یوجنا

اپریل۔مئی ۱۹۹۷ء
۵ روپے



ایم. ڈی. سکھامنی

ملک کے لیے قابلِ فخر مصنوعی سیارہ:

آئی. آر. ایس. ایک سی

بھارت کے خلائی پروگرام نے ۱۹۶۰ء کے دہے میں اپنے آغاز کے بعد سے عظیم کامیابی حاصل کی ہے، جس کا موازنہ خلائی تکنالوجی کے حامل دولت مند ممالک سے کیا جاسکتا ہے۔ بھارت نے دکھا دیا ہے کہ وہ قابل اعتماد طریقے اور کم اخراجات سے خود اپنے ریموٹ سینسنگ سٹیلائٹ چھوڑ سکتا ہے۔ یہ ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیارے دنیا کے اعلا اور پیچیدہ ترین مصنوعی سیاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ یہ سیارے امریکہ اور یوروپی ممالک کے مقابلے میں ایک تہائی لاگت پر خلا میں چھوڑے گئے ہیں۔ بھارت نے ریموٹ سینسنگ کے ذریعہ ڈاٹا حاصل کرنے، اس کی پروسیسنگ اور تجزیہ کرنے میں بھی کافی مہارت حاصل کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملکی اور بین اقوامی استعمال کنندگان اس کے ڈاٹا پروڈکٹس کی عمدہ کوالٹی کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

بھارتی ریموٹ سینسنگ سٹیلائٹس (آئی آر ایس) قدرتی وسائل کے انتظام کے قومی نظاموں کا ایک اہم جزو ہیں اور وہ ملک کے قدرتی وسائل کے انتظام کے لیے مسلسل اور عملی ریموٹ سینسنگ ڈاٹا کی خدمات فراہم کرکے ایک اہم قومی نصب العین کی تکمیل کی کوشش کر رہے ہیں۔

بڑھتے قدم

پہلی نسل کے آئی آر ایس مصنوعی سیاروں کا ڈیزائن بنانے، انھیں تیار کرکے خلا میں چھوڑنے اور مدار میں ان کی عمدہ کارکردگی کی صورت میں حاصل ہونے والی کامیابی کے بعد ہی بھارت نے قدم رکھے ہیں۔ وہ اب دوسری نسل کے ریموٹ سینسنگ مصنوعی سیاروں سے بہتر اور اضافی ڈاٹا سروس فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آئی. آر. ایس. ایک سی جدید ترین سویلین ارتھ آبزرویشن سٹیلائٹ ہے۔ یہ مصنوعی سیارہ ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کو خلا میں چھوڑا گیا تھا۔ اسے زمین کا چکر لگانے میں صرف ۱۰۱ منٹ لگتے ہیں۔ کرۂ ارض کی پوری سطح کا سروے یہ صرف ۲۴ دنوں میں کرتا ہے۔ ہندوستانی ارتھ اسٹیشن سے نظر آنے والے علاقوں سے ڈاٹا اکٹھا کرنے کے لیے اس میں ایک "آن بورڈ ٹیپ ریکارڈر" کی سہولت موجود ہے جو ڈاٹا ریکارڈ کرکے دنیا کے کسی بھی حصے میں بھیج سکتا ہے۔

اسٹیٹ آف دی آرٹ تکنالوجی

آئی آر ایس۔ ایک سی سٹیلائٹ میں تصویر لینے والے تین نہایت اعلا درجے کے سینسر نصب ہیں۔ ان میں سے ایک پینکرومیٹک کیمرہ ہے جو ۵.۸ ایم۔ کے بہت بلند فضائی ریزولیوشن کا ڈاٹا فراہم کرسکتا ہے۔ سٹیلائٹ میں لائنز امیجنگ اور سیلف اسکیننگ (ایل آئی ایس ایس III) سنسر بھی لگا ہوا ہے جو چار بینڈس پر جمع کیا ہوا ڈاٹا فراہم کرتا ہے۔

تیسرا ریموٹ سینسنگ سنسر، جو اس سٹیلائٹ میں لگا ہوا ہے، وائڈ فیلڈ سنسر (ڈبلیو آئی ایف ایس) کہلاتا ہے جو دو خاص بینڈس پر ڈاٹا اکٹھا کرتا ہے۔ یہ ۸۱۰ کلومیٹر کے وسیع تر رقبہ اراضی کا احاطہ کرسکتا ہے۔ ڈاٹا ڈیجیٹیل (عددی) اور فوٹوگرافک میڈیا کے ذریعے مہیا کیا جاتا ہے۔

ٹھوس فائدے

۱۹۸۸ء سے بھارت اپنی ضرورتوں کے مطابق پانچ ریموٹ سینسنگ سٹیلائٹ تیار کرچکا ہے، جس سے ہندوستانی عوام کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ سٹیلائٹ کی فراہم کی ہوئی تصاویر سے ملک میں پانی والے مقامات کا پتا لگانا بہت آسان ہوگیا ہے۔ سٹیلائٹ کی تصاویر کی مدد سے محققین زیر زمین پانی ۹۲ فی صد کامیابی کے ساتھ ۸ ہزار کنووں کا پتا لگا چکے ہیں جب کہ یہ کام روایتی طریقوں سے کرنے میں ۴۵ فی صد کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ ریموٹ سینسنگ سٹیلائٹس نے جنگلات اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کی جانے والی اراضی کے نقشے بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ریموٹ سینسنگ تکنالوجی کی مدد سے پورے ملک کے جنگلات کا نقشہ بنانے میں سات سال لگے، جب کہ یہی کام اگر روایتی زمینی سروے کے ذریعے کیا جاتا تو ۵۰ سال

باقی صفحہ ۴۲ پر

یوجنا

چیف ایڈیٹر ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر ۔ عابد کرمانی

فون ۔ 6177591

معاون رفیق زیدی

تزئین وکتابت افتخار احمد خاں

سرورق سدستا

جلد ۱۷ شمارہ ۱۔۲

اپریل مئی ۱۹۹۶ء (۱۱ چیتر تا ۱۰ جیٹھ تک ۱۹۱۸)

قیمت فی شمارہ ۵ روپے

زرِ سالانہ ۔ ۵ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں

بزنس مینیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱ ۱۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

مضامین سے متعلق
خط وکتابت کا پتا

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (میں) نئی دہلی ۶۶

"یوجنا" منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

مہیش پرساد

صنعتی ترقی

مصنف کے مطابق گزشتہ برسوں میں جو ٹھوس پالیسیاں اختیار کی گئی ہیں، ان کے نتیجے میں ہندوستانی صنعت میں زبردست ترقی دیکھنے میں آئی ہے۔ جہاں چہ ہندوستان کی صنعت آج ایک ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ تاہم بنیادی ڈھانچے کی کچھ کمزوریاں ابھی پائی جاتی ہیں، جنھیں دور کیے جانے کی ضرورت ہے تاکہ مزید ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان کی صنعت میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ایک ایسی صورت حال سے، جب کہ ایک پن تک درآمد کرنی پڑتی تھی۔ ہندوستان اب ایک ایسی سطح پر پہنچ گیا ہے، جہاں وہ ۵۰ نشستوں اور سو نشستوں والے مسافر بردار طیارے تیار کرنے جا رہا ہے۔ مزید براں ہندوستانی عوام کے سامنے ساز و سامان کی گوناگوں اقسام ہیں، جن میں سے اپنے لیے اپنی پسند کے مطابق انتخاب کر سکتا ہے۔ ہندوستانی منڈی میں اب مختلف اقسام کا ساز و سامان بھرا پڑا ہے۔ خواہ کاریں، اسکوٹریں اور موٹر سائیکلوں کے نئے سے نئے ماڈل ہوں یا واشنگ مشینوں، کوکنگ رینج یا مکسیوں کے جدید سے جدید نمونے ہوں، انتخاب کرنے کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ وہ دن اب چلے گئے جب پسند کا معاملہ محدود تھا اور ایک شخص کو نئی کار یا اسکوٹر لینے کے لیے تقریباً ایک سال تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اب کوئی بھی شخص کسی شوروم میں جا کر نئی کار چلاتا ہوا باہر آ سکتا ہے۔ صارفین کے لیے دستیاب انتخاب کے عمل کے ساتھ ساتھ ساز و سامان کی کوالٹی میں بھی نمایاں بہتری آئی ہے۔

آزادی کے وقت ہندوستان کی صنعت ابتدائی مرحلے میں تھی۔ یہ صنعت سوتی کپڑے اور پٹ سن کی اشیاء، جن کا حصہ مالیت پر مبنی اشیاء سازی میں ۵۶٫۸ فی صد تھا، چینی (۶٫۶ فی صد)، انجینئرنگ (۴٫۸ فی صد)، فولاد (۶٫۷ فی صد)، کیمیاوی اشیاء (۱٫۴ فی صد) اور سیمنٹ (۱٫۲ فی صد) تک ہی محدود تھی۔ ۱۹۵۰ء میں آزاد ہندوستان میں قومی آمدنی میں جدید صنعت کا حصہ صرف چھ سے آٹھ فی صد ہی تھا جب کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور کان کنی کے شعبے کا تعاون ۱۲ سے ۱۴ فی صد تھا۔ آزادی کے فوراً بعد ہندوستان کے صنعتی شعبے کے لیے مشینیں اور دیگر ساز و سامان موجود نہیں تھا۔ ہندوستان کی صنعتوں کو تقریباً مکمل طور سے درآمد شدہ مشینری اور میکانیکی ساز و سامان پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ہندوستان نے صرف ۳۰ لاکھ روپے کی مالیت کے مشینی اوزار اور قابلِ نقل و حمل اوزار اندرونِ ملک تیار کیے تھے اور مشینی اوزاروں کے لیے اپنی ۸۹٫۸ فی صد ضرورت درآمدات سے پوری کی تھی۔

بنیاد

جدید ہندوستان کی صنعتی معیشت کی بنیاد جواہر لال نہرو نے رکھی تھی، جنھوں نے آزادی کے لیے اور اس کے بعد تقریباً ۱۷ برس تک وزیر اعظم کی حیثیت سے ملک کی رہنمائی کی اور ملک کی معیشت کی تعمیر کی۔ یہ کام سرکاری شعبے کے ذریعے انجام دیا گیا تھا، جس کی بنیاد بھی نہرو نے ہی رکھی تھی، کیوں کہ غیر سرکاری شعبے کے پاس بنیادی ڈھانچے کے بڑے پروجیکٹ مثلاً بھاکڑہ میں بجلی پروجیکٹ، یا فولاد سازی کا کارخانہ مثلاً بھلائی شروع کرنے کے لیے وسائل نہیں تھے، جنھیں اس عظیم صاحب بصیرت شخص نے جدید ہندوستان کی عبادت گاہوں سے تعبیر کیا تھا۔ نہرو نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی کہ بنیادی ڈھانچے کی صنعتوں کے بغیر جدید صنعتی معیشت کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر یہ بات ۱۹۵۰ء میں سچ تھی تو یہ آج بھی اتنی ہی سچ ہے کیوں کہ بنیادی ڈھانچے کی رکاوٹیں ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

دو پالیسی قراردادیں

آزادی کے بعد صنعتی ترقی و فروغ میں ۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی قرارداد اور اس کے بعد ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی قرارداد سے کافی مدد ملی، جن کا مقصد سماج کے سوشلسٹ طریقے کے حصول

سے ذرائع کے طور پر صنعت کاری کے عمل میں تیزی لانا اور صنعتی ترقی کی شرح میں اضافہ کرنا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں سرمایے کی قلت تھی اور صنعت کاری کی بنیاد مضبوط نہیں تھی۔ چناں چہ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی قرارداد میں مملکت کے کردار کو اولیت دی گئی تاکہ وہ صنعتی ترقی کے لیے براہِ راست ذمہ دار ہو سکے۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء کی دو قراردادوں میں فولاد، ہیوی انجینئرنگ، جیسی اوزاروں اور کیمیاوی اشیاء کی صنعت کی ترقی وفروغ کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی۔

۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی قرارداد میں ایسی صنعتوں کی کم تعداد تھی، جو سرکاری شعبے کے ذریعے پیداوار کے لیے مخصوص کی جاتی تھیں۔ ان میں ہتھیاروں اور گولہ بارود کی تیاری، ایٹمی توانائی کی پیداوار اور کنٹرول نیز ریلوے کی ملکیت اور انتظام شامل تھا۔ تاہم کوئلہ، لوہا اور فولاد، ہوائی جہازوں کی تیاری، بحری جہازوں کی تیاری، ٹیلی گراف اور وائرلیس کے ساز وسامان (ریڈیو کو چھوڑ کر) کی تیاری اور معدنیات کی پیداوار کا کام مرکزی اور ریاستی حکومت کے اداروں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی قرارداد کے تحت فہرست میں کچھ مزید صنعتوں کو شامل کیا گیا تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ جہاں تک سرکاری شعبے کا تعلق ہے، اسے ایسے شعبوں میں داخل ہونا چاہیے، جن میں غیر سرکاری شعبے کے لیے سرمایہ کاری کرنا مشکل ہو۔ ۱۹۵۶ء تک یہ معاملہ صنعتوں کی سرکاری ملکیت کے لیے قطعی ترجیح میں تبدیل ہو گیا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سرکاری شعبہ معیشت کی بلندیوں پر پہنچ جائے گا۔

صنعتی ترقی وفروغ پر زور

اس وقت پائے جانے والے خیال کے مطابق پہلے پنج سالہ منصوبے میں کہا گیا تھا کہ صنعتی منصوبہ بندی کا مقصد اہم صنعتی اشیاء کی ... کے سلسلے میں خامیوں اور کمیوں کو دور کرنا ... ترقی کا عمل شروع کرنا ہے، جس سے اس طرح کی بنیادی پیداوار کی مجموعی توسیع ہو سکے گی۔ دیگر اقتصادی پالیسیوں مثلاً کسٹم اور ایکسائز محصول کے ڈھانچے، درآمداتی اور برآمداتی پالیسی، سرمایہ کاری اور ٹکنالوجی سے متعلق پالیسی نیز مالی اور مالیاتی پالیسی کی تشکیل کے ساتھ صنعتی پالیسی میں تال میل کی ضرورت پہلے منصوبے میں کافی محسوس کی گئی تھی۔ دوسرے منصوبے اور بعد کے منصوبوں میں سرکاری وسائل کی تخصیص پر زیادہ سے زیادہ نیز علامتوں اور پالیسیوں پر کم توجہ دی گئی ہے تاکہ پوری معیشت کو مطلوبہ سمتوں میں لے جایا جائے۔

۱۹۷۳ء کے صنعتی پالیسی بیان میں منجملہ دیگر چیزوں کے ان اعلا ترجیحی صنعتوں کی نشاندہی کی گئی، جن میں صنعتی ایوانوں اور غیر ملکی کمپنیوں سے سرمایہ کاری کی اجازت دی جائے گی۔ ۱۹۸۰ء کے صنعتی پالیسی بیان میں اندرونِ ملک منڈی میں مقابلے کو فروغ دینے، ٹکنالوجی کی ترقی وبہتری اور جدید کاری کی ضرورت پر توجہ مرکوز کی گئی۔ اس پالیسی میں برآمدات کی زیادہ سے زیادہ مقابلہ جاتی بنیاد نیز ٹکنالوجی کے اعلا ترجیحی شعبوں میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنے کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا اظہار چھٹے پنج سالہ منصوبے میں کیا گیا، جس میں پیداواریت کو تمام اقتصادی اور پیداواری سرگرمیوں میں مرکزی تشویش کا معاملہ بنائے جانے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

اس کے باوجود بھی سرکاری شعبہ بھاری صنعتوں کی ترقی وفروغ پر زور دیتا رہا۔ بجلی، ریلوے، کوئلہ، پٹرولیم، فولاد اور کیمیاوی کھادوں جیسے اہم شعبوں میں سرکاری شعبہ ترقی کی رفتار قائم کرنے کے کام میں بہت زیادہ شامل رہا ہے۔ بنیادی صنعت اور بنیادی ڈھانچے میں سرکاری سرمایہ کاریوں کے علاوہ، منصوبے کے مقاصد اور ترجیحات کے مطابق، غیر سرکاری شعبے کی توسیع کے کام میں مالی اداروں نے بہت زیادہ مدد کی اور سہولت بہم پہنچائی۔ ترقیاتی بینکنگ کے خصوصی اداروں کا ایک وسیع نظام، جس میں سب سے اوپر ہندوستان کا صنعتی ترقیاتی بینک تھا، قائم کیا گیا تاکہ غیر سرکاری شعبے میں صنعتی سرمایہ کاری کے سلسلے میں رقم فراہم کرنے کے کام میں مدد کی جائے۔ یہ ادارے، جن کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے، کارپوریٹ شعبے کے لیے طویل مدتی مالیہ کا اہم ذریعہ بن گئے ہیں۔

چھٹے اور ساتویں منصوبے میں ترقی

جیسا کہ صنعتی پالیسی، ۱۹۹۱ء کے متعلق بیان میں کہا گیا ہے "ان پالیسیوں نے ملک میں تیز رفتار صنعتی ترقی کا ماحول پیدا کیا ہے۔ چناں چہ ساتویں پنج سالہ منصوبے کے موقع پر وسیع بنیاد پر مبنی بنیادی ڈھانچہ تیار کیا جا چکا تھا۔ بنیادی صنعتیں قائم کی جا چکی تھیں۔ بڑی تعداد میں اشیاء ... خام مال، درمیانہ اشیاء، تیار سامان ... کے معاملے میں کافی حد تک خود کفالت حاصل کی جا چکی تھی۔ صنعتی سرگرمی کے نئے ترقیاتی مراکز ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ بڑی تعداد میں انجینئروں، تکنیکی افراد اور ہنر مند کارکنوں کو تربیت دی جا چکی تھی۔

چھٹے منصوبے میں دیگر اشیاء کے ساتھ ساتھ، ایلومینیم، جست، سیسہ، تھرمو پلاسٹکس، دھاگے، پیٹرو کیمیکل درمیانی اشیاء، بجلی کا ساز وسامان، سیمنٹ اور صارفین کی پائیدار اشیاء سمیت، بڑی تعداد میں صنعتوں میں کم وبیش نشانوں کے مطابق نئی صلاحیت میں اضافہ حاصل کیا گیا تھا۔ تاہم فولاد، سیمنٹ، غیر آہنی دھاتیں، کیمیاوی کھادیں اور کچھ دیگر صنعتوں سمیت، کپڑے، پٹ سن کی مصنوعات، چینی، ادویہ، کاروباری گاڑیاں اور ریل ڈبوں جیسی کچھ بنیادی صنعتوں میں پیداوار میں کمی آئی تھی۔ مشینی اوزار، مسافر کاریں، موٹر سائیکل اور اسکوٹر، صارفین کے الیکٹرونکس کا ساز وسامان اور مواصلاتی ساز وسامان جیسی کچھ صنعتوں میں پیداواری نشانوں سے تجاوز کیا گیا تھا۔ پیداوار میں کمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اندرون ملک عدم توازنوں کو فولاد، سیمنٹ، کیمیاوی کھادیں اور چینی جیسی ضروری اشیاء کی درآمدات کے ذریعے درست کرنا پڑا تھا۔

انجینئرنگ کے شعبے میں کچھ صنعتوں میں منصوبے کی مدت کے دوران ٹکنالوجی پر زور دیا گیا تھا۔ ۵۰۰ میگاواٹ حرارتی بجلی تیار کرنے والا پہلا یونٹ چالو کیا گیا تھا اور ۵۰۰ میگاواٹ کی صلاحیت والے ٹربو جنریٹروں اور بوائلروں کی تیاری کا کام شروع کیا گیا تھا۔ بجلی کے شعبے کے لیے درکار دیگر ساز وسامان کے سلسلے میں پیداواری ٹکنالوجی میں منظم طریقے سے بہتری اور ترقی ہوئی ہے۔

یومیہ ۱۳۵۰ ٹن کیمیاوی کھاد تیار کرنے کے یونٹوں کے لیے سازوسامان نیز فولاد کے کارخانوں کے لیے ۳۲۰۰ مکعب میٹر کی صلاحیت والی بلاسٹ بھٹیوں کے لیے سازوسامان تیار کرنے کا کام ملک میں شروع کیا جا رہا تھا۔ الیکٹرونکس کے شعبے کی تیز رفتار ترقی کے لیے ایک ٹھوس بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

ساتویں منصوبے میں ان صلاحیتوں کو مستحکم بنانے اور ابھرتے ہوئے چیلنجوں سے موثر طور پر نپٹنے کے سلسلے میں ہندوستانی صنعت کو تیار کرنے کی غرض سے اقدامات کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں جو متعدد پالیسی اور طریقہ جاتی تبدیلیاں کی گئی تھیں، ان کا مقصد پیداواریت میں اضافہ کرنا، لاگتوں میں کمی لانا اور معیار کو بہتر بنانا تھا۔ صنعتوں پر پیداواری صلاحیت کے سلسلے میں جو پابندیاں عائد تھیں، انھیں رفتہ رفتہ کم کیا گیا۔ صنعتوں کی صلاحیت کو وسیع تر بنانے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا تاکہ اشیا تیار کرنے والا شخص یا ادارہ منڈی کی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی پسند کے مطابق اشیا تیار کر سکے۔ ۱۹۸۶ء میں موجودہ صلاحیت کی ازسر نو توثیق کرنے کے برخلاف ہر یونٹ کے لیے کم سے کم اقتصادی سائز مقرر کرتے ہوئے اجازت ناموں کے ساتھ پیداوار کے کم سے کم اقتصادی پیمانے کی اسکیم شروع کی گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مقابلے کے لیے اندرون ملک منڈی شروع کرنے اور بین اقوامی مقابلے کی صورت میں صنعت کو خود اپنے بل بوتے پر مقابلہ کرنے کے سلسلے میں تیار کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ سرکاری شعبے پر سے بہت سی پابندیاں ہٹا دی گئی تھیں اور اسے کافی خود مختاری دی گئی تھی۔ پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے اور دنیا میں مقابلہ جاتی صلاحیت کو بہتر بنانے کی غرض سے صنعت کی تکنیکی اور انتظامی جدید کاری کے کام کو اہم آلۂ کار کے طور پر اپنایا گیا تھا۔

آزادی کے بعد سے اپنائی گئی پالیسیوں کے نتیجے میں ۱۹۵۰ء سے ۴۰ سال سے زیادہ کے عرصے میں صنعتی ترقی کا طویل مدتی رجحان ۷ فی صد سے زیادہ کی سالانہ ترقی کا رجحان ہے۔ ہندوستانی معیشت کے موضوع پر بمل جالان کی کتاب میں شامل ایک مضمون میں راکیش موہن نے لکھا ہے "یہ ایک کامیابی ہے ۔ ۔ ۔ ۔" انھوں نے ترقی کے ریکارڈ کو تین امتیازی مدتوں میں تقسیم کیا ۷، ۷ فی صد سالانہ ترقی، پلان ہولی ڈے میں (۶۶-۱۹۶۹ء) نیز جو تھے اور پانچویں منصوبے کی مدتوں میں (۶۹-۱۹۷۹ء) ۴ فی صد سالانہ ترقی، چھٹے اور ساتویں منصوبے کی مدتوں میں تقریباً ۷، ۷ فی صد سالانہ ترقی کی بحالی۔

تاریک زمانہ

راکیش موہن کے مطابق، ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۰ء کا عرصہ ہندوستانی معیشت کا تاریک عرصہ ہے۔ اس عرصے میں تین سال یعنی ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک زبردست خشک سالی سے دوچار ہونا پڑا، چین کے ساتھ جنگ اور پاکستان کے ساتھ دو جنگوں کی وجہ سے ۱۹۶۲ء سے زیادہ دفاعی اخراجات کے اثرات رونما ہوئے، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۹ء میں تیل کی قیمتوں میں زبردست اضافہ ہوا اور غیر ملکی وسائل کی دستیابی میں کمی واقع ہوئی۔ اس مدت کے دوران ہندوستانی معیشت توازن پیدا کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہی تھی۔

پالیسی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستانی صنعت کی صورت حال میں بہت زیادہ تبدیلی آگئی تھی۔ آزادی کے بعد صارفین کی اشیا کی صنعت کا حصہ تمام صنعتی پیداوار میں تقریباً آدھا تھا۔ ۱۹۹۱ء میں اس قسم کی صنعتوں کا حصہ صرف تقریباً ۳۰ فی صد تھا۔ اس کے برخلاف بڑے سازوسامان کی پیداوار کل صنعتی پیداوار کے ۴ فی صد حصے سے بھی کم تھی۔ ۱۹۹۱ء میں یہ پیداوار بڑھ کر ۲۴ فی صد ہو گئی تھی۔ اسی طرح سے بنیادی سازوسامان کا حصہ ۳۰ فی صد سے بڑھ کر ۴۰ فی صد ہو گیا تھا۔

نئی صنعتی پالیسی

اس کے باوجود بھی گزشتہ برسوں میں یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی کہ صنعتی لائسنس دینے کے نظام سے جو کہ ۱۹۶۰ء کے دہے کے وسط کے بعد مرتب کیا گیا تھا، نااہلی کو بڑھاوا ملا تھا اور اس کے نتیجے میں زیادہ اخراجاتی معیشت وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۹۱ء میں اہم پالیسی تبدیلیاں کی گئی تھیں، تاکہ تیز رفتار اقتصادی ترقی کے لیے مقابلے کی ترغیب دی جائے۔ نئی پالیسی میں مقابلے کے نئے ذرائع کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے تاکہ صنعتوں کے لیے لائسنس کا سلسلہ ختم کرکے نیز غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری سے متعلق پالیسی کو نرم اور آسان بنا کر زیادہ سے زیادہ صنعتی کارکردگی میں اضافہ کیا جائے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۹۱ء کو نئی صنعتی پالیسی کے بارے میں ایک بیان پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا، جس کے تحت ایسی ۱۸ صنعتوں کو چھوڑ کر صنعتی لائسنس کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا، جن کا تعلق سلامتی اور جنگی امور، سماجی امور، خطرناک کیمیاوی اشیا، بہت زیادہ ماحولیاتی امور اور بہت زیادہ کھپت کی اشیا سے تھا۔ سرکاری شعبے کے لیے مخصوص صنعتوں کی تعداد گھٹا کر آٹھ کر دی گئی تھی، جن کے معاملے میں، حکومت کی رائے میں سلامتی اور جنگی امور زیادہ اہم تھے۔ دونوں فہرستوں میں رفتہ رفتہ مزید کمی کی گئی ہے۔ نئی صنعتی پالیسی کا مقصد نئے صنعت کاروں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ تجارتی نظریے پر مبنی سرمایہ کاری کے بارے میں فیصلے کر سکیں اور اس سلسلے میں حکومت کا ضابطہ جاتی کردار کم سے کم رہے۔

نئی صنعتی پالیسی کے نتیجے میں ۱۹۹۱ء کے بعد کی مدت میں، جس سے پہلے ۰۱۶ فی صد کی صنعتی ترقی درج کی گئی تھی، شرح ترقی میں اضافہ دیکھنے میں آیا، جو ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۲٫۳ فی صد اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں کافی بڑھ کر ۶٫۱ فی صد ہو گئی۔ بحالی کا عمل اس کے بعد تیز تر رہا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۸٫۶ فی صد اور ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۱۲ فی صد کی ترقی ریکارڈ کی گئی۔ مزید برآں جب کہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں صنعتی ترقی کی قیادت صارفین کی پائدار اشیا کے شعبے نے کی تھی، ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس ترقی کی قیادت بڑے سازوسامان کے شعبے نے کی ہے، جس نے مذکورہ سال کے دوران ۲۵ فی صد کی ترقی ریکارڈ کی ہے۔

موجودہ صورت حال

نئی صنعتی پالیسی اور دیگر اقتصادی اصلاحات سے غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ پالیسی کے بعد کی مدت میں ۳۰ ستمبر ۱۹۹۶ء تک غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری کی منظوریوں کی مالیت ۸۶۳۲۹٫۰۵ کروڑ روپے (۲۴۳۱۸٫۰ لاکھ امریکی ڈالر) رہی ہے۔ لیکن صنعتی امداد سے متعلق سیکریٹریٹ کے پاس دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ستمبر ۱۹۹۶ء تک حقیقی آمد صرف ۸۱۵۱٫۴۹ کروڑ روپے (۵۱۱۲٫۰ لاکھ امریکی ڈالر) رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی مواصلات کے شعبے کو چھوڑ کر دیگر اہم شعبوں مثلاً بجلی، سڑکوں اور بندرگاہوں کے شعبوں میں زیادہ غیر ملکی سرمایہ کاری نہیں رہی ہے۔

ملک آج کل صنعتی ترقی میں کمی کے دور سے گزر رہا ہے۔ صنعتی ذرائع کے مطابق، اس کی وجہ یہ ہے کہ مناسب نئی صلاحیت ابھی تک پیدا نہیں کی گئی ہے۔ ملک نے اب تک جتنی ترقی کی ہے وہ موجودہ صلاحیت کے بھرپور استعمال سے حاصل کی گئی ہے۔ بنیادی ڈھانچے میں بہتریاں نہ کرنے اور زیادہ شرح سود کے نتیجے میں زیادہ اخراجاتی معیشت کی وجہ سے مزید ترقی کا عمل رکا ہوا ہے۔ صنعت وقتاً فوقتاً رقم کی کمی کے مسئلے سے بھی دوچار رہی ہے۔ اس کے علاوہ گھریلو صنعت بھی وقتاً فوقتاً کثیر ملکی کمپنیوں کے مقابلے میں لیول پلیئنگ فیلڈ پر زور دیتی رہی ہے۔ یہ کثیر ملکی کمپنیاں معیشت میں فراخدلانہ پالیسی اپنائے جانے سے زیادہ سے زیادہ منڈی میں داخل ہو رہی ہیں۔ ان سب میں سے بنیادی ڈھانچے میں مزید ترقی مجموعی طور سے معیشت کی ترقی کے لیے لازمی اور اہم ہے۔

صنعتی زوال کی واضح علامتیں موجود ہیں۔ موجودہ مالی سال (۹۷-۱۹۹۶ء) کے دوران اگرچہ اپریل تا اگست کی مدت میں صنعتی پیداوار میں مجموعی اضافہ ۸٫۶ فی صد رہا ہے، تاہم یہ کم ہو کر مئی میں ۱۰٫۶ فی صد سے جون میں ۹٫۷ فی صد اور جولائی میں ۸٫۲۹ فی صد ہو گیا ہے جب کہ گزشتہ سال اگست میں یہ ۱۳٫۲ فی صد اور اپریل تا اگست میں ۱۲٫۶ فی صد تھا۔ اشیا سازی میں اضافہ گزشتہ سال ۱۴٫۵ فی صد کے مقابلے میں اس سال اگست میں ۷٫۸ فی صد رہا ہے۔

معیشت میں فراخدلانہ پالیسی اپنائے جانے کے بعد ملک میں صنعت کاری کے تیز رفتار عمل اور بنیادی ڈھانچے کی ناکافی ترقی و فروغ کی وجہ سے ایک ایسی عدم مساوات پیدا ہو گئی ہے، جو مزید ترقی کی راہ میں رکاوٹ سی ہوئی ہے۔ اعداد و شمار کی مرکزی تنظیم کے تازہ ترین تخمینوں کے مطابق ۹۶-۱۹۹۵ء میں مجموعی اندرون ملک پیداوار میں ۶٫۷ فی صد کا اضافہ حاصل کرنے کے بعد ۹۷-۱۹۹۶ء کے لیے مجوزہ اضافہ ۶٫۴ فی صد ہے۔

بنیادی ڈھانچے پر مناسب توجہ دینا لازمی ہے کیوں کہ ہندوستان کا یہ تجربہ رہا ہے کہ بنیادی ڈھانچے کی صنعتوں میں ترقی کی شرح اشیا سازی کی صنعتوں کے مقابلے میں کافی کم رہی ہے۔ مثال کے طور پر ۹۶-۱۹۹۵ء میں بنیادی ڈھانچے کی صنعتوں میں اشیا سازی کی صنعتوں کی نصف شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی ڈھانچے کی دستیابی اور بقیہ صنعت کی ضروریات کے درمیان عدم مساوات بڑھ رہی ہے۔ جو چیز ابھر کر سامنے آ رہی ہے وہ ہے بنیادی ڈھانچے کی امکانی طور سے ناقابل انتظام رکاوٹیں۔ زیادہ اہم بات ہے بنیادی ڈھانچے کے شعبے کے مختلف جزو کی متوازن ترقی۔

اس سلسلے میں دی گئی ایک مثال سیمنٹ کی صنعت میں ۱۳ فی صد کی زیادہ ترقی کی ہے، جس سے ۱۵ برسوں میں کوئلے کی مانگ بڑھ کر ۵ لاکھ ٹن ہو جائے گی، جب کہ اس کی سپلائی صرف آدھی ہی رہے گی۔ اس طرح بنیادی ڈھانچے کی صنعتوں کے مختلف حصوں کے ایک دوسرے پر انحصار اور دیگر صنعتوں کے ساتھ ان کے تعلق کو سمجھتے ہوئے متوازن ترقی کی پالیسی اپنائے جانے کی ضرورت ہے، بصورت دیگر زیادہ شرح ترقی برقرار رکھنا مشکل ہوگا۔

ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک مطلوبہ چیلنج کے طور پر رقم فراہم کرنے اور قیمتیں متعین کرنے کی پائیدار پالیسیوں کے ساتھ نیز مناسب اخراجات پر بنیادی ڈھانچے کی مناسب اور قابل بھروسہ خدمات کی فراہمی کا ذکر کرتے ہوئے، بجٹ سے پہلے کے اقتصادی جائزے کی 'تازہ ترین رپورٹ' میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جب تک اس شعبے میں اہم بہتریاں نہیں کی جاتیں، اس وقت تک صنعت، زراعت اور برآمدات کے شعبوں میں ترقی کی رفتار بے کار رہے گی۔

مزید برآں، اس تازہ ترین رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ ہندوستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی کا انحصار زیادہ تر بنیادی ڈھانچے کے شعبوں سے مثلاً بجلی، سڑکوں، ریلوے، بندرگاہوں، آبپاشی اور ٹیلی مواصلات کے شعبے کی کارکردگی پر ہے۔ ضروری بہتریاں کرنے سے سرکاری اجارہ داری کا پرانا نظریہ ایک ایسے نظریے میں زبردست طور سے تبدیل ہو جائے گا، جس میں بنیادی ڈھانچے کی خدمات فراہم کرنے والے افراد کی بھی سرگرم طور سے حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

بنیادی ڈھانچے کو فروغ دینے کی ضرورت

بنیادی ڈھانچے کے شعبے کے مختلف حصوں میں صورت حال مایوس کن رہی ہے۔ بجلی کے معاملے میں، نصب شدہ صلاحیت ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء کو ۸۱۱۶۴ میگاواٹ تھی۔ آٹھویں منصوبے کے پہلے تین برسوں میں یعنی ۹۵-۱۹۹۴ء تک ۱۲۶۷۵ میگاواٹ بجلی کی صلاحیت کا اضافہ کیا گیا تھا جب کہ آٹھویں منصوبے میں ۳۰۸۵۸ میگاواٹ بجلی کی صلاحیت کا اضافہ کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

تیل کے شعبے میں، صورت حال گزشتہ مالی سال تک قدرے بہتر رہی ہے۔ خام تیل کی پیداوار ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۲۷٫۰۳ ایم۔ ایم ٹی سے بڑھ کر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۳۲٫۲۸ ملین میٹرک ٹن (ایم۔ ایم۔ ٹی) ہو گئی۔ ۳۵٫۱۹۳ ایم ایم۔ ٹی کی پیداوار کر کے ۹۶-۱۹۹۵ء میں یہ

پیش رفت برقرار رکھی گئی تھی، جس سے گزشتہ سال کی اسی مدت کے مقابلے میں ۹٫۰۲ فی صد کے اضافے کا پتا چلتا ہے۔ لیکن موجودہ سال میں یعنی ۹۷-۱۹۹۶ء میں پیداوار میں مذکورہ سال کے لیے اس سے قبل کے تخمینوں کے مقابلے میں ۴٫۸ ملین میٹرک ٹن کی کمی آنے کا امکان ہے، یعنی اس سے قبل پیشین گوئی کردہ ۳۵٫۶۵ ایم۔ ایم۔ ٹی کے مقابلے میں ۳۰٫۸۵ ایم۔ ایم۔ ٹی۔

۹۵-۱۹۹۴ء میں قدرتی گیس کی پیداوار ۱۹٫۴ ارب مکعب میٹر رہی تھی، جو ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۸٫۳ ارب مکعب میٹر کے مقابلے میں ۶٫۰ فی صد زیادہ تھی۔ ۲۲٫۶ ارب مکعب میٹر کی پیداوار کے ساتھ ۹۶-۱۹۹۵ء میں اضافہ (۱۶٫۴ فی صد) کہیں زیادہ تھا۔ لیکن مانگ اور سپلائی کے درمیان فرق بہت زیادہ ہے۔ توقع ہے کہ قدرتی گیس، جس سے ہندوستان میں تجارتی توانائی کی صرف ۸ فی صد مانگ پوری ہوتی ہے، مستقبل میں ہائیڈروکاربن کی مانگ و رسپلائی کے درمیان فرق کو ختم کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

ٹیلی مواصلات کے شعبے میں، جب کہ ہندوستان میں ایک لائن فی ایک سو افراد ہے، تھائی لینڈ میں گیارہ لائنیں اور مجموعی طور سے تمام ترقی پذیر ممالک میں چھ لائنیں ہیں۔ اب تک جہاں تک ریلوے کا تعلق ہے، مال ڈبوں کی شدید قلت ہے۔ جہاں تک سڑکوں کا معاملہ ہے، سامان کی ۵۵ فی صد اندرونِ ملک نقل و حمل سڑکوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ ملک میں ایک بھی سپر شاہراہ نہیں ہے۔ مجموعی طور سے ۳۴۰۰۰ کلومیٹر لمبی شاہراہوں کے قومی نظام میں نقل و حمل کی دوہری راہوں کی کل لمبائی ایک ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

بندرگاہوں میں بھی صورت حال اتنی ہی خراب ہے۔ بیشتر بندرگاہوں پر مال اتارنے میں ۲ سے ۲۵ دن، یہاں تک کہ ۳۵ دن بھی لگ جاتے ہیں۔ عالمی بینک کے ایک مطالعے میں تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستانی بندرگاہوں پر کنٹینروں کے سلسلے میں ہونے والی تاخیر پر آنے والے اخراجات سالانہ ۷۰۰ لاکھ امریکی ڈالر ہیں۔

۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۵۳۰ لاکھ ٹن کوئلے کی پیداوار سے ۹۴-۱۹۹۳ء کے مقابلے میں ۳٫۲ فی صد کے اضافے کا پتا چلتا ہے۔ غیر کوکنگ کوئلے کی پیداوار میں، جس کا حصہ کوئلے کی کل پیداوار میں تقریباً ۸۳ فی صد ہے، ۴٫۳ فی صد کا اضافہ ہوا ہے، جب کہ کوکنگ کوئلے کی پیداوار میں ۱٫۸ فی صد کی کمی آئی ہے۔

خصوصی پالیسی پیکیج

سرکار نے ترقیاتی پروگراموں کے لیے درکار ڈھانچے کے لیے ایک جامع انداز کے پالیسی پیکیج کا اعلان کیا ہے۔ اس میں منجملہ دیگر سہولتوں کے ایک یہ ہے کہ جو ادارے سڑکوں، شاہراہوں کے پلوں، نئے ہوائی اڈوں، گودیوں اور ریلوے نظام جیسی بنیادی سہولتوں کو آگے بڑھانے اور ان کو چلانے والے اداروں کو پانچ سال کے لیے ٹیکسوں سے چھٹی دیے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ۹۷-۱۹۹۶ء کے مرکزی بجٹ میں آب رسانی پانی کی فراہمی، صفائی اور گندے پانی کے نکاس کے لیے بھی سہولتیں دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ پسماندہ خطوں کے لیے مزید پانچ سال کے لیے ۲۵ فی صد آمدنی کی تخفیف کی اجازت ہوگی۔ اس طرح کی کمپنیوں کو کم سے کم متبادل ٹیکس سے چھوٹ دے دی گئی ہے۔ ایسے اداروں کے لیے جو بنیادی سہولتوں کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں، ان کو جو بھی منافع، سود یا طویل مدتی سرمایہ کے فائدے ہوں گے، وہ انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

۹۷-۱۹۹۶ء کے بجٹ کی روشنی میں بنیادی سہولتوں کے فروغ سے متعلق مالیاتی کارپوریشن قائم کی جارہی ہے جس کا مجاز سرمایہ ۵ ہزار کروڑ روپے ہوگا۔ یہ کارپوریشن براہ راست قرض دے گی اور دوبارہ سرمایہ کاری کے ادارے کی صورت میں کام کرے گی اور مالیاتی گارنٹی کے ادارے کی صورت میں بھی ذمہ داری نبھائے گی۔

کوئی فنڈ اگر بنیادی سہولتوں کے لیے لگایا جائے تو اس سے ہونے والی آمدنی پر آمدنی ٹیکس نہیں ہوگا۔ بنیادی سہولتوں کے لیے منصوبہ جاتی مصارف بڑھا دیے گئے ہیں۔ اس مد میں سرمایہ کاری بڑھانے کے لیے تمام درآمدات پر ۲ فی صد کی خصوصی کسٹم ڈیوٹی لگانے کی تجویز ہے۔ البتہ اس ڈیوٹی سے ایسی اشیا محفوظ ہوں گی جن پر کوئی ڈیوٹی نہیں ہے یا جو بغیر کسٹم ڈیوٹی کے برآمدات کا سامان تیار کرنے کی غرض سے برآمد کی جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہندوستان کو بنیادی سہولتوں کے فروغ کے لیے زیادہ صراحت شدہ پالیسی درکار ہے، اس طرح غیر ملکی سرمایہ کاری کے رول کے سلسلے میں بھی واضح پالیسی کی ضرورت ہے، جیسا کہ چند ماہرین اقتصادیات کا مشورہ ہے۔ اس سلسلے میں مرکز اور ریاستوں میں پالیسی کی تشکیل کے لیے تال میل ہونا ضروری ہے۔ وسائل کو فراہم کرنے کے لیے نت نئے طریقوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس طرح کا ایک ذریعہ سرمایہ منڈی ہے جسے سرمایہ کاری کرنے والے بینک اس وسیلے کو بڑی گہری نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک دوسرا ذریعہ قرضہ منڈی ہے جس سے فاضل امداد حاصل کی جاسکتی ہے۔ مالی ماہرین نے سرمایہ منڈی کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اطلاعات مظہر ہیں کہ بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں معاون بڑے پیمانے کے پروجیکٹوں کے لیے مالیات کی فراہمی میں اس ذریعے کو مستحکم کیا جارہا ہے۔ جہاں تک قرضہ منڈی کا تعلق ہے، ان ماہروں نے مشورہ دیا ہے کہ قرضہ دستاویزات کی میعاد ۵ سال سے بڑھا کر ۱۰ سال تک کر دی جائے ------۔ اس میں ایسی گنجائش بھی ہو کہ ۵ سال سے ۱۰ سال اور اس کے بعد ۲۰ سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک جاری رکھا جاسکے اور ان سے بنیادی معاشی ڈھانچے کے استحکام والے پروجیکٹوں کو آگے بڑھایا جاسکے اس کے علاوہ صنعتوں کو درپیش دیگر دشواریوں کا بھی مطالعہ کیا جانا چاہیے تاکہ ان دشواریوں کو دور کیا جاسکے۔ اس طرح کے اقدامات میں وسائل کا محتاط استعمال بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

ایس. دھرماراجن

سطح ٹرانسپورٹ

مڑ کر دیکھا جائے تو پتا چلے گا کہ سطح ٹرانسپورٹ کو ترقی دینے کے لیے آزاد ہندوستان میں بہت کچھ کیا گیا ہے۔ اور ملک کی خوشحالی کا اہم وسیلہ مانے گئے اسے زیادہ سے زیادہ ترقی دی گئی مگر مصنف کا کہنا ہے کہ اس اہم زمرے میں بہت کچھ کرنا اب بھی باقی رہ گیا ہے۔

مسلسل اور متواتر معاشی نمو کے لیے بنیادی ڈھانچے کا ایک کلیدی جزو سطح ٹرانسپورٹ ہے۔ ایک زیادہ منظم اور مربوط نظام ملک کو مقابلاتی سبقت دلانے کے لیے سطح ٹرانسپورٹ کا بہتر استعمال آسان بناتا ہے۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ زمین کی سطح پر اور پانی کی سطح پر ٹرانسپورٹ کے نظام کو ترقی دینے کا کام اس ٹرانسپورٹ کی اثر انگیزی کو انتہا پر پہنچانے کی غرض سے کیا جاتا رہا ہے لیکن ہندوستان جیسے بڑے ملک میں، جو کہ اپنے رقبہ کے اعتبار سے ایک برّ اعظم کا درجہ رکھتا ہے، سطح ٹرانسپورٹ کو انتہائی موثر بنانے کا کام انجام دینے کے لیے بہت کچھ کرنا اب بھی باقی ہے۔

لیکن اگر گزشتہ ۵۰ برس سے جاری کوششوں پر ایک نظر مڑ کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دیے گئے ہیں وہ چھوٹے موٹے نہیں ہیں۔ ۲۰ لاکھ کلومیٹر کے رقبے میں پھیلی ہوئی سڑکوں کا جال اس وقت دنیا میں سڑکوں کا تیسرا بڑا جال ہے۔ اسی طرح جہازوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور آج ۴۸۰ جہاز سمندر اور ندیوں کے سینے پر تیرتے رہتے ہیں جو کل ملا کر ۷۲ لاکھ ٹن مال اسباب ڈھونے کے اہل ہیں۔ آزاد ہونے کے بعد سے ہندوستان

ے جہاز سازی کے میدان میں کافی ترقی کی ہے اور آج سرکاری زمرے میں جہاز سازی کے چار بڑے اور تین درمیانی درجے کے کارخانے ہیں۔ ہندوستان کی بڑی بندرگاہوں کی تعداد گیارہ ہے، جن میں زیادہ سے زیادہ ۱۷ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن سامان لادا اتارا جا سکتا ہے مگر اس کے برعکس ۹۶-۱۹۹۵ء کے درمیان ان بندرگاہوں کے ذریعہ ۲۱ کروڑ ۵ لاکھ ٹن سامان یہاں درآمد کیا گیا یا برآمد۔

ضابطے نرم کرنے کا اثر

ان برسوں کے دوران قومی معیشت کے نمو نے ان تمام شعبوں میں لمبی جست لگائی ہے۔ جب سے اقتصادی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جہاز رانی پالیسی میں پھر سے نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے، جہازوں کی خریداری کے ضابطے نرم کر دیے گئے ہیں، بڑی بندرگاہوں پر مال اسباب اور کنٹینروں کو سنبھالنے کا نیا ریکارڈ بنا ہے۔ بندرگاہوں اور قومی شاہراہوں کی جدت کاری اور ترقی میں پرائیویٹ سیکٹر کی شرکت کی حوصلہ افزائی کے لیے متعدد ترغیبات اور سہولیات دی جا رہی ہیں اور اسی کے ساتھ درونِ ملک آبی گزرگاہوں اور تیز رفتار ٹرانسپورٹ نظام کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

تب اور اب

یہ تمام چیزیں وزارت سطح ٹرانسپورٹ کے ماتحت ہیں۔ جو کہ متعلقہ پالیسیوں اور پروگراموں کے وضع کرنے اور ان پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ گھریلو استعمال اور برآمدات کے لیے اشیاء کی آسان اور تیز رفتار نقل و حرکت اس کی موثر کارکردگی سے راست داخلی تعلق رکھتی ہے۔ کام کی وسعت کا اندازہ پہلے منصوبے کے آغاز میں سڑکوں پر مال ڈھلائی اور موجودہ مال ڈھلائی کا موازنہ کر کے قائم کیا جا سکتا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں سڑکوں پر کم و بیش ۶ ارب ٹن کلومیٹر مال اور ۲۳ ارب پسنجر کلومیٹر مسافر کا گوشوارہ تھا۔ موجودہ اعداد و شمار علی الترتیب ۶۵ ارب ٹن کلومیٹر اور ۱۵۰۰ ارب پسنجر کلومیٹر ہے۔ سڑکیں مسافروں کی آمد و رفت اور مال و اسباب کی ڈھلائی کے لیے ترجیحی وسیلہ ٹرانسپورٹ بن کر ابھرے ہیں اور آنے والے دنوں میں بھی صورت حال میں اس نوع کی بہتری کا امکان ہے۔

سڑکوں کے اس جال کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ قومی شاہراہوں کی لمبائی بڑھ کر ۳۴۰۵۸ کلومیٹر ہو گئی ہے اور ان میں سے بیشتر حصہ گزشتہ ۵۰ برسوں کے دوران تعمیر ہوا ہے اور سڑکوں پر جتنا مال اسباب ڈھویا جاتا ہے یا جتنے لوگ سڑکوں سے

سفر کرتے ہیں ان کا ۴۰ فی صد حصہ قومی شاہراہوں سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اس سے سڑک ٹرانسپورٹ کی بہت تیز اور زیادہ نمو کا اشارہ ملتا ہے چونکہ قومی شاہراہیں سڑکوں کے جال کے دو فی صد سے کم پر ہی مشتمل ہیں اس لیے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے دنوں میں قومی شاہراہوں کی ضرورت کتنی بڑھ جائے گی۔ پہلے پنج سالہ منصوبے سے ہی سڑک ٹرانسپورٹ میں اضافہ کی مانگ کو دھیان میں رکھ کے منصوبہ سازی کی جاتی رہی ہے۔ ان کوششوں میں سڑکوں کا رقبہ، ان کی تعمیر، دیکھ بھال، تعمیر میں استعمال ہونے والی اشیاء دیں۔ سڑکوں کی حالت میں نمایاں تبدیلی، تعمیراتی آلات اور ٹرانسپورٹ گاڑیوں کی جدت کاری، ٹریفک ضابطے، کثیر ماڈل ٹرانسپورٹ، شہری سڑکوں پر گاڑیوں کا اژدہام اور شہری ٹرانسپورٹ کے مسائل کا حل ساری چیزیں یکساں توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ اس کے باوجود ۴۶ سال کے بعد آج نویں پنج سالہ منصوبے کی دہلیز پر یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ سڑکوں اور سڑک ٹرانسپورٹ کی ترقی اقتصادی نمو کے تقاضوں کے ہم قدم نہیں ہے۔

ان کمیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے طے شدہ مقصد کے ساتھ اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور مزید اصلاحات پر غور کیا جا رہا ہے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء کے اقتصادی جائزے میں باضابطہ شروع کی گئی تدبیروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سڑک زمرے کو صنعت قرار دیا گیا ہے تاکہ گاڑیوں کی خریداری کے لیے آسان شرطوں پر قرض لینا آسان ہو جائے اور بونڈ جاری کرنے کی اجازت مل سکے۔ بڑی فرموں کو قومی شاہراہوں کی تعمیر کے سیکٹر میں لگانے کے لیے ایم۔ آر۔ ٹی۔ پی کی گنجائشوں میں نرمی لائی گئی، قومی شاہراہوں، پلوں اور سرنگوں کو استعمال کرنے کی فیس عائد کرنے کے لیے قومی شاہراہ قانون میں ترمیم کی گئی اور تعمیراتی آلات پر کسٹم ڈیوٹی کم کی گئی اور اس کے ساتھ متعلقہ ضابطوں میں نرمی لائی گئی۔ جن اصلاحات پر غور کیا جا رہا ہے ان میں قومی شاہراہوں کی لمبائی میں اضافہ کے لیے تعمیر کے کام میں غیر ملکی سرمایہ کاروں سمیت پرائیویٹ سیکٹر کی شمولیت تعمیر کے بعد ۳۰ سال تک ۔۔۔ چنگی لگا کر اپنی رقم وصول کرنے کے لیے (بی۔ او۔ ٹی) کی بنیاد پر قومی شاہراہوں کی تعمیر۔ اس کے علاوہ مال کا ان ٹریفک میں باضابطگی لائیں گے اور بے روک ٹوک گاڑیوں کی آمد و رفت یقینی بنائیں گے۔ ایکسپریس ویز پر رکاوٹیں نہیں لگائی جائیں گی اور حکام صرف داخل ہونے اور نکلنے کے مقامات پر ہی چیکنگ کا بندوبست کریں گے۔ اراضی کا حصول اور اس پر سے ناجائز قبضہ کا خاتمہ حکومت کا کام ہوگا۔ یہ اصلاحات سڑکوں کے جال کو توسیع دینے کی ضرورت اجاگر کرتی ہیں کیونکہ منصوبہ بندی کے آغاز کے وقت یہ سڑکیں صرف ۴ کلومیٹر تھیں مگر اب ان کے رقبے اور لمبائی میں ۵۰۰ فی صد کا اضافہ ہو چکا ہے۔ سڑک ٹرانسپورٹ میں ۲ سے ۶۵ گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ اندازہ ہے کہ ۸۰ فی صد مسافر سڑکوں کے ذریعہ سفر کرتے ہیں اور ۶ فی صد مال اسباب سڑکوں کے ذریعہ ڈھویا جاتا ہے۔ اب سے صرف ۴ سال کے بعد یعنی کہ ۲۰۰۲ء تک سڑک کے ذریعہ سفر کرنے والے مسافروں کی تعداد میں ۸۷ فی صد اور ڈھوئے جانے والے مال کی مقدار میں ۶۵ فی صد کا اضافہ ہو جائے گا۔

گزشتہ پچاس برسوں کے دوران گاڑیوں کی تعداد بڑھ کر ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ ہو گئی ہے جو کہ ۹ فی صد اضافہ ہے۔ ہندوستانی لائسنس کے تحت بننے والی بین اقوامی برانڈ کی کاروں سے سڑکوں کے بھر جانے کا اندیشہ ہے۔

مزید قومی شاہراہوں کی ضرورت

سڑک کے نظام کا بنیادی جال قومی شاہراہوں پر مشتمل ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے ایک حالیہ مطالعہ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کو قومی شاہراہوں کے جال میں مزید دس ہزار کلومیٹر کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں سڑکوں کی اہلیت بڑھانی ہے تو کافی فٹ پاتھ بھی ضروری ہوں گے۔ گاڑی چلانے کا معیار بھی بلند کرنا ہوگا، پُل بھی مستحکم کرنے ہوں گے۔ ریلوے کے زیادہ لیول کراسنگ بنانے پڑیں گے۔ سڑک کے کنارے کی سہولتیں بھی بڑھانی ہوں گی اس کے علاوہ حفاظتی تدبیریں اور سخت کرنی ہوں گی۔ اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مطلوبہ مقاصد کی تکمیل پر ۵۲۰۰۰ کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ یہ رقم خطیر سہی مگر یہ خرچ کرنی ہوگی کیونکہ سڑکوں کی خراب حالت کی وجہ سے ملک کو ہر سال جو ۱۵۰۰۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوتا ہے اس سے بچنے کی یہی صورت ہے۔ یہ نقصان ایندھن کے غیر ضروری فاضل خرچ کی صورت میں بھی ہوتا ہے اور گاڑیوں کو چلانے کی لاگت میں اضافے کی شکل میں بھی۔ یہاں ایک نیا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایسی ایک نمو ہے جو اقتصادی سرگرمیوں میں اضافے کی وجہ سے ٹریفک میں اضافہ کا سبب بن سکتی ہے اس لیے نیشنل ہائی وے اتھارٹی آف انڈیا قائم کی گئی ہے جس کا ایک کل وقتی چیئرمین بنایا گیا ہے اور تین اراکین رکھے گئے ہیں۔ اس چار رکنی کمیٹی کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے مختلف شعبوں میں مہارت رکھنے والے سینئر اور تکنیکی افسروں کی بھی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ سڑکوں کے جال کی بہت زیادہ مانگ کے پیش نظر پرائیویٹ سیکٹر سے بھی تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اہم بندرگاہیں

بندرگاہوں سے بھی معیشت کے تقاضے بہت بڑھ گئے ہیں۔ بندرگاہوں میں درآمد یا برآمد ہونے والے مال اسباب میں ہر سال ۶،۷ فی صد سے دس فی صد تک کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کنٹینروں کی تعداد میں اضافہ حالیہ برسوں کے دوران کم ہو رہا تھا مگر ۹۵-۱۹۹۴ء اور ۹۶-۱۹۹۵ء میں سب سے زیادہ فی صد اضافہ اسی میں ہوا۔ اس مثالی نمو میں کلکتہ، کوچین اور ممبئی بندرگاہوں کا خاصا اہم حصہ ہے۔ تمام بڑی بندرگاہوں میں کل ملا کر ۱۴ لاکھ کنٹینر سنبھالے گئے۔

مالی سال ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران گیارہ بندرگاہیں اہم تھیں جن میں مشرقی ساحل پر کلکتہ، پارادیپ، وشاکھاپٹنم، چینئی اور توتی کورن اور مغربی ساحل پر کوچین، نیو منگلور، مورماگوا، ممبئی اور کنڈلا ہیں۔ اہم بندرگاہوں کی ترقی آئین کے اعتبار سے مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

حالیہ برسوں میں بندرگاہوں کی تعمیر میں جو سرمایہ لگایا گیا ہے اس کا بڑا حصہ کنٹینروں کو اور اسی طرح زیادہ بڑے سامان کو لادنے اتارنے کی سہولتوں پر لگایا گیا ہے۔

اقتصادی اصلاحات کے پیش نظر حکومت نے بلڈنگ آپریشن اور کنٹینر ٹرمنل کی دیکھ بھال، اسٹوریج اور گودام، پائلٹ خدمات، ڈریجنگ آپریشن اور پورٹ کرافٹ کے علاوہ بھی دیگر آلات کی دیکھ بھال کے کام میں پرائیویٹ سیکٹر کی شمولیت کی اجازت دے دی ہے۔ کلکتہ میں دو خشک گودیوں کی نجکاری کر دی گئی ہے۔ دو برتھ پٹے پر دینے کے معاملے پر حکومت سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ دیگر بندرگاہوں میں بھی نجکاری کی تجویز زیر غور ہے۔ اہلیت کی کمی پر قابو پانے کے لیے بجلی کے علاوہ بندرگاہیں اور شاہراہیں وہ اہم شعبے ہیں جن میں پرائیویٹ سرمایہ کاری مانگی جا رہی ہے۔ بڑی بندرگاہوں میں منصوبوں کی لمبی فہرست تیار کی گئی ہے، جس پر عمل کیا جائے تو ۲۔ ارب امریکی ڈالر کا خرچ آئے گا، جہاں پرائیویٹ سیکٹر کی سرمایہ کاری قابل عمل ہے۔ اس کے علاوہ جو ریاستیں خلیج بنگال کے کنارے واقع ہیں انھوں نے بھی ایسے منصوبے وضع کیے ہیں جن پر عمل کے لیے ایک ارب امریکی ڈالر خرچ کرنا ہوگا۔

چوں کہ نمو میں مرکزی حیثیت بنیادی ڈھانچے کی خدمات کی ہے اس لیے حکومت اس سیکٹر میں پرائیویٹ سرمایہ کاری خاطر خواہ بڑھانے کی کوشش میں ہے۔ حال ہی میں "ڈسٹی نیشن انڈیا" کانفرنس میں بین اقوامی تجارتی لیڈروں سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم مسٹر ایچ ڈی دیوے گوڑا نے کہا ہے کہ "ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اقتصادی نمو کو برقرار رکھنے کے لیے بنیادی ڈھانچے کو ترقی دینا کتنا اہم ہے۔ حکومت غیر ملکی اور کثیر قومی کمپنیوں کے ذریعہ سرمایہ کاری کے لیے اسے انتہائی ترجیحی علاقہ تصور کرتی ہے۔ ان شعبوں میں گھریلو اور غیر ملکی دونوں طرح کی سرمایہ کاری کو راغب کرنے کے لیے ہم نے پالیسی کے مطابق تدبیریں اور پروگرام شروع کیے ہیں۔ بنیادی ڈھانچے کے منصوبوں کے لیے ٹیکس میں چھوٹ اور دیگر مالی ترغیبات بھی دی جا رہی ہیں۔ ان سیکٹروں میں گزشتہ چند برسوں کے دوران ہمیں کچھ تجربے بھی ہوئے ہیں اور ہم اس ضرورت سے آگاہ ہیں کہ ان ضابطوں میں مزید سادگی لانی ہوگی اور معاملات کو زیادہ واضح اور صاف شفاف بنانا ہوگا۔ ہم لوگ اس نظام کو بہتر بنانے کے لیے کسی بھی مشورے کو آزمانے کے لیے تیار ہیں۔

جہاز رانی

وزارت سطح ٹرانسپورٹ کے ماتحت دیگر شعبوں میں جہاز رانی، جہاز سازی اور درونِ ملک آبی ٹرانسپورٹ کے شعبے شامل ہیں جن میں آزادی کے گزشتہ ۵۰ برسوں کے دوران نمو کی وجہ سے خاصی وسعتیں لائی گئی ہیں۔ جہاز رانی کی صنعت میں نمو آسان بنانے کے لیے کئی ضابطوں کو نرم کرنے کی تدبیریں اپنائی گئی ہیں۔ جہاز رانی سے متعلق منصوبہ بندی کمیشن کے تشکیل کردہ ایک ورکنگ گروپ نے بھی سفارش کی ہے کہ نویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ۵۰ کروڑ روپیہ کے سرمایہ کاری سے فاضل ۷، ۳ لاکھ جی۔ آر۔ ٹی حاصل کی جائے کہ جی۔ آر۔ ٹی کی مجموعی دستیابی ۹۰ لاکھ سے زائد ہو سکے۔ جہاز رانی کی صنعت سے جہاز سازی اور مرمت کی صنعت وابستہ ہے۔ گزشتہ ۵۰ برسوں کے دوران سرکاری زمرے میں چار بڑے اور تین درمیانہ درجے کے جہاز سازی کے کارخانے کھولے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ سرکاری زمرے میں پہلے کبھی ایسے کارخانے تھے ہی نہیں۔

وشاکھاپٹنم میں ہندوستان شپ یارڈ لمیٹڈ اور کوچین شپ یارڈ میں علی الترتیب ۵۰۰۰۰ ڈی ڈبلیو ٹی اور ۸۶۰۰۰ ڈی ڈبلیو ٹی کے جہاز بنائے جا سکتے ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر (نجی زمرے) میں جہاز بنانے کے کارخانوں کی تعداد کسی بھی طرح ۳۵ سے کم نہیں ہے۔ جہاز رانی کی صنعت کو اب لائسنس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ نجی زمرے کو جہاز بنانے کی کھلی چھوٹ ہے۔ چاہے جتنے بڑے جہاز بنانے ہوں پرائیویٹ سیکٹر کے کارخانے بنا سکتے ہیں۔ صرف جنگی جہاز بنانے کی ممانعت ہے۔ ماہی گیری کے لیے استعمال ہونے والی کشتیوں سمیت موٹر سے چلنے والے ۱۰۰۰۰ ڈی ڈبلیو ٹی تک کے جہاز اور جہاز سازی میں استعمال ہونے والے کل پرزوں کا کارخانہ لگانے کے لیے اگر ۵۱ فی صد اپنا سرمایہ لگا کے کسی غیر ملکی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کیا جائے تو اس طرح کے منصوبوں کو از خود منظوری حاصل ہو جاتی ہے۔

برسوں سے ملک میں جہاز کی مرمت کی سہولتیں بہت محدود رہی ہیں۔ جہازوں کی مرمت ملک کے باہر کرانی پڑتی تھی جس کی وجہ سے ڈھیر سارا زرمبادلہ باہر چلا جاتا تھا مگر اب بہت جلد حالات بدل جائیں گے۔ بندرگاہوں کو حکومت نے مشورہ دیا ہے کہ وہ جہازوں کی مرمت کا کام شروع کرنے کے خواہش مند پرائیویٹ صنعت کاروں کو اس کام کے لیے اراضی دستیاب کرائیں اور اس کا خاص لحاظ رکھیں کہ وہ اراضی دریا کے یا سمندر کے کنارے کی ہو تاکہ جہازوں کو کارخانے میں لانا اور مرمت کے بعد پانی میں اتارنا ممکن ہو سکے۔

درونِ ملک آبی ٹرانسپورٹ بھی اسی وزارت سطح ٹرانسپورٹ کی ذمہ داری ہے۔ یہ ماحولیاتی کثافت سے پاک اور کم خرچ والا وسیلہ ٹرانسپورٹ ہے اور اس کے ذریعہ نقل و حمل کو فروغ دینے پر وزارت سطح ٹرانسپورٹ خاصا زور دے رہی ہے۔ اس وقت تین قومی آبی گزرگاہیں زیر استعمال ہیں (گنگا ہگلی دریائی نظام پر) الٰہ آباد اور ہلدیہ کے درمیان (برہم پتر پر) سعدیہ اور ڈھبری کے درمیان اور (کیرالا میں) کولام کوٹم پورم کے درمیان۔ اب آندھرا پردیش میں دریائے گوداوری پر چیرالہ سے راجہ منڈری تک اور گوا میں کومبر جوئے نہر اور زوبری اور منڈووی ندیوں پر اور ساگر سے سندر بن میں بنگلہ دیش کی سرحد تک قومی آبی گزرگاہیں قرار داد دینے کی تجویز کو آخری شکل دی جا رہی ہے۔

مختصراً یہ کہ سطح ٹرانسپورٹ کے کلیدی بنیادی ڈھانچہ سیکٹر میں پرائیویٹ سرمایہ کاری کے لیے ضابطوں کو زیر عمل لایا جا رہا ہے۔ یہ کام فی الحال جاری اقتصادی اصلاحات کے تحت ہو رہا ہے۔ بنیادی ڈھانچے کی ترقی کو ہندوستان

باقی صفحہ ۳۶ پر

ڈاکٹر بی. این سہائے

آدی باسیوں کی بہبود کے لیے طرزِ عمل

مصنف کا کہنا ہے کہ اگرچہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد سے اب تک آدی باسیوں کی فلاح وبہبود اوران کی ترقی کے لیے مسلسل کوششیں کی جاتی رہی ہیں مگران کے نتائج ایسے نہیں نکلے رہے ہیں جو اس کام میں لگائے گئے فنڈ اور اس سلسلے میں کی گئی مساعی کے حوالے سے اطمینان بخش کہے جاسکیں۔ آدی باسیوں کی فلاح کے لیے وضع کی گئی اسکیموں پر کامیاب عمل درآمد کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد اس معاملے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے طریقۂ کار پر رکھی جائے۔

آزاد ہندوستان میں آدی باسیو ں کی بہبود سے متعلق طریقۂ کار پر تبادلۂ خیال سے قبل کیوں نہ آزادی سے پہلے آدی باسیوں کے حالات کی جھلکیاں دیکھ لی جائیں۔

آزادی سے قبل آدی باسیوں کی فلاح وبہبود

ہندوستان کے آدی باسی عوام صدیوں سے دوسروں سے الگ تھلگ ہو کے روایتی انداز سے زندگی گزارتے آئے ہیں۔ جن علاقوں میں وہ آباد ہیں، ان پورے علاقوں میں ان کی بود و باش کہیں کہیں تھوڑی سی ہے اور انھوں نے صدیوں میں امن و قانون برقرار رکھنے کا اپنا نظام وضع کیا ہے۔ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کی بہت قدیم روش کی وجہ سے ان لوگوں کو بہت سارے مسئلوں کا سامنا رہا اور آزادی سے قبل ان مسئلوں کا حل نکالنے کی جو کوشش بھی ہو ئی وہ انفرادی اور مقامی سطح پر ہو ئی۔

برطانوی حکمرانوں نے آدی باسیوں کو الگ تھلگ رکھنے کی جو پالیسیاں اپنائی تھی، اس کی بنیاد کئی مصلحتوں پر تھی۔ انھوں نے آدی باسیوں کو ترقی کی شاہراہ پر لگانے کی کوشش اس لیے بھی نہیں کی کہ ان علاقوں کا انتظام اچھی طرح چلانے کے لیے وہاں امن اور قانون برقرار رہے۔ غیر آدی باسی زمین داروں کے خلاف پہڑیا آدی باسی قبیلہ کی بغاوت کے بعد راج محل پہاڑیوں میں (واضح رہے کہ یہ علاقہ تھوڑا سا بہار میں پڑتا ہے اور تھوڑا سا مغربی بنگال میں) "بالواسطہ حکمرانی" کی پالیسی اپنائی گئی پہڑیا آدی باسیوں کو پہلے مسلح تصادم کے ذریعہ قابو میں کیا گیا اور اس کے فوراً بعد اس وقت کے کلکٹر آگسٹس کلیولینڈ نے مذکورہ بالا پالیسی اپنا کے دیہی اور علاقائی سرداروں پر قابو پالیا۔ ان سرداروں کو حکومت نے وظیفے منظور کیے اور ان کو لگان وصول کرنے کے کام پر لگا دیا۔ ان لوگوں کو تھوڑے سے بہت انتظامی اور عدالتی اختیارات بھی دیے گئے۔ یہ پالیسی ملک کے کئی خطوں میں اپنائی گئی۔ اس طرح حکومت وقت نے کسی فلاحی یا ترقیاتی پروگرام کے ذریعہ انھیں دوسروں کے برابر لانے کی عملاً کوئی کوشش نہیں کی۔ برطانوی حکومت کا واحد مقصد یہ تھا کہ جب تک آدی باسی کسی قسم کی شورش کا سبب نہ بنیں انھیں نہ چھیڑا جائے اور اپنے طور پر زندگی بسر کرنے کی چھوٹ دے دی جائے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی جو حالت ہے وہی برقرار رہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آسکے۔

لیکن قومی لیڈروں کو آدی باسیوں کی پسماندگی سے واقفیت تھی اور وہ ان کی فلاح کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۹۵ء کی گنجائشوں کے مطابق کانگریس کی وزارتیں تشکیل ہوئیں اور بہار، اڑیسہ، ممبئی اور مدراس صوبوں کی حکومتوں نے آدی باسیوں کی حالت کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لیے کمیٹیاں تشکیل کردیں۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے سبب ابھر کر سامنے آنے والی نئی ترجیحات حکمرانوں کی پالیسی اور بعد ازاں وزارتوں کے استعفیٰ کی وجہ سے آدی باسیوں کے حالات کی تفصیل اکٹھا کرنے کا کام تسلی بخش طور پر پورا نہیں ہو سکا۔

آزادی سے قبل کے دنوں میں ان گنت سماجی خدمت گاروں اور رضاکار تنظیموں نے انفرادی اور مقامی سطح پر آدی باسیوں کی حالت سدھارنے کی کوشش ضرور کیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر اگلی سطروں میں کیا جا رہا ہے۔

(۱) عیسائی مشنریوں نے صحت اور تعلیم سے

متعلق دو اہم پروگراموں کے ذریعہ آدی باسیوں کی ترقی اور بہبود کے لیے بہت سارا کام کیا۔ اگرچہ اس طرح کی کوششیں ملک کے گوشے گوشے میں کی جا رہی تھیں مگر آسام، بہار اور مدھیہ پردیش کی ریاستوں میں یہ کوششیں سب سے زیادہ کامیاب رہیں۔ سماجی فلاح کے کاموں کے لیے عیسائی مشنریوں کا جوش و خروش اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے علاوہ ان کے طرز فکر اور طریقۂ کار دونوں میں انسان دوستی کا ہی جذبہ غالب تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے آدی باسیوں کو تبدیل مذہب کر کے عیسائی بنانے کی کوشش بھی کی۔

(۲) مہاتما گاندھی نے آدی باسیوں کی فلاح و بہبود کو خاطر خواہ اہمیت دی اور اسے اپنے تعمیری پروگرام میں ایک آئٹم کے طور پر شامل کیا۔

(۳) ایک نمایاں سماجی خدمت گار اے۔ وی۔ ٹھکر اور ہندوستانی معاشرے کے کئی دوسرے خدمت گاروں نے آدی باسیوں کی فلاح و بہبود کے لیے اہم کام کیے۔

(۴) ایس۔ سی۔ رائے نامی ایک وکیل نے آدی باسیوں کو اپنے حقوق کی محافظت میں مدد پہنچائی۔ انھوں نے بہار کے آدی باسی قبائل کے بارے میں بہت سی کتابیں چھپوائیں اور آدی باسی زندگی کے رسوم و رواج کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

(۵) وی۔ ایلون نے (جو پہلے ایک مشنری تھے اور آگے چل کر ماہر علوم بشریات ہوئے) اور ان کی طرح کے بعض دوسرے ماہرین نے آدی باسیوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں مقدور بھر حصہ لیا۔ ایلون نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۵ء تک مختلف قبائلوں کے درمیان رہ کر خاص کر مدھیہ پردیش میں آدی باسیوں کی حالت سدھارنے کا اہم کام کیا۔ ان کی کوششوں میں آدی باسیوں کی فلاح و بہبود کے علاوہ ان کے معاملات کی تحقیق شامل تھی۔ انھوں نے مدھیہ پردیش کے کرنجیا، سنہروچھ پور اور بنتان گڑھ میں کالونیاں قائم کیں اور فلاحی کام شروع کیے جیسے کہ لاعلاج بیماریوں کا علاج، خواندگی، زراعت اور پولٹری فارمنگ اس کے ساتھ انھوں نے آدی باسیوں کے مختلف قبائل کا تفصیلی مطالعہ کیا۔

آدی باسیوں کے علاقوں میں بہت دن تک اپنے سرگرم رہنے اور آدی باسیوں کی زندگی اور ثقافت کی بہتر فہم کی بنیاد پر انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آدی باسیوں کی فلاح اور ترقی کا کام اسی صورت میں کامیابی سے تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ان کی اصل برقرار رکھی جائے۔ ایلون کی اس پالیسی پر سیاسی لیڈروں، سماجی کارکنوں گھُرئیے نامی ایک ماہر سماجیات سمیت ماہرین نے تنقید کی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ آدی باسیوں کو ہندوستانی معاشرے کے اصل دھارے میں مکمل طور پر شامل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس پالیسی کی وکالت کرتے وقت انھوں نے بے ضابطہ اور غیر منصوبہ بند ثقافتی رابطہ کے منفی اثرات کے بارے میں نہیں سوچا۔ انھوں نے اس سچائی کو بھی نظر انداز کر دیا کہ آدی باسیوں کے کلچر میں کئی خوش کن اور کارآمد پہلو ہیں اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ اس لیے ایلون اور دیگر ماہرین کو "الگ تھلگ رکھے جانے کے حامی احیا پسند" اور "تبدیلی کے دشمن" وغیرہ کہا گیا۔ تاہم بعد کے برسوں میں ان کی ذکاوت اور ان کے خلوص کا اعتراف کیا گیا۔ ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایلون کی پالیسی کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اسی وقت اس کی حمایت بھی کی جب انھوں نے آدی باسیوں کے تئیں اپنائے جانے والے طریق عمل کا بنیادی خاکہ پیش کیا۔ اس پالیسی میں . . . . میں محدود اور منصوبہ بند ہم آہنگی کی اہمیت پر تو زور دیا گیا مگر اس کے ساتھ اس پر بھی زور دیا گیا کہ کارآمد اور روایتی اداروں روایات اور رسوم کی حفاظت ضروری ہے۔

آزادی کے بعد کے دور میں آدی باسیوں کی فلاح کے لیے طریقۂ کار

آدی باسی عوام کی پسماندگی کی وجہ سے ہند کے آئین میں کئی دفعات میں آدی باسیوں کے مفادات کی حفاظت ان کی ترقی اور بہبود کا ذکر کیا گیا ہے۔

آئینی گنجائشوں کے نتیجے میں آدی باسیوں کی بہبود اور ترقی کے حوالے سے حالات میں بہت تبدیلی آئی ہے۔ دفعات ۴۶، ۲۷۵ اور ۳۳۹ میں خاص کر ان مفادات کے فروغ اور تحفظ پر زور دیا گیا ہے۔ اس مرحلے میں ان دفعات کا تذکرہ ضروری ہے۔

دفعہ ۴۶ میں کہا گیا ہے کہ مملکت عوام کے کمزور طبقات کے تعلیمی اور اقتصادی مفادات پر خصوصی توجہ دے گی اور خاص کر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل پر اور انھیں سماجی بے انصافی اور ہر طرح کے استحصال سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے گی۔

دفعہ ۲۷۵ میں اس کی گنجائش ہے کہ درج فہرست قبائل کی فلاح کے لیے اور ان کے یہاں بہتر انتظامیہ کی فراہمی کے لیے مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کو خصوصی فنڈ دے گی۔

دفعہ ۳۳۹ میں یہ گنجائش ہے کہ آئین پر عمل شروع ہونے کے دس سال کے بعد صدر جمہوریہ ہند درج فہرست علاقوں کی خصوصی انتظامیہ اور درج فہرست قبیلوں کی فلاح سے متعلق ایک رپورٹ طلب کریں گے۔ صدر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دس سال کی مہلت گزرنے سے پہلے ہی ایسی کوئی رپورٹ طلب کر لیں۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ شیڈولڈ کاسٹس کی انتظامیہ کے لیے ریاستوں کو ہدایتیں جاری کرے۔

آئین میں حاصل تحفظات کے نتیجے میں حکومت اور بھارتیہ آدم جاتی گرام ادیوگ سنگھ، آدم جاتی سیوا منڈل، رام کرشنا مشن، ماتا شنکر مشن اور چند دوسروں سمیت غیر حکومتی تنظیموں نے متعدد فلاحی اور ترقیاتی پروگرام شروع کیے ہیں۔

آدی باسیوں کی آبادی

(۱۹۹۱) میں ہندوستان میں آدی باسیوں کی آبادی لگ بھگ ۶۸ ملین تھی جو ملک کی مجموعی آبادی کے ۸ ر ۸ فی صد کے برابر تھی۔ بعض ریاستوں / مرکز کے تحویل کے خطوں میں آدی باسی باشندوں کی تعداد اس سے زیادہ بھی ہے جیسے کہ میزورم میں ان کی آبادی ۹۵ فی صد ہے، لکشدیپ میں ۹۳ فی صد، دادر نگر حویلی میں ۷۹ فی صد اور اروناچل پردیش میں ۶۴ فی صد۔ بعض ریاستوں میں آدی باسیوں کی تعداد خاص ہے جیسے کہ مدھیہ پردیش میں ۲۳ فی صد، اڑیسہ میں ۲۲ فی صد، گجرات میں ۱۵ فی صد، مہاراشٹر میں ۹ فی صد، بہار میں ۸ فی صد آبادی آدی باسیوں پر مشتمل ہے۔ یہ آبادی ۲۵۰ سے زائد قبیلوں (ریاست گیر میزان ۵۷۶) پر مشتمل ہے جس میں گونڈ، بھیل، سنتھال اوراوں، مینا، منڈا وغیرہ کی آبادی زیادہ ہے ان لوگوں میں خواندگی کی شرح کم و بیش ۳۰ فی صد ہے اور ان میں ۱۸ فی صد خواتین خواندہ ہیں۔ اس پوری آدی باسی آبادی کا ایک ثقافتی پس منظر ہے دوسری ذاتوں سے مختلف ان کی اپنی ماحولیات، اپنی معیشت، اپنا مذہب، اپنی زبان، اپنا سماجی و سیاسی نظام اور فعل ہے۔

اس کے علاوہ آدی باسی قبائل میں علاقائی شاخیں بھی ہیں اور ان شاخوں میں کچھ ایک دوسرے سے کئی چیزیں جدا بھی ہیں۔ اسی طرح بہت سارے لسانی اور نسلی گروپ سے تعلق رکھنے والے ان آدی باسیوں میں سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ترقی کی سطحیں مختلف ہیں۔ یہ آدی باسی ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض خاص خطوں یا حصوں میں ان کی آبادی گنجان بھی ہے۔ بیشتر آدی باسی انتہائی دور افتادہ پہاڑی اور جنگلاتی علاقوں میں رہتے ہیں اور ٹکنالوجی کی ترقی کے معاملے میں بہت پیچھے ہیں۔

چوں کہ ان میں سے کچھ لوگ اقتصادی لحاظ سے پسماندہ، افلاس زدہ، آدھا پیٹ کھائے، آدھا تن ڈھانپے اور ناخواندہ ہیں اور ان کے متعدد پیچیدہ مسائل ہیں اس لیے حکومت ان کی طرف توجہ دیتی ہے۔ ان لوگوں کو ترقی دلانے اور ہندوستانی زندگی کے اصل دھارے میں دھیرے دھیرے لانے کے لیے کئی مثبت اقدام کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد ان لوگوں کی بہبود اور ترقی کو خاص نشانہ بناکر بھرپور منصوبہ سازی کے ساتھ کوششیں کی گئی ہیں۔ یکے بعد دیگرے بننے والے آٹھ پنج سالہ منصوبوں میں ان لوگوں کی ترقی کے لیے کافی فنڈ منظور / مختص کیا گیا ہے اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران ۴۳ خصوصی کثیر المقاصد آدی باسی بلاک بنائے گئے تھے تو تیسرے پنج سالہ منصوبے میں آدی باسی ترقیاتی بلاک بنائے گئے اور انھیں زیادہ فنڈ اور منصوبہ بند طریقۂ کار دے کر آدی باسیوں کی ترقی کا بند و بست کیا گیا۔ تاہم پانچویں پنج سالہ منصوبے میں آدی باسیوں کی ترقی کے لیے ایک ذیلی منصوبہ بنایا گیا جس میں مرکز سے اور ریاستوں سے بھی خاطر خواہ فنڈ دیا گیا۔ مربوط آدی باسی ترقیاتی پروجیکٹوں (آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ پی) کے ذریعہ منصوبوں پر عمل درآمد میں خاص لچک کی اجازت بھی دی گئی۔ چھٹے، ساتویں اور آٹھویں پنج سالہ منصوبوں میں ذیلی منصوبے کے طریقۂ کار کو استحکام دیا گیا اور پری میٹیو ٹرائبل گروپس کی ترقی کے لیے کئی دوسری تدبیریں بھی کی گئیں۔ ان آٹھوں پنج سالہ منصوبوں کے دوران اگرچہ آدی باسیوں کو ترقی دینے کے لیے سخت کوشش کی گئیں مگر ان کے نتائج اب تک جو سامنے آئے ہیں اس کام میں لگائے گئے فنڈ اور اس سلسلے میں کی گئی کوششوں کے حوالے سے اطمینان بخش نہیں ہیں۔

مختلف مسائل

جیسا کہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ آدی باسی باشندوں کی سماجی و ثقافتی اور اقتصادی ترقی کی سطح مختلف جگہ پر جداگانہ ہے اس لیے یہ ایک الگ مسئلہ بن جاتا ہے، جو آدی باسی اب بھی شکار کرتے اور شکار سے پیٹ پالتے ہیں۔ ان کو پری میٹیو ٹرائبل گروپس کہا جاتا ہے۔ وہ کبھی یہاں کبھی وہاں کاشت کرکے پیٹ پالنے والے قبائل سے مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خانہ بدوش کسان قسم کے آدی باسی کسی جگہ جم کر رہنے والے اور کھیتی باڑی کرانے والے آدی باسیوں سے مختلف ہیں۔ اس لیے ان کے مختلف جغرافیائی پس منظر اور معیشت، تاریخی پس منظر اور ثقافتی ٹائپ کی وجہ سے ان کے مسائل بھی مختلف ہیں اور ان مسئلوں کو حل کرنے کے لیے مختلف قسم کے منصوبے بھی ضروری ہیں۔

آدی باسی قبیلوں کے ان طبقات کی ترقی سے تعلق رکھنے والے مسائل کی خصوصی نوعیت سامنے رکھ کر ہی اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے آدی باسیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ۵ بنیادی اصول وضع کیے تھے۔

۱۔ عوام کو اپنی ہی ذہانت کے خطوط پر بڑھنا چاہیے اور ہمیں ان پر کچھ بھی مسلط کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اپنے روایتی آرٹ اور کلچر کو فروغ دینے میں ان کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کریں۔

۲۔ زمینوں اور جنگلات میں آدی باسیوں کے حقوق کا احترام کیا جائے۔

۳۔ ان علاقوں میں انتظامیہ اور ترقی کا کام کرنے کے لیے مقامی آدی باسیوں میں سے ہی کچھ لوگوں پر مشتمل ایک ٹیم بنا دی جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طرح کے کام کے لیے باہر سے بعض تکنیکی ماہرین کو لانے کی ضرورت ہوگی، خاص کر شروعات میں، مگر آدی باسیوں کے علاقوں میں باہر سے بہت سارے لوگوں کو بھیجنے سے ہمیں بچنا چاہیے۔

۴۔ ہمیں چاہیے کہ ان علاقوں میں انتظامیہ کو ضرورت سے زیادہ گنجان اور سرگرم بنانے سے گریز کریں اور بہت زیادہ اسکیمیں شروع نہ کریں بلکہ آدی باسیوں کے سماجی اور ثقافتی اداروں کے توسط سے اور ان کی مخالفت کیے بغیر سارے کام انجام دینے کی کوشش کریں۔

آدی باسیوں کی زندگی اور ثقافت کو سمجھنے کی کوشش

اس صورت حال میں آدی باسیوں کی زندگی اور ثقافت کو سمجھنا اور ان کی ترقی کے لیے خاص قسم کا طریقہ کار اپنانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل پہلوؤں کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔

۱۔ آدی باسیوں کی ترقی کے پروگرام کا مقصد آدی باسی عوام کی مجموعی ترقی ہے اور آدی باسی عوام کی زندگیوں میں منصوبہ بند، دیدہ و دانستہ اور بیدار معاشی تبدیلی لانے کا یہ عمل ہے۔ اس لیے ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ ہم جن آدی باسی عوام میں ترقی لانے کا یہ کام انجام دینا ہے، ان کے موجودہ طرز حیات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ کام قبیلوں کے موجودہ حالات سے واقف ہو کر اور ان کے سماجی، سیاسی اور مذہبی اعتقادات اقدار اور ان کی مادی ثقافت کا منصوبہ بند طور سے ذاتی مشاہدہ بھی کریں۔

۲۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم سماجی تبدیلی کے تازہ ترین تھیوریوں سے بھی آگاہ رہیں جن میں سے ضابطہ ثقافتی رابطہ کی صورت حال کے عملی پہلو سے متعلق تھیوریاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی تبدیلی کی صورت حال سے تعلق رکھنے والے تین بڑے اقدام پر بھی ہماری توجہ رہے۔

(الف) اختراع (ب) اختراع پر ردّ عمل۔ منفی یا مثبت اور (ج) ردّ عمل مثبت ہونے کی صورت میں اختراع کو سماجی و ثقافتی زندگی کا حصہ بنانے کی کوشش۔ ایسا کیا جائے تو ہمیں ترقی کا جائزہ لینے کی مہلت مل جائے گی جس سے ہم یہ موسوم کرسکیں گے کہ ہم درست راستے پر چل رہے ہیں اور کیا عوام میں تیسرے مرحلے میں آنے کا رجحان پنپ رہا ہے۔

۳۔ اس کا علم کہ معاشی تبدیلیاں اکثر و بیشتر سماجی تبدیلیوں سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہیں، ہمیں مایوسی اور جھلاہٹ سے محفوظ رکھنے میں معاون ہوگا۔ اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ آخر کار آگے چل کر اقتصادی اور سماجی دونوں قسم کی تبدیلیوں کو ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ اگر چہ سماجی تبدیلیاں سست رفتار اور ناقابل پیمائش ہوتی ہیں مگر اقتصادی تبدیلیوں سے ان کا بڑا قریبی تعلق ہوتا ہے۔

۴۔ اس کا احساس کہ ہمیں عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے اور نئے خیالات کو پیش کرنے یا رواج دینے میں ہوشیار رہنا چاہیے، ہمیں ثقافتی شدت پسندوں کے ساتھ ٹکراؤ سے بچائے رکھنے میں معاون ہوسکتا ہے۔

آدی باسیوں کی ترقی کے لیے پروگراموں کو کامیاب بنانے اور ان کے بہتر نتائج حاصل کرنے میں آدی باسیوں، مختلف گروپوں کے درمیان ان کے آپسی تعلقات، ان کے نقطہ نظر، ان کی ضرورتوں، ان کے ارادوں، اعتقادات، ریت ورواج، اصولوں اور ضابطوں کی سمجھ اور نئے خیالات کو ان کے موجودہ اور قدیمی آدرشوں، قدروں، اداروں اور تجربوں سے جوڑنے کی کوشش بہت ضروری ہے۔

۵۔ چوں کہ کوئی نیا خیال زندگی کے کئی شعبوں/پہلوؤں پر اثر انداز ہوسکتا ہے اس لیے ذہن میں مجموعی طور پر پورے معاشرے کی تصویر رکھنی چاہیے۔ اس کے علاوہ پہلے سے اس کا اندازہ قائم کر لینا ضروری ہے کہ کیا کسی نئے خیال کے رواج سے سماجی و معاشی تعلقات اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ اندازہ ہو کہ جو اثر بھی پڑے گا اس کے مثبت ہونے کا امکان نہیں ہے تو اس نئے خیال کو پیش کرنے سے گریز کر لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس میں ضروری تبدیلی کر کے اس نئے خیال کو رواج دیا جائے۔

۶۔ ہمیں آدی باسیوں کے درمیان ثقافت کے معاملے میں کٹر افراد کی طرف سے ہوشیار ہونا چاہیے۔ عوام کا مکمل اعتماد حاصل کر لینے کے بعد ہی شدت پسندوں کو چھوا جاسکتا ہے۔ یہ کام بہت دھیرے دھیرے، قدم بہ قدم اور نتائج کا باضابطہ مظاہرہ کر کے کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ وہ رویہ جس سے کوئی (بڑا بھائی نہیں) اچھا دوست بن سکتا ہے، پروگرام شروع کرتے وقت اپنایا جائے تو بہت کارآمد ہوسکتا ہے۔ جن لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی بہبود کا کام کرنا مقصود ہوتا ہے، اس میں ذاتی طور پر اور فطری لحاظ سے شامل ہونا بھی اس برادری میں قابلِ قبول ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

۸۔ یہ بات ہمیشہ یاد رہے کہ سماجی تبدیلی کا عمل مقابلتاً سست رفتار ہے۔ بہت کم وقت میں بہت کچھ کی توقع کی جائے تو اس سے بھی مایوسی اور جھلاہٹ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ ترقی تین نسلوں میں مکمل ہونے والا عمل ہے۔ کوئی جادوئی چھڑی نہیں۔ اس میں وقت لگتا ہے اور عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ترقی کی دقت طلبی کو تسلیم کرلیا جائے۔ اسی کے ساتھ عوام کو ان کی اپنی عقل و فہم کے مطابق ترقی کرنے کا موقع دینے کے اصول پر جتنی سختی سے عمل کیا جاسکے بہتر ہے۔

۹۔ آدی باسی عوام کی فلاح اور ترقی کے لیے کام کرتے وقت علم الانسان اور اس کے ضابطوں سے واقفیت بھی بہت کارآمد ہوسکتی ہے کیوں کہ اس سے آنے والے معاشرے پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں تبدیلیاں کیسے کیسے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا تعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے کہ مناسب مرحلوں میں کسی معاشرے کو کیسے بدلا اور بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ اس موضوع پر متعدد ماہرین نے جو کام کیا ہے ان میں ایسے سماجی و ثقافتی عناصر کی بہتر سمجھ پر تفصیل سے بات کی گئی ہے جو کہ آدی باسیوں کی ترقی کے پروگرام کو آگے بڑھانے یا ان کے راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

اگر سماجی و ثقافتی اور معاشی پہلوؤں کا مناسب مطالعہ نہیں کیا گیا، جائزہ نہیں لیا گیا اور انھیں آدی باسیوں کی ترقی کے لیے استعمال نہیں کیا گیا تو اس پروگرام کی کامیابی محدود ہو جائے گی لیکن اس کے برعکس اگر ان کا مناسب ڈھنگ سے مطالعہ اور تجزیہ کر کے انھیں آدی باسیوں کی فلاح کے کام میں استعمال کیا گیا تو سائنٹفک مزاج اور تبدیلی کو قبول کرنے والا نقطہ نظر اس پروگرام کی بنیاد بنے گا اور اس طرح پروگرام کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔

درج بالا گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ آدی باسیوں کی زندگی اور ان کے کلچر کے بارے میں

باقی صفحہ ۲۳ پر

مزدوروں کی حالت میں ڈرامائی تبدیلی

مصنف کا کہنا ہے کہ سماجی سلامتی کے امکان کو وسعت دینے کے لیے شروع کی گئی متعدد فلاحی تدبیروں اور اقتصادی محاذ پر حالیہ واقعات کی وجہ سے ملک میں مزدوری کے اور ملازمت کا سارا منظر نامہ روشن ہو گیا ہے۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد خاص کر ۱۹۹۱ء کے جولائی میں اقتصادی ضابطے نرم کرنے کی پالیسی پر عمل کے بعد ملک میں مزدوری اور ملازمت کا منظر نامہ بہت حد تک تبدیل ہوا ہے۔ ایک ایسی معیشت میں جو بڑے پیمانے پر بے روزگاری اور نیم روزگاری سے متاثر ہو' ملازمتوں کے امکانات بہت بڑے پیمانے پر بڑھے ہیں مگر اب بھی اتنے تیز نہیں ہیں کہ آبادی میں اضافے کی رفتار سے قدم ملا کر چلیں۔ نویں پنج سالہ منصوبے کے خاتمے تک ہر تندرست فرد کے لیے روزگار کے مواقع نکال لینے اور تقریباً ہر کسی کو مکمل روزگار فراہم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

آٹھویں منصوبے کی حکمت عملی

آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا گیا کہ درمیانی مدت کے تناظر میں روزگار کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے تاکہ ۲۰۰۰ء تک بے روزگاری گھٹ کر اتنی رہ جائے کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہو۔ منصوبہ سازوں کا زور اس پر تھا کہ روزگار کے لیے مواقع کئی گنا زیادہ بڑھائے جائیں اور اس کے ساتھ مناسب تکنیکی مزدوروں کو متعلقہ اداروں سے وابستہ کر کے پیداواریت اور آمدنی دونوں میں اضافہ کر کے موجودہ روزگاری مواقع کا معیار بلند کیا جائے۔

"ہفت روزہ درجہ" کی بنیاد پر جو لوگ روزگار سے جڑے ہوئے تھے ان کی پوری تعداد اپریل ۱۹۹۲ء میں ۳۰ کروڑ ۷۱ لاکھ تھی اور مزدوروں و ملازموں کی مجموعی تعداد ۳۱ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی۔ تاہم ان اعداد و شمار سے یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ جو لوگ "ہفتہ" کی بنیاد پر روزگار سے لگے ہوئے تھے وہ سب کے سب مستقل اجرت حاصل کرنے والے لوگ تھے۔

ہفت روزہ بنیاد پر روزگار حاصل کرنے والوں کی فہرست ہے۔ اس میں ۲ فی صد ایسے لوگ ہیں جو آدھے سال یا اس سے زیادہ بے کار رہے ہیں اور ایک پیسہ کی بھی اجرت حاصل نہیں کر پاتے ان لوگوں کو نیم روزگار مان لیا جائے تو جز وقتی روزگار (ضروری نہیں ہے کہ طے شدہ تنخواہ والے کام ہی ہوں) تلاش کرنے والوں کی تعداد اب سے ۵ سال پہلے ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ تھی۔

اندازہ ہے کہ ان روزگار تلاش کرنے والے افراد کی صفوں میں آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران مزید ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ افراد شامل ہو گئے ہوں گے اس طرح مارچ ۱۹۹۷ء تک روزگار تلاش کرنے والوں کی مجموعی تعداد بڑھ کر ۵ کروڑ ۸۰ لاکھ تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔ نویں پنج سالہ منصوبے کے دوران روزگار تلاش کرنے والوں کی تعداد میں مزید ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ کا اضافہ متوقع ہے اس طرح مارچ ۲۰۰۲ء تک روزگار مانگنے والوں کی مجموعی تعداد بڑھ کر ۹ کروڑ ۴۰ لاکھ تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔ روزگار تلاش کرنے والوں کی اتنی بڑی فوج کی توقعات پوری کرنے کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ روزگار میں نمو کی شرح جو کہ ۹۱۔ ۱۹۷۱ء تک ۲.۲ فی صد تھی اسے ۲۰۰۲۔ ۱۹۹۲ء تک بڑھا کر ۳ فی صد کیا جائے۔

رکاوٹیں

مگر اس مقصد کے حصول میں حائل رکاوٹوں کو کم سے کم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ملک میں مکمل روزگار کی فراہمی کا راستہ رکاوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے سیکٹروں' ذیلی سیکٹروں اور شعبوں کی اور زیادہ تیز رفتار نمو یقینی بنانی ہوگی۔ اقتصادی سرگرمیوں میں اور زیادہ تیزی کے ساتھ نمو کو یقینی بنانا بھی ضروری ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بات

سب پر ظاہر ہے کہ مخفی بے روزگاری اور نیم روزگاری کی ضرورتوں کی تکمیل حکومت کے بس سے باہر ہے۔

اپریل ۱۹۹۲ء سے دس برس تک ہر سال روزگار کے ایک کروڑ نئے مواقع کا اضافہ کھلی بے روزگاری کو دور کرنے میں بہت حد تک معاون ہو سکتا ہے لیکن جب تک تکنالوجی کے علم اور ہنر میں اضافہ کرکے ادھار اور منڈی تک رسائی بڑھا کے خود روزگاری کے مواقع میں توسیع نہ کی جائے تب تک بے روزگار اور نیم روزگاری سے وابستہ مزدوروں کی آمدنی میں اضافے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے ابتدائی تین برسوں کے دوران جو رجحان ابھر کر سامنے آیا ہے وہ اس کی عکاسی کرتا ہے۔ پیداوار اور پیداواریت میں اضافہ کی وجہ سے روزگار کی نمو میں زیادہ شدت آئی ہے معیشت کے منظم زمرے میں روزگار کا اندازہ ۲۔۷ فی صد نمو کا اشارہ کرتا ہے منظم سیکٹر میں سرکاری زمرے کے روزگار میں ملازمت پانے والی خواتین کی تعداد مارچ ۱۹۹۴ء تک ۱۴ لاکھ ۵۴ ہزار تھی جو اس کے ایک برس بعد ۵۔۷ فی صد بڑھ کر ۴۲ لاکھ ۲۸ ہزار تک پہنچ گئی۔

مگر زیادہ حالیہ گوشوارے اقتصادی سرگرمیوں کی توسیع میں کمی آنے کا اشارہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ اندیشہ بڑھنے لگا ہے کہ اقتصادی اصلاحات کے آغاز سے روزگار کے مواقع میں نمو کی جو رفتار ترقی تھی اس کو برقرار رکھنا مشکل ہوگا اور روزگار کے مواقع کے بارے میں جو اندازے قائم کیے گئے ہیں وہ رائیگاں جائیں گے۔ اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ نویں منصوبے میں، جس کا خاکہ وضع کیا جا رہا ہے، بے روزگاری کے مسئلے پر قابو پانے کے لیے زیادہ مناسب حکمت عملیاں تیار کی جائیں گی

اگرچہ روزگار حاصل کرنے کے خواہش مندوں کی تعداد، روزگار کے بازار میں دستیاب اسامیوں سے کہیں زیادہ ہے اور بڑے پیمانے پر بے روزگاری کا ہونا مسلسل تشویش کا باعث ہے، . . . .

. . . اب بہت سے مالکوں کی باری آئی ہے کہ وہ بعض خاص قسم کے کاموں کے لیے خصوصی ہنر اور مہارت رکھنے والے مزدوروں اور ملازموں کو تلاش کریں انھیں اپنی طرف راغب کریں اور اپنی ضرورتوں کی ان سے تکمیل کرائیں۔ یہ ایسے ہنرمند مزدوروں کا کام ہے جس کے لیے نہ تو عام مزدور موزوں ہے نہ پڑھے لکھے کلرک کی طرح کے لوگ۔ اس کی وجہ سے بے روزگار مزدوروں اور ملازمین کے سمندر میں بھی متعلقہ ہنرمند مزدوروں کی تلاش مشکل ہے۔

تحفظ پسندانہ پالیسیاں

روزگار کے مواقع کا دائرہ وسیع کرنے کی راہ میں بہت سے غیر متعلق عناصر بھی رکاوٹ بن کر کھڑے ہو رہے ہیں۔ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ کچھ ممالک نئے نئے بھیس میں تحفظ پسندانہ پالیسیاں مسلط کرنے کی کوشش میں ہیں جس کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں کو بیرونی تجارت کا دائرہ وسیع کرنے میں طرح طرح کی رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

خاص طور سے امریکہ ہندوستان جیسے ملکوں پر اپنے یہاں کے مزدوروں کا معیار مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کوشش نئی نہیں بلکہ بہت دنوں سے جاری ہے۔ حتیٰ کہ وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی نے امریکی معیار اپنانے پر ہند کو مجبور کرنے کے منفی اثرات کے خلاف بین اقوامی فورموں میں اپنی آواز بلند کی تھی۔

اب امریکہ اپنے یہاں کی حالت کے مطابق مزدوروں کا معیار اپنانے پر ترقی پذیر ملکوں کو مجبور کرنے کے لیے نو تشکیل عالمی تنظیم تجارت کو بطور اوزار استعمال کرنے کی کوشش میں ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں غریب خاندانوں کے لیے روزی روٹی جٹانے میں بچوں کے بھی شامل ہو جانے کے بہت سے تاریخی اسباب ہیں۔ صرف قانون بنا کر بچوں کو مزدوری کرنے سے روکنا ممکن نہیں ہے مگر امریکہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے کہ اگر یہ معلوم ہو گیا کہ کسی بھی شئے کے بنانے میں بچہ مزدوری سے استفادہ کیا گیا ہے تو ہندوستان جیسے ملکوں سے بہت سی اشیاء کی درآمد پر پابندی لگا دی جائے گی۔

ترقی پذیر ملکوں پر کئی دوسری صورتوں میں بھی دباؤ ڈالا جا رہا ہے تاکہ بین اقوامی منڈی میں وہ جو مال برآمد کریں ان کے مقابلہ کرنے کی طاقت کم سے کم ہو سکے۔ اس مسئلہ کا توڑ کرنے کے لیے ملازموں اور مالکوں دونوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ مل جل کر کام کریں تاکہ ہندوستان سے اشیاء کی برآمد متاثر نہ ہو کیوں کہ اس پر کروڑوں افراد کی روزی روٹی کا دارومدار ہے۔

کام کی شرائط میں بہتری

وقفہ وقفہ سے مرکز میں چاہے جو پارٹیاں یا پارٹی برسراقتدار رہی ہو، ہر پارٹی نے روزگار کے مواقع کی توسیع اور مزدوروں کی حالت میں بہتری کو حکومت کا سب سے ترجیحی معاملہ قرار دیا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے اب تک جتنی حکومتیں بنی ہیں ان تمام حکومتوں نے سماجی انصاف اور برابری کے اصولوں کو نافذ کرنے میں بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔

لیکن آج جس ملک کو بھی کم سے کم تنخواہ والی جو نوکری ملتی ہے وہ دس یا پندرہ سال قبل مزدوری/ملازمت اختیار کرنے والوں کی نوکری سے تنخواہ کے لحاظ سے بہت برتر ہے۔ نہ صرف یہ کہ تنخواہیں اور الاؤنس بڑھ گئے ہیں بلکہ کام کے ماحول میں ملازمت کی شرطوں میں، صحت کی دیکھ بھال کے معاملے میں، تعلیمی سہولتوں میں اور سماجی سلامتی کی آسائشوں میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ حقیقتاً یہ درست بات بھی بظاہر مہمل لگے مگر ادھر کی نصف صدی کے دوران مزدوروں کے کام کاج کی صورت حال اور ان کی رہائش کے معیار میں جو نمایاں تبدیلی آئی ہے وہ ٹریڈ یونین تحریک کے زوال کے حوالے سے زیادہ اہمیت اختیار کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں بعض حصوں میں ایک آدھ مستثنیٰ واقعات کو چھوڑ کر بیشتر صورتوں میں کام کاج کی حالت میں، اجرتوں میں، سماجی سلامتی وغیرہ میں جو تبدیلی اور بہتری آئی ہے وہ مزدوروں کی سودے بازی کی طاقت کے بجائے ہنرمند

مزدوروں کی تعداد میں کمی، صنعت کی قوت ادائیگی میں اضافہ اور مزدوروں کی فلاح کے تدبیریں نافذ کرنے میں حکومت کی سنجیدگی اور خلوص کا نتیجہ ہے۔

ٹریڈ یونین تحریک

ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک کے بانیوں کے لیے تمام تر جذبۂ احترام و محبت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اگرچہ مزدوروں کے جائز حقوق منوانے کے لیے پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ جدوجہد کی مگر حالیہ دنوں میں مزدوروں کے نام نہاد خیراندیشوں کے لیے ٹریڈ یونین ازم ایک منفعت بخش تجارت بن کر رہ گئی ہے۔

وہ زمانہ لد گیا جب بیکار پسند ٹریڈ یونینیں ذرا ذرا سی بات پر کام بند کرا دیتی تھیں۔ یہ صنعت کے لیے بھی اور بذات خود مزدوروں کے لیے خوش قسمتی کی بات ہے کہ گھیراؤ اور اعلا افسروں کو ان کے دفتروں میں بند کر دینے کے واقعات جو کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں روز کا معمول تھے اب قصۂ پارینہ ہو چکے ہیں۔

مزدوروں پر سے اس طرح گرفت کمزور ہونے اور ٹریڈ یونین تحریک کے زوال کے لیے کسی حد تک بیکار پسند ٹریڈ یونین لیڈران بذات خود ذمہ دار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزدوران سے دل برداشتہ ہو چکے تھے اور یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی زندگی اور ملازمت کی حالت صرف اس سے سدھر سکتی ہے کہ وہ اپنی مہارت اور ہنرمندی بڑھائیں اور اس کے ساتھ پیداواریت میں اضافہ کریں۔

کام روک دینے، سست رفتاری سے کام کرنے، گھیراؤ کرنے، ذرا ذرا سی بات پر اور کبھی کبھی تو بغیر کسی بات کے ہڑتال کر دینے کا رجحان کم ہوا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں کے دوران صنعتی کارروائیوں خاص کر ہڑتال اور تالابندی میں اس کی روشن جھلکیاں ملنے لگی ہیں۔ ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۲ء میں ہڑتالوں اور تالابندیوں کی وجہ سے ایام اجرت کا نقصان بڑھ کر اب تک کا سب سے زیادہ یعنی علی الترتیب ۴ کروڑ ۲۶ لاکھ ۶۰ ہزار اور ۳ کروڑ ۱۴ لاکھ ۶۰ ہزار تک پہنچ گیا تھا مگر ۱۹۹۵ء کے لیے عبوری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس سال ایام اجرت کا نقصان گھٹ کر ایک کروڑ ۲۱ لاکھ ۷۰ ہزار رہ گیا۔

تاہم درج بالا جملوں سے یہ اندازہ قائم کر لینا غلط ہوگا کہ ملازمین کے کام اور زندگی کے حالت اور معیار میں اضافہ یا ان کی اجرتوں اور دیگر سہولتوں میں اضافہ عوام کی جدوجہد کے بغیر ممکن ہو سکا۔ بعض روشن خیال مالکان کو چھوڑ کر، جو یہ سمجھتے ہیں کہ پیداوار اور پیداواریت میں ملازموں اور مزدوروں کا حصہ بہت گراں قدر ہے، بیشتر مالکان نے بڑی بڑی دقتوں کے بعد مزدوروں ملازمین کو رعایتیں دی ہیں۔

مزدوروں کی ہنرمندی اور مہارت بڑھانے کے لیے تاکہ وہ تیزی سے بدلتی ہوئی ٹکنالوجی کے ساتھ مطابقت کرنے کے اہل ہو سکیں، حکومت اور غیر حکومت تنظیموں نے جو بہت سی کارروائیاں کی ہیں ان کے واضح اور نمایاں اثرات اب نظر آنے لگے ہیں۔ اپریل ۱۹۷۴ء سے مئی ۱۹۸۱ء تک سات برسوں کے دوران سرکاری زمرے میں کان کنی میں ۲ر۴ فی صد کا اضافہ ہوا تھا مگر اس کے بعد مارچ ۱۹۹۱ء تک یعنی گیارہ برسوں میں کان کنی میں اضافہ بڑھ کر ۱۲ر۸ فی صد ہو گیا۔ انہی گیارہ برسوں کے دوران ہندوستان کی مجموعی گھریلو پیداوار میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں مجموعی گھریلو پیداوار ۵۶۰۸ کروڑ روپیہ تھی جو کہ ۱۹۹۲ء میں ۷۵۳۵ کروڑ روپیہ ہو گئی۔

مزدوروں کی بہبود کے لیے قانون سازی

مزدور طبقہ کو ان کی جائز بقایہ جات دلانے کے لیے یکے بعد دیگرے بننے والی حکومتوں نے جو اقدام کیے ہیں ان میں مزدوروں کے ایک ایک مفاد کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مزدوروں کے حقوق کے تحفظ اور ان کے بقایہ جات کی ادائیگی یقینی بنانے کے لیے حکومت کے ہاتھوں میں سب سے اہم اوزار قانون سازی ہے۔

مزدور طبقہ کی بہبود کے لیے حکومت نے جو سب سے اہم قدم اٹھایا تھا وہ ۱۹۴۸ء میں اٹھایا گیا تھا۔ اس سال ایمپلائیز اسٹیٹ انشورنس ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اس کے چار سال کے بعد ایمپلائیز پروویڈنٹ فنڈ اور متفرق گنجائشوں کا قانون بنایا گیا۔ یہ دونوں قوانین پہلی بار بنے تھے جن سے منظم سیکٹر کے مزدوروں کو ایک طرف کسی حد تک سلامتی ملی اور دوسری طرف ان کی سودے بازی کی طاقت میں اضافہ ہوا۔

ان دونوں اوّلین اور اہم فلاحی قوانین کا مقصد بیمار ہونے، معذور ہو جانے یا ملازمت کے دوران مر جانے کی صورت میں مزدوروں اور ان کے افراد خاندان کو ایک طرح کی سلامتی دلانا تھا اور جب سے یہ قوانین بنے ہیں تب سے اب تک ان کے امکانات اور نوعیت میں مسلسل توسیع کی جاتی رہی ہے۔

گزشتہ سال ایک اسکیم شروع کی گئی جس کے تحت اب سے نہ صرف مزدوروں/ملازمین کو پروویڈنٹ فنڈ کی سہولت ملے گی بلکہ سبکدوشی کے بعد وہ اس اسکیم کے تحت پنشن کے بھی حق دار ہوں گے۔

اس کے علاوہ گریجویٹی ادائیگی قانون کے تحت جو کہ اب سے ۲۵ سال پہلے بنایا گیا تھا، ورکروں کو ریٹائرمنٹ کی صورت میں یا ایک خاص مدت میں ملازمت کر لینے کے بعد استعفیٰ کی صورت میں ایک موٹی رقم بطور ہرجانہ ملتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان تینوں سہولتوں یعنی پی۔ ایف، گریجویٹی اور پنشن کے امکانات کو مسلسل وسعت دی جا رہی ہے صنعتی تنازعات قانون میں درج تفصیلات کے مطابق جو بہت سے لوگ مزدور/ملازم کی تعریف پر کھرے نہیں اترتے جیسے کہ اسکولوں اور کالج کے اساتذہ وہ بھی اس سے فیضیاب ہوں گے۔

ایمپلائیز پروویڈنٹ فنڈ اسکیم سے وابستہ پنشن اسکیم اپنی بہت سی اچھی خصوصیات کے باوجود تمام طبقہ کے ورکروں کی توقعات پر کھرا اترنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ بعض بڑی ٹریڈ یونینوں نے اسے ایسی اسکیم قرار دیا ہے جو ورکروں کے چندے سے تیار ہونے والے سرمایہ کو کھا جائے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ

باقی صفحہ ۳۳ پر

ڈاکٹر محمد خالد*

صنعتی توانائی کا ایک اہم وسیلہ :

حیاتیاتی توانائی

آج کی صنعتی دنیا میں جب کہ ہر طرف مشینوں اور صنعتی اوزاروں کا دور دورہ ہے، ان صنعتوں کے چلانے کے واسطے توانائی کا حصول خود ایک اہم اور دقت طلب مسئلہ ہے۔ آج صنعتی شعبے میں توانائی کے لیے معدنی تیل اور بجلی ایک اہم ماخذ کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں اور دنیا کے کل کارخانوں میں استعمال ہونے والی توانائی کا ایک بڑا حصہ ان ہی ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن ان ذرائع کا حصول خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ معدنی تیل کا ذخیرہ دن بہ دن کم ہی ہوتا جا رہا ہے اور توانائی کی ضرورت کی شدت زمانے کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے مستقبل میں ان کا حصول ایک مسئلہ بن سکتا ہے۔ اس وجہ سے سائنس داں اور ماہرین اب اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ توانائی کے دوسرے ذرائع جن کا حصول نسبتاً آسان ہے، ان پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور توانائی کی ضرورت کا بڑا حصہ ان غیر روایتی ذرائع سے ہی حاصل کیا جانا چاہیے۔

توانائی کے غیر روایتی ذرائع اور ان کے حصول میں حیاتیاتی توانائی ایک اہم اور موثر کردار ادا کر سکتی ہے۔ حیاتیاتی توانائی سے مراد وہ توانائی ہے جو حیاتیاتی اجزا مثلاً زرعی باقیات (AGRICULTURAL RESIDUES) بلدیاتی اور صنعتی اور دوسرے طرح کے کوڑا کچرا وغیرہ سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال زراعی باقیات اور بلدیاتی اور صنعتی اکائیوں سے ٹھوس اور مائع کی شکل میں جو کوڑا کچرا پیدا ہوتا ہے وہ لگ بھگ ۳۰ کروڑ ٹن کے برابر ہوتا ہے اور جس رفتار سے شہری زندگی اور شہروں کے رقبے میں اضافہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ چند سالوں میں اس کوڑے کی مقدار اور زیادہ ہو جائے گی۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال کم سے کم ۱۰۰۰ میگاواٹ بجلی شہری علاقوں کے ٹھوس اور مائع کچروں (MUNICIPAI SOLID WASTF) سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ توانائی کی نسبت سے زراعتی باقیات ملک کی کل کوئلے کی پیداوار کا ۶۰ سے ۷۰ فی صد تک ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں بھی اگرچہ توانائی کے مصارف کا تقریباً ۵۰ فی صد حصہ حیاتیاتی ذرائع سے ہی حاصل ہوتا ہے لیکن کام اور خرچ ہوئی توانائی کا تناسب بہت کم ہوتا ہے۔ مثلاً کھانا پکانے کے عام چولہوں میں توانائی کی استعداد بہ مشکل دس فی صد ہوتی ہے جب کہ بوائلر اور بھٹیوں وغیرہ میں جلتے وقت دھان کی بھوسی وغیرہ میں یہ استعداد چالیس فی صد تک ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں ایندھن اور توانائی کے ذرائع کی کمی اور ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس شعبے میں مزید تحقیقات اس بات کی متقاضی ہیں کہ ایندھن کے ذرائع کے طور پر زراعی باقیات، جو کہ حیاتیاتی توانائی کا ایک نہایت اہم جزو ہیں کی استعداد کو ممکن حد تک بڑھایا جائے اور زیادہ سے زیادہ قابل استعمال بنایا جا سکے۔

مارچ ۱۹۹۶ء میں تامل ناڈو صنعتی ترقیاتی کارپوریشن (TIDCO) نے ۱۹ کروڑ روپے کی لاگت کا ایک پروجیکٹ تیار کیا ہے جس میں ٹھوس بلدیاتی کچروں (MUNICIPAL SOLID WASTES) کو توانائی کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے گا جس سے تقریباً پانچ میگاواٹ سالانہ بجلی پیدا کی جا سکے گی۔ ہمارے ملک میں اس طرح کے پروجیکٹوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور تامل ناڈو صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کا یہ پروجیکٹ بھی ابھی بالکل شروعاتی دور میں ہے لیکن یہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس نے توانائی کے ذرائع اور ان کے حصول میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے اور مستقبل کی مزید تحقیقات اس کے حصول میں اور آسانیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ سائنسی تحقیق کے دوسرے ادارے بھی اس سمت میں پیش رفت کر رہے ہیں اور زراعتی باقیات اور کوڑے کچرے وغیرہ کو زیادہ سے زیادہ قابل استعمال بنانے کے لیے حکومتی سطح پر بھی اس کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ چوں کہ زراعتی باقیات دیہی علاقوں میں زیادہ مقدار میں حاصل ہوتی ہیں اور گاؤں وغیرہ میں ایندھن کے طور پر لکڑیوں یا اسی طرح کے دوسرے زرعی

*شعبہ معاشیات، شبلی نیشنل (پی۔جی) اعظم گڑھ۔۲۷۶۰۰۱

باقیات کا زیادہ استعمال ہوتا ہے اس لیے ان کی استعداد کو بڑھانے اور ان کے حصول کے ذرائع پر تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، دہلی (IIT DELHI) ان چند مراکز میں سے ایک ہے جہاں اس سمت میں قابل لحاظ پیش رفت ہو رہی ہے۔ زرعی باقیات جیسے دھان کی بھوسی وغیرہ کو جدید طریقے پر گٹھلی (BRIQUETTES) بنا کر استعمال کرنے سے ان کی استعداد بھی بڑھتی ہے اور چوں کہ روایتی استعمال سے ماحولیاتی کثافت بھی بڑھتی ہے اس لیے اس جدید طریقے کو اپنانے سے فضائی آلودگی پر بھی کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف لدھیانہ شہر میں روزانہ تقریباً آٹھ ہزار ٹن زرعی باقیات روایتی طریقے کی بھٹیوں میں جلائی جاتی ہیں، جس سے تقریباً تین ہزار دو سو ٹن کالی راکھ آس پاس کی زمینوں پر گرتی ہے۔ روایتی طریقے کے بجائے اگر ان باقیات کو جدید طرز کی گٹھلی میں تبدیل کر کے جدید قسم کی بھٹیوں میں جلایا جائے تو ایندھن کی استعداد بھی بہت حد تک بڑھ جائے گی اور فضائی آلودگی پر بھی بہت حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ آئی۔ آئی ٹی۔ دہلی کے ماہرین نے شہد کی مکھی کے چھتے کے انداز کی گٹھلی (BRIQUETTES) کا نمونہ تیار کیا ہے جسے کسی بھی عام قسم کے چولہے میں آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ گٹھلی بھی زرعی باقیات سے دیہی علاقوں میں آسانی سے تیار کی جا سکتی ہے۔ اس طرح کی گٹھلیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جلانے کے لیے ایک وقت میں ایک گٹھلی کی ضرورت ہوتی ہے اور جلتے وقت چھتے کی ہر سوراخ سے گیس پیدا ہوتی ہے جو ایک صاف اور بغیر دھویں کے ایندھن کے طور پر گھروں میں بہ آسانی استعمال ہو سکتی ہے۔

اگرچہ تکنیکی طور پر زرعی باقیات کے سیدھے استعمال سے توانائی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ان کو گیسیفکیشن (GASIFICATION) میں استعمال کیا جائے تو مصارف میں کمی آ سکتی ہے۔ پہلے زرعی باقیات کو جلا کر گیس تیار کی جائے پھر اس گیس کو صاف کر کے استعمال کیا جائے۔ اس گیس کو ڈیزل جنریٹرسٹ میں استعمال کر کے ڈیزل کے مصارف میں ۵۰ سے ۸۰ فی صد تک کمی کی جا سکتی ہے۔ چاول اور تیل کے کارخانے اس طریقے سے توانائی پیدا کر کے اپنی ضرورت سے زیادہ توانائی حاصل کر سکتے ہیں۔

حیاتیاتی توانائی کے حصول میں چینی ملوں کا کردار بھی بہت اہم ہو سکتا ہے۔ چینی ملیں گنّے کی باقیات (BAGASSE) سے مختلف طرح کے توانائی پیدا کر سکتی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان باقیات کو سیدھے جلانے کے بجائے ان کو جلا کر گیس بنائی جائے اور پھر اس گیس کو استعمال کیا جائے اور اس طرح گیس بننے کے بعد جو راکھ بچے گی اس میں کاربن کی قابل لحاظ مقدار ہوگی اور اس راکھ کو پھر گھریلو ایندھن کے لیے گٹھلی بنا کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دھام پور (اتر پردیش) کی چینی مل میں اس طرح کے تجربات کیے جا رہے ہیں اور ماہرین کو اس میں خاصی کامیابی بھی ملی ہے ان تجربات کے کامیاب ہونے کی صورت میں اس کو چاول ملوں میں بھی اپنایا جا سکتا ہے جہاں دھان کی بھوسی کو سیدھے جلانے کے بجائے ان کا گیسیفکیشن (GASIFICATION) کیا جائے اور اس طرح ایندھن کی استعداد کو بڑھایا جائے۔ اس طریقے سے یہ ملیں اپنی ضرورت سے زیادہ توانائی پیدا کر سکتی ہیں۔ گنّے کے باقیات (BAGASSE) سے توانائی پیدا کرنے کا مختلف ایجنسیوں کا تخمینہ ۲۸۰۰ میگا واٹ سے ۵۱۰۰ میگا واٹ تک کا ہے۔ سب سے زیادہ ۵۱۰۰ میگا واٹ کا تخمینہ ٹاٹا کی توانائی تحقیق کے ادارے (TATA FNERGY RESEARCH INSTITUTE) کا ہے۔

آج کل ہمارے ملک میں گھریلو توانائی کے حصول کے لیے گٹھلیاں بنانے کا رواج تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مختلف ساخت کی گٹھلیوں کی بناوٹ اور ان کے اجزا پر تجربات ہو رہے ہیں تاکہ ان کی استعداد کو بھی بڑھایا جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ ماحولیاتی کثافت بھی کم کی جا سکے۔ اس طرح کے گٹھلیوں کے بنانے میں لکڑی اور اس کا برادہ، مونگ پھلی کے چھلکے، دھان کی بھوسی وغیرہ جیسی زرعی باقیات کو استعمال کر کے ان پر تجربے بھی ہو چکے ہیں۔ حیاتیاتی توانائی کے شعبے کی حوصلہ افزائی کے لیے غیر روایتی توانائی کی وزارت (MINISTSTRY OF NON-CONVENTIONAL ENERGY) کئی طرح کے پروجیکٹوں میں مالی اور تکنیکی امداد بھی فراہم کر رہی ہے۔ وزارت نے اب تک اس طرح کے ۲۹ پروجیکٹوں کو ۸ کروڑ روپے کے بقدر رقم فراہم کیا ہے۔ ان پروجیکٹوں کی سالانہ استعداد تقریباً ۲/۸ لاکھ ٹن کے بقدر زرعی باقیات کو گٹھلیوں میں تبدیل کرنے کے برابر ہے۔

توانائی کے اس شعبے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے منصوبہ بندی کمیشن نے اپنے ایک ممبر جے۔ ایس۔ بجاج کی سرکردگی میں شہری ٹھوس باقیات (URBAN SOLID WASTE) پر تحقیق کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ اپنی رپورٹ میں کمیٹی نے بتایا کہ شہری ٹھوس باقیات کا انتظام بہت ناقص ہے اور اب تک نظر انداز ہوتا رہا ہے۔ کمیٹی نے ان شعبوں کی بھی نشاندہی کی ہے جو اس سلسلے میں اب تک اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتے رہے ہیں اور ان کے آپسی ربط اور تال میل کے لیے پالیسی اور ایکشن پلان بھی تیار کیا ہے تاکہ ان شہری باقیات اور دوسری طرح کے کوڑوں کچروں کا صحیح اور پائدار استعمال ہو سکے۔ حکومت کے سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے نے ممبئی میں اسی طرح کا ایک پائلٹ پروجیکٹ تیار کیا ہے جس سے روزانہ تقریباً ۸۰ ٹن کوئلے کے بقدر ایندھن کی گٹھلیاں تیار کی جائیں گی اور یہ گٹھلیاں ساری کی ساری اسی میں شہری کوڑے کچرے کو استعمال کر کے بنائی جائیں گی۔ نجی شعبہ بھی اس طرح کے پروجیکٹوں کو بہت مثبت انداز سے لے رہا ہے اور ماحولیاتی آلودگی کو بچانے کی خصوصیت کی وجہ سے لوگ ان گٹھلیوں کو کوئلے سے زیادہ مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ ●

بقیہ: آئین ہند: اقلیتوں کی بہبود کا ضامن ہے

کے جمہوری نظام کی روح فوت ہو جاتی اور یہ آئین اکثریتی طبقے کے یک طرفہ مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہوتا۔ ہمارے ملک کی گوناگونی اس صورت حال کو برداشت نہ کرتی، کیوں کہ ہر ریاست میں مذہبی اقلیتیں موجود ہیں۔ ملک کی رنگا رنگی اور گوناگونی کا لحاظ کیے بغیر کوئی بھی آئین ہندوستان کی جنگ آزادی کی روح کے منافی ہوتا، جس سے ہندوستان کا استحکام متزلزل ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کے آئین میں شامل اٹھارہ زبانیں بھی اس رنگا رنگی کی مظہر ہیں۔ ●

ڈاکٹراقبال محی الدین

گنگاندی

ہندوستان میں بہت سی ندیاں ہیں جن میں سب سے اہم گنگا ندی ہے کیوں کہ اس کی مذہبی، معاشی و اقتصادی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ جس علاقے سے گزرتی ہے اس کو صنعتی اور معاشی اعتبار سے خوشحالی عطا کرتی ہے۔

ہندو مذہبی عقیدہ کے مطابق یہ ایک پوتر دریا ہے۔ اس کی پاکیزگی کے تصور کے پیچھے ہندو MYTHOI OGY کارفرما ہے جس کے مطابق راجہ بھاگیرتھ نے وشنو بھگوان کی بے حد تپسیا کی تاکہ ان کی سلطنت میں پانی کی افراط رہے۔ ان کی عبادت سے خوش ہو کر وشنو بھگوان نے ان کو گنگا ندی دینے کا وعدہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گنگا کی تیز روی کو وہ سنبھال نہ پائیں گے۔ لہٰذا شنکر بھگوان کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ اس کی تیزی پر قابو رکھیں اور مناسب مقدار میں اس سرزمین کو پانی دیتے رہیں۔ اس طرح شنکر بھگوان کی جٹاؤں سے گنگا ندی نکل پڑی اور اپنے راستے پر آج تک گامزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اس کو ایک پوتر ندی مانتے اور پوجتے ہیں اور اس کو ماں کا درجہ دیتے ہیں اور "گنگا میا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ تہواروں کے موقعوں پر اس میں اشنان کرتے ہیں۔ ہر بارہ سال کے بعد کمبھ کا میلا گنگا کے کنارے ایک ہردوار میں اور دوسرا پریاگ میں لگتا ہے۔ لاکھوں لوگ اس موقعہ پر گنگا میں اشنان کرتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گنگا کے ساتھ دو اہم تہوار بھی جڑے ہیں۔ کارتک پورنیما اور گنگا دسہرہ۔ گورو نانک دیو جی کی پیدائش کارتک پورنیما کے دن ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ایسے مبارک موقعہ پر لوگ گنگا میں اشنان کرتے ہیں اور پوجا ارچنا کرتے ہیں۔ اسی لیے گنگا کے پانی کو پوتر مانتے ہیں یہاں تک کہ گرہن کے بعد گنگا جل چھڑک کر اس جگہ کو پاک کرتے ہیں جہاں کھانا رکھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کھانے پر بھی گنگا جل چھڑک کر اس کو پوتر کر کے تب کھاتے ہیں۔

یہ تو رہی بات گنگا کی پوترتا اور اس کی MYTH LOGY کی۔ اب ہم جغرافیائی نقطۂ نظر سے گنگا ندی کے بارے میں آپ کو تفصیل سے بتاتے ہیں۔

گنگا ندی کو بہت سے ناموں سے جانا جاتا ہے مثلاً وشنو پدی، جَن ہادی، مندا کنی، بھاگیرتھی وغیرہ۔ مہابھارت میں اس ندی کے منبع یا SOURCF کو بندو سارا بتایا گیا ہے جب کہ بین جمبو دلیوا پوننا نئی اس ندی کے منبع کو پدماہ رادا کے نام سے بتاتی ہے۔ پالی تحقیقی کام گنگا کے سورس کا انو تاپتا جھیل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ موجودہ جغرافیہ دان گنگا کے سورس کو گنگوتری گلیشیر میں "گئو مکھ" نامی مقام بتاتے ہیں جہاں سے نکل کر وہ گڑھوال میں گنگوتری کے مقام پر دکھائی دیتی ہے اور دیو پریاگ کے مقام پر الک نندہ نامی ایک ندی دھارا اس سے مل جاتی ہے۔ یہیں سے اسے گنگا ندی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

گنگا ندی کی بہت سی چھوٹی بڑی معاون ندیاں ہیں جن میں سے کچھ تو ہمالیہ پہاڑ سے نکل کر اس میں ملتی ہیں اور کچھ ندیاں جنوبی سطح مرتفع کے پہاڑی سلسلوں سے نکل کر اس ندی میں مل جاتی ہیں۔ ہمالیہ سے نکلنے والی معاون ندیاں جو گنگا سے ملتی ہیں وہ ہیں جمنا، رام گنگا، گومتی، گھاگھرا، کوسی، گنڈک، تیستا اور مہانندہ۔ جنوبی سطح مرتفع کے پہاڑی سلسلوں یعنی وندھیا رینج، اراولی رینج، میکال رینج، کیمور رینج اور سہاندری رینج سے نکلنے والی ندیاں ہیں۔ بانس، چمبل، سندھ، بیتوا اور کین جو جمنا ندی کے ساتھ گنگا ندی میں جنوب سے آکر مل جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ میکال کی پہاڑیوں سے نکل کر سون ندی پٹنہ کے پاس گنگا ندی میں مل جاتی ہے۔ اس طرح اپنے سورس یا منبع سے لے کر خلیج بنگال کے دہانے تک گنگا اپنے اندر ایک درجن سے بھی زیادہ بڑی معاون ندیوں کو سموئے ہوئے بہتی چلی جاتی ہے۔ اسی لیے گنگا ندی کو ہندوستان میں مقبولیت اور اہمیت حاصل ہے۔

بنگلہ دیش میں پبنا اور راج باڑی کے نزدیک برہم پترا ندی گنگا سے ملتی ہے جسے وہاں پدما ندی کے نام سے جانا جاتا ہے جو آگے چل کر خلیج بنگال میں گر جاتی ہے۔ گنگا ندی

ڈی۔۹۱۔ ایم۔ ایم۔ ٹی۔ سی۔ کالونی
سری آربندو مارگ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۷

کی کل لمبائی ۲،۴۴۲ کلو میٹر ہے۔

دریاؤں کی وادیوں کی، خاص طور سے وہ دریا جن کا منبع پہاڑوں کے برف اور گلیشیر میں ہے' انسانی تاریخ میں بہت اہمیت رہی ہے۔ پانی کے علاوہ جس کی انسانی زندگی میں بے حد ضرورت رہتی ہے وہ دریا، صفائی، سینچائی اور جہاز رانی کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان ندیوں کے استعمال کے طریقے بھی بڑھتے اور بدلتے گئے۔ گنگا ندی جو کہ ہندوستان کے بڑے شمالی میدان کو جو شمال میں ہمالیہ پہاڑ اور جنوب میں وندھیا پہاڑیوں تک پھیلے ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو سیراب کرتی ہے اور دوسری طرف بہت سی قوموں اور تہذیبوں کو پھلنے پھولنے میں مدد بھی کرتی ہے۔ مذہبی مراکز جیسے ہری دوار، پریاگ، کاشی اور کالی گھاٹ تعلیمی مراکز جیسے دہلی، روڑکی، وارانسی، الٰہ آباد، کلکتہ اور شاہی مراکز جیسے اندر پرستھ، فتحپور سیکری، گوڑ، مرشد آباد اور کلکتہ سبھی گنگا کی وادی میں پھلے پھولے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے اولین دور سے گنگا ندی اپنے منبع سے لے کر دہانے تک کے لمبے سفر میں اپنے کنارے پر اور میدانی علاقوں میں بڑی بڑی قوموں اور تہذیبوں کو اپنے گہوارے میں پالتی پوستی رہی ہے۔

جس طرح انسانی زندگی کے تین دور ہوتے ہیں یعنی بچپن، جوانی اور ضعیفی۔ اسی طرح ندیوں کے بھی منبع سے لے کر اخراج تک تین دور ہوتے ہیں۔ پہلا اس کے سورس اور اوّلین دور کا زمانہ یعنی بچپن، دوسرا اس کا درمیانی دور یعنی جوانی اور تیسرا اس کے اخراج کا دور یعنی ضعیفی۔ اسی طرح گنگا ندی کے طویل سفر کے دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا اپر گنگا بیسن (اتر پردیش)' دوسرا مڈل گنگا بیسن (بہار) یعنی وسط گنگا کا نشیبی میدان اور تیسرا لوور گنگا بیسن (بنگال) یعنی گنگا کا نچلا نشیبی میدان۔ اب ہم ان تینوں حصوں کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

پہلا حصہ اپر گنگا بیسن ہے جو اتر پردیش میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شروعات گنگا کے منبع یا سورس سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اس ندی کے بچپن کا دور ہے۔ گنگا ندی ہمالیہ پہاڑ یعنی گنگوتری گلیشیر کے گئو مکھ کے مقام سے نکل کر پہاڑی راستے پر اچھلتی، کودتی اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی رشی کیش کے مقام سے میدانی حصہ میں داخل ہوتی ہے۔ پہاڑی علاقہ میں دو اہم ندیاں اس کی معاون ہو جاتی ہیں جن میں ایک الکنندہ ہے جو کیدار ناتھ کے مقام سے گزرتی ہے اور دوسری مندا کنی ہے جو نندہ دیوی کے مقام سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے اور ہردوار کے آگے گنگا میں بہت سی اور ندی دھارائیں بھی مل جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ اتر پردیش کے زرخیز میداں میں آکر اپنا سفر شروع کر دیتی ہے۔ اس کے داہنے کنارے پر جمنا ندی پریاگ (الٰہ آباد) کے مقام پر ملتی ہے اور سنگم بناتی ہے۔ پریاگ کی بہت زیادہ مذہبی اہمیت ہے۔ لوگ کمبھ کے میلے کے وقت بھی اور دوسری مذہبی رسومات کو ادا کرنے کے لیے بھی سنگم کے مقام پر گنگا ندی میں نہاتے ہیں اور پوجا کرتے ہیں۔ پرانے شہر پریاگ کے پاس سے گزرتے وقت گنگا ندی دوسری مقامی چھوٹی چھوٹی ندی دھاراؤں کو اپنے اندر اپنے بائیں کنارے سے سمو لیتی ہے۔ پریاگ تک اس کا طاس یا CATCHMENT AREA ۹۷،۹۰۲ مربع کلو میٹر ہے جس میں سو سے ۲۰۰ سینٹی میٹر تک بارش ہوتی ہے۔ طاس اس رقبۂ زمین کو کہتے ہیں جہاں کا پانی بہہ کر دریا میں چلا جائے۔ ۶۰ سے ۱۰۰ سینٹی میٹر بارش دوآب کے علاقہ میں ہوتی ہے جو گنگا اور جمنا کا میدانی حصہ ہے۔ الٰہ آباد تک گنگا کے راستے میں بہت اہم تجارتی مقامات ہیں جن میں کانپور خاص طور سے کئی صنعتوں کے لیے مشہور ہے۔

گنگا ندی کی پہلی بڑی اور اہم معاون ندی جمنا ہے جو اس سے الٰہ آباد کے مقام پر ملتی ہے۔ اس کا طاس یا کیچمنٹ ایریا ۳۷،۱۸،۷۱ مربع کلو میٹر ہے جس میں اس کے داہنے کنارے پر ۴۰ سے ۶۰ سینٹی میٹر تک اوسطاً بارش ہوتی ہے اور بائیں کنارے پر ۶۰ سے ۸۰ سینٹی میٹر تک اوسطاً بارش ہوتی ہے۔ دو ترقی یافتہ شہر دہلی اور آگرہ اس کے داہنے کنارے پر آباد ہیں۔ گنگا۔ جمنا دوآب ایک بہت زرخیز میدانی علاقہ ہے جو ہمالیہ کے دامن تک پھیلا ہوا ہے۔ جمنا ندی کے داہنے کنارے پر مدھیہ پردیش کا کوہستانی علاقہ پھیلا ہوا ہے جس میں چمبل اور بیتوا ندیاں بہتی ہیں جو جمنا کی معاون ندیاں ہیں۔

گھاگھرا ندی ہمالیہ پہاڑ سے نکل کر گنگا کے بائیں کنارے پر اس سے چھپرا (بہار) کے مقام پر ملتی ہے۔ پہاڑی دامن اور ندی کے بائیں کنارے تک یہاں اوسطاً بارش سو سے دو سو سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ اتنی زیادہ بارش سے اس علاقہ میں اکثر سیلاب آجاتا ہے۔ گنگا اور گھاگھرا کا دوآب ایک زرخیز میدانی علاقہ ہے جس میں مشہور تعلیمی ادارے ہیں۔ اس میں روڑکی، لکھنؤ، الٰہ آباد، کانپور اور وارانسی کی مشہور و معروف یونیورسٹیاں ہیں۔ یہاں بارش کی تقسیم ۸۰ سے سو سینٹی میٹر تک ہے۔

گنگا۔ جمنا اور گھاگھرا ندیاں ایک دوسرے کے متوازی بہتی ہوئی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف رواں دواں رہتی ہیں اور اپنے ساتھ ہمالیہ پہاڑ اور وندھیا پہاڑیوں کے بڑے بڑے پتھروں اور مٹی کو لے کر بہتی رہتی ہیں۔ یہی پتھر جب ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں تو وہ بالو اور مٹی کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں جو ALLUVIUM SOIL کے نام سے بہت زرخیز میدانی علاقہ کی مٹی بن جاتے ہیں۔ یہ INDO-GANGETIC ALLUVIUM TRACT شمال سے جنوب تک ۱۶۰ سے چار سو کلو میٹر تک پھیلے ہوئے ہیں جس میں سب سے زیادہ لمبائی ۷۵۰ کلو میٹر تک مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔ یہ بہت گنجان آباد ہے اور ہندوستان کے خوشحال علاقوں میں سے ایک ہے۔ چوں کہ یہ علاقہ گنگا ندی اور اس کی معاون ندیوں جمنا اور گھاگھرا سے پوری طرح سیراب رہتا ہے اسی لیے یہاں قدرتی پانی کا جماؤ نہیں ہونے پاتا۔ صرف گھاگھرا ندی کے بائیں کنارے پر ہمالیہ کے دامن میں پانی اکٹھا ہو جاتا ہے۔ زمین کا ڈھلان ہمالیہ اور

صیا پہاڑی سلسلوں سے گنگا کی جانب بہے
لیے بغیر کسی راستے کے گھماؤ کو اختیار کیے
ئے گنگا ندی سیدھی بہتی چلی جاتی ہے اور
ت کم اس میں گھماؤ آتا ہے۔ یہ تینوں ندیاں
لیہ پہاڑ کے برفانی ذخیروں سے نکلتی ہیں
اہر موسم میں ان میں پانی کی افراط رہتی ہے۔
پر یاگ شہر جو گنگا اور جمنا کے سنگم پر
د ہے اس کا مذہبی کتابوں میں بھی ذکر ہے۔
ئی شہر بھی گنگا کے کنارے آباد ہے جس کا بھی
بی ہندو مذہبی کتابوں میں ذکر ہے اور بہت
ہمی اہمیت ان دونوں جگہوں کی بیان کی گئی
۔ ان دونوں مقامات کے درمیان گنگا ندی
، اپنے راستے کو سیدھا رکھا ہے مگر اس کے
ستے کی تبدیلی چھپرا کے بعد شروع ہوتی ہے جہاں
ے گھاگھرا ندی ملتی ہے۔

اب ہم گنگا کے دوسرے دور یا اس کی
انی کی بات کرتے ہیں یعنی مڈل گنگا بیسن کی
بہار ریاست میں پھیلا ہوا ہے۔ گنگا بیسن کا
میانی حصہ گنگا ندی کے راستے کا دوسرا حصہ ہے
بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چھپرا اور پٹنہ
ے درمیان گنگا ندی کے بائیں کنارے سے
ا گھاگھرا ندی اور دائیں کنارے سے سون ندی
، میں ملتی ہے تو گنگا ندی کے راستے میں تھوڑی
بلی آتی ہے۔ اسی درمیان گنگا سے گنڈک
ی بھی مل جاتی ہے۔ یہ ندی بھی ہمالیہ کے برفیلے
اڑوں سے آتی ہے اور گنگا کے پانی میں مل کر
، میں پانی، پتھر، مٹی اور ملبہ کا اور اضافہ
ردیتی ہے۔ حالاں کہ یہ دونوں ندیاں یعنی گھاگھرا
ر گنڈک، گنگا ندی سے تھوڑے تھوڑے
صلہ سے ملتی ہیں مگر جو پتھر، کنکر، مٹی وغیرہ
، اپنے ساتھ لاتی ہیں وہ بالکل مختلف ہیں اور
نگا کے راستے کو پٹنہ شہر کے بعد تبدیل کرنے
ں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ پٹنہ اور منی ہاری
ھاٹ کے درمیان گنگا میں کئی اور چھوٹی چھوٹی
ـیاں مل جاتی ہیں جو ہمالیہ کے جنوبی ڈھالے
، نکل کر آتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم ندی کے
ہ کوسی جو گنگا سے اس کے بائیں کنارے پر
تی ہے۔ چھپرا اور منی ہاری گھاٹ کے درمیان
نگا کے بائیں کنارے پر دو ندیاں گنڈک اور کوسی

ملتی ہیں جب کہ سون ندی گنگا کے داہنے کنارے ملتی ہے۔ یہ ندیاں گنگا میں اتنا زیادہ پانی بھردیتی ہیں کہ شمالی بہار میں اکثر سیلاب آجاتا ہے۔ منی ہاری گھاٹ کے آگے جب گنگا بہتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو وہ "گنگا ڈیلٹا" میں داخل ہو جاتی ہے جس کے داہنے کنارے پر بھاگیرتھی، ہگلی اور بائیں کنارے پر پدما، میگھنا ہیں۔

کوسی ندی کے بعد گنگا میں اس کے بائیں کنارے پر ملنے والی ندی مہانندہ ہے جو بارش کے درمیان بھر جاتی ہے۔ وہ بھی اپنا پانی گنگا میں انڈیل دیتی ہے۔ کوسی ندی اپنے ساتھ پتھر، مٹی وغیرہ کو لے کر بہتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا راستہ مشرق سے مغرب کی طرف بدل دیتی ہے اور وہ شمالی بہار کے میدانی علاقہ میں اپنے لائے ہوئے ملبہ کو بکھیرتی رہتی ہے۔ اس سے وہاں سیلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کو پشتے بنا بنا کر اب روک دیا گیا ہے۔ کوسی اور مہانندہ ندیوں کے درمیانی میدان کو ان ہی ندیوں کی نہروں کے ذریعہ سینچا جاتا ہے۔

مختصراً گنگا ندی کا طاس ہمالیائی برفانی ذخائر میں ہے جہاں سے وہ مغرب سے مشرق کی جانب ۱۵ر۹ سینٹی میٹر فی کلومیٹر کی ڈھال پر بہتی ہے اور جنوب میں جگہ جگہ اس کو پہاڑی سلسلے کا نکلا ہوا حصہ ملتا ہے۔ مرزا پور، مونگیر، بھاگلپور اور سنتھال پرگنہ میں عام طور سے پہاڑی ٹیلے ملتے ہیں جن کے پاس سے ہو کر یہ ندی بہتی ہے۔ گنگا کا داہنا کنارہ ڈھلوان ہے جب کہ بایاں کنارہ سپاٹ ہے۔ گنگا ندی جب وسط گنگا کے نشیبی میدان میں داخل ہوتی ہے تو اپنے ساتھ بہت زیادہ مٹی، پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے لیے ہوئے ہوتی ہے جو تیرتے ہوئے آپس میں ٹکراتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں گنگا ندی اپنے طاس کا اور اپنی بہت سی معاون ندیوں کا ملبہ بھی ساتھ میں بہاتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس حصے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے گنگا ندی میں گرتے رہتے ہیں جو گھاگھرہ سسٹم، گنڈک سسٹم، کوسی سسٹم، اور سون سسٹم کے ہوتے ہیں۔ الٰہ آباد اور بکسر کے درمیان گنگا ندی کے بہنے کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔

چھپرا کے پاس سے یہ ندی اپنا راستہ بدلنے لگتی ہے اور گھماؤ دار، در پیچ دار راستہ اختیار کرتی ہے اور جنوب کی جانب گھوم جاتی ہے کیوں کہ اس میں معاون ندیوں کا پانی اور ملبہ بہت زیاد ملنے لگتا ہے جس کی وجہ سے یہ اپنا راستہ بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اب ہم گنگا ندی کے تیسرے اور آخری دور کا ذکر کرتے ہیں۔ عام فہم جغرافیائی زبان میں اس کو LOWER GANGA BASIN یا گنگا کا نچلا نشیبی میدان کہا جاتا ہے۔ یہ بنگال کا علاقہ ہے۔

کوسی ندی کے گنگا میں گرنے کے بعد گنگا ندی بنگال کے علاقے میں سست رفتاری سے داخل ہوتی ہے۔ یہ اس کا آخری دور ہے۔ راج محل پہاڑیوں کے دامن سے ہوتی ہوئی یہ ندی بنگال میں آگے بڑھتی ہے۔ اس کے بائیں کنارے پر کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں اس میں آکر مل جاتی ہیں۔ فراکہ کے آگے یہ کئی شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے جس میں بھاگیرتھی ندی ملتی ہے۔ اس ندی کے ذریعہ گنگا اپنے پانی، پتھریلے کنکڑ و پتھر اور ملبہ کو خلیج بنگال میں گرادیتی ہے۔ گنگا کا داہنا بازو پدما ندی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس کی بہت سی دریائی شاخیں ہیں جیسے جلنگی، ماتھا بھنگا، اچھامتی، بھیرب، تب گنگا اور گورئی جو برہم پتر ندی سے مل جاتی ہیں اور بالآخر خلیج بنگال میں گرتی ہیں۔ بہت پرانے زمانے سے ہی بھاگیرتھی/ہگلی اور پدما میگھنا کے درمیان کا ڈیلٹا دراصل "گنگا کا ڈیلٹا" کہلاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۵۸۷۵۲ مربع کلومیٹر ہے۔ یہاں کے سندربن مشہور ہیں۔ اس کے داہنے بازو پر پرانے شہروں کے کھنڈرات اب بھی ملتے ہیں جو کبھی اپنی صنعت و حرفت میں بہت مشہور تھے۔ یہ شہر ہیں گوڑ، مرشد آباد اور سرام پور، یہ مسلم کلچر کے نمونے تھے۔ کٹوا اور نوادیپ پرانے شہر ہیں جو ہندو کلچر کے نمونے تھے۔ کلکتہ بھاگیرتھی/ہگلی ندیوں پر آباد ہے جس کا شمار ہندوستان کے بہت بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے شروع میں کلکتہ ایک بڑا تجارتی مرکز بن چکا تھا۔ خلیج بنگال میں کلکتہ ایک بندرگاہ

باقی ص۲۳ پر

بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو

"میری خوشیاں ایسی نہ تھیں جو بالعموم بچپن کی خوشیاں ہوتی ہیں، میری روح کی تمنا کچھ ایسے کھیل نہ تھے، جو فکر سے عاری نہ ہوں، بلکہ اس روح کی بالیدگی اور اس کی پرورش بہت سے روشن تر موضوعات پر تھی۔ میرے روشن خوابوں کی دنیا اعلا و ارفع خیالات میں تھی" یہ اعتراف ہے اس شاعرہ کا جس نے فکر و خیال کی سیرت پائی تھی اور یہ شاعرانہ تخیل اس نے اپنی چودھویں سالگرہ کے موقع پر پیش کیا تھا۔ ۱۲ سال کی عمر میں ہی اس شاعرہ نے شاعری شروع کر دی تھی اور اپنی پہچان بنالی تھی یہ ایک ایسی پہچان تھی، جو کم سنی کی امنگوں اور آرزوؤں سے بہت پرے تھی۔ اس شاعرہ کا نام سروجنی نائیڈو تھا۔ ان کے والد کا نام اگھورے ناتھ چٹوپادھیائے اور والدہ کا نام ورادا سندری تھا، وہ اپنے والدین کی سب سے بڑی صاحب زادی تھیں۔

ان کے والد نے تمام روایات کو برطرف کر کے جرمنی میں جا کر علم الادویہ کا مطالعہ کیا اور بعد میں وہ نظام حیدرآباد کے طبیب بن گئے۔

سروجنی نے ۱۲ سال کی عمر میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ مدراس پریزیڈنسی سے امتحان دیا اور کامیاب امیدواروں کی فہرست میں سب سے اوپر رہیں۔ ہر شعبہ جات میں ان کی ذہانت اور ذہنی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں لیکن جسمانی طور پر وہ کمزور تھیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی تعلیم ترک کر دی اور میٹرکولیشن کے بعد آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔

۱۸۹۵ء میں سروجنی نائیڈو برطانیہ گئیں اور نظام کی طرف سے دیے گئے وظیفے سے لندن کے کنگس کالج میں داخلہ لیا۔ حالاں کہ موصوفہ نے وہاں صرف تین سال ہی قیام کیا مگر اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے اپنی ترقی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ لندن میں اس سادہ اور فکر انگیز لڑکی نے اپنے بچپن کے خوابیدہ شوق و ذوق کو پھلنے پھولنے دیا۔

موصوفہ نے ادبی اعتبار سے ممتاز نظمیں لکھنی شروع کیں، انھوں نے بہت تیزی سے لکھا۔ انھوں نے ہندوستانی موضوعات سے گہری دلچسپی لی۔ موصوفہ نے انگریزی شعر و ادب کے ماہر مثلاً گوسے، سائمن اور ہارڈی کے ساتھ شاعری کے موضوع پر تبادلۂ خیال کیا۔ حتیٰ کہ ہیڈری جیمس نے بھی خداداد صلاحیت کی مالک اس لڑکی کے ادبی کمالات کا اعتراف کیا۔ ان کے ذہن نے نئے نئے خیالات قبول کیے جس سے ان کا ذہنی اور شعری ذوق وسعت پذیر ہوا۔ اس طرح وہ انگریزی میں شعر کہنے والی ہندوستان کی سب سے باکمال خاتون بنیں۔

۱۸۹۸ء میں سروجنی ہندوستان واپس آئیں انھوں نے وہاں کوئی ڈگری حاصل نہ کی۔ اس سال مدراس میں ڈاکٹر گووندراجولو نائیڈو سے ان کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی شدہ جوڑا حیدرآباد میں بس گیا۔ ان کے چار بچے ہوئے۔ موصوفہ کی دلچسپی کے تین موضوعات تھے یعنی ان کا گھر، ان کا کنبہ اور ان کی شاعری۔

سنہری آغاز

۱۹۰۵ء میں ان کی نظموں کا مجموعہ "دی گولڈن تھریشولڈ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت کا سہرا انگریزی کے مشہور شاعر آرتھر سائمن کو جاتا ہے، جو کہ اس مجموعہ کی اشاعت کے محرک تھے وہ اس شاعرہ کی ذہانت کے بہت زیادہ قائل تھے۔ اس کتاب کی اشاعت نے انگلینڈ میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں سائمن نے لکھا کہ "سترہ سالہ اس بچی نے تمام تر ایک خاتون کی زندگی گزاری۔ موصوفہ میں بدلہ سنجی بدرجہ اتم ہے جو کہ ان کی عجیب و غریب ذہانت کا ایک حصہ ہے۔" اس غیر معمولی کمسن عورت کے کچھ دیگر مجموعوں کے نام ہیں۔ "دی برڈ آف ٹائم" یعنی وقت کا پرندہ، "سانگس آف لائف" یعنی زندگی کے گیت، "ڈیتھ اینڈ دی اسپرنگ" یعنی موت اور چشمہ، "دی بروکن ونگ" یعنی شکستہ پر۔

موصوفہ کو آل انڈیا سوشل کانفرنس کی میٹنگ سے بطور ایک ممتاز شاعرہ کے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو ان کے ملک میں صرف ایک اور عورت کو دیا گیا تھا اور وہ تھیں مسز اینی بیسنٹ۔ ۱۹۱۱ء میں ان کو سماجی خدمات کے صلے میں قیصرِ ہند گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔

اپنی پہلی کتاب میں سروجنی نائیڈو نے ہندوستان کی نوجوان شادی شدہ عورتوں کے حق میں آواز اٹھائی۔ جذبات کے اظہار میں

ان کو کمال حاصل تھا اور وہ اپنی سر زمین کی عورتوں کی نمائندہ آواز تھیں۔

ان کی ادبی خدمات کے صلے میں موصوفہ کو لندن کی رائل سوسائٹی آف لٹریچر کا رکن بنایا گیا۔ ایک بار جب وہ لندن میں سوسائٹی کی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئیں تو ان کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ یہ ملاقات گوکھلے کے توسط سے ہوئی۔ گاندھی جی سروجنی نائیڈو کو "بھارت کوکیلا" یعنی بلبلِ ہند کہتے تھے۔ موصوفہ گاندھی جی کو مکی ماؤس کہتی تھیں۔

بہترین مقرر

سروجنی بہترین مقرر تھیں۔ قومی آزادی، عورتوں کی آزادی، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کے نوجوان ان کے محبوب موضوعات تھے۔ عورتوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے سروجنی نے اپنے ہم وطنوں کو طعن و تشنیع کی۔ انھوں نے کہا کہ "آپ ہندوستان میں عورتوں کے سلسلے میں بات کرتے ہیں، آپ بات کرتے ہیں اس ہمت اور عقیدت کی، جس کے تحت ساوتری نے اپنے شوہر کی روح کو دوبارہ جیتنے کے لیے موت کی دنیا تک میں قدم رکھا لیکن آج کی ساوتری کا کیا حال ہے آپ اسے یہ طاقت نہیں دیتے کہ وہ قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونکے۔" سروجنی نائیڈو نے جن لفظوں میں اس موضوع پر توجہ دلائی ان سے پتا چلتا ہے کہ ان میں عورتوں کی بقا کا جذبہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو کہ انھوں نے لندن میں پایا تھا۔ جلیاں والا باغ کا حادثہ اور رولٹ بل کی مخالفت کا واقعہ، ان دونوں ہی احتجاجی مظاہروں میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔ جد و جہد آزادی میں شرکت کی سزا میں ان کو تین بار جیل بھیجا گیا۔

اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مل کر کانگریس اور سوراج پارٹی کے درمیان صلح صفائی کرا دی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں انھیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر چن لیا گیا جس کا اجلاس کانپور میں ہوا۔

۸ اگست ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی نے بمبئی میں بھارت چھوڑو تقریر کی اگلے ہی روز تمام بڑے بڑے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں گاندھی جی، کستوربا گاندھی، سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں۔ پونا کے آغا خاں محل میں ان کو ایک ساتھ قید میں رکھا گیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو سروجنی نائیڈو کو خرابیٔ صحت کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یوم آزادی کے موقع پر سروجنی نائیڈو نے اتر پردیش کے پہلے گورنر کی حیثیت سے حلف لیا۔ وہ آزاد بھارت کی پہلی خاتون گورنر تھیں۔ ۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو وہ مختصر سی علالت کے بعد وفات پا گئیں۔

گزٹ آف انڈیا کی غیر معمولی اشاعت میں ان کی شخصیت کا خاکہ ان لفظوں میں پیش کیا گیا۔ موصوفہ ایک ذہین مقرر، عظیم شاعرہ، غیر معمولی دلکشی اور جاذبیت سے بھرپور خاتون تھیں۔ ان میں مزاح کا مادہ بدرجہ اتم تھا۔ ان کی انتظامی صلاحیتیں اور عوامی مقبولیت پر تقریر کرنے کی صلاحیت مسلمہ تھی۔ سروجنی نائیڈو اب اگرچہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر آنے والی نسلیں اس بلبل ہند کو ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ ●

بقیہ گنگا ندی

کی حیثیت سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

بنگلہ دیش میں "پدما" اور راج باڑی کے مقامات کے نزدیک برہم پتر ندی گنگا ندی سے ملتی ہے جسے وہاں پدما ندی کے نام سے جانا جاتا ہے جو آگے چل کر خلیج بنگال میں گر جاتی ہے۔ اس طرح گنگا ندی اپنے آخری دور یا ضعیفی کے دور سے گزرتی ہوئی بالآخر اپنے اختتام تک پہنچ جاتی ہے۔

آج کل گنگا کے پانی میں آلودگی بڑھتی چلی جا رہی ہے جس سے کئی طرح کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ شہروں کے نکاس کا گندہ پانی بھی اسی دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ بہت سے صنعتی ادارے اپنے بچے ہوئے کیمیائی اجزا کو بھی اسی ندی میں بہا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پانی میں آلودگی اور گندگی بڑھتی جا رہی ہے۔

ہمارے سائنس داں گنگا کے پانی کی صفائی کی طرف دھیان دے رہے ہیں۔ حکومت ہند نے گنگا کو کثافت و آلودگی سے بچانے کے لیے کئی پروجیکٹس شروع کیے ہیں جو گنگا پروجیکٹس کے نام سے مشہور ہیں جن کا مقصد اس عظیم ندی کی پاکیزگی کو قائم رکھنا ہے۔ حکومت کے علاوہ یہ ہمارا بھی فرض ہے کہ جس ندی کو ہم "ماں" کا درجہ دیتے ہیں اس کو گندہ ہونے سے بچائیں اور اس کی پاکیزگی کو قائم رکھیں تاکہ ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو گنگا کا تازہ، صاف اور میٹھا پانی ملتا رہے۔

●

بقیہ آدی باسیوں کی بہبود کے لیے طرز عمل

افسروں اور (دیہی لیڈروں سمیت) غیر سرکاری ملازم افراد دونوں کو تربیت دینا سخت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں قومی دیہی ترقیات انسٹی ٹیوٹ، ریاستی دیہی ترقیات انسٹی ٹیوٹ اور آدی باسی تحقیق انسٹی ٹیوٹ جو بھی سہولتیں دستیاب ہیں ان کو مناسب ڈھنگ سے استحکام دے کر آدی باسیوں کی فلاح کے پروگرام کی ضرورتوں کے مطابق مناسب تربیت کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس موضوع کے ماہرین کا پہلا کام یہ طے کرنا ہوگا کہ کس قسم کی تربیت ضروری ہے۔

اس کے علاوہ آدی باسیوں کی فلاح کے لیے طرز عمل اپنانے میں پنڈت نہرو کے وضع کردہ پانچوں بنیادی اصولوں کو پھر سے یاد کرنا، ان کا جائزہ لینا اور ان پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

منصوبہ بنانا، نشانہ قائم کرنا، لوگوں کو منظم کرنا، ان کے کام کاج میں ہم آہنگی قائم کرنا یہ سب ضروری تو ہیں ہی، ان کے علاوہ ایسا ماحول بنانا بھی ضروری ہے جس میں نچلی سطح پورے آدی باسی معاشرے کو فوری نمو یقینی بن سکے۔

فرحت عثمانی

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر کمزور طبقوں کے مسیحا

یہ کہنا شاید مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ اگر ڈاکٹر امبیڈکر نہیں ہوتے تو پسماندہ طبقوں کو اتنی جلدی سماج میں وہ مقام حاصل نہیں ہوا ہوتا جو آج انھیں حاصل ہے۔ انھیں بجا طور سے کمزور طبقوں کا مسیحا کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا شمار بھی جدید ہندوستان کے معماروں میں ہوتا ہے۔

ہندوستان کا یہ سپوت اور کمزور طبقوں کے لیے باعث افتخار شخصیت ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو مرکزی ہندوستان میں 'مہو' کے مقام پر پیدا ہوئی۔ ان کا تعلق ہندو سماج کے ایک درج فہرست ذات 'مہار' سے تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کا پورا نام بھیوا رام جی امبیڈکر تھا جو بعد میں بھیم راؤ امبیڈکر ہو گیا۔ "مہار" ہونے کی وجہ سے اپنے ابتدائی زمانے میں انھیں بہت زیادہ بے عزتی کا رویہ اور غیر انسانی سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی باعث شروع ہی سے ذات پات کے نظام کے تئیں شدید نفرت ان کے دل میں گھر کر گئی۔

گریجویشن کے بعد انھیں اعلا تعلیم کے لیے امریکہ جانے کا موقع ملا۔ کسی غیر ملکی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے وہ پہلے "مہار" تھے۔ یہ ایک ہندوستانی اور خاص طور سے کسی درج فہرست ذات والے کے لیے ایک بے مثل موقع تھا۔ امریکہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ لندن سے انھوں نے ایم۔ ایس سی کیا۔ وہ تین عظیم شخصیتوں سے متاثر ہوئے۔ کبیر، بابا پھولے اور گوتم بدھ۔ وہ کتابوں کے بے حد رسیا تھے ان کی اپنی ایک لائبریری تھی جس میں قانون، فلسفہ، مذہب، سوشلزم، معاشیات، سیاسیات، آئینی قانون، پارلیمانی امور جیسے مختلف موضوعات پر تازہ ترین کتابیں تھیں۔ غیر ممالک میں ان کی تعلیم اور وسیع سماجی نظریے نے انھیں سماجی غلامی سے اپنے فرقے کو نجات دلانے کی راہ دکھائی۔ ان کے سامنے ایک ایسے سماج کا نصب العین تھا جو آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے اصولوں پر مبنی ہو۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے جو سماجی جدوجہد شروع کی تھی اس کا مقصد درج فہرست ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ کیے جانے والے غیر مساوی سلوک کا مقابلہ کرنا تھا۔ ان کا مقصد تمام طبقوں کو معیار زندگی بہتر بنانے کا موقع فراہم کر کے نیز ان کی ترقی کے لیے حالات پیدا کر کے ان کے لیے مذہبی، سماجی، معاشی اور سیاسی امور میں مساوی مقام پیدا کرنا تھا۔ یہ بنیادی نظریات اس ہر ایک سماجی جدوجہد کے پیچھے کارفرما تھے جو ڈاکٹر امبیڈکر کی سربراہی میں درج فہرست ذاتوں نے ذات پات کے نظام کے خلاف شروع کی تھی۔ 'مہاد ٹینک ستیہ گرہ' اور 'کالا رام مندر ستیہ گرہ' ان کچھ تحریکوں میں سے ہیں جو ڈاکٹر امبیڈکر نے چلائی تھیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے "سمتا سینک دل" یعنی سماجی مساوات کے لیے فوج قائم کی جس کا مقصد ان تمام روایات کو ختم کرنا تھا جس سے روایتی اور تہذیبی ورثے کے نام پر انسان دشمن عناصر کو بڑھاوا ملتا ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر ہندوستان کے ان چند مدبر سیاست دانوں میں سے تھے، جنھوں نے آئین سازی سے متعلق تمام امور میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ چوں کہ درج فہرست ذاتوں کی ایسی کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی اس لیے ڈاکٹر امبیڈکر نے 'آزاد لیبر پارٹی' کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی۔ اس پارٹی نے 'بمبئی' میں عام انتخابات میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر سمیت اس پارٹی کے ۱۳۔ امیدوار کامیاب رہے۔ آگے چل کر اس پارٹی کو درج فہرست ذاتوں کے کل ہند فیڈریشن میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں لیبر ممبر کے طور پر شامل ہوئے۔ ڈاکٹر امبیڈکر آزاد ہندوستان کی سب سے پہلی مرکزی کابینہ میں سب سے پہلے درج فہرست ذات کے ہندو وزیر بنے۔ ان کو وزیر قانون بنایا گیا۔ انھوں نے ہندو کوڈ بل پیش کیا تاکہ ہندو کوڈ ملک بھر میں یکساں رہے۔ وہ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے لیے بھی منتخب ہوئے۔ ان کو مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کے لیے منتخب کیا گیا۔ آگے چل کر ان کو اس کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا ان کا خاص مقصد درج فہرست ذاتوں کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد وہ حزب مخالف کے رہنما بھی رہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے بارے میں یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے آئین کے معمار اعلا کے طور پر ان کے اثر کی وجہ سے ہی اشوک چکر

سی۔۴۹، منٹو روڈ کمپلیکس، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

ہندوستان کے جھنڈے میں رکھا گیا تھا اور سارناتھ میں اشوک کی لاٹ سے ببر شیر کو "قومی نشان" کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ بدھ مذہب میں مساوات، انصاف اور انسان دوستی کی اخلاقی بنیاد کی وجہ سے ڈاکٹر امبیڈکر بدھ مذہب کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے اسے اپنایا۔ تعلیم سے انتہائی لگاؤ ہونے کے سبب انھوں نے پیوپلز ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی نیز بمبئی اور اورنگ آباد میں کالج شروع کیے۔ ڈاکٹر امبیڈکر انسانی حقوق کے علم بردار تھے۔ وہ ماہر اقتصادیات اور ماہر سماجیات بھی تھے۔ انھیں ہندوستان کے بہترین محسنان وطن میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر ایک مشہور اسکالر، ممتاز ماہر تعلیم، مدبر، موثر مقرر، قابل منتظم اور پسماندہ لوگوں کے نڈر رہنما تھے۔ انھوں نے درج فہرست ذاتوں کو متحد کیا، انھیں اونچا اٹھانے کے لیے انتھک کوشش کی اور ہندوستان میں سماجی اور سیاسی اہمیت دلائی۔ ان کی قیادت کی وجہ سے ایک سرگرم تعلیم یافتہ متوسط طبقہ پیدا ہوا۔ ان کا نام ہندوستان کے سماجی اور آئینی ارتقا کی تاریخ میں نمایاں رہے گا۔

وہ ایک سچے دانشور ہونے کے علاوہ ایک عظیم مدبر ثابت ہوئے۔ انھوں نے پسماندہ طبقوں کے تحفظ کے لیے سیاسی تحفظات کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ ان کی کل ہند قیادت کا نچوڑ اپنے فرقے کے تئیں ان کی وفاداری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ ہی اپنے فرقے کی آزادی اور بہبود کو افضل رکھا۔ وہ اہم سیاسی فیصلوں پر اثر انداز رہے۔ اگرچہ وہ اپنے فرقے کے رہنما تھے لیکن وہ تمام مسائل کو سیکولرزم کے زیادہ بڑے کینوس پر دیکھتے تھے۔ مغرب کا اثر، قانون کی برتری، شہریوں کی مساوات، قانون سازی اور پالیسی فیصلوں میں سیاسی شرکت، سماجی اصلاحات کی وسیع کوششیں کچھ ایسے عناصر ہیں جن سے ہندوستانی سیاست میں سیکولر رجحانات پیدا ہوئے۔ یہ رجحانات پیدا کرنے میں ڈاکٹر امبیڈکر کا بھی ایک اہم کردار تھا۔ انھوں نے علاحدگی پسندی کے رجحانات کی مخالفت کی۔ قومی یک جہتی کے سلسلے میں ان کا کردار عظیم تھا۔ ان کی تعمیری رہنمائی نے معماران قوم کی صف میں ان کا قطعی مقام بنایا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے مطابق ذات پات ختم کرنے کا مسئلہ ہندوستانی سماج کی بنیادی سماجی اور اقتصادی تعمیر نو کے مسئلے سے جڑا ہوا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۵۶ء کو ہندوستان کا یہ روشن ستارہ اس دنیائے فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر امبیڈکر اپنی تعلیمات، کارناموں اور تحریروں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ●

بقیہ کور ۳: ماحولیات کے تحفظ میں دیہی خواتین کا کردار

موجودہ زمانے میں یہ "چپکو تحریک" اتر پردیش کے کوہستانی اضلاع چمولی، کمایوں، گڑھوال، پتھورا گڑھ وغیرہ میں شروع ہوئی اور جنگلوں کی تباہی کے خلاف تحریک کی صورت میں دنیا بھر میں سراہی جا چکی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس تحریک کو چلانے والی عورتیں پہاڑ کے دیہی علاقوں کی رہنے والی اَن پڑھ خواتین ہیں یہ سرگرم اور خون خرابہ سے مبرا تحریک تاریخ عالم کو خواتین کی انوکھی دین ہے۔ یہ تحریک ان کی اپنی زندگی کے تحفظ کی تحریک ہے۔ ان خواتین نے اپنی تحریک کو اس طرح سے منظم کیا ہے کہ ان کے گاؤں کا ہر کنبہ جنگلوں کی حفاظت کے لیے حفاظتی دستہ تعینات کر کے اجتماعی چندہ تحریک سے ان کی تنخواہ کی ادائیگی کا اہتمام کرتا ہے ان خواتین کی لغت میں "ناممکن" نام کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس تحریک کی خاص رہنما گائتری دیوی ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ جنگلوں اور ماحول کی حفاظت کے لیے ان کی جدوجہد پیہم جاری رہے گی۔

سیوامنڈل کی مساعی

راجستھان میں اودے پور کے نزدیک دیہی علاقوں کی عورتیں مردوں کے ساتھ دوش بدوش اوسر اور ریتیلی زمین کو ہرے بھرے کھیتوں میں بدل رہی ہیں۔ سیوا منڈل نام کے ایک ادارے نے پسماندہ بھیل قبیلے کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہے کہ اب وہ صدیوں سے ویران پڑی زمین کو سرسبز و شاداب بنانے میں مصروف ہو گیا ہے۔ یہ ادارہ اودے پور کے چھ وکاس کھنڈوں کی حفاظت میں بڑے تن من سے لگا ہوا ہے۔ اس کے اس حوصلہ اور کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہی حفظان ماحول کے لیے سال ۱۹۹۱ء کا کے۔ پی۔ گوئنکا انعام خواتین کے اس "سیوامنڈل" نام کے ادارے کو ملا ہے۔

ہماچل پردیش کی خواتین بھی تحفظ ماحولیات کے پروگرام میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہاں کی خواتین چھوٹی چھوٹی ٹولی سا کر تحریک میں موثر سرگرمی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

"سرملا بچاؤ" تحریک کے ضمن میں میدھا پاٹیکر بھی کافی معروف ہیں انھیں اس تحریک کے لیے جیل تک بھی جانا پڑا ہے۔ حفظان ماحول میں ان کی موثر کارکردگی کے پیش نظر ہی انھیں بین اقوامی "گرین ربن ماحول انعام" سے نوازا گیا ہے۔ جو نوبل انعام کے مساوی قرار دیا جاتا ہے اس کے علاوہ انھیں کئی ملکی اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ محترمہ وندنا شیوا جی بھی اسی طرح کی جفاکش ماحول کی محافظ کارکن ہیں۔ حفظان ماحول سے متعلق ان کے کارناموں کے مدنظر ہی انھیں سال ۱۹۹۳ء میں "رائٹ لائولی ہڈ" بین اقوامی ماحولیات انعام عطا کیا گیا ہے۔

اس طرح واضح ہے کہ ماحولیات کے تحفظ میں خواتین نے اہم کردار ادا کیا ہے اور خاص طور سے دیہی علاقوں کی خواتین کی مساعی اور سرگرمیوں کو تو کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔ ●

بقیہ: اناج بینک۔ غریبی مٹانے کی ایک راہ

نتیجہ

اناج بینک بہت زیادہ تعریف کے قابل سسٹم ہے اور اس کے اثرات بہت وسیع تر ہیں اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اڑیسہ سرکار ایک پروجیکٹ "ہاؤس ہولڈ فوڈ سیکورٹی پروجیکٹ" لاگو کر رہی ہے جس کا تعاون یونیسیف اور ریاست میں غیر سرکاری تنظیمیں (این۔ جی۔ اوز) اپنی سرگرم شرکت سے کر رہی ہیں۔ ●

شہزاد شمس

مسلم خواتین اور جنگِ آزادی

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا دن ہے جب پہلی بار میرٹھ چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہیوں نے باضابطہ انگریز حکومت کے خلاف بغاوت شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں اس کی لہر دوڑ گئی، جس میں سیکڑوں انگریز افسران ہلاک ہوئے۔ اس کامیابی سے ہندوستانی سپاہیوں کا تھوڑا حوصلہ ضرور بلند ہوا لیکن بہت جلد یہ درہم برہم ہو گئے اور ایک بار پھر انگریزوں نے پورے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس کے بعد انگریزوں نے انتقامی کارروائیوں کا آغاز کیا، جس میں اہلِ وطن تشدد کے شکار ہوئے۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کی وجوہ جو بھی رہی ہوں لیکن یہ نقطۂ آغاز مسلسل آزادی کی جنگوں کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔

تقریباً ایک صدی کی جنگِ آزادی کی اس لڑائی میں بادشاہ، نواب، راجہ، پرجا، سپاہی، سپہ سالار، مولوی، پنڈت، امیر، غریب سب نے حصہ لیا، جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان عورتوں میں مسلم خواتین بھی تھیں، جنھوں نے دوسرے بھائی بہنوں کی طرح اس انقلابی دور میں غیرت و حمیت، بہادری و سرفروشی اور ایثار و قربانی کے دائمی نقوش چھوڑے۔ چاہے تحریک عدم تعاون ہو یا انگورہ فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام، ولایتی کپڑوں میں آگ لگانی ہو یا سودیشی کو عام کرنا، ہر موقع پر خواتین پیش پیش رہیں۔

جنگِ آزادی میں حصہ لینے والی زیادہ تر مسلم خواتین پردہ نشین تھیں۔ اپنے زمانے کے معاشرتی تناظر میں ان خواتین کا بیدار سیاسی شعور اور قومی سیاسی زندگی میں ان کی شرکت قابلِ تحسین اور ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھا۔ جس کا تصور ہمیں آج کے معاشرے میں مشکل سے ہو سکے گا۔ ان خواتین میں اول مقام بیگم حضرت محل کو حاصل ہے۔

واجد علی شاہ کے قید ہونے کے بعد جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو ایک سربراہ کی تلاش تھی جو ان کی رہنمائی کر سکے اور حوصلہ بلند کر سکے۔ فوجی افسروں نے یکے بعد دیگرے شاہی خاندان کے چند سربرآوردہ افراد سے قیادت کی درخواست کی۔ لیکن ان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وہیں ایک حضرت محل کی ذات بھی تھی جس نے اس پُرآشوب زمانے میں قیادت کا بارِ گراں اپنے کندھوں پر اٹھا کر غیر معمولی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا اور ان ہستیوں کی فہرست میں شامل ہو گئیں جن کے ہاتھوں آزادی کے شاندار قلعے کی خشتِ اول رکھی گئی۔

اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل ایک حوصلہ مند اور ہمت ور خاتون تھیں۔ ایک بار جو عزم کیا اسے آخری لمحے تک نبھایا۔ سپاہیوں کی قیادت کی سربراہی کے بعد بیگم حضرت محل نے فوجی محاذ کو آگے بڑھانے کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ایک فوجی گروہ بھی تیار کیا، جس میں جاسوس عورتوں کا بھی ایک گروہ تھا۔ ان کی (سپاہیوں) کی حوصلہ افزائی کے لیے بیگم زیادہ سے زیادہ انعامات سے نوازتیں۔

حضرت محل کی غیر معمولی شجاعت و مستعدی اور ان کے ذریعہ کی گئی مقاومت سے انگریز فوج کافی پریشان ہوئی، جس سے گھبرا کر انگریز فوج کے جنرل نے دورانِ جنگ ہی صلح کے لیے کئی شرطیں رکھیں لیکن بیگم حضرت محل نے ان شرطوں کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر صلح نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

جنگ میں ہار کو دیکھتے ہوئے حضرت محل لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ مختلف مقامات خیرآباد، بریلی، محمود آباد، بونڈی (بہرائچ) سے ہوتے ہوئے حضرت محل ہندوستان کی سرحد پار کر کے نیپال چلی گئیں۔ نیپال ہی میں ان کی وفات ہوئی اور زندگی کی آخری سانس تک وہ کبھی انگریزوں کے ہاتھ نہ آنے کے عہد پر قائم رہیں۔

حضرت محل کے دوش بدوش لکھنؤ میں تحریکِ آزادی کے چلانے والے مولوی احمد اللہ شاہ، راجہ بینی مادھو سنگھ، راجہ مان سنگھ، راجہ جیالال جیسی مقتدر ہستیاں بھی موجود تھیں۔

اسی زمانہ میں جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کی عبرت انگیز مثال دہلی کی ایک سبز پوش بوڑھی عورت اور کانپور کی

۵۲-ستلج ہاسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔ ۶۷

عزیزن قائم کررہی تھیں۔ یہ دلیر عورتیں مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتیں اور شہر کے لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرتیں۔ مغل خاندان کو ایک ایک کر کچلنے والے ہڈسن نے بھی دہلی کی اس سبز پوش خاتون کو ہندوستان کی "جون آف آرک" کے نام سے منسوب کیا ہے۔

دوسری طرف عزیزن جو لکھنؤ میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئی، چند ساتھیوں کی مدد سے عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج منظم کررہی تھی۔ اس کے لیے وہ گھر گھر جاتی، عورتوں کو گھڑسواری اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتی۔ خواتین کی یہ چھوٹی سی فوج زخمی سپاہیوں کو طبی امداد پہنچاتی، ان کے لیے گولے بارود فراہم کرتی، جاسوسی و جنگی اطلاعات حاصل کرتی جن میں مختلف اہم شخصیتوں تک پہنچایا جاتا۔ خواتین کا یہ فوجی دستہ اپنی مخصوص وردی میں ملبوس گھوڑوں پر سوار، ہاتھ میں تلواریں لیے جب خاص خاص شاہراہوں سے گزرتا تو سڑک کے دونوں طرف کھڑی بھیڑ فلک شگاف نعروں سے استقبال کرتی اور فضا 'عزیزن زندہ باد' کے نعروں سے گونج اٹھتی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے متعدد محاذوں کی مانند کانپور میں بھی انقلابیوں کی شکست ہوئی۔ کرنل ولیم نے جب باغیوں کی فہرست تیار کی تو عزیزن کا نام سرفہرست رکھا۔

آزادی کی اس پہلی لڑائی میں اصغری بیگم، حبیبہ، رحیمی جیسی سیکڑوں خاتون برطانوی افواج کی مزاحمت کے جرم میں پکڑی گئیں اور شہید ہوئیں۔

تاریخ اب بیسویں صدی میں داخل ہو چکی تھی۔ ایک عرصے کے بعد ہندوستان میں پھر ایک بار سیاسی افق کا عکس ابھرنا شروع ہوا۔ جوایمان راسخ، حب الوطنی، قومی یک جہتی، حق پسندی، آزادئ فکر، بلند حوصلگی یعنی حادثات وقت کے ساتھ ساتھ جیوں جیوں نقوش واضح ہوتے گئے، ان رنگوں کی دل آویز آمیزش پرستارانِ وطن وملت پر سحر کرتی چلی گئی۔

اس کارواں میں ایک اہم نام بی اماں (والدۂ محمد علی، شوکت علی) کا ہے۔ جو جوانی میں ہی بیوہ ہوگئیں۔ اَن پڑھ ہونے کے باوجود بہت سلیقہ مند اور عقلمند تھیں، جس کا اعتراف محمد علی نے بھی کیا ہے۔ کچھ لکھنے پڑھنے کے بعد جب بی اماں تحریک آزادی میں شامل ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقرروں میں کیا جانے لگا۔

عملی طور پر بی اماں نے سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے کیا۔ بعد میں تحریک خلافت کی بھی فعال ممبر رہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں جاکر نوجوان مردوں و عورتوں میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ مختلف جگہوں پر پُر اثر تقاریر بھی کیں، زنانہ کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ اپنے وقت کی دوسری سرگرم خواتین شریمتی کستوربا گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، مسز اینی بیسنٹ، انوسوئیا بائی، سرلا دیوی، محترمہ امجدی بیگم (بیگم محمد علی) بیگم حسرت موہانی، بیگم محترمہ جواہر، محترمہ بیگم سیف الدین کچلو وغیرہ کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ ساتھ ہی ان کے عزم مسلسل سے مردوں کو بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں آزادی کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

بیگم حسرت موہانی (نشاط النساء بیگم) کی کہانی بھی دار و رسن کی آزمائش کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے بھی بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ حسرت موہانی کی پہلی گرفتاری جو "اردوئے معلیٰ"، میں چھپے مضمون "مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کی وجہ سے ہوئی تھی، نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ حسرت کی دوسری گرفتاری سے نشاط النساء کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے معاشرے کی مخالفت کے باوجود پردہ ترک کیا۔

دوران قید نشاط النساء حسرت کو خطوط و اخبارات پہنچا کر حالات سے آگاہ کراتیں۔ اس درمیان بیگم حسرت سیاسی میدان میں کھل کر آچکی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے فیصلہ کن موڑ پر جب وزیر ہند لارڈ مانٹیگو نے سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین کے ایک وفد سے بھی ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اس وفد میں دوسری اہم خواتین مسز این دلوی، ڈاکٹر مس این جوشی، مسز جبارا داس، مسز سروجنی نائیڈو، مسز بیسنٹ وغیرہ کے ساتھ بیگم حسرت موہانی بھی شامل تھیں۔ اس ملاقات میں بیگم حسرت نے صاحب وزیر ہند کے روبرو نظر بندوں کی آزادی کا پیغام اس طرح پہنچایا تھا۔ "جب کہ باغیانہ آئرلینڈ کو رہا کردیا گیا ہے تو نظر بندان ہند کو بھی آزاد فرما دیجیے۔"

نشاط النساء بیگم کی سیاسی اجلاس میں شرکت، سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کی جدوجہد، کل ہند کانفرنس میں شمولیت، ہم خیال سیاسی رہنماؤں سے خط و کتابت، قومی اخبارات سے وابستگی جیسی سرگرمیاں، ان کی منفرد حیثیت کی واضح نشاندہی کرتی ہیں۔ جدوجہد آزادی کے دوران ہی بیگم حسرت نے ۱۹۳۷ء میں دنیائے فانی کو لبیک کہا۔

امجدی بیگم (بیگم محمد علی) اس مجاہد ملک وملت کی رفیقۂ حیات تھیں جس نے کہا تھا۔ "جب وطن کا معاملہ ہے تو میں اول ہندوستانی بعد میں مسلمان ہوں اور اسلام کا معاملہ ہے تو میں پہلے مسلمان ہے اور بعد میں ہندوستانی ہوں۔" امجدی بیگم مولانا کے ساتھ ہر جلسہ، ہر سفر اور دوسری کارروائیوں میں شریک رہتی تھیں۔ آپ نے دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہوئی انڈین نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں یو پی کی نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ستیہ گرہ تحریک اور خلافت تحریک کے لیے بی اماں (والدہ محمد علی) کے ساتھ کروڑوں روپے کا چندہ بھی جمع کیا تھا۔ اپنے عورتوں کے حلقے میں وہ اچھی منتظم بھی تھیں۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی

عورتوں میں بڑی سرگرمی سے پروپیگنڈہ کرنا شروع کیا اور جدو جہد آزادی کے لیے عورتوں کو تیار کیا۔

قومی محاذ پر ہندوستانی خواتین کے خدمات کے تذکرے میں ۲۹ نومبر ۱۹۲۱ء کے "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی نے امجدی بیگم کے لیے "ایک بہادر خاتون" کے عنوان سے خصوصی طور پر مضمون لکھا۔ امجدی بیگم زندگی کے آخری برسوں میں کسی وجہ سے مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئی تھیں۔

سعادت بانو کچلو، سیف الدین کچلو کی شریک حیات تھیں، جن کی ۱۸۹۳ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدائش ہوئی۔ وہ علمیت و قابلیت کی گہوارہ تھیں۔ بچپن سے ہی مختلف رسائل میں مختلف مسائل پر مضامین لکھنا، ان کے وسعت مطالعہ، دوراندیشی، دوربینی، قومیت اور حب الوطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بچپن سے ہی ان کے کلام میں جذبۂ حب الوطنی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ رسائل "زمین دار" اور "ہمدرد" نے انھیں دنیائے سیاست کی نئی راہوں سے روشناس کرایا اور بڑے انہماک کے ساتھ قومی وملی خدمات کے لیے کمربستہ ہوئیں۔ شادی کے بعد شوہر کے کاندھے سے کاندھا ملا کر چلیں۔ ہر طرح کے سیاسی جلسے و دوسرے جلسے خصوصاً زنانہ جلسوں میں شریک ہونا اور پُرجوش تقاریر کرنا، ان کا اہم مشغلہ تھا۔ آزادی کے بعد بائیں بازو کی سیاست میں دلچسپی لینے لگیں۔

بیگم خورشید خواجہ حیدرآباد کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور علی گڑھ کے بیرسٹر خواجہ عبدالمجید جو جنگ آزادی کے نامور مجاہد بھی تھے سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد خورشید بیگم نے پردہ ترک کر دیا اور قومی محاذ پر قوم پرست شوہر کے شانہ بشانہ چلنے کا فیصلہ کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر رہیں۔ علی گڑھ میں کھادی بھنڈار قائم کیا۔ یہیں سے "ہند" نام سے ماہانہ جریدہ جاری کیا۔ ۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد میں حمیدیہ گرلس سکنڈری اسکول قائم کیا جو اب ایک ڈگری کالج ہے۔

تحریک آزادی میں خواتین کی شرکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس زمانے میں ان کے مجاہد شوہر جیلوں میں چکی کی مشقتیں برداشت کیا کرتے تو ان کی رفیقۂ حیات نہ صرف یہ کہ اپنے گھروں کا انتظام سنبھالیتیں بلکہ ہر طرح کی معاشی پریشانیوں، ذہنی الجھنوں اور دیگر مشقتوں کے باوجود اپنے شوہروں کے حوصلے کو بڑھاتیں اور دوسرے اسیران آزادی کے خاندانوں کی بھی دیکھ بھال کرتیں۔ ایسی ہی بلند حوصلہ خواتین میں زلیخا بیگم (بیگم مولانا ابوالکلام آزاد) کا نام سرفہرست آتا ہے۔

تحریک خلافت کے سلسلے میں دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب مولانا آزاد کو سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا تو زلیخا بیگم نہ صرف ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ ہوئیں بلکہ یہ بھی کہا کہ مولانا کی خدمات کی جو جگہ بنگال میں خالی ہوئی ہے وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو ہماری موجودگی میں انجام پائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی زلیخا بیگم نے ہر موقع پر مولانا کا ساتھ دیا۔ انہی وجوہ سے شاید مولانا حسرت موہانی یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں گے کہ اگر بیگم حسرت، بیگم آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد الہلال و البلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لال زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے۔ یہ عورتیں وفا اور ایثار کا مجسمہ تھیں جنھوں نے اپنی جان دے دی مگر کبھی ان کی زبان پر حرف غلط کی طرح بھی نہیں آیا کہ آپ تو جیل جا رہے ہیں میرا کیا ہوگا؟

زاہدہ خاتون شروانیہ (زہ۔ ش) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر نواب مزمل اللہ خاں شروانی کی صاحبزادی تھیں۔ زاہدہ ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، بالغ نظر، خوش فکر شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ اصلاح معاشرت جس میں آزادیٔ نسواں کی خصوصی طلب گار تھیں۔ انھوں نے عورتوں و مردوں کو بڑی دل سوزی سے انقلاب پر ابھارا۔ خاص طور پر عورتوں کو اپنے حقوق طلب کرنے اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی بڑی پُرجوش تلقین کی۔

زاہدہ خاتون نے ۱۲ برس کی عمر میں ہی عورتوں کی زبوں حالی پر ایک طویل نظم "آئینۂ حرم" لکھی تھی جو اقبال کے شکوہ کی ہم رنگ و ہم آہنگ ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اپنی ایک مشہور نظم "موصل کا تیل" میں کھل کر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی مشہور نظمیں "آشوب اسلام" اپیل منظوم برائے امداد ہلال احمر "عید کی خوشی" میں "شہدا کی یاد" "زندہ باد الوزپاشا" وغیرہ ہیں۔

قومی رہنماؤں کی شخصیتیں بھی زاہدہ خاتون کی توجہ کا خاص مرکز تھیں۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی اور آنجہانی گوکھلے ان سب کی وفات کے قومی حادثے پر ان کے قلم نے کھل کر اشک فشانی کی ہے۔ قومی سیاست کے بارے میں زاہدہ خاتون ایک مستحکم عقیدہ رکھتی تھیں۔ گاندھی جی کی شخصیت کا اثر، قومی آزادی کا مطلب، سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، حمایت مزدور وغیرہ سبھی سیاسی و سماجی تحریکات کی خلوص دل سے تائید کرتی تھیں۔ ملک کے اتحاد پر ان کی ایک نظم "ترانہ اتحاد" موجود ہے۔

اس کے علاوہ خدیجہ بیگم، زبیدہ بیگم داؤدی (بیگم شفیع داؤدی) کنیز سیدہ بیگم (کانگریسی رہنما سید صلاح الدین کی چھوٹی بہن) منیرہ بیگم (بدرالدین طیب جی کی بھتیجی) صغرا خاتون وغیرہ ایسی خواتین ہیں جو سودیشی تحریک، چرخہ تحریک، ستیہ گرہ تحریک سے وابستہ تھیں، خواتین کے جلسوں میں شریک ہوتیں اور کانگریس کی فعال ممبر بھی تھیں۔

جنگ آزادی کے آخری مرحلے کی جدوجہد میں کالج یا اسکول کی فارغ التحصیل خواتین زیادہ تھیں۔ یہ خواتین براہ راست گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات و نظریات کے زیر اثر قومی محاذ میں شامل ہوئیں، جہاں ان کے ہمہ جہت مقاصد، ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد و دیہی ترقی، تعلیم بالغان، عوامی رابطہ منصوبہ جیسے کاموں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہیں۔ ان میں بعض

باقی صفحہ ۳۳ پر

آئینِ ہند: اقلیتوں کی بہبود کا ضامن

ہندوستان میں ایک دلچسپ اور حیران کن صورت حال یہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ ہر مذہب عالم گیر بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے اور امن وسکون سے رہنے کی تلقین کرتا ہے لیکن اس کے باوجود یہاں مذہب کی بنیاد پر تفرقہ اور ناچاقیاں دیکھنے کو ملتے ہیں اور یہ نہ صرف ہندوستان کا بلکہ پوری تاریخ انسانی کا المیہ ہے کہ مذہب ہمیشہ ہی تنازعات کا سبب بنتا ہے۔ ہندوستان کی تقریباً ایک ہزار سال کی تاریخ سے بھی اس طرح کی مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں جس کی وجہ سے برطانوی سامراج نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور عرصہ دراز تک لوگوں کو آپس میں لڑا کر حکومت کی۔

ہندوستان کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہوئی لیکن اس سے ملک میں مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا بلکہ اور پیچیدہ ہوگیا۔ تقسیم وطن کے وقت ہندوستان میں تقریباً ۴ کروڑ سے زیادہ مسلمان تھے جو دیش بھر میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے علاوہ ایک کروڑ عیسائی، ۵۰ لاکھ سکھ اور کافی تعداد میں پارسی، جینی، بودھ اور یہودی تھے۔ ہندوؤں کی سب سے بڑی اکثریت تھی اور یہ ۸۵ فی صد تھے، اگر یہ نمائندہ اداروں میں ایک مذہبی گروپ کی شکل میں پیش کیے جاتے تو وہ اپنی من مانی سے جو قانون چاہتے پاس کرا لیتے اور پوری سرکاری مشینری پران کا کنٹرول ہوتا لیکن اس طرح کے عمل سے مذہبی اقلیتوں کا اعتماد متزلزل ہو جاتا اور ہندوستان میں جمہوری نظام بے معنی ہو کر رہ جاتا، چناں چہ آئین میں بنیادی حقوق کی ضمانت کا تصور ایک ایسی راہ پیش کرتا ہے جس سے جمہوری نظام کی روح کو محفوظ رکھا جاسکے، تقریر اور اظہار خیال کی آزادی اس طرح انجمنوں اور یونینوں کو بنانے کا حق نیز مذہبی تقریروں اور مذہب کے موضوع پر اظہار خیال کی آزادی کی ضمانت بھی ہندوستان کے سیکولرزم کی آبرو ہے۔ یہی نہیں مذہبی اقلیتوں کو مکمل اعتماد بخشنے کے لیے ایسی دفعات آئین میں شامل کردی گئیں جن سے مذہبی آزادی کا حق مکمل طور پر باقی رہے، چناں چہ آئین کے آرٹیکل ۲۵، ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ کو شامل کرکے مذہبی اقلیتوں کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا گیا۔ یہ دفعات دراصل اقلیتوں کے ساتھ ایک معاہدے کا درجہ رکھتی ہیں۔ آئین ساز اسمبلی نے اس سلسلے میں اقلیتوں کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی تھی، اس نے یہ آرٹیکل اتفاق رائے سے شامل کیے تھے۔ اس سے ملک میں ہم آہنگی، قومی یک جہتی اور اعتماد کی ایک نئی فضا قائم ہوسکی۔ ان دفعات نے آئین کی تمہید میں شامل منشا اور مقصد کو بھی پورا کیا یعنی تمام شہریوں کو فکر، سوچ، اظہار خیال، عقیدہ، یقین اور عبادت کی مکمل آزادی دی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں اقلیتوں کو جس قدر سلامتی اور آزادی حاصل ہوگی، اسی قدر حکومت مستحکم اور مضبوط ہوگی۔ اس ملک میں آزادی کے حصول کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں ہر رنگ ونسل اور ہر مذہب کے ماننے والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کی لڑائی میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے کاندھے سے کاندھا ملا کر حصہ لیا۔ اس میں ایک طرف مولانا محمد علی، مولانا برکت اللہ بھوپالی، مولانا آزاد، شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا سید حسین احمد مدنی کے اسمائے گرامی شامل ہیں تو اُدھر مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری اور دیگر متعدد عظیم ہستیاں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس سے ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا پتا چلتا ہے، چناں چہ آزادی کے بعد جمہوریت کے اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے ہندوستان کے آئین میں اقلیتوں کا پوری طرح تحفظ بحال رکھا گیا۔ ہندوستان کے آئین میں اس بات پر زور ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، سب کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ آرٹیکل ۲۹ میں سبھی اقلیتوں کے لیے خاص طور پر تحفظ کی صراحت کی گئی ہے۔ اس آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی حصے میں بسنے والے شہریوں کا کوئی بھی طبقہ جو زبان، رسم الخط یا ثقافت کی اپنی الگ پہچان رکھتا ہو، اس کو اسے قائم رکھنے کا پورا پورا حق ہے، کسی بھی شہری ریاست کے زیر اہتمام چلنے والے تعلیمی ادارے یا سرکاری فنڈ سے چلنے والے تعلیمی ادارے میں داخلہ سے کسی کو مذہب، نسل، ذات پات، زبان یا ان میں سے کسی ایک وجہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ آئین کی رو سے ایک اقلیتی کمیشن ملک میں قائم کیا گیا ہے۔ یہ کمیشن اقلیتوں کو دیے گئے تحفظات کا جائزہ لیتا ہے اور ان پر عمل درآمد کو موثر بنانے کے لیے سفارشیں کرتا ہے نیز اقلیتوں کی شکایتوں کو سن کر دور کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ دفعہ ۳۰ میں تمام

ثروت ایم۔ اے۔ صدیقی
۱۲-۸، مبتی پورہ، کوٹھی ظہیر اللہ خان غازی آباد۔ یوپی

اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنیاد پر ہوں یا زبان کی، ان کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام کا حق حاصل ہے۔ کچھ ریاستوں میں اقلیتی سیل قائم کیے گئے ہیں تاکہ اقلیتوں کی بہبود کے اقدامات پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جا سکے۔ مالیاتی کارپوریشنیں قائم کی گئی ہیں تاکہ اقلیتوں کو آسان شرطوں پر قرض دیا جا سکے، کچھ ریاستوں میں پولیس میں بھرتی کے لیے جو سلیکشن کمیٹیاں قائم ہیں، ان میں اقلیتی افراد کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ بھرتی کے معاملے میں اقلیتوں کی نمائندگی ہو سکے، قومی ملکیت کے بینکوں، پبلک سیکٹر کے اداروں اور ریلوے وغیرہ میں گروپ سی اور گروپ ڈی کی اسامیوں پر بھرتی کے لیے جو سلیکشن کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں، ان میں بھی اقلیتی افراد کے نمائندوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ بینکوں میں بھرتی کے لیے اقلیتوں کو یہ رعایت دی گئی کہ بھرتی سے قبل ان کی تربیت کے مراکز کھولے جائیں۔ ریاستی راجدھانیوں میں یہ مراکز کام کر رہے ہیں۔

پسماندہ اقلیتوں والے اضلاع میں کلرکوں کی بھرتی کے لیے ایسے مراکز کھولے گئے ہیں جہاں بھرتی سے پہلے امیدواروں کو تربیت دی جاتی ہے۔ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ دفاتر روزگار، اقلیتی افراد کے روزگار کے متلاشی امیدواروں کے نام رجسٹر کرنے اور پھر انھیں بھرتی کرنے والے اداروں کے پاس بھیجنے میں کسی قسم کا امتیاز نہ برتیں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں، تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی طبقوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اقلیتی فرقے کی لڑکیوں کے لیے سلائی، بنائی، کشیدہ کاری جیسے گھریلو کاموں میں تربیت دینے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ضمیر کی آزادی

آرٹیکل ۲۵ (الف) میں کہا گیا ہے کہ سبھی لوگوں کو یکساں طور پر ضمیر کی آزادی حاصل ہے اور وہ آزادانہ طور پر مذہب کو قبول کرنے، اس پر عمل درآمد کرنے اور اس کی اشاعت کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ اس آرٹیکل کے الفاظ امریکہ کے مذہبی آزادی کے تصور کو سامنے رکھ کر وضع کیے گئے ہیں۔ امریکہ کی سپریم کورٹ کی وضاحت یہ ہے کہ مذہبی عقائد کی آزادی کیا ہے؟ اور اس پر عمل درآمد کا کیا مطلب ہے؟ وہ یہ کہ اس پر عمل درآمد یا اس کو ماننے سے امن، قانون یا معاشرتی اخلاق و آداب کے مفادات کو ضرر نہ پہنچے۔ چناں چہ آج ہمارے ہندوستان میں بھی یہی تصور رائج ہے کہ مذہب کے نام پر ایسا کچھ نہ کیا جائے جس سے مذہب پر عمل درآمد اور اس کی اشاعت بے لگام ہو جائے۔ چناں چہ آرٹیکل ۲۵ (الف) میں مذہبی آزادی کے ضمن میں تین پابندیاں ہیں یعنی سرکاری نظم و نسق اور انتظام و انصرام میں خلل واقع نہ ہو، اخلاقی قدریں محفوظ رہیں اور صحت مند معاشرہ پنپ سکے۔ دراصل ان پابندیوں کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہمارے سماج میں اخلاقی بیداری کے زیادہ سے زیادہ آئے، آئین ساز اسمبلی کے چند ارکان اس بات کے مخالف تھے کہ آئین میں مذہب کی اشاعت کی اصلاح استعمال نہ کی جائے کیوں کہ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہے کہ عوام کو تبدیلیٔ مذہب پر آمادہ نہ کر لیا جائے، مگر اکثریت اس کی حامی تھی۔ اس لیے سپریم کورٹ نے ہر شخص کو اس کے صوابدید اور ضمیر کے مطابق مذہبی عقائد کی آزادی دی ہے۔

آرٹیکل ۲۶، دراصل آرٹیکل ۲۵ کا تتمہ ہے۔ اس میں مذہبی امور کے انتظام و انصرام کی آزادی دی گئی ہے۔ آرٹیکل ۲۷ میں کسی بھی مذہب کے لیے خرچ کی گئی رقومات کو ٹیکسوں سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا تھا کہ ہندوستان میں مذہب کا تصور بہت وسیع ہے کہ یہ پیدائش سے لے کر مرنے تک زندگی کے سبھی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ چناں چہ آئین کا مقصد سیکولر ریاست کا قیام ہے۔ آئین اس سیکولر ریاست کا تصور کیا ہے؟ وہ یہ کہ ریاست مذہب، رنگ و نسل یا فرقہ، برادری کی بنیاد پر کسی کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتے گا۔ ریاست کا کوئی خاص مذہب نہیں ہوگا۔ نہ ہی کسی مذہب کو ریاست کی سرپرستی حاصل ہوگی، نہ ہی کسی مذہب کو ریاستی مذہب کے طور پر قابل ترجیح سمجھا جائے گا۔ ریاست کسی شخص کے ساتھ اس بنیاد پر رعایت نہیں برتے گی کہ وہ کوئی خاص مذہب مانتا ہے۔ اگرچہ سیکولر کی اصطلاح آئین میں کہیں نہیں تھی اور سب سے پہلے یہ ۱۹۷۶ء میں استعمال کی گئی تاہم آئین سازوں نے سیکولرازم کے مفاہیم کو آئین میں پہلے ہی داخل کر دیا تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے ۱۹۵۱ء میں پارلیمنٹ میں ہندو کوڈ بل کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے سیکولر کی اصطلاح کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ سیکولر اسٹیٹ کا مطلب یہ نہیں کہ ہم عوام کے مذہبی جذبات کا احترام نہیں کرتے، سیکولر ریاست کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ پارلیمنٹ باقی لوگوں پر کسی خاص مذہب کو تھوپنے کی مجاز نہیں ہے اور آئین اس واحد پابندی کو قبول کرتا ہے۔

آئین کی ۴۲ ویں ترمیم میں اس صورت حال کو اور زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے سیکولر کی اصطلاح کو آئین کی تمہید میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ اصطلاح دراصل مغربی ملکوں کی ہے اس کے ارتقا میں صدیاں لگی ہیں۔ شروع میں یہ مذہب کی نفی کے طور پر استعمال کی گئی۔ بعد میں جمہوری مزاج کے پرورش پا جانے سے اس کو یکسر مذہب مخالف اصطلاح نہیں کہا گیا۔ لیکن قانونی، سیاسی اور تعلیمی عمل میں مذہبی اداروں اور مذہبی تحرکات کے لیے راستہ ہموار نہیں ہو سکا۔ لیکن ہندوستان میں سیکولرزم کا تصور اس سے قطعی جدا اور مختلف ہے۔ ہمارے آئین میں سیکولرزم کی اصطلاح ضمیر کی آزادی، مذہبی آزادی، مذہبی اداروں کے قیام و نظام کی آزادی میں ہرگز حائل نہیں ہے۔ ہندوستانی سیکولرزم مذہب کی بنیاد پر امتیاز کی نفی کرتا ہے اور قانون کی نظر میں سب کو برابر مانتا ہے۔ آرٹیکل ۴۶ میں ریاست کی یہ ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ سماج کے کمزور طبقات کی بلا کسی امتیاز خبر گیری لے اور ان کی تعلیمی اور دیگر مفادات کا تحفظ کرے۔

آئین میں مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی شعبوں میں جن حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، ان پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کو انتہائی جامع انداز میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے جس سے اقلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مذہبی اور لسانی آزادی حاصل ہو چکی ہے۔ اگر اقلیتوں کا اس انداز پر تحفظ نہ کیا جاتا تو ملک

باقی صفحہ ۱۸ پر

ڈاکٹر امرناتھ دت گری

مسائل کا حل ـ خود روزگار

آزادی کے وقت ہم نے جو سنہرے مستقبل کے رنگین خواب سجائے تھے وہ انتظامی ابتری اور غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے نہ صرف کھوکھلے ثابت ہوئے بلکہ وہ خواب شرمندۂ تعبیر بھی نہ ہو سکے۔ جہاں ایک طرف بدعنوانی، مہنگائی اور سماج کے زریں اصولوں کی روز بہ روز پائمالی ہو رہی ہے وہیں دوسری جانب بے روزگاری نے ایک مہلک بیماری کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ یہ بے روزگاری کا سلسلہ ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی دن میں پیدا ہوا ہو۔ یہ سوچنا کہ یہ مسئلہ تقسیم ملک کے باعث وجود میں آیا ہے، بالکل غلط ہے۔ دراصل یہ مسئلہ ہمارے سماج میں صدیوں سے پنپ رہا تھا لیکن روز افزوں بڑھتی مہنگائی اور تنگ نظری نے اس کے وجود کو اور اہمیت دے دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روزگار کی سہولت پہلے بھی ہر کس و ناکس کو میسر نہیں تھی ہاں اتنا ضرور تھا کہ اگر کسی خاندان کا کوئی ایک فرد برسر روزگار ہو جاتا تو وہ اپنے متعلقین کے گزر اوقات اور پرورش بہ حسن و خوبی کر سکتا تھا اب حالت یہ ہے کہ اگر ایک خاندان جس میں صرف میاں بیوی ہوں وہ بھی مہنگائی کے سبب روزگار کی تلاش میں منہمک رہتے ہیں۔

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ آج کل روزگار تلاش کرنے والے نوجوانوں کی تعداد میں تو روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے لیکن روزگار کے مواقع میں بڑھوتری نہیں ہو پاتی۔ ملک میں صنعت کے فروغ کے سبب شہروں میں نئے نئے کارخانوں و فیکٹریوں کے لگنے کی وجہ سے روزگار پانے کی جستجو میں ہر شخص نے نزدیک کے شہر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ شخص جو کل تک کھیتی باڑی کو افضل سمجھتا تھا وہ دیہاتی لڑکا بھی اس پیشہ سے منہ موڑتا نظر آتا ہے اور نوکری کی تلاش میں لمبی لمبی قطاروں میں جا کھڑا ہوا۔ اور تو اور وہ ملازمت کو باعث فخر اور کھیتی باڑی کو قابل شرم بات تصور کرنے لگا۔ اس طرح نوکری کے تئیں ابھرتے جذبے نے نہ صرف ملک میں بے روزگاری کے مسئلہ کو جنم دیا بلکہ مہاتما گاندھی کے "خود روزگار" کے خوابوں کو بھی چکنا چور کر دیا۔ اگر گاندھی جی کے پیش کردہ اسکیم خود روزگار کو بنیاد بنا کر ملک کی اقتصادی پالیسی مرتب کی جاتی تو کم از کم دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی فہرست میں ہمارے ملک کا نام پچھڑے ہوئے ملکوں میں شامل نہ کیا گیا ہوتا۔

نوکری کا مایا جال

آج کا تعلیم یافتہ نوجوان ملازمت کے سنہرے جال میں پھنس کر ایک طرح سے غلام ذہنیت کا شکار ہو گیا۔ محدود خالی آسامیوں میں سے کسی ایک آسامی کو جیسے تیسے طریقے سے حاصل کرنے کی تگ و دو میں وہ اس قدر اندھا ہو گیا کہ اپنی شخصیت کو ہی بھلا بیٹھا۔ ایسی حالت میں آئندہ نسل کو نئی راہ دکھانے، خود اعتمادی و خود انحصاری کا جذبہ پیدا کرنے کے واسطے نوجوانوں کو پیشہ ورانہ تعلیم کے ذریعہ خود روزگار انتخاب کرنے کی طرف مائل کرنے اور اس اسکیم کی طرف رغبت پیدا کرنے کی تربیت دینے کے لیے ایک اسکیم منظر عام پر لائی گئی۔

آج کے دور میں زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں مقابلہ آرائی کی دوڑ شروع ہو گئی ہے صنعتی تکنیک، تجارت و کاروبار کی سرگرمیوں اور روزمرہ کے کاموں میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث روزگار کے مختلف النوع اقسام کے نئے نئے مواقع میسر ہو رہے ہیں لہٰذا نوجوان نسل کو آج اس قابل بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ روزگار سے متعلق مواقع کو پہچان کر ان سے فائدہ اٹھائیں اور اس میں خود اعتمادی و خود انحصاری کے جذبات پیدا ہو سکیں۔

آج کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کے پس منظر میں اکثر و بیشتر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ملازمت کو محفوظ روزگار تصور کرنے کی وجہ سے ملازمین لاپرواہ و کاہل ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں قاعدے قانون کی بندش کے سبب ملازم اپنے فرائض منصبی کو ایمانداری سے سنبھالنے میں آناکانی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہوتا ہے کہ زیادہ تر تنخواہ پر منحصر روزگاروں میں ملازم کے لیے اشیا کی پیداوار کی صلاحیت

لازمی نہیں ہوتی اس کے علاوہ اگر کوئی خالی اسامی ایک بار پُر ہو جائے تو اسی جگہ پر کسی دوسرے بے روزگار نوجوان کو کم از کم آئندہ دس سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے برخلاف خود روزگار اسکیم پر منحصر اکائی۔ صارفین سے متعلق روزمرہ کے کام آنے والی اشیا کی پیداوار نیز روزمرہ کی چیزوں کی برآمدات کے ذریعہ نہ صرف اپنی ترقی، خوش حالی کی ضامن بنتی ہے بلکہ قومی پیداوار میں بھی اضافہ کرنے کی حصہ دار بنتی ہے۔ اپنا خود روزگار اختیار کرنے والے نوجوان کے ذریعہ قائم کردہ اکائی سے دوسرے لوگوں کو بھی روزگار ملتا ہے۔ یہی نہیں ایسی اکائیاں اپنے قرب وجوار کی اقتصادی سرگرمیوں سے متعلق ادارے مثلاً ٹرانسپورٹ سروس، بجلی کی کھپت، ٹیلی فون سروسز، مارکٹنگ وغیرہ کے میدان میں وسعت و ترقی کے ساتھ ساتھ معاون بھی ہوتے ہیں۔ بڑے اور درمیانی قسم کے کارخانے چھوٹے قسم کے قائم کردہ کارخانوں کو مال وغیرہ مہیا کرا کر ان کی بے حد مدد کرتے ہیں۔ خود روزگار کی اسکیم سے نہ صرف ایک نوجوان کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ اس سے دوسرے لوگ بھی اپنی روٹی روزی کماتے ہیں۔

لہٰذا ان حالات کے پیش نظر ضروری ہے کہ طلبا وطالبات کو ابتدائی منزل سے ہی پیشہ ورانہ روزگار کے فوائد بتائیں جائیں تاکہ ان میں خود روزگار انتخاب کرنے کا جذبہ کار فرما ہو سکے۔ اگر کوئی شخص ایک بار اپنا روزگار منتخب کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو پھر وہ سرکاری ملازمت 'عوامی و نجی زمرے میں مقررہ مزدوری یا تنخواہ پر کام کرنے کی جستجو چھوڑ دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ مختلف لائحہ عمل کا تجزیہ کرنے اور تمام دستیاب ذرائع کو بروئے کار لا کر پیداوار اور کھپت کے گوشہ کی معلومات کرنے کے بعد اپنے تیار کردہ مال کی مارکٹنگ کرتا ہے۔

صنعت کاری کی تحریک کو متحرک بنانے، اس کو صحیح سمت دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ صنعت کار میں اپنے میدان عمل میں کامیابی حاصل کرنے سے متعلق تمام تر ضروری صلاحیتوں کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ ماضی بعید میں یہ عام تاثر تھا کہ تجارت کا پیشہ کسی مخصوص مقام، خاندان، طبقہ یا ذات برادری سے وابستہ ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اس قول کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ کوئی بھی شخص ایک کامیاب تاجر بن سکتا ہے بشرطیکہ اس میں کچھ ضروری صلاحیتوں کا میلان پایا جاتا ہو مثلاً کامیابی کی تمنا رکھتا ہو۔ جوکھم اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ خود کے بارے میں مثبت ایروچ رکھتا ہو۔ ہر کام میں پہل کرنے کی عادت ہو، متواتر کوشاں رہنا اور کھلا ذہن رکھنا، مشکلات پر قابو پانے کے لیے تیار رہنا، درخشاں مستقبل کے تئیں پُرامید ہونا، آس پاس کے حالات و ماحول کو سمجھنے اور پرکھنے کی خواہش رکھتا ہو، مقررہ معیار میں پلان کے مطابق کام کی تکمیل کرنا۔ روزگار کے مواقع کو پہچانتا ہو اور اس کا فائدہ اٹھاتا ہو، حالات حاضرہ سے باخبر رہنا اور قوت ارادی کے ساتھ مشکل ترین کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

موجودہ تعلیمی نصاب میں پیشہ ورانہ زمرہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حال ہی میں تعلیمی پالیسی کے تحت پیشہ ورانہ زمرہ کو نصابات میں وسیع پیمانہ پر شامل کیا گیا ہے۔ اس کے ذیل میں ان تعلیمی پروگراموں کو ترجیحات دی جا رہی ہیں جو مختلف سطحوں پر طلبا میں تکنیکی، انتظامی امور۔ نفسیات و اکائیوں کو قائم کرنے سے متعلق صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں۔

مرکزی سرکار کے ذریعہ چلائی جا رہی ایک اسکیم کے تحت آج ہائی اسکول کی سطح پر تکنیک' ہوم سائنس، کامرس، پیرامیڈیکل، زراعت و دیگر شعبوں سے متعلق روزگار مہیا کرانے والے نصاب ملک کے مختلف اسکولوں و کالجوں میں ایک خاص پلان کے طور پر چلائے جا رہے ہیں۔ یہ پیشہ ورانہ نصابات جہاں طلبا کو اپنا روزگار کمانے کے لیے تیار کرتے ہیں وہیں ان طلبا کو خود روزگار شروع کرنے کی ترغیب و تربیت بھی دیتے ہیں تاکہ لوگ خود کفیل بن سکیں۔ ان نصابات کے ذریعہ طلبا کو صنعت کاری کا خاکہ' ذرائع کی پہچان، اکائیوں کو قائم کرنا، اکائیوں کو چلانے و مالی وسائل مہیا کرنے، مارکٹنگ و انتظامی امور وغیرہ کے سلسلے میں کئی اہم معلوماتی و فائدہ مند اطلاعات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

ان پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے نصابات کے نتائج قومی سطح پر کافی امید افزا رہے۔ گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، تامل ناڈو جیسے کئی صوبوں میں طلبا نے مذکورہ نصاب کی دستیاب سہولیات کا فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی روزگار کی شروعات کی۔ یہ طلبا مختلف پیشوں (مثلاً سیری کلچر، اسکوٹر، موٹر سائیکل مرمت، ٹی۔ وی۔ ریڈیو مرمت، میڈیکل لیبارٹریز ٹیکنیشن۔ یونیورسٹی کی سطح سے قبل تعلیم۔ فوٹوگرافی وغیرہ) سے وابستہ تھے۔

تجربہ کرنے پر یہ بات بھی واضح ہوئی کہ چند وجوہات کی بنا پر ان نصابات کا فائدہ ابھی کم بہت کم طلبا حاصل کر پا رہے ہیں اس کی ایک وجہ تو طلبا میں اپنا روزگار قائم نہ کرنے کا جذبہ۔ دوسرے اس اسکیم کی طرف راغب نہ ہو پانا ہے۔ بہرنوع اس کمی کو دور کرنے کے لیے آج نئی صوبوں میں گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے مراکز کھولے گئے ہیں۔ یہ مراکز روزگار تلاش کرانے میں نوجوانوں کی صحیح رہنمائی اور مناسب طور پر طلبا کو تربیت و ترغیب دینے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ اپنا روزگار چلانے کی خواہش رکھنے والے نوجوان خود کو در پیش مالی وسائل کے بندوبست کے بارے میں ضلع صنعتی مراکز سے مشورے، معلومات و رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اب تعلیم یافتہ بے روزگار سرکار کے ذریعہ چلائی جا رہی مخصوص اسکیم

خود روزگار کے تحت اپنے کاروبار شروع کرنے میں پیش آنے والی دقتوں کا ازالہ ان مراکز کی معاونت سے بہ آسانی کر سکتے ہیں۔

طلبا وطالبات کو خود روزگار اپنانے کے لیے ذہنی طور سے تیار کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لہٰذا اس سمت میں چھوٹی عمر سے ہی ان کو ترغیب وتربیت دینی چاہیے۔ بچوں کو ذہنی طور سے روشن خیال و ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے نیز ان کی شخصیت بنانے وسنوارنے کی غرض سے بنیادی سطح پر ہی تعلیم دینا کارگر ثابت ہوگا۔ بچوں کو پرائمری سطح پر ہی پُرخطر سفروں و جواں مردوں کی داستانیں بیان کرنے چاہئیں اور ایسے مرد، عورتوں کے کارہائے نمایاں سے متعارف کرانا چاہیے جنھوں نے اپنی محنت، لگن اور قابلیت کی بنیاد پر سماج میں ایک نمایاں وکامیاب صنعت کار کے طور پر سماج میں اپنی پہچان بنائی ہو۔ ان لوگوں کو قرب وجوار کی تجارتی دست کاری ودیگر پیشوں سے روشناس کرانے کے علاوہ شب وروز میں ہو رہی تکنیکی تبدیلیوں اور ان سے متعلق سرگرمیوں سے بھی باخبر رکھنا فائدہ مند ثابت ہوگا۔ مستقبل میں انھیں نچلی جماعتوں و ہائی اسکول کی سطح پر مذکورہ سرگرمیوں سے اور زیادہ وسیع وموثر طریقے سے آگاہ کرتے رہنا چاہیے۔ ابتدائی پیشوں کی طرف رغبت دلاکر مشکل پیشوں کو سکھانے کے بعد آہستہ آہستہ تجارتی مراکز واکائیوں کو قائم کرنے کی معلومات کے ساتھ ہی بچوں میں پوشیدہ صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کی غرض سے انھیں بہتر طریقے پر تربیت دینی چاہیے تاکہ وہ اپنی دلچسپی کے مطابق پیشہ کا تجربہ وتربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے پیشہ میں عبور حاصل کر سکیں۔ ہائی اسکول کی سطح کے بعد ان کو صنعت کاری کی جانکاری، انتظامی امور سے متعلق تعلیم دینا تاکہ وہ اپنے کاروبار میں کامیابی حاصل کر سکیں اور مناسب طریقے سے خود روزگار کا انتخاب کر کے اس میدان عمل میں پیش قدمی سے متعلق ضروری اقدامات کر سکیں۔

اس طرح کے تربیتی پروگرام کا خاصا اچھا اثر ہوا ہے، پالی تکنیک وتکنیکی اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے کئی نصابوں میں گھریلو صنعت اور اس سے وابستہ مضمون شامل کیے گئے ہیں۔ بہر نوع ان کے نتائج فوری طور پر ظاہر نہیں ہو سکتے لیکن امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں ان سے نوجوان طبقہ اپنا من پسند کام چننے میں کافی مدد حاصل کر سکے گا۔

اس صنعت کاری کے میدان میں طالبات وعورتوں کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ ماضی میں صنعت، تجارت ودست کاری کا شغل صرف مردوں تک ہی محدود سمجھا جاتا تھا لیکن اب عورتیں بھی تجارت کی جانب متوجہ ہو رہی ہیں اور وہ اپنی تعلیمی صلاحیت کے سہارے خود کفیل بننا چاہتی ہیں کیوں کہ ہمارے سماج میں عورتوں کے مقابلے مردوں کو فوقیت حاصل ہے لہٰذا اب ایک عورت صرف سماج میں مالی اعتبار سے خود کفیل ہی نہیں ہونا چاہتی بلکہ وہ سماج میں اپنی شخصیت اور قدر ومنزلت کا سکہ جمانا چاہتی ہے۔ خود روزگار اور گھریلو صنعت سے متعلق نصاب ہمارے اسکولوں کے لیے بالکل نئے وانچھوتے ہیں پھر بھی حکومت نے اس جانب قدم اٹھایا ہے۔ مستقبل قریب میں تعلیمی نصاب میں ان زمروں کو خصوصی حیثیت دینی ہوگی، اتنا ہی نہیں گھریلو صنعتکاری اور خود روزگار کی اسکیم کو ترقی اور اسے مقبول بنانے کی غرض سے اس عمل کو تحریک کی شکل دینی ہوگی۔ ●

بقیہ: مسلم خواتین اور جنگ آزادی

خواتین نے آزاد جمہوری ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار بھی ادا کیا۔ ان خواتین میں بی. بی. امت السلام (بنت کرنل عبدالحمید خاں)، آمنہ قریشی (بنت امام عبدالقادر، باپو کے قریبی دوست جو جنوبی افریقہ میں مقیم تھے)، فاطمہ عریف (آمنہ قریشی کی بڑی بہن)، امینہ طیب جی (عباس طیب جی کی اہلیہ)، ریحانہ طیب جی (بنت طیب جی)، حمیدہ طیب جی (عباس طیب جی کی پوتی)، بیگم سکینہ لقمانی (بنت بدرالدین طیب جی)، صوفیہ سوم جی، بیگم ماجدہ بانو، بیگم کلثوم سایانی، بیگم سلطانہ حیات انصاری، ہاجرہ زیڈ احمد، زہرہ انصاری، بیگم صفیہ عبدالواجد وغیرہم کے نام اہم ہیں۔

اس کے علاوہ سیکڑوں ایسی دوسری خواتین رہی ہوں گی جن کی قربانیاں آج ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔ ●

بقیہ: مزدوروں کی حالت میں ڈرامائی تبدیلی

پنشن اسکیم میں جو نابرابریاں در آئی ہیں انھیں مزدوروں کی تنظیموں کے ساتھ مناسب صلاح مشورہ کرکے حکومت دور کر لے گی۔

اگرچہ پروویڈنٹ فنڈ اسکیم، گریجویٹی اور بونس ادائیگی قانون حکومت کے ہاتھوں میں سماجی سلامتی کے کلیدی اوزار ہیں اس کے باوجود حکومت نے سماجی سلامتی کے امکانات کو بڑھانے کے لیے متعدد دوسری تدبیریں بھی شروع کی ہیں اور اس کوشش میں ہے کہ ان امکانات میں نہ صرف منظم زمرے کے بلکہ غیر منظم اور چھوٹی صنعتوں کے زمرے کے بھی ملازمین اور مزدوروں کی بڑی تعداد کا احاطہ ہو جائے۔ ●

بقیہ: اناج بینک۔ غریبی مٹانے کی ایک راہ

میں اموات کا سانحہ ماضی کی کہانی بن جائے گا۔

۹۔ اناج بینک سسٹم سے ملکیت کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔

۱۰۔ اس نظام کا ایک دیگر اہم عنصر بچت کرنا ہے۔

۱۱۔ پیسہ قرض دینے والوں کے ذریعہ محنت، سازوسامان روپیہ پیسہ اور زمین وغیرہ کا استحصال اب بالکل ختم ہو چکا ہے اور یقیناً انصاف، مساوات اور استحصال کے خلاف آواز کا دور دورہ ہے۔

نقصانات

کوئی شئے مکمل نہیں ہے چناں چہ اس طرز عمل کے بھی مضر اثرات سامنے آئے ہیں۔ دولت مند افراد منظم دیہاتی غریبوں کے دشمن بن جاتے ہیں اور مختلف طریقوں سے انھیں پریشان کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

باقی صفحہ ۲۵ پر

مکند ساہو

اناج بینک ـ غریبی مٹانے کی ایک راہ

دنیا میں دو طرح کے افراد ہوتے ہیں نادار اور دولت مند۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک وسیع خلیج واقع ہے۔ عموماً نادار لوگ مالیاتی امور میں دولت مندوں پر انحصار کرتے ہیں۔ سرکاری ذرائع سے غریبی کو مٹانے کے لیے جتنے بھی پروگراموں اور پالیسیوں پر عمل درآمد کیا جاتا ہے وہ سب کے سب دولت مند طبقہ کے حق میں چلے جاتے ہیں کیوں کہ ممتاز افراد اپنی ساز باز سے یا پھر طاقت کے استعمال کے ذریعہ تمام وسائل کو کنٹرول کرتے ہیں۔

اناج بینک نادار اور دولت مندوں کے درمیان حائل خلیج پر پل باندھنے کا ایک آلہ ہے۔ اڑیسہ کے پہاڑی قبائلی علاقے میں نادار لوگ بدحالی کے زمانے میں بالخصوص کھانے کے لیے زبردست مشقت کا سامنا کرتے ہیں۔ وہ دولت مند افراد سے اناج کی صورت میں قرض لیتے ہیں اور کٹائی کے موسم میں ۵۰ فی صد کے حساب شرح سے انھیں قرض واپس کرنا پڑتا ہے۔ قرض کی ادائیگی کے لیے عموماً ۴ تا ۵ ماہ مدت ہوتی ہے اگر وہ وقت پر ادائیگی نہیں کر پاتے ہیں تو محنت مزدوری سے جمع کردہ معمولی پونجی اور روپے حتیٰ کہ ان کی محدود زمین بھی امیر لوگ غصب کر لیتے ہیں۔

ایسی صورت حال میں رضاکار تنظیموں نے اڑیسہ کے دور دراز کے قبائلی علاقوں میں دیہاتی غریبوں اور رشید و لڈ تراتب کے معاملہ پر توجہ مبذول کی۔ رضاکاروں نے مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اناج بینک (GRAIN BANK) کا تصور نادار اور متمول کے درمیان فاصلے کو ختم کر سکتا ہے اڑیسہ میں اناج بینک سے مراد کمیونٹی فنڈ (FUND OF THE COMMUNITY) ہے۔

اناج بینک ایک نظام خود۔ انتظامی ہے۔ موضع کمیٹی گاؤں کے سائز کے مطابق ۵ تا ۷ افراد (۳ مرد / ۴ خاتون) پر مشتمل ہوتی ہے جس کا انتخاب گاؤں کی عام میٹنگ میں کیا جاتا ہے۔ یہ کمیٹی اناج بینک کا انتظام سنبھالتی ہے مزید براں موضع کمیٹی عوام کے تمام تر طبقات یعنی بے زمین چھوٹے کسان، ایس سی، ایس ٹی اور خواتین جو کہ تنظیم کی حقیقی ٹارگیٹ گروپ ہیں سب کی نمائندہ مجلس ہوتی ہے۔

کمیٹی کا بنیادی کردار گاؤں کی عام میٹنگ کے فیصلہ کے مطابق بدحالی کے دوران ممبروں کے درمیان اناج تقسیم کرنا ہے۔ وہ میٹنگ میں شرح سود بھی متعین کرتے ہیں۔ موضع کمیٹی اناج بینک کے تمام ریکارڈز کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اگر زرعی پیداوار میں نقصانات کے سبب کوئی شخص اناج واپس نہیں کر پاتا ہے تو موضع کمیٹی اس کے معاملے کی شنوائی کرتی ہے اس طرح وہ سخت اوقات میں اہل ضرورت مندوں کے درمیان غلہ بانٹ دیتے ہیں اور کٹائی کے موقع پر واپسی کو جمع کر لیتے ہیں جس سے تقسیم کاری ایک دن میں پوری ہو جاتی ہے اسی طرح اناج جمع کرنے کا کام بھی ایک روز میں ہی مکمل کر لیا جاتا ہے۔ موضع کمیٹی غلے کو اسٹور کرنے کا فیصلہ بھی کرتی ہے اور حسب ضرورت اناج گودام کی تعمیر بھی کر سکتی ہے جو کہ صد فی صد عوامی چندہ سے بنایا جاتا ہے۔

پروگرام کو کامیاب بنانے اور پروگراموں کے ہر مرحلے جیسے منصوبہ سازی، تشکیل کاری، عمل درآمد، پروگرام کے فوائد میں حصہ داری اور تجزیہ کاری سے متعلق تمام معاملات میں لوگوں کی بھرپور شمولیت کے لیے عوامی شرکت لازمی ہے۔ جساس رضاکار تنظیم تمام سرگرمیوں میں عوامی شرکت کے لیے کوشاں رہتی ہے کیوں کہ افراد ہی تمام اشیا کی بنیاد ہیں۔ اس طرح اناج بینک کی تشکیل میں انھوں نے عوام کی سرگرم شرکت کو یقینی بنانے اور اناج بینک تنظیم کی ۵۰ فی صد افراد کے ساتھ عوام کے ۵۰ فی صد تعاون کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ اگرگامی، کاسی پور ایک معتبر جساس اور سرگرم رضاکار تنظیم ہے جو اڑیسہ کے مختلف اضلاع کے دور دراز کے قبائلی حصوں میں کام کر رہی ہے۔ تنظیم عوام کی سرگرم شرکت پر مبنی ۵۲۰ مواضعات میں اناج بینک قائم کر چکی ہے۔

انتظام کار

کسی بھی پروگرام کی کامیابی کے لیے موثر انتظامیہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اناج بینک مینجمنٹ سسٹم، پائیدار مینجمنٹ سسٹمز میں سے ایک ہے جس کا اطلاق غریبی کو نابود کرنے کے لیے (کامن پراپرٹی ریسورس مینجمنٹ) میں بھی ہو سکتا ہے اور غریبوں کی سماجی و اقتصادی صورت کو سدھارنے میں بھی یہ سسٹم معاون ثابت ہوگا۔

فوائد

اناج بینک استحصال کے خلاف ایک عمل ہے اس طرح اس کے کثیر جہتی فوائد ہیں جیسے:

۱۔ پیسہ قرض دینے والوں پر انحصار کی کمی ہو جاتی ہے۔

۲۔ اچھی خاصی سودی رقم جو پہلے قرض دینے والوں کی جیب میں چلی جاتی تھی۔ اب گاؤں والوں کا فنڈ بن جاتی ہے۔

۳۔ اناج بینک لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور گاؤں کے ترقیاتی پروگراموں پر مذاکرات کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔

۴۔ نہ صرف بدحالی کے موقع پر خوراک کے لیے بلکہ پیدائش، موت وغیرہ جیسے مخصوص اوقات میں گاؤں کے لوگ اپنی ہنگامی ضروریات کی تکمیل کے لیے اناج بینک پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۵۔ گاؤں کی میٹنگ ایک مستقل سلسلہ ہے جس میں گاؤں کے لوگ مختلف مسائل پر فیصلہ کرتے رہتے ہیں۔

۶۔ ترقیاتی سرگرمیوں میں مینجمنٹ ایک اہم عنصر ہے اور گاؤں کے لوگوں میں انتظامی امور کا ادراک پیدا ہو جاتا ہے جس سے دیگر انتظامی معاملات کو سنبھالنے کا ان میں حوصلہ ہوتا ہے۔

۷۔ اناج بینک کے توسط سے غریبوں میں استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور سماجی انصاف اور انسانی حقوق کی حصولیابی کے لیے طاقت و ہمت پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ بدحالی کے زمانے میں غذا کی کمی سے پہاڑی قبائلی علاقوں

باقی صفحہ ۳۳ پر

غریب کسانوں کے لیے روزی کا وسیلہ:

بکری پالن

ڈاکٹر راج بیر سنگھ *

ہماری معاشرے کا ایک بہت بڑا طبقہ جن میں چھوٹے کاشت کار اور بے زمین افراد شامل ہیں۔ بکری پالن جیسے چھوٹے گرہ ادیوگ (چھوٹی گھریلو صنعتیں) اپنا کر اپنا سامان زندگی کر رہا ہے۔

بکری پالن ٹراپیکل ممالک میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ایک کثیر جہتی دھندا ہونے کے باعث اسے ترقی دینا نفع بخش ہے۔ بکری پالن غریبوں کا پیشہ ہے، بکری غریب کی گائے ہوتی ہے۔ ترقی کی اندھی دوڑ میں فضائی ماحول کو کثیف کرنے کا الزام بھیڑ اور بکری پالنے والوں پر منڈھا گیا، جب کہ بکری کا ماحول سے چولی دامن کا رشتہ ہے۔ بکری جنگلوں کو جیوک کھاد دیتی ہے، یہ آدمی کو دودھ گوشت، مرنے کے بعد کھال، بال، سینگ، کھر وغیرہ دیتی ہے۔ بنجر زمین کو سدھارنے والی کھاد دے کر بھیڑ بکریاں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بھیڑ بکریاں جھاڑیوں کے بیج پتے کھا کر اپنی مینگنی کے ذریعہ بیج جنگل میں دور دور تک پہنچاتی ہیں۔ یہ بیج مینگنی کی جیوک کھاد کے ذریعہ جون، جولائی کی پہلی برسات کے ساتھ اُگ کر جنگلوں کو نئے درخت جھاڑیاں اور ہریالی فراہم کرتے ہیں۔ دشوار علاقوں میں بار برداری اور مر کر بھی آدمی کے کام آنے والی بھیڑ بکریاں انسان یا ماحول کی دشمن کیسے ہو سکتی ہیں؟ ماہرین ماحولیات نے نہ جانے کیوں بکری کو قربانی کا بکرا بنا دیا۔ اس کے باوجود دنیا میں بکریوں کی آبادی بڑھ رہی ہے آج ملک میں ۱۱٫۲ کروڑ بکریاں ہیں۔

اقسام

ملک میں جمنا پاری عمدہ نسل ہے، کالا بنگال، مالاباری اور آسام پہاڑی جیسی لونی بکریاں جلد ہی بچہ پیدا کرنے کے لائق ہو جانے اور زیادہ تعداد میں میمنے دینے کے لیے مشہور ہیں۔ لداخ کی پشمینہ بکری دنیا کی سب سے بہترین قسم کا ملائم اون دیتی ہے۔ کشمیر میں پشمینہ ایک بڑی گھریلو صنعت ہے۔ گدی نام کی پہاڑی بکری رسی بنانے لائق بال دیتی ہے۔ اس طرح بکریاں آمدنی میں اضافہ کرنے، روزگار مہیا کرانے اور خانگی پرورش کو سدھارنے میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں، جمنا پاری باربری، دیسی اسپائن، بیٹل، ساسین، بیٹل سنکر نسل کی خاص اقسام ہیں۔ دودھ کے لیے جمنا پاری، بیٹل، سورتی مالنس پیداوار کے لیے بلیک بنگال اور عثمان آبادی اور دونوں کے لیے باربری، سروہی، محل اور بیٹل قسمیں خاص ہیں۔

سنکر بکریوں کی خصوصیات

۱۔ پیدائش پر وزن	تین کلوگرام
۲۔ چھ ماہ میں جسمانی وزن	چوبیس کلوگرام
۳۔ پہلا بچہ دینے کی عمر	۴۵۵ دن
۴۔ دو بچوں کے درمیان فاصلہ	۳۷۸ دن
۵۔ زیادہ سے زیادہ دودھ کی پیداوار	۷۹۲٫۷ کلوگرام (سالانہ)
۶۔ زیادہ سے زیادہ دودھ کی پیداوار	۷٫۴ کلوگرام (روزانہ)

بکری پالن کے فوائد

۱۔ کم عمر میں دودھ پیداوار کا شروع ہونا، اس طرح جلد ہی آمدنی۔

۲۔ ان کے میمنوں کی زیادہ تعداد۔

۳۔ گھاس جھاڑیوں کے پتوں کو گوشت میں تبدیل کرنے کی بکریوں میں زیادہ صلاحیت۔

۴۔ بیماریوں کی مزاحم قوت کا ہونا۔

۵۔ دودھ، گوشت، چمڑا، ریشہ اور کھاد کے لیے مفید جانور۔

دودھ کی پیداوار

ملک میں پائی جانے والی بکریوں میں دودھ کی پیداوار کے مقابلہ میں گوشت کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔ اچھی دودھاری بکری سے ۱۲ دنوں میں ۳۰۰ لیٹر دودھ کی امید رہتی ہے جب کہ دیسی سے ۶۵ سے ۷۰ لیٹر۔ سنکر و دیشی ایک مدت میں آٹھ سو لیٹر تک دودھ دیتی ہے۔ عام طور سے اوسط بکری کی عمر ۸ سے ۱۰ سال ہوتی ہے۔ بکری کا دودھ اصلی نوعیت کا ہونے کے سبب بوڑھوں، بچوں اور محتاجوں کے لیے انتہائی مفید ہوتا ہے۔ دودھ میں چھوٹے چھوٹے وسا اجزا ہونے کے سبب یہ زود ہضم، لذت دار اور پیٹ کے امراض، بدہضمی، زیادہ پیشاب ہونے اور کھجلی (خارش) میں فائدہ بخش

ہوتا ہے۔

حاملہ بکریوں کی دیکھ بھال

پیدائش کے دو ماہ قبل سے ہی خوراک کی ضرورت دوگنی سے زیادہ ہو جاتی ہے تو چرائی کے ساتھ پھلی دار، ہرا چارہ، لوسرن، برسیم لوبیا کے ساتھ ساتھ دانہ بھی دینا چاہیے۔ اضافی خوراک پیدائش کے تین ماہ کے بعد تک جاری رکھی جائے تاکہ بچوں کو کافی مقدار میں دودھ مل سکے۔

بکریاں بھیڑوں سے سخت فطرت کی ہوتی ہیں۔ آزاد زندگی بسر کرنے والی بھوک لگنے پر جہاں چاہے گھومنے والی قدرت نے ان کے گھر میں ایسی طاقت رکھی ہے جو درختوں کے اوپر چڑھنے میں تعاون کر سکیں یہ اوپر کی ملائم پتیاں کھانا پسند کرتی ہیں۔ بکری عموماً دو بچے، کبھی کبھی تین اور کبھی کبھی چار بچے دیتی ہے۔

گوشت کی پیداوار

کل قومی گوشت پیداوار کا تقریباً ۵۰ فی صد گوشت صرف بکریوں سے حاصل ہوتا ہے۔ چھ ماہ کی بکری ۲۵ کلو وزن تک ہو جاتی ہے جس میں اس کے کل وزن کا ۵۰ فی صد حصہ گوشت ہوتا ہے۔ چھ ماہ تک اتنا وزنی بنانے کے لیے انھیں رجکا، شبتول وغیرہ جیسے طاقتور چارے دینے چاہئیں۔ یہ زیادہ سوکھی اشیا ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر طاقتور چاروں میں دلہنی فصلیں نہ ہوں تو راتب بھی دینا ضروری ہوتا ہے۔ بکری کا گوشت زود ہضم، خوشبودار، کم چربیلے والا رسیلا اور لذت دار اور زیادہ توانائی بخش ہوتا ہے۔

عام بیماریاں، صحت اور تحفظ

عام طور پر بیمار بکری باڑے کے اندھیرے کونے میں کان لٹکائے الگ کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہلکی بدہضمی میں دو دن کے وقت کے علاوہ جگالی نہیں کرتی جو بیمار ہونے کی پہلی علامت ہے۔ ایسے میں ۳ منٹ تک تھرمامیٹر اینس میں لگانے کے بعد درجۂ حرارت نوٹ کر چاہیے۔ عام حرارت ۱۰۲/۵ سے ۱۰۳ ڈگری فارن ہائیٹ (۳۹/۲ سے ۳۹/۴ ڈگری سیلسیس) ہوتا ہے۔ دو ڈگری زیادہ ہونے پر ویٹری سرجن کو بلائیں، کمبل سے بکری کو رگڑیں، گرم پانی پینے کو دیں، نکار لک ایما بھی مدد کرتا ہے۔ گرم مالش یا گرم بوتل سے گرمی دیں اور پسلیوں کو ملیں۔ بکری کے اگلے دونوں پیروں کو موڑ کر اٹھائیں اسے دیگر بکریوں سے الگ نہ کریں۔ زہریلی چیز کھانے پر، اگر ام ایسم سالٹ کو تھوڑے سے گرم پانی میں دیں۔ اگر دانہ دیا گیا ہو تو وٹامن بی کامپلیکس کا انجکشن دیں۔

بکری پالن کے لیے ہرے چارے اور دانے

بکریوں کو موزوں اور طاقتور خوراک دینے سے ان کی حالت میں خاص سدھار لایا جا سکتا ہے۔ بکری اپنے جسمانی وزن سے ۳ سے ۴ فی صد خشک اشیا کھا سکتی ہے جب کہ گائے اور بھیڑ اس کے مقابلے میں ڈھائی سے تین فی صد تک ہی کھا پاتی ہیں۔

عمدہ اور طاقتور خوراک

اچھے اور سستے پالن کے لیے تازہ اور طاقتور ہرے چارے، ذائقہ دار زود ہضم اور قوت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ بکریوں کے لیے چاروں کو خاص طور سے درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ صاف اور تازہ پانی۔
۲۔ ہرا چارہ، دلہنی فصلوں کے چارے اور غیر دلہنی فصلوں کے چارے اور پیڑ اور جھاڑیوں کے پتوں وغیرہ سے حاصل چارہ۔
۳۔ سوکھا چارہ۔ فصلوں سے حاصل بھوسہ اور سوکھا چارہ اور پیڑوں کی سوکھی پکی پھلیاں۔
۴۔ چراگاہ کی ملائم گھاس۔

بکروں کی خوراک

افزائش نسل میں کام آنے والے بکروں کو عمدہ اور معتدل خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ بکری کو صحت مند رکھنے کے لیے روزانہ ۳/۲ سے ۸/۴ کلوگرام چارہ دینا لازمی ہوتا ہے۔ چوں کہ بکرا زیادہ موٹا تازہ ہوتا ہے اس لیے اسے عمدہ قسم کا زیادہ چارہ کھلانا چاہیے۔ بکرے کو روزانہ ۸۶/۱ کلوگرام دانہ ملا کر دینا چاہیے۔ پیدائش کے وقت ان دونوں کی مقدار بڑھا دینی چاہیے۔

ضروری مشورے

۱۔ جو بکریاں چرنے نہیں جاتیں انھیں معدنی مرکب دینا ضروری ہے۔
۲۔ خوراک کی خصوصیات اور بکری کی ضروریات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کئی طرح کے چارے کھلائے جائیں۔
۳۔ عمدہ صحت اور زیادہ دودھ کے لیے ہری گھاس اور پیڑوں کے پتے کھلائے جائیں۔
۴۔ چراگاہوں میں بکریوں کے پینے کے لیے صاف پانی کا انتظام کرنا لازمی ہے۔
۵۔ آج کل بکری پالن روزگار کو سائنسی طریقہ سے اپنانے کے لیے سرکار نے تربیتی پروگرام بھی چلائے ہیں۔ مزید جانکاری کے لیے صدر کرشی وگیان کیندر اور ڈائریکٹر راشٹریہ ڈیری انوسندھان سنستھان کرنال سے رجوع کریں۔ ●

بقیہ: سطح ٹرانسپورٹ

کا اصل وسیلہ تسلیم کیا گیا ہے۔ آئندہ صدی کے اوائل ہی میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن میں بندرگاہوں کو اپنی اہلیت سے زیادہ بوجھ اٹھانے اور سڑکوں کے جال پر بھی زبردست بار پڑنے کا معاملہ قصہ پارینہ ہو چکا ہوگا۔ اس کے لیے گزشتہ ۵۰ برس کے ترقیاتی عمل کو نئی تیزی اور شدت دی جائے گی۔

کپڑے کا شعبہ۔ ملک کی ترقی میں اہم رول

ہماری معیشت میں کپڑے سے متعلق صنعت کا ایک اہم مقام ہے۔ انسان کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کرنے والی یہ صنعت ان صنعتوں میں سے ایک ہے جو ملک میں سب سے پہلے وجود میں آئیں۔ اس میں روئی اور پٹ سن کی دو اہم زرعی پیداواریں بطور خام مال استعمال کی جاتی ہیں۔ اس میں دوسری بڑی صنعتوں کے مقابلے میں کم سرمائے کی ضرورت پڑتی ہے اور کپڑا تیار کرنے کا طریقہ بھی سیدھا سادا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کپڑا منظم ملوں اور کارخانوں کے ساتھ ساتھ ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بھی تیار کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ملک کے کروڑوں عوام کی زندگیوں سے اس کا براہ راست تعلق ہے۔ جہاں یہ لوگوں کا تن ڈھکنے کے لیے کپڑا فراہم کرتی ہے وہاں یہ کپاس اور پٹ سن اگانے والوں سے لے کر دستکاروں، بنکروں، کارکنوں اور کپڑا ملوں میں کام کرنے والے کروڑوں اشخاص کا ذریعہ معاش بھی ہے۔

گزشتہ برسوں میں ملک کی قومی پیداوار، روزگار اور برآمدات میں اس صنعت کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ ہماری مجموعی صنعتی پیداوار میں کپڑے کی صنعت کا حصہ ۱/۵ اور مجموعی برآمدات میں اس کا حصہ ۱/۳ ہے نیز یہ تقریباً تین کروڑ ۸۰ لاکھ افراد کو روزگار مہیا کرتی ہے۔

نمایاں کامیابیاں

کپڑا ملوں کی صنعت نے گزشتہ ۱۵ برسوں میں نمایاں پیش رفت کی ہے۔ نصب شدہ تکلیوں کے سوت اور کپڑے کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ تکلیوں کی تعداد ۱۹۸۰ء میں دو کروڑ دس لاکھ سے بڑھ کر مارچ ۱۹۹۶ء تک تین کروڑ دس لاکھ ہو گئی ہے۔ یہ اعداد تقریباً ۰/۶۶۷ ملین سالانہ کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔ ترقی کے اس عمل کی ایک توجہ طلب بات یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اوپن اینڈ روٹرز بڑی تعداد میں نصب کیے گئے ہیں اور سو فی صدی برآمداتی اکائیاں قائم کرنے کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔

کپڑا بننے کے شعبے میں لامرکزی پاور لوم سیکٹر میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں کپڑے کی تیاری میں لگ بھگ ۵ تا ۶ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ حالیہ برسوں میں ملے جلے سوت سے بنے کپڑے اور غیر سوتی کپڑے کی تیاری میں لوگوں کی پسند کے مطابق کافی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۵-۸۶ء سے ۱۹۹۵-۹۶ء کی مدت میں مختلف قسموں کے ملے جلے سوت سے بنے کپڑے اور غیر سوتی کپڑے کی تیاری میں اضافے کی شرح بالترتیب ۱۲ سے ۱۶ فی صد رہی ہے۔ کپڑے کے روایتی شعبے ہینڈلوم نے بھی کافی ترقی کی ہے۔ ملک میں مجموعی طور پر جتنا کپڑا تیار ہوتا ہے اس میں ہینڈلوم شعبے کا حصہ ۱/۵ ہے۔

ملک میں کپڑے کی تیاری کی اطمینان بخش صورت حال کے نتیجے میں کپڑے کی فی کس دستیابی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آبادی اور برآمدات میں اضافے کے باوجود کپڑے کی فی کس دستیابی ۱۹۸۵-۸۶ء میں تقریباً ۲۱ مربع میٹر سے بڑھ کر ۱۹۹۵-۹۶ء میں تقریباً ۲۶ مربع میٹر ہو گئی ہے۔

روز افزوں برآمدات

ملک کی مجموعی برآمدات میں کپڑے کی برآمدات کا حصہ ۱/۳ کے لگ بھگ ہے۔ کپڑا غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے کیوں کہ دوسری برآمداتی اشیا کے مقابلے میں کپڑے کے شعبے میں درآمدات کا جزو بہت کم ہے۔ یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ اس شعبے میں جو خام مال استعمال ہوتا ہے اس میں روئی اور پٹ سن کی مقدار ۸۰ فی صد سے زیادہ ہے اور یہ اشیا ملک کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں۔ کپڑے کی برآمدات ۱۹۸۰ء کے آغاز میں فقط ۱۳۲۶ کروڑ روپے کی مالیت کی تھیں جو بڑھتے بڑھتے ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۳۵۵۰۳ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس مدت میں کپڑے کی برآمدات میں ۳۰ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوا ہے۔

کپڑوں اور ملبوسات کے شعبے میں کوالٹی کے معاملے میں کافی بہتری آئی ہے۔ ملک کے اندر اور دوسرے ممالک میں فیشن میں ہونے والی تبدیلیوں کے مطابق عمدہ ڈیزائن اور نئی طرز کے ملبوسات تیار کیے جا رہے ہیں جو کافی مقبول بھی ہو رہے ہیں۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فیشن اینڈ ٹکنالوجی کے ذریعے فیشن ڈیزائنروں کو باقاعدہ تربیت دلانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس وقت ملک میں اس طرح کے پانچ انسٹی ٹیوٹ کام کر رہے ہیں۔

پٹ سن پر زور

پٹ سن سے بنے کپڑے کا شعبہ بھی ایک اہم شعبہ ہے۔ ہمارے ملک میں مشرقی اور شمال مشرقی ریاستوں کی زرعی اور صنعتی معیشتوں کا کافی دارومدار اس شعبے پر ہے۔ پٹ سن کے کپڑے کی برآمدات سے ہر سال ۴۰۰ کروڑ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ حکومت نے پٹ سن کی صنعت میں نئی جان ڈالنے کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔ جوٹ پیکیجنگ میٹریلز (پیکنگ میں لازمی استعمال) ایکٹ کے نام سے ۱۹۸۷ء میں ایک قانون پاس کیا گیا ہے جس کا مقصد پیکیجنگ سیکٹر میں پٹ سن سے بنی اشیاء کی روایتی مارکیٹ کو برقرار رکھنا ہے۔ پٹ سن کے شعبے کی جدیدکاری کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پٹ سن کے فروغ کے لیے ایک خصوصی فنڈ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان اقدامات کی بدولت پٹ سن ملوں کے بند ہونے کا سلسلہ رک گیا ہے۔ پٹ سن اُگانے والے کاشت کاروں کو منافع بخش قیمتیں ملنے لگی ہیں۔ پٹ سن سے نئی مصنوعات بنانے کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اور پٹ سن سے بنی اشیاء کی فروخت بھی بڑھی ہے۔ نویں پنج سالہ منصوبے کے دوران یہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔

دست کاریوں کو فروغ

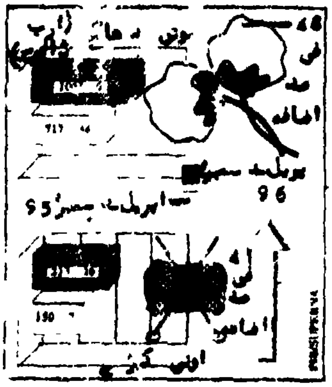
کپڑے کی صنعت میں ہینڈلوم کے شعبے کا بدستور ایک اہم مقام ہے۔ یہ شعبہ بڑی تعداد میں لوگوں کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ ملک میں کل جتنا کپڑا تیار ہوتا ہے اس میں ہینڈلوم کے کپڑے کا ۱/۵ حصہ ہے۔ ہینڈلوم کے شعبے میں پیداوار اور روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ایک اسکیم وضع کی گئی جس کا مقصد تین ہزار ہینڈلوم ڈیولپمنٹ سینٹر اور عمدہ رنگائی کے ۵۰۰ اکائیاں قائم کرنا تھا۔ اس سے ۳۰ لاکھ بنکروں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس وقت تک ۱۸۱ ہینڈلوم ڈیولپمنٹ سینٹر اور عمدہ رنگائی کے ۱۷۲ مراکز کے قیام کی منظوری دی جاچکی ہے۔ نویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ہینڈلوم سیکٹر کی ترقی کے لیے کئی اور اسکیمیں بھی تیار کی گئی ہیں۔

روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کا ایک ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہینڈلوم کا شعبہ ملک کی معیشت میں بھی ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دہائی میں ہینڈلوم کے شعبے نے پیداوار، روزگار اور برآمدات تینوں چیزوں کے لحاظ سے نمایاں ترقی کی ہے۔

ملک میں دست کاریوں کو برائے فروخت بازاروں اور منڈیوں تک پہنچانے پر خاص زور دیا جارہا ہے۔ روایتی اور غیر روایتی دست کاریوں کو فروغ دیا جارہا ہے۔ ان دست کاریوں پر خاص توجہ دی جارہی ہے، جن سے بین اقوامی مارکیٹ کم متعارف ہے۔ اس کے لیے بڑے پیمانہ پر نمائشیں اور میلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ یہ نمائشیں اور میلے ملک کی تمام ریاستوں میں مختلف جگہوں پر ایسے وقت منعقد کیے جاتے ہیں جب وہاں ان کے مقامی میلے وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ "دلی ہاٹ" کے طرز پر اہم مقامات پر مستقل مارکیٹ کے ڈھانچے بھی فراہم کیے جارہے ہیں۔ برآمدات بڑھانے کی غرض سے ایسی دست کاریوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جن کے بین اقوامی مارکیٹ میں مقبول ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ دست کاریوں کی کوالٹی بہتر بنانے کی غرض سے مرکزی سطح پر ٹریننگ، ڈیزائن سازی، مارکیٹنگ اور برآمدات کے فروغ کی کئی اسکیمیں زیر عمل ہیں۔

مختصر یہ کہ گزشتہ پندرہ برسوں میں کپڑے کی صنعت کے مختلف شعبوں نے نمایاں ترقی کی ہے۔ یہ صنعت ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی میں بھی بہت مددگار ثابت ہوئی ہے، جہاں اس صنعت کی پیداوار بڑھی ہے وہاں اس کی بدولت روزگار کے مواقع میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے اور صلاحیت بھی بہتر ہوئی ہے۔ آج کے اقتصادی نرم کاری اور زیادہ سے زیادہ ترقی و فروغ کے ماحول میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ کپڑے کی صنعت مستقبل قریب میں ہندوستان کے ایک بڑی صنعتی طاقت بننے میں اہم رول ادا کرے گی۔

کپڑے کا شعبہ ۔ بہترین کارکردگی



اس سال کپڑے کے شعبے میں بہترین کارکردگی بلاشبہ سوتی دھاگے نیز اونی اور اونی کپڑوں کی رہی ہے۔ سوتی دھاگے کی برآمدات میں ۴۸ فی صد کا ریکارڈ اضافہ ہوا ہے جس کی مالیت اپریل تا دسمبر ۱۹۹۵ء میں ۷۱۷٫۳۸ ملین ڈالر سے بڑھ کر اپریل تا دسمبر ۱۹۹۶ء میں ۱۰۶۳٫۶ ملین ڈالر ہوگئی۔ اونی اور اونی کپڑوں کے سلسلے میں بھی ۴۱ فی صد سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔ ●



غـــــــــــزلیں

مہتاب پیکر اعظمی

شمع دل سے جب فروزاں تیرگی کرتے رہے
آندھیوں سے ہم جہاد روشنی کرتے رہے

کچھ صلہ ہم کو ملے اس کی ہمیں پروا نہیں
عمر بھر اردو زباں خدمت تری کرتے رہے

اپنے سائے کے برابر بھی نہیں ہے جن کا قد
شہر کے مینار کی وہ ہم سری کرتے رہے

آگ سے مت کھیلیے یہ کھیل کچھ اچھا نہیں
جل گئے وہ آگ سے جو دل لگی کرتے رہے

شہر کی سرحد سے آگے روشنی جاتی نہیں
گاؤں والے شکوۂ تیرہ شبی کرتے رہے

بدنصیبی سر پٹکتی رہ گئی پیکر میاں
کیا بتائیں زندگی بھر شاعری کرتے رہے

قیام محل۔ اسٹیشن روڈ براکر، پوسٹ آفس
براکر۔ ضلع بردوان (ویسٹ بنگال) ۷۱۳۳۲۴

اسد رضا

بات کیا دلِ نشیں کہتا ہے
خار کو بھی حسیں کہتا ہے

دورِ حاضر کا وہ مفکر ہے
آدمی کو مشین کہتا ہے

ہم سے بہتر ہے تم سے بہتر ہے
خود کو جو کمترین کہتا ہے

اپنے قاتل کو ایک سادہ لوح
زندگی کا امیں کہتا ہے

وہ ہے شاید سراب کے گھر میں
ہر گماں کو یقین کہتا ہے

اس کی دیوانگی کو کیا کہیے
جو اسد کو ذہین کہتا ہے

۷/۴۴/E.11۔ حوض رانی مالویہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۷

محمد شمشیر

میں جینا چاہتا ہوں درد کی دوا بنکر
رہوں گا دل میں ہر اک کے میں مدعا بنکر

ستم بھی راستہ میرا نہ روک پائے کبھی
وفا کی راہ سے گزروں وہ قافلہ بنکر

قدم قدم پہ زمانہ فریب دیتا رہا
میرا جنون بھٹکتا رہا وفا بنکر

نہ بجھ سکے گی زمانہ کی پیاس دریا سے
میں آسمان سے برسوں گا اک گھٹا بنکر

نہ سمجھو سنگ ہمیں ہم بھی رکھتے ہیں احساس
تمہارے سامنے آئیں گے آئینہ بنکر

لہو سے اپنے چراغوں کو روشنی دوں گا
کہ جب بھی آئے گا تو سرپھری ہوا بنکر

کسی بھی در سے محبت کی بھیک مل نہ سکی
ہر ایک در پہ بھٹکتا رہا صدا بنکر

بھٹک رہے ہیں زمانے میں جو بھی اے شمشیر
میں ان کو راہ دکھاؤں گا رہنما بنکر

این۔ سی۔ آر۔ پی۔ الیٹ، بلاک ۷۔ آر۔ کے
پورم نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

تبصرے

نام کتاب : شاہین
مصنف : شبّر امام
صفحات : ۱۷۵
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : ۴۴- پرومس اپارٹمنٹ
وکاس پوری، نئی دہلی

مبصر : شکیب ایاز

شبر امام کی نگارشات اردو دنیا کے لیے اجنبی نہیں۔ وہ کئی برسوں سے تصنیف و تالیف میں منہمک ہیں۔ ان کے افسانے، خاکے، انشائیے کے علاوہ مختلف موضوعات پر مسی مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں ان کی پہلی کتاب "شخصیت اور کردار" طبع ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں "کلیاں" اور ۱۹۹۶ء میں ناول "شاہین" شائع ہوئی۔ مذکورہ ناول پر کئی تبصرے بھی موقر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

ناول "شاہین" کی عقبی زمین "فسانۂ خورشیدی" یا "اصلاح النساء" ہے۔ شبر امام اصلاح معاشرہ کے داعی رہے ہیں۔ ان کا ادارہ "حسینی سماج" اس کی ایک سامنے کی مثال ہے۔ اصلاح کا بیڑا اٹھانا کوئی بری بات نہیں۔ لیکن اصلاحی ناولوں کی خامیوں کو آج بھی دہرانا درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ناول نگار کے ذہن میں پہلے ہی سے ایک مثالی کردار کی لڑکی کا تصور موجود تھا اور یہی وجہ ہے کہ پورے ناول پر شاہین کا کردار چھایا ہوا ہے۔

اس کے دوسرے کردار حامد، عبدل بابا اور بیگم صاحبہ بھی اسی مرکزی کردار کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ شاہین کا کردار ملمع سازی کا نمونہ نہیں بلکہ وہ ایک متحرک اور فعال کردار ہے بلکہ وہ اپنے افعال و نظریات سے دوسرے ذیلی کرداروں کو متاثر کرتی ہے۔ حامد ہیرو بن سکتا تھا لیکن ناول نگار کے ذہن میں جو مثالی کردار لڑکی کا حلیہ و خاکہ موجود تھا، اس نے حامد کو ہیرو بننے سے باز رکھا۔ میرے نزدیک ہیروئن شاہین ہی سب کچھ ہے۔

کرداروں کے ذریعے جو مکالمے ناول میں پیش کیے گئے ہیں وہ طوالت کی وجہ سے ماجرے کی تعمیر میں خلل پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ مکالمے ناول نگار کے نظریات کے غماز ہیں۔ مکالمے کی طوالت بھی قدیم اصلاحی ناول کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ لیکن قدیم اصلاحی ناولوں اور ناول "شاہین" میں جو عہد کا بُعد ہے، وہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نئے انقلاب کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے۔ یہاں عملی انقلاب کی بشارت بھی ہے۔ یہی طرز فکر "شاہین" کو دوسرے معاشرتی و اصلاحی ناولوں سے ممیز کرتا ہے۔ ایسے نظریات کی تردید اور تائید دونوں آمیزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کشاکش قاری کے ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ یہاں محرومی سے نکل کر خوش آئند زندگی گزارنے کا ایک تازہ رجحان نمایاں ہے۔ مسلم تہذیب کی نشاۃ الثانیہ کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ یہی اس ناول کی اہم خصوصیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

ناول "شاہین" شبر امام کا پہلا ناول ہے۔ توقع ہے دوسرے ناول میں جو تھوڑی سی "آنچ" کی کمی ہے، وہ دور کر دی جائے گی۔ ●

نام کتاب : محراب تمنّا
شاعر : ڈاکٹر فطرت انصاری
صفحات ۱۵۲
ناشر : بزم اردو ادب، سکندرآباد
ضلع بلند شہر (یو پی)

مبصر : احسان خرد

زیر نظر کتاب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک سو باون صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت و طباعت دونوں اچھی ہیں۔ لیکن بہت اچھے نہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف آٹھ روپے ہے۔

اس میں جتنی بھی غزلیں ہیں (بہ استثنائے چند) سب پُرزور اور پُرلطف ہیں۔ ان میں حکایتِ حسن و عشق بھی ہے اور بیانِ امروز و فردا بھی۔ ان میں ایک ایسا انداز پایا جاتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کتاب کی مشمولہ غزلوں کو پڑھنے سے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ صاحبِ کتاب اشعار کہنے سے پہلے کافی تجربات و مشاہدات کر چکا ہے، مختلف حالات سے دوچار ہوا ہے اور غم و خوشی کا رازِ سربستہ معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ اس میں ڈھونڈنے سے بعض

بے رنگ و بے اثر اشعار کی مثالیں بھی ملے جاتی ہیں جو ممکن ہے ابتدائی دور کا نتیجۂ فکر ہوں۔ لیکن اکثر اشعار اس کتاب میں ایسے ہیں جو قلب کو فرحت اور ذہن کو توانائی بخشتے ہیں۔

لرزتی ہے نگاہِ اہلِ دانش جس کے پرتو سے
محبت اپنے دیوانوں کو وہ انداز دیتی ہے

مری خود دار فطرت کی خدا ہی آبرو رکھے
خزاں کے دور میں عزمِ بہاراں لے کے چلتا ہوں

دل کو ہوتی جو تابِ نظارہ
شوقِ دیدار کم نہیں ہوتا

بدگمانی کو مری اور بڑھا دیتا ہے
ان کا یہ کہنا کہ دامن کشِ اغیار نہ بن

جب بھی تمہیں خود اپنے ستم یاد آئیں گے
ایسا ضرور ہوگا کہ ہم یاد آئیں گے

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سلیس و شائستہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ الفاظ میں حسنِ انتخاب اور تراکیب میں دلکشی پائی جاتی ہے — اشعار میں شعریت بھی کافی ہے۔

"محرابِ تمنا" میں غزلوں کے علاوہ شاعر کے چند متفرق اشعار بھی ہیں۔ یہ بھی بجائے خود بہت خوب ہیں۔ افسوس کہ یہ کتاب حق دارِ شہرت ہو کر بھی ابھی تشنۂ شہرت ہی ہے۔ ●

نام کتاب : زرد موسم (مجموعۂ غزلیات)
شاعر : کیفی سنبھلی
سن اشاعت : ۱۹۹۵ء
صفحات : ۱۲۰
قیمت : ۵۲ روپے
ناشر : کیفی سنبھلی، نوریوں سرائے، سنبھل ۲۴۴۳۰۲ ضلع مراد آباد

مبصر : احسان خسرو

یہ کتاب بھی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ابتدا حمد و نعت اور سلام سے کی گئی ہے۔ اس کی قابلِ ذکر خصوصیات بیان کرنے سے پیشتر میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اردو جتنی زبوں حال ہے اتنے ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی اردو کے شعرا موجود ہیں۔ عہدِ حاضر میں اردو جاننے والے کم ہیں اور اردو کے شاعر زیادہ۔ ان شعرا میں مشکل ہی سے ایسے دو چار ملیں گے جن کا دیوان یا مجموعہ قبل از وقت یا بروقت نہ چھپا ہو۔ ایسی صورت میں ایک تو مجموعۂ کلام پڑھنے والے نہیں ملتے، دوسرے یہ کہ اگر کوئی شوق کا مارا پڑھنے بھی لگتا ہے تو تکرارِ مضمون اور یکساں اندازِ بیاں سے اکتا کر اور گھبرا کر اگر مفت کا ہوتا تو اسے سدا کے لیے زینتِ طاق بنا دیتا ہے اور اگر وہ خریدا ہوا ہوتا ہے تو کباڑیئے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا یہ امتیاز ہے کہ آپ اسے بادلِ نخواستہ ہی سہی لیکن صرف کھول لیجیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ دیکھیے گا کہ آپ اسے پڑھتے جا رہے ہیں۔

بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے سے اس میں چند کمیاں اور چند کمزوریاں بھی نظر آجاتی ہیں لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ مذکورہ کتاب زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک نہیں۔ اکثر اشعار شعری عمق سے عاری ہیں۔ - - - - - - - -

- - - - - - - اس میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو محض تکمیلِ غزل اور تشکیلِ غزل کی خاطر کہے گئے ہیں۔ یہ سب اپنی جگہ درست لیکن اس میں جو چاشنی ہے وہ ان کمیوں اور ان کمزوریوں پر پردہ ڈالتی ہے۔

- - - کئی ایسے بھی اشعار ہیں جو مبتدی اور زبردستی شعر کہنے والے نہیں کہہ سکتے۔ ان اشعار کی بندش، سلاست، نغمگی اور مضمون کی جدت و طرفگی شاعرانہ کمال تک پہنچ چکی ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے :

بھول ہی جائیں گے دیوار کی در کی صورت
ایک مدت ہوئی دیکھی نہیں گھر کی صورت

میرے فن کا مجھے اس طرح صلہ دو یارو!
بن چکا تاج محل کاٹ دو شانے میرے

ظالم کے پاس زورِ قلم بھی تھا تیغ بھی
مجھ کو بچا کے بس مرا کردار لے گیا

مال و دولت کرے قربان بھرا گھر دے دے
آدمی وہ ہے جو کردار نہ دے سر دے دے

---

۱۲۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت زیادہ ہے جو قاری کے ذہن میں خریدتے وقت ہچکچاہٹ پیدا کرے گی۔ اس کی کتابت اور طباعت پر اور توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ ●

نام کتاب : نغمۂ خیام
مصنف : عادل اسیر دہلوی
صفحات : ۸۰
قیمت : ۲۰ روپے (مجلد : ۳۰ روپے)
پتا : سورج پرکاش، ۴۔۱۰۲۴ چتلی قبر دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

مبصر : احسان خسرو

زیرِ نظر کتاب عادل اسیر دہلوی کے مذاقِ سخن کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ کتاب اپنی خصوصیت کی بنا پر تشنگانِ شعر و ادب کی نظر میں ہمیشہ قابلِ تحسین اور درخورِ اعتنا رہے گی۔

اس میں عمر خیام کی دو چار سے قطعِ نظر اچھی اور بہت اچھی رباعیوں کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان فارسی رباعیوں اور ان کے منظوم ترجمے کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحبِ کتاب کی سخن فہمی اعلا درجے کی ہے اور وہ نہ صرف اردو زبان سے بخوبی واقف ہیں بلکہ فارسی پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

یہ کتاب کئی لحاظ سے اہم اور مفید ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اردو کے اکثر طلبہ اردو زبان و ادب ہی اچھی طرح نہیں جانتے، فارسی زبان و ادب کیا جانیں گے۔ ایسے طلبہ کے لیے یہ کتاب بڑے کام کی چیز ہے۔ بہت سارے ایسے حضرات بھی ہیں جو اردو اور فارسی کے گنجینۂ ادب سے واقفیت چاہتے ہیں لیکن اردو رسم الخط نہیں جانتے۔ ایسے

لوگوں کو پیشِ نظر رکھ کر مشمولہ رباعیوں کا ترجمہ دیوناگری میں بھی کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کا منظوم ترجمہ نہ صرف ترجمہ ہے بلکہ تخلیق کا بھی درجہ رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دو ایک رباعیوں کا ترجمہ محض ترجمہ ہے۔ اس میں دھیما پن اور ڈھیلا پن محسوس ہوتا ہے لیکن اکثر رباعیوں کے ترجمے میں تخلیقیت موجود ہے۔ اس میں روانی بھی ہے، وزن بھی ہے اور برجستگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مثلاً:

معلوم نہیں تجھ کو کہ یہ مرغِ سحر
رورانہ ہوا کرتا ہے کیوں نوحہ گر
اک دن تری عمر کا بے کار گیا
نادان مگر تجھ کو نہیں کوئی خبر

عارض پہ گل کے آبِ نوروز اچھا
گل زار میں رخسارِ دل افروز اچھا
ماضی کے تعلق سے ہیں باتیں بے کار
کل سے تو بہرحال ہے امروز اچھا

---

۸۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب کتابت، طباعت اور قرینے کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے۔ سرورق اتنا جاذبِ نظر ہے کہ مذکورہ کتاب کی عمدگی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اس کے پیش لفظ میں بعض حقائق سے پردہ اٹھا کر جرأت مندی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس کی قیمت بہت کم نہیں تو بہت زیادہ بھی نہیں ہے۔ مختصراً یہ کہ اس کتاب کے بارے میں "بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کہنا غلط نہ ہوگا۔ ●

نام کتاب:	بیربل کی کہانیاں
مصنف:	عادل اسیر دہلوی
سالِ اشاعت:	۱۹۹۶ء
صفحات:	۷۱
قیمت:	۱۰ روپیے
ناشر	سورج پرکاش، ۴۴-۱۰۲ اجیتلی قبر، دہلی
مبصر:	شبنم امام

"اردو ادبِ اطفال" میں کہانیاں، نظم اور لطائف اہم ترین صنفِ ادب ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں میں محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور اسماعیل میرٹھی کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ ان لوگوں کی کہانیوں میں پند و نصیحت پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ نونہالانِ ملک و قوم کی ذہنی پرورش اور تعلیم و تربیت میں کہانیاں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو کہانیاں سناتی تھیں اور آج بھی بعض گھروں میں اس کی تقلید ہو رہی ہے۔ ہندوستانی کہانیوں میں سب سے پہلے سنسکرت کی مشہور تصنیف "پنچ تنتر" کو عالمی مقبولیت حاصل ہوئی۔

عادل اسیر نے سیدھی سادی آسان زبان، دلکش اسلوب اور بچوں کی دلچسپی کے پورے مواد کے ساتھ ساتھ پرلطف واقعات اور سبق آموز کہانیاں پیش کی ہیں۔ ایسی کہانیاں بچوں کو مہمیز کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی ان کہانیوں میں اسیر کی انشا پردازی کا جوہر صاف نظر آتا ہے۔

کتاب کا سرورق بچوں کے لیے دیدہ زیب ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ اور قیمت بھی معقول ہے۔ اس کتاب کو بچوں کے درسی نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ ●

نام کتاب،	آؤ بچو! پہیلی بوجھیں
مرتب:	عادل اسیر دہلوی
سالِ اشاعت:	۱۹۹۶ء
صفحات:	۴۶
قیمت	۱۰ روپیے
ناشر	سورج پرکاش دہلی ۴۴-۱۰۲، اجیتلی قبر، دہلی
مبصر:	شبنم امام

بچوں کی ذہنی تربیت اور ان کی نفسیاتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ادبی مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے موزوں ہو۔ عادل اسیر اس تگ و دو میں پیش پیش نظر آتے ہیں بلکہ ان کا کام ایک مجتہدانہ اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔

بچوں کو محض اچھی غذا، عمدہ لباس اور قیمتی کھلونے فراہم کرنے سے پرورش و پرداخت کا فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ ادبی مواد فراہم کر کے ان کی معلومات میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ ایک عمدہ شہری بننے کی راہ ہموار کر سکیں۔

عادل اسیر کی تصانیف سے نہ صرف طلبا و طالبات مستفیض ہوں گے بلکہ یہ صاحبانِ ذوق کی دلچسپی کا سبب بھی بنیں گی۔ بچوں کے لیے اردو میں اس طرح کے ادب کا فقدان ہے اور خاص کر پہیلیوں اور معموں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کے بعد اس فن کی طرف چند حضرات نے توجہ دی مگر وہ نہیں کے برابر ہے۔ اس مجموعے میں قدیمی روایتی اور جدید انداز کی بھی پہیلیاں شامل ہیں۔

کتاب کا سرورق بچوں کے لیے دیدہ زیب ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے۔ قیمت بھی معقول ہے۔ ●

بقیہ کور ۲ - آئی۔ آر۔ ایس۔ ایک سی

سکتے۔ ریموٹ سینسنگ سیٹلائٹس سے متاثرہ علاقوں کا پتا لگانے اور عوام کو امداد پہنچانے، معدنی ذخائر کی تلاش نیز فصلوں اور پیداوار کے اندازے مرتب کرنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

یہ دو دہائیوں کی سخت محنت کا نتیجہ تھا کہ بھارت نے دسمبر ۱۹۹۵ء میں آئی آر ایس-ایک سی اور مارچ ۱۹۹۶ء میں آئی آر ایس-پی ۳ خلا میں چھوڑنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح بھارت ان چیدہ ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے جو اپنے یہاں ترقیاتی مقاصد کے لیے ملکی خلائی ٹکنالوجی تیار اور استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خلائی ٹکنالوجی کے معاملے میں اگلی دہائی بھارت کے لیے اور بھی اہم اور شاندار رہے گی کیوں کہ بھارت مزید گیارہ مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ●

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

بچہ مزدوری کے خاتمے کے لیے بین اقوامی پروگرام

بچہ مزدوری کے خاتمہ کے لیے بین اقوامی پروگرام (آئی پی ای سی) ایک عالمی پروگرام ہے جسے بین اقوامی تنظیم محنت (آئی۔ ایل۔ او) نے دسمبر ۱۹۹۱ء میں شروع کیا تھا۔ ہندوستان نے آئی۔ ایل۔ او کے ساتھ ایک مفاہمتی دستاویز پر دستخط کیے تھے اور اس طرح وہ ۱۹۹۲ء میں اس پروگرام میں شامل ہونے والا پہلا ملک بن گیا تھا۔ آئی پی ای سی کا طویل المیعاد مقصد تو بچہ مزدوری کو موثر طور پر ختم کرنے میں اپنا حصہ ادا کرنا ہے مگر اس کے فوری مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آئی۔ ایل۔ او سے الحاق رکھنے والے اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں بچہ مزدوری ختم کرنے کے پروگرام کی تیاری، ان پر عمل درآمد اور ان کے جائزے کی صلاحیت میں اضافہ کرنا۔

۲۔ آبادیوں کی اور قومی سطحوں پر ان مداخلتوں کی نشاندہی کرنا جو نقش ثانی کے لیے ماڈل (نمونہ) کا کام دے سکیں۔

۳۔ بچہ مزدوری کو ختم کرنے کے لیے بیداری اور سماجی تحریک پیدا کرنا۔

ہندوستان میں آئی پی ای سی کی کوششیں

۱۹۹۲ء کے آغاز میں ہندوستان میں آئی۔ پی۔ ای۔ سی میدان میں اترا۔ یہاں اس نے جو اہم اقدامات کیے، حسب ذیل ہیں۔

(۱) بچہ مزدوری کی باز آبادکاری کے لیے براہ راست امداد کے پروگرام۔

(۲) بچہ مزدوری کے خلاف عوامی بیداری پیدا کرنا۔

(۳) بچہ مزدوری کے خلاف ٹریڈ یونیوں اور ان کے کارکنوں کو احساس دلانا اور بچہ مزدوری کے خلاف اہم کردار ادا کرنے کے لیے انھیں تیار کرنا۔

(۴) سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں نیم سرکاری اداروں اور خود مختار تنظیموں وغیرہ کا قیام۔

(۵) بچہ مزدوری کے عواقب کی تفہیم کے لیے تحقیقی مطالعات کرنا اور ان کو دستاویزی شکل دینا۔

(۶) قوانین کے موثر نفاذ کے لیے لیبر انسپکٹروں کو ٹریننگ دینا، بچہ مزدوری سے تعلق رکھنے والے مختلف پہلوؤں کی ٹریننگ غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں کو فراہم کرنا جس میں ڈیزائن، انتظامیہ در بچہ مزدوری کے خاتمہ کے لیے پروجیکٹ کا جائزہ بھی شامل ہے۔

(۷) بچہ مزدوری کے خلاف مالکان اور ان کی تنظیموں کو قیام اور بچہ مزدوری کے خلاف ان کے اندر احساس پیدا کرنا۔

آئی پی ای سی کے تحت اقدامی پروگرام

ہندوستان میں آئی۔ پی۔ ای۔ سی کے تحت اقدامی پروگرام کو فنڈ فراہم کیا گیا ہے ان کی تعداد ۱۱۸ ہے۔ اس وقت جن اقدامی پروگراموں پر عمل ہو رہا ہے ان میں سے کچھ پروگرام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہندوستانی آجرین کی کونسل کے تحت ایک پروجیکٹ یہ کونسل ایک سب سے بڑی تنظیم کی حیثیت رکھتی ہے جو کہ پبلک سیکٹر، اسکوپ اور پرائیویٹ سیکٹر کی فکی اے۔ ایس۔ او سی۔ ایچ۔ اے۔ ایم کا احساس کرتی ہے۔ کونسل ریاستی سطح کے ایوان ہائے تجارت وصنعت کو ملک کی پانچ منتخبہ ریاستوں میں اس کے فرائض کا احساس دلاتی ہے اور ان اسباب کا جائزہ لیتی ہے کہ والدین بچوں کو کام کے لیے کیوں بھیجتے ہیں۔

۲۔ سینٹرل بورڈ برائے ورکرز ایسوسی ایشن کا ایک پروجیکٹ جس کے ذریعہ ورکروں کے لیے جاری اس کے تمام ٹریننگ پروگراموں میں بچہ مزدوری کے موضوع کو ۴۸ علاقوں میں سے ۱۲ علاقوں میں شامل کرنا ہے۔ اس اقدامی پروگرام کے ذریعہ لگ بھگ ۵۰۰۰ ورکروں کو بچہ مزدوری کے بارے میں بیدار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

۳۔ منتخبہ صنعتوں میں بچہ مزدوروں کی جگہ بالغ مزدوروں سے کام لینے کے اقتصادی اثرات کا جائزہ، سینٹرل فار آپریشنز ریسرچ اینڈ ٹریننگ بڑودہ کے ذریعہ لیا جارہا ہے۔

۴۔ ایک پروجیکٹ کے ذریعہ یہ کوشش کی جارہی ہے کہ خاص دھارا کے بچے (جو یا تو اسکول میں داخل ہی نہیں ہو پاتے یا اسکول چھوڑ کر نکل آتے ہیں) دوبارہ اسکول بھیجے جائیں اور اس کے لیے ۲۴ گھنٹے کے دن رات کے رہائش کے بچوں کے ذریعہ ان کو آمادہ کیا جائے یہ کیمپ اسکول کے دوبارہ کھلنے سے تین چار ماہ قبل لگائے جائیں۔ اس

پروجیکٹ پر ایم۔ دی فاونڈیشن ضلع رنگا ریڈی آندھرا پردیش عمل کر رہا ہے۔

۵۔ ۱۳ ریاستوں اور آٹھ صنعتوں میں بچہ مزدوری کے مسئلہ کے ادراک کی مہم کے ایجنڈے میں نمایاں جگہ دینے کے لیے سنٹر آف انڈین ٹریڈ یونین (سی۔ آئی۔ ٹی یو) کے ذریعہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔

۶۔ جیودنٹ غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعہ ۔۔ ۴۰ بچہ مزدوری کی ریاستی محکمہ تعلیم کے کہ سے تعاون سے ضلع دستا کھا پٹنم کے تعلقہ بالا میں چلائی گئی باز آبادکاری کے لیے ایک پروجیکٹ پروشا کھا پٹنم کا سجنگا دتول چیریٹ ایبل ٹرسٹ عمل کر رہا ہے۔

۷۔ بنگلور شہر کی گندگی بستیوں میں بچہ مزدوروں کی باز آبادکاری کے ایک پروجیکٹ پر عمل ہو رہا ہے جن کو مقامی اسکولوں میں داخلہ کرانے کے لیے کرناٹک اسٹیٹ کونسل فار چلڈرن بنگلور کوشاں ہے۔

۸۔ پنجاب ہریانہ اور دہلی چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری نے ایک ورکشاپ کے ذریعہ مالکان کو بچہ مزدوری کے خلاف بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اس کا مقصد مالکان کے گروپوں کو ایک اقدامی منصوبہ کے لیے تیار کرنا بھی تھا۔

۹۔ ہریانہ اور راجستھان میں بندھوا بچہ مزدوروں کی باز آبادکاری کے سرو ویشنک آر یو دک پریشد نے ایک پروجیکٹ پر عمل کیا اور بچوں کے ماؤں کو گھر کی آمدنی میں اضافہ کے لیے چھوٹا کاروبار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۰۔ ایک اور پروجیکٹ جس کے تحت ریلوے پلیٹ فارموں پر ان بچوں کے لیے اسکول لگائے جاتے ہیں، جو ریلوے کے احاطے کے اندر اردگرد اور چلتی گاڑیوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ خدمت روچیکا اسکول سوشل سروس ونگ بھوبنیشور انجام دے رہی ہے جو تین مرحلوں کے ایک نظام کے ذریعہ بچوں کو خاص دھارے میں شامل کرکے باقاعدہ اسکولوں میں داخل کرانے کا انتظام کرتا ہے۔

۱۱۔ بھارت چلڈرنز شیکشا سمتی ٹونک، راجستھان کے ذریعہ ایک پروجیکٹ چلایا جا رہا ہے جو زرعی سیکٹر میں بچہ مزدوری کو راجستھان کے اس دیہی علاقہ میں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

۱۲۔ ایک پروجیکٹ چھتاگارا آدی باسی مہیلا سمیتی ۱۷۰۰ بچوں کی باز آبادکاری کے لیے چلا رہی ہے (ان میں سے کچھ بچے تارکین وطن مزدوروں کے ہیں) ان بچوں کو باقاعدہ چل رہے سرکاری اسکولوں میں داخل ہونے کے لیے آمادہ کرکے بچہ مزدوری کے زور کو کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۱۳۔ مختلف ریاستی حکومتوں کے انفورسمنٹ سیکٹرز کے ذریعہ بچہ مزدوری پر ترجیحی انداز میں توجہ دینے کے لیے ایک ٹریننگ پروگرام چلایا جا رہا ہے، جس کے ذریعہ ان کے معائنہ اور مقدمات قائم کرنے کے ہنر کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ اس پروگرام پر مختلف ریاستی یونٹوں کے اداروں کے ذریعہ نیشنل لیبر انسٹی ٹیوٹ عمل کر رہا ہے۔

۱۴۔ کلکتہ شہر کی کچھ بستیوں میں بار آبادکاری اور روک تھام اقدامات کے ذریعہ سی۔ آشا کلکتہ کے ذریعہ بچہ مزدوری کو ختم کرنے کے لیے ایک پروجیکٹ پر عمل کیا جا رہا ہے۔

۱۵۔ دیہی کارکنوں کی تنظیموں کے عہدیداروں کو بچہ مزدوری کے مسئلے سے آگاہ کرنے کے لیے ورکشاپس منعقد کرنے کی خدمت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف دیہی ترقیات (این۔ آئی۔ ڈی۔ آر) حیدرآباد اور حکومت کیرالہ کا محکمہ انجام دے رہے ہیں۔

۱۶۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (اے آئی۔ ٹی۔ یو۔ سی) سے تعلق رکھنے والی ٹریڈ یونینوں کو بچہ مزدوری کے مسئلہ سے آگاہ کرنے کے لیے ایک پروجیکٹ پر عمل ہو رہا ہے جس میں خاص خاص ریاستوں اور صنعتوں پر توجہ مرکوز کی جا رہی ہے اور بچہ مزدوروں کو مثالی کلاس روموں میں غیر رسمی تعلیم دے کر ان کی باز آبادکاری پر زور دیا جا رہا ہے۔

بچوں کا احاطہ

اب تک آئی۔ پی۔ ای۔ سی کے ذریعہ مجموعی طور پر ۱۱۸ پروجیکٹوں کے فنڈز فراہم کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ براہ راست مجموعی طور پر لگ بھگ ۸۱۱۲۸ بچوں کا احاطہ کرنا مقصود ہے۔

آئی۔ پی۔ ای۔ سی کے تحت ریاست وار پروجیکٹ اور جن بچوں کا احاطہ کیا گیا ہے ان کی تعداد (۹۶-۹۲) کے درمیان حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار	ریاستیں	منظور شدہ پروجیکٹ	بچوں کی تعداد
۱۔	آندھرا پردیش	۱۶	۱۵۴۵
۲۔	بہار	۳	۱۳۴۰
۳۔	دہلی	۶	۴۲
۴۔	گجرات	۵	۱۳۵۰
۵۔	ہریانہ	۱	۳۰۰
۶۔	کرناٹک	۲	۱۳۲
۷۔	کیرالہ	۲	۲۰۰۰
۸۔	مدھیہ پردیش	۵	۲۰۲۵
۹۔	منی پور	۱	۵۰۰
۱۔	مہاراشٹر	۷	۱۷۵۰
۱۱۔	اڑیسہ	۴	۱[illegible]۰۰
۱۲۔	راجستھان	۷	۵۸۵۰
۱۳۔	تامل ناڈو	۱۷	۶۷۱۰
۱۴۔	اتر پردیش	۱۱	۱۳۹۳۹
۱۵۔	مغربی بنگال	۱۹	۲۲۸۹۰
۱۶۔	مشرقی بنگال	۱	دستیاب نہیں
۱۷۔	علاقائی	۱۱	دستیاب نہیں
کل تعداد ادارے	–	–	–
کل میزان	۱۱۸	۸۱۱۲۹	–

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

معاون : رقیہ زیدی

تزئین و کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : نندیتا

جلد : ۱۷ : شمارہ : ۳

جون ۱۹۹۷ء (۱۱ جیٹھ تا ۹ اساڑھ شک ۱۹۱۹)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر کے پورم (مین) نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

ترتیب

نور اللہ خاں

عام بجٹ ۹۸-۱۹۹۷ء: ایک جائزہ

۲۸ فروری ۱۹۹۷ء کو ۹۸-۱۹۹۷ء کا عام بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر خزانہ نے کہا تھا کہ اس بجٹ کی بنیاد بھی کم از کم مشترکہ پروگرام ہی ہے۔ شری چدمبرم نے بتایا تھا کہ جن سات بڑے مقاصد کو سامنے رکھ کر پچھلا بجٹ بنایا گیا تھا ان مقاصد کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے۔ یہ مقاصد تھے ترقی، کم از کم بنیادی خدمات، روزگار، وسیع تر معاشی استحکام بالخصوص بنیادی ڈھانچے میں سرمایہ کاری۔ انسانی وسائل کا فروغ اور ادائیگیوں کا توازن۔ وزیر خزانہ نے کہا تھا کہ پچھلے بجٹ میں انھوں نے جو وعدے کیے تھے انھیں زیادہ تر پورا کر دیا گیا ہے مثلاً ریاستوں کو بنیادی خدمات کے لیے ۲۲۴۴ کروڑ کروڑ روپے دیے گئے اسی طرح سے دیہی بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے پروگراموں کے لیے ۲۵۰۰ کروڑ روپے دیے گئے، جیون سرکشا اور جن آروگیہ بیمہ اسکیمیں شروع کی گئیں، ان صنعتوں کی فہرست میں توسیع کی گئی جو خود بہ خود غیر ملکی سرمایہ کاری حاصل کرنے کی مجاز ہیں۔ وزیر خزانہ نے بتایا کہ معیشت کا قابل ذکر پہلو یہ رہا کہ پچھلے تین برس کے دوران اندرون ملک مجموعی پیداوار، فی صد سالانہ کی اوسط شرح سے بڑھی۔ انھوں نے بتایا کہ شرح ترقی ۶/۸ فی صد رہی۔ زراعت اور دیگر متعلقہ شعبوں میں ترقی کی رفتار میں جو کمی آگئی تھی وہ ختم ہوئی اور ۳/۷ فی صد شرح ترقی ریکارڈ کی گئی۔ اناج کی پیداوار ۱۹۱۰ لاکھ ٹن

رہی۔ اشیاء سازی کے شعبے ۷/۶ فی صد ترقی ہوئی اور غیر ملکی زر مبادلہ کا ذخیرہ ۱۷۔ ارب امریکی ڈالر سے بڑھ کر ۲۷ فروری ۱۹۹۷ء کو ۱۹/۵۔ ارب امریکی ڈالر ہوگیا۔

غریبی دور کرنے کے اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے وزیر خزانہ نے بتایا کہ یوم آزادی کے موقعے پر وزیر اعظم کستوربا گاندھی شکشا یوجنا کا افتتاح کریں گے۔ اس پروگرام کے تحت جن اضلاع میں لڑکیوں کی شرح خواندگی نسبتاً کم ہے وہاں خصوصی اسکول قائم کیے جائیں گے۔ اس کام کے لیے ۹۸-۱۹۹۷ء کے بجٹ میں ۲۵۰ کروڑ روپے کی رقم کی تخصیص کی گئی ہے۔ تمام تر موجودہ خود روزگار اسکیموں کی، جن میں پی۔ ایم۔ آر۔ وائی، آئی آر۔ ڈی پی، این آر۔ وائی۔ وغیرہ شامل ہیں، تشکیل نو کی جائے گی اور اس کے تحت دس لاکھ نوجوانوں کو بینک قرض مہیا کرائے جائیں گے تاکہ وہ کوئی اپنا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکیں۔

وزیر اعظم کا اہم پروگرام بنیادی کم از کم خدمات منصوبہ ہے۔ گزشتہ مالی برس میں اس کے لیے ۲۴۶۶ کروڑ روپے کے مقابلے میں ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۳۳۰۰ کروڑ روپے فراہم کرانے کی تجویز ہے۔ اس میں گندی بستیوں کے لیے ۲۳۰ کروڑ روپے بھی شامل ہیں۔

تیز رفتار آبی بہم رسائی کے لیے تخصیص کو ۹۰۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۱۳۰۰ کروڑ روپے کیا جا رہا ہے۔

گنگا کلیان یوجنا کا مقصد کاشتکاروں کو زیر زمین پانی اور سطح زمین پر دستیاب پانی کے استعمال کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے میں تعاون دینا ہے۔ اس کے تحت سبسڈی، دیکھ ریکھ کے لیے امداد، قرض انتظامات کے لیے ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۲۰۰ کروڑ روپے فراہم کرائے گئے ہیں۔ زراعت ہماری معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ سی۔ ایم۔ پی یعنی کم از کم مشترکہ پروگرام اس بات کا متقاضی ہے کہ زراعت اور زرعی صنعتوں کے لیے فراہم کی جانے والی قرض کی رقم کو ۵ برسوں میں دوگنا کر دیا جائے۔ زرعی شعبے کے لیے قرضے کی سہولیات کو ۲۲۰۰۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۲۸۶۰۰ کروڑ روپے کیا جا رہا ہے یعنی ۶۶۰۰ کروڑ روپے کا ایک بے مثال اضافہ۔ دیہی بنیادی ڈھانچہ ترقیاتی فنڈ (آر۔ آئی۔ ڈی۔ ایف) کامیاب اور مقبول ثابت ہوا ہے۔ مارچ ۱۹۹۷ء تک اس فنڈ کے تحت ۱۴۰۰ کروڑ روپے تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ علاقائی دیہی بینکوں کو مستحکم کرنے کی پالیسی آئندہ برس بھی جاری رہے گی۔ اس مقصد کے لیے بجٹ میں ۲۷۰ کروڑ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔

نبارڈ کو مستحکم کیا جا رہا ہے۔ نبارڈ کو ۵۰۰ کروڑ روپے کی پیشگی اضافی حصص رقم فراہم کی گئی ہے۔ ۹۸-۱۹۹۷ء میں بھی اس کو اسی طرح سے مستحکم بنایا جائے گا۔

حکومت نے حال ہی میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے پلانٹ اور مشینوں کے لیے سرمایہ کاری کی حد کو بڑھا کر ۳ کروڑ روپے اور بہت چھوٹی اکائیوں کے لیے اس حد کو

۳۱۳۲۔ گلی رنگ والی، تلک بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

بڑھا کر ۲۵ لاکھ روپے کر دیا ہے۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے اب توسیع شدہ تمام چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو قرض دستیاب ہو سکے، ریزرو بینک یہ ہدایت جاری کر رہا ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے شعبے کے لیے عام طور پر دستیاب رقومات میں سے ۴۰ فی صد حصہ ان اکائیوں کے لیے مخصوص ہوگا جن میں پلانٹ اور مشینوں پر ۵ لاکھ روپے تک کی سرمایہ کاری کی گئی ہے اور ۲۰ فی صد حصہ ایسی اکائیوں کے لیے مخصوص ہوگا جن میں ۵ سے ۲۵ لاکھ روپے تک کی سرمایہ کاری کی گئی ہے اور بقیہ ۴۰ فی صد حصہ دیگر چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے مخصوص ہوگا۔

دیہی علاقوں میں مالکانہ حقوق کی حامل زمینوں پر مکانات کی تعمیر کے لیے عام شرح سود پر دو لاکھ روپے تک کے قرض مہیا کرائے جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ قرض لینے والا مکان کی لاگت کا ایک تہائی حصہ خود فراہم کرے۔

کچھ عرصہ پہلے بنیادی ڈھانچے میں ٹیلی مواصلات کو شامل کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ تیل کی کھوج اور صنعتی پارکوں کو اس زمرے میں شامل کرنے کی تجویز ہے۔ ٹیلی مواصلات کے لائسنس تفویض کرنے کے مسئلے کو حل کر لیا گیا ہے اور ٹیلی مواصلات کے محکمے، لائسنس لینے والے اور دینے والوں کے درمیان سہ فریقی معاہدے کیے جانے کی تجویز ہے۔

نیشنل ہائی وے اتھارٹی آف انڈیا کے لیے بجٹی امداد موجودہ سال کے ۲۰۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰ کروڑ روپے کرنے کی تجویز ہے۔ مشترکہ کم از کم پروگرام بنیادی ڈھانچے کو اعلا ترجیح دیتا ہے۔ ہندوستانی انفراسٹرکچر رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ اب اس پر عمل ہونا باقی ہے۔ یکم اپریل ۱۹۹۷ء سے بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے ایڈہاک ٹریژری بل کا مروجہ طریقہ ترک کر دیا جائے گا۔

۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینہ جات میں ۲۰۴۴۶۰ کروڑ روپے کے مجموعی اخراجات دکھائے گئے تھے۔ اب یہ گھٹ کر ۲۰۲۲۹۸ کروڑ روپے ہو جانے کی امید ہے۔

سالِ رواں میں نان پلان اخراجات ۴۰۴۷۴۱ کروڑ روپے کے دکھائے گئے ہیں۔ زیر تبصرہ سال میں مشکلات کے باوجود مزید ۷۰۰ کروڑ روپے دفاع کے لیے بھی دیے گئے۔ مجموعی طور پر وصولی اور خرچ کو بجٹ کے اندر ہی رکھا گیا ہے۔

حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ منصوبے کے لیے بجٹ کی امداد میں ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینہ جات کے مقابلے میں ۷۹۵۸ کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا ہے جو اب تک کا سب سے زیادہ اضافہ ہے۔

مرکزی منصوبے میں بجٹ کی امداد دیہی ترقی، روزگار اور غریبی دور کرنے والے پروگراموں اور انسانی وسائل کی ترقی کے شعبے پر مرکوز ہے ——

۹۸-۱۹۹۷ء کے لیے دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت کے لیے اخراجات بڑھا کر ۹۰۹۶ کروڑ روپے کیے جا رہے ہیں جو ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینے سے ۱۲۷۱ کروڑ روپے زیادہ ہیں۔

۹۸-۱۹۹۷ء میں جواہر روزگار یوجنا سے ۴۵ کروڑ افرادی دنوں کا روزگار پیدا ہونے کی توقع ہے تقریباً ۹۰۰۰۰ بستیوں کو پینے کا محفوظ پانی مہیا کرایا جائے گا۔

سماجی خدمات کے شعبے کے لیے اخراجات ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ ۱۱۷۸۵ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۱۵۰۷۰ کروڑ روپے کیے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ اضافہ شہری ترقی میں ہوا یعنی ۷۷۵ کروڑ روپے، تکنیکی تعلیم کے لیے ۱۳۲ کروڑ روپے، خاندانی بہبود کی اسکیموں کے لیے ۲۸۲ کروڑ روپے اور پانی کی فراہمی اور صفائی کی مد میں ۳۱۲ کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے کے لیے ۹۷-۱۹۹۶ء کے ۱۴۵۸ کروڑ روپے کے مقابلے میں ۱۸۷۰ روپے دیے گئے ہیں۔ مولانا آزاد تعلیمی فاؤنڈیشن کو ۴۰ کروڑ روپے دیے جب کہ اقلیتوں کی ترقی اور مالیات کی قومی کارپوریشن کو ۴۱ کروڑ روپے دیے گئے ہیں۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی ترقی سے متعلق قومی کارپوریشن کے لیے ۹۶ کروڑ روپے، جب کہ معذوروں کی بہبود کے لیے ۹۰ کروڑ روپے کی تخصیص کی گئی ہے۔

۹۸-۱۹۹۷ء میں مجموعی غیر منصوبہ جاتی اخراجات کا اندازہ ۱۴۹۶۲۹ کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ اندرون ملک کیمیاوی کھادوں کے لیے سبسڈی ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینے یعنی ۴۷۴۳ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۵۲۴۰ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ خوراکی اجناس اور چینی کے لیے سبسڈی کے طور پر ۷۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جو ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینوں کے مقابلے میں ۱۴۴۳ کروڑ روپے زیادہ ہے۔ دفاع پر ۳۵۶۲۰ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

ٹیکسوں کی موجودہ شرحوں سے ٹیکسوں سے ہونے والی مجموعی آمدنی کا اندازہ ۱۵۳۳۴۷ کروڑ روپے لگایا گیا ہے اس میں سے ۴۰۲۵۴ کروڑ روپے ریاستوں کو ٹیکسوں کے حصے کے طور پر دیے جائیں گے۔ غیر ٹیکس آمدنیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مختلف مدوں کے تحت ہونے والی آمدنیاں ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۳۹۷۴۹ کروڑ روپے ہوں گی۔ مرکز کو مالیہ سے ہونے والی خالص آمدنی جس میں غیر ٹیکس آمدنی بھی شامل ہے، ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینے یعنی ۱۳۰۷۸۳ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۱۵۲۸۴۳ کروڑ روپے ہو جائے گی۔ ●

بقیہ: مرزا غالب

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بے شک مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو ادب میں ایک بیش بہا خزانے کا اضافہ کر گئے ہیں۔ اسی لیے آج ہم ان کی دو سو سالہ یادگار منا کر انھیں خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ ●

ایم. اروناچلم

ترقی پذیر ملک میں محنت کش طبقہ

محنت پیداوار کے چار عناصر میں سے ایک ہے لیکن اسے پیداوار کی محض ایک نامیاتی اکائی کے طور پر ناپا نہیں جاسکتا۔ یہ ایک انسانی وسیلہ ہے جو انسانوں پر مشتمل ہے اس کی اپنی امیدیں ہیں، امنگیں ہیں، بنیادی ضروریات ہیں، پسند ناپسند ہے، جذبات ہیں، کمزوریاں ہیں۔ ان ضروریات، خوابوں، توقعات اور جذبات کو مناسب ہمدردی کے ساتھ انسانی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔

سرکار کو سماج کا ایک ایجنٹ ہونے کے ناتے سماج کے محروم اور پسماندہ طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے آگے آنا ہوگا۔ ان طبقوں میں محنت کش طبقہ بھی شامل ہے جسے خاص تحفظ اور سماجی انصاف کی ضرورت ہے۔ سرکار کو انفرادی عمل کا منصف ہونے کی حیثیت سے ان کی کم از کم اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کو یقینی بنانا ہوگا مثلاً یہ کہ انھیں پینے کے لیے صاف اور محفوظ پانی دستیاب ہو، ان کے کام کرنے کی جگہ ایسی ہو جہاں حادثات کا خطرہ نہ ہو، انھیں رہنے کی جگہ، خوراک اور دوسری اشیاء جو جینے کے لیے ضروری ہیں، دستیاب ہوں۔

نمایاں ترقی

حصول آزادی کے بعد ملک کا صنعتی منظر تیزی سے بدلا ہے۔ جہاں اسٹیل، سیمنٹ اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کے کچھ مستحکم کارخانوں میں بہت زیادہ توسیع ہوئی ہے، وہاں مرکزی اہمیت رکھنے والے بہت سے شعبوں اور بنیادی ڈھانچے کے سیکٹر میں بہت سے نئے یونٹ بھی قائم ہوئے ہیں۔

صرف پبلک سیکٹر ہی میں صنعتی شعبے میں اندازاً ۲۵۰ انٹرپرائزز ہیں۔ ان کے علاوہ وزارت دفاع اور ریاستی سرکاروں کی پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز کی بہت سی اکائیاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ پرائیویٹ یا نجی سیکٹر میں بھی صنعتی منظر میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ صنعتی اداروں کی تعداد میں اضافے کے نتیجے میں نجی سیکٹر میں روزگار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ برسوں میں صنعتی شعبے کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ہندوستانی محنت کش طبقے کا کردار بھی بدلا ہے۔ آج محنت کش طبقہ اپنے ذوق وشوق اور نظریات کے اعتبار سے پہلے سے زیادہ شہری ہوگیا ہے۔ اسے ایک حد تک سماجی انصاف بھی حاصل ہے جس کا تین چار دہائیوں قبل تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ منظم سیکٹر میں صنعتی مزدوروں کے معاملات طے کرنے کی اجتماعی طاقت میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔

آزادی کے بعد سے ہم ملی جلی معیشت کی پالیسی پر عمل کرتے رہے ہیں تاہم ۱۹۹۱ء سے اختیار کی گئی نئی اقتصادی پالیسی نے صورت حال کافی بدل دی ہے اگرچہ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کو مناسب اہمیت دی جارہی ہے تاہم ان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ پرائیویٹ کمپنیوں اور ملٹی نیشنل اداروں کا مقابلہ کرکے اپنی مضبوطی اور استحکام ثابت کریں۔ لہٰذا ان اکائیوں کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ مزدوروں کی پیداوار کی صلاحیت بڑھانے پر زور دیں۔ ڈھانچہ جاتی تطبیق اور عالمی معیشت سے ارتباط کے پس منظر میں نظریے کی یہ تبدیلی اس بات کی متقاضی ہے کہ مزدوروں کے ساتھ تعلقات پر از سر نو غور کیا جائے۔ محنت سے متعلق پالیسی اقتصادی پالیسی کا جزو لاینفک ہے۔

وزارت محنت کام کے حالات کی ضابطہ بندی، ازالۂ شکایات نیز مزدوروں کے حقوق کے تحفظ اور انھیں سماجی انصاف دلانے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد صنعتی تعلقات کو بہتر بنانا اور صنعتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے موثر اقدامات کرنا ہے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہوسکے۔ اس کے علاوہ کارکنان کو پیشہ ورانہ تربیت دلانے اور روزگار دفاتر کو فروغ دینے کی ذمہ داری بھی وزارت محنت پر ہی ہے۔

مشترکہ کم از کم پروگرام

متحدہ محاذ سرکار کے مشترکہ کم از کم پروگرام میں جن باتوں پر زور دیا گیا ان میں سے کچھ اہم باتیں یہ ہیں:۔ تمام پیشوں اور صنعتوں میں بچہ مزدوری ختم کی جائے، زرعی مزدوروں کو مناسب اجرت دلانے اور کام کے مناسب حالات پیدا کرنے کے لیے قانون بنایا جائے، پبلک سیکٹر اداروں کے مینجمنٹ میں کارکنان کو بھی شامل کیا جائے، پبلک سیکٹر کے اداروں کے تخفیف میں آئے ہوئے ملازمین کو از سر نو تربیت دے کر متبادل روزگار دلایا جائے، لیبر قوانین کو موثر انداز میں نافذ کیا جائے، خفیہ ووٹ کے ذریعے مزدور یونینوں کو تسلیم کیا جائے، غیر منظم شعبے کے مزدوروں کے لیے بنائے گئے قوانین کو

مستحکم بنایا جائے اور خود روزگار کو بڑھاوا دینے کی غرض سے بے روزگاروں کے لیے تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیت کی اسکیمیں شروع کی جائیں۔

بچہ مزدوری ختم کرنے کے اقدامات

ہندوستان میں محنت مزدوری کرنے والے بچوں کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے ۲۰ لاکھ بچے خطرناک پیشوں میں کام کرتے ہیں۔ بچہ مزدوری (ممانعت اور ضابطہ بندی) قانون، ۱۹۸۶ء میں بچوں کو خطرناک پیشوں میں کام پر لگانے کی ممانعت کی گئی ہے نیز دوسرے پیشوں اور اداروں میں ان کی ملازمت کے لیے ضوابط مقرر کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ۲۰۰۲ء تک خطرناک پیشوں میں بچہ مزدوری کے خاتمے کے لیے ایک بڑا قومی پروگرام شروع کیا جا چکا ہے۔

تمام کام دھندوں اور پیشوں میں بچہ مزدوری کو ختم کرنے کی ضرورت کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ بچہ مزدوری کے خاتمے کی راہ میں حائل دو بڑی مشکلات ہیں۔ اس مسئلے کی وسعت اور پیچیدگی نیز وافر وسائل کی عدم دستیابی۔ سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں ہدایت کی ہے کہ بچوں کے لیے لازمی اور مفت تعلیم کا اہتمام کیا جانا چاہیے، تمام خطرناک پیشوں میں بچہ مزدوری کی ممانعت کی جانی چاہیے، موجودہ قوانین کو زیادہ سختی کے ساتھ نافذ کیا جا رہا ہے۔

- - - - - - - - -

- - - - - - - - -

اس فیصلے کے بعد مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے۔ بچہ مزدوری ختم کرنے کے پروگرام بنانے اور زیر عمل لانے کے لیے سپریم کورٹ کی ہدایات کو رہنما خطوط بنایا جائے گا۔ غیر منظم سیکٹر میں زرعی مزدوروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں زرعی مزدوروں کے مسائل مقامی حالات کے مطابق مختلف اور متنوع ہیں۔ زرعی مزدوروں کے لیے ایک مرکزی قانون بنانے کے معاملے پر بالتفصیل غور کیا گیا ہے۔

متحدہ محاذ حکومت نے زرعی مزدوروں کے لیے تحفظ، سماجی انصاف اور مناسب اجرتیں - - - ہٹانے کے ایک مسودہ قانون لانے کا عزم کیا ہوا ہے۔ یہ مسودہ قانون بنانے کے سلسلے میں کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ یہ بل پارلیمنٹ کے آئندہ بجٹ اجلاس میں پیش کیا جا سکے گا۔

مزدوروں کی شمولیت

مینجمنٹ میں مزدوروں کی شمولیت سے متعلق بل ۱۹۹۰ء میں تیار کر کے اسی سال راجیہ سبھا میں پیش کیا گیا تھا مگر اس کی دفعات میں ترمیم کے لیے بہت سے نوٹس پیش کیے جا چکے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی کارروائی کے بعد پارلیمنٹری اسٹینڈنگ کمیٹی نے تجویز کیا کہ ملک کے بدلتے ہوئے سماجی و اقتصادی تناظر کے سیاق و سباق میں حکومت ضروری ترمیمات شامل کرنے کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بل پر دوبارہ غور کر سکتی ہے۔ لہٰذا تمام مرکزی وزارتوں اور پبلک سیکٹر کے اداروں کی آرا طلب کی گئیں اور اب یہ آرا جمع بھی کی جا چکی ہیں۔ اب وزارت محنت رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کی اسٹینڈنگ کمیٹی سے رجوع کرے گی۔

قومی تجدیدی فنڈ

نئی اقتصادی پالیسیوں پر عمل آوری سے متاثر ہونے والے مزدوروں کی بہبود کے اقدامات کرنے کی پالیسی کو عمل میں لانے کی سمت میں حکومت کا ایک بڑا قدم قومی تجدیدی فنڈ کا قیام تھا۔ اس فنڈ کا اہم مقصد پبلک سیکٹر میں معقولیت لائے جانے کی وجہ سے تخفیف میں آئے ہوئے ملازمین کی دوبارہ تربیت اور دوبارہ تعیناتی کا اہتمام کرنا تھا۔ اس وقت تک ۹۸۳۱۹ کارکن رضاکارانہ طور پر ریٹائر ہونے کی اسکیم کا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ ان میں سے ۱۶۴۴۲ مزدوروں کو دوبارہ تربیت دی گئی ہے اور ۲۹۰۰ مزدوروں کو پھر سے کام پر لگایا گیا۔ وزارت محنت کے ڈائرکٹوریٹ آف ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ نے بھی تخفیف میں آئے ہوئے ملازمین کو دوبارہ تربیت دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

مزدوروں کو بہتر فائدے دلانے کی کوشش

محنت ایک ایسا موضوع ہے جو مرکز اور ریاستوں دونوں کی فہرست میں شامل ہے۔ اس لیے مزدوروں کے لیے قانون بنانے اور عمل میں لانے کی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی حکومتوں، دونوں کی ہے۔ وزارت محنت نے صنعتی تعلقات کی مرکزی مشینری سے مزدوروں کے لیے بہتر نتائج اور بہتر فائدے حاصل کرنے کے لیے اپنے معائنوں کے پروگرام میں تیزی لانے کو کہا ہے۔

اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ ملک میں مزدور یونینوں کی بہتات ہے، مزدور یونینوں کی شناخت کے طریقے اور اصولوں کے معاملے پر سرکاری ملازمین اور ورکروں کی تنظیمیں کچھ عرصے سے غور کرتی رہی ہیں۔ مشترکہ کم از کم پروگرام میں کہا گیا ہے کہ مزدور یونینوں کو خفیہ ووٹ کے ذریعے تسلیم کیا جائے۔ یہ معاملہ اسٹینڈنگ لیبر کمیٹی اور ہندوستانی لیبر کانفرنس میں زیر بحث آیا۔ ہندوستانی لیبر کانفرنس کی میٹنگ میں طے پایا کہ یہ معاملہ مزدور یونینوں اور آجرین کی تنظیموں کے نمائندوں پر مشتمل ایک دو فریقی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ غور و خوض کے بعد اپنی تجاویز پیش کرے۔ وزارت محنت نے یہ کمیٹی تشکیل دے دی ہے جو اس معاملے پر غور کر رہی ہے۔

تعمیراتی مزدوروں کے لیے سماجی تحفظ

ملک میں اندازاً ۸۵ لاکھ تعمیراتی مزدور ہیں اور یہ مزدور زیادہ تر غیر منظم ہیں۔ اس صنعت کی نوعیت یہ ہے کہ مزدور غیر مستقل ہوتے ہیں اس لیے وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ آجرین اور مزدوروں کے درمیان عارضی رشتہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کو مقابلتاً زیادہ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ بنیادی سہولیات انھیں دستیاب نہیں ہوتیں یا کم ہوتی ہیں۔ کام کے حالات میں سلامتی کا دھیان نہیں رکھا جاتا۔ تعمیراتی مزدوروں کے حالات کو بہتر بنانے کے

باقی صفحہ ۱۳ پر

عادل صدیقی

آزاد ہندوستان میں صنعتی ترقی: ایک جائزہ

ہندوستان میں آزادی کے بعد صنعتی ترقی پر خصوصی زور دیا گیا۔ صنعتی سیکٹر کی ترقی اور فروغ کے لیے سرکار کی پالیسیوں میں تال میل بٹھانے کے واسطے وزارت صنعت کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ اس وزارت سے متعلق چند اہم شعبہ جات یہ ہیں:۔

(۱) صنعتی پالیسی اور صنعتی فروغ کا محکمہ
(۲) صنعتی ترقی کا محکمہ
(۳) چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور زرعی خام مال پر مبنی دیہی صنعتوں کا محکمہ
(۴) سرکاری صنعتی اداروں کا محکمہ
(۵) بھاری صنعتوں کا محکمہ

صنعتی پالیسی اور صنعتی فروغ کا محکمہ

یہ محکمہ صنعتی پالیسی کے نظم ونسق اور اس کی تشکیل کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ محکمہ چند مخصوص صنعتوں کے فروغ کے لیے بھی ذمہ دار ہے۔ صنعتی پیداوار میں رجحانات کا جائزہ اور بنیادی سہولتوں کے فروغ کے ذریعے صنعتی ترقی کا عمل اسی کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہ پسماندہ خطوں میں صنعتی ترقی کے لیے کوششیں کرتا ہے اور صنعتوں کو جدید لائنوں پر آراستہ کرنے اور تکنالوجی کا معیار بڑھانے اور تیار مال کو بین اقوامی معیار سے اور معیارات پر لانے کے لیے سعی جدوجہد کرتا ہے۔

جولائی ۱۹۹۱ء میں اس محکمے نے صنعتی پالیسیوں میں کچھ بڑی تبدیلیوں کا آغاز کیا تاکہ صنعتی ترقی کا عمل تیز رفتار ہو سکے اور تیار مال بین اقوامی سطح پر تیار مال کے مقابلے پر رکھا جا سکے۔ یہ کام صنعتی پیداوار کو بہتر بنا کر اور اسے معیاری بنا کر انجام دینے کی کوشش کی گئی۔ صنعتوں کو لائسنسوں کے اجرا کے عمل سے آزاد کر دیا گیا۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کو براہ راست آنے کے لیے مواقع فراہم کیے گئے اور اس سلسلے کے قواعد وضوابط کو بہت آسان بنا دیا گیا۔ تجارت سے متعلق اصلاحات کا عمل شروع کیا گیا اس کے لیے مقدار کی بالائی حد کی پابندی ہٹا لی گئی اور محصولات میں بڑی حد تک کمی کر دی گئی، نئی صنعتی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ صنعت کار تجارتی پیمانوں کو سامنے رکھ کر سرمایہ کاری کے سلسلے میں خود فیصلے کر سکیں ایسی صنعتوں کو خصوصیت سے بڑھاوا دیا گیا جن کے تحت تیار کردہ مال باہر ملکوں میں بھیجا جا سکتا ہے اور ان کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکے۔

ہندوستان میں صنعتی پالیسی کی تبدیلیوں سے صنعتی حلقوں نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی نئی پالیسی نے ایک ایسا صنعتی ماحول پیدا کر دیا جس سے نجی سرمایہ کاری کو بڑھاوا ملے۔ اشیاء کی قیمتوں کے استحکام سے صنعت کاروں میں اعتماد بحال ہو سکا۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں صنعتی ترقی کی اوسط شرح اعتبار ریہ ۶ فی صد تھی، جو بڑھ کر ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۲٫۳ فی صد اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۰٫۶ فی صد ہو گئی۔ صنعتی پیداوار میں ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۸٫۶ فی صد اضافہ ہوا۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں صنعتی شعبوں میں ان اشیاء کی تیاری بڑھانے پر زور رہا جو عام استعمال کی اور روزمرہ کام آنے والی اشیاء کے زمرہ میں آتی ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں بھاری سامان اور بھاری مشینوں کی تیاری پر زیادہ زور رہا اور اس عرصے میں سامان کی تیاری میں ۲۵ فی صد اضافہ ہوا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء کے پہلے پانچ ماہ میں مشینوں اور بھاری سامان کی تیاری ۱۱٫۶ فی صد تک بڑھی۔ صنعتی ترقی کے لیے ڈھانچے کو وسیع البنیاد اور متنوع بنایا گیا۔ بنیادی صنعتی ڈھانچے کے فروغ میں خصوصی کام ہوا جس سے صنعتی شعبوں کی ترقی کا مستقبل روشن تر نظر آتا ہے۔ انفرا سٹرکچر صنعتوں میں یعنی ایسی صنعتوں میں جن کی بنیاد پر بہ حیثیت مجموعی صنعتی ترقی کی رفتار کا انحصار ہے، درج ذیل صنعتیں شامل ہیں:۔

بجلی، کوئلہ، فولاد، پٹرولیم کی مصنوعات، خام پٹرولیم اور سیمنٹ۔ ان شعبوں میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۷٫۸ فی صد ترقی دیکھنے کو ملی۔

اس رفتار ترقی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نئی صنعتی پالیسی کے تئیں مثبت رد عمل ہے اور صنعت کاروں میں یہ مقبول ہے۔ پالیسی کے نفاذ کے بعد سرمایہ کاری کے سلسلے کی کل ۲۵ ہزار سے زیادہ درخواستوں کی بنیاد پر دسمبر ۱۹۹۴ء تک ۵۲۰۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی جانی تھی ان میں سے ایک تہائی صنعتی ادارے پسماندہ علاقوں کے لیے ہیں جن میں کل سرمایہ کاری کا ۴۰ فی صد حصہ لگایا جانا تھا۔ سال ۱۹۹۵ء کے دوران سرمایہ کاری کی درخواستوں میں خصوصی اضافہ دیکھنے کو ملا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرمایہ کاری کے سلسلے میں نئی صنعتی پالیسی بے حد موثر ہے۔

ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ان درخواستوں میں تقریباً ۲۵ فی صد درخواستوں کے تحت سرمایہ کاری عمل میں آچکی ہے۔ مزید ۲۰ فی صد سرمایہ کاری کے اجازت نامے زیر غور ہیں، امید ہے کہ ان پروجیکٹوں

انچارج پبلسٹی دارالعلوم دیوبند۔ یوپی

پر عمل درآمد سے ۱۵ لاکھ افراد کو روزگار مل سکے گا، نئی اقتصادی پالیسی کے آغاز کے بعد سے مینوفیکچرنگ کے شعبے میں مزید ۲۰ فی صد لوگوں کی کھپت ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ دیگر معاون شعبوں کے ذریعے بالواسطہ طور پر بھی لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔

نئی صنعتی پالیسی اور دیگر اقتصادی اصلاحات نے غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے راستہ ہموار کر دیا ہے۔ غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری کی درخواستوں کو جس تعداد میں وصول اور منظور کیا جا رہا ہے اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ نئی اصلاحات بے حد مقبول ہیں، ۱۹۹۱ء میں ۵۳۰ کروڑ روپے کے بقدر براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری کی درخواستوں کو منظور کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں یہ سرمایہ کاری بڑھ کر ۳۸۹۰ کروڑ روپے اور ۱۹۹۳ء میں ۸۸۶۰ کروڑ روپے، ۱۹۹۴ء میں ۸۹۶۰ کروڑ روپے اور ۱۹۹۵ء میں نومبر تک ۲۷ ہزار کروڑ روپے سے زیادہ کی غیر ملکی سرمایہ کاری کو منظوری دی جا چکی تھی۔ غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری کا ۸۰ فی صد حصہ ترجیحی زمروں کی صنعت کاری کے لیے ہے مثلاً بجلی، تیل صاف کرنے والے کارخانے، الیکٹرانک اور بجلی کا سامان، کیمیاوی اجزا، خوراکی اشیا کی ڈبہ بندی، ٹیلی مواصلات وغیرہ۔

بنیادی صنعتی ڈھانچے کے فروغ کے لیے آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں ترقیاتی مراکز کے قیام کی ایک اسکیم شروع کرنے کا پروگرام بنایا گیا جو مرکز کے زیر اہتمام ہے۔ اس کی رو سے ۷۰ مراکز قائم ہوں گے۔ اب تک ۴۱ مراکز کے قیام کی منظوری دی جا چکی ہے۔ ہر ترقیاتی مرکز پر ۳۰ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ اس کے لیے مرکزی امداد، ریاستی سرکار کی امداد، مالی اداروں کی امداد اور منڈی سے قرضوں کی فراہمی وغیرہ کے لیے اقدامات کیے گئے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں مرکز نے ۴۸ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے دیے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں مرکز نے ۱۲ کروڑ ۹۴ لاکھ روپے کی امداد دی۔

مرکزی سرکار نے ٹرانسپورٹ سبسڈی اسکیم کو مزید ۵ سال کے لیے توسیع دے دی ہے۔ پہاڑی علاقوں، دور دراز اور دیگر ناقابل رسائی علاقوں تک پہنچنے کے لیے اس اسکیم سے خاصا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

ملک میں چمڑے کی صنعت کے فروغ کے لیے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت ایک پروگرام شروع کیا گیا ہے، اس کے لیے ڈیڑھ کروڑ امریکی ڈالر کی امداد ملی ہے، اس کے ذریعے سے ملک میں چمڑے کی صنعت کو مربوط ڈھنگ سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعے معاون صنعتوں کا فروغ بھی مقصود ہے اور چمڑے کی صنعت میں تحقیق و ترقی کے امور کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کامگاروں اور کفش دوزوں کی تکنیکی صلاحیت کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

صنعتی ترقی کا محکمہ

یہ محکمہ غیر ملکوں کے صنعتی نظاموں کا مطالعہ کرتا ہے۔ قومی تجدیدی فنڈ پر عمل درآمد کی ذمہ داری بھی اس کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ پیٹنٹوں اور ٹریڈ مارک قوانین پر عمل درآمد پر نظر رکھنا، کوالٹی کنٹرول اور انڈین بائلرز اور آتش گیر مادوں سے متعلق ایکٹ پر عمل درآمد اسی محکمے کے دائرہ کار میں آتا ہے، سرکار کی کوشش یہ رہی ہے کہ صنعتی ڈھانچہ کے عمل کو آسان بنا دیا جائے جس سے کہ پیداواری اثاثہ جات کا موثر ڈھنگ سے استعمال ہو سکے۔ ہندوستان میں پیٹنٹ انفارمیشن سروس کو جدید بنانے کے لیے سرکار نے ناگپور میں ایک پروجیکٹ شروع کیا ہے۔ یہ کام جنوری ۱۹۹۲ء میں اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت شروع کیا گیا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں کارکنوں کے سماجی تحفظ کے لیے قومی تجدیدی فنڈ کے نام سے ایک اسکیم شروع کی گئی۔

ٹریڈ مارک رجسٹری کے طریق کار کو جدید بنانے کے لیے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت ایک پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ پروجیکٹ مئی ۱۹۹۷ء میں مکمل کر لیا جائے گا۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور زرعی خام مال پر مبنی دیہی صنعتوں کا محکمہ

یہ محکمہ جنوری ۱۹۹۰ء میں قائم ہوا۔ اس کے تحت دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو آگے بڑھایا جاتا ہے تاکہ دیہی عوام کو نفع بخش روزگار مل سکے اور خطہ وار ترقی میں توازن قائم ہو سکے۔

سال رواں میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور کھادی اور گرام ادیوگ کو خاص طور پر ترقی ملی۔ چھوٹے پیمانے کے صنعتی اداروں کی تعداد ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۲۳ لاکھ ۴۸ ہزار تھی، جو بڑھ کر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۵ لاکھ ۷۰ ہزار ہو گئی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے شعبوں میں پیداواری مالیت بڑھ کر ۱۹۹۴۲۷ کروڑ روپے ہو گئی جب کہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں یہ ۱۸۰۹۵۶ کروڑ روپے تھی۔ اس شعبہ میں ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۲۵٫۳۰ لاکھ افراد کام کر رہے تھے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۱۴۶٫۵۶ لاکھ ہو گئی۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں اس شعبے کی برآمدات کی مالیت ۱۷۷۸۵ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۸۰۰۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ اس سلسلے کے قواعد و ضوابط کو سہل بنانے پر خصوصی زور دیا گیا۔

نائک کمیٹی نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو قرضوں کی فراہمی کے لیے بہت سی سفارشیں کیں۔ ریزرو بینک آف انڈیا نے ان بہت سی سفارشات پر اہم فیصلے کیے اور اس شعبے میں قرضوں کی فراہمی کو آسان بنایا۔

سرکار نے وزیر اعظم کی قیادت میں اعلا اختیارات کی ایک کمیٹی بنائی تاکہ کھادی اور گرام ادیوگ کی کارگزاری کو بہتر بنایا جا سکے۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں وزیر اعظم کی روزگار یوجنا شروع کی گئی تاکہ بے روزگار نوجوانوں کو کام پر لگایا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت صنعت، خدمات اور کاروبار کے لیے قرضے فراہم کیے گئے۔ کیرالہ، تمل ناڈو، کرناٹک، آندھرا پردیش، اڑیسہ اور چند دیگر ریاستوں میں مہیلاؤں یعنی خواتین کے لیے ناریل کے ریشے سے اشیا تیار کرنے کی اسکیم شروع کی جا چکی ہے۔

سرکاری صنعتی اداروں کا محکمہ

یہ محکمہ سرکاری صنعتی اداروں کے فروغ سے متعلق پالیسی کو ترتیب و تشکیل دیتا ہے اور اس سلسلے کے رہبر خطوط وضع کرتا ہے۔ پبلک سیکٹر کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینے اور فیصلے کرنے کے اختیارات دیے گئے اور ان کو انھیں کارگزاری

باقی صفحہ ۳۱ پر

پروفیسر حاجی شمس الدین

دور متوسط کا نظام تعلیم

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ قدیم ہندوستان علم کا گہوارہ اور تہذیب و تمدن کا نمونہ بنا ہوا تھا اشوک سے لے کر بکرما جیت تک تعلیم سرزمین ہند پر عزت کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی اور صحیح طریقوں پر دی جاتی تھی حقیقت تو یہ ہے کہ کرۂ ارض پر علم کے آفتاب کی پہلی کرن ہندوستان میں پھوٹی اور بعد ازاں آہستہ آہستہ سارا زمانہ اس سے منور ہو اٹھا۔

وقت نے پھر پلٹا کھایا اور عہد وسطیٰ میں ہندوستان پھر ایک بار تعلیمی سطح پر تنزل کی طرف مائل ہو گیا۔ سیکڑوں سال وہ غیر ملکی اقتدار کے زیر اثر ظالموں کی خود غرضانہ سیاست کا شکار بنا رہا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ سماجی، اقتصادی، علمی اور سیاسی میدانوں میں لوگ غلامی کی گہری نیند میں ڈوب گئے۔ مگر وقت نے پھر کروٹ بدلی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ حالاں کہ مسلمان ہندوستان میں حملہ آوروں کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے مگر انھوں نے تعلیم کے گل کردہ چراغ کو دوبارہ روشن کیا اور اپنی عقل و فہم کے مطابق پھر سے یہ سلسلہ شروع کیا۔

محمد غوری کا دور بہت ہی مختصر رہا۔ اس کے بعد خاندان غلامان کی حکومت شروع ہوئی۔ اسی عہد میں بلبن کو تعلیم سے از حد شوق تھا۔ اس کا ذاتی کتب خانہ بہت ہی وسیع تھا، جس میں ہر شعبہ کی بہترین کتب موجود تھیں۔ اس کا دربار اہل علم کے لیے ایک دلکش مرکز تھا۔ اس زمانہ کی بے نظیر ہستی امیر خسرو ہیں۔ ان کو فارسی و عربی کے علاوہ ہندوستان کی مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ بلبن کے قدم جمنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر ملک میں سیاسی تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے اس طرح حکومتیں اور خاندان بھی بدلتے رہے — جلال الدین نے علم دوست شخصیتوں پر نگاہ کرم ڈالی۔

جب علاؤالدین خلجی کی حکومت قائم ہوئی، صنعت و حرفت کی ترقی ہونے لگی۔ اسی نے قابل اور تعلیم یافتہ شخصیتوں کی ہمت افزائی کی اور ذات پات کے جھگڑوں کو نیست و نابود کر دیا اور پھر ہندوستانی اور فارسی علم و ہنر تہذیب و اخلاق مل کر دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔

چودھویں صدی کے اختتام پر ہندوستان میں علم و ادب کی زمین فیروز تغلق کے دور میں زرخیز ہونے لگی۔ اسے انصاف پسند حکمراں کہا جاتا ہے۔ اسی عہد میں دہلی تعلیم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس نے دہلی سے قریب "فیروز آباد" نامی ایک شہر بسایا تھا۔ وہ ۱۸ ہزار "غلام زادے" رکھتا تھا جو سدا ہنر اور دستکاری کے کام میں مشغول رہتے تھے اور قرآن کریم کو خوبصورتی سے نقل کرنے کی تربیت دیتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے ۳۰ کالج قائم کیے۔ ان کے اخراجات کے لیے جاگیریں بھی دیں۔ انھوں نے تین دیوان خاص تعمیر کرائے تھے جہاں وہ قابل ملاؤں، پنڈتوں اور نجومیوں کو مدعو کرتے تھے اور بحث و مباحثہ کرتے تھے۔

پھر مغل آئے اور مستقل طور پر ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے۔ ان کے عہد میں قدیم ہندوستان کے ہنر، صنعت و حرفت، شاعری، فلسفہ، علم نجوم اور علم سیاست کو دوبارہ زندگی حاصل ہوئی اور یہ علوم ان کی سرپرستی میں فروغ پانے لگے۔ بابر کا دور حکومت تو بہت مختصر تھا۔ وہ ایک قابل اور علم دوست ادیب تھا۔ اسے عربی، فارسی اور ترکی پر عبور حاصل تھا۔ اس نے تحریر میں ایک نئی روش پیدا کی جو کہ اس کے نام ہی سے مشہور ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے حالات خود قلم بند کیے تھے۔ حالاں کہ اسے تعلیم و ہنر کا از حد شوق تھا لیکن عہد حکومت مختصر ہونے کے باعث کوئی خاص علمی کام نہیں کر سکا۔

ہمایوں کے عہد میں رسم مکتب کی ادائیگی ہوئی۔ اس رسم کو اس وقت دہرایا گیا جب اکبر چار سال چار ماہ چار دن کا تھا۔ ہمایوں کو علم نجوم اور علم جغرافیہ کا از حد شوق تھا۔ اس نے گلوب (GLOBF) کا استعمال بھی کیا تھا۔ ہمایوں نے دیوان خانے بھی تعمیر کرائے تھے مشہور مورخ فرشتہ نے ان کی تعداد سات بتائی ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ ہمایوں کو مطالعہ کا از حد شوق تھا۔ اسی نے دہلی کے پرانے قلعہ کو اپنا کتب خانہ بنایا تھا۔ اس نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ اسے ادب سے لگاؤ رکھنے والوں سے بڑی انسیت تھی۔ اس نے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا، اہل سعادت، اہل دولت اور اہل مراد۔

۸۱۵/۷۔ نیج ناتھ پارہ، رائے پور ۴۹۲۰۰۱۔ ایم۔پی

بدقسمتی سے اس کا دور حکومت بہت ہی مختصر رہا اور یہی وجہ تھی کہ وہ تعلیم کے سلسلہ میں کوئی خاص کام نہ کر سکا۔ اس کی تمام کوشش کے باوجود کوئی خاص ترقی نہ ہو سکی۔

اس کے شہزادے اکبر نے فلاح و بہبود کا کام فراخ دلی سے اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ علم دوست انسان تھا۔ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ بے علم تھا۔ وہ صحیح معنوں میں عالم تھا یا نہیں اس پر بحث کی چنداں ضرورت نہیں لیکن یہ تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اسے مختلف شعبوں میں اعلا قسم کی شخصیتوں کی صحبت حاصل تھی۔ اس نے کئی قابل ہستیوں کو صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ وہ اسے اعلا قسم کی کتابیں پڑھ کر سنا سکیں۔ ابوالفضل نے اس کی سوانح حیات "آئینہ اکبری" میں ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ سائنس اور تاریخ کی شاید ہی کوئی تصنیف تھی جسے شہنشاہ کو پڑھ کر نہ سنایا گیا ہو۔

اکبر کے دور حکومت میں سب کے حقوق مساوی تھے۔ قوم و فرقہ کا کوئی سوال نہ تھا۔ مسلمان فارسی کے ذریعہ علم حاصل کرتے تھے اور ہندو سنسکرت کے ذریعہ۔ اس نے ہندوؤں کی بھی ہمت افزائی کی کہ وہ بھی مدرسوں میں علم حاصل کریں۔ ٹوڈرمل تمام حساب فارسی میں رکھتا تھا۔ ملک کی لگان وصول کرنے والے ہندو افسر بھی فارسی اچھی طرح جانتے تھے۔ "آئینہ اکبری" علم کے متعلق اکبر کے خیالات کا آئینہ ہے۔ اس نے صحیح کہا تھا کہ انسانیت کی قابلیت کا جوہر اس کی عقل ہے۔

اس کے عہد حکومت میں علم ریاضی جیومیٹری علم فلسفہ، علم تصوف اور تاریخ وغیرہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں "نیائے" "ویاکرن" اور "ویدانت" وغیرہ پر بھی اسی طرح توجہ دی جاتی تھی۔ ابوالفضل اور فیضی سنسکرت کے ماہر تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں بھی اسی عہد کے ہیں جن کی یادگار آج بھی حکومت ہند مناتی ہے۔

اکبر کے جانشینوں کو تعلیم سے اس قدر ذوق نہیں تھا جتنا کہ اکبر کو تھا۔ جہانگیر ایک قابل قدر جانشین ضرور تھا لیکن اسے مصوری کا شوق تھا پھر بھی وہ مدرسوں کا خیال ضرور رکھتا تھا۔ اس کا فرمان تھا کہ لاولد امرا یا مسافروں کی موت پر ان کی دولت سرکاری خزانہ میں جمع کی جائے اور اسے مدرسوں کی مرمت میں استعمال کیا جائے۔ ۱۶۲۳ء میں اس نے جبلپور میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔

شاہ جہاں نے بھی مصوری اور ہنر کی ترقی میں حصّہ لیا۔ دارا کو علم فلسفہ کا شوق تھا۔ اس نے خود اپنشد اور بھاگوت گیتا کا ترجمہ کیا حالاں کہ وہ کبھی حکمراں نہ ہو سکا لیکن اس نے علم کے لیے ضرورت سے زیادہ سعی کی۔

اورنگ زیب نے تعلیم کی ہمت افزائی کی۔ اصل میں اسے گجرات کے بوہروں سے کافی ہمدردی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ وہاں کے بوہرے علم کا شوق نہیں رکھتے تو اس نے ان کے لیے تعلیم لازمی کر دی اور اس کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک افسر مقرر کیا گیا جو کہ ہر ہفتہ شہنشاہ کو اطلاع دیا کرتا تھا۔ بوہروں پر صرف یہ لازم تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے مدرسے بھیجیں بلکہ انھیں تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اس نے طلبا، مدرسین اور علم داں انسانوں کے لیے وظیفے بھی مقرر کیے تھے۔

عام طور پر تعلیم کا رواج نہ تھا۔ قصبوں میں رہنے والے انسان تعلیم سے محروم ہی رہے۔ کمسنی میں شادی اور پردہ کے رواج کے باعث مستورات کی تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی جا سکی۔ لیکن پھر بھی بہت سی مغل شہزادیاں تعلیم یافتہ تھیں۔ حکمراں اپنے بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مثلاً اکبر نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے مختلف مضامین میں مختلف مدرسین مقرر کیے تھے۔ جہانگیر اور شاہ جہاں نے بھی اپنے بچوں کو بہترین تعلیم دلانے کی کوشش کی۔

بالآخر علم کے سلسلے میں جو کچھ بھی ترقی ہوئی تھی اسے نادر شاہ کے حملے نے نیست و نابود کر دیا۔ ہندوستان کے دور متوسط کے حکمرانوں کے عہد میں تعلیم کی ترقی اور فروغ نہ صرف مورخوں بلکہ ماہرین تعلیم کے لیے بھی ہمیشہ دلچسپی کا موضوع بنا رہا ہے۔

●

بقیہ: اندرا گاندھی۔ ایک عظیم رہنما

ہی ایک ایسی شخصیت کا نقش ذہن میں ابھرتا ہے کہ جو سیاسی بصیرت اور دانشورانہ قیادت سے پُر نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے انھیں آفاقی شہرت، عزت، مقبولیت اور عظمت ملی اور آج بھی دنیا کے بلند اور عظیم ترین رہنماؤں میں ان کو یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری خوبیوں کے ساتھ اندرا گاندھی دور رس نگاہ بھی رکھتی تھیں، وقت کی پابندی، مصمم ارادہ ان کے اصولوں میں شامل تھا۔ وہ نڈر اور بہادر تھیں۔ کسی بھی چیلنج کو بغیر آنکھ جھپکائے قبول کر لیتی تھیں۔ اندرا گاندھی کی پالیسی تمام ملکوں سے دوستی رکھنے کی تھی لیکن ہندوستان کے وقار سے سمجھوتہ کر کے نہیں بلکہ اس کی بھلائی کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں۔

مسز اندرا گاندھی کے نزدیک زندگی ایک جہد مسلسل کا نام تھا۔ ملکی حالات کے علاوہ اندرا گاندھی کو ذاتی بھی کئی صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے کئی عزیزوں نے انھیں داغ مفارقت دیا۔ یہ ایسے اندوہناک حادثات تھے جس سے دل و دماغ کا متاثر ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے اور قدم لڑکھڑا جاتے ہیں مگر اندرا گاندھی نے ۱۹۳۶ء میں ماں کے انتقال پر صبر کا دامن تھاما تو ۱۹۶۲ء میں فیروز گاندھی کی موت کے غم کے پہاڑ کو برداشت کیا۔ ۱۹۶۴ء میں شفیق باپ جواہر لال نہرو کی موت کے غم کو برداشت کیا۔ ۱۹۸۰ء میں جواں سال بیٹا ان سے جدا ہو گیا مگر ان کے قدم متزلزل نہ ہوئے۔ اندرا گاندھی زندگی کو بچانے کی نہیں، فولاد کی طرح ٹکرانے کی قائل تھیں۔ اسی نظریے کے تحت وہ ہمیشہ ملک کی بہتری کے لیے کام کرتی رہیں اور اس پر عمل کرتے ہوئے ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اپنے خون کے ایک ایک قطرے کو ملک پر نچھاور کر دیا۔ ان کی قربانی اور ملک پر دیگر احسانات کو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا اور رہتی چاند سورج تک انھیں عظیم ملک کی وزیر اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا رہے گا۔

●

ڈاکٹر عبدالرشید صدیقی

اقلیتی تعلیمی ادارے: آئینی حقوق و ذمہ داریاں

ہمارا ملک ہندوستان مختلف مذاہب، قوموں، تہذیبوں اور زبانوں کا خوب صورت گلدستہ ہے۔ اس کی یہی مختلف النوعی اور رنگا رنگی اسے یک جہتی اور سالمیت بخشتی ہے۔ گوناگونی میں یک جہتی اس کی صدیوں کی حاصل کردہ امانت ہے۔ اس قومی یک جہتی اور سالمیت کو برقرار رکھنے اور اسے مزید تقویت بخشنے کی غرض سے ہی آزاد ہندوستان کے آئین کے معماروں نے آئین کے مسودے میں اقلیتی فرقوں کو خصوصی حیثیت و مراعات کا اہتمام کیا ہے تاکہ مذہبی اور لسانی اقلیتیں اپنے مذہب اور زبان کی بہتر حفاظت کر سکیں۔ ہندوستانی آئین نہ صرف ذاتی کوششوں کی ضمانت دیتا ہے بلکہ اس سمت میں کی گئی اجتماعی کوششوں کو بھی تحفظ بخشتا ہے۔ تعلیمی ادارے وہ ذرائع ہیں جن سے ان اجتماعی کوششوں کو مزید تقویت ملتی ہے۔ ایک اقلیتی فرقہ اپنی زبان، تہذیب اور رسم الخط کی حفاظت تعلیمی اداروں کے ذریعے بہتر اور موثر طریقے سے کر سکتا ہے۔ اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنا اور ان کا نظم و نسق چلانے کا حق ایک اہم جزو ہے جس کی عدم موجودگی میں اقلیتیں اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت نہیں کر سکتی ہیں۔ اسی کے مدنظر آئین کی شق ۲۹ اور ۳۰ میں اقلیتوں کے اس حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔

آئین کی شق ۲۹ یہ قرار دیتی ہے کہ

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۲

(۱) ہندوستان کے کسی خطے یا اس کے کسی حصے میں رہنے والے شہریوں کا کوئی طبقہ جو اپنی مختلف زبان، رسم الخط یا تہذیب رکھتا ہے۔ اسے اس کو محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے۔

(۲) کسی بھی شہری کو صرف مذہب، ذات پات، زبان یا ان میں سے کسی بھی ایک بنیاد پر کوئی بھی ایسا تعلیمی ادارہ داخلے سے انکار نہیں کر سکتا ہے جو ریاست کے زیر انتظام ہے یا جسے ریاستی خزانے سے مالی امداد حاصل ہوتی ہے۔

اگرچہ موجودہ آئین کی شق ۲۹ (۱) میں لفظ "اقلیت" کا استعمال نہیں کیا گیا ہے مگر یہ لفظ آئینی اسمبلی کی صلاح کار کمیٹی کے اصل مسودے میں اس طرح موجود تھا "ہر اکائی کی اقلیتوں کی حفاظت ان کی زبان، رسم الخط اور تہذیب کے مدنظر کی جائے گی اور کوئی بھی ایسا قانون یا ضابطہ نافذ نہیں کیا جائے گا جو اس سلسلے میں اقلیتوں کو نقصان پہنچاتا ہو۔" (بی۔ شوراؤ۔ منتخب تنقید ۱۹۵۷ء جلد دوم صفحہ ۲۸۱)۔ مگر جب آئین کی مسودہ ساز کمیٹی نے یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو اس پر نظر ثانی کی تو لفظ "اقلیت" کو تبدیل کرکے "شہریوں کا طبقہ" درج کر دیا اور وجہ یہ بتائی گئی کہ نیت یہ ہے کہ لفظ اقلیت کی جامع تشریح ہو جائے تاکہ مثال کے طور پر بنگال میں مقیم مراٹھیوں کو بھی یہ تحفظ حاصل ہو سکے۔

آئین کی شق ۲۹ کے تحت حاصل حقوق زیادہ سودمند نہ ہوتے اگر انھیں شق ۳۰ کے ذریعے مزید مستحکم نہ کر دیا گیا ہوتا یعنی اقلیتوں کو ان کی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا حق نہ دیا گیا ہوتا۔ شق ۳۰ یہ قرار دیتی ہے کہ:

(۱) سبھی اقلیتیں چاہے وہ مذہب کی بنیاد پر ہوں یا زبان کی، انہیں اپنے پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا حق حاصل ہے۔

(۲) ریاست تعلیمی اداروں کی مالی اعانت میں اس بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کرے گی کہ کوئی تعلیمی ادارہ مذہبی یا لسانی اقلیت کے زیر انتظام ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شق ۳۰ صرف مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے لیے محدود ہے۔ اس کے دروازے شہریوں کے کسی اور طبقے کے لیے کھلے نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ شق صرف زبان، رسم خط اور تہذیب کے تحفظ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ اقلیتوں کو یہ حق بھی فراہم کرتی ہے کہ وہ غیر مذہبی ادارے بھی قائم کر سکتی ہیں اور ان کا نظم و نسق بھی اپنے زیر تسلط رکھ سکتی ہیں۔ غرض اقلیتیں موجودہ دور کی ضرورت کے تحت جدید سائنس، انجینئرنگ اور ٹکنالوجی، کمپیوٹر سائنس، میڈیکل سائنس، معاشیات، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ کی تعلیم دینے والے ادارے اپنے زیر انتظام قائم کر سکتی ہیں اور بہ خوبی چلا سکتی ہیں۔

آئین کی شق نمبر ۳۰ (۱) کے ذریعے ایک اقلیتی فرقے کو دو حقوق حاصل ہیں:

(۱) اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق۔
(۲) اس ادارے کا نظم و نسق چلانے کا حق۔

کسی بھی ادارے کو ریاست تبھی اقلیتی ادارہ

تسلیم کرے گی جب اس ادارے کا قیام کسی اقلیتی طبقے کے ہاتھوں عمل میں آیا ہو۔ ہندوستان کی عدالت عالیہ نے یہ فیصلہ مشہور زمانہ مقدمے عزیز پاشا بنام یونین آف انڈیا ۱۹۶۸ء میں صادر فرمایا تھا۔ اس تاریخی مقدمے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار زیر بحث تھا۔ عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں فرمایا:

> چوں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام مسلم اقلیت کے ذریعے نہ ہو کر ۱۹۲۰ء کے ایک پارلیمانی ایکٹ کے ذریعے عمل میں آیا ہے اس لیے مسلم اقلیت اس کا نظم ونسق چلانے کا دعوا نہیں کر سکتی۔

اس فیصلے کے نتیجے میں مسلم اقلیت میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کے مختلف مقامات پر فساد برپا ہو گئے۔ مسلمانوں کے اس غم وغصہ کا اندازہ کر کے مرکزی حکومت نے پارلیمنٹ میں ایک آئینی بل پیش کیا، جو "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۲ء" کے نام سے مشہور ہے۔ اس ایکٹ کی دفعہ ۵ (۲) (س) میں الفاظ "خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی و ثقافتی ترقی کو فروغ دینے کا مرکز" کو شامل کیا گیا۔ اس طرح اس ترمیمی ایکٹ کے ذریعے اس یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ صاف طور پر تسلیم تو نہیں کیا گیا البتہ ایک طرح سے اس ادارے کو کچھ اقلیتی کردار عطا کیا گیا۔

آئین کی شق نمبر ۳۰ (۱) کے تحت "نظم ونسق چلانے کا حق" کے معنی ہیں کہ ادارے کے انتظام والفرام میں کسی بھی باہری طاقت کی دخل اندازی نہ ہو تا کہ ادارے کے بانی یا اس کے نامزد اشخاص ادارے کو وہ سمت دے سکیں جس سے کہ اس اقلیتی طبقے اور خصوصاً ادارے کا زیادہ سے زیادہ تعلیمی مقصد حاصل ہو سکے۔

نظم ونسق چلانے کا حق، جسے آئین کا تحفظ حاصل ہے اور جس کی بقا کی ضامن ہندوستان کی عدالت عالیہ بھی ہے، کے ذیل میں درج ذیل حقوق شامل ہیں:

(۱) ملازمت میں رکھنے اور اس سے برطرف کرنے کا حق۔

(۲) اقلیتی طبقے کی زبان کے مدنظر ذریعۂ تعلیم نافذ کرنے کا حق۔

(۳) اقلیتی ادارے کے الحاق اور اسے تسلیم کرانے کا حق۔

(۴) طالب علموں کے داخلے کا اختیار۔

ادارے کے نظم ونسق کا مطلب ہے کہ ادارے کا صحیح انتظام والفرام ہو۔ یہ نظم ونسق اشخاص کے ایسے گروپ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے جسے ادارے کے بانی کا یقین حاصل ہو اور ان کو اس حلقۂ عمل میں مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ناظم کو ادارے کے عملے کے انتخاب کا بھی پورا حق حاصل ہو جس میں اساتذہ کے انتخاب کا حق بھی شامل ہے۔ کوئی بھی ایسا ضابطہ یا قانون جو اقلیتی ادارے کے ناظم کے ہاتھوں سے اس کا یہ حق چھین کر دوسرے اشخاص یا ایسی ہی کسی کمیٹی کے ہاتھوں میں دے دے جس پر ادارے کے بانیوں کا کنٹرول نہ ہو تو ایسا ضابطہ یا قانون اقلیتی اداروں پر نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس سے ادارے کی خود مختاری مجروح ہوتی ہے۔[2] اسی طرح اگر کوئی ضابطہ یا قانون ادارے کے ملازمین کے خلاف کی جانے والی کسی تادیبی کارروائی کو کسی باہر کے طاقت کے ہاتھوں میں سونپتا ہے یا زیر نگر بناتا ہے تو یہ ضابطہ یا قانون بھی شق نمبر ۳۰ (۱) کی خلاف ورزی میں ہوگا اور نتیجتاً قانونی طور پر بے اثر ہوگا۔[3]

اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا بندوبست کرنے کے حق میں یہ حق بھی شامل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسی زبان میں تعلیم دینے کی سہولت فراہم کر سکیں جو ان کی تہذیبی وثقافتی زندگی کے قریب تر ہو۔ اگر کوئی ضابطہ یا قانون اقلیتی اداروں سے ان کا یہ حق چھینتا ہے تو وہ قانوناً بے اثر ہوگا اور عدالت اسے کالعدم قرار دے دے گی کیوں کہ یہ ضابطہ یا قانون شق نمبر ۳۰ (۱) کی خلاف ورزی میں ہوگا۔ شق نمبر ۳۰ (۱) کے تحت حاصل حقوق آئین کے نفاذ سے پہلے اور بعد کے قائم کردہ دونوں ہی طرح کے اداروں کو حاصل ہیں۔[4]

ایک تعلیمی ادارہ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوگا اگر اس کی جاری کردہ ڈگریاں اور اسناد ریاست سے تسلیم شدہ نہ ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ادارہ ریاست سے تسلیم شدہ ہو۔ اسی کے مدنظر شق نمبر ۳۰ کے تحت یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ اقلیتی اداروں کو ریاست تسلیم کرے گی اور انھیں منظوری دے گی۔ اگرچہ یہ بنیادی حق نہیں ہے مگر کوئی ادارہ اگر ان ساری شرائط کو پورا کرتا ہے جو اس معیار کے تعلیمی ادارے کے لیے ضروری ہیں تو ریاست کسی عذر لنگ کی بنیاد پر ایسے ادارے کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی ہے۔ تسلیم شدہ ہونے کے لیے کوئی ایسی شرط جو ادارے کی خود مختاری اور ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہے وہ شق نمبر ۳۰ (۱) کی رو سے خلاف آئین ہوگی اور اس لیے قانونی طور پر بے اثر ہوگی۔ اس طرح ریاست کسی ایسے اقلیتی ادارے کو فریب دہ بنیادوں پر تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی ہے۔[5]

اقلیتی تعلیمی اداروں کو شق نمبر ۳۰ (۱) کے تحت یہ سارے حقوق اس لیے دیے گئے ہیں تا کہ یہ اقلیتی ادارے اپنی قوم کے بچوں کی تعلیمی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ بچوں کے والدین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ان کے بچوں کی تعلیم ایسے ماحول میں ہو جو ان کی تہذیبی وثقافتی زندگی سے قریب تر ہو ـــ عدالت عالیہ نے سینٹ اسٹیفن کالج بنام یونین

باقی صفحہ ۲۹ پر

حواشی

1. St. Xavier College Vs State of Gujrat AI[illegible] 1974 S.C. 13[illegible]
2. Lily Kurian Vs St. [illegible] AIR 1[illegible] S.C. 5[illegible]
3. D.A.V. College [illegible] Vs State of Punjab AIR 1971 S.C. 1731
4. [illegible] Board of [illegible] Talimi Mission Vs State of Bihar 1984 S.C. 500

ظہیر عباس

اتر پردیش میں اعلا تعلیم کا فروغ

کسی بھی ملک کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی ترقی میں تعلیم نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایک ترقی یافتہ ملک کے شہریوں کا معیارِ زندگی کافی حد تک وہاں کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے۔

تعلیم نہ صرف انسان کے ذہنی ارتقا میں مددگار ثابت ہوتی ہے بلکہ اس کو جہالت کے تاریکی سے نکال کر ایک باعزت زندگی بسر کرنے کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔

آزادی کے بعد جہاں ملک کے کئی صوبوں نے تعلیم کے میدان میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے وہیں اتر پردیش نے بھی اس سمت خاص کر اعلا تعلیم کے میدان میں بہت تیزی سے آگے قدم بڑھائے ہیں۔ جس وقت ملک آزاد ہوا اس وقت اتر پردیش میں صرف دو مرکزی و تین صوبائی یونیورسٹیاں اور ۱۶ ڈگری کالج تھے جب کہ آج ۳ مرکزی اور ۱۲ صوبائی یونیورسٹیوں کے علاوہ ایک انجینئرنگ، ۳ ایگری کلچر، ۱۴ عام تعلیم کی یونیورسٹیاں اور ۵ ڈیمڈ یونیورسٹیاں بھی ہیں۔ اس وقت اتر پردیش میں ڈگری کالجوں کی تعداد ۵۰۹ تک پہنچ چکی ہے اس میں ۹۰ سرکاری اور ۴۱۹ غیر سرکاری ہیں۔ ان ۵۰۹ ڈگری کالجوں میں سے ۱۰۹ لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔

موجودہ حکومت نے اعلا تعلیم کے فروغ کے لیے میدانی علاقے کے ساتھ ساتھ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے نوجوانوں کی تعلیم کی جانب بھی خاص توجہ دی ہے چناں چہ اس وقت اگر صوبے کے میدانی علاقوں میں سرکاری ڈگری کالجوں کی تعداد ۹۵ ہے تو اتراکھنڈ میں بھی ۳۱ ڈگری کالج تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک ہیں۔ رواں تعلیمی سال کے دوران مزید ۹ نئے سرکاری ڈگری کالج قائم کیے گئے ہیں جہاں درس و تدریس کا کام شروع ہو چکا ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں میں تعمیری کاموں کا وقت سے مکمل نہ ہونا تعلیمی سرگرمیوں کو متاثر کرتا ہے۔ چناں چہ اس جانب بھی حکومت نے خاص توجہ دی ہے اور نامکمل تعمیری کاموں کو بہت تیزی سے مکمل کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی و کالجوں میں طلبا کی بڑھتی تعداد کے پیش نظر الٰہ آباد، لکھنؤ اور گڑھوال یونیورسٹی میں شبینہ درجات کھولے جانے کو بھی منظوری دی گئی ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی کے تحت اتر پردیش سرکار نے مختلف یونیورسٹیوں میں روزگار پر مبنی کورس شروع کرنے کو بھی منظوری دی ہے تاکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوجوانوں کو تلاش معاش کے لیے دفتروں کی خاک نہ چھاننی پڑے اور وہ خود کاروبار لگا کر اپنی اور اپنے متعلقین کی کفالت آسانی سے کر سکیں۔ جن یونیورسٹیوں میں روزگار پر مبنی کورس شروع کیے گئے ہیں ان میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ماسٹر آف لیبر اینڈ پرسونل مینجمنٹ، ماسٹر آف مینجمنٹ اسٹڈیز اور ماسٹر آف فائننشل کنٹرول کا کورس، روہیل کھنڈ یونیورسٹی میں بی ٹیک، بی فارما، ماسٹر آف ٹورزم ایڈمنسٹریشن اور گڑھوال یونیورسٹی میں بی فارما کورس کے لیے منظوری دی جا چکی ہے۔

اعلا تعلیم کو فروغ دینے اور اس کے معیار کو مزید بلند کرنے کے لیے آگرہ، وارانسی اور بریلی منطقوں میں علاقائی دفاتر کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اتراکھنڈ میں واقع سرکاری اور غیر سرکاری ڈگری کالجوں پر موثر نگرانی اور انھیں مزید فعال بنانے کے لیے اتراکھنڈ اور دہرہ دون میں بھی "ہائر ایجوکیشن" دفتر قائم کیا گیا ہے۔

بھارت سرکار کی قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں درج سفارشات اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (یو۔جی۔سی) کی جانب سے جاری راہبر اصولوں کی بنیاد پر اعلا تعلیم کو ریاست گیر وسعت عطا کرنے کے لیے گزشتہ ۲۵ مئی ۱۹۹۵ء کو لکھنؤ میں "اسٹیٹ ہائر ایجوکیشن کونسل" کی تشکیل کی گئی ...اس کونسل کے قیام کا خاص مقصد یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کی ترقی کے لیے مختلف اسکیمیں تیار کرنا، اعلا تعلیم سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کو حکومت کو پیش کرنا، تعلیم کے فروغ کے لیے ذرائع میں اضافہ سے متعلق اپنی رائے دینا۔ طلبا کی فلاح و بہبود اور وظائف کی تقسیم کے عمل پر نگرانی رکھنا اور جنگ آزادی کے شہیدوں کی حیات اور کارناموں پر مبنی تاریخی دستاویزوں کی نشر و اشاعت اور طباعت کرنا۔

اس کے علاوہ حکومت نے اقلیتوں کے

باقی صفحہ ۲۳ پر

۳۸۔ جوہری محلہ چوک۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

احسان خسرو

تحریک آزادی میں:

"تحریک عدم تعاون" کی اہمیت

آزادی کسے عزیز نہیں۔ انسان ہی نہیں، جانور بھی قید و بند کی زندگی پسند نہیں کرتے ۔ آشیانے میں چلچلاتی دھوپ، کڑاکے کی سردی، برسات کے تند جھونکے اور مشقت کی زندگی پسند آتی ہے لیکن طلائی قفس کا عیش و آرام پسند نہیں آتا۔ انسان اگر خستہ حال بھی ہوتا ہے تو آزاد رہ کر جتنا پرسکون اور بشاش ہوتا ہے اتنا پرسکون اور بشاش غلام بن کر نہیں ہو سکتا خواہ کتنی ہی آسانیاں اسے میسر ہوں۔ بالکل سچ ہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
وہ ہے خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

کوئی بھی دور ایسا نہیں گزرا کہ جب انسان آزادی کا متمنی نہیں رہا۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو خواہشِ آزادی کی بدولت وجود میں آئے۔ ان میں ایک قدیم اور بے حد زبردست واقعہ وہ ہے جس نے ۲۰۷۳ سال قبل مسیح سلطنت روم میں غلامی سے نجات پانے کی تحریک پیدا کی۔ اس تحریک کی قیادت اسپارٹیکس نامی ایک غلام نے کی تھی۔ ایسے بے شمار جاں بازوں کا نام تاریخ میں محفوظ ہے جو اسپارٹیکس کی طرح ہی آزادی کے لیے آخر تک لڑتے رہے۔ بہت سارے ایسے مفکرین، فلاسفر اور سائنس دانوں کا بھی نام تاریخ کو یاد ہے جنھوں نے ذہن و شعور کی آزادی کے لیے جدوجہد کی اور ضرورت پڑنے پر جان تک دے دی۔ ایسے ہی لوگوں میں سقراط کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے سزائے موت گوارا کر لی لیکن جو بات ان کے خیال میں حق تھی اسے حق کہنے سے باز نہیں آئے۔ القصہ آزادی کی اہمیت ہر زمانے میں تسلیم کی گئی ہے۔

جس طرح جگہ جگہ سد باندھ کر دریا کے بہاؤ میں زیادہ خلل اندازی کرنے پر دریا کی طغیانی بند کو توڑ دیتی ہے اور آزاد ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر کسی قوم پر بے جا تسلط اور ناقابلِ برداشت پابندیاں عائد کی جاتی ہیں تو وہ قوم عاجز آ جاتی ہے اور برسرِ پیکار ہو کر ایک روز اس تسلط اور ان پابندیوں سے خود کو آزاد کر لیتی ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر پوری طرح حکومت قائم کر لینے کے بعد جب ہندوستانی قوم پر ایسی ہی ناقابلِ برداشت پابندیاں عائد کر دیں تو ہندوستانی قوم نے بالآخر ان پابندیوں سے خود کو آزاد کرنے کی ٹھان لی اور حصولِ آزادی کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرنے لگی۔ انھیں تدبیروں کو "تحریک آزادی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی تحریک کی ایک کڑی "تحریک عدم تعاون" (NON-CO-OPERATION MOVEMENT) ہے۔

یہ اسی وقت معرضِ وجود میں آگئی تھی جب انگریز کے ہاتھوں بنگال تقسیم ہوا تھا۔

دسمبر ۱۸۹۸ء میں جب لارڈ کرزن ہندوستان کے نئے وائسرائے کی حیثیت سے آیا اور نہایت ناگوار اقدام کیا تو عوام میں انگریزی حکومت کے خلاف جو جذبات پیدا ہو چکے تھے اور شدید ہو گئے۔ اس کا سب سے بدنام عمل تقسیمِ بنگال تھا۔ اس تقسیم کا مقصد انتظامی سہولتیں بتایا گیا تھا لیکن قائدینِ ملک بہ خوبی سمجھ رہے تھے کہ اس تقسیم کا مقصد ہندو و مسلم کے باہمی اتحاد و اتفاق کو کمزور اور عوامی تحریک کو ناکام بنانا ہے۔ لہٰذا ردِ عمل کے طور پر غیر ملکی چیزوں کا استعمال ترک کیا جانے لگا اور ملکی اشیا کے استعمال پر زور دیا جانے لگا۔ اس ردِ عمل کے متعلق لالہ لاجپت رائے نے کہا :۔

> "میں اسے اپنے ملک کی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ "سودیشی تحریک" ہمارے اندر خودداری، خودکفالت، خوداعتمادی اور دوسروں کی بھلائی کے جذبات پیدا کرے گی۔ "سودیشی تحریک" ہمیں سکھائے گی کہ ہم اپنے سرمائے، اپنے ذرائع، اپنی محبت، اپنی قوت اور اپنی ذہانت کا استعمال کس طرح کریں کہ بلا امتیازِ مذہب، نسل اور ذات پات سبھی ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی ہو سکے۔ یہ ہمارے مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے باوجود ہمیں متحد کرے گی۔"

تقسیم بنگال نے ہندوستانیوں کو اتنا بے چین کر دیا کہ اس کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے کیے اور غیر ملکی مال کی دکانوں پر دھرنے دیے جانے لگے۔ جلسے بھی ملک بھر میں منعقد ہوئے اور تنظیمیں بھی بنائی گئیں۔ حکومت نے انھیں دبانے کی بھرپور کوشش کی۔ جلسوں پر پابندی لگا دی، اسکولوں کی منظوری واپس لے لی، ان کی مالی امداد بند کر دی۔ جلوسوں پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ کئی رہنماؤں کو قیدی بنا لیا گیا۔

۱۵۰، ستلج ہاسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔ ۶۷

یہی نہیں، قوم پرست اخبارات پر بھی پابندی عائد کردی گئی اور ان کے مدیروں کو سزائیں بھی دی گئیں۔

تحریک عدم تعاون ۱۹۰۷ء کے بعد کمزور ہوگئی۔ اس کے کمزور ہونے کا سبب یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء میں جب کانگریس کا ۲۳واں اجلاس ہوا تو "گرم دل" اور "نرم دل" دونوں میں نااتفاقی ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہوگئے۔ اس کے علاوہ اس تحریک سے وابستہ لوگوں کے خلاف حکومت اپنے سخت سے سخت اختیارات استعمال کرنے لگی اور کچھ دنوں بعد اس نے نرم دل کو مطمئن کرنے کی غرض سے مارلے منٹو اصلاحات کا اعلان کیا۔

زور و شور سے باقاعدہ تحریک عدم تعاون یوں شروع ہوئی کہ پہلی عالمی جنگ کے اختتام کے بعد ترکی کے ساتھ برطانیہ اور اس کے طرف داروں کے بہیمانہ سلوک کی مخالفت میں ۱۹۱۹ء میں ایک تحریک چلائی گئی، جس کی قیادت شوکت علی اور محمد علی جوہر وغیرہ کررہے تھے۔ اس تحریک کی قیادت میں ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور حکیم اجمل خاں بھی شامل تھے۔ اس تحریک کو چلانے کے لیے جو خلافت کمیٹی بنائی گئی، اس میں گاندھی جی بھی شامل ہوگئے اور جلد ہی اس کے ایک اہم اور سرگرم رکن بن گئے۔

ترکی کے ساتھ برطانیہ کے بہیمانہ سلوک سے مسلم عوام کافی مشتعل ہوگئے تھے، لہٰذا حکومت برطانیہ کے خلاف بڑے پیمانے پر بے اطمینانی پھیل گئی۔ اس پر قابو پانے کے لیے حکومت برطانیہ نے مجلس قانون ساز کے سبھی ہندوستانی اراکین کی مخالفت کے باوجود رولٹ ایکٹ (ROWLATT ACT) پاس کردیا جس سے سرکاری افسران کو ہندوستان میں یہ اختیار مل گیا کہ بغیر مقدمہ چلائے جس کو چاہے جیل بھجوادے۔ اس ایکٹ کے خلاف عوام میں ایسا جوش و خروش پیدا ہوا جو "جلیانوالہ باغ" میں تاریخ ساز مظلومیت کا محرک بنا۔ اس روح فرسا مظلومیت اور ترکی کے ساتھ ناانصافی کے پیش نظر جون ۱۹۲۰ء میں الٰہ آباد میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں سرکاری تعلیم گاہوں، قانون ساز مجلسوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کا منصوبہ بنایا گیا اور خلافت کمیٹی کی جانب سے تحریک عدم تعاون شروع کردی گئی۔ اس تحریک کو کئی مرحلوں میں چلایا جانا تھا اور اس کا پہلا مرحلہ حکومت کی طرف سے ملے ہوئے خطابات واپس کرنا تھا۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتے میں کانگریس کا ایک مخصوص اجلاس ہوا، جس میں اس بات کی پوری حمایت کی گئی کہ جب تک پنجاب اور ترکی کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا ازالہ نہ ہو اور "سوراج" قائم نہ ہو، سرکار کے ساتھ عدم تعاون جاری رکھا جائے۔ عوام سے گزارش کی گئی کہ وہ انگریزی سرکار کے تعلیمی اداروں، عدالتوں، آئین ساز اسمبلیوں اور ٹیکس کا بائیکاٹ کریں، غیر ملکی لباس ترک کریں، سرکاری خطابات و اعزازات لوٹائیں، سرکاری ملازمتوں سے استعفا دیں اور چرخہ کاتنا شروع کریں۔ لہٰذا کانگریس کے اراکین فوراً اسمبلی سے علاحدہ ہوگئے اور ووٹ دینے والوں نے بھی عام طور پر انتخابات کا مقاطعہ کیا۔ انگریزی حکومت سے جو خطابات ہندوستانیوں کو ملے تھے، وہ واپس کردیے گئے۔ سبرامنیا ایر اور رابندر ناتھ ٹیگور پہلے ہی یہ کام کرچکے تھے۔ گاندھی جی نے بھی اگست ۱۹۲۰ء میں اپنا "قیصر ہند" کا تمغہ واپس کردیا۔ ہزاروں طلبہ نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر قومی اسکولوں اور کالجوں میں داخلے لیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، بہار ودیاپیٹھ، کاشی ودیاپیٹھ اور گجرات ودیاپیٹھ اسی زمانے میں قائم ہوئیں۔ (ان قومی تعلیم گاہوں میں آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر ذاکر حسین اور لالہ لاجپت رائے جیسے نامور استاد اور ان جیسے بہت سے ممتاز معلم تعلیم دیتے تھے۔) سیکڑوں وکیل اور بیرسٹر اپنی شاندار وکالت سے دامن کش ہوگئے۔ ان میں چترنجن داس، موتی لال نہرو، راجندر پرشاد، سیف الدین کچلو، راج گوپال آچاری، سردار پٹیل، ٹی پرکاشم اور آصف علی جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔ تحریک عدم تعاون کے اخراجات کے لیے "تلک سوراج" فنڈ شروع کیا گیا اور چھ مہینے کے اندر ایک کروڑ سے زیادہ چندہ فراہم کرلیا گیا۔ اس چندے کی فراہمی میں عورتوں نے اپنے زیورات سے بے حد تعاون کیا۔ سارے ہندوستان میں غیر ملکی کپڑے جلائے جانے لگے اور جلد ہی کھادی آزادی کا نشان بن گئی۔ اس تحریک میں ہندوستان کے کاشت کاروں اور مزدوروں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو جب پرنس آف ویلز ہندوستان پہنچے تو ہڑتالوں اور مظاہروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ کئی جگہوں پر پولیس والوں نے مظاہرین پر گولیاں چلائیں۔ تشدد اسی طرح جاری رہا۔ سال کے اختتام تک گاندھی جی کے سوا تمام صف اول کے رہنما گرفتار کیے جاچکے تھے۔

۱۹۲۱ء کی شروعات میں کانگریس کا سالانہ جلسہ احمد آباد میں اس وقت ہوا جب تحریک عدم تعاون اور برطانوی تشدد دونوں عروج پر تھے۔ اس جلسے کی صدارت حکیم اجمل خاں کررہے تھے۔ اس جلسے میں تحریک جاری رکھنے پر زور دیا گیا تاوقتیکہ پنجاب اور ترکی کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا ازالہ نہ ہو۔

گاندھی جی نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ تحریک پُرامن طور سے چلائی جائے۔ لیکن جب گورکھپور کے قریب اترپردیش میں چوراچوری نامی مقام پر ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو بلاتشدد احتجاجی جلوس پر پولیس والوں نے گولیاں چلادیں تو مظاہرین اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے اور غصے کی حالت میں پولیس اسٹیشن پر حملہ کردیا۔ اس حملے سے ۲۲ پولیس والے ہلاک ہوگئے۔ چوں کہ گاندھی جی نے پہلے ہی شرط لگادی تھی کہ تحریک مکمل طور سے پُرامن رہنی چاہیے، لہٰذا اس واقعے کی خبر ملتے ہی انھوں نے اس تحریک کو واپس لینے کا اعلان کردیا۔

اگرچہ یہ تحریک ختم ہوگئی لیکن اس نے قوم پرستی کا جوش و جذبہ اور سیاسی شعور ہندوستان کے گوشے گوشے میں پیدا کردیا جو آگے چل کر ہندوستان کی آزادیٔ کامل کی مانگ بنا۔ اس تحریک کی بدولت ہندوستانیوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکل گیا۔ اب ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی ظالمانہ اور وحشیانہ طاقت انھیں خوف زدہ کرنے میں ناکام تھی۔ اب ہندوستانی عوام کے دلوں میں خود اعتمادی اور خودداری کا ایسا جذبہ تھا جسے کوئی طاقت زائل نہیں کرسکتی تھی۔ اس تحریک سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مغرب کے خلاف ہندوستانیوں کی صف بندی کو کافی قوت ملی۔ ہندو مسلم دونوں میں زبردست اتفاق و اتحاد قائم ہوا اور دونوں کے مفادات مشترک ہوگئے۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں پھر "تحریک عدم تعاون" کا از سر نو آغاز ہوا۔ اب کے یہ تحریک گاندھی جی کے

"قانونِ نمک" توڑنے کے اعلان سے شروع ہوئی۔ نمک پر حکومت کی طرف سے ٹیکس لگایا گیا تھا جس سے نمک کی قیمت میں اضافہ ہوگیا تھا اور غریب لوگوں پر اس کا زیادہ بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ گاندھی جی نے تہیہ کیا کہ وہ سابرمتی سے چل کر دو سو میل دور سمندر کے کنارے ایک ویران گاؤں "ڈانڈی" پہنچیں گے اور سرکاری قانون توڑ کر نمک بنائیں گے۔ ملک بھر کے لوگوں نے لکھ کر گزارش کی کہ وہ ان کے ساتھ جانے والے رضاکاروں میں شمولیت چاہتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی طے کر چکے تھے کہ اپنے آشرم ہی کے ساتھیوں کو پہلی ٹولی میں لے جائیں گے۔ گاندھی جی کے وہ ساتھی ۱۵ سال تک عدم تشدد کی تربیت پا چکے تھے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو ۱۶ سال سے ۶۱ سال تک کے اپنے ۷۸ ساتھیوں کے ہمراہ گاندھی جی آشرم سے پیدل روانہ ہوگئے۔ (وہ اپنے ان ساتھیوں میں سب سے بڑے تھے) ہری پتیوں اور جھنڈیوں سے راستہ سجادیا گیا تھا۔ راستے میں ہزاروں ان کے ہم سفر بن گئے۔ گاندھی جی ان سبھی کے ساتھ ۵ اپریل کو "ڈانڈی" پہنچے۔ وہاں انھوں نے نمک بنا کر نمک کا قانون توڑا۔ انھوں نے اپریل میں کہا کہ ہر گاؤں میں قانون توڑ کر نمک بنایا جائے۔ عورتیں افیون کے اڈوں اور شراب اور غیر ملکی کپڑوں کے دوکانوں پر دھرنا دیں۔ غیر ملکی لباس جلا ڈالیں۔ ہندو چھوت چھات کو ترک کر دیں۔ طلبہ سرکاری اسکول کالج جانا بند کر دیں اور سرکاری ملازمین اپنی اپنی ملازمت سے استعفا دے دیں۔ یہ تحریک شروع ہوئی اور گاندھی جی، جواہر لال نہرو جیسے سبھی اہم رہنما گرفتار کر لیے گئے۔

گاندھی جی یہ طے کر چکے تھے کہ ان کے بعد نمک سے متعلق اس تحریک کی قیادت بڑودہ کے سابق جج عباس طیب سنبھال لیں گے اور عباس طیب کے بعد سروجنی نائڈو۔ عباس طیب کچھ کر بھی نہ سکے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی گرفتاری ہوئی اور فوراً سروجنی نائڈو نے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی۔

اپریل کے مہینے تک یہ تحریک کافی مقبول ہوگئی۔ اس کے زیر اثر کئی جنگلاتی قوانین توڑے گئے۔ انگریزی سامان کا بائیکاٹ کیا جاتا رہا۔ ہڑتالیں اور مظاہرے ہوتے رہے۔ بہت سارے افسروں نے اپنی اپنی نوکریوں سے استعفادے دیا۔

حکومت نے عدم تعاون میں شریک تمام لوگوں کو دبانے کی بھرپور کوشش کی۔ لاٹھیوں اور گھوڑوں سے ان پر شدید سے شدید حملے کیے گئے۔ کلکتہ، مدراس اور کراچی میں ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ تاہم ان کا جوش و جذبہ کم نہ ہوا تو جنوری ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی اور کچھ دیگر رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا اور مارچ میں گاندھی۔ اروِن معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں کانگریس کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی۔ اروِن معاہدے کو منظور کر لیا گیا اور تحریک عدم تعاون واپس لے لی گئی۔ کراچی کے اجلاس کا سب سے اہم کام بنیادی حقوق اور اقتصادی پالیسی سے متعلق قرارداد (RESOLUTION) تھی۔ اس میں آزادی کے بعد ہندوستانی سماج کی تعمیر نو سے متعلق منصوبے کا ایک خاکہ پیش کیا گیا تھا اور ہندوستان کے آئین کے لیے مقاصد کے علاوہ جمہوریۂ ہند کی معاشرتی اور اقتصادی پالیسیوں کو بھی پیش کیا جاتا تھا۔

کانگریس "دوسری گول میز کانفرنس" میں حصہ لینے کے لیے تیار ہوگئی۔ یہ کانفرنس ایک نئے آئین کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلائی گئی تھی اور حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ تشدد کے جرم میں گرفتار کیے ہوئے افراد کے سوا سبھی سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔

جب لندن میں "گول میز کانفرنس" ہوئی، جس کا اعلان لارڈ اروِن پہلے ہی کر چکے تھے تو اس وقت "تحریک عدم تعاون" اپنے عروج پر تھی۔ حکومت نے ہندوستانی نمائندوں کو اس کانفرنس میں شرکت کے لیے منتخب کیا تھا۔ ہندوستان کے قومی جذبے کی نمائندگی کرنے والا کوئی بھی شخص اس کانفرنس میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا یہ کانفرنس ملتوی ہوگئی اور گاندھی جی اور وائسرائے کی گفتگو سے ۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو کانگریس اور حکومت کا معاہدہ ہوا جو گاندھی اروِن معاہدے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی معاہدے کے بعد "تحریک عدم تعاون" واپس لے لی گئی۔ حکومت نے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور بے جا دباؤ کی پالیسی ختم کر دی۔ کانگریس کانفرنس میں شرکت پہ آمادہ ہوگئی۔ جب دوبارہ اس کی نشست ہوئی تو اس میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے صرف گاندھی جی تھے۔ یہ نشست تشفی بخش نہیں تھی۔ اس موقع پر مختلف طبقے کے لوگ جب اپنے اپنے مطالبات پر زور دینے لگے تو گاندھی جی نے مذمت کی۔ انھوں نے ان مطالبات کی بجائے ہندوستان کی آزادی کامل پر زور دیا۔

اسی دوران حکومت نے ایک نیا قانون بنگال میں سیاسی سرگرمی کو ختم کرنے کے لیے اور دوسرا شمال۔ مغرب کے سرحدی صوبے کے لیے تجویز کیا۔ جب گاندھی جی واپس آئے اور دیکھا کہ سرکار نے دباؤ کی حکمت عملی دوبارہ اختیار کر لی ہے تو انھوں نے عدم تعاون پھر شروع کر دیا۔ یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو اس عدم تعاون کی حمایت میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے تجویز پاس کر دی۔ لہٰذا فوراً کانگریس کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور گاندھی جی کو قید کر لیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء تک ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ لوگ گرفتار کر لیے گئے تھے۔ تحریک عدم تعاون کا یہ دور زیادہ مشکل دور تھا۔ اس دور میں ہندوستانی انقلابیوں کا سامنا کرنے کے لیے سرکار زیادہ بہتر طور سے تیار تھی۔ مظاہرین کو دبانے کے لیے اس بار زیادہ طاقت کا استعمال کیا گیا۔ خفیہ پولیس سے بھی کام لیا گیا۔ پورے ملک میں ایک طرح کا مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور مکان، سامان وغیرہ کے علاوہ جن چیزوں کو مناسب سمجھا، ضبط کر لیا۔ اخبارات پر پہلے سے زیادہ سخت پابندی عائد کر دی۔ غرض کہ تحریک عدم تعاون اس بار سخت ترین مشکلات سے دوچار رہی۔ تاہم اس کی مقبولیت بڑھتی رہی۔

مارچ ۱۹۳۴ء میں "تحریک عدم تعاون" اس وقت ختم ہوئی جب حکومت ہندوستانیوں کے ساتھ اپنا رویّہ قدرے نرم ہونے پر مجبور ہوئی، اس کے قانون میں تھوڑی لچک پیدا ہوئی اور کانگریس نے حکومت کی نئی تبدیلیوں پر غور کرنے کا فیصلہ کیا۔

باقی صفحہ ۲۹ پر

کے۔کے کھلر

عظیم مجاہدِ آزادی: چندر شیکھر آزاد

ہندوستان کی تحریک آزادی میں چندر شیکھر آزاد کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کی قربانی اور ایثار کی حیرت انگیز داستان ہماری جنگ آزادی کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ ان کی ۲۴ سالہ زندگی اور شہادت کے سامنے ہر ہندوستانی کا سر احترام سے جھکتا ہے۔ انھوں نے انقلاب کو نئے معنی دیئے۔ ایک نئے ہندوستان کا خواب دیکھا۔

تاریخی اعتبار سے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ سب سے پہلے چندر شیکھر آزاد اور ان کے ساتھیوں نے اس وقت لگایا تھا جب ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ جن میں بھگت سنگھ، رام پرساد بسمل اور اشفاق اللہ جیسے دلیر اور روشن دماغ انقلابیوں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

چندر شیکھر آزاد اور ان کے ساتھیوں کا انقلاب نہ تو کوئی کھوکھلا نعرہ تھا اور نہ ہی کسی اخبار کی سرخی۔ نہ بند کمروں میں ہونے والا سیمنار اور نہ کوئی ذہنی تفریح۔ یہ انقلاب ایک ٹھوس اور منظم سماجی اور اقتصادی پروگرام تھا۔ جس کی توضیح بھگت سنگھ نے ملٹری ٹربیونل کے سامنے لاہور سینٹرل جیل میں کی تھی کہ یہ انقلاب کسی بم یا پستول کی روایت نہیں ہے۔ اس انقلاب کا مطلب ہے ایک ایسا سماج وجود میں لانا جس کی بنیاد انصاف اور برابری پر ہو۔ ایک ایسا سماج جو حق تلفی، غریبی، بھوک مری، جہالت اور فرقہ وارانہ عناصر سے پاک ہو۔ چندر شیکھر آزاد بھگت سنگھ کی طرح قوم پرستی کا ایک ایسا نشہ ہے جو آج بھی لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ انگریز ان کے نام سے دہشت زدہ تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں چندر شیکھر آزادی کی علامت تھے۔ وہ آزادی کے لیے جیے اور آزادی کے لیے شہید ہوئے۔

چندر شیکھر آزاد کا جنم ۲۳ جولائی ۱۹۰۶ء کے دن مدھیہ پردیش میں ضلع جھابوا کے ایک گاؤں بھورا کے ایک غریب گھرانے میں ہوا۔ ان کے والد پنڈت سیتارام تیواری اپنے بیٹے کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کی تعلیم کے بعد انھوں نے چندر شیکھر کو سنسکرت پاٹھ شالہ وارانسی میں داخل کرایا۔

وارانسی میں چندر شیکھر کی ملاقات وہاں کے ایک سرگرم انقلابی شیو پرشاد گپتا سے ہوئی۔ یہ وہ دن تھے جب جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے زخم لوگوں کے دلوں میں ابھی تازہ تھے۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون یعنی نان کو آپریشن تحریک چل رہی تھی۔ نوجوان چندر شیکھر کی عمر اس وقت صرف ۱۴ سال تھی۔ وہ آزادی کے میدان میں کود پڑا اور لیڈروں کے ساتھ آگے آگے چل کر نعرے لگانے شروع کر دیے۔ "بھارت ماتا کی جے"، "انقلاب زندہ باد"، "وندے ماترم"، "مہاتما گاندھی کی جے"، "انگریزوں کو بھارت سے بھگا دو"۔ جب جلوس عدالت کے سامنے سے گزرا تو مجسٹریٹ نے کہا کہ اگر یہ نوجوان کل عدالت تک نعرے لگائے گا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ جب چندر شیکھر کو اس بات کا علم ہوا تو دوسرے دن اس نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے نعرے لگائے اور اپنے آپ کو گرفتار کروایا۔

مجسٹریٹ آگ بگولہ ہو گیا۔ غصے میں آ کر اس نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ چندر شیکھر نے اونچی آواز میں کہا "آزاد"۔ مجسٹریٹ اور طیش میں آ گیا باپ کا نام "سوتنتر"، رہائش "جیل"۔

مجسٹریٹ نے حکم صادر کیا کہ اسے جیل میں لے جا کر پندرہ بینت مارے جائیں۔ ایک نیا بینت لایا گیا۔ ہر بینت پر چندر شیکھر "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگاتا تھا، "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگاتا تھا۔ جب اسے جیل سے باہر نکالا گیا تو ہزار ہا لوگ اس بہادر نوجوان کا استقبال کرنے کے لیے جیل کے باہر موجود تھے۔ وارانسی میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا۔ اس دن سے چندر شیکھر کا نام چندر شیکھر "آزاد" ہو گیا۔ اس دن آزاد نے عہد کیا کہ انگریزوں کو بھارت سے نکال کے دم لے گا اور انقلابیوں کے ساتھ کام کرے گا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اس وقت کے مشہور انقلابی رام پرساد بسمل کا دل جیت لیا اور کاکوری ریلوے اسٹیشن پر خزانہ لوٹنے کے کیس میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔ بھگت سنگھ انھیں اپنا لیڈر تسلیم کرتا تھا۔ جب بسمل کو ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کے روز گورکھپور جیل میں پھانسی ہوئی تو اس دن تمام انقلابیوں نے چاہے وہ جہاں بھی تھے سرفروشی والا گیت دہرایا۔

پولیس نے چندر شیکھر آزاد کو زندہ یا مردہ

باقی صفحہ ۳۶ پر

سی-۸/۸۳۳۸، وسنت کنج، نئی دہلی-۷۰

اظہار احمد ندیم

اندرا گاندھی۔ ایک عظیم رہنما

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کسی آدمی کی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں اس کا ماحول بہت ہی اہم رول ادا کرتا ہے، جس کی ایک مثال ہم آہنی خاتون مسز اندرا گاندھی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ مسز اندرا گاندھی کی ولادت ۱۹ر نومبر ۱۹۱۷ء کو الٰہ آباد میں ہوئی اور جنھوں نے اپنی شہادت کے ایک روز قبل یہ لافانی جملے کہے تھے: "اگر میں قوم کی خدمت کرتے کرتے مروں گی تو مجھے اس پر فخر ہوگا۔ میرے خون کا ہر قطرہ مجھے یقین ہے کہ ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے گا اور اسے مضبوط بنائے گا۔" ان کی زندگی کے اس سفر کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیے ان کے ماضی کے اوراق کی ورق گردانی انتہائی ضروری ہوگی۔ اندرا گاندھی کے سیاسی اور ذہنی ارتقاء میں ان کے دادا موتی لال نہرو، والد جواہر لال نہرو اور والدہ کملا نہرو نے اہم رول ادا کیا۔ اس کے علاوہ اندرا گاندھی کی شخصیت کے معماروں میں بابائے قوم مہاتما گاندھی اور مشہور زمانہ "گیتانجلی" کے تخلیق کار رویندر ناتھ ٹیگور کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی تعلیم و تربیت نے ان کو وہ مقام عطا کیا کہ ایک طرف ان کا شمار دنیا کے عظیم رہنماؤں میں ہوا تو دوسری طرف ہندوستان کے کروڑوں عوام کے دلوں پر بھی حکومت کرتی رہیں۔ ویسے تو ان کی شخصیت بین اقوامی شہرت رکھتی ہے مگر ہم ان کی شخصیت اور کارکردگی کا تجزیہ ہندوستان کے حوالے سے کریں گے۔

اندرا گاندھی جب چار برس کی تھیں تو ان کے والد اور دادا دونوں کو چھ چھ ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ باپ اور دادا کی گرفتاری کے بعد گھر کے سارے لوگ "سابرمتی آشرم" چلے آئے۔ جن میں اندرا بھی شامل تھیں۔ یہاں سادہ اور روکھا سوکھا کھانا، فرش پر سونا، صبح سویرے چار بجے جاگنا اور سابرمتی کے کنارے پرارتھنا کے لیے جمع ہونا ان کی زندگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ سابرمتی آشرم میں کچھ دنوں کا رہنا ان کی سوچ، طرزِ رہائش اور زندگی کے دیگر شعبوں میں کافی بدلاؤ لایا۔ وہاں کی زندگی سے اندرا گاندھی اس قدر متاثر ہوئیں کہ گھر واپس آنے کے بعد کھادی کے کپڑے پہننے لگیں۔ سابرمتی کی چند دنوں کی زندگی نے ان کے ظاہر و باطن دونوں کو بدل ڈالا۔ اس کے بعد عالم یہ ہوا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر چپکے سے گلی کے جلوس میں مل کر "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگانے لگتیں تو کبھی گھر میں گڑیوں کی فوج بناتیں اور کبھی گھر کے نوکروں کو یکجا کرکے خود اونچی میز پر کھڑے ہوکر تقریر کرتیں۔ بڑے بڑے رہنماؤں کی ان کے گھر آمد نے مادرِ وطن سے ان کی محبت کو جوش کی حد تک پہنچا دیا۔ ان ساری باتوں کا اثر ان کے ذہن پر اس قدر ہوا کہ دس برس کی عمر سے ہی ہر اتوار کو ایک اسپتال میں جاکر مریضوں کی خدمت کرنی شروع کردی۔ اس کے علاوہ اس بچپنے ہی میں انھوں نے ایک "بال چرخہ سنگھ" بنایا، جس میں بچے چرخہ کاتنے کے علاوہ گھر گھر جاکر کھادی کا پرچار اور اسے استعمال کرنے کی اپیل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ لگ بھگ ۱۲ سال کی عمر میں بہت دلیری کے ساتھ کمسن کارکنوں کا ایک جتھا بنایا جسے ان کے دادا نے پیار سے "بانر سینا" کا نام دیا تھا۔ اندرا گاندھی کے دل و دماغ میں ملک کی آزادی کا جذبہ اس قدر قوی ہو گیا کہ اس نے ایک طرف تو گڑیوں کے کھیل اور دیگر تفریحی کاموں میں ان کی دلچسپی کو کم کر دیا اور دوسری طرف تعلیم پر وہ خاطر خواہ توجہ نہیں دے پائیں۔ میٹرک تک ان کی تعلیم مستقل طور پر نہیں ہو پائی۔ چند سال الٰہ آباد مشن اسکول میں تو کچھ دن یوروپ کے ایک اسکول میں پھر دہلی کے ایک بورڈنگ اسکول میں اور بعد میں پیپلز اون اسکول بورڈنگ پونہ میں۔ یعنی جیسے تیسے انھوں نے میٹرک مکمل کیا اور پھر آگے کی تعلیم کے لیے ان کا داخلہ وشو بھارتی شانتی نکیتن میں ہوا۔ یہاں کی طرزِ زندگی "سابرمتی" کی زندگی جیسی ہی تھی جس نے ان کی سوچ اور شخصیت دونوں کو پختگی عطا کی۔ شانتی نکیتن کی کچھ ہی دنوں کی طالب علمی کے بعد وہ آکسفورڈ چلی گئیں مگر وہاں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکیں اور ہندوستان لوٹ آئیں۔ ۱۹۴۲ء میں فیروز گاندھی سے ان کی شادی ہو گئی اور ان کا یہاں رہنا مستقل ہو گیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جو سبق انھیں اپنے گھر، سابرمتی اور شانتی نکیتن وغیرہ میں ملا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کا وقت آن پہنچا تھا۔ اندرا گاندھی ملک کی سیاست اور جدوجہد آزادی میں نہایت سرگرمی سے حصہ لینے لگیں۔

۱۱۸۔ نرمدا ہاسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔ ۶۷

ان پر لاٹھیاں برسائی گئیں، پولیس کی زد وکوب کا نشانہ بنیں، گرفتار ہوئیں اور جیل بھی گئیں مگر جو قدم ان کے آگے بڑھ گئے تھے رکے نہیں۔ وقت یوں ہی آگے کی طرف بڑھتا رہا اور ہندوستانی عوام کی بے شمار قربانیوں، انتھک کوششوں اور مسلسل کاوشوں کے سبب ملک آزاد ہوا اور جواہر لال نہرو وزیر اعظم بنائے گئے۔ ابھی ملک کی آزادی کی مہندی کا رنگ پھیکا بھی نہ پڑا تھا کہ ملک میں مذہبی فسادات نے بھیانک روپ اختیار کر لیا۔ جس میں اپنے والد کے ساتھ اندرا گاندھی نے بھی اپنی جان جوکھم میں ڈال کر مظلوم اور بے سہارا لوگوں کی مدد کی اور پناہ گزینوں کے کھانے پینے سے لے کر رہنے سہنے تک کی ذمہ داری کو ایک فرض عین کی طرح پورا کیا۔ ملک میں جہاں بھی فسادات بھڑکتے وہاں اندرا گاندھی بے خوف وخطر جا کر روک تھام کرتیں جس میں انھیں کامیابی ملتی۔ وقت اور حالات نے اندرا گاندھی کو اس طرح باشعور اور دور اندیش بنا دیا تھا کہ ملکی معاملات ومشکلات میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ سیاسی حلقوں میں ان کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا، کانگریس کے بڑے لیڈروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ دوسرے عام انتخاب میں انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور گاؤں گاؤں میں تقریریں کیں جو عوام میں بہت مقبول ہوئیں۔

اندرا گاندھی کی سیاسی بصیرت کو دیکھتے ہوئے فروری ۱۹۵۹ء میں ۴۲ سال کی عمر میں انھیں صدر کانگریس کے عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس ذمے داری کو وہ بہ حسن وخوبی انجام دے رہی تھیں کہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد لال بہادر شاستری ہندوستان کے نئے وزیر اعظم بنائے گئے۔ تاشقند سمجھوتے کے بعد لال بہادر شاستری جی کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء کو مسز اندرا گاندھی کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس وقت ان کے حریفوں اور نکتہ چینوں نے نہ جانے کیا کیا کہا مگر رفتہ رفتہ اندرا گاندھی نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ان کے اندر وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک عظیم رہنما کے لیے لازم وملزوم ہوتی ہیں۔

مسز اندرا گاندھی ہندوستان کی وزیر اعظم بن کر عالمی بساطِ سیاست پر نمودار ہوئیں اور بہت جلد ہی انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر دولت مشترکہ میں ایک اہم حیثیت حاصل کر لی۔ انھوں نے اقوام متحدہ میں اپنی صلاحیت کا دنیا بھر سے لوہا منوایا۔ ناوابستہ ممالک کو یکجا کرنے، اس کو ایک بڑی طاقت کا روپ دینے میں انھوں نے ایک نمایاں رول ادا کیا۔ ۱۹۸۳ء میں ناوابستہ ممالک کا ساتواں اجلاس نئی دہلی میں انھیں کی صدارت میں ہوا۔ دنیا کے عظیم رہنماؤں نے ان کی سیاسی بصیرت کا اعتراف کیا اور عالمی سیاست میں ان کو ایک عظیم لیڈر تسلیم کیا جانے لگا۔

اندرا گاندھی کی قیادت میں ہمارے ملک نے بہت ترقی کی۔ جسے ہم انگلیوں پر شمار نہیں کر سکتے۔ چند اہم باتوں کا ذکر کچھ اس طرح ہے۔ ان ہی کے عہد میں ہندوستان ایٹمی دور میں داخل ہوا اور ان ہی کی رہنمائی میں "تری ہری کوٹا" کا خلائی مرکز قائم ہوا، جس نے ہندوستان کے اپنے خلائی سیارہ "انسیٹ بی" کو خلا میں قائم کر کے اس ملک کے دور دراز حصّوں کو ٹیلی ویژن کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ دوسری طرف ان ہی کی دلچسپی اور لگاتار کوشش کی بدولت ہندوستان دفاعی حیثیت سے اتنا طاقتور اور دفاعی سامان پیدا کرنے میں اس حد تک خود کفیل ہو گیا کہ آج اس کا شمار سو سے زیادہ ترقی پذیر ملکوں میں سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ملکوں میں کیا جاتا ہے۔ آج پورے ملک میں معاشی خوشحالی اور ٹکنالوجی، تعمیر وترقی کی جو خوشبو پھیلی ہوئی ہے اس کا مخزن اور مرکز مسز اندرا گاندھی کو کہنا غیر مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ ملک کے پسماندہ اور غریب عوام نیز کمزور طبقات کے لیے انھوں نے ۲۰ نکاتی پروگرام کے ذریعے جو کارنامہ انجام دیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

مسز اندرا گاندھی کے ہی دور اقتدار میں ملک نے گھڑیوں کے نازک پرزوں سے لے کر بھاری مشینوں تک کی پیداوار میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ انھیں کے دور میں بجلی کی بھاری ٹربائینوں سے لے کر بجلی کے چھوٹے کارخانوں تک کے ٹربائینوں کی پیداوار پر خاص زور دیا گیا۔ دوسری طرف وشاکھاپٹنم دوسری بندرگاہوں میں مال بردار بحری جہازوں سے لے کر جنگی جہازوں اور آب دوزوں تک کی تیاری کا کام شروع ہوا۔

یہ انھیں کی انتھک محنت اور تعمیری جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان درجنوں ترقی پذیر ملکوں میں ریلوے لائن بچھا رہا ہے۔ ریلوے کے انجن اور مال گاڑیوں کے ڈبے سپلائی کر رہا ہے، درجنوں ملکوں میں سڑکیں اور پل بنانے کا کام ٹھیکے پر کر رہا ہے۔ ان کے دور میں ڈاکٹروں، انجینئروں، سائنس دانوں اور دیگر فنون کے ماہروں کی ایسی قطاریں ملک میں نمودار ہوئیں کہ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ہندوستان کے ماہرین فن کام نہ کر رہے ہوں اور عزت کی نگاہ سے نہ دیکھے جا رہے ہوں۔ اسے ہم یوں کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ اندرا گاندھی کی قیادت میں جہاں ایک طرف ترقی پذیر ملکوں نے اس کی اہمیت اور عظمت کو تسلیم کیا وہیں دوسری طرف ترقی یافتہ ملکوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

اس کے علاوہ "عالمی تجارتی میلہ"، "ایشیاڈ" اور "ناوابستہ ممالک کانفرنس" مسز اندرا گاندھی کی تنظیمی صلاحیت کا شاہکار ہیں گو کہ اندرا گاندھی نے اپنی زندگی کو ہندوستانی عوام کے لیے وقف کر دیا تھا لیکن ہر خطۂ زمین کے عوام سے ان کی دلی ہمدردی تھی۔ ظلم واستحصال کی انھوں نے ہمیشہ مخالفت کی اور مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر رہیں۔ بنگلہ دیش کے قیام کے سلسلے میں انھوں نے وہاں کی عوامی جدوجہد کا ساتھ دیا۔ ہندوستان کی اخلاقی اور سیاسی حمایت کے سبب ہی بنگلہ دیش کے عوام نے پاکستانی شکنجے سے خود کو آزاد کیا۔ بین اقوامی سطح پر انھیں جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہر مکتبۂ فکر اور سیاسی نقطۂ نظر کے لوگوں میں مقبول تھیں اور دنیا کی چند قد آور خواتین میں ان کا نام شامل ہے۔

مختصر یہ کہ اندرا گاندھی کا نام ذہن میں آتے

باقی صفحہ ۹ پر

روشن صدیقی

قومی یک جہتی، ایک چیلنج

جہاں آج پوری دنیا میں سائنس و ٹکنالوجی کی غیر معمولی دریافت و انکشافات نے تمام نوع انسانی کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا ہے، وہاں ہزاروں ہزار کلومیٹر کی دوری اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ نتیجے میں ہم گھر بیٹھے پوری دنیا کی مخلوق کی شب و روز کی نقل و حرکت کو نہ صرف سُن اور پڑھ رہے ہیں بلکہ دیکھ کر یقین بھی کر رہے ہیں۔ حُسن اتفاق سے اس جدید ترقی یافتہ دور میں پوری دنیا کے اندر کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جو مسائل سے خالی ہو۔ لیکن دلچسپ اور سبق آموز بات تو یہ ہے کہ ہندوستان ہی غالباً ایسا واحد ملک ہے جہاں دیگر تمام مسائل میں "قومی یک جہتی" کے مسئلہ کو اولیت حاصل ہے۔ ایسی صورت میں قومی اتحاد کی عدم موجودگی میں صالح و صحت مند معاشرہ کا تصور بچہ کا سا بات ہو گی۔ دراصل یہ وہی قومی اتحاد ہے جس کے ذریعہ آج سے ۵۰ سال قبل انگریز کی ظالمانہ حکومت سے آزادی حاصل کی گئی تھی۔ یہی قومی اتحاد جو ہماری وراثت ہے۔ آج ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔

جہاں غلامی کی زندگی جہنم کی زندگی سے کسی قدر کم نہیں۔ وقت کا دھارا ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ عین اس فطرت کے پیش نظر ہمارے ہم وطنی قائد ملک و قوم، دیگر جاں نثاران وطن نے مختلف قسم کی قربانیاں دیں۔ نتیجے میں عرصہ دراز سے غلامی کے مکروہ شکنجے میں جکڑے ہوئے وطنِ عزیز کو بھی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے دن آزاد کرایا۔ اس کے بعد ہی ہم اپنے باغ کے باغبان کی حیثیت سے زندگی کی سانس لینے لگے۔ ۱۹۵۰ء کو آزاد جمہوریہ ہند کا دستور نافذ ہوا۔ جس کے تحت ملک میں ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب و ملت آزادی کی نعمتوں سے پورا استفادہ کرنے اور ترقی کرنے کے لیے یکساں مواقع فراہم کیے گئے۔

لفظ "قومی یک جہتی" کے معنی ہیں افراد و قوم کے بیچ آپسی اتحاد و اتفاق، جن کے جذبات ایک خاص قسم کی رسّی میں بندھے ہوں۔ کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ اتحاد ہے اور اختلاف کا دوسرا نام کمزوری ہے — اختلاف کا سبب افراد کی انانیت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں اتحاد سے بڑی کوئی دوسری طاقت نہیں۔ اتحاد و اتفاق ہی دنیا کو تسخیر کرنے والی قوتیں ہیں۔ ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

"قومی یک جہتی" جس کے اندر لفظ انسانیت اس کی روح ہے جو ایک سادہ سا لفظ ہے، جس کا عصرِ حاضر میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے۔ آج پوری دنیا انسانیت کی دہائی دے رہی ہے۔ خصوصی طور پر حقوقِ انسانی کا مغربی تصور اصلاً مغربی تہذیب کے تسلط کا بہانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مشرقی ممالک کو اس میٹھے زہر کو قبول نہیں کرنا چاہیے، جو مغرب کی مادی اخلاقیات کی پیداوار ہے۔ صحافت اور دیگر ذرائع ابلاغ، سنجیدہ دانشور طبقہ، اربابِ حکومت و اقتدار، بنیادی انسانی حقوق کا دفاع اور تحفظ کرنے والے غرض ہر جماعت کے منشور میں انسانیت کا لفظ سرِ فہرست ہے۔ تاہم آج انسانیت پامال ہے۔ کھلے بندوں اس کا خون ہو رہا ہے۔ آج پوری دنیا میں مختلف حصّوں میں مختلف نسلوں، قوموں اور گروہوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں انھیں ان کے بنیادی انسانی حقوق سے جس طرح محروم کیا جا رہا ہے، ان کی جان و مال، عصمت و آبرو اور عزت و ناموس پر جس طریقے سے حملے کیے جا رہے ہیں۔ اگر یہی انسانیت ہے تو پھر حیوانیت ہے کیا؟ دنیا اس وقت انتہائی سخت اور نازک حالات سے گزر رہی ہے۔ انسان نفسیاتی و ذہنی طور پر مایوسی، گھبراہٹ، تذبذب، انتشار، چڑچڑے پن، جھنجھلاہٹ اور اسی قسم کی مختلف منفی کیفیتوں میں مبتلا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کرے کیا؟

جہاں ہمارا ملک مسائل سے کبھی خالی نہیں رہا۔ مہنگائی، بے روزگاری، علاقائی بے چینی اور ایک بہت بڑے طبقے کی سماجی پسماندگی جیسے مسائل کے علاوہ اخلاقی گراوٹ، سماجی جرائم میں اضافہ اور غلط رسم و رواج جیسے مسائل نے اس ملک کو بہت پہلے سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہاں آج اس نے ہر محب وطن شہری کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔

اس وقت ہمارا گھر، معاشرہ مختلف طرح کے نہایت سنگین حالات اور مسائل سے دوچار ہے جو اس کے مستقبل کے لیے ایک

ناصر لائبریری، ابو بازار (اچوا) ضلع گورکھپور (یو پی)

زبردست خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ایسی حالت میں ہماری قوم کسے پکارے؟ یہ قوم پڑھے لکھے طبقے ہی کو پکارے گی بلکہ پکار رہی ہے اور اسے اسی کو پکارنا چاہیے ۔ دراصل یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ عصرِ حاضر میں موجودہ بحران کے حل کے لیے سب سے زیادہ سخت ذمہ داری اُن لوگوں پر ہے جو صاحب علم ہیں ۔ صحیح علم و فہم بھلائیوں کا سرچشمہ ہے ۔ صحیح علم سیکھنے کا مقصد اس پر عمل کرنا ہے ۔ جس طرح پیڑ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح عالم اس کے نیک اعمال سے ۔ اصل علم حقیقت کا علم ہے اور اس سے محرومی جہالت ہے ۔ اصل علم سے ہی صحیح راہِ حیات متعین کی جا سکتی ہے ۔ لیکن ایسا نظام تعلیم کس کام کا جو طالب علموں کو روزی کمانا تو سکھاتا ہو لیکن زندگی کو حسن اخلاق کے زیور سے عاری اور طلبا کو خیر و شر کی تمیز سے محروم کر دے ۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے تعلیمی اور تربیتی نظام کو عمومی اور موثر بنانا ہوگا ، یہ پروگرام جڑ سے شروع کرنا ہوگا ۔ اس کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ کوئی بستی اس سے خالی نہ رہے اور یہ کام ہمارے شب و روز کی زندگی کا ایک جزو بن جائے ۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے ہنگامی مسائل میں یہ مسئلہ دب کر رہ جائے ، جس کا تعلق ہماری بنیادی ضرورت سے ہے ۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ جس طرح کسی انسان کے صحت مند ہونے کی ضمانت یہ ہے کہ اس کے تمام اعضائے جسم درست ہوں ۔ ٹھیک اسی طرح کسی ملک کے بہتر ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ ہر فرد صحیح فکر رکھتا ہو ۔ آج ہر ملک کی تعمیر و ترقی اور جدید تنظیم کے لیے نئے نئے پلان اور منصوبے مرتب کیے جا رہے ہیں ۔ لیکن یہ منصوبے ادھورے اور ناقص صرف اس لیے کہے جا سکتے ہیں ان میں انسانیت کی تعمیر ، سیرت سازی اور اخلاقی اصلاح کا کوئی خانہ نہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں سب سے اہم اور مقدم کام یہ ہے کہ انسان کو حقیقی معنی میں انسان بنایا جائے ، جو صحیح تعلیم و تربیت سے ہی ممکن ہے ۔ ایسی تعلیم و تربیت دی جائے جس سے صاف ستھرے ماحول میں ایک ایسا آدم ہندی تیار ہو کر سامنے آئے گا جس کا ذہن فرقہ وارانہ تعصب سے خالی ہوگا جو بلند ہمت اور بلند حوصلہ کا مالک ہوگا ۔ جو دیانت دار اور ایماندار ہی نہیں با اخلاق اور بلند خیالی کا سراپا مجسمہ ہوگا ۔ جو دوسروں کے لیے ایثار کرنا جانتا ہو ۔ وطن اور برادرانِ وطن کی خدمت اور مساوات پر اس کا ایمان ہو ۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب ہر شہری اپنا یہ فرض سمجھ کر تعمیر و ترقی کا عمل اپنی ذات سے شروع کرے ۔ یقیناً اخلاق ، محبت اور یک جہتی کی ان روایات کی بدولت ہندوستان جنت نشان کہلائے گا ۔

دراصل ہندوستان کے ذمہ دار شہری کے طور پر ہم اپنی ذمہ داریوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتے ۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم خود اپنے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں بہترین اور فعال شہری ہونے کا ثبوت دینا ہے ۔ جس کے لیے ہم میں سے ہر فرد ایک سچا ہندوستانی ہی نہیں ملک کا پُرامن شہری ہونے کا ترجمان بھی ہو ۔ جب ہی ملک کے اندر قومی یک جہتی کا ننھا سا پودا مستقبل میں تناور پھل دار پیڑ کی شکل میں اپنی ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھے پھل سے ملک کے ہر امیر و غریب شہری کو یکساں فائدہ پہنچا سکے گا ۔

سچائی تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب نے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور محبت اور پریم کی تعلیم دی ہے ۔ ملک کا ہر فرد خواہ اس کا تعلق مذہبی اعتبار سے عیسائیت ، بدھ مت ، ہندو دھرم اور اسلام سے یا کسی اور عقیدے سے کیوں نہ ہو ۔ ان تمام مذاہب کے پیغمبروں اور مصلحوں نے انسانی تعلقات کو پرکیف اور جاندار بنانے کے لیے زندگی کے ہر گوشے میں اس پر نہ صرف زور دیا ، بلکہ اس کو معاشرے کی جان اور ریڑھ کی ہڈی قرار دیا ہے ۔ ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس کے لیے ایسا تبھی ممکن ہے جب ہم "جیو اور جینے دو" کے نعرے کے ساتھ زبان ، علاقے اور برادری کے جھگڑوں سے اوپر اٹھ کر اپنے آپ کو قومی یک جہتی کا ترجمان بنا دیں ۔ کیوں کہ یہ سچ ہے کہ "تمام انسان آدم کی اولاد ہیں" ۔ ایسی صورت میں ہم ہندی ایک دوسرے کے بھائی ہیں ، جن کو ایک دوسرے پر پورا پورا حق حاصل ہے ۔

یوں بھی حب الوطنی پر کسی کا اجارہ نہیں بقول علامہ اقبال ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

قومی یک جہتی کا ایک طریقہ فطری اور حقیقی ہے اور وہ ہے رواداری ۔ فکری فرق کو مانتے ہوئے عملی برتاؤ میں باہمی احترام ۔ اس کے ساتھ قومی یک جہتی کے عنوان پر کچھ بھی لکھنے پڑھنے اور کوئی تقریب مناتے وقت اس بات کا لحاظ رکھیں کہ وہ وقت ایک ایسا اہم وقت ہے جو قومی یکجہتی کے سلسلے میں ہمیں اپنا فرض یاد دلاتا ہے ۔

یقیناً ایسا ہونے پر گھر سے محلہ ، محلہ سے قصبہ ، قصبہ سے شہر ، شہر سے ریاست اور پھر ریاست سے پورے ملک کے ماحول میں ایک غیر معمولی تبدیلی کے ساتھ پرسکون و پرکیف فضا قائم ہو کر رہے گی ۔ پھر تو معاشرے کے ہر فرد کی زندگی ایک مثالی زندگی بن جائے گی ۔ ●

بقیہ : گنگا ساگر — ایک ثقافتی سنگم

پرانے زمانے میں کشتیوں کے حادثات کی طویل تاریخ کی وجہ سے اس جگہ کو انتہائی دشوار گزار اور ناقابل رسائی بھی سمجھا جاتا ہے ۔ شاید اسی وجہ سے شمالی ریاستوں اور جنوب کے نچلے علاقوں میں یہ عام مثل مشہور ہے کہ "سارے تیرتھ بار بار ، گنگا ساگر ایک بار" ۔

گزشتہ دو سال سے میلے کے دوران جزیرہ پر بنیادی ڈھانچہ کو بہتر بنانے کی مسلسل سرکاری کوششوں ، یاتریوں کی آمد و رفت کی نگرانی اور دیکھ بھال نیز دیسی کشتیوں اور ماہی گیری کی ٹرالروں کے ذریعہ یاتریوں کے لانے پر مکمل پابندی کے نفاذ کے نتیجہ میں آگ لگنے کی واردات بہت کم ہو گئی ہے اور کشتیوں کے حادثات بھی تقریباً نہیں کے برابر ہو گئے ہیں ۔ اب کوئی یاتری بھی اس سالانہ اجتماع میں بہت کم جوکھم کا سامنا کرتے ہوئے شریک ہو سکتا ہے ۔ ●

اے. راجا راؤ

کمزور طبقات کے روزگار پر آر. آر بینکوں کا اثر

حقیقی اقتصادی ترقی اس وقت ممکن ہے جب کہ کمزور طبقات کی ترقی ہو جائے۔ بھارت میں کمزور طبقات چھوٹے کسانوں، حاشیائی کسانوں، زرعی مزدوروں، چھوٹے تاجروں اور دیہاتی دست کاروں پر مشتمل ہیں یہ ایس سی، ایس. ٹی اور دیگر پسماندہ برادریوں سے متعلق ہیں ان کی معاشی صورت حال انتہائی خستہ ہے۔

بھارت میں تجارتی بینکوں کو قومیانے کے بعد بینکنگ کے تصور میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ دیہی ترقی کے مقاصد کی تکمیل زیادہ تر دیہی علاقوں میں کمزور طبقات کو بینک کریڈٹ کی دستیابی سے مربوط ہے۔ نرسمہم کمیٹی نے اسٹیٹ اسپانسرڈ علاقے پر مبنی اور ریجنل رورل بینکز (R R Bs) کے قیام کی سفارش کی تھی اس طرح دیہی مالیات کے میدان میں حالیہ اہم شروعات آر. آر بینز کا قیام ہے۔ وہ سرکار کے غریبی ہٹاؤ پروگرام سے پوری طرح منسلک ہیں۔

زیر نظر مطالعہ کا مقصد کمزور طبقات کی اقتصادی صورت حال پر ناگارجن گرامینے (N G BANK) کے ذریعہ مالی تعاون یافتہ اسکیموں کے اثرات کو تلاش کرنا ہے۔

طریقۂ کار

زیر مطالعہ یونٹ آندھرا پردیش کے تلنگانہ علاقے میں نالگونڈا ضلع میں این. جی بینک ہے۔ این جی بینک ریاست میں سب سے بڑا اور قدیم ترین دیہی بینک ہے۔ چوں کہ نالگونڈا ریاست کے معاشی طور پر پسماندہ اضلاع میں سے ایک ہے اس لیے ہم نے اپنے مطالعہ کے لیے این. جی بینک نالگونڈا کا انتخاب کیا ہے۔ این. جی بینک کے ذریعہ ادا کردہ قرضوں کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک فیلڈ سروے کا اہتمام کیا گیا جس میں سوالنامہ کے توسط سے اسکیم کے مختلف عوامل پر فائدہ اٹھانے والے گھروں سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ سروے میں کثیر مرحلہ جاتی تجزیاتی طریقۂ کار اپنایا گیا ہے۔ ڈاٹا کے تجزیہ میں آسان شرح ترقی اور تناسب کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ دیکھئے گوشوارہ نمبر ا۔

نالگونڈا اور نارکٹ پلی برانچ ایریا میں روزگار (زمرہ جاتی) پر مختلف اسکیموں کے اثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ نالگونڈا برانچ ایریا میں سب سے زیادہ روزگار ایام چھوٹے کسانوں کو یعنی ۲۴٫۸ فی صد اور سب سے کم روزگار دیہاتی دست کاروں کو یعنی ۱۲٫۴ فی صد فراہم کیے گئے ہیں۔ جب کہ نارکٹ پلی برانچ ایریا میں زیادہ سے زیادہ روزگار ایام چھوٹے تاجروں کو یعنی ۵۸٫۷ فی صد اور کم از کم روزگار کے مواقع متوسط کسانوں کو یعنی ۳۷٫۳ فی صد مہیا کیے گئے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مختلف اسکیموں کی عمل آوری کا۔ دیکھئے گوشوارہ نمبر ۲۔

گوشوارہ نمبر ۲ میں نالگونڈا اور نارکٹ پلی برانچ ایریا میں روزگار پر ذاتوں کے اعتبار سے مختلف اسکیموں کا اثر واضح کیا گیا ہے۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ نالگونڈا برانچ ایریا میں شیڈولڈ کاسٹ سے متعلق فائدہ اٹھانے والے کنبوں کو سب سے اونچی شرح میں روزگار حاصل ہوا اور نارکٹ پلی برانچ ایریا میں پسماندہ برادریوں کو سب سے زیادہ روزگار ملا اور دوسری طرف نالگونڈا برانچ ایریا میں فائدہ اٹھانے والے شیڈولڈ ٹرائب کو اور نارکٹ پلی برانچ ایریا میں فائدہ اٹھانے والی دیگر برادری کو سب سے کم روزگار ملے۔ نارکٹ پلی برانچ ایریا میں کسی بھی ایس ٹی کو فائدہ نہیں حاصل ہوا۔

گوشوارہ نمبر ۳۔ دونوں برانچ ایریا میں فائدہ اٹھانے والوں کی آمدنی پر این۔ جی بینک کی مختلف اسکیموں کے اثر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دیکھئے گوشوارہ نمبر ۳۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ نالگونڈا برانچ میں چھوٹے کسانوں کو اعلا ترین انکریمینٹل (INCREMENTAL) اور نارکٹ پلی برانچ میں انھیں سب سے کم انکریمینٹل آمدنی حاصل ہوئی۔ نالگونڈا برانچ میں چھوٹے تاجروں کو سب سے کم فائدہ ہوا اور نارکٹ پلی میں متوسط کسانوں کو اعلا ترین انکریمینٹل آمدنی حاصل ہوئی۔ مذکورہ حقائق سے واضح ہے کہ مختلف اسکیموں پر عمل درآمد کے بعد بھی آمدنی میں انٹر برانچ اور انٹرا برانچ میں نابرابری موجود ہے۔

گوشوارہ نمبر ۴۔ دونوں برانچ علاقوں میں استفادہ کرنے والوں کی آمدنی پر این۔ جی بینک کی مختلف اسکیموں کے اثر کو ذاتوں کے لحاظ سے پیش کرتا ہے۔ دیکھئے گوشوارہ نمبر ۴۔

دیکھا جا سکتا ہے کہ نالگونڈا اور نارکٹ پلی ایریا میں شیڈولڈ کاسٹ سے متعلق استفادہ کرنے والوں نے مختلف اسکیموں سے اعلا ترین آمدنی

حاصل کی ۔ لیکن نالگونڈا برانچ ایریا میں مستفید شیڈولڈ کاسٹ کم ازکم آمدنی حاصل کرسکے جب کہ نارکٹ پلی برانچ - - - - - ایریا میں این ۔ جی بینک کے ذریعہ نافذ اسکیموں سے مستفید او۔ بی۔ سی (OBCs) کو سب سے کم آمدنی ہوئی ۔ نارکٹ پلی اور نالگونڈا دونوں ایریا میں استفادہ کرنے والے او۔ بی سی کو زرعی سرگرمیوں سے اعلا ترآمدنی حاصل ہوئی اور مستفید ایس۔ سی کو زراعتی سرگرمیوں سے کم ازکم آمدنی ہوئی۔

دیگر پیشوں سے آمدنی کے وسیلہ کے مطابق مستفید ایس سی کو اعلاترین آمدنی اور مستفید ایس ٹی کو کمترین آمدنی نالگونڈا برانچ ایریا میں حاصل ہوئی جب کہ نارکٹ پلی برانچ ایریا میں بی سی مستفید کو اعلاترین آمدنی اور دیگر مستفید برادریوں کو کمترین آمدنی حاصل ہوئی ۔ مزدوری سے متعلق آمدنی کے پیش نظر مستفید ایس سی کو نالگونڈا برانچ ایریا میں اعلاترین آمدنی ہوئی اور مستفید او سی کی آمدنی اجرتی ذرائع سے کم تر ہوئی۔ نارکٹ پلی برانچ ایریا میں مستفید ایس سی کی آمدنی اجرتی ذرائع سے بڑھ کر ۴۰۱/۴ روپے سالانہ ہوگئی اور مستفید دیگر برادریوں کی آمدنی بڑھ کر ۲۹۶/۷ روپے سالانہ ہوگئی لیکن مستفید بی سی کی آمدنی میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوگی ۔

نالگونڈا اور نارکٹ پلی دونوں برانچ ایریا میں تمام زمروں سے متعلق رزاعت سے آمدنی میں اضافہ ہوا بالخصوص این جی بینک کے ذریعہ اسکیموں کو نافذ کرنے کے سبب ۔ دیگر پیشوں سے آمدنی میں کچھ زمروں سے متعلق کمی واقع ہوئی۔ یہ بھی مشاہدے میں آیا کہ دیگر پیشوں سے آمدنی میں حتی کہ اسکیموں کو لاگو کرنے کے بعد بھی اضافہ ہوا کیوں کہ کام کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ این جی بینک کے ذریعہ اسکیموں کو روبہ عمل لانے کے بعد اجرتی آمدنی میں کمی و بیشی سے متعلق یہی اسباب ہوسکتے ہیں ۔

مشورے

۱۔ چوں کہ این جی بینک کے مالی تعاون سے کے باعث استفادہ کرنے والوں کی آمدنی اور روزگار میں اضافہ ہوا ہے اس لیے مستقبل میں اس سلسلے کی برقراری اور توسیع کاری ضروری ہے خاص طور سے شہری یا نیم شہری علاقوں کے مقابلے میں دیہاتی علاقوں میں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔

۲۔ پیش نظر مطالعہ سے معلوم ہوا کہ پانچ ایکڑ سے زائد زمین کے حامل کسانوں کو چھوٹا کسان تصور کرکے بینک ایڈوانس دیا گیا جسے نظرانداز کردینا چاہیے۔

۳۔ کچھ استفادہ کرنے والوں کو شکایت ہے کہ قرضوں کی منظوری میں بہت زیادہ تاخیر ہوتی ہے اس ضمن میں مشورہ ہے کہ بغیر کسی التوا کے قرضے منظور کردیے جائیں۔

۴۔ این جی بینک کو متوقع قرض خواہوں میں ٹریننگ کے ذریعہ مہارت پیدا کرنی چاہیے تاکہ وہ قرضوں کا خاطر خواہ موثر طور پر استعمال کرسکیں اور انھیں واپس کرسکیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

فی کنبہ روزگار پر اثر ۔ زمرہ وار

استفادہ کرنے والوں کی شاخ/زمرہ	مستفید ہونے والے کنبوں کی تعداد	سال میں کام کے دنوں کی تعداد: اسکیم سے قبل	اسکیم کے بعد	اضافہ
(اے) نلگونڈا				
۱۔ چھوٹے کسان	۱۵	۴۷/۶	۶۸/۰	۲۰/۴ (۴۲/۸)
۲۔ اوسط کسان	۱۵	۳۷/۳	۴۸/۰	۱۰/۷ (۲۸/۶)
۳۔ چھوٹے تاجر	۱۵	۴۹/۳	۶۰/۶	۱۱/۳ (۲۲/۹)
۴۔ دیہاتی دست کار	۱۵	۲۲۲/۰	۲۴۹/۷	۲۷/۷ (۱۲/۴)
(بی) نارکٹ پلی				
۱۔ چھوٹے کسان	۱۵	۴۱/۳	۶۱/۰	۱۹/۷ (۴۷/۶)
۲۔ اوسط کسان	۱۵	۴۶/۴	۶۴/۰	۱۷/۴ (۳۷/۳)
۳۔ چھوٹے تاجر	۱۱	۹۲/۷	۱۴۷/۲	۵۴/۵ (۵۸/۷)
۴۔ دیہاتی دست کار	۹	۱۵۶/۶	۲۳۶/۶	۸۰/۰ ([illegible])

(بریکٹ میں اعداد متعلقہ تناسب کو پیش کرتی ہیں)

ذریعہ: QUESTIONNAIRE

گوشوارہ نمبر ۲

ہر گھر میں روزگار پر اثر = کاسٹ کے مطابق

استفادہ کرنے والوں کا زمرہ/شاخ	استفادہ کرنے والے گھروں کی تعداد	ایک سال میں کام کے دنوں کی تعداد: اسکیم سے قبل	اسکیم کے بعد	اضافہ
(اے) نلگونڈا				
۱۔ درج فہرست ذاتیں	۹	۱۲۸/۸	۱۶۴/۰	۳۵/۲ (۲۷/۳)
۲۔ درج فہرست قبائل	۸	۱۸۲/۵	۲۱۲/۵	۳۰/۰ (۱۶/۴)

۳- پسماندہ ذاتیں	۳۰	۷۶/۳	۹۲/۳	۱۶۱/۰ (۲۰/۹)
۴- دیگر ذاتیں	۱۳	۱۰۸/۰	۱۳۳/۰	۲۵/۰ (۲۳/۱)
(بی) نارکٹ پلی				
۱- درج فہرست ذاتیں	۱۵	۸۰/۶	۱۱۰/۰	۲۹/۴ (۳۶/۴)
۲- درج فہرست قبائل	-	-	-	-
۳- پسماندہ ذاتیں	۲۴	۸۳/۹	۱۳۶/۴	۵۲/۵ (۶۲/۶)
۴- دیگر ذاتیں	۱۱	۴۷/۷	۶۳/۶	۱۵/۹ (۳۳/۴)

(بریکٹ میں اعداد متعلقہ تناسب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں)
ذریعہ :۔ کوئسچینیئر

گوشوارہ نمبر ۳

فی کنبہ آمدنی پر۔ ذاتوں کے لحاظ سے

استفادہ کرنے والوں کا زمرہ/شاخ	زراعت سے آمدنی			دیگر پیشوں سے آمدنی			مزدوری آمدنی			تمام وسائل سے آمدنی		
	اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی
(اے) نلکونڈا												
۱- چھوٹے کسان	۲۲۲۶/۶	۵۸۲/۰	۳۳۸۳/۴ (۱۳۸/۸)	۱۶۹۲/۶	۲۴۰۹/۰	۷۱۶/۴ (۴۲/۳)	۲۳۸۴/۰	۲۱۲۰/۰	-۲۶۴/۰ (-۱۱/۰)	۶۵۱۳/۲	۱۰۳۴۹/۰	۳۸۳۵/۸ (۵۸/۸)
۲- متوسط کسان	۱۹۲۵/۰	۴۰۸۶/۶	۲۱۶۱/۰ (۱۱۲/۲)	۱۹۵۸/۳	۱۸۷۸/۳	۸۰/۰ (۴/۰)	۳۴۶۵/۶	۴۸۸۶/۰	۱۴۲۰/۴ (۴۰/۹)	۷۴۴۹/۵	۱۰۸۵۰/۹	۳۵۰۱/۴ (۴۷/۶)
۳- چھوٹے تاجر	۳۳۰/۰	۴۳۸/۶	۱۰۸/۶ (۳۲/۹)	۷۱۶۰/۰	۱۰۱۲۰/۰	۲۹۶۰/۰ (۴۱/۳)	۷۱۲/۰	۸۶۴/۰	۱۵۲/۰ (۲۱/۳)	۸۲۰۲/۰	۱۱۴۲۲/۶	۳۲۲۰/۶ (۳۹/۲)
۴- دیہاتی دست کار	۶۲۲/۶	۱۰۲۹/۳	۴۰۶/۷ (۶۵/۳)	۴۸۱۸/۶	۷۲۲۰/۶	۲۴۰۲/۰ (۴۹/۸)	۱۵۴۹/۳	۲۲۱۲/۰	۶۶۲/۷ (۴۲/۷)	۶۹۹۰/۵	۱۰۴۶۱/۹	۳۴۷۱/۴ (۴۹/۶)
(بی) نارکٹ پلی												
۱- چھوٹے کسان	۲۲۰۶/۶	۴۰۲۶/۰	۱۸۱۹/۴ (۸۲/۴)	۱۴۹۶/۶	۱۰۷۶/۶	-۴۲۰/۰ (-۲۸/۰)	۷۶۶/۴	۶۹۶/۰	-۷۰/۴ (-۹/۱)	۴۴۶۹/۶	۵۷۹۸/۶	۱۳۲۹/۰ (۲۹/۷)
۲- متوسط کسان	۱۹۶۷/۳	۴۶۲۶/۶	۲۶۵۹/۳ (۱۳۵/۱)	۷۹۸/۶	۷۹۸/۶	۲۵۴/۷ (۳۱/۸)	۱۱۶۰/۰	۱۹۴۸/۰	۷۸۸/۰ (۶۷/۹)	۳۹۲۵/۹	۷۶۲۷/۹	۳۷۰۲/۰ (۹۴/۲)

زمرہ/شاخ	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی
۳۔ چھوٹے تاجر	۴۸۳/۶	۷۰۹/۰	۲۲۵/۴ (۴۶/۹)	۴۷۲۷/۲	۹۸۲۷/۲	۵۱۰۰/۰ (۱۰۷/۸)	۵۲۰/۰	۵۴۵/۴	۲۵/۴ (۴/۸)	۵۷۳۰/۸	۱۱۰۸۱/۶	۵۳۵۰/۸ (۹۳/۳)
۴۔ دیہاتی دست کار	۴۶/۶	۶۶/۶	۲۰/۶ (۴۴/۲)	۲۸۲۲/۲	۴۷۳۳/۳	۱۹۱۱/۱ (۶۷/۷)	۳۹۵/۵	۵۳۳/۳	۱۳۷/۸ (۳۴/۸)	۲۲۶۴/۳	۵۳۳۳/۲	۲۰۶۸/۹ (۶۳/۳)

(بریکٹ میں اعداد متعلقہ تناسب کی طرف اشارہ کرتے ہیں)
ذریعہ:۔ کوئسچینئر

گوشوارہ نمبر ۴
فی کنبہ آمدنی پر اثر۔ ذاتوں کے لحاظ سے

استفادہ کرنے والوں کا زمرہ/شاخ	زراعت سے آمدنی			دیگر پیشے سے آمدنی			مزدوری سے آمدنی			تمام ذرائع سے آمدنی		
	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی	ماقبل اسکیم	مابعد اسکیم	انکریمنٹل آمدنی
(اے) نلکونڈا												
۱۔ درج فہرست ذاتیں	۴۴۶/۶	۱۰۵۰/۰	۶۰۳/۴ (۱۳۵/۱)	۲۳۵۸/۸	۴۱۰۰/۰	۱۷۴۱/۲ (۷۳/۸)	۳۷۷۶/۰	۵۵۹۳/۳	۱۸۱۷/۳ (۴۸/۱)	۶۵۸۱/۴	۱۰۷۴۳/۳	۴۱۶۱/۹ (۶۳/۲)
۲۔ درج فہرست قبائل	۱۹۰۰/۰	۳۲۷۲/۵	۱۳۷۲/۵ (۷۲/۲)	۳۳۸۰/۰	۴۳۸۸/۷	۱۰۰۸/۷ (۲۹/۸)	۲۷۱۵/۰	۳۶۷۱/۲	۹۵۶/۲ (۳۵/۲)	۷۹۹۵/۰	۱۱۳۳۲/۴	۳۳۳۷/۴ (۴۱/۷)
۳۔ پسماندہ ذاتیں	۱۰۱۳/۸	۲۳۱۲/۳	۱۲۹۸/۵ (۱۲۸/۰)	۴۴۵۹/۱	۵۹۳۳/۶	۱۴۷۴/۵ (۳۳/۰)	۱۶۲۲/۶	۲۰۸۴/۰	۴۶۱/۴ (۲۸/۴)	۷۰۹۵/۵	۱۰۳۲۹/۹	۳۲۳۴/۴ (۴۵/۵)
۴۔ دیگر ذاتیں	۲۲۱۳/۸	۵۰۴۷/۶	۲۷۳۳/۸ (۱۱۸/۱)	۴۱۰۷/۶	۵۷۲۳/۰	۱۶۱۵/۴ (۳۹/۳)	۱۳۲۹/۲	۶۹۲/۳	-۶۳۶/۸ (-۴۷/۹)	۷۷۵۰/۶	۱۱۴۶۲/۹	۳۷۱۲/۳ (۴۷/۸)
(بی) نارکٹ پلی												
۱۔ درج فہرست ذاتیں	۱۴۴۶/۰	۳۵۴/۰	۲۰۵۸/۰ (۱۴۲/۳)	۷۷۳/۳	۳۳۵۳/۲	۱۵۸۰/۰ (۲۰۴/۳)	۱۴۹۰/۶	۲۰۹۲/۰	۶۰۱/۴ (۴۰/۳)	۳۷۰۹/۹	۷۹۴۹/۳	۴۲۳۹/۴ (۱۱۴/۲)
۲۔ درج فہرست قبائل	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
۳۔ پسماندہ ذاتیں	۷۹۹/۵	۱۷۸۹/۱	۹۸۹/۶ (۱۲۳/۷)	۲۸۷۶/۲	۵۲۰۹/۵	۲۳۳۳/۳ (۸۱/۱)	۳۶۰/۰	۳۶/۰	-	۴۰۳۵/۷	۷۳۵۸/۶	۳۳۲۲/۹ (۸۲/۳)
۴۔ دیگر ذاتیں	۲۳۵۵/۴	۳۶۵۳/۶	۱۲۹۸/۲ (۵۵/۱)	۲۵۰۹/۰	۳۲۷۲/۷	۷۶۳/۷ (۳۰/۴)	۶۵۲/۳	۹۴۹/۰	۲۹۶/۷ (۴۵/۴)	۵۵۱۶/۷	۷۸۷۵/۳	۲۳۵۸/۶ (۴۲/۷)

(بریکٹ میں اعداد متعلقہ تناسب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں)
ذریعہ:۔ کوئسچینئر

محمد تبریز عالم

ملازمت پیشہ خواتین اور شیر خوار بچے

عورتوں میں روز بہ روز تعلیمی ترقی ایک خوش آئند پہلو ہے اور اسی طرح ان کے اندر خودکفالت کا جذبہ قابل ستائش ہے مگر اس کے ساتھ لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ ایک طرف اقتصادی صورت حال بہتر ہوتی جارہی ہے مگر دوسری طرف ایک ماں کا اپنے بچوں سے جو والہانہ تعلق ہونا چاہیے وہ مفقود ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت ماں اور اس کے ننھے بچوں کے درمیان جو مسائل رونما ہوئے ہیں اس سے معاشرہ کی حالت روز بہ روز دگرگوں ہوتی جارہی ہے۔

یہ سچ ہے کہ کسی بھی ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے صرف وہاں کے قدرتی وسائل کافی نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہاں کے افراد کی ذہنیت اور ان کے اندر وطنیت، قومی ہمدردی کا جذبہ اور احساس ذمہ داری کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی قدیم روایت یہ رہی ہے کہ گھر کا ایک فرد کماتا ہے اور بقیہ افراد کی کفالت کرتا ہے، مگر عصر حاضر نے اقتصادیات کی راہ میں ایک نیا نشان دکھایا، وہ یہ کہ ہر فرد جو کمانے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ اسی اقتصادی نظریہ کو عام کرنے کے لیے ہمارے ملک کا وہ گروپ میدان میں آیا جس کو صنف نازک کہہ کر گھر کی چہار دیواری تک محدود رکھا جاتا تھا۔ ہندوستانی معاشرہ اس صنف نازک کا احترام تو بہت کرتا تھا مگر اس کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ بھی گھر سے باہر ہاتھ پاؤں مار سکے۔ اپنا اور اپنے متعلقین کا معیار زندگی بلند کر سکے۔

مگر اس وقت صورت حال یہ ہے کہ خواتین کا نوکری پر جانا کہیں فیشن ہے تو کہیں مجبوری، کہیں وقت گزارنے کا ذریعہ ہے تو کہیں اعلا تعلیم کا استعمال، وجہ چاہے کچھ بھی ہو خواتین نوکری کے بہاؤ میں بڑی تیزی سے بہہ رہی ہیں۔ اس بہاؤ کو روکنا تو دشوار ہے ہی، اب ان سے گھر کی چہار دیواری میں رہنے کے لیے کہنا بھی دقیانوسیت ہے۔ لیکن ہم اپنے ننھے منے بچوں سے کیا کہیں جو کہ ماؤں کی نوکریوں کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت بے سہارا محسوس کر رہے ہیں۔ ان کے حقوق کو یہ مائیں کسی نہ کسی وجہ سے نظر انداز کر رہی ہیں۔

ملازمت پیشہ خواتین کے بچوں کی دنیا جاکر دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ ہر بچہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ "اگر تمہیں نوکری ہی کرنی تھی یا ہمارے لیے تمہارے پاس وقت ہی نہیں تھا تو ہمیں عدم سے وجود میں لانے کی غلطی کیوں کی؟" بچہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، غریب کا ہو یا امیر کا، سب کا ایک ہی نظریہ ہے کہ انھیں ان کی ماؤں کا نوکری پر جانا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ پھر بھی بڑے بچے موج حیات کے تھپیڑوں کو برداشت کر لیتے ہیں مگر شیر خوار بچے تو ماؤں کے سینوں سے لپٹ کر سونا چاہتے ہیں۔ اپنی ماؤں کی گود میں بیٹھ کر کھیلنا چاہتے ہیں۔ بچے اپنی پیاری ماں کے ہاتھوں کا بنا کھانا، کھانا چاہتے ہیں۔ کس طرح یہ ملازمت پیشہ مائیں اپنے بچوں کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں۔ ان بچوں کی شکایت میں کتنی سچائی ہے یہ جاننے کے لیے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

شاردا ایک اسکول میں نوکری کرتی ہیں۔ ان کا لگ بھگ دو سال کا ایک بیٹا ہے جیسے ہی شاردا تیار ہو کر جانے لگتی ہیں وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ ماں کہیں باہر جارہی ہے۔ "میں بھی بازار جاؤں گا" کہتے ہوئے ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ وہ معصوم یہ نہیں سمجھتا ہے کہ اس کے جسمانی اظہار بیاں سے ماں کی کلف لگی اور پریس کی ہوئی ساڑی میں سلوٹیں پڑ گئی ہیں یا ہاتھوں کی گندگی ساڑی میں لگ گئی ہے وہ تو کہیں سے بھی ساڑی پکڑ کر لٹکنے لگتا ہے۔ ایک تو ساڑی کی حالت کو دیکھ کر دوسرے اسکول جانے میں تاخیر کی وجہ سے شاردا کا دماغ گرم ہو جاتا ہے اور جھٹ سے ایک تھپڑ بچہ کے گال پر رسید کر دیتی ہیں۔ "چل چھوڑ مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے" کہتے ہوئے وہ بچہ کو دور ڈھکیل دیتی ہیں۔ کبھی تو بچہ دور ہو کر بیٹھا روتا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ بھی ضد پر آجاتا ہے اور ماں کی ساڑی کو اور مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر شاردا بھاگتے ہوئے گھر سے باہر جاتی ہیں۔ بچہ کافی دیر تک اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا رہتا ہے اور یہ آنسو کوئی معمولی آنسو نہیں ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایسے بچوں کو اپنی ماؤں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ ہماری مائیں اتنی بے رحم کیوں ہیں؟ وہ ہم سے پیار کیوں نہیں کرتی ہیں؟ ہمیں روزانہ اس طرح کیوں چھوڑ جاتی ہیں؟ ہم ماں کے آغوش میں میٹھی نیند سونا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے

---

۲۰۲ ۔ ستلج ہوسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی۔ ۶۷

دودھ پینا چاہتے ہیں۔ ہمیں ماں کی نوکری سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمیں اپنا حق چاہیے۔

دوسری مثال راجو کی ہے۔ آٹھ ماہ کا راجو اپنی ماں کے سینہ سے لپٹا رہنا چاہتا ہے۔ راجو دھیرے دھیرے آرام سے دودھ پیتا ہے۔ کبھی دودھ پی کر سینہ سے الگ ہو کر وہ ہنسنے لگتا ہے اور کبھی کبھی ہاتھ پیر چلا کر کھیلنے لگتا ہے۔ اس پیاری اور معصوم شرارت پر اگر کوئی دوسری ماں ہوتی جو گھر سے باہر ملازمت کرنے نہیں جاتی ہے تو خوشی سے باغ باغ ہو اٹھتی۔ مگر یہاں ملازمت پیشہ ماں غصّے سے جھنجھلا جاتی ہے اور با دل ناخواستہ سینے سے لگاتی ہے اور بڑبڑاتے ہوئے دودھ پلاتی ہے۔ اس ماں کو کیا معلوم کہ یہ بچہ اس کی ترش روئی کو خوب سمجھتا ہے اور کمسنی کی وجہ سے "بغاوت" ملتوی کر دیتا ہے۔ ماں کہتی ہے "چل جلدی سے پی ورنہ آج بھی دیر ہو جائے گی" اگر اس کے بڑبڑانے سے بچہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے تو بولے گی "چل چھوڑ نہیں پینا ہے تو ہر دم پریشان کیوں کرتا رہتا ہے" اب اِدھر تو ماں اسے اپنے سے چھڑانا چاہتی ہے، اُدھر بچہ چھوڑتا ہی نہیں ہے۔ زور زبردستی ہونے پر بچہ چیخ چیخ کر رونے لگتا ہے مگر ہائے رے نوکری! بھوکے اور روتے اور بلکتے راجو کو چھوڑ کر ماں دفتر چلی جاتی ہے۔ کیوں کہ دیر ہونے پر بس نہیں ملے گی، دفتر تاخیر سے پہنچنے پر اس کے خلاف کارروائی ہو جائے گی یا افسر کی دو چار باتیں سننی پڑیں گی۔

آپ کی کچھ بھی مجبوریاں ہوں مگر بچوں کو اس سے کیا مطلب۔ انھیں تو دن میں کئی بار ماں کا دودھ چاہیے اس کی ممتا اور پیار چاہیے جو کہ ان کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن یہ ملازمت پیشہ خواتین (مائیں) ایمانداری سے اپنے فرض کو نہیں نبھا پاتیں۔

حال ہی میں ہمارا ایک اسکول میں جانا ہوا وہاں نرسری کلاس کے بچوں سے جب ہم نے پوچھا "تمہیں اپنی ماں کا نوکری پر جانا کیسا لگتا ہے؟" تو ایک بھی بچہ ایسا نہیں نکلا جس نے یہ کہا ہو کہ "ہاں ہمیں ماں کا نوکری پر جانا اچھا لگتا ہے" بلکہ ایک بچی نے کہا کہ مجھے اسکول سے گھر جانے پر دروازہ پر لٹکا تالا اچھا نہیں لگتا ہے۔ دیپک نے کہا ماں جانے کی جلدی میں میری پسند کا ناشتہ نہیں بناتی ہے، آصفہ کہتی ہے ماں آتے ہی ہم پر غصہ کرنے لگتی ہے، کچھ بچوں نے یہ شکایت کی کہ ہماری مائیں ہمیں باہر گھمانے نہیں لے جاتی ہیں۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر بچہ اپنی ماں کو گھر میں ہی دیکھنا چاہتا ہے مگر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ ماہر نفسیات کی رائے بھی یہی ہے کہ بچوں کی صحیح نشوونما کے لیے ماں کا پیار اور ممتا ضروری ہے۔ دو دن کا بچہ بھی پیار کی زبان سمجھنے لگتا ہے۔ چھوٹی عمر میں ہی اسکول بھیجنا بھی اس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ کتابوں کے بوجھ سے بچوں کا صرف جسم ہی نہیں ذہن بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ کم پیسے میں گھر کو چلانا زیادہ اچھا ہے۔ لیکن آج صاحب حیثیت بننے کے لیے ملازمت کرنا عام طور پر خواتین کا شغل بن گیا ہے۔ ہاں اگر شوہر کے نہ رہنے کی وجہ سے نوکری کرنی پڑے تو بات دوسری ہے کیوں کہ ایسی حالت میں سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ماں کے اقتصادی تقاضے ہیں تو دوسری طرف بچے کی بشری ضروریات۔ دونوں کی بیک وقت تکمیل ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس دشواری کا ایک متوازن حل پیش کرنا عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے۔

●

بقیہ: عظیم مجاہد آزادی: چندر شیکھر آزاد

گرفتار کرنے والے کو ۳۰ ہزار روپے کا انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چندر شیکھر پولیس کی گرفت سے آزاد رہا۔ ۸ ستمبر ۱۹۲۸ء کے دن دہلی میں انقلابی پارٹی کی میٹنگ میں چندر شیکھر آزاد کو ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کے ملٹری ونگ کا کمانڈر بنایا گیا۔ لالہ لاجپت رائے کی موت کا انتقام لینے کے لیے چندر شیکھر آزاد نے بھگت سنگھ اور راج گرو کے ساتھ مل کر ایک اسکیم بنائی۔ جب بھگت سنگھ نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس جے۔ پی سانڈرز کو لاہور میں گولی ماری چندر شیکھر آزاد بھگت سنگھ کے ساتھ تھے۔ ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو سینٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں بم پھینکنے کا پلان بھی چندر شیکھر آزاد کا تھا۔ اگلے لگ بھگ دو سال تک وہ "انڈر گراونڈ" رہے لیکن پولیس نے ان کی تلاش متواتر جاری رکھی۔

۲۷ فروری ۱۹۳۱ء کے دن صبح ساڑھے نو بجے جب چندر شیکھر آزاد اپنے ایک ساتھی سے ملنے کے لیے الفریڈ پارک الہ آباد میں گئے تو کسی غدار نے اس میٹنگ کی خبر پولیس کو پہلے سے ہی دے دی تھی۔ سارے پارک کو پولیس نے گھیر لیا۔ ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر اکیلے آزاد پولیس پر گولیاں چلاتے رہے۔ کئی پولیس کے سپاہی زخمی کیے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس ناٹ بویر (NOTT BOWER) کو بھون دیا۔ لیکن خود ان کے ہاتھ، پاؤں اور سینہ گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب کوئی اور راستہ نہیں رہا تو پستول کو اپنی کنپٹی تک لے گئے۔ ان کو اپنے بچپن کا عہد یاد آ گیا کہ وہ انگریز کی گولی سے نہیں مریں گے۔ اپنی آخری گولی سے اپنے آپ کو گولی ماری اور امر شہید ہو گئے۔ آخری رسوم رسول آباد گھاٹ پر پولیس کی نگرانی میں سرانجام دی گئیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ آج الفریڈ پارک کا نام "آزاد پارک" ہے اور سارا ملک ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی نام و نشاں ہو گا

چندر شیکھر آزاد کسی فرد کا نام نہیں ہے بلکہ بذات خود ایک "انقلاب" کا نام ہے، ایک جذبے کا نام ہے۔ آج چندر شیکھر آزادی کی علامت ہے۔ چندر شیکھر آزاد جیسے بہادر حب الوطن انقلابی سیکڑوں سالوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اپنی چھوٹی سی عمر میں ایسے کام کر جاتے ہیں جو صدیوں یاد رہتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عظیم اقبال

پولیو

آپ نے ایسے بچوں اور سیانوں کو بار ہا دیکھا ہوگا، جن کے لیے یکبارگی آپ کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہوگا اور جن کی بہتر زندگی کے لیے آپ دعا گزار ہوتے ہوں گے۔ یہ لوگ پولیو زدہ ہوتے ہیں۔ پولیو کا نشانہ کوئی مخصوص علاقہ یا خطہ نہیں، بلکہ ساری دنیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں ایک نوجوان امریکی ڈاکٹر جس کا نام جوناس سالک (JONAS SALK) تھا، جامعہ پٹس برگ (PITSBURG) میں پولیو کے زہریلے مادہ کے مطالعہ کے لیے ایک منصوبے کا سربراہ بنایا گیا۔

اس عارضے کا پورا نام پولیو مائی لیٹس (POLIO MYELITIS) ہے۔ بچوں کے فالج کے طور پر بھی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ جس زہریلے مادے سے لاحق ہوتا ہے، اس کا نام ENTERO VIRUS ہے۔ یہ راست حرکات کے اعصابی نظام پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اس سے عام طور سے پیروں اور بازوؤں کے پٹھے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر اس سے تنفس کے اعضاء متاثر ہو جائیں تو ہلاکت بھی ہو سکتی ہے۔

ان دنوں ریاست ہائے متحدہ میں باقی ماندہ دنیا کی طرح ہر سال ہزاروں بچے پولیو کا شکار ہو جاتے تھے۔ زیادہ تر شکار تو ہلاک ہو جاتے تھے، لیکن زندہ بچ رہنے والے تا حیات مفلوج رہتے تھے۔ اس کی ایک مثال سابق امریکی صدر ایف۔ ڈی روزویلٹ (۱۹۴۵ء - ۱۸۸۲ء) کی ہے، جنھیں ۱۹۲۱ء میں یہ مرض لاحق ہوا اور اپنی باقی ماندہ زندگی وہ لنج رہے۔

اس بیماری کا آغاز گلے میں خراش اور کبھی کبھی قے سے بھی ہوتا ہے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں اس کی کوشش جاری رہی کہ پولیو کا کوئی با اثر ٹیکہ (VACCINE) تیار کیا جائے، لیکن کسی کو اس سلسلے میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

سالک نے پولیو کے ٹیکے پر تحقیق شروع کی اور اسے تیار کرنے کی انتھک تگ و دو کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے اعلان کیا کہ انھوں نے ایک ٹیکہ بنا لیا ہے اور اس کی آزمائش کے لیے وہ تیار ہیں۔ ٹیکے میں پولیو کو پیدا کرنے والے زہریلے مادے (VIRUS) تھے، جنھیں خاص دواؤں FORMALDEHYDE SOLUTION کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اسے یہ امید تھی کہ جب ہلاک شدہ مادے جسم میں داخل ہوں گے تو ان سے مخالف اجسام (ANTI BODIES) کی افزائش ہوگی اور بالآخر یہ جسم پر حملہ آور زندہ زہر آلود مادوں کے لیے روک ثابت ہوں گے۔

پہلے پہل ٹیکہ لینے والوں میں سالک، ان کی اہلیہ اور ان کے بیٹے شامل تھے۔ ۱۹۵۴ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ٹیکے کی آزمائش بڑے پیمانے پر کی جائے۔ پہلے تو والدین اپنے بچوں کو ٹیکہ دلوانے کے لیے رضامند نہ تھے، کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ کہیں اس سے بیماری سے تحفظ کے بجائے بیماری لاحق نہ ہو جائے۔ سالک نے ٹیلی ویژن پر آ کر ٹیکے کی عمل آوری کی تشریح کی اور والدین سے تعاون کی گزارش کی۔ اس کے بعد ۴۰ ہزار بچوں کو ٹیکہ لگایا گیا۔ یہ با اثر اور محفوظ ثابت ہوا۔

عمومی طور پر یہ بچوں کی بیماری ہے، لیکن اس کا حملہ سن بلوغت میں بھی ہو سکتا ہے، اگر اس سے بچاؤ کا ٹیکہ بچپن میں نہ لیا گیا ہو۔

اگلے سات سالوں میں ریاست ہائے متحدہ سے پولیو کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۶۰ء میں ایک دیگر امریکی، جس کا نام البرٹ بیسن (ALBERT BASIN) تھا، نے پولیو کا ایک ایسا ٹیکہ، جسے منھ کے ذریعہ دیا جا سکتا تھا، ایجاد کیا۔ یہ پہلے ٹیکہ سے زیادہ آسان تھا اور اس کا اثر بھی دیرپا تھا۔

ان دو ٹیکوں کے استعمال سے دنیا کے بیشتر حصوں سے پولیو کا صفایا کیا جا چکا ہے۔

کوئی وبا ہو، بیماری ہو یا عارضہ ہو، یہ بنی نوع انسان پر قہر الٰہی ہرگز نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی اور ہماری آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں سرخرو ہونے کے لیے ہمیں تگ و دو کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف اسی حالت میں ہم انسان مخالف قوتوں کو شکست دینے کے اہل بن سکتے ہیں۔

گنج ۲، بتیا - ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

روی داس۔ ایک عظیم سنت

قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان میں احیاء پسندی کی تحریک روشن دماغ راما نند نے شروع کی تھی اور ان کے مساوی دوسرے عظیم گورو کو ان نے اسے آگے بڑھایا تھا۔ لیکن اس تحریک کو چار چاند اس وقت لگے جب اس نے پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک موچی سنت کو جنم دیا جس کی یاد آج تک عوام کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہے۔

پیشہ سے موچی روی داس نے سنت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے قدامت کی دیواریں توڑ دیں۔ گورو کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے انھیں سماجی نظام کے خلاف بغاوت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی اور ان کی زبردست روحانی طاقت نے برہمن اسکالروں تک کو ان کے بلند رتبہ کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا۔

عظیم گورو کے شاگرد

روی داس خوش قسمت تھے کہ انھیں کو اپنے دور کے عظیم سنت راما نند کی شاگردی نصیب ہوئی۔ وہ برہمن تھے مگر پہلے شخص تھے جنھوں نے برہمنوں کی برتری کو چیلنج کیا۔ انھوں نے اچھوتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ انھیں مندروں میں داخل ہونے نیز گورو بننے کی بھی اجازت دی اور اس طرح ذات پات کے تنگ نظریہ کو خارج کر دیا۔ روی داس بھی اپنے عظیم گورو کے اہم شاگردوں میں شامل ہو گئے۔

عظیم روحانی طاقت

گورو روی داس نے عظیم روحانی طاقت حاصل کر لی تھی اس کی تصدیق بہت سی عصری باتوں سے ہوتی ہے۔ ایک بار ایک ایسی جگہ پر، جہاں ان کو دعوت دی گئی تھی، بہت سے پنڈت بھی موجود تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ روی داس بھی ان کے ساتھ شریک طعام ہوں گے تو انھوں نے اس دعوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ کسی ناخوشگوار واقعہ سے بچنے کے لیے گورو روی داس نے بھی ظاہری طور پر اس دعوت میں شرکت سے گریز کیا۔ جب برہمن کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو انھیں یہ نظر آیا کہ ہر دو برہمنوں کے بیچ میں روی داس بیٹھے ہوئے ہیں۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور تمام برہمنوں نے گڑگڑا کر ان سے معافی مانگی اور ان کے پیر چھوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے فوراً بعد روی داس نے ان سے کہا کہ پاکیزگی مقدس دھاگے میں نہیں بلکہ آدمی کے دل میں ہوتی ہے کیوں کہ پاک صاف دل ایشور کا مسکن ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی جلد کاٹی اور اس کے نیچے موجود مقدس دھاگہ ان تمام برہمنوں کو دکھا دیا۔

بلند پایہ سنت

روی داس کو بنیادی طور پر سنت کا مرتبہ ان کی زبردست بھگتی اور روحانی افکار کی واضح تفہیم سے حاصل ہوا۔ ایشور میں ان کے زبردست یقین اور ان کی کراماتی طاقتوں کی وجہ سے ان کے بہت سے پیروکار بن گئے جن میں سے زیادہ تر لوگوں کا تعلق خود ان کی ذات یا فرقہ سے تھا۔ ان لوگوں نے ایشور بھگت کے طور پر ان کا احترام کیا اور ان کو وہی مرتبہ دیا جو ان کے آبا و اجداد صدیوں سے برہمنوں کو دیتے آ رہے تھے۔

روی داس ایک کراماتی شخصیت کے مالک تھے۔ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ بغیر کسی مشکل کے بیماروں کو شفا سے ہمکنار کر دیتے تھے۔ انھوں نے ایسے بہت سے مریضوں کو شفا عطا کی جن کو معالجین بھی اچھا نہ کر سکے تھے۔ رحم دل سنت نے سب کو راحت پہنچانے کی کوشش کی۔ اس بات کا ریکارڈ موجود ہے کہ وہ کوڑھ جیسی بیماری سے بھی نجات دلا دیتے تھے۔

روی داس کی زندگی سے بہت قصے اور کہانیاں وابستہ ہیں مثلاً یہ کہ ان کی انتہائی غریبی کو دیکھتے ہوئے ایک روحانی شخص نے آکر انھیں کچھ رقم دی۔ جب وہ شخص دوبارہ ان کے پاس آیا تو اسے پتا چلا کہ روی داس نے اس رقم کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ جب سنت کے سامنے رقم رکھی گئی تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اسے یاتریوں کے لیے ایک سرائے کی تعمیر پر خرچ کر دیا جائے۔

مخلص عبادت گزار

روی داس ایشور ہر جگہ ہے کے نظریہ میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں اہم چیز ایشور تھی اور جسم کے علاوہ انسان اور ایشور میں کوئی فرق نہیں تھا۔ روی داس کے مطابق روح

اور ایشور میں صرف فرق ہے کہ وہ کسی جسم میں قید ہے۔ ایشور سب کچھ ہے۔ یہ تمام برے جذبات سے بلند تر ہے اور پوری توجہ اور لگن سے اس کی عبادت کی جانی چاہیے۔ روی داس نے بدی سے نیکی تلاش کی، اچھے کاموں کو پسند کیا اور جن باتوں کی ممانعت تھی ان سے گریز کیا۔

انھوں نے ایشور کی تعریف میں اشعار بھی کہے جو ابھی تک عوام میں مقبول ہیں۔ ان کے تین سے زیادہ اشعار کو مقدس گرنتھ صاحب میں جگہ ملی۔ یہ تمام بھگتی کے گیت ایشور کے تعلق سے سنت کے ذہن کے عکاسی کرتے ہیں۔

اگر تم پہاڑ ہو تو میں مور ہوں۔
اگر تم چاند ہو تو میں چکور ہوں۔
اگر میں تم سے ناتہ توڑ دوں تو پھر کس سے جوڑوں۔
اگر تم چراغ ہو تو میں بتی ہوں۔
اگر تم تیرتھ استھان ہو تو میں تیرتھ یاتری ہوں۔
تم سے ناتہ جوڑنے کے لیے میں نے سب سے ناتہ توڑ لیا۔
میں جہاں بھی جاتا ہوں تمہاری ہی سیوا کرتا ہوں۔
تمہارے جیسا کوئی دوسرا آقا نہیں۔
تمہاری پوجا کر کے موت کا پھندا کٹ جاتا ہے۔
روی داس تمہاری ہی خدمت کے گن گاتا ہے۔

سنت روی داس کی گہری بھگتی اور روحانی طاقت کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ ہزاروں لوگ ان کے عقیدت مند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی گفتگو اور شاعری سورج کی طرح تھیں جو شبہات کی تاریکی دور کر دیتی تھیں جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ روی داس کی بہت سی شعری تخلیقات گورو گرنتھ صاحب میں پائی جاتی ہیں۔ خاص طور پر ان کی ایک شعری تخلیق سے ایشور سے ان کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔

بھگتی تحریک

ہندوستان کے روحانی افق پر گورو روی داس کا پندرہویں صدی میں رونما ہونا ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تھا۔ یہ بھگتی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا جس نے ایک موچی کے بیٹے کو بطور گورو عوامی مقبولیت دی۔ اس زمانہ کے دوسرے سنت بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ کبیر نے بھی اپنے بہت سے دوہوں میں ان کی روحانی صفات کی تعریف کی ہے۔

سنت روی داس کی روحانی طاقت دور دور تک مشہور ہو گئی تھی۔ ان کا احترام اس درجہ تھا کہ چتوڑ کی مہارانی نے ان کے پاؤں چھوئے اور ان کی شاگرد بن جانا پسند کیا۔ ہندوستان کی عظیم سنت میرا بائی نے بھی ان کی رہنمائی ہی میں اپنی روحانی تعلیم مکمل کی تھی۔

امر سنت

روی داس شمال ہندوستان کے ممتاز روحانی رہنماؤں میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کا مستقل کام آج بھی زندہ ہے۔ ان کے نام سے موسوم ایک اہم واشنو طبقہ بھی ہے جو روی داس کہلاتا ہے جس میں چمڑے کا کام کرنے والے لوگ بہت بڑی تعداد میں شامل ہیں جو صرف نظریاتی طور ہی پر سہی مگر اس عقیدہ کو مانتے ہیں کہ "ایک قادر مطلق ایشور ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے اور صرف اس کی عبادت صحیح ہے۔" اس فرقے کے لوگوں کی تعداد رامانند اور کبیر پنتھیوں کی تعداد کے بعد سب سے زیادہ ہے۔

اس طرح روی داس نے سماج کو اس وقت بیدار کیا جب وہ ترقی کے انتہائی اہم دور سے گزر رہا تھا۔

●

بقیہ: اقلیتی تعلیمی ادارے: آئینی حقوق اور ذمہ داریاں

آف انڈیا میں اپنے حالیہ تاریخی فیصلے میں یہ واضح طور پر فرمایا ہے کہ اقلیتی ادارے اپنی ۵۰ فی صد نشستیں اقلیتی بچوں کے حق میں محفوظ کر سکتے ہیں مگر یہ تحفظ بھی امیدواروں کی قابلیت کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ باقی ۵۰ فی صد نشستیں بھی دوسرے امیدواروں کے لیے کھلی ہوں گی۔ فاضل جج نے کہا کہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے ادارے میں داخل کرا سکیں تاکہ ادارے کا اقلیتی کردار برقرار رہ سکے۔ یہ حق شق نمبر ۳۰ (۱) اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا لازم حصہ ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو اقلیتی اداروں کا وجود ہی بے کار ہوگا۔ عدالت اس سلسلے میں اپنی پرانی نظیر (بالاجی راؤ کیس) پر کاربند رہی جس میں کہا گیا تھا کہ کہیں بھی نشستوں کا تحفظ کسی بھی حالت میں ۵۰ فی صد سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ ۵۰ فی صد سے زیادہ تحفظ غیر آئینی ہے۔ اسی سلسلے میں عدالت نے آگے کہا کہ اقلیتی ادارے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں اس لیے ان کے نظم و نسق چلانے کے حق پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی ہے جس سے یہ شناخت ختم ہوتی ہو، کم ہوتی ہو یا مجروح ہوتی ہو۔ اس طرح کی کوئی پابندی غیر آئینی ہے۔

دوسرے بنیادی حقوق کی طرح آئینی حقوق بھی مطلق العنان نہیں ہیں۔ ان پر بھی حکومت پابندی عائد کر سکتی ہے مگر یہ ضروری ہے کہ یہ پابندی تنظیمی ([illegible]) ہو ایسی نہ ہو جس سے شق نمبر ۳۰ (۱) کے تحت حاصل حقوق میں رخنہ اندازی ہوتی ہو۔ ایسے سرکاری ضابطے یا قوانین جو ادارے کے تعلیمی معیار کو بلند کرتے ہوں۔ نظم و ضابطگی اور صحت و تندرستی میں معاون ہوں، اخلاقی کردار کے فروغ اور ایک اچھا نظام دینے کی غرض سے جاری کردہ ہوں قانونی طور پر درست اور اداروں پر واجب التعظیم ہیں۔

●

بقیہ: تحریک آزادی میں تحریک عدم تعاون کی اہمیت

یہ تحریک یوں تو ختم ہو گئی لیکن اس کے جو اثرات برطانوی حکومت پر مرتب ہوئے وہ باقی رہے اور اخیر وقت تک اپنا کام کرتے رہے۔ یہ ایسی قوت ثابت ہوئی کہ جس کے آگے انگریزوں کا سارا زور سرنگوں ہو گیا۔ حکومت نے ہندوستانیوں پر بربریت کے پہاڑ توڑ دیے، اپنا ہر حربہ استعمال کر لیا، پھر بھی اسے شکست کھانا پڑی۔ بے شک اس تحریک نے ہندوستانیوں کو جو قوت، جو جرأت اور جو عزم و ہمت دی تھی وہی حصول آزادی کا باعث بنی۔

سوامی وویکانند ۔ دائمی سچ کی تلاش

سوامی وویکانند کا جنم ۱۲ جنوری ۱۸۶۳ء کو ہوا۔ ان کا نام نریندرناتھ تھا اور وہ وشوناتھ اور بھونیشوری دیوی کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دن انھوں نے کلکتہ کے درمیانہ درجہ کے ماحول میں گزارے۔ ان کی زندگی پر مشرقی اور مغربی فلسفوں، راجہ رام موہن رائے اور بنکم چندر چٹرجی کے خیالات، ایشور چندر ودیاساگر کی حیات اور سوامی رام کرشن پرم ہنس کی اعلا و ارفع تعلیمات کی گہری چھاپ پڑی۔

جب وہ صرف آٹھ برس کے تھے تو ایک مذہبی تیوہار کے دوران انھوں نے ایک چوہے کو وہ پرساد کھاتے دیکھا جو ایک مورتی پر چڑھایا گیا تھا۔ نریندر کو حیرت ہوئی اور انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ سروشکتی مان ایشور اس چھوٹی سی مخلوق کو متبرک پرساد کھانے سے روکنے کے قابل کیوں نہیں ہے۔ اس دن سے ایشور میں ان کا عقیدہ ختم ہوگیا اور بت پرستی کے سلسلے میں وہ تشکیک میں مبتلا ہو گئے۔

سچ کی تلاش

انھوں نے بہت کم عمری ہی میں روحانیت اور انسانیت کی صفات کا مظاہرہ کیا۔ سچ کی جستجو میں وہ الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ فلسفیوں، سنتوں، مذہبی رہنماؤں اور بہت سے سماجوں میں شرکت کرتے ہوئے انھوں نے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ ایک بار وہ رام کرشن کے پاس گئے اور ان سے بھی وہی سوال کیا جو وہ پہلے بھی ہر عالم سے کر چکے تھے اور اطمینان بخش جواب نہ پا سکے تھے۔ سوال تھا "کیا آپ نے ایشور کو دیکھا ہے"۔ "ہاں میں نے" جواب ملنے پر وہ حیران ہو گئے۔ اس بے ساختہ جواب نے ان پر ایک پوری نئی دنیا کا دروازہ کھول دیا۔ سوامی رام کرشن نے ان کے اندر انسان میں ایشور کو دیکھنے اور انسانوں کی خدمت کو سب سے بڑی عبادت ماننے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ سوامی جی نے انھیں کالی کی پوجا کرنے کے لیے آمادہ کر دیا اور انھیں بت پرستی کے باطنی معنی "توجہ اور بھکتی کے ذریعہ" سے آشنا کر دیا۔ سوامی رام کرشن نے انھیں وویکانند کا نام دیا اور اپنے چیلوں میں سے مستقبل کے روحانی قائد کے طور پر ان کا انتخاب کیا۔

سوامی وویکانند نے سات سال تک ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا اور ہندوستانی عوام کی بے انتہا غریبی کا مشاہدہ کیا۔ عالمی تاریخ کے گہرے مطالعے نے انھیں ان طریقوں کی تلاش میں مدد دی جن پر عمل کر کے ان کے گورو کے نظریہ سرومکتی یعنی سب کی نجات کو عملی شکل دی جا سکے۔ درحقیقت ان کے غیر ملکی دوروں کا مقصد جزوی طور پر ہندوستان کے قدیم روحانی طریقہ کی عظمت کی تبلیغ اور جزوی طور پر کروڑوں مصیبت زدہ ہندوستانیوں کے لیے مادی امداد حاصل کرنا تھا۔

مذاہب کی پارلیمنٹ

امریکہ کے اپنے پہلے دورہ کے دوران انھوں نے ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں منعقدہ مذاہب کی پارلیمنٹ میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ جب انھوں نے تقریر کی تو "مغرب میں ہندوازم کے بارے میں مغرب کے بڑے بڑے مذہبی مفکروں کے اذہان میں پرورش پا رہے تمام غلط تصوروں کو مشرق کے سادھو نے بہا کر ایک طرف کر دیا"۔ منٹوں ہی میں انھوں نے مندوبین کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی اپنے اچھوتے خیالات سے انھیں محو حیرت کر دیا۔ ان کا پیغام تھا آفاقیت، بھائی چارہ اور سب کے لیے نجات۔

سوامی جی نے اس بہترین مذہب کی نمائندگی کی جس کا عقیدہ انسان کی جسمانی اور ذہنی بلندی سے عبارت ہے۔ انھوں نے کہا "کھڑے ہو جاؤ، بے خوف بنو، مضبوط بنو، تمام ذمہ داریاں اپنے شانوں پر اٹھا لو اور جان لو کہ اپنی تقدیر کے تم خود خالق ہو"۔ جب مذاہب کی پارلیمنٹ اختتام کو پہنچی تو بہت سے شرکا ان کے پیروکار ہو چکے تھے۔

حالیہ تاریخ میں انسان کے ضمیر کو جتنی شدت کے ساتھ سوامی وویکانند نے جھنجھوڑا، کسی اور نے اتنی شدت سے نہیں جھنجھوڑا۔ ان کی تعلیمات نے ہمارے ملک کے لیڈروں اور عوام کی ایک پوری نسل کو اپنی بہترین صلاحیتوں کو صرف کرنے پر آمادہ کیا۔

سوامی جی کے عقائد

سوامی جی کا عقیدہ تھا کہ فکر و عمل کی آزادی زندگی، ترقی اور خوشحالی کی واحد شرط ہے۔ ان کے خیال میں ایک آزاد اور بے خوف کردار کا انسان فراخ دلی اور محبت کی دنیا کی امید ہے۔ انسان کی کایا پلٹ ہی سماج کی تمام خرابیوں کا علاج ہے۔

ان کا قول تھا کہ ظالمانہ سماجی قاعدوں کو ختم کر دینا چاہیے وہ مصنوعی اور میکانکی قوانین کے خلاف تھے جو کسی فرد کی آزادانہ اور بے روک ٹوک ترقی میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ مگر وہ "دھرم" یا اخلاقی قوانین کے مخالف نہیں تھے۔ انھوں نے ہمارے دوامی "دھرم" کی فعالیت اور مطابقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

انھوں نے دریافت کیا کہ حقیقی قوم جو گاؤں میں رہتی ہے اپنی انسانی خصوصیات اور انفرادیت سے محروم ہو چکی ہے۔ جب اسے تعلیم کے ذریعے واپس لے آیا جائے گا تو عوام پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مسائل کا سامنا کریں گے اور ان کو حل بھی کر لیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ماں بہترین معلم ہے۔ جب تک عورتوں کی حالت بہتر نہیں ہو گی اس وقت تک دنیا کی بہبود کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ان کے مطابق تعلیم بے ترتیب ذہن کو حقائق سے آگاہ نہیں کر رہی ہے۔ یہ اطلاعات کی فراہمی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ انھوں نے تعلیم کو صحیح انداز میں سوچنے نیز پوری قابلیت اور لیاقت سے کام کرنے کی تربیت کا نام دیا اور کہا کہ آفاقی مذہب ہی تعلیم کی حقیقی بنیاد ہے۔ ان کا خیال تھا کہ عوامی طور پر مقبول انداز میں دیسی زبانوں میں تعلیم دینی چاہیے۔ اگر غریب تعلیم تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تو تعلیم کو اس کے پاس کھیتوں میں، فیکٹریوں میں پہنچایا جانا چاہیے۔

رام کرشن مشن

لوگوں میں سائنٹفک مزاج پیدا کرنے کے لیے اور بالآخر "سب کے لیے نجات" کے سری رام کرشن کے نظریہ کی تبلیغ کرنے کے لیے سوامی وویکانند نے یکم مئی ۱۸۹۷ء کو رام کرشن مشن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد تھے۔۔۔ لوگوں کو اس طرح کی تربیت دینا کہ وہ دوستوں کو سائنس کے اس علم سے آشنا کر سکیں جو عوام کی مادی اور روحانی بہبود کے لیے مفید ہو، آرٹس اور صنعتوں کو فروغ دینا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا، ویدانتی اور دوسرے مذہبی خیالات کو پیش کرنا اور پھیلانا۔ اس کے نتیجہ میں دو ممتاز اداروں۔۔۔ رام کرشن مٹھ اور رام کرشن مشن کی الگ الگ سرمایے اور حسابات کے ساتھ تشکیل ہوئی ان میں سے اول الذکر سادھوؤں کی تربیت کے لیے اور ثانی الذکر خیراتی کاموں کے لیے تھا۔ کلکتہ کے نزدیک گنگا کے کنارے واقع بیلور مٹھ رام کرشن مت کے صدر مقام کے طور پر کام کرتا ہے۔

اپنے گورو کے نام پر ادارہ قائم کرنے کے بعد سوامی جی بہ مشکل ۵ سال زندہ رہے۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال انھوں نے لوگوں کو ایک ایسا نیا سماج بنانے کی ترغیب دینے پر صرف کیے جس کی ریڑھ کی ہڈی سچا دھرم ہو۔ دونوں تنظیمیں، جن کی ۱۴۰ مرکزوں کے ساتھ دنیا بھر میں عزت ہے نیز طبی، تعلیمی، ثقافتی، روحانی اور ہنگامی امدادی خدمات انجام دینے کے بہترین ریکارڈ کی حامل ہیں، سوامی جی کے نظریے کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔ ●

بقیہ: ترقی پذیر ملک میں محنت کش طبقہ

لیے اور انھیں کم از کم جتنا ملنا چاہیے اتنا سماجی تحفظ دینے کی غرض سے حال ہی میں دو قانون بنائے گئے ہیں۔ (۱) بلڈنگ اور دیگر تعمیراتی مزدوروں (روزگار کی باضابطگی اور کام کرنے کے حالات) سے متعلق قانون ۱۹۹۶ء اور (۲) بلڈنگ اور دیگر تعمیراتی مزدوروں کے بہبودی محصول سے متعلق قانون، ۱۹۹۶ء۔

اس کے بعد وزارت نے ضروری نوٹیفکیشن جاری کر کے ان قوانین پر عمل درآمد کے لیے حکام کا تعین کر دیا ہے۔

خود روزگار کا پروگرام

موجودہ اقتصادی اصلاحات اور اقتصادی نرم روی کی پالیسی سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کی غرض سے خود روزگار کو بڑھاوا دینے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ یہ بھی محسوس کیا گیا ہے کہ روزگار کے متلاشیوں کی روز افزوں تعداد کو پبلک سیکٹر اور ملک کے منظم شعبوں میں کھپایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے ہنرمندیوں اور وسائل کو خود روزگار کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ اس کے لیے ڈائرکٹوریٹ جنرل آف ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ کے تربیتی پروگراموں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

ملازمین کے لیے پنشن اسکیم، جو پراویڈنٹ فنڈ میں روپیہ جمع کرانے والے ایک لاکھ نوے ہزار ملازمین کے فائدے کے لیے شروع کی گئی ہے، سماجی تحفظ کی ایک بڑی اسکیم ہے۔ گزشتہ سال نومبر کے آخری ہفتے میں ملازمین کی پنشن اسکیم کی پہلی سالگرہ منائی گئی ہے۔ اس وقت تک اس نئی اسکیم کے تحت ایک لاکھ افراد کو پنشن تقسیم کی جا چکی ہے۔ ●

بقیہ۔ آزاد ہندوستان میں صنعتی ترقی: ایک جائزہ

اور کاموں کے لیے جواب دہ بنایا گیا۔

بھاری صنعتوں کا محکمہ

بھاری صنعت کا محکمہ ۴۹ اداروں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ان میں سات وہ ادارے ہیں جو مشاورتی خدمات فراہم کرتے ہیں، ان میں پیچیدہ قسم کی انجینئرنگ کے شعبوں سے لے کر صارفین کے استعمال میں آنے والی صنعتوں کے ادارے سبھی شامل ہیں۔ ان کارخانوں کا سالانہ کاروبار دس ہزار کروڑ روپے سے زیادہ کا ہے۔ یہ محکمہ لگاتار ان کارخانوں کے کاموں کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ آٹھویں منصوبے میں پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز کے سلسلے کی سرمایہ کاری کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایسا فاضل سرمایہ اکٹھا کیا جائے جسے دوبارہ صنعت کاری کے لیے استعمال میں لایا جائے، اس مقصد کے تحت آٹھویں منصوبے میں ۲۷۰۱ کروڑ روپے رکھے گئے۔ جو صنعتی سرکاری ادارے نقصان میں چل رہے ہیں، ان میں رضاکارانہ طور پر ریٹائرمنٹ کی اسکیمیں لاگو کی گئیں۔

مختصر یہ کہ ہندوستان میں اس وقت جو صنعتی ترقی دیکھنے کو ملی ہے، وہ نئی اقتصادی پالیسی کی مرہون منت ہے، اس کا سلسلہ ۱۹۵۶ء میں صنعتی پالیسی سے متعلق قرارداد اور ۱۹۹۱ء کے صنعتی پالیسی سے متعلق بیان سے ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ملک صنعتی ترقی کے بغیر اپنے عوام کا معیار زندگی بلند نہیں کر سکتا۔ ہندوستان نے صنعتی اور زرعی محاذ پر جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ ترقی پذیر ملکوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ●

گنگا ساگر ۔ ایک ثقافتی سنگم

کلکتہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک بڑی عارضی لبستی کی تشکیل کا عمل دسمبر کے آتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ پانچ اہم راستوں اور بہت سے چوراہوں پر مشتمل ایک بڑا میلہ کمپلیکس سال بھر کے بعد پھر سامنے آجاتا ہے۔ یاتریوں کے لیے سیکڑوں سائبان، قطار در قطار دوکانیں عارضی احاطہ بندیاں اور غسل خانے وغیرہ بانس کی کھپچیوں، دھان کے بھو سے اور ہوگلا (بانس کی پتیوں جیسی ایک مقامی گھاس) سے بن کر تیار ہونے لگتے ہیں۔

گنگا ساگر میں کپل منی کے مقدس مندر اور اس کے مستقل پجاری کو اچانک ہزاروں کسانوں کا ساتھ حاصل ہو جاتا ہے جو حفاظتی مینار والے، آب رسانی کے نظام، ضلع اور پنچایت افسروں کے لیے خیموں، ذرائع ابلاغ کی ٹیموں لگ بھگ ۳۰ تنظیموں کے رضاکاروں اور صحت کے عملہ کے لیے بانس اور ہوگلا سے بناتے گئے ڈھانچوں نیز ایک عارضی جیل کی تعمیر میں بھی معروف ہوتے ہیں تاکہ اس میں ان چھوٹے موٹے مجرموں کو بند کیا جا سکے جو گنگا ساگر کی طرح کے میلوں میں عام طور پر سرگرم عمل رہتے ہیں۔

چھوٹا سا جزیرہ ساگر مغربی بنگال کے ضلع جنوبی ۲۴ پرگنہ میں سندر بن کی حیرت انگیز دنیا کے بہت نزدیک گنگا ندی کے اتار پر کلکتہ سے بنگال ساڑھے تین گھنٹہ کے سفر کے فاصلہ پر عین خلیج بنگال کے دہانہ پر واقع ہے۔ یہ فاصلہ سڑکوں اور کشتیوں سے طے کیا جاتا ہے۔ مکر سنکرانتی کے مقدس دن ۱۴ جنوری کے آس پاس ہر سال اس جزیرہ پر کم از کم ۵ لاکھ یاتری آتے ہیں یہ یاتری جن میں زیادہ تر سن رسیدہ لوگ ہوتے ہیں نیل گری اور نیپال، گجرات اور گڑھوال تک سے آکر گنگا ساگر کے کناروں پر جمع ہوتے ہیں جو نہ تو کسی ندی کا کنارہ ہے نہ ہی اسے سمندری ساحل ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ یاتری اپنے کنبہ کے افراد کے ساتھ سنگم پر مقدس اشنان کرتے ہیں۔

گنگا ساگر مشرقی ہندوستان میں یاتریوں کا سب سے پرانا اور سب سے بڑا میلہ ہے جس کو چھوٹا کمبھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ سرکاری طور پر ۱۲ جنوری سے شروع ہونے والے اس پانچ روزہ میلہ میں ہندوستان کے تمام حصوں اور پڑوسی ملکوں سے بھی یاتری آتے ہیں۔ یہ یاتری خاص طور پر بسوں میں بھر کر کلکتہ تک آتے ہیں اور راستہ میں پڑنے والے تیرتھ استھانوں کے درشن بھی کرتے ہیں۔ دسمبر کے آخری ہفتہ میں خصوصی تیرتھ یاترا اوڈیو کوچ کے ذریعہ یاتریوں کی کلکتہ میں آمد شروع ہو جاتی ہے اور وکٹوریہ میموریل۔ بابو گھاٹ علاقوں کے سرسبز و شاداب میدان ایک چھوٹے سے ہندوستان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

تاریخی یادگار

میلے کی تاریخیں قریب آنے کے ساتھ ہی اکا دکا بسوں کی جگہ پر خصوصی بسوں کی قطاریں سی لگ جاتی ہیں یہ تمام بسیں نام کھانا یا کاک دویپ کی جانب براستہ ڈائمنڈ ہاربر روانہ ہوتی ہیں تاکہ مسافروں کو دریائی جہازوں پر اتاریں جو وہاں سے رات دن ساگر کے لیے روانہ ہوتے رہتے ہیں اور وہاں سے واپس آتے رہتے ہیں۔ جزیرہ پر پہنچنے کے بعد کا چو بیریا یا چیما گوری سے مزید ۴۵ منٹ کا سڑک کا سفر مکمل کرکے سکون قلب کی تلاش میں آنے والے یاتری کپل منی مندر کے چاروں طرف بکھرے ہوئے منور میلے میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ جگہ سنت راجہ ساگر کے بیٹے بھاگیرتھ کا استھان ہے جس کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ ہمالیہ پہاڑوں میں اپنے بزرگوں کی نجات کے لیے عبادت کرنے کے بعد دریا کو اس مقام تک لایا تھا۔

اس مندر کا نظم و نسق ہنومان گڑھی ایودھیا کے نروانی اکھاڑہ کے ہاتھ میں ہے جو برہمچاری سادھوؤں کا ایک فرقہ ہے اور مندر میں مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے اور پانچ روزہ میلہ کے دوران چڑھائے جانے والے چڑھاوے جمع کرنے کے لیے پجاریوں کی ایک ٹولی بھیجتا ہے۔

دلی تمنائیں

گنگا ساگر کی مذہبی اہمیت تو ہے ہی لیکن رفتہ رفتہ اس نے ہندوستان کے علاقائی کلچر کے سالانہ اجتماع کی شکل بھی اختیار کر لی ہے عقیدت مند زندگی میں کم از کم ایک بار یہاں کی یاترا کرنے کے خواب کی تعبیر حاصل کرتے ہیں۔ دور دراز کے علاقوں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ سمندر اور گنگا ندی کے سنگم پر واقع مندر پورے سال پانی میں ڈوبا رہتا ہے اور مکر سنکرانتی کے دن پانی سے باہر آتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کہانی کیسے پھیلی لیکن اب یہ کہانی زبانی روایت کا ایک حصہ بن چکی ہے۔

باقی صفحہ پر

قابلِ قدر خدمات کے پچاس سال

فزیکل ریسرچ لیبارٹری

فزیکل ریسرچ لیبارٹری ۱۱ نومبر ۱۹۹۶ء کو اپنے گولڈن جوبلی سال میں داخل ہوئی ہے اس کی ابتدا احمد آباد کے ایم۔ جی سائنس انسٹی ٹیوٹ کے چند کمروں سے ہوئی تھی۔ مگر ترقی کرتے کرتے اب یہ ملک میں فزیکل تحقیق کا ایک ایسا ادارہ بن گیا ہے جس نے نیوکلیر سائنس میں حالیہ پیش رفتوں کی نمائندگی کی۔ فزیکل ریسرچ لیبارٹری کو مختصراً پی۔ آر۔ ایل کہتے ہیں۔ اس لیبارٹری کی بنیاد ڈاکٹر وکرم اے سارابھائی نے رکھی تھی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ احمد آباد میں ایک ایسا ادارہ کھولا جائے جو سائنسی تحقیق کا اعلاترین ادارہ ہو اور جہاں کاسمک (کائناتی) شعاعوں کے بارے میں گہرا مطالعہ کیا جا سکے۔

گزشتہ برسوں میں لیبارٹری کی سرگرمیاں کافی وسعت پا گئی ہیں اور اس نے ۵۸-۱۹۵۷ء میں منعقدہ بین اقوامی جیو فزیکل سال سے متعلق تعاون اور سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا۔ اس سے اس ادارے کی سائنسی خدمات کو وسیع تر بنیادوں پر بین اقوامی شہرت ملی اور بین اقوامی محاذ پر اس ادارے کی اہمیت تسلیم کر لی گئی چناں چہ ۱۹۶۰ء کے دہے میں تھیوریٹیکل فزکس، خاص کر خلائی فزکس، پلازما فزکس اور نیوکلیر فزکس کے بارے میں مطالعے شروع کیے گئے۔

بڑھتا دائرۂ کار

۱۹۶۰ء کے دہے میں اس کی سرگرمیاں عالمی پس منظر میں فروغ پانے لگیں چناں چہ زمین اور فضا کے بہتر مطالعے کے لیے مصنوعی سیاروں یعنی سٹیلائٹ کا استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں خلائی تحقیق کو فروغ دینے کے لیے ۱۹۶۹ء میں خلائی تحقیق کی ہندوستانی تنظیم (اسرا) کا قیام عمل میں آیا اور فزیکل ریسرچ لیبارٹری کے اس وقت کے ڈائرکٹر ڈاکٹر وکرم سارابھائی کو اس کا چیئرمین بنایا گیا۔ اس طرح یہ ادارہ فی الحقیقت ہندوستان میں خلائی پروگراموں کی ترقی کا گہوارہ ہے۔

۱۹۷۰ء کے دہے میں ایروفزکس کے شعبے میں نئی نئی سرگرمیاں شروع کی گئیں۔ اس کے علاوہ تجرباتی پلازما فزکس، جیو کاسمو فزکس، الٹرا ریڈ آسٹرانومی اور ریڈیو آسٹرانومی میں بھی نئی نئی سرگرمیاں شروع کی گئیں۔ اس ادارے نے سورج کے مطالعے پر توجہ دی۔ اس سلسلے میں گورو شیکھر کی رصد گاہ، احمد آباد کے قریب تھل تیج کا آسٹرانومی سینٹر، اودے پور کی شمسی رصد گاہ نے سورج کے مطالعے شروع کیے۔ تھیوریٹیکل فزکس کی تحقیق کی توسیع عمل میں آئی اس میں ذرّاتی فزکس اور نان لائنر ڈائنامکس کو شامل کر لیا گیا۔

حال ہی میں لیزر فزکس اور کوانٹم آپٹکس کے شعبوں میں تحقیقی مطالعوں کو شروع کیا گیا ہے اس لیبارٹری کے پلازما کے شعبے سے متعلق ماہرین فزکس نے اپنی سرگرمیوں کو توسیع دینے کے لیے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط میں خود کو لیبارٹری سے الگ کر لیا اور ایک نیا سینٹر قائم کر لیا۔ اس کا نام ہے پلازما تحقیق کا ادارہ (انسٹی ٹیوٹ فار پلازما ریسرچ) یہ گجرات کی راجدھانی گاندھی نگر کے قریب واقع ہے۔

گزشتہ ۵ برسوں میں اس لیبارٹری کے عملے کی تعداد بڑھی اور اس کی سائنسی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا اب یہ آسٹرانومی کے مختلف شعبوں کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ آسٹروفزکس، پلانیٹری سائنس اور خلائی سائنس، زمینی سائنس، تھیوریٹیکل فزکس، لیزر فزکس اور کوانٹم آپٹکس اور دیگر متعدد سائنسز میں تحقیقی مطالعات میں مصروف ہے۔

بین اقوامی اشتراکِ عمل

اس مدت میں لیبارٹری کے سائنس دانوں نے بہت سی قومی اور بین اقوامی مہموں میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر انٹرنیشنل اوزون انٹر کمپیریزن میژرمنٹ، انٹرنیشنل مڈل ایٹموسفرک پروگرام، سولر سائنس پروگرام، انورادھا اسپیس لیب ایکسپیری منٹ، انڈین انٹارٹک ایکسپیڈیشن، سولرک پیس کمپین، جیو کیمیکل اوشن سیکشنز اسٹڈی وغیرہ۔ بالائی فضائی سائنسوں میں اشتراکِ عمل پر مبنی بہت سے تجربات کیے گئے اسرو اور روس کی سائنسی ایجنسی ایس۔ سی۔ ایچ۔ این۔ اے (ایجنسی)، جرمنی کی ڈی۔ ایل۔ آر۔ اور فرانس کی سی۔ این۔ ای۔ ایس نامی ایجنسیوں کے اشتراک سے یہ تجربات کیے گئے۔

اس وقت سائنس داں جیو اسفیر بایو اسفیر پروگرام، ورلڈ آئنو اسفیر تھرمو اسفیر سسٹم (ڈبلیو آئی ٹی ایس) انڈسٹریلٹ انرجی پروگرام (ایس ٹی ای پی)، جائنٹ گلوبل اوشن

فلکس، اسٹڈیز اور گلوبل اوسٹن نیٹ ورک گروپ (جی او این جی) وغیرہ کے ساتھ اشتراک عمل قائم کیے ہوئے ہیں۔ تھیوریٹیکل فزکس کے شعبے کے بہت سے سائنس داں بہت سے قومی اور بین اقوامی سائنس دانوں کے اشتراک سے عملی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

تحقیقی سرگرمیاں

فزیکل ریسرچ لیباریٹری فضائی فزکس اور زمینی سائنسوں میں ڈاکٹرل اور مابعد ڈاکٹر تحقیقی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لیے ایک سرکردہ ادارہ ہے۔ اس وقت تقریباً ۴۰ تحقیقی اسکالر ہیں اور ۱۵ مابعد ڈاکٹر فیلو ہیں جو اس ادارے میں ملک کے مختلف حصوں سے آکر تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ گزشتہ برسوں میں اس نے بہت سی متحرک سائنسی و تکنیکی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

یہ لیباریٹری اس بات کے لیے ایک قابل فخر ریکارڈ رکھتی ہے کہ یہاں کے فارغ بہت سے سائنس دانوں نے ہندوستان کے خلائی پروگرام کو آگے بڑھانے اور اسے نئی نئی سمتیں دینے میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے سائنس داں بھی اس ادارے سے فیضیاب ہوتے ہیں سائنسی لمابات سے مستفید ہوتے ہیں۔ مختلف انجینئرنگ کالجوں اور گجرات کے پولی ٹیکنک اداروں کے طلبا بھی اس ادارے میں تکنیکی تربیت پاتے ہیں۔ طلبا اس پروگرام میں بہت گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

سائنس کے مختلف شعبوں میں بنیادی تحقیق کے سلسلے میں لیباریٹری نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان خدمات کا قومی سطح پر اور بین اقوامی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔ اس لیباریٹری کے سائنس دانوں کو قومی اور بین اقوامی قابل فخر اعزازات مل چکے ہیں۔ مختلف سائنسی اکیڈمیوں نے یہ اعزازات دیئے ہیں اور فیلوشپ بھی دیے ہیں۔ خلائی اور زمینی سائنس کے سلسلے میں گراں قدر خدمات کے لیے گجرات سرکار کی طرف سے دیا جانے والا وکرم سارا بھائی ایوارڈ بھی اس لیباریٹری کو مل چکا ہے۔ اس لیباریٹری نے ہری اوم آشرم پریرت وکرم سارا بھائی ریسرچ ایوارڈ قائم کیا ہے جس سے سائنسی تحقیق کی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا جاسکے اور مختلف سائنسی شعبوں میں سائنس دانوں کی تحقیقی سرگرمیوں کے اعتراف کے طور پر انھیں یہ اعزاز دیا جاسکے۔ وکرم پروفیسرشپ پروگرام کے تحت معزز و ممتاز سائنس دانوں کو بلاکر ان سے لیکچر دلوائے جاتے ہیں۔ راما ناتھن میموریل لیکچرز کے تحت بھی اس طرح کے پروگرام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

پولر سٹیلائٹ لانچ وہیکل (پی ایس ایل وی) کو کامیابی کے ساتھ چھوڑا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے جدید آلات حاصل کر لیے گئے مثلاً لیزر، لڈارز، مختلف طرح کی دوربین، ماس اسپکٹرومیٹرس، ذراتی فزکس کے تحقیقی پروگرام، مان لائنز ڈائنامکس، لیزر فزکس اور کوانٹم آپٹکس وغیرہ سے خلائی سائنس کو جدید ترین لائنوں پر لے آیا گیا ہے اور اب یہ لیباریٹری اکیسویں صدی میں اس امید کے ساتھ قدم رکھ رہی ہے کہ اس کی تحقیقی سرگرمیاں اور زیادہ متحرک اور فعال ہوں گی نیز پہلے سے زیادہ جوش عمل کے ساتھ ان کاموں کو آگے بڑھایا جاسکے گا۔

●

بقیہ کور ۲: بچہ مزدوری

عوامی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے حکومت ہند نے زبردست تشہیری مہم شروع کر رکھی ہے۔ اخبارات، رسائل، جرائد، ریڈیو و ٹی وی پر ایسے پروگرام، مضامین، فیچر وغیرہ منظر عام پر لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حکومت کی کوشش ہے کہ ۲۰۰۰ء تک مرحلہ وار طریقے سے خطرناک پیشوں میں مصروف عمل ۲۰ لاکھ بچوں کو ان سے علاحدہ کرکے انھیں فطری طور پر زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرائے جائیں۔

بچہ مزدوری کی روک تھام کا سب سے اہم پہلو اس رسم کے خاتمے کے لیے قانون سازی سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں اکثر سیمنار، مذاکرے و میٹنگیں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں کام کے اوقات کی ضابطہ بندی، رات کے وقت کام نہ کرانے وغیرہ کے ضمن میں قانون وضع کیا گیا تھا۔ خلاف ورزی کے مرتکب افراد سزا کے بھی مستحق قرار دیے گئے ہیں تاہم بچہ مزدوری اور اس قانون کی خلاف ورزی دھڑلے سے جاری ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ مزدور بچوں کے تئیں پورے سماج کے ضمیر کو جگایا جائے۔ بچہ مزدوری کی سرے سے اجازت ہی نہ دی جائے کیوں کہ اگر ایک مرتبہ اجازت دی جاتی ہے تو پھر اس کی آڑ میں بقیہ پہلو اور گنجائشیں نکال لینا قانون شکنی کرنے والوں کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ والدین کی مجبوری بچوں سے مزدوری کرانے کی ہے اور صنعت کار او پیسے کو ہی سب کچھ سمجھنے والے تاجران مجبوریوں سے مستفید ہونے کا گر خوب جانتے ہیں۔ قانونی موشگافیوں اور توڑ مروڑ میں ماہر یہ لوگ اپنے مطلب کے حصول کے لیے ہر طرح کی گنجائش نکال لیتے ہیں اور بچوں کا استحصال کرتے ہیں اور انھیں جی بھر کے ذلیل کرتے ہیں۔ اگر بچوں سے مزدوری کرانا جرم قرار دیا جائے ساتھ ہی نادار و مفلس طبقے کے بچوں کی تعلیم اور خوراک کا کوئی معقول بندوبست بھی ہو تو شاید اس رسم کا خاتمہ ہوسکے۔ غریبی کا خاتمہ شرط اولین ہے۔ سماج کو بچہ مزدوری کے خطرناک نتائج کے تئیں بیدار کرنا بھی ازحد ضروری ہے تب کہیں جاکر اس قبیح رسم کا خاتمہ ہوسکے گا۔

●

بقیہ: اترپردیش میں اعلا تعلیم کا فروغ

جذبات کا احترام کرتے ہوئے ۱۲ تعلیمی اداروں کو بطور "اقلیتی ادارہ" منظوری دے دی ہے۔ سرکار کے اس قدم سے اقلیتی اداروں کو بھی وہ تمام سہولتیں فراہم ہوجائیں گی جو اس وقت دیگر تعلیمی اداروں کو حاصل ہیں۔ ●

رئیس صدیقی

مرزا غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک معزز ترکمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد مرزا عبد اللہ بیگ کے مارے جانے پر آپ نے اپنے چچا نصر اللہ بیگ کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ بدقسمتی سے آپ کے چچا محترم اس وقت رحلت فرما گئے جب آپ کی عمر صرف نو برس کی تھی۔ لہٰذا آپ ننہال میں پرورش پانے لگے۔ حسب رواج آپ مدرسے بھیجے گئے، جہاں آپ نے فارسی ادب پڑھا۔ حسن اتفاق سے ایران کے ایک عالم اور سیاح جناب عبد الصمد سیر و سیاحت کرتے ہوئے ۱۸۱۰ء میں آگرہ تشریف لائے۔ وہ آپ کے گھر دو سال مقیم رہے۔ آپ کو انھیں سے فارسی اور تھوڑی سی عربی پڑھنے کا موقع ملا۔ یہی وہ ٹھوس تعلیم تھی جو آپ نے حاصل کی تھی۔

۱۸۱۰ء میں بہ عمر ۱۳ سال آپ کی شادی دہلی میں جناب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحب زادی سے ہوئی۔ معروف ایک مشہور شاعر تھے۔

۱۸۱۲ء کے قریب آپ اپنا مسکن آگرہ سے تبدیل کر کے دہلی آگئے اور اپنی بقیہ زندگی اسی تاریخی شہر میں گزار دی۔

معروف کے ذریعے آپ کا دہلی کے اہل علم سے متعارف ہونے کے علاوہ آپ کی شناسائی شاعروں، عالموں اور مدبروں سے ہوئی۔ ۱۸۲۵ء میں آپ کو اپنی پنشن کی بحالی کے سلسلہ میں کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ راستے میں رامپور، بنارس، لکھنؤ وغیرہ میں بھی قیام کیا۔

۱۸۴۹ء میں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب ملا اور ۵۰ روپے مشاہرہ پر خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور ہو گئے۔

۱۸۵۴ء میں استاد ذوق کے رحلت فرمانے کے بعد آپ شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ کی آمدنی چھ سو روپے سالانہ شاہ ظفر کی طرف سے، سات سو سالانہ اپنے چچا کا ترکہ، کل ۱۳ سو تھی لیکن ۱۸۵۷ء میں ملک سیاسی شورش سے گزرا۔ برطانوی حکومت نے آپ کی پنشن بند کر دی۔ ادھر شاہ ظفر کی طرف سے بھی پنشن بند ہو گئی۔ یہ دن آپ کے حق میں بڑے تنگ دستی اور مفلسی کے گزرے۔

۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے اردو شاعری میں آپ کا شاگرد ہونے کی پیش کش کی اور اس خدمت کے سلسلہ میں کل ۱۲ سو روپے سالانہ وظیفہ دینا منظور کیا۔

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء یعنی وفات تک یہ رقم غالب کی کل آمدنی تھی اور اسی مفلسی میں آپ نے رحلت فرمائی۔ مرتے وقت آپ یہ شعر کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

آپ کی ابدی آرام گاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار شریف کے قریب ہے۔

غالب نے اردو فارسی میں لکھنے کا شغل اس وقت اختیار کر لیا تھا جب آپ آگرہ ہی میں تھے۔ اسی زمانے میں آپ نے تخلص اسد اختیار کیا۔ آپ کے ہم عصروں کو یہ شکایت شدت سے تھی کہ آپ کے اشعار اور زبان فہم سے بالاتر ہوتی ہے۔ جب آپ کے عزیز دوستوں نے بھی یہ بات کہی اور مشورہ دیا تو آپ نے مشورے کا احترام کیا۔ تخلص غالب رکھا اور زبان آسان کر دی۔

غالب بڑے زندہ دل، شگفتہ مزاج، نہایت با وضع، ظریف الطبع، بذلہ سنج، با اخلاق، مخلص اور رواداری کے پتلے تھے۔

اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بالکل آزاد تھے۔ جتنے صاف باطن تھے اتنے ہی صاف گو تھے۔

آپ فارسی اور اردو دونوں کے زبردست شاعر اور انشاپرداز تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جاوداں عظمت، شہرت اور مقبولیت کا راز آپ کا اردو دیوان ہے۔ دونوں زبانوں میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔ کلیات نثر فارسی، کلیات نظم فارسی، تیغ تیز قاطع برہان، پنج آہنگ، مہر نیم روز وغیرہ اور اردو میں عود ہندی، اردوئے معلیٰ، (دو حصوں میں) یہ خطوط کے مجموعے ہیں۔ اردو دیوان۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۹۶۔ سرسوتی کنج سوسائٹی، ۲۵، مدر ڈیری روڈ
آئی۔ پی۔ ایکسٹنشن دہلی۔ ۹۲

اور قصائد ہیں۔

آپ کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور

اس دور میں غالب کے کلام پر فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ بیدل کی روش پر عجیب وغریب تشبیہیں، طرزِ بیان نامانوس، اشعار بعید الفہم۔ آپ خود فرماتے ہیں۔ ؎

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

اس کی وجہ شاید صرف یہ تھی کہ آپ ہر بات میں اپنے آپ کو عام روش سے علاحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

اس دور کے اشعار میں مرزا نے عام خیالات و مضامین کو اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے پیش کیا ہے مثلاً فراق کی مصیبتیں، وصل کی امیدیں، معشوق کا غرور، بے پروائی، قاصدوں کی خوشامد، عاشق کی عاجزی و بےبسی اور محبوب کے خدوخال کی تعریف وغیرہ۔

دوسرا دور

اس دور میں فارسیت کا وہ غلبہ نہیں اور نازک خیالات کا وہ انداز نہیں ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہوگئی ہے۔ فارسی تراکیب، محاورات اور بندشوں کے استعمال میں بہت کمی آگئی ہے مگر فکر و نظر کی بلندی موجود ہے۔

تیسرا دور

یہ دور غالب کے کمالِ فن کے عروج کا دور ہے اور ارتقائے کمال کی آخری منزل۔ اس دور کی غزلوں میں ندرتِ خیال کے ساتھ سادگی، سلاست، روانی، نازک خیالی، اختصار و جامعیت، لطافت اور جدتِ تمثیل سب کچھ بدرجہ اتم موجود ہیں اور یہی ہیں وہ اوصاف جن سے غالب کو شعرائے اردو کی صفِ اول میں نہایت ممتاز جگہ دی گئی ہے۔

آپ کی شاعری کی بعض خصوصیات

۱۔ اختصار وجامعیت: شعرا جس خیال کو متعدد اشعار میں ادا کرتے ہیں آپ اسے ایک ہی شعر میں ادا کر دیتے ہیں۔

۲۔ جذبات کی صحیح ترجمانی: آپ اپنے اشعار کے ذریعہ دلی کیفیات اپنا کلام پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۳۔ فلسفہ اور حقیقت طرازی: مرزا غالب ایک بہت بڑے فلسفی تھے۔ آپ کے اشعار اکثر نکات فلسفہ کو آسانی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں، جس سے علم ہوتا ہے کہ آپ حقائقِ تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی و مذہبی تعصبات سے بالکل آزاد تھے۔

۴۔ نظر فریب طرزِ تحریر: آپ کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے بلکہ ایسے لوازم یکجا کر دیتے ہیں کہ قاری کا خیال خود اس طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

۵۔ آپ کی شاعری میں گویا مایوسی اور درد کی کثرت ہے لیکن پھر بھی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر نمایاں رہتی ہے۔

۶۔ متانت و سنجیدگی میں شوخی اور ظرافت کا ایسا امتزاج پیدا کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں۔

۷۔ حسنِ معانی کے ساتھ ساتھ آپ کا کلام، حسنِ الفاظ، حسنِ بندش اور حسنِ ترکیب کا بھی بہترین نمونہ ہے۔

۸۔ جدت طرازی آپ کے کلام کی بنیادی و خاص خصوصیت ہے۔ آپ روشِ عام سے بہت ہٹ کر چلے اور شاعری میں ایک نئی راہ نکالی۔

۹۔ آپ کا کلام آپ کے ذاتی تجربے و مشاہدات، احساسات اور جذبات کا آئینہ دار ہے۔ غمِ عشق، آپ بیتی، جگ بیتی سب کچھ موجود ہے۔

۱۰۔ الفاظ کا انتخاب لاجواب ہے۔ شعر میں ہر لفظ نگینہ کی مانند جڑا ہوا ہوتا ہے۔ معمولی سے معمولی اور پامال خیال و مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔

نمونۂ کلام

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
خود ہماری خبر نہیں آتی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دردمنت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

باقی صہ ۳ پر

جلیل بازید پوری

چنے کا ساگ

(کہانی)

میری پیاری نجمہ!

تمہاری مخروطی انگلیوں کی تحریریں پیار کی چھلکتی ہوئی گاگر ہیں۔ جانتی ہو ایسا کیوں ہے اس لیے کہ ان انگلیوں میں سماج کے بگڑے ہوئے ڈھانچے کو پیار سے بدلنے کی صلاحیت ہے ایسا میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم دونوں کی شخصیت میں گاؤں کی سوندھی سوندھی مٹی رچی بسی ہے ہمارے اور تمہارے جسم وہیں کے خمیر سے بنے ہیں نا۔ حتیٰ کہ روح تک۔ ہم لوگوں کے گاؤں کی گلیوں میں کھٹے میٹھے سپنے بُنے تھے کیا وہ دن تھے جب ہم لوگ مولوی صاحب کے کھیتوں سے چنے کا ساگ توڑ کر لایا کرتے تھے کبھی کبھی میں تمہاری چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتا تھا اور تم رونے لگتی تھیں۔ میری ماں سے تم اپنی توتلی زبان میں کہتیں "چاچی! ندیم نے زور سے میری چوٹی کھینچ لی ہے" اور میری ماں میرا کان پکڑ کر کھینچ لیتی تھی اور تم ہنستی ہوئی تالیاں بجاتی چلی جاتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ سب کچھ بھول جاتے اور باغ سے پھول توڑ کر لاتے۔ اعظم بھیا مرحوم کے باغ سے۔ اعظم بھیا کا مسکراتا چہرہ آج مجھے رلاتا ہے۔ ہم دونوں تتلیاں پکڑتے، گھاس پر لوٹتے اور آنکھ مچولی کھیلتے تھے آج زندگی ہم دونوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے کیا دن تھے وہ۔؟ کیا فضا تھی، کیا خوشگوار ماحول تھا۔ کیا گاؤں کے نوجوان اب بھی "دھرا بھر" پچیسی کھیلتے ہیں اور بڑے بوڑھے ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہیں؟ جی چاہتا ہے اُڑ کر گاؤں جاؤں، امام باڑہ پر بیٹھوں اور ان جگہوں کی تمام فضاؤں کو اپنے اندر انڈیل لوں۔ ان بیتے ہوئے دنوں کو میٹھے شربت کی طرح پی جاؤں اور اس گزرے ہوئے ماحول کو گھنٹوں گنتے کی مانند چوستا رہوں۔ وہ چنے کا ساگ ہر سال میری روح کے سونے سونے کھیت میں اُگتا رہتا ہے اگر ان یادوں کو نہ اُگاؤں تو جیوں کیسے؟ ہم لوگوں کی زندگیاں چڑیوں کی مانند پھدک رہی تھیں تم معصومیت سے میری طرف تک کیوں رہی ہو تم تو سب کچھ بھول گئیں تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا تمہاری نظریں نیچی کیوں ہیں؟ شرما گئیں اس لیے کہ اب تم وہ نہیں رہیں جو کل تھیں۔!

لیکن میں تو اب بھی وہی ہوں۔ زندگی کے پینتروں نے ہمیں جدا کر دیا تو کیا ہوا؟ ہم دونوں کے سماجی نظریے تو ایک جیسے ہیں خیالات میں یکسانیت تو ہے۔

زندگی چالیں چلتی ہے تو چلے گھر والوں نے رشتے داروں نے اور بھائی بہنوں نے مجھے معاشی ترازو پر تولا میرا پلڑا بھاری نہیں تھا اس لیے میں بھاری ہو گیا۔ قلم کا مزدور ہوں آج ہمارا گونگا لنگڑا سماج قلم کے مزدور کو بھکاری سمجھتا ہے میں ان کی نظر میں آج دو کوڑی کا ہوں جو میرے لیے جان دیا کرتے تھے سسرال والے شرابی بدکردار داماد کو جھیل سکتے ہیں لیکن نادار داماد ان کی نظر میں حقیر ہے میرا بھی وہی حال ہے۔ اگر قلم نہ ہوتا تو میں خودکشی کر لیتا یا ہارٹ اٹیک سے مر جاتا۔ اگر میرے چاہنے والے دوست نہ ہوتے تو میں پاگل ہو جاتا کیوں کہ ان کے قہقہوں میں میں اپنے آنسوؤں کو ڈبوتا ہوں۔ وہ بھی کیا رات تھی چاندنی رات جب میں تمہارے ہاتھ سے گاگر کا تمام پانی ایک ہی سانس میں پی جانے کے لیے مچلتا تھا تاکہ ساری عمر پیاس کا احساس ہی نہ ہو۔ تم لڑکیاں تو رُو دھو کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہو لیکن میں تو وہ بھی نہیں کر سکتا کیوں کہ اب رونے کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔ جب ہنسنا چاہیے روتا ہوں اور جب رونا چاہیے ہنستا ہوں کیوں کہ بے بس ہوں۔ ان یادوں کا کیا کروں جو آج بھی میرے دل میں سمندر کی لہروں کی مانند ہچکولے لے رہی ہیں۔ کاش یہ لہریں مرتے دم تک یوں ہی مچلتی رہیں اور تم میرے اندر مچلتی رہو میرا درد تمہاری تڑپ بن جائے، تمہاری تڑپ میرا درد بن جائے اور ہم دونوں کا سر پہاڑ کی گود میں ہو، دھرتی سبزہ زاروں کے آنچل میں یا اسی چنے کے کھیت میں جہاں پیار کا گارا تیار ہوا تھا۔ ایک ایسا معصوم پیار جو اپنے اندر معصومیت سمیٹے ہوئے تھا اور روح ندی کی آغوش میں، یاد ہے تمہیں۔

مجھے اپنے گاؤں کے لوگوں پر رونا آتا ہے۔ یہ لوگ ذات پات اور برادری کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہیں۔ ہم دونوں آج علاحدگی کی جھلستی دوپہر میں کیوں جل

مدھو ساؤنڈ، ۱۴ پروکٹر روڈ، نزد گرانٹ روڈ مسجد، ممبئی ۷

رہے ہیں؟

برادری کے گھیرے کو توڑنے میں اور جہیز کے بکھیڑے کو ختم کرنے میں کیا تم ہمارا ساتھ نہیں دو گی؟ برادری اور جہیز ایک بدنما دلدل ہے جس میں ہم دھنستے جا رہے ہیں۔

نحرا تم ذرا گاؤں کی ان کنواریوں کو دیکھو جو جوانی کی چوکھٹ کو پار کر چکی ہیں ان کی آنکھیں بجھی ہوئی لالٹینیں بن چکی ہیں جب بھی کوئی برات اس گاؤں میں آتی ہے اور بڑے درخت کے نیچے دری بچھائی جاتی ہے۔ کنواریوں کی آنکھیں کسی کے انتظار میں بجھ جاتی ہیں۔ رات کی تنہائیوں سے جب تنہائیاں ہم آغوش ہوتی ہیں اس وقت جہیز اور برادری کی ماری ہوئی کنواریوں کے دلوں پر آرے چلتے ہیں۔ وہ اپنے جھروکوں سے ایسا بانکا نوجوان دیکھنا چاہتی ہیں جو نگنٹٹ گھوڑے پر سوار آئے اور باری باری سب کو برادری اور جہیز کے جہنم سے دور لے جائے۔

ماں باپ کو اپنی برادری کا ڈاکٹر، وکیل انجینئر داماد چاہیے۔ چپراسی' پوسٹ مین' باورچی نہیں چلے گا چاہے بیٹی بوڑھی کیوں نہ ہو جائے اور یہاں لڑکے والوں کا یہ حال ہے کہ جاہل بھی جہیز مانگتا ہے۔ ہمارے سماج میں لوگ بڑے گھٹیا ہیں ان کا ذہن تنگ ہو چکا ہے اس لیے کہ ہر آدمی اپنا مقابلہ معاشی طور سے ایک دوسرے سے کرنا چاہتا ہے۔ پالتو جانوروں کی مانند مول تول کرتے ہیں۔ جہاں کم دام ملا وہاں منگنی لوٹا دیتے ہیں۔ بھٹیار خانوں میں جو لوگ روٹیاں پکاتے ہیں انھیں بھی جہیز چاہیے۔ داماد رنگین لنگی باندھے ٹرانزسٹر لیے تاڑی خانے میں تاڑی پیتا ہوا نظر آتا ہے تو کیا ہوا؟ جاہل ہے تو کیا ہوا؟ پتھر توڑتا ہے تو کیا ہوا؟ اپنی برادری کا ہے۔" گویا خدا نے برادری کا ٹھپہ لگا کر" شاید ان لوگوں کو پیدا کیا ہے جو برادری پر فخر کرتے ہیں۔ بیرونِ ملک کما رہا ہے شراب پیتا ہے تو کیا ہوا برادری اونچی ہے۔ ان جاہلوں کو یہ پتا نہیں کہ اسی پیٹ سے پچھڑی ذاتوں نے جنم لیا ہے جس پیٹ سے اعلا ذات والے پیدا ہوئے ہیں پھر بڑائی چھوٹائی کیا ہے؟ سچ پوچھو تو برادری کے صرف دو ہی قسم کی ہیں امیر اور غریب۔ ہرے ہرے نوٹ ہوں تو شراب کباب اور شباب سے کھیلنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ برادری بھی بھول جاتے ہیں بیٹی لاکھوں میں کھیلے گی۔ رائٹر اسے کیا دے گا وہ تو خود حقیر فقیر ہے۔ بیل، گدھا، گھوڑا، ہاتھی، انجینئر، ڈاکٹر، وکیل اور پہاڑ کے ٹھیکیدار میں کوئی فرق نہیں رہا سب کے سب جانور ہیں۔ گھر گھر میں ہاٹ اور بازار لگ رہا ہے کیوں کہ شادی اب روحانی رشتہ نہیں کاروباری معاہدہ بن کر رہ گئی۔ لڑکا پھٹا ہوا ڈھول ہے۔ شراب پیئے، عیاشی بھی کرے کوئی بات نہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ لاکھوں میں کھیل رہا ہے جس سے چاہے جیسے بھی کھیلے اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے۔

سسر بے چارا کھیت بیچ کر پیسے جٹاتا ہے کہ بیٹی راج کرے گی۔ ادھر جوڑ توڑ کے بعد شادی طے ہوئی اُدھر سسر کی کمر ٹوٹ گئی اور حجام نے آنگن میں کھٹیا پر بیٹھ کر پکارنا شروع کیا "گھٹا جوڑ ہے مہاجبو!" یعنی اسے زیادہ سے زیادہ رسم کی ادائیگی کے پیسے دیتے جائیے۔ گھٹا جوڑ کا وظیفہ اپنی کمائی کے لیے پڑھا جاتا ہے لڑکیاں گھاٹے میں ہوتی ہیں یا لڑکا یہ تو شادی کے بعد پتا چلتا ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ تم نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہی نہیں تمہیں سُوپ میں چاول سے کنکر نکالنے، ساس کی جوئیں دیکھنے، چاول پھٹکنے، آٹا گوندھنے اور شادی بیاہ میں سہیلیوں کے منڈوے تلے "لاڈو چلی سسرال" گیت گانے کے علاوہ اور آتا ہی کیا ہے؟ گاؤں کے ان باپوں کی آنکھیں پڑھو جنھیں داماد نہیں ملتا ہے کیوں کہ ان کی جیبیں پھٹی ہوتی ہیں۔

ہم دونوں بھی برادری کے کٹہرے میں کھڑے رہ گئے۔ بڑے شہر میں تو لوگ برادری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کہاں سے لاؤں تمہاری جیسی لڑکی حیا میں لپٹی ہوئی۔

کہاں تلاش کروں تمہیں چوپاٹی میں یا گیٹ وے آف انڈیا پر۔ ویسے تمہارا بسیرا میری روح میں ہے۔ یہ کہانی صرف ہم دونوں کی نہیں ہے ہم دونوں تو اب زندگی نہیں زندگی کی میت اپنے کاندھوں پر لیے پھر رہے ہیں۔ اب آنسوؤں کو پونچھ لو میں ذہنی زندگی جی کر مرنا چاہتا ہوں۔ پیڑ پودے یا جانوروں کی طرح جینے سے بہتر ہے جینا ہی چھوڑ دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم برادری اور جہیز کے خلاف جہاد کرو۔ گاؤں کی پڑھی لکھی لڑکیوں میں فضا ہموار کرو عورتوں کے لیے ایک الگ لائبریری قائم کرو تاکہ ان کی ذہنی اصلاح ہو' ان کی اصلاح پوری نسل کی اصلاح ہوگی۔ ہر لڑکی کا انفرادی طور سے ذہن بیدار ہو تاکہ وہ اپنے ماں باپ کو قائل کر سکے۔ جہیز کی برائیاں اور برادری کی اندھی تقلید کے خلاف ایک ذہنی جنگ ناگزیر ہے۔

اس وقت میں بالکل ٹوٹ گیا ہوں اکیلا ہوں۔ میرا وہ کمرہ یقیناً مجھ سے روٹھ چکا ہوگا جہاں میرا اوڑھنا بچھونا تھا، کتابیں تھیں۔ اس کمرے کی کڑیاں مجھے اکثر گھورتی تھیں اب وہ مجھ سے ناراض ہوں گی۔ حقیر فقیر جو ٹھہرا۔ بار بار جیتا ہوں بار بار مرتا ہوں۔ اس بار میں گاؤں آ رہا ہوں اور اس امید پر کہ ان سماجی برائیوں کے خلاف تم میرا ساتھ دو گی دنیا کانٹوں سے بھر گئی ہے تم جیسی معصوم لڑکیاں جو واقعی پھول ہیں مگر دو پیڑوں میں کانٹے ہی کانٹے ہیں اگر یہ سچ نہ ہوتا تو پھول جیسی لڑکیاں بوڑھے شوہروں کے پلّے باندھ نہیں دی جاتیں۔

آؤ ہم تم مل کر یہ عہد کریں کہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیں گے لیکن ان سماجی برائیوں کے گھرڑے بیچ چور رہے پر پھوڑے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ چنے کا ساگ کھلا رہی ہو نا۔ میں آ رہا ہوں۔

تمہارا ندیم

غزلیں

حیات لکھنوی

تنہائی میں اجڑا اجڑا یادوں کا ہے لشکر کیوں
آنکھوں میں ہیں خوابوں جیسے ٹوٹے پھوٹے منظر کیوں

میں تو اس پر رنگ برنگے پھول نچھاور کرتا ہوں
لیکن اس کے پاس پہنچ کر بن جاتے ہیں پتھر کیوں

میں نے کوئی غفلت برتی مجھ سے کوئی بھول ہوئی
میرے گھر کی بات گئی ہے آخر گھر سے باہر کیوں

میں تو قطرہ قطرہ اس کا شکر زباں پر لایا ہوں
پھر بھی مجھ سے چھین لیا ہے اس نے بہتا ساگر کیوں

نفرت کی کیوں بستی بستی آگ برسنے لگتی ہے
دم بھر میں شاداب زمینیں ہو جاتی ہیں بنجر کیوں

اپنی راہیں طے کرتا ہوں سوچ سمجھ کر خوب حیات
پھر بھی مجھ کو رستہ چلتے لگ جاتی ہے ٹھوکر کیوں

۵۔ امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

شہناز چاندنی

اس نے کھائی قسم نہ آنے کی
لگ گئی ہے نظر زمانے کی

کچھ تو ہو وجہ روٹھ جانے کی
یا ہمیں ٹھان لی ستانے کی

چمکی قسمت غریب خانے کی
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی

بجلی منڈلا رہی ہے گلشن پر
خیر ہو میرے آشیانے کی

جانتی ہوں تری وفاؤں کو
کیا ضرورت وفا جتانے کی

کیا کسی سے گلہ تباہی کا
جب یہ حالت مری خدا نے کی

چاندنی وہ تو تم کو بھول گئے
تم بھی کوشش کرو بھلانے کی

معرفت غمگین قریشی، ڈھولی کھال سہارنپور۔ ۲۴۷۰۰۱

نثار جیراجپوری

تمنائیں سبھی ٹوٹی ہوئی ہیں
یہ دل کی بستیاں لوٹی ہوئی ہیں

انھیں میں ہے چھپا مفہوم سارا
جو تحریریں ابھی چھوٹی ہوئی ہیں

زمیں تک آ نہیں پاتیں شعاعیں
سنہری ڈوریاں ٹوٹی ہوئی ہیں

صلہ کس طرح مانگیں محنتوں کا
ہماری کوڑیاں پھوٹی ہوئی ہیں

سبھی کو روشنی بخشی گئی ہے
ہماری بستیاں چھوٹی ہوئی ہیں

کبھی جو کھیلتی تھیں ساحلوں سے
وہ موجیں آج کل روٹھی ہوئی ہیں

نثار اس قلعۂ دل کی مرے اب
فصیلیں جا بجا ٹوٹی ہوئی ہیں

ڈپارٹمنٹ آف کامرس، شبلی نیشنل پی۔ جی کالج۔ اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱ (یو۔ پی)

غزلیں

واجد سحری

دیکھ بھی سکے نہ ان کو ہم — آنکھ ہی نقاب ہوگئی
راز تھی کبھی، جو زندگی — اب کھلی کتاب ہوگئی

کچھ بگڑ گئی ہیں صورتیں — کچھ نظر خراب ہوگئی
تتلیوں سے چھیڑ چھاڑ کی — عمر وہ تو خواب ہوگئی

زندگی سکوں کے شوق میں، — وقفِ اضطراب ہوگئی
سرخرو ہوا مرا سوال — خامشی، جواب ہوگئی

آستیں میں سانپ پالنا — عادتِ جناب ہوگئی
نیند لے گئی بصارتیں — کھل کے آنکھ خواب ہوگئی

خواہشیں ہیں واجد اس قدر
زندگی عذاب ہوگئی

●

بی-۲۸، طبیہ کالج قرول باغ، نئی دہلی - ۵

مناظر حسن شاہین

میں ہوں شیشہ تو اُدھر سنگ اٹھانے کا مزاج
مجھ سے ملتا ہی نہیں میرے زمانے کا مزاج

دودھ کی نہر بہانا کوئی آسان نہیں
اب کہاں لوگوں میں وہ تیشہ اٹھانے کا مزاج

فصل کانٹوں کی سرِ راہ اُگانے والو!
ہم نے رکھا ہے سدا پھول کھلانے کا مزاج

اس کو کھونے کا کوئی غم ہے نہ پانے کی خوشی
ہے جدا سب سے یہاں تیرے دِوانے کا مزاج

خود کو آئینہ کبھی اس نے دکھایا ہی نہیں
جس کا ہے غیر پہ انگشت اٹھانے کا مزاج

بات کیا ہے کہ اندھیروں کے پرستار ہیں سب
اب تو ملتا ہی نہیں شمع جلانے کا مزاج

حرفِ حق جب سے لکھا میرے قلم نے شاہین
بدلا بدلا نظر آتا ہے زمانے کا مزاج

معرفت فرحت قادری، محلہ معروف گنج گیا - ۸۲۳۰۰۱

سدھیر کمار پرواز

زندگی میں ہر قدم پر دکھ مجھے ملتا ہے کیوں؟
پوچھتا ہے مجھ سے اکثر دل یہی، جیتا ہے کیوں؟

پیار کرنے کو نہ کوئی جرم ثابت کر سکا
پیار کرنا جرم دنیا کو مگر لگتا ہے کیوں؟

اے میرے دل اس سے ہرگز جیت نہ پائے گا تو
علم ہے اس کا تجھے پھر درد سے لڑتا ہے کیوں؟

تو اگر انسان ہے تو ہم کو یہ سمجھا ذرا
غیر انسانی رواجوں سے ترا ناتا ہے کیوں؟

میرا جیون جب کہ درد و غم کا ریگستان ہے
اس میں آئیں گی بہاریں مجھ کو یہ آشا ہے کیوں؟

ظلم سے لڑنے کی دل میں ٹھان لے پرواز تو
اور بڑھتا ہے یہ سہنے سے، اسے سہتا ہے کیوں؟

جاٹو نگر، سہارنپور - ۲۴۷۰۰۱

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

بجٹ ۹۸-۱۹۹۷ء

ٹیلی مواصلات شعبہ کے لیے ترغیبات

ٹیلی مواصلات شعبہ کے تیز رفتار فروغ کے لیے ۹۸-۱۹۹۷ء کے بجٹ میں بہت سی ترغیبات دی گئی ہیں۔ مواصلات کے شعبہ کے لیے ۹۷-۱۹۹۶ء کے ۱۰۰۷۵ کروڑ روپے کے نظر ثانی شدہ مصارف کو بڑھا کر ۹۸-۱۹۹۷ء کے مرکزی منصوبہ کے مصارف کو ۱۲۳۶۱ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے اور محکمہ ٹیلی مواصلات کے مصارف کو جو گزشتہ سال ۱۰۰۸۴ کروڑ روپے تھے بڑھا کر ۱۳۲۵۴ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔

ودیش سنچار نگم لمیٹڈ (وی۔ایس۔این ایل) کے لیے ۸۳۲ کروڑ روپے کے مصارف منظور کیے گئے ہیں اور وائرلیس مانیٹرنگ آرگنائزیشن کے لیے بھی مزید سات کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

ایسا اور قابل ذکر پہلو وزارت مواصلات کے تحت آنے والی پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگز (پی۔ایس۔یو) مثلاً آئی۔ٹی۔آئی اور ایچ۔ٹی ایل کے لیے بجٹ میں مختص کی گئی ۴ کروڑ روپے کی رقم کا ہے جس سے ان اداروں کو ٹیلی مواصلات شعبہ کی ترقی اور توسیع کے کام میں مدد ملے گی۔

بجٹ میں ٹیلی مواصلات سیکٹر کے لیے مندرجہ ذیل انتظامات کیے گئے ہیں۔

— لائسنس فیس کو آمدنی سے ہونے والا خرچ سمجھا جائے گا۔ اس کا اعلان یکم اپریل ۱۹۹۷ء سے ہوگا۔

— اس خرچ کو لائسنس کی میعاد تک وسعت حاصل ہوگی اور کمپنیاں اس رقم کو قابل ٹیکس آمدنی سے الگ رکھ سکیں گی۔

— سیلولر ٹیلی فونوں اور پیجروں کے زون پر ڈیوٹی ۳۰ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد کر دی گئی ہے۔

— ٹیلی مواصلات آلات اور ان کے پرزوں پر ڈیوٹی ۳۰ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد کر دی گئی ہے۔

— آلات کے ساتھ آنے والے لازمی سافٹ ویئر (ایمبیڈڈ سافٹ ویئر) پر ڈیوٹی بالکل ختم کر دی گئی ہے۔

— ٹیکس سے پانچ سال تک چھوٹ اور ٹیکس کا حساب کرتے ہوئے آمدنی کے ۲۵ فی صد حصے کو شامل نہ کیا جائے گا۔ (جنوری میں اعلان ہوا)

— اب ہام اوپریٹر ۷۵۰۰۰ روپے تک کی قیمت کے مخصوص آلات رعایتی شرح کی ڈیوٹی ادا کر کے درآمد کر سکیں گے۔ (پہلے ۵۰۰۰۰ روپے تک کے آلات ہی درآمد کر سکتے تھے)

مزید برآں حکومت نے ٹیلی مواصلات کے شعبے کو پہلے ہی "بنیادی ڈھانچہ" قرار دے دیا ہے اور اسے ڈیوٹی اور ٹیکس میں بہت سی رعایتوں کا مستحق بنا دیا ہے۔ محکمہ ٹیلی مواصلات، لائسنس اور قرض دینے والوں کے درمیان ذمہ داریاں تفویض کرنے کے کلاز کو اطمینان بخش طور پر طے کیے جانے کے ساتھ ہی یہ اقدامات ملک میں ٹیلی مواصلات کی نشو و نما میں قیمتی کردار ادا کریں گے۔

الیکٹرانکس صنعت کے فروغ کے لیے بجٹ کے اقدامات

۹۸-۱۹۹۷ء کے مرکزی بجٹ میں الیکٹرانکس کے شعبے کے لیے بہت سے اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔ ان کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ ایک مستحکم الیکٹرانکس صنعت کے لیے میدان تیار ہوگا بلکہ نویں منصوبہ کے نشانوں کی تکمیل میں بھی مدد ملے گی۔ ان اقدامات میں سے کچھ حسب ذیل ہیں:

— کمپیوٹر سافٹ ویئر کو مکمل چھوٹ۔

— پاپولیٹڈ پرنٹڈ سرکٹ بورڈز کو چھوڑ کر دیگر کمپیوٹر پارٹس پر ڈیوٹی میں تخفیف یعنی ڈیوٹی کی شرح ۲۰ فی صد سے گھٹا کر ۱۰ فی صد کرنا۔

— کارٹرج ٹیپ ڈرائیو اور ڈیجیٹل ویڈیو ڈسک ڈرائیو پر ڈیوٹی کی شرح ۲۰ فی صد سے گھٹا کر ۱۰ فی صد کرنا۔

— پاپولیٹڈ پرنٹڈ سرکٹ بورڈ پر ڈیوٹی کی شرح ۳۰ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد کرنا۔

— انٹگریٹڈ سرکٹوں پر ڈیوٹی کی شرح ۲۰ فی صد سے گھٹا کر ۱۰ فی صد کرنا۔

— رنگین مانیٹر ٹیوب پر ڈیوٹی کی شرح ۲۰ فی صد سے گھٹا کر ۱۰ فی صد کرنا۔

رنگین پکچر ٹیوب پر ڈیوٹی کی شرح ۲۵ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد کرنا۔

— سیلولر ٹیلی فون اور پیجر کے پارٹس (پرزوں) پر ڈیوٹی کی شرح ۳۰ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد کرنا۔

...... ٹیلی مواصلات کے آلات پر ڈیوٹی کی شرح ۴۰ فی صد سے گھٹا کر ۳۰ فی صد کرنا اور ان کے پارٹس پر ڈیوٹی کی شرح ۳۰ فی صد سے گھٹا کر ۲۰ فی صد کرنا۔

ہائی ٹیک انوسٹمنٹ پارک قائم کرنے کے لیے دو کروڑ روپے کی رقم الگ سے مختص کی گئی ہے۔ اس پروگرام کا مقصد کثیر الپہلو ذرائع ابلاغ (ملٹی میڈیا) اور ورچول رئیلٹی کی پیش آمدہ تکنالوجیوں کی وسیع پیمانہ پر ترقی اور استعمال کو فروغ دینا ہے۔

قومی اطلاعاتی بنیادی ڈھانچہ کے لیے ۵ کروڑ روپے کی ایک رقم بھی فراہم کی گئی ہے۔ پروگرام کا خاص مقصد اطلاعاتی تکنالوجی میں عصری اوزاروں کے استعمال کا مظاہرہ کرنا، کام کی مجموعی اہلیت میں اضافہ کرنا، فیصلہ سازی میں تاخیر کے عمل کو گھٹانا اور اطلاعات تک رسائی کو بہتر بنا کر انسانی وسائل کو زیادہ سے زیادہ استعمال میں لانا ہے۔ ●

تحقیقات و ترقیات کے لیے بجٹ تخصیص میں اضافہ

تکنالوجی ترقیات بورڈ کے لیے تخصیص مرکزی بجٹ برائے سال ۹۸-۱۹۹۷ء میں گزشتہ سال کے مقابلہ میں دوگنا سے زائد کردی گئی ہے۔ ۷۰ کروڑ روپے کی رقم گزشتہ سال بورڈ کے قیام کے لیے ۳۰ کروڑ روپے کی تخصیص کے ساتھ مختص کی گئی تھی۔ بورڈ نے دس پروجیکٹوں کی پہلے ہی نشاندہی کرلی ہے جو یہ ہے فارماسیوٹیکل کیمیکل، صحت اور زراعت کے میدانوں میں تجارتی اہمیت کے پروجیکٹ۔

گزشتہ سال کے بجٹ میں لائے گئے "روپے کے بدلے روپے" کی اسکیم متواتر جاری رکھی جائے گی۔ یہ اسکیم سی۔ ایس۔ آئی۔ آر اور آئی۔ سی۔ اے۔ آر تجربہ گاہوں نیز آئی۔ آئی۔ ٹی اداروں پر نافذ ہوگی۔ یہ آر۔ اینڈ۔ ڈی کی صنعت کے ساتھ لمبی مدت کے رابطوں کے قیام اور اس کی تکنالوجیوں کے مارکیٹنگ کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ ایک الگ عنوان کے تحت سی۔ ایس۔ آئی۔ آر تجربہ گاہوں کی جدید کاری کے لیے ۵۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ بجٹ میں سرکار کے ذریعہ فنڈ مہیا کی گئی سوسائٹیوں کو جنھیں سائنسی اور صنعتی تحقیقات ...

... کے محکمہ نے تسلیم کرلیا ہے، نجی شعبہ کی کمپنیوں کی اکویٹی میں سرمایہ کاری کی اجازت دینے کی تجویز ہے یہ ادارے نقد مال نہیں جٹائیں گے بلکہ اپنی معلومات اور عملی استعداد بطور اکویٹی جٹائیں گے۔ بجٹ میں ۴۵ سال کی عمر سے کم سائنس دانوں کے لیے "سوَرن جینتی" فیلوشپ رکھی گئی ہے۔ سرکردہ سائنس دانوں کو عالمی درجہ کی سطح حاصل کرنے کے لیے مالی امداد دی جائیں گی۔ اس مقصد کے تحت پونجی بڑھانے کے لیے ۵۰ کروڑ روپے الگ رکھ لیے گئے ہیں۔ ●

گنگا کلیان یوجنا کے لیے ۲۰۰ کروڑ روپے

۹۸-۱۹۹۷ء کے مرکزی بجٹ میں گنگا کلیان یوجنا کے لیے ۲۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ یہ اسکیم یکم فروری ۱۹۹۷ء کو قومی پیمانہ پر شروع کی گئی تھی۔ کچھ چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے ساتھ یہ اسکیم اسی نام کی اس اسکیم کے طرز پر تیار کی گئی ہے جس پر چند سال قبل کرناٹک میں عمل کیا گیا تھا۔ گنگا کلیان یوجنا کا تصور سب سے پہلے وزیر اعظم ایچ ڈی دیو گوڑا نے اس وقت پیش کیا تھا جب وہ کرناٹک کے وزیر اعلا تھے۔

مرکز کے اہتمام میں تیار کی گئی گنگا کلیان یوجنا کا بنیادی مقصد معاشرہ کے غریب ترین لوگوں میں کمزور ترین لوگوں کی مدد کرنا ہے۔

اس اسکیم کا خاص زور اس بات پر ہے کہ زیر زمین پانی کو استعمال میں لا کر ان چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کو آب پاشی کی سہولیات فراہم کی جائیں جن کی آمدنی ۱۰۰۰ روپے ماہانہ سے کم ہے۔ اس سے استفادہ کرنے والے کم از کم ۵۰ فی صد افراد شیڈولڈ کاسٹس اور شیڈولڈ ٹرائبس کے ارکان ہوں گے۔ استفادہ کرنے والوں کا انتخاب جنرل باڈی کے کھلے جلسوں میں متعلقہ افسروں کی موجودگی میں گرام سبھا کرے گی۔ مرکز ۸۰ فی صد مالی بوجھ اٹھائے گا جب کہ باقی ماندہ رقم ریاستی حکومتیں دیں گی۔ اس اسکیم پر ضلعی دیہی ترقیاتی ایجنسیاں (ڈی۔ آر۔ ڈی۔ اے) اور ضلع پریشدوں کے ذریعہ عمل ہو رہا ہے۔

اسکیم کے تحت ۷۵ فی صد سبسڈی (رعایت یا چھوٹ) شیڈولڈ کاسٹس، شیڈولڈ ٹرائبس اور جسمانی طور پر معذور گروپوں کو ملے گی اور ۲۵ فی صد دوسروں کو۔ فی گروپ سرمایہ کی حد ۴۰۰۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔ انفرادی طور پر استفادہ کرنے والے کو اسکیم کے تحت فی ایکڑ زمین پر ۵۰۰۰ روپے سبسڈی (چھوٹ) ملے گی مگر ہر استفادہ کرنے والے کے لیے چھوٹ کی حد ۱۲۰۰۰ روپے ہوگی۔ ●

کستوربا گاندھی سوتنترتا ودیالیہ اسکیم

حالیہ بجٹ کی نمایاں جھلکیوں میں ایک قابل ذکر نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک نئی اسکیم کا اعلان ۱۰ مارچ ۱۹۹۷ء کو کیا گیا ہے جس کا نام ہے کستوربا گاندھی سوتنترتا ودیالیہ ملک کی آزادی کے پچاسویں برس میں یہ نئی اسکیم اس لیے شروع کی جا رہی ہے کہ نسبتاً کم شرح خواندگی والے قبائلی علاقوں سمیت ملک بھر کے منتخبہ اضلاع میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے جائیں۔

لڑکیوں کے لیے اسکول مولانا آزاد فاؤنڈیشن کے تحت کھولے جا رہے تھے تاہم ۵۰ ۲ کروڑ روپے کی یہ نئی تخصیص دیہی علاقوں میں نہ صرف لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دے گی بلکہ اس سے مزید روزگار مواقع بھی فراہم ہوں گے۔ ●

محکمہ ڈاک کے تخمینہ مصارف میں اضافہ

محکمہ ڈاک کے لیے سال رواں کے بجٹ میں ۹۵ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں جس سے گزشتہ سال کے نظرثانی شدہ تخمینہ جات میں جو ۸۵ کروڑ روپے کے تھے اضافہ کی نشاندہی ہوئی ہے۔

اس میں سے ۲۹٫۹۳ کروڑ روپے تکنالوجی کا معیار بلند کرنے بشمول پوسٹل کاؤنٹر خدمات اور دیگر فرنٹ آفس خدمات کی جدید کاری، سٹیلائٹ سے منی آرڈر بھیجنے کی سہولیات میں توسیع، میٹرو اور بڑے شہروں تک پریمیم سیونگز بینک خدمات کی توسیع اور پوسٹل اسٹور ڈپوؤں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے کام شامل ہیں۔ ۷۹٫۸ کروڑ روپے کی رقم ڈاک کی چھٹی کی جدید کاری کو مزید مستحکم بنانے کے لیے مختص کی گئی ہے جب کہ ۵٫۳ کروڑ روپے کی رقم قابل قدر خدمات کو روشنی میں لانے کے لیے کاروباری ترقی اور ...

مارکیٹنگ کے لیے مختص کی گئی ہے۔

۴۰ء۸۷۶ لاکھ افرادی دن کے بقدر روزگار

جواہر روزگار یوجنا اور روزگار یقین دہانی اسکیم (ای اے ایس) کے تحت ملک میں اب تک ۴۰ء۸۷۶ لاکھ افرادی دن کے بقدر روزگار فراہم کرایا گیا ہے۔ تقریباً ۹۰ء۴ لاکھ کنبوں کو مربوط دیہی ترقیات پروگرام کے تحت مدد دی گئی ہے۔ جے آر وائی اور ای اے ایس اجرت روزگار پروگرام دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت کے ذریعہ نافذ کیے جا رہے ہیں۔ جے آر وائی اور آئی آر ڈی پی پر ملک بھر میں عمل درآمد ہو رہا ہے اور ای اے ایس ۳۲۹۴ بلاکوں پر احاطہ کرتا ہے۔ حکومت ان پروگراموں پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کا عمل کرتی ہے اور اس پروگرام کی اثر انگیزی اور اس کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے ضروری اقدام کرتی ہے۔ ●

اپریل ۹۶ء تا جنوری ۹۷ء دستکاریوں کی برآمد

برآمد کے عارضی اعداد و شمار کے مطابق، اپریل۔ ۱۹۹۶ء، جنوری ۱۹۹۷ء کے دوران ہاتھ کی بنی قالینوں سمیت دستکاریوں کی برآمد کا تخمینہ ۸۸ر۴۶۴۱ کروڑ روپے (۵۶ر۱۳۰۷ ملین امریکی ڈالر) کا ہے جب کہ سابقہ برس اس مدت میں ۲۰ر۴۱۱۱ کروڑ روپے (۶۳ر۱۱۷۴ ملین امریکی ڈالر) کی دست کاریوں کی برآمد ہوئی تھی۔ اس طرح ۹۱ر۱۲ فی صد کا اضافہ روپے کے حساب سے اور ۳۲ر۱۱ فی صد کا اضافہ ڈالر کے حساب سے ہوا ہے۔

دست کاریوں کی برآمدات میں اضافہ کے لیے بہت سی اسکیموں پر عمل کیا جا رہا ہے جن میں مہارت کو بہتر بنانے کی تربیت، ڈیزائن اور تکنیکی ترقی، تکنالوجی کو بہتر بنانے کے لیے مشترکہ سہولت کے مراکز کی جدید مشینوں اور آلات کے ساتھ تشکیل، ان کم مشہور دست کاریوں کی ترقی اور فروغ جن کے درآمد کیے جانے کے امکانات کافی ہیں، عدم توجہی کا شکار روایتی دست کاریوں میں جان ڈالنے، دست کاریوں کی پیکجنگ کے لیے خصوصی تربیت، نمائشوں اور میلوں میں شرکت، غیر ممالک میں فروخت و بکری کی ٹیموں کو بھیجنا اور ہندوستان میں بین اقوامی معیار کی دست کاری اور قالینوں کی نمائشیں منظم کرنا شامل ہے۔ ●

کافی کی پیداوار بڑھانے کے اقدامات

۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران ہندوستان نے ۲۲۳۰۰۰ ٹن کافی پیدا کی۔ اس میں سے ۱۰۳۲۵۱ ٹن "عربیکا" اور ۱۱۹۷۵۰ ٹن "روبسٹا" قسم کی کافی تھی۔ ہندوستان میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں کافی کی پیداوار صرف ۸۳ر۱۸ ٹن تھی یعنی ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۲۲۳۰۰۰ ٹن تک کافی کی پیداوار پہنچ جانے سے اس کی پیداوار میں لگ بھگ ۱۲ گنا اضافہ ہوا ہے۔ کافی کے گھریلو استعمال کا تخمینہ لگ بھگ ۵۵۰۰۰ ٹن ہے۔ کافی پیداوار بڑھانے کے لیے کافی بورڈ کئی منصوبہ جاتی پروجیکٹوں پر عمل کر رہا ہے اور کئی ترقیاتی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ مثلاً زیادہ کاشت، کافی کے پودوں کو ایک جگہ سے لے جا کر دوسری جگہ لگانے اور معیار کو بہتر بنانے کے پروگراموں پر عمل پیرا ہے۔ یہ بورڈ زراعتی تحقیق، توسیع، قرض اور سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کرنے اور "بیرن" تیار کرنے کے لیے کافی کے بیج کی فراہمی کی طرح کے ضروری امدادی کام کرنے میں بھی مصروف ہے۔

کافی کی ریاست وار پیداوار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کافی کی مجموعی پیداوار میں کرناٹک کا حصہ ۳ر۱۷ فی صد، کیرلا کا حصہ ۲ فی صد، تامل ناڈو کا حصہ ۸ر۷ فی صد اور دیگر ریاستوں کا حصہ ۷ر۰ فی صد ہے۔ روایتی طور پر کافی کے لیے ایک اچھا برآمدی بازار بھی دستیاب ہے۔ ہندوستان سے برآمد ہونے والی کافی کی مقدار اور قیمت میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ کافی کی برآمد سے ۱۹۸۰-۸۱ء میں ۷۷ر۲۱۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی تھی جب کہ ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۱۵۲۴ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی۔ ●

ریلوے پیداواری اکائیوں کی کارکردگی

ریلوے کی تمام تر پیداواری اکائیوں نے رواں مالی برس کے پہلے نو ماہ اپریل۔ دسمبر ۱۹۹۶ء کے دوران اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور تین اکائیوں نے مقررہ نشانہ سے تجاوز بھی کیا ہے۔

ڈیزل لوکوموٹیو ورکس یعنی ڈی ایل ڈبلیو وارانسی نے ۱۱۱ ڈیزل ریل انجنوں کی تیاری کے نشانے کے مقابلے میں ۱۱۵ ڈیزل ریل انجن تیار کیے۔ انٹگرل کوچ فیکٹری (آئی سی ایف) چینئی نے تیاری کے نشانہ ۷۹۴ کے مقابلے میں ۷۰۰ ڈیزل انجن تیار کیے۔ وہیل اینڈ ایکسل پلانٹس (ڈبلیو اے پی) بنگلور نے ۵۶۸۲۳ پہیوں کے نشانہ کے مقابلہ میں ۵۷۸۰۰ پہیے اور ۲۳۳۹۷ دھروں (ایکسلز) کے نشانہ کے مقابلہ میں ۳۳۴۲۵ دھرے تیار کیے۔ چترنجن لوکوموٹیو ورکس (سی ایل ڈبلیو) نے ۱۰۸ بجلی انجن بنا کر محض نشانہ ہی کی تکمیل کی جب کہ ریل کوچ فیکٹری کپورتھلہ نشانہ پورا نہیں کر سکی۔ اس نے ۷۴۸ کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۶۹۴ کوچیں ہی بنا کر دیں۔ کوچوں کی تیاری میں کمی آر سی ایف میں لگ بھگ دو مہینوں کی ہڑتال کی وجہ سے آئی۔ دسمبر ۱۹۹۶ء میں تیار کیے گئے چار پہیوں والے ویگنوں کی تعداد ۲۴۶۰ تھی جب کہ اس ماہ کے دوران نشانہ صرف ۱۸۶۵ ویگنوں کی تیاری کا تھا۔ ●

ای۔ ایس۔ آئی اسکیم کے تحت حاصل ہونے والے فوائد

ای۔ ایس۔ آئی اسکیم ایک برس کی مدت میں ۹۱ دنوں تک کے عرصے کے لیے علالت سے متعلق چھٹی دینے کی گنجائش فراہم کرتی ہے۔ اگر معاملہ طویل علالت کا ہو تو بیماری کی توسیع شدہ چھٹی اور برسوں تک کی مدت تک کے لیے ۷۰ فی صد تنخواہ کے ساتھ دی جاتی ہے۔ موت واقع ہو جانے، معذور ہونے کی صورت میں جو روزگار کے دوران لاحق ہوئی ہو، اسکیم، اجرت کی ۷۰ فی صد کی شرح کی بنیاد پر ماہانہ پنشن فراہم کرتی ہے۔

اس کے علاوہ ای۔ ایس۔ آئی اسکیم بیمہ شدہ افراد اور ان کے کنبوں کے لیے پوری طبی نگہداشت اور کچھ دیگر فوائد بھی فراہم کرتی ہے۔ عام طور سے ای۔ ایس۔ آئی اسکیم کے تحت دیے جانے والے فوائد مجموعی طور

سے جامع ہوتے ہیں۔ اور ای۔ ایس۔ آئی ایکٹ کے تحت انفرادی اداروں کے ذریعہ دیے جانے والے فوائد کے مقابلے میں بہتر ہوتے ہیں۔ تاہم اگر کوئی ادارہ ایسی ہی سہولیات یا اس سے بہتر سہولیات فراہم کرتا ہے اور اس سے زیادہ رعایت چاہتا ہے تو اسے متعلقہ ریاستی حکومت ای۔ ایس۔ آئی کارپوریشن کے مشورہ سے زیر غور لا سکتی ہے۔ ●

ہندوستانی ریلوں میں بہتر تحفظ

اپریل۔ دسمبر ۱۹۹۶ء کے دوران ہندوستانی ریلوں میں تحفظ کی فراہمی کی کارکردگی میں سدھار کی نشاندہی ہوئی۔ اس عرصہ میں ۳۹۷ حادثے ہوتے جب کہ گزشتہ سال اسی مدت کے دوران ۴۰۱ حادثے ہوئے تھے۔ جنوب مشرقی ریلوے میں حادثات ۴۷ سے گھٹ کر ۴۰ تک آ گئے اور جنوبی ریلوے میں بھی حادثے ۶۹ سے گھٹ کر ۵۱ ہو گئے لیکن کچھ اہم ریلوں بشمول مشرق شمالی اور مغربی ریلویز میں کارکردگی گزشتہ سال جیسی بہتر نہیں رہی۔

حادثوں کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مدت میں ٹرینوں کے پٹری سے اترنے کے واقعات میں کافی کمی آئی۔ اس عرصہ میں حادثوں کی تعداد گھٹ کر ۳۱۹ رہ گئی جب کہ ۱۹۹۵ء میں ان حادثوں کی تعداد ۳۳۱ تھی لیکن ٹرینوں کے ٹکرانے اور ریلوے کراسنگ کے حادثات میں برائے نام اضافہ ہوا۔ ●

کثیرالقومی کمپنیاں بجلی کے شعبہ میں بنیادی ڈھانچہ تعمیر کریں گے

بجلی پروموٹروں سے جن میں کثیر القومی کمپنیاں بھی شامل ہیں۔ میمورنڈم آف انڈر اسٹینڈنگ / لیٹر آف انٹنٹ وغیرہ کے ذریعے بجلی کے سو کروڑ روپے سے زیادہ کی مالیت کے پروجیکٹ قائم کرنے کی ۵۷۔ ایسی تجاویز موصول ہوئی ہیں جن میں غیر ملکی سرمایہ کاری ملوث ہے۔

سینٹرل الیکٹری سٹی اتھارٹی کے ذریعے بجلی کے شعبے میں بجلی کے پروجیکٹ قائم کرنے کے لیے الیکٹری سٹی سپلائی ایکٹ ۱۹۴۸ء کی رو سے تکنیکی و اقتصادی منظوری دینے کے لیے پروجیکٹ کی ضرورت، محصول کی مناسبت اور کارخانہ میں نصب کیے جانے والے آلات کی نوعیت کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ ●

ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے فنڈ

کپڑے کی صنعت کے معیار کو بڑھا کر کپڑے کی صنعت کی جدید کاری کی تجویز زیر غور ہے۔ بھارتی کپڑا صنعت کی پیداوار اور معیار کو بڑھا کر اس کو برآمداتی منڈی میں شامل ہونے کے لائق بنایا جائے گا۔ اس اسکیم کے تفصیلات ابھی طے ہونا باقی ہیں۔ ●

کچھ اور خبریں۔ ۔ ۔ ۔

● چالیس ہزار ٹن سالانہ کی مقررہ صلاحیت کی نئی کولڈ رولنگ مل قائم کرنے کی بھارت الومنیم کمپنی لمیٹڈ (بالکو) کی تجویز حکومت نے منظور کر لی ہے جس میں پتلی چادریں اور ۰.۰۴ ایم۔ ایم سے کم موٹائی کے کوائل تیار کیے جائیں گے۔ اس مل کے قیام پر ۱۹۹۶ء کی آخری سہ ماہی کی قیمت کی سطح کے مطابق ۱۵۰،۵۷۱ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری ہوگی۔
نئی کولڈ رولنگ مل کی تعمیر کی معیاد ۳۶ ماہ ہے۔ ●

● دہلی پولیس کے بہادر انسپکٹر ابھے کمار کی بیوہ کو ۲ لاکھ روپے کا ایک چیک پیش کیا گیا۔ یہ پولیس افسر ۳ مارچ ۱۹۹۷ء کی رات کو مغل سرائے کے قریب ہوڑہ جا رہی ۲۳۱۲ ہوڑہ کالکا میل میں ڈاکوؤں سے مقابلہ کے دوران ہلاک ہو گیا تھا۔ اس مقابلہ میں ابھے کمار نے ۲ ڈاکوؤں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اپنی جان بھی قربان کر دی تھی۔

بقیہ کور ۲: زہر پی رہا ہے شہر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

درختوں کے پتوں میں سوراخوں کے ذریعہ داخل ہوتی ہے اور شادابی کو برباد کر کے زندگی بخش مادہ کو جذب کر لیتی ہے اس سے پودوں میں روشن کے عملی انجذاب پر اثر پڑتا ہے، جس کے تحت پودے خوردنی مواد تیار کرتے ہیں اور آکسیجن چھوڑتے ہیں۔ سلفر ڈائی آکسائڈ کے اثر کا زمین پودوں کی نسلیں خراب ہو سکتی ہیں اور پودے بیکار ہو سکتے ہیں۔ یہ گیس آدمی کے پھیپھڑوں کے لیے انتہائی موذی ہوتی ہے اس کے علاوہ یہ گیس ہوا میں موجود نمی کو جذب کر کے سلفیورک ایسڈ بناتی ہے۔ یہ نقصان دہ ایسڈ برسات کا سبب بنتا ہے۔ ممبئی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ چیمبور عام طور سے ایسڈ سے معمور ہوا سے گھرا رہتا ہے۔ آج کل شہر کا کوڑا بھسم کرنے کی بات بڑے زور شور سے پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ اس طریقہ سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن غور طلب ہے کہ شہر کی گندگی میں خاص طور سے پلاسٹک یا پی وی سی تھیلے ہوتے ہیں جنہیں جلانے سے ڈائیوکسن گیس نکلتی ہے اس ڈائیوکسن گیس کو دنیا میں سب سے زیادہ زہریلا قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ شہری اور صنعتی دونوں ہی طرح کی کثافتوں میں پارہ، سیسہ، کیڈمیم اور کرومیم وغیرہ ہوتے ہیں۔ پارہ جسم کی رگوں پر براہ راست حملہ آور ہوتا ہے۔ کیڈمیم کو سانسوں کا زہر کہا گیا ہے۔ یہ خون کے دباؤ کو بڑھا کر قلب سے متعلق بیماری پیدا کرتا ہے۔

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج پورا کا پورا شہر زہر پینے کے لیے مجبور ہوتا جا رہا ہے۔ اگر قبل از وقت ہم نے اس مسئلہ سے نبرد آزما ہونے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تو وہ دن دور نہیں جب پورا عالم ہی تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا۔

دیہی علاقوں میں روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا دیہی علاقوں میں صنعت و حرفت کو پھیلایا جائے۔ زراعت پر مبنی صنعتیں کھولی جائیں۔ سماج اور ملک کے لیے مفید کاموں میں دیہی مزدوروں کو مزدوری پر لگایا جائے۔ دوسرا گاؤں کے لوگوں کو قرض مہیا کرا کے انھیں اپنا روزگار شروع کرنے کی ترغیب دی جائے۔ مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں نے دیہی غربت دور کرنے کے لیے ان دونوں اسکیموں کو سب سے مقدم قرار دیا ہے۔

حکومت نے دیہی علاقوں میں مخصوص روزگار مہیا کرنے اور غربت ختم کرنے کے کئی پروگرام تیار کیے ہیں۔ ان میں سے چند خاص پروگرام یہ ہیں۔

مربوط دیہی پروگرام، (آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی) خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کو ٹریننگ (ٹرائی سیم) جواہر روزگار اسکیم (جے۔ آر۔ وائی) اور نہرو روزگار یوجنا، (این۔ آر۔ وائی) اور مقررہ روزگار اسکیم۔

اس کے علاوہ سرکار نے انسدادِ غریبی اور انسداد ناحرف شناسی، بوڑھوں اور خطِ غریبی سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو راحت پہنچانے کے لیے بہت سی اسکیمیں شروع کی ہیں۔

قومی سماجی امداد پروگرام (این۔ ایس۔ اے۔ پی) کی قومی ضعیفی پنشن اسکیم، (این۔ او۔ اے۔ پی۔ ایس) کے تحت ۶۵ سال سے زیادہ عمر کے بے سہارا بزرگوں کو ۷۵ روپے ماہوار پنشن مہیا کی جاتی ہے۔ قومی خاندانی بھبود اسکیم (این۔ ایف۔ بی۔ ایس) کے تحت قدرتی وجوہات سے کنبہ کے پالنے والے کی موت ہونے پر غمزدہ کنبے کو ۵ ہزار اور حادثے میں فوت ہونے پر دس ہزار روپے دیے جاتے ہیں۔ قومی زچہ بھبود اسکیم کے تحت پہلے دو زندہ بچوں تک زچہ کو تین سو فی حمل کے حساب سے دیے جاتے ہیں۔ سرکار نے گاؤں میں رہنے والوں کے لیے گروپ بیمہ اسکیم بھی شروع کی ہے۔ یہ اسکیم زندگی بیمہ کارپوریشن کے ذریعہ پنچایت کے تعاون سے چلائی جا رہی ہے۔ ۲۰ سے ۶۰ سال کے لوگ اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں۔ ۶۰ سے ۷۰ روپے سالانہ پریمیم دینے پر پالیسی دار کو ۵ ہزار روپے حیاتی زرہ کے طور پر دیا جاتا ہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ء کو یہ اسکیم بارہ ریاستوں اور مرکز کے تحت علاقہ جات میں لاگو کی گئی۔

اہلِ دیہات کی غربت ان کی قوت خرید بڑھا کر دور کی جا سکتی ہے۔ چوں کہ دیہاتوں میں زراعت کے لیے اور مزید زمین نہیں ہے۔ لہٰذا اتنی بھاری تعداد میں گاؤں میں رہنے والوں کی قوت خرید اور زراعت اور مویشیوں پر مبنی صنعتوں کا اضافہ کر کے اور دیگر مشاغل شروع کر کے بڑھائی جا سکتی ہے۔ کوئی بھی مشغلہ شروع کرنے کے لیے پونجی کی ضرورت پڑتی ہے اور غربت کی زندگی گزارنے والے زیادہ تر گاؤں والے لوگ پونجی کا انتظام کہاں سے کر سکتے ہیں؟

قرض

سرکار تقریباً دو دہوں سے بے سہارا لوگوں کو بینکوں اور دیگر مالی اداروں سے پیداواری کاموں کے لیے قرض مہیا کرا رہی ہے۔ سرکار کی کوشش رہی ہے کہ دیہی علاقوں میں کسانوں، بے زمین مزدوروں، کاریگروں، دستکاروں اور اپنا کام دھندہ شروع کرنے والوں کو آسانی سے اور مناسب شرح سود پر قرض دستیاب ہو جائے۔ پہلے نقدی قرض کی امداد صرف تھوڑے سے کسانوں کو میسر تھی اب یہ امداد قریب قریب سبھی کسانوں کو حاصل ہے۔

دیہی علاقوں میں تعمیر و ترقی کے لیے دو ہزار کروڑ روپے سے ایک مخصوص فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کو قرض منظور کرنے کی خاص اسکیمیں ہیں چھوٹی صنعتوں کے حلقوں کو قرضوں کی فراہمی میں سدھار لانے کے لیے ایک ۷ نکاتی پروگرام بنایا گیا ہے۔ ابتدائی بنکر امداد باہمی سوسائٹیوں اور ہتھ کرگھا حلقوں کے بنکروں کے لیے بینک قرض، تکنالوجی کی ترقی اور جدید کاری فنڈ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے کھادی کمیشن کو پبلک بینکوں کے ذریعہ ایک ہزار کروڑ روپے مہیا کرائے جا رہے ہیں۔ اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی قیادت میں سرکاری حلقے کے بینکوں کی ایک امدادی تنظیم قائم کی گئی ہے۔ جو درج فہرست ذاتوں اور قبائل کو قرض دیتا ہے۔

ریزرو بینک نے چھوٹے اور غریب لوگوں کو قرض مہیا کرانے کے لیے کامرس بینکوں کو احکام جاری کیے ہیں کہ وہ اپنے کل بینک قرض کا دس فی صد چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں، بے زمین مزدوروں، اسامی کاشت کاروں، بٹائی داروں، کاریگروں، دیہی اور چھوٹی صنعتوں میں لگے لوگوں کو مہیا کریں۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لوگوں کو رعایتی شرح سود پر قرض دستیاب کرایا جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۹۴ء کے آخر میں پبلک بینکوں کے ذریعہ سماج کے کمزور طبقوں کے لوگوں کو ۹۷، ۱۲اکروڑ روپے کا قرض دیا جا چکا ہے۔

بینکوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے کل قرضے کا ۱۸ فی صد زراعتی حلقوں کو براہ راست رقم کی شکل میں دیں۔ ہر ریاست میں زراعتی حلقے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خاص زرعی شاخیں کھولی جائیں۔ مارچ ۱۹۹۶ء تک ملک میں ایسی ۶۵ شاخیں کام کرنے لگی تھیں۔

سماج کے کمزور طبقوں میں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لوگوں کی حالت خاص طور پر تشویشناک ہے۔ ان کی حالت سدھارنے اور انھیں سماج کے دیگر طبقوں کے برابر لانے کے لیے خاص کوشش کی ضرورت ہے۔ بینکوں سے کہا گیا ہے کہ انھیں اپنا کام دھندا شروع کرنے کے مقصد سے کافی قرض مہیا کرانے کے لیے خاص کوششیں کی جائیں۔ مارچ ۱۹۹۴ء کے آخر میں پبلک سیکٹر کے بینکوں نے درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے ۱۵، ۹ لاکھ لوگوں کو ۲۷، ۴ کروڑ روپے کے قرض مہیا کرائے تھے۔

حکومت نے زراعت اور دیہی ترقی کی ضرورتیں پوری کرانے کے لیے ۱۲ جولائی ۱۹۸۲ء کو ایک خاص بینک، نیشنل بینک آف ایگری کلچر اینڈ رورل ڈیولپمنٹ (نابارڈ) یا قومی زراعت اور دیہی ترقی بینک، قائم کیا۔ اس بینک کی ادا شدہ پونجی سو کروڑ روپے تھی۔ ریزرو بینک اور حکومت ہند اس پونجی میں برابر کے حصہ دار تھے۔ یہ بینک ترقی زمین بینکوں، ریاستی امدادی بینکوں، درج فہرست کورس بینکوں اور علاقائی دیہی بینکوں کو قرض مہیا کرتا ہے۔ لوگوں کو انفرادی طور پر بھی پیداواری کاموں کے لیے قرض دیا جاتا ہے۔

باقی صفحہ ۴۰ پر

ڈاکٹر ابوسعد خاں

ہندوستان میں سائیکل سازی کی صنعت

سائیکل عام ہندوستانیوں کی اہم سواری ہے۔ شہروں، قصبوں اور گاؤوں میں کم آمدنی والے ہر فیملی کے پاس سائیکل ہے۔ طالب علم، ڈاکیہ، کلرک اور پولیس مین وغیرہ جیسے اوسط آمدنی والے لوگوں کے لیے سائیکل آج تیز رفتار مشینی زندگی کی بھاگ دوڑ میں اہم حصہ دار ہے۔ ہمارے ملک میں یہ سب سے سستا ذریعہ نقل وحمل ہے۔

دنیا کے کئی دوسرے ممالک مثلاً چین، انگلینڈ، جرمنی، فرانس، پاکستان، ملیشیا، انڈونیشیا اور امریکہ وغیرہ میں بھی سائیکل مقبول ترین سواری ہے۔ چین کو "سائیکلوں کا ملک" ہی کہا جاتا ہے، جہاں امیر و غریب، انجینیر، ڈاکٹر، پروفیسر یہاں تک کہ سکریٹری وغیرہ بھی سائیکل کی سواری کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

عالمی طور پر سائیکل کی اس بڑھتی مقبولیت کی کئی وجوہات ہیں جن میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ سائیکل، قیمت اور خرچ کے لحاظ سے عام آدمی کی قوت خرید کے اندر ہے۔ کم دوری کے روزمرہ سفر کے لیے سائیکل سے آسان اور سستا کوئی دوسرا متبادل ذریعہ موجود نہیں ہے۔ پٹرول اور ڈیزل کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور آلودگی نے سائیکل سواری کو دنیا کے کئی ممالک میں مقبولیت عطا کی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں سائیکل سواری کی طرف لوگوں کا رجحان پھر سے بڑھا ہے۔

ہمارے ملک میں سائیکل سازی کی صنعت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہاں اس صنعت کی شروعات ۱۹۳۸ء میں ہوئی جب انڈین سائیکل مینوفیکچرنگ کمپنی کے نام سے کلکتہ میں ایک کمپنی قائم ہوئی، جو صرف سائیکل کے پرزے بنانے کا کام کرتی تھی۔ اس کے بعد دو کمپنیاں "ہندوستان بائیسائیکل مینوفیکچرنگ اینڈ انڈسٹریل کارپوریشن پٹنہ" اور "ہند سائیکل لمٹیڈ ممبئی"، مکمل سائیکل بنانے کے لیے قائم ہوئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ صنعت زیادہ ترقی نہیں کرسکی۔ ۱۹۴۲ء میں مشہور صنعت کار ایل۔ این برلا اور جے۔ ڈی۔ کپور وغیرہ نے کئی دوسرے سائیکل سازی کے مالکوں کے ساتھ ایک یونین کی تشکیل کی۔ ان سب کاوشوں کے باوجود ہمارے ملک میں سائیکل سازی کی صنعت خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکی۔ آزادی سے قبل تقریباً چار پانچ کروڑ روپے کی سائیکلیں درآمد کی جاتی تھیں۔ فی ہزار آبادی پر سائیکلوں کی تعداد صرف ۳۸ تھی۔

آزادی کے بعد اس صنعت نے کافی ترقی کی۔ اس صنعت کی ترقی میں حکومت نے بھی کافی دلچسپی دکھائی اور بھرپور امداد کی۔ سائیکل سازی کے تین نئے کارخانے قائم کیے گئے۔ (۱) ٹی۔ آئی۔ سائیکل آف انڈیا مدراس (۲) سین۔ ریلے انڈسٹریز آف انڈیا آسنول (۳) اٹلس سائیکل انڈسٹریز کمپنی سونی پت۔

سائیکل سازی کے میدان میں خود کفالت حاصل کرنے کے مقصد سے حکومت نے ۱۹۵۹ء میں سائیکلوں کی درآمدات پر پابندی نافذ کردی۔ ۱۹۶۹ء میں "ہند" اور "ریلے" سائیکل بنانے والی پرائیویٹ کمپنیوں کو قومیا لیا گیا۔ سائیکل سازی کی صنعت میں حکومت کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے ۱۹۷۰ء میں بھارت دنیا کے پانچ اہم سائیکل بنانے والے ممالک کی فہرست میں آگیا۔ اس وقت ملک میں سائیکل سازی کے ۳۰ کارخانے ہیں جن میں ۱۲ بڑے کارخانے ہیں۔ ۶۰ یونٹوں میں سائیکل کے مختلف قسم کے پرزے تیار کیے جاتے ہیں۔ ان چھوٹی بڑی یونٹوں میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد تقریباً ۲ لاکھ سے زیادہ ہے۔ سائیکلوں کی مرمت میں لگے تقریباً ۵۵ لاکھ لوگوں کو روزگار مہیا ہورہا ہے جب کہ سائیکل فروخت کرنے والوں کی تعداد تین لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔

اس وقت ملک میں سائیکل سازی کے کارخانوں میں سائیکل بنانے کی گنجائش سالانہ دو کروڑ ۲۰ لاکھ ہونے کے باوجود صرف ایک کروڑ ۱۵ لاکھ سائیکلیں ہی تیار ہوتی ہیں۔ اس طرح سائیکل سازی کی صنعت ملک کی مانگ پوری کرنے میں قاصر ہے۔ فی ہزار آبادی پر صرف ایک سو سائیکلیں موجود ہیں جو کافی کم ہیں۔ سائیکل سازی کی صنعت کو ترقی دینے کی بہت گنجائش موجود ہے۔

آج کل دنیا میں نئی تکنیک سے بنی ہلکی

صدر شعبۂ جغرافیہ۔ فخرالدین علی احمد گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج۔ محمود آباد (سیتاپور) یوپی

سائیکلوں کی مانگ ہے۔ عالمی سطح پر چین اور تائیوان میں بنی نئی ڈیزائنوں کی سائیکلیں کافی مقبول ہیں۔ ہندوستانی سائیکل سازی کی صنعت کو انھیں دونوں ملکوں کی سائیکل سازی کی صنعت سے اصل مقابلہ درپیش ہے۔

بھارت میں ۱۹۷۰ء کے عشرے میں صرف کالے اور ہرے رنگ کی سائیکلیں بنتی تھیں۔ لیکن اب کئی رنگوں میں مختلف ڈیزائنوں کی خوب صورت سائیکلیں جن کی قیمتیں دو ہزار روپے تک ہوتی ہیں، بازاروں میں آگئی ہیں جو نوجوانوں میں کافی مقبول ہو رہی ہیں۔

سائیکل سازی کی صنعت کو مزید ترقی دینے کے لیے دہلی میں ایک سائیکل نمائش "سائیکو انڈیا۔ ۱۹۹۶ء" ۱۸ مارچ ۱۹۹۶ء کو لگائی گئی تھی۔ اس نمائش کا خاص مقصد تھا کہ ہمارے ملک کی سائیکل سازی کی صنعت دوسرے ممالک خاص طور سے چین اور تائیوان کی سائیکل سازی کی صنعت سے مقابلہ کر سکے۔

سائیکل کی بڑھتی ہوئی عالمی مانگ کے مدنظر ہندوستانی سائیکل سازی کی صنعت کو جدید تکنیک اپنانی چاہیے اور اس میدان میں نئے تحقیقی کاموں کو فروغ دینا چاہیے تاکہ ہلکی، کم محنت سے نسبتاً تیز رفتار سے چلنے والی سائیکلوں کو فروغ دیا جا سکے۔

ہندوستانی سائیکل سازی کی صنعت نے عالمی بازار میں جگہ بنائی ہے لیکن آج بھی وہ دنیا کے کئی دوسرے سائیکل برآمد کرنے والے ممالک کے مقابلے پیچھے ہے۔ تائیوان، ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسے چھوٹے ممالک بہترین منصوبہ بندی، اچھی حکمت عملی اور بدلتی ضروریات کے مطابق سائیکل سازی کی صنعت کو ترقی دے کر خوب منافع حاصل کر رہے ہیں۔ عالمی بازار میں ہماری سائیکلوں کا مقابلہ خاص طور سے انھیں ممالک کی سائیکلوں سے ہے۔ چین نے دوسرے ممالک کو بہترین سائیکلوں کو برآمد کر کے بھارت سے برتری حاصل کر لی ہے۔ سائیکل کی مانگ اور سپلائی کے فرق کو کم کرنے کے لیے پیداوار بڑھانے سے موجودہ پیداوار میں گنجائش کا بھرپور استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ برآمدات میں اضافہ کرنے کے لیے کوششیں کرنی ہوں گی۔ اگر سائیکل سازی کی صنعت ہلکے وزن اور اسپورٹ بائیسائیکل کی برآمدات پر زیادہ دھیان دے تو برآمدات میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

آل انڈیا سائیکل مینوفیکچرس ایسوسی ایشن کے مطابق ترقی پذیر ممالک کے بازار کی بدولت ہی بھارتی سائیکلوں کی جو برآمدات ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۱۳۳ کروڑ روپیہ تھی۔ ۱۹۹۱-۹۲ء میں ۲۴۰ کروڑ روپیہ، ۱۹۹۲-۹۳ء میں ۴۴۵ کروڑ روپیہ، ۱۹۹۳-۹۴ء میں ۴۷۵ کروڑ روپیہ، ۱۹۹۴-۹۵ء میں چھ سو کروڑ روپیہ اور ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۸۰۵ کروڑ روپیہ کی سائیکلوں کی برآمدات ہوئی۔ جن ترقی پذیر ممالک میں ہماری سائیکلوں کی زیادہ مانگ ہے ان میں خلیجی ممالک، افریقی ممالک اور جنوب ایشیائی ممالک اہم ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک مثلاً امریکہ، کناڈا اور یوروپی ممالک میں سائیکلوں کی برآمدات میں اضافہ کے لیے تکنالوجی کے معیار کو بہتر کرنا ضروری ہے۔ روڈ ماسٹر کو ہائی ٹیک سائیکلوں کا آرڈر ملا ہے۔ اٹلس، ہیرو اور ایوَن ترقی یافتہ ممالک کو اب بہتر ماڈل برآمد کر رہے ہیں۔ غیر ممالک بازاروں میں، پہاڑوں پر چلائی جانے والی ماونٹینر (MOUNTAINEER CYCLES) سائیکلوں کی مانگ زیادہ ہے اس کے علاوہ دوڑاک (RACER) اور کسرت کرنے والی (EXCERCISER CYCLES) سائیکلوں کی بھی مانگ ہے۔ ان سبھی سائیکلوں میں اعلا قسم کی تکنالوجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہندوستانی سائیکل سازی کی صنعت اس میدان میں اعلا اور جدید قسم کی تکنالوجی کا استعمال کرے تو ہمارے ملک سے ماونٹینر، ریسر اور ایکسر سائزر سائیکلوں کی برآمدات میں اضافہ ممکن ہے۔

حکومت ہند نے ۲۰۰۰ء تک ۲۰ کروڑ سائیکلوں کی مانگ اور سپلائی کے فرق کو کم کرنے کے لیے پیداوار میں اضافہ کرنے، موجودہ پیداواری گنجائش کا بھرپور استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ برآمدات میں اضافہ کرنے کی کوششیں کرنی ہوں گی۔ ●

بقیہ: کرۂ ارض کے درجۂ حرارت میں اضافہ

بڑھ جائیں گی۔ سوکھے اور برسات میں تبدیلی کی وجہ سے کچھ جگہوں پر کھیتی کو ختم کرنا ہوگا تو کچھ نئی جگہوں پر کھیتی شروع کرنا ہوگی۔ دنیا کے گرم حصوں میں گرمی کی حدت میں ۱۵ فی صد کے اضافہ کی توقع ہے اور کئی جگہوں پر قحط کا بھی اندیشہ ہے۔

صرف امریکہ میں پودوں کی تقریباً ۱۳ ہزار نسلیں اور ۱۳ فی صد سے زائد حیوانات کی قسمیں ناپید ہو گئی ہیں۔ اندیشہ ہے اس صدی کے اختتام تک مزید ۱۷۰۰ انواع ختم ہو جائیں گی۔ اسی طرح انڈونیشیا میں گزشتہ ۱۵ برسوں کے دوران دھان کی پندرہ سو قسمیں ختم ہو گئیں، خود ہندوستان میں بتایا جا رہا ہے کہ مینڈھک کی آبادی گھٹتی جا رہی ہے نیز ملیریا جیسی بیماریاں سر ابھارنے لگی ہیں اور فصلوں کو لگنے والے کیڑوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔

چین اور بھارت: شمار آبادی کے لحاظ سے دنیا کے دو بڑے ممالک ہیں ان ممالک میں کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ کوئلہ وہ قدرتی ایندھن ہے جس سے بہت زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے اور ان دونوں ممالک میں یہ ذخائر اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں کہ وہاں اگلے کئی عشروں تک اس کا استعمال بہ آسانی جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک بھی تکنالوجی کے ساتھ ساتھ کوئلہ، تیل اور گیس استعمال کرنے پر مجبور ہیں اور ان کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔

اگر حکومتیں اس بات پر متفق ہو جائیں کہ انھیں گیسوں کے اخراج کے اضافے میں ایک شرح سے کمی کرنا ہے۔ پھر اس شرح کو مستحکم کر لیا جائے اور رفتہ رفتہ مزید کمی کی طرف مائل ہوا جائے تو اس سارے عمل کے لیے ۴۰ سال کا عرصہ درکار ہوگا تب کہیں جا کر آب و ہوا کے تباہ کن اثرات کی شدت میں کمی ہوگی اور کوئی خوشگوار تبدیلی رونما ہو سکے گی۔ ●

دیہی تعمیرِ نو کا عزم

تامل ناڈو کے ضلع والی گانی ویرن از ہادو موستھو کے مغربی گھاٹ کے سلسلے کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع پنانی پورم گاؤں زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اپنے نام کے عین مطابق ہرا بھرا گاؤں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ لیکن گزشتہ تیس برس کے دوران بڑے پیمانہ پر درختوں کے کاٹے جانے کی وجہ سے اس کے قدرتی ماحول کو سخت نقصان سے دو چار ہونا پڑا جس کی وجہ سے لوگوں کی زندگی سبزے اور شادابی سے محروم ہو گئی اور اس کے بعد خشک سالی اور پریشانیوں کا دور شروع ہو گیا جس کی کہانیاں تامل ناڈو کے اس خطہ کے باشندوں کی زبانوں پر ہیں۔ اس عمیق تناظر میں دیہی تعمیرِ نو کے کام میں ۲۰ سال سے زیادہ کے تجربات کا ریکارڈ رکھنے والی ایک تنظیم سارا (ساؤتھ ایشین رورل ری کنسٹرکشن یعنی جنوبی ایشیا کی دیہی تعمیرِ نو) نے پنانی پورم کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔

فلپائنز میں دیہی تعمیرِ نو کے بین الاقوامی ادارے کے بانی جیمس ین کے جذبہ سے ترغیب عمل حاصل کرتے ہوئے، جو صحت، تعلیم، گزر بسر اور قیادت کی چار رخی حکمتِ عملی کے حامی تھے، "سارا" اپنے مشن میں آگے بڑھی۔

"سارا" کے منصوبہ عمل کے شرکا رنیپال، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے رہنے والے ہیں اور پائیدار ترقی کے عمل کے سلسلہ میں انھوں نے جو تجربات حاصل کیے ہیں ان سے مختلف ملکوں میں اس طرح کے دور دراز کے گاؤں کے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔

شروعات

"سارا" نے اپنے پروجیکٹ کی شروعات برساتی پانی کو فصل کے لیے استعمال کرنے، اس کا ذخیرہ کرنے اور قدرتی وسائل کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں مقامی لوگوں کی صلاحیت بڑھانے کی کوشش سے کی۔ پہلا چیلنج یہ تھا کہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع بنجر زمین کو کس طرح ایک تالاب میں تبدیل کیا جائے تاکہ مقامی آبادی کو درپیش پانی کے بحران کو حل کیا جا سکے۔

پروجیکٹ پر مقامی باشندوں کے سرگرم تعاون سے عمل شروع کیا گیا۔ گاؤں کے لگ بھگ ۵۰ کنبوں کو، جن کا تعلق ۱۴ مختلف ذاتوں سے تھا، کوآپریٹو کھیتی باڑی کے تحت چھ ایکڑ کے رقبہ میں ۱۲ لاکھ روپے کے خرچ سے دو بڑے تالابوں "تعمیر و ملائی نائیکر تالاب" اور "ایرو مائی کرن تالاب" کی کھدائی پر مامور کیا گیا۔ اب یہ دونوں تالاب ۵۰۰ مویشیوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور مغربی گھاٹ کے ہاتھی تک اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان تالابوں پر آتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں اور سارا کی کوششوں کے نتیجہ میں اب پنانی پورم کے تمام کنوؤں میں کافی پانی رہتا ہے۔

نئے چیلنج

پانی کی فراہمی کے اس پروجیکٹ کی کامیابی کے نتیجہ میں، جس کی وجہ سے کنوؤں میں پانی کی سطح بڑھتی رہتی ہے، گاؤں کے لوگوں کو کھیتی کرنے کی ترغیب حاصل ہوئی جب کہ اس کے لیے کافی سرمایہ کاری کی ضرورت تھی۔ سارا نے لوگوں کو یہ تعلیم دینے کی کوشش کی کہ "پہلے بچت اور بعد میں قرض"۔

سارا نے گاؤں کی عورتوں سے اپیل کرنے کا راستہ اپنایا۔ یہ کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کیا گیا اور اس کی رفتار بھی سست تھی۔ لوگوں نے ایک یا دو کے گروپ میں شامل ہو کر پیسہ بچانا شروع کیا اور جب کھیتی باڑی کا کام کر کے پیسہ کمانے والوں نے یہ دیکھا کہ ان کے ذریعہ بچائی جانے والی رقم میں اضافہ ہو رہا ہے تو ان میں امید کی کرن پیدا ہوئی۔

عورتوں نے بھی ایک یا دو کے گروپ میں شامل ہونا شروع کیا اور ان کی بچت کی رقم میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ عورتوں کے اس انوکھے بینک کے سرمایہ کو بہت سے چھوٹے موٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے استعمال کیا گیا جیسے سبزی فروشی، پولٹری، بکریوں کی پرورش اور بنائی کے کام۔ گزشتہ ۱۴ مہینوں میں پنانی پورم کی عورتوں نے مل جل کر مجموعی طور پر ۷۶ ہزار روپے کی پونجی جمع کر لی اور اب تک ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپے قرض تقسیم کیے ہیں۔ باہمی تعاون کے جذبہ نے باقاعدگی کے ساتھ قرض کی وصولی میں گاؤں والوں کی بڑی مدد کی ہے اور اب تک ۱۲۲۰۰ روپے وصول کیے جا چکے ہیں۔

سرگرمی کا مرکز

کاشت کاری کے لیے جو زمین چنی گئی

باقی صـ۱۳ پر

ڈاکٹر امبیڈکر - پسماندہ طبقوں کے مسیحا

ہمارے آئین کے معمار اور پسماندہ طبقوں کے مسیحا ڈاکٹر امبیڈکر، جنھوں نے ہندوستان کا مقدر بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، سماج کے ایک کمزور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنی پرکشش شخصیت، جدوجہد، قربانی اور عزم و استقلال کی بدولت وہ شان و عظمت کی بلندیوں پر پہنچ گئے نیز ہماری قومی زندگی اور سیاسی نظام پر ایک انمٹ چھاپ چھوڑی۔

ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیڈکر، جنھیں لوگ پیار سے "بابا صاحب" کہتے ہیں، ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو مہو (مدھیہ پردیش) کے ایک غریب مہار خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ صوبے دار میجر رام جی مالوجی اور بھیم بائی کی چودھویں اولاد تھے۔

جدوجہد کے دن

انھوں نے ابتدائی تعلیم ستارا میں مکمل کی۔ ایک پسماندہ طبقے سے تعلق ہونے کی وجہ سے انھیں تکالیف و مصائب، دقتوں اور دشواریوں کے ساتھ ساتھ بے عزتی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ انھیں مشترکہ برتن سے پانی نہیں پینے دیا جاتا تھا۔ سنسکرت کے استاد نے انھیں پڑھانے سے انکار کر دیا اس لیے انھیں فارسی پڑھنی پڑی۔ لیکن یہ تمام مشکلات ان کا حوصلہ پست نہیں کر سکیں۔ انھوں نے اپنی پڑھائی مسلسل جاری رکھی اور ۱۹۰۷ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ یہ ایک مہار لڑکے کے لیے ایک شاندار کامیابی تھی جس کے لیے ان کی برادری نے ان کی بہت عزت و توقیر کی اور انھیں "گوتم بدھ کی زندگی" نامی کتاب کی ایک جلد بطور اعزاز پیش کی۔ اس کتاب نے ان کی زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ میٹریکولیشن کا امتحان پاس کرنے کے کچھ عرصہ بعد رامابائی سے ان کی شادی ہو گئی۔

اس وقت تک سر نارائن گنیش چنداورکر استحصال پسندی کے شکار طبقات کی ترقی کے لیے "پسماندہ طبقات کا مشن" کے نام سے اپنی جدوجہد شروع کر چکے تھے۔ یہ پسماندہ طبقات کی ترقی و بہبود کے لیے پہلی منظم کوشش تھی۔ اس کی بدولت بھیم راؤ کو بمبئی کے الفنسٹن کالج میں داخلے کا موقع ملا۔ وہاں سے گریجویشن کرنے کے بعد انھوں نے بڑودہ میں ملازمت اختیار کی لیکن حصول علم کے لیے ان کی تشنگی اور ترقی کرنے کی چاہ نے انھیں زیادہ دیر تک ملازمت نہ کرنے دی۔

سنہری موقع

ان کی زندگی میں ایک سنہری موقع اس وقت آیا جب بڑودہ کے مہاراجہ نے انھیں تین ہونہار طالب علموں کے ساتھ اعلا تعلیم کے لیے جولائی ۱۹۱۳ء میں امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں بھیجا۔ انھیں ریاست بڑودہ کے ساتھ ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے پڑے کہ وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد دس سال تک ریاست کی ملازمت کریں گے۔

یونیورسٹی کی آزاد فضا، علمی ماحول اور کتابوں کے شوق نے ان کے ذہنی افق کو وسعت بخشی۔ انھوں نے ذات پات کی رکاوٹوں اور سماجی بندشوں کی پروا کیے بغیر علم کی جستجو جاری رکھنے کا تہیہ کیا۔ امریکہ میں عظیم محب وطن لالہ لاجپت رائے سے ان کی ملاقات ہوئی، جو وہاں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ دونوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ اس طرح بھیم راؤ میں حب الوطنی کے خیالات پیدا ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی جمہوری فکر نے بھی انھیں سچا قوم پرست اور انسانی حقوق و عظمت کا پرخلوص علم بردار بنا دیا۔

امریکہ میں دو باتوں کا ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا۔ پہلی بات یہ تھی کہ وہ امریکی آئین اور بالخصوص چودھویں ترمیم سے، جس میں نیگرو قوم کی آزادی کا اعلان کیا گیا تھا، بہت متاثر ہوئے اور دوسری بات تھی نیگرو کے عظیم مصلح اور معلم بوکر ٹی واشنگٹن کی زندگی، جن کی کوششوں کی بدولت ہی نیگرو قوم صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوئی تھی۔

کولمبیا یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد امبیڈکر نے ۱۹۱۶ء میں لندن اسکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لیا۔ لیکن وظیفے کی مدت ختم ہو گئی اور انھیں مہاراجہ بڑودہ کا ملٹری سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح انھیں ہندوستان لوٹنا پڑا۔ لیکن وہ اپنے علم اور اپنی ذاتی کامیابیوں

کے باوجود اونچی ذات کے ہندوؤں کے تعصبات کو کم نہیں کر سکے۔ خود ان کے ماتحت ان سے بدسلوکی کرتے تھے۔ اس حوصلہ شکن اور افسوس ناک ماحول سے نکل کر وہ بمبئی آگئے۔ چند ماہ ایک کالج میں پڑھانے کے بعد وہ اپنی قانونی اور اقتصادیات کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے لندن چلے گئے۔

۱۹۱۸ء میں ساؤتھ بورو کمیٹی نے، جو مونٹیگو۔ چیمس فورڈ اصلاحات کی روشنی میں ووٹ دینے کے حق کے معاملے پر غور کر رہی تھی، انھیں اپنی بات کہنے کے لیے بلایا۔ انھوں نے پسماندہ طبقات کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے علاحدہ الیکٹوریٹ اور نشستوں کے ریزرویشن کا مطالبہ کیا۔ مگر یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا۔

ان کا مشن

جون ۱۹۲۳ء میں لندن سے واپسی پر انھیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ وہ ابھی تک ایک پسماندہ ہونے کی سماجی لعنت سے چھٹکارا نہیں پا سکے تھے۔ انھوں نے پسماندہ لوگوں کی سماجی و اقتصادی بہتری کے لیے کام کرنے کا اپنا مشن جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں وکالت بھی شروع کر دی۔

انھوں نے کمزور طبقوں کی نمائندگی کے لیے "موک نائک" کے نام سے ایک ۱۵ روزہ مراٹھی اخبار بھی نکالا۔ ان کا خیال تھا کہ غیر برہمنوں کی پسماندگی کی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ پسماندہ طبقے کو ہمیشہ کی غلامی، غربت اور جہالت سے بچانے کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے۔ ہندوستان کے لیے ایک آزاد ملک کا درجہ حاصل کرنا ہی کافی نہیں ہے، اسے ایک اچھے ملک کی حیثیت سے بھی اپنا درجہ بلند کرنا ہوگا۔ ایک ایسے ملک کی حیثیت سے، جس میں لوگوں کے تمام طبقات کو مذہبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی معاملات میں برابری کا درجہ دیا جائے اور ہر انسان کو زندگی میں ترقی کرنے کا موقع حاصل ہو۔

ایک علاحدہ قسم کی تحریک

جب ملک کے دوسرے رہنما ملک کی سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے تو ڈاکٹر امبیڈکر اس کے ساتھ ساتھ پسماندہ طبقات کو اعلا مقام دلانے کے لیے بھی کوشاں تھے۔ ان کی یہ تحریک نفسیاتی نوعیت کی تحریک تھی۔

انھوں نے "بہشکرت ہتکارنی سبھا" کے نام سے ۲۰ جولائی ۱۹۲۴ء کو قائم کی۔۔۔ انجمن کے ذریعے سے ایک سماجی تحریک شروع کی۔ انھوں نے ایک ستیہ گرہ کی رہنمائی بھی کی، جس کا مقصد اکولہ ضلع میں مہاڈ میں ایک عام تالاب سے اچھوتوں کو پانی لینے کا شہری حق دلانا تھا۔ اس ستیہ گرہ سے ہندوستان میں سماجی انصاف کی تاریخ میں ایک اہم موڑ آیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے "موک نائک" کے بعد ۱۹۲۷ء میں "بہشکرت بھارت" نکالنا شروع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے "اکویلیٹی" اور "جنتا" کے نام سے مزید دو اخبارات نکالے۔ ان کی تنظیم "سمر سمتا سنگھ" نے انٹر کاسٹ (مختلف ذاتوں کے درمیان) شادیوں اور مختلف ذاتوں کی مشترکہ ضیافتوں کی حوصلہ افزائی کی۔

سائمن کمیشن نے لندن میں ایک گول میز کانفرنس بلائی جس میں ڈاکٹر امبیڈکر کو پسماندہ طبقوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے ایک مرتبہ پھر پسماندہ طبقات کے لیے علاحدہ الیکٹوریٹ کی ضرورت پر زور دیا۔ لیکن انھیں صرف اپنے طبقے کے لیے ریزرو انتخابی حلقے ہی مل پائے۔ اس وقت انھیں بمبئی لیجسلیٹو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا اور ان کی یہ رکنیت ۱۹۳۴ء تک جاری رہی۔ اپنے رکنیت کے دوران انھوں نے کونسل میں کاشت کاری، محنت کش طبقوں اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی بل پیش کیے۔

ماہر آئین

۱۹۳۶ء میں انھوں نے انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی آف انڈیا کی داغ بیل ڈالی، جس نے بمبئی میں ۱۵ نشستیں جیتیں اور اپوزیشن کی صف میں بیٹھی۔ جب انھیں پہلے بنگال سے اور پھر بمبئی سے ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کا ممبر چنا گیا تھا تو ایک قومی رہنما، ماہر قانون، ماہر آئین اور پارلیمنٹرین کی حیثیت سے ان کی قابلیت مسلم ہو گئی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں انھیں آئین کا مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی میں شامل کیا گیا اور بعد میں اس کمیٹی کا چیرمین بنایا گیا۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے آئین میں محروم و پسماندہ طبقات کو مساوات کی ضمانت دینے کی پوری کوشش کی۔ بنیادی حقوق ہندوستان کے لیے ان کا بہترین تحفہ ہے۔ ہندوستانی آئین میں بنیادی حقوق کا باب نہ صرف امریکی آئین کے "بل آف رائٹس" سے بلکہ کسی بھی اور آئین سے زیادہ واضح اور جامع ہے۔

ملک اولیں وزیر قانون کی حیثیت سے انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال ملک کو مساوات اور خوشحالی کی طرف لے جانے کے لیے کیا۔

تعلیم کے زبردست حامی

ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی کا ایک کم معروف پہلو یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ایک زبردست حامی تھے۔ وہ انسان کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت بخوبی سمجھتے تھے۔ انھوں نے تعلیم کو اپنے نعرہ "تعلیم، مقاصد اور تنظیم" کا پہلا قدم بنایا۔ انھوں نے پسماندہ طبقات کے لیے کئی ہاسٹل کھولے اور طلبا کو مفت کتابیں فراہم کیں۔ پہلا کالج ۱۹۴۶ء میں بمبئی میں سدھارتھ کالج آف آرٹس اینڈ سائنسز کے نام سے کھولا گیا۔ یہ کالج ان کے ۱۹۴۵ء میں قائم شدہ تعلیمی انسٹی ٹیوٹ، پیوپلز ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام پسماندہ طبقات کے طلبا کے لیے

باقی صفحہ ۲۶ پر

سب کے لیے خوراک کے سلسلے میں ایک اہم قدم

ٹی پی ڈی ایس

مقررہ نشانوں کی بھرپور عکاسی کرنے والے سرکاری نظام تقسیم (پی ڈی ایس) کو، جس پر مناسب ڈھنگ سے عمل بھی کیا جاتا ہو، غریبی دور کرنے کی حکمت عملی کے ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ کھلے بازار میں ضروری اشیاء کی قیمتوں کو معقول بنانے اور سماج کے کمزور تر طبقات کو خوراک کی فراہمی کو یقینی بنانے کے سلسلے میں بھی یہ ایک اہم آلۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نظام پورے ملک میں پھیلے ہوئے ۴ لاکھ ۳۳ ہزار مناسب قیمتوں کی دوکانوں (ایف پی ایس) کے نظام کے ذریعہ کام کرتا ہے جس میں دور دراز کے علاقوں اور پہاڑی علاقوں کے لیے چلتی پھرتی مناسب قیمتوں کی دوکانیں بھی شامل ہیں۔

ٹی پی ڈی ایس کی ضرورت

لیکن غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والی آبادی کو مستفید کرنے میں اس کی ناکامی، اس کے شہروں پر مبنی ہونے اور ترسیل میں کھلے پن اور جواب دہی کے فقدان کی وجہ سے سرکاری نظام تقسیم کی بڑے پیمانہ پر تنقید بھی کی جاتی رہی ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے سرکاری نظام تقسیم کو بہتر بنانے کی غرض سے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے کنبوں کے لیے خصوصی کارڈ جاری کرکے اور سرکاری نظام تقسیم کے تحت ضروری اشیاء خصوصی رعایتی قیمتوں پر فراہم کرکے نیز ترسیل کے نظام کی بہتر طور پر نگرانی کرتے ہوئے سرکاری نظام تقسیم کو مزید آسان بنانے کا فیصلہ کیا ہے یعنی حکومت نے اس کا رخ غریبوں کی جانب موڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔

غریب لوگوں کو مدنظر رکھ کر حکومت نے ایک بڑا اقدام اٹھاتے ہوئے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے لیے ایک دو سطحی سرکاری تقسیم نظام شروع کیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت، جس کا نام نشانہ شدہ سرکاری نظام تقسیم (ٹی پی ڈی ایس) رکھا گیا ہے، ریاستی حکومتیں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے کنبوں کے لیے خصوصی راشن کارڈ جاری کریں گی اور نصف قیمت پر عام اور اعلا قسم کا اناج ان کو فروخت کریں گی۔ اس اسکیم پر مرحلہ وار عمل کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے رہنما خطوط ۷، اگست ۱۹۹۶ء کو ریاستی وزرائے خوراک کی اس کانفرنس میں طے کیے گئے تھے، جس میں ٹی ڈی پی ایس کا رخ غریبوں کی جانب موڑنے پر غور و خوض کیا گیا تھا۔

آدھی قیمت پر اناج

اس اسکیم کے تحت غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے تمام کنبوں کو ہر ماہ فی کنبہ دس کلوگرام اناج مرکزی اجرائی قیمتوں کی نصف قیمت پر فراہم کیا جائے گا۔ ہر خریف اور ربیع کی فصل کے بعد کسانوں کے لیے مقرر کی جانے والی قیمتوں میں امکانی اضافے کے پیش نظر مرکزی اجرائی قیمتوں پر حکومت نظر ثانی کر سکتی ہے۔ ۹۷-۱۹۹۶ء کے فصلی سال کے سلسلے میں عام، اعلا اور بہت اعلا قسم کے دھان کے لیے کم سے کم امدادی قیمتیں بالترتیب ۳۸۰ روپے، ۳۹۵ روپے اور ۴۱۵ روپے فی کوئنٹل مقرر کی گئی ہیں اور اناج کے لیے یہ ۴۱۵ روپے فی کوئنٹل ہیں۔ موجودہ شرح پر خصوصی راشن کارڈوں والے لوگ اعلا قسم کا چاول ۳ روپے ۵۰ پیسے فی کلوگرام کے حساب سے خریدنے کے مستحق ہوں گے جب کہ یہی چاول غریبی کی سطح سے اوپر زندگی گزارنے والوں کو ۶ روپے ۵۰ پیسے فی کلوگرام سے خریدنا ہوگا۔ خصوصی راشن کارڈوں والے لوگوں کو مناسب قیمتوں کی دوکانوں (ایف پی ایس) سے گندم دو روپے ۵۰ پیسے فی کلوگرام کے حساب سے ملے گا جس کی موجودہ قیمت چار روپے ۵۰ پیسے فی کلوگرام ہے۔

غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی نشاندہی کا کام ریاستی سرکاریں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی انتظامیہ کرے گی مگر ان لوگوں کو، جو غریب نہیں ہیں، بدستور ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے ذریعہ گزشتہ دس برسوں سے مرکزی اجرائی قیمت پر ان کی اوسط سالانہ خرید کی بنیاد پر اناج کی فراہمی جاری رہے گی۔ اس اوسط خرید کے تحت نہ آنے والے اناج کو جو غریبی کی سطح سے نیچے کی آبادی کی ضرورت سے فاضل ہوگا، ریاستوں کو عارضی تخصیص کے طور پر مرکزی اجرائی قیمتوں پر دینے کی تجویز ہے۔

دشوار گزار علاقوں پر خصوصی توجہ

غریبی کی سطح سے اوپر کی آبادی کو اچانک

موجودہ سرکاری نظام تقسیم سے الگ کرنے سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں لہٰذا کانفرنس کی سفارش کے مطابق اس طبقہ کے لیے، جو فی الحال پی ڈی ایس کے فوائد حاصل کر رہا ہے، اناج کی تخصیص کی ضمانت دی جائے گی۔ پہاڑی ریاستوں، سرحدی ریاستوں، دشوار علاقوں نیز اناج کی کمی والی ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی ضرورتوں کو اس سلسلہ میں خاص طور پر مدنظر رکھا جائے گا۔

کانفرنس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مرکزی اجرائی قیمتوں میں، جس پر ان لوگوں کو اناج فراہم کیا جائے گا، جو غریب نہیں ہیں، اچانک اور زبردست اضافہ نہ کیا جائے، بلکہ مرحلہ وار اضافہ کیا جائے۔ غریبی کی سطح سے نیچے کی آبادی کے تعلق سے آنجہانی پروفیسر لاکڑاوالا کی صدارت میں ماہرین کا جو گروپ بنایا گیا تھا اس کے تخمینوں کو زیر عمل لایا جائے گا، نہ کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کو۔ مرکز ۵۵۰۰ کروڑ روپے کی سبسڈی کے موجودہ بوجھ کی بجائے ۷۶۶۲/۹۰ کروڑ روپے سالانہ کی سبسڈی کا بوجھ اٹھائے گا۔ نشانہ شدہ سرکاری نظام تقسیم کے تحت ۲۳۰ لاکھ میٹرک ٹن اناج جاری کیے جانے کی توقع ہے۔

۳۶ فی صد افراد مستفید ہوں گے

اندازہ لگایا گیا ہے کہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے لگ بھگ ۳۲۰۸/۶۸ لاکھ افراد یعنی ملک کی مجموعی آبادی کے لگ بھگ ۳۵/۹۰ فی صد حصہ کو نئی اسکیم سے فائدہ پہنچے گا۔ موجودہ پی ڈی ایس اسکیم نوعیت کے اعتبار سے ملک کے تمام لوگوں کا احاطہ کرتی ہے غریبوں کو تقریباً نصف قیمت پر اناج فراہم کرنے کے لیے اضافی سبسڈی کا انحصار وقتاً فوقتاً حکومت کے ذریعہ مقرر کی جانے والی مرکزی اجرائی قیمتوں پر ہوگا۔

مرکزی حکومت نے ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی انتظامیہ سے کہا ہے کہ وہ غریبوں کی نشاندہی کرنے کے لیے فوری اقدامات کریں، انھیں خصوصی راشن کارڈ جاری کریں نیز مناسب قیمتوں کی دوکانوں سے انھیں مناسب اور موثر ڈھنگ سے باقاعدگی کے ساتھ غلہ فراہم کرنے کے لیے غلہ کی فراہمی کا بندوبست کریں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی تقسیم میں کھلاپن اور جواب دہی کا عنصر بھی موجود ہو۔ جیسے ہی ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے تمام ضروری انتظامات کر لیں گے، ٹی پی ڈی ایس کے تحت غریبوں کو فائدہ حاصل ہونے لگے گا۔

مستفید ہونے والے دیگر افراد

اس اسکیم سے ایمپلائمنٹ ایشورنس اسکیم اور جواہر روزگار یوجنا کے تحت آنے والوں کو بھی فی فرد ایک کلو گرام اناج دے کر فائدہ پہنچانے کی تجویز ہے۔ اس نظر ثانی شدہ اسکیم سے وہ لوگ بھی استفادہ کر سکتے ہیں جو غریب سے غریب ہیں۔

یہ نئی اسکیم، جس کا بڑے پیمانہ پر خیر مقدم کیا گیا ہے، غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے لیے سلامتی کا ایک وسیلہ ہوگی اور اس طرح سماجی انصاف کے ساتھ ترقی کے نشانوں کی حصولی کو یقینی بنائے گا۔

●

بقیہ: انسانی دماغ کی تشکیل

کے نیورون کنڈینڈرائٹ پیڑ کی جڑوں کی طرح شاخ در شاخ بٹے ہوتے ہیں۔ ان ہی شاخوں کی سطح پر سائی نیس یا آپسی تعلق کے جوڑ بنے ہوتے ہیں کسی کے ذہن میں سائی نیس کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی وہ اتنی ہی زیادہ اور اتنی ہی قسم کی معلومات حاصل کر سکے گا نیز اس کی ذہانت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا لیکن اب پتا چلا ہے کہ ذہن کی اس تشکیل نو میں بھی تعلیم، تجربے اور باہری اثرات کی بہت اہمیت ہے۔

جدید تکنیکوں کے ذریعہ ڈھیر سارے تجربات کے بعد سائنس داں اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بچے کی پیدائش سے لے کر ایک سال کی عمر تک کے دوران اس کے دماغ میں اربوں، کھربوں، نئی سائی نیس بن جاتی ہیں۔ دماغ کے ہر سیل میں کئی کئی ہزار سائی نیس بنتے ہیں اور ایک سال کی عمر تک ان کی تعداد ۱۰۰۰ ٹریلین خاص اہمیت کی حامل ہے۔

نئی دریافتوں کی روشنی میں دماغی سائنس کے ماہرین زندگی کے اصولوں کی بنیاد پر بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک نئی حکمت عملی تیار کرنے کی رائے دیتے ہیں۔ عام طور پر لوگ سوچتے ہیں کہ بچپن تو کھیلنے کودنے کے لیے ہے سنجیدہ مطالعہ اور تجربات تو آگے کی عمر میں ہی شروع ہونے چاہئیں، لیکن اب سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس عمر کے دوران بچوں کی تعلیم جتنی انواع و اقسام کی اور چنوتی بھری ہوگی مستقبل میں ان کے دماغ کا سائی نیپس نقشہ اتنا ہی نکھر کر سامنے آئے گا۔ ہندوستانی موسیقی کے بڑے بڑے استادوں کی زندگی کی کہانی ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ بچپن میں جس نے جتنا سخت ریاض کیا اور وہ اتنا ہی بڑا استاد بنا۔ دراصل اس عمر میں بننے والے سائی نیپس اگر برتاؤ اور تجربے کے ساتھ جڑ کر پختہ نہیں بنتے تو ایک بار ختم ہونے کے بعد وہ دوبارہ کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

زبان سیکھنے اور یاد کرنے کے معاملے میں بھی ہم اس بات کو آزما سکتے ہیں کہ زیادہ عمر میں غیر ملکی زبان سیکھنا کسی بھی شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ خاص طور پر صحیح تلفظ ادا کر پانا تو اس کے لیے تقریباً ناممکن ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ الفاظ کی ادائیگی کو کنٹرول کرنے والے گلے کی نسوں سے متعلق سائی نیپس دس سال کی عمر سے پہلے بن جاتے ہیں۔

اس طرح سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچپن میں ذہن کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی آئندہ قطعی ممکن نہیں ہے تاہم عمر رسیدہ افراد پر کیے گئے تجربات سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مستقل ذہنی کثرت میں مشغول رہنے والے بزرگ بھی اپنے دماغ کو تازہ اور چست رکھ سکتے ہیں۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ڈینڈرائٹ کا سکڑنا ایک قدرتی فعل ہے۔ نئی دریافتیں بتاتی ہیں کہ اس عمل کو بھلے ہی ہم پوری طرح نہ روک سکیں تاہم اپنے ذہن کو فعال اور مشغول رکھ کر ہم اس عمل کو چست ضرور کر سکتے ہیں۔

●

بنیادی ڈھانچے کی ترقی وفروغ

پائیدار صنعتی ترقی کے لیے ایک موثر بنیادی ڈھانچے کا ہونا اشد ضروری ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ایک بنیادی اولین شرط کی حیثیت رکھتا ہے — ۹۸-۱۹۹۷ء کا بجٹ اسی نظریے پر مبنی ہے۔ اس بجٹ میں ٹیلی مواصلات، تیل کی تلاش اور شاہراہوں سے متعلق شعبوں کو ٹیکسوں میں رعایات اور دیگر فوائد بہم پہنچانے کی غرض سے کافی اہمیت دی گئی ہے۔

بنیادی ڈھانچے کی ترقی وفروغ

سب سے پہلے سڑکوں کو ہی لیجیے ہندوستان میں صنعتی ترقی کی رفتار کے سست رہنے کی ایک وجہ سڑکوں کی تعمیر اور رکھ رکھاؤ کا کام ناقص یا ناکافی ہونا ہے۔ ہندوستان میں ۳۴۲۹۸ کلومیٹر لمبی قومی شاہراہوں میں سے صرف ۵۵۵ کلومیٹر یا دو فی صد سے بھی کم شاہراہوں کو "ایکسپریس شاہراہوں" کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ سڑکوں پر چلنے والی موٹر گاڑیوں کی تعداد، جو ۱۹۵۱ء میں صرف ۳ لاکھ تھی، بڑھ کر دو کروڑ ۵۳ لاکھ ہوگئی ہے اور امید ہے کہ یہ تعداد ۲۰۰۱ء تک ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ مگر سڑکوں کے جال میں اس حساب سے توسیع نہیں ہوئی ہے جس حساب سے موٹر گاڑیوں کا ٹریفک بڑھا ہے۔ سڑکوں کی کوالٹی بھی ایسی نہیں ہے جو روز افزوں ٹریفک کے تقاضوں کو پورا کرسکے۔ اچھی اور کافی سڑکیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے گاڑیاں سست رفتار سے چلانی پڑتی ہیں جس سے گاڑی چلانے کا خرچ بڑھتا ہے۔ ہمارے ملک میں کمرشل گاڑیاں ایک دن میں صرف دو ڈھائی سو کلومیٹر کی مسافت طے کرتی ہیں جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں وہ پانچ چھ سو کلومیٹر روزانہ کی مسافت طے کرتی ہیں۔ ایک سروے کے مطابق، سڑکوں کی حالت خراب ہونے کی وجہ سے ہر سال تقریباً چار ہزار کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

ریلوے کی حالت بھی زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ہماری مال گاڑیوں کی اوسط رفتار ۲۳ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اگرچہ راجدھانی اور شتابدی ایکسپریس جیسی کچھ ریل گاڑیاں تیز رفتار کے لیے مشہور ہیں تاہم میل یا ایکسپریس ٹرینوں کی اوسط رفتار ۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ سے کم ہے۔

بندرگاہوں پر بھی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہے۔ برآمدات اور درآمدات کی موجودہ سطح پر بھی ہماری بندرگاہیں مال کی نقل وحمل کے کام کو نہیں سنبھال پا رہی ہیں۔ اگرچہ بیشتر بندرگاہیں اپنی سو فی صدی صلاحیت سے کام کر رہی ہیں تاہم جب ہم اس خطے کی دوسری بندرگاہوں سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ ان کی کارکردگی بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں بندرگاہوں پر برتھ کے بے کار رہنے کا فی صد تناسب برتھ کے زیر استعمال رہنے کے وقت کا لگ بھگ ۳۶ تا ۳۷ فی صد ہے۔ ایوریج شپ ٹرن اراؤنڈ اور ایوریج شپ برتھ آؤٹ پٹ کے لحاظ سے بندرگاہوں کی پیداواریت بھی ایشیائی خطے کی بندرگاہوں سے کم ہے۔ ہماری بندرگاہوں کی اس کم پیداواریت کی کئی وجوہات ہیں مثلاً مال لادنے اور اتارنے وغیرہ کے ساز وسامان کا بریک ڈاؤن، پانی کی تہہ میں جمع شدہ مٹی نکالنے کی ناکافی سہولیات اور کنٹینروں کی ہینڈلنگ کا ناکافی انتظام۔

کنٹینر ٹریفک، جو دنیا بھر میں بہت مقبول ہے، اس کا فی صد تناسب ہماری بندرگاہوں کے شپنگ ٹریفک میں ابھی تک بہت کم ہے کیوں کہ ہندوستانی بندرگاہوں پر امپورٹ اور ایکسپورٹ کنٹینروں کی ہینڈلنگ کی لاگت زیادہ ہے نیز ہماری بندرگاہوں پر کنٹینر سروس میں ہونے والی تاخیر سے ایک سال میں ۷۰ ملین امریکی ڈالروں کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بنیادی ڈھانچے کے محاذ پر چیلنج

وزیر خزانہ شری پی چدمبرم نے اپنی بجٹ تقریر میں متعدد نئی اسکیموں کا اعلان کیا ہے جن کا مقصد ملک میں بنیادی ڈھانچے کے لیے مختلف ذرائع سے مالیات جٹانا ہے۔ ان میں بنیادی ڈھانچے کے لیے مالیات کی فراہمی اور پیداواری مقاصد کے لیے کالے دھن کو استعمال کرنے کی ایک اسکیم بھی شامل ہے۔ یہ اسکیم اپریل تا دسمبر ۱۹۹۷ء کی مدت میں زیر عمل لائی جائے گی۔ یہ ایک سادہ سی اسکیم ہوگی جس کے تحت نقدی، ہنڈیوں یا اندرون ملک یا بیرون ملک رکھے ہوئے اثاثوں کی صورت میں منکشف کی گئی رقومات پر بلا لحاظ اس بات کے کہ وہ کس سال میں حاصل کی گئیں اور ان کی نوعیت اور ان کا ذریعہ حصول کیا ہے، ٹیکس کی نظر ثانی شدہ اعلا شرح سے ٹیکس لیا جائے گا۔

اس طرح اکٹھا کی جانے والی کل رقم کا ۷۷٫۵ فی صد حصہ ریاستی حکومتوں کو اور باقی حصہ مرکزی حکومت کو دیا جائے گا۔ مرکزی حکومت کا حصہ پورے کا پورا کم از کم بنیادی خدمات کے پروگرام اور بنیادی ڈھانچے کی ضرورتوں کی تکمیل پر صرف کیا جائے گا۔

وزیر خزانہ کی اس تجویز کے مطابق، اب سڑک کے راستے سے مال کی نقل و حمل، مشاورتی انجینیروں، کسٹم ہاؤس، اسٹیم اور کلیئرنگ نیز فارورڈنگ ایجنٹوں، ایئر ٹریول ایجنٹوں، ٹور آپریٹروں اور کاریں کرائے پر دینے والی ایجنسیوں، گھر سے باہر طعام کا بندوبست کرنے والوں، پنڈال کنٹریکٹروں، منڈپ لگانے والوں اور افرادی قوت کی ریکروٹمنٹ ایجنسیوں کو بھی سروس ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

تیل کی تلاش اور صنعتی پارک

ایک اہم پیش قدمی کے طور پر وزیر خزانہ نے اعلان کیا کہ تیل کی تلاش کے کام اور صنعتی پارکوں کو بنیادی ڈھانچے کا جزو تصور کیا جائے گا۔ حکومت ٹیلی مواصلات کو پہلے ہی بنیادی ڈھانچے کا حصہ قرار دے چکی ہے اور اس نے اسے ٹیکس سے مستثنیٰ رکھنے جیسی کچھ رعایات دینے کا اعلان کیا تھا۔ بجلی کے شعبے کو بڑھاوا دینے کے لیے وزیر خزانہ نے غیر کوکنگ کوئلے پر محصول کی شرح ۳۰ فی صد سے گھٹا کر ۱۰ فی صد کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے بین اقوامی مقابلہ جاتی بولیوں کے طریقوں کے تحت تیل، گیس اور بجلی کے پروجیکٹوں کو سپلائی کیے جانے والے سامان کو برآمدات کا درجہ دینے کا اعلان کیا ہے۔ وزیر خزانہ نے لوک سبھا کو بتایا ہے کہ دیہی بنیادی ڈھانچہ ترقیاتی فنڈ (آر۔ آئی۔ ڈی۔ ایف) کا تیسرا مرحلہ ۹۸-۱۹۹۷ء میں شروع ہوگا اور اس کے لیے ۲۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی جائے گی۔ انھوں نے ممبران کو یہ بھی بتایا کہ آر۔ آئی۔ ڈی۔ ایف کے پہلے اور دوسرے مرحلے مقبول ثابت ہوئے ہیں اور ۴۴۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کے پروجیکٹ منظور کیے جا چکے ہیں۔ بجٹ میں کپیاسٹی کنورٹروں پر کسٹم ڈیوٹی ۲۵ فی صد سے گھٹا کر فقط ۵ فی صد کر دی گئی ہے۔ اسی طرح کمپریسڈ نیچرل گیس کی کٹس اور اس کے اجزا پر ڈیوٹی دس فی صد سے گھٹا کر ۵ فی صد کر دی گئی ہے۔

شاہراہوں کی تعمیر و بہتری

۹۸-۱۹۹۷ء کے بجٹ میں قومی شاہراہوں سے متعلق سرکاری اتھارٹی، نیشنل ہائی ویز اتھارٹی آف انڈیا (این ایچ اے آئی) کے لیے تخصیص ۱۵۰ فی صد بڑھا دی گئی ہے۔ بجٹ تجاویز میں اس کے لیے ۵۰۰ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے ہیں جب کہ ۹۷-۱۹۹۶ء میں صرف ۲۰۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے۔ رواں مالی سال میں سڑکوں کے سلسلے میں منصوبہ جاتی مصارف بھی ۹۴۲٫۱ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۱۰۱۸ کروڑ روپے کر دیے گئے ہیں۔

یہ اقدامات اس لیے ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ این ایچ اے آئی کو سڑکوں کی تعمیر و بہتری کے کام میں پرائیویٹ سیکٹر کو شریک کرنے کے سلسلے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ امید ہے کہ این ایچ اے آئی کے لیے منظور کی گئی اضافی بجٹی امداد کا ایک حصہ ۵ فی صد سروس ٹیکس کے نفاذ سے حاصل ہوگا۔

ریلوے بجٹ

ریلوے بجٹ میں بھی ریلوے لائنوں کی اصلاح و بہتری اور توسیع پر کافی توجہ دی گئی ہے خصوصاً ملک کے شمال مشرقی علاقے، اترا کھنڈ، جموں و کشمیر اور دیگر پسماندہ علاقوں میں کیوں کہ اگر مواصلات یا ذرائع نقل و حمل کی کمی کے باعث کچھ علاقے باقی ملک سے کٹے رہتے ہیں تو اقتصادی ترقی کے فائدے یکساں طور پر پورے ملک میں نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ ریلوے پروجیکٹ کے چند ماہ کے اندر مکمل ہو جانے کی توقع ہے۔

"بلٹ آپریٹ لیز ٹرانسفر" اسکیم اور "اون یور ویگن" اسکیم کے تحت نجی سرمایہ کاری سے مزید ۹۰۰ کروڑ روپے حاصل ہونے کی توقع ہے۔ ریلوے بجٹ میں خوراک اور اشیائے ضروریہ کو مال بھاڑے میں ۱۲ فی صد کے اضافے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے تاکہ ان اشیا کی قیمتیں نہ بڑھنے پائیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ریلوے نے معیشت کے بنیادی ڈھانچے کے کلیدی شعبے کی توسیع میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کی ہے۔

بندرگاہوں کے شعبے سے متعلق پالیسی میں بندرگاہوں کی بہتری پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کنٹینر ٹریفک کے لیے بندرگاہوں پر سہولیات میں اضافہ کیا جائے گا۔ دیگر سہولیات کی توسیع اور جدید کاری کی جائے گی۔ منتخبہ بڑی بندرگاہوں پر پانی کی گہرائی بڑھائی جائے گی تاکہ وہاں پر زیادہ بڑے جہاز آ جا سکیں۔ پانی کی تہہ میں جمع شدہ مٹی کو نکالنے کے انتظامات بھی بہتر بنائے جائیں گے۔ مختصر یہ کہ ریلوے اور عام بجٹ میں بنیادی ڈھانچے پر جو توجہ مبذول کی گئی ہے اس کے پیش نظر امید کی جا سکتی ہے کہ بنیادی ڈھانچے کے شعبے میں مستقبل کی صورت حال کافی روشن اور حوصلہ افزا ہوگی۔ ●

بقیہ: پریم چند اور تصنیفات پریم چند

میں شائع ہوا، جس کی آخری قسط ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آئی۔

"غبن" پریم چند کا وہ ناول ہے جس نے ان کی فنکارانہ عظمت کو نہ صرف مزید وقار عطا کیا بلکہ پریم چند کی تخلیقی سرگرمیوں کا نقطۂ عروج بھی ثابت ہوا۔ ہندی میں لکھا گیا یہ ناول سرسوتی پریس سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ اسی کے بعد ۱۹۳۲ء میں پریم چند کا قابل ذکر ناول "کرم بھومی" شائع ہوا۔ اس کا اردو ایڈیشن بھی فوراً ہی بعد ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

"گئودان" جسے ناقدین ادب متفقہ طور پر ہندی اور اردو کا کامیاب اور ایک بڑا ناول قرار دیتے ہیں، تقریباً تین سال کی تخلیقی جہد مسلسل کے بعد مکمل ہوا۔ یہ ناول پریم چند کی موت سے بس تین ماہ قبل شائع ہوا، جب کہ اس کے اردو ایڈیشن کی طباعت ان کی موت کے بعد مکمل ہوئی۔ ●

ڈاکٹر اشوک کمار سنگھ

بہار کے کھیتی مزدور

کھیتی مزدوروں سے ہمارا مطلب اُن دیہاتی مزدوروں سے ہے جو کھیتی کے کام میں مزدوری پر لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ زراعتی معاشیات کے مطابق "کھیتی مزدور وہ گروہ ہے جو اپنی محنت زراعتی کاموں میں لگا کر اس کے بدلے میں نقد یا جنس کی شکل میں محنت کی۔۔۔ مزدوری حاصل کرتا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء کی پہلی "کھیتی مزدور جانچ کمیٹی" کے مطابق کھیتی مزدوروں سے مراد ان کھیتی مزدوروں سے ہے جو فصلی پیداوار اور دوسرے کھیتی کے کاموں میں اپنی محنت لگا کر مزدوری حاصل کرتے ہیں۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں دوسری "کھیتی مزدوری جانچ کمیٹی" نے بھی کھیتی مزدور کا مطلب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ کھیتی مزدور وہ آدمی ہے جس کی آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ کھیتی مزدوری سے ملتا ہے۔ اس طرح پہلی جانچ کمیٹی میں کھیتی مزدوروں کو صرف فصل کی پیداوار کے ہی اندر شامل کیا تھا۔ جبکہ دوسری جانچ کمیٹی نے کھیتی مزدوروں کو فصل کی پیداوار کے علاوہ باغبانی، مویشی پالن، دودھ کے کام اور مرغی پالن اور دیگر کھیتی سے متعلق کاروبار سے جوڑ دیا ہے۔ مردم شماری کے اضافہ کے نتیجے میں ملک میں کھیتی مزدوروں کی تعداد میں بھی امید افزا اضافہ ہوا ہے۔ نتیجتاً مختلف مسائل بھی پیدا ہوئے، جس کا براہ راست اثر ان کی اہلیت اور صلاحیت کار پر پڑا۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں کھیتی مزدوروں کی کل تعداد ۲،۴۵۹،۷۷،۴۴ ہے جس میں ۶۱۶۴۴۷۴۴ مرد اور ۲۸۴۳۲۹۹،۷ عورتیں ہیں۔ صرف بہار ریاست میں ہی کل کھیتی مزدوروں کی تعداد ۹۵۱۲۸۹۲ ہے۔ جس میں ۷،۰۷۸،۷۱۶ مرد اور ۲۴۳۴۱۶۷ عورتیں ہیں۔ کھیتی مزدوروں کی اتنی وسیع تعداد جو کم سے کم سماجی معاشی معیار، بیکاری، غریبی، قرض داری، غیر حرف شناسی اور بے تنظیمی کا شکار ہے وہ براہ راست طریقے سے کھیتی مزدوروں کی صلاحیت کار کو تو متاثر کر ہی رہی ہے، بالواسطہ طور پر بھی اس کا اثر کھیتی کی پیداوار اور ہماری قومی ترقی پر بھی پڑا ہے۔ اس لیے حکومت ہند کی توجہ آزادی سے لے کر آج تک کھیتی مزدوروں کے مختلف مسائل کی طرف منعطف رہی ہے۔ مختلف پنج سالہ منصوبوں، قانونوں اور اسکیموں کے ذریعہ مزدوروں کے سماجی معاشی معیار کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں زراعت کا پیشہ گھاٹے کا دھندا بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ان وجوہات میں کسان مزدوروں کی پسماندگی اور نقل مکانی کی خو بھی ایک اہم وجہ ہے۔ اس کا اثر ان کی صلاحیت کار، کارکردگی اور طرز زندگی پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کارکردگی کو اثر انداز کرنے والے مختلف وجوہات ہیں جن میں ان کی تعداد میں قابلِ لحاظ اضافہ، فصلی کاروبار، کم مزدوری کی شرح، ناحرف شناسی اور بے تنظیمی خاص ہیں۔ آج بہار پورے ملک میں کھیتی مزدوروں کے پچھڑے پن اور نقل مکانی کے لیے مشہور ہو گیا ہے۔ ریاست اڑیسہ کے بعد کھیتی مزدوروں کی سب سے بڑی تعداد بہار میں ہے۔ اگرچہ اس ریاست میں قابلِ زراعت زمین پنجاب کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہے اور معقول کھیتی مبنی ڈھانچہ بھی موجود ہے پھر بھی کھیتی ہی اس علاقے میں سب سے زیادہ بے توجہی کا شکار ہے۔ قابلِ زراعت زمین کا صرف ۳۰ فی صد ہی یہاں زیر آب پاشی ہے اور اس ریاست کا تقریباً ۶۵ لاکھ ہیکٹیر رقبہ سیلاب زدہ ہے۔ بیج، بجلی اور کھاد بر وقت اور مناسب مقدار میں دستیاب نہ ہونے کے نتیجے میں کھیتوں پر محنت کی قیمت، نیچی، ہوتی جا رہی ہے اور یہاں کے کھیتی مزدور غریبی اور بھکمری کے شکار ہو کر یہاں سے بھاگنے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی بہار میں فی نفر اوسط آمدنی ملک میں سب سے کم ہے اور اس میں مسلسل گراوٹ ہو رہی ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں یہاں ۱۱۹۵ روپے تھی جو ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۲۲۱۶ روپے کے قومی معیار کے مقابلے میں ۱۰۹۱ روپے ہو گئی۔ کے۔ کے۔ برلا فاؤنڈیشن کے ذریعہ چلائی جانے والی ایک تحقیقی اسکیم میں جرنلسٹ اروند موہن کا یہ اندازہ ہے کہ حکومت بہار سے تین سو کھیتی مزدوروں کی یومیہ نقل مکانی ہوتی ہے۔ کھیتی مزدوروں کی اس پسماندگی اور نقل مکانی کے پیچھے حالات کی مختلف صورتیں ہیں۔ ناکافی صنعتی

پھیلاؤ، سیلاب کی غضبناکی، سماجی سیاسی صورت حال، سماجی رسومات، زراعت پر مبنی موزوں ڈھانچے اور سہولتوں کی کمی، خلاف کار حالات جیسے عوامل کھیتی مزدوروں کی پسماندگی اور ان کے گھر چھوڑنے کا سبب ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہونا، ان کے پاس زمین نہ ہونا، کھیتی مزدوری میں عورتوں بچوں کی شرکت اور ان کی کثرت، عارضی مزدوروں کی تعداد کا بڑھنا، جاہلیت، قیادت اور تنظیم کی کمی، غریبی، بے کاری، کم اجرت اور نچلا معیار زندگی، بٹائی طریقہ وغیرہ وجوہات کھیتی مزدوروں کے پچھڑے پن اور ان کے گھر چھوڑنے سے جڑے ہوئے ہیں۔

ان سماجی، معاشی وجوہات کے علاوہ کھیتی مزدوروں کے پچھڑے پن گھر چھوڑنے کے کچھ خاص نفسیاتی اور انفرادی اسباب بھی ہیں۔ یہاں کچھ مخصوص نفسیاتی وجوہات کا تجزیہ کرنا مناسب ہوگا۔

نسلی اور جدی اوصاف

کھیتی مزدوروں کے بچوں میں اپنے نسلی اور جدی اوصاف بہ خوبی آجاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ کھیتی مزدوری کو ہی روزانہ کا معمول اور آمدنی کے ذریعے سمجھنے لگتے ہیں اور اسی کے مطابق ان میں صلاحیتوں کی نمو ہونے لگتی ہے۔

تعلیمی معیار

کھیتی مزدوں میں تعلیمی معیار بہت نیچا ہوتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت اور اس کی افادیت پر ان کی توجہ نہیں ہوتی۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو ہی روزگار اور ذرائع آمدنی کا ذریعہ سمجھنے لگتے ہیں اور انھیں علم حاصل کرنے کے بجائے، پیسہ کمانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

رہن سہن کا معیار

آدمی کے رہن سہن کا معیار اس کی تہذیب، خیالات اور احساسات کو متاثر کرتا ہے کھیتی مزدوروں کے رہن سہن کا نچلا معیار، ان کے خیالات پر مخالف اثر ڈالتا ہے۔ وہ آگے چل کر نا امیدی، کمزور ذہنی اور کشمکش کا شکار ہوجاتے ہیں۔

تربیت کی کمی

سماجی تبدیلی اور تکنیکی ترقی کے نتیجے میں مزدور انتظام . . . . . . میں انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ اس پس منظر میں کھیتی مزدوروں کی صلاحیت کار اور کارکردگی کو تربیت [illegible] کے ذریعہ ہی بڑھایا جاسکتا ہے۔ مگر تربیت کے مواقع اور ان سہولتوں کی نہایت کمی ان کی پسماندگی اور گھر چھوڑنے کا سبب بنتی ہے۔

مہارت اور صلاحیت کار

نئے زمانے کی کھیتی کے کاموں میں زرعی آلہ جات کے استعمال کے لیے کھیتی مزدوروں میں خاص طرح کی مہارت اور صلاحیت درکار ہے۔ جس کی ہمارے مزدور طبقے میں کافی کمی ہے۔

مزدوروں کی کم حوصلگی

اکثر کھیتی مزدوروں کا حوصلہ کھانے پینے کی چیزوں اور کپڑے تک ہی محدود رہتا ہے۔ حوصلے کے معیار کے مطابق ان کی کارکردگی کی صلاحیت بھی متعین ہوتی ہے۔ آگے چل کر ان کی پسماندگی کا یہی خاص سبب بن جاتی ہے۔

رجحان میں تبدیلی

آج کل کھیتی مزدوروں کے رجحان اور ان کی نفسیات میں بہت انقلابی تبدیلی آرہی ہے۔ مواصلات کے ذرائع کے وسیع ہوجانے کے نتیجے میں جدید کاری کی طرف ان کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان میں مختلف جدیدیت کے ذرائع اور جدید اشیا کی تحریص پیدا ہورہی ہے۔ زیادہ محنت اور سخت ریاضت سے جدید زمانے کی جدید اشیا کی حصولیابی اور نقل مکانی کے ذریعہ بھی جدت کاری کی مختلف اشیا کی تلاش ہمارے کھیتی مزدوروں کی زندگی کا مقصد بنتی جارہی ہے۔ ان کے رجحان میں اس طرح کی تبدیلی ان کی ترقی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس طرح کھیتی مزدوروں کے حالات سے پیدا شدہ کئی معاشی اور نفسیاتی وجوہات ہیں جو ان کی پسماندگی اور نقل مکانی سے جڑے ہیں۔ حکومت ہند اور ریاستی کے ذریعہ جہاں ایک طرف کھیتی مزدوروں کی بہبود کے لیے متعدد پروگرام شروع کیے گئے ہیں جن سے ان کے سماجی، معاشی معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہیں ان وجوہات کے پس منظر میں ضرورت ہے ۔ وقت کے مطابق مخصوص علاقہ کے لیے مزدوروں کی اسکیموں کو تیار کرنے کی تاکہ سماج کے کمزور طبقوں کے ساتھ ساتھ کھیتی مزدوروں کی بھی ترقی ہوسکے اور وہ بھی سماجی انصاف کے عمل میں قومی ترقی کی خاص دھارا سے جڑ سکیں۔

●

بقیہ: ڈاکٹر امبیڈکر۔ پسماندہ طبقوں کے مسیحا

بمبئی اور مراٹھواڑہ خطے کی جھونپڑیوں میں کھول گیا۔

بدھ مذہب کی جانب

ایک پسماندہ نوجوان، ماہر قانون اور پریڈینٹ کی حیثیت سے انھیں جن تلخ تجربات سے گزرنا پڑا ان کی وجہ سے وہ ہندو سماج کے سخت اور بے دھڑک نکتہ چیں بن گئے اور آخرکار انھوں نے ۱۹۵۶ء میں بدھ مذہب اختیار کرلیا۔ بدھ مذہب میں ان کا اعتقاد اس لیے پیدا ہوا کہ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ مذہب مساوات اور برابری کے لیے ہے۔ بدھ مذہب کے روپ میں انھیں ایک رہبر ملا۔ ہندوستان میں گوتم بدھ کی تعلیمات کی مزید تشہیر کے لیے انھوں نے ۱۹۵۵ء میں "بھارتیہ بدھ مہا سبھا" قائم کی۔

ہندوستان کے اس عظیم سپوت نے ۶ دسمبر ۱۹۵۶ء کو "مہا نروان" حاصل کیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی اعلا خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں بعد از مرگ "بھارت رتن" دیا، جو ملک کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہ ملک ہمیشہ اس عظیم مصلح کا احسان مند رہے گا، جو سماجی تفریق و امتیاز کی کیچڑ میں کنول کے پھول کی طرح کھلا اور جس نے پورے ملک کی بھلائی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

●

ڈاکٹر دنیش مانی *

آلودگی کو کم کرنے کا ایک ذریعہ :

کرم پروری

دور حاضر میں صنعتی ترقی اور آبادی میں اضافے نے عالم انسانیت کو گوناگوں مسائل سے دوچار کر دیا ہے۔ آلودگی کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ بلاشک وشبہ گھنی آبادی والے علاقوں میں نہ صرف گاڑیوں کی کثرت اور صفائی ستھرائی کی صورت حال ہوتی ہے بلکہ ٹھوس وسیال فضلات کی زیادتی کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ ہر گھر سے ٹھوس فضلات نکلتے ہیں۔ یہ فضلات موٹے طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں:

ا۔ سڑنے گلنے والی چیزیں: سبزیوں کے چھلکے، بچا ہوا کھانا وغیرہ۔

ب۔ نہ سڑنے گلنے والی چیزیں: پلاسٹک بیگ، دھات کے ڈبے، شیشے کی بوتلیں اور خطرناک زہریلے فضلات۔

درحقیقت فضلات گم شدہ وسائل ہوتے ہیں اور تمام کے تمام فضلات کو تلف کر دینا ممکن نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عالم رنگ وبو میں کوئی چیز بھی بیکار نہیں ہے۔ ہر چیز جسے ہم استعمال کرنے کے بعد پھینک دیتے ہیں کسی نئی شکل میں دوبارہ سامنے آتی ہے۔ استعمال کے بعد پھینکی ہوئی چیزیں یا تو فضائے بسیط کا جزو بن جاتی ہیں یا پھر فضلہ بن جاتی ہیں جنھیں دوبارہ کوئی مختلف شکل دی جا سکتی ہے۔

فضلات کا بندوبست: نئی چنوتیاں

نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں شہری منصوبہ بندی کے ماہرین اس مسئلہ کو حسب استطاعت حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن انھیں بس اتنی ہی کامیابی مل سکی ہے کہ کوڑا کرکٹ کے انبار کو گھنی آبادیوں سے نکال کر نسبتاً کم آبادی والے علاقوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ کالونیوں میں گھروں سے برآمد شدہ کوڑا سڑکوں کے کنارے سڑتا اور تعفن پیدا کرتا رہتا ہے کیوں کہ اس کا بیشتر حصہ سڑی ہوئی نامیاتی چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ کوڑے کا یہ ڈھیر کبھی ختم نہیں ہوتا کیوں کہ کارپوریشن کا عملہ اسے جس قدر اٹھاتا ہے یہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ردی چننے والے، چڑیاں اور آوارہ جانور کوڑے کے ڈھیر میں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرتے ہیں اور کوڑے کو بکھیر دیتے ہیں۔ گاؤں اور شہروں میں جگہ جگہ پر یہ مناظر عام ہیں۔

قدرت کا ارضی کیمیا داں

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ نامیاتی فضلات کو ایسی کھاد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو ارضی غذائیت سے بھرپور ہو۔ اکیلے کینچوے ہی پورے سسٹم کی مجموعی توانائی کی ۲۰ فی صد سے زیادہ توانائی فراہم کرتے ہیں اور کھاد بننے کے وقفہ کو ۲۵ فی صد کم کر کے اس عمل کو تیز تر کر دیتے ہیں۔ آلودگی کو کم کرنے میں نامیاتی فضلات کی درستگی معاون ہو سکتی ہے۔ کینچوا نہ صرف یہ کہ بایوفرٹی لائزنگ ایجنٹ اور کھاد بنانے میں معاون ہوتا ہے بلکہ یہ کاربونک گیس خارج کرنے والا، مٹی کو قائم رکھنے والا، مٹی کو مسلنے والا، حیاتیاتی ایجنٹ، قدرت کا بہترین ارضی کیمیا داں اور کاشتکار ہوتا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ حیاتیاتی تکنالوجی میں اشیا کی ارزاں اور موثر بایو پروسسنگ کے لیے بڑے پیمانے پر بایو سسٹم کا استعمال ہوتا ہے تاکہ فائدہ بخش بایو پروڈکٹ پیدا کیے جا سکیں۔ اسی لیے کرم پروری حیاتیاتی تکنالوجی کا وہ پہلو ہے جس میں (الف) فضلاتی بندوبست کی ارزاں تکنالوجی کے ذریعے ماحول کی صفائی، (ب) زراعت کی ترقی اور (ج) بنجر اراضی کی اصلاح کے لیے کینچوؤں کو فطری ہمہ گیر حیاتیاتی عامل کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ صنعتی فضلات کی درستگی کے لیے کینچوؤں کے استعمال کی سائنس کو کرم پرور تکنالوجی کہتے ہیں۔

طریقۂ کار

کینچوے ٹھوس فضلات کھا کر ایسی کینچلیاں پیدا کرتے ہیں جو پودوں کی متوازن غذائیت یعنی وٹامنوں، کیمیاوی خمیروں، جراثیم کشوں اور پودوں کی نشوونما میں معاون بارمونز سے بھرپور ہوتا ہے۔ کینچوے مٹی کو مسل دیتے ہیں جس کے بعد نامیاتی مادوں کا کھاد میں تبدیل ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کینچوئے کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب غذا کے سفر میں پیچیدہ خمیری تعاملات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ اپنی کینچلیاں پیچھے چھوڑتے

جاتے ہیں جن میں کیلشیم اور میگنیشیم کی وافر مقدار ہوتی ہے۔ اس میں وٹامن، کیمیاوی خمیر اور ہارمونز گبریلین بھی ہوتے ہیں۔

کینچوے ۴ سے ۲۳۶ ٹن فی ایکڑ کینچلیاں پیدا کرتے ہیں۔ نائٹروجن کی یہ مقدار ۲۰ سے ۱۸۰ کلوگرام فی ایکڑ سالانہ ہوتی ہے جو کسی فصل کے لیے اوسط مطلوب نائٹروجن سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ کینچوؤں کے ذریعہ بنائی گئی زیر زمین سرنگیں جڑوں تک پانی اور ہوا پہنچانے میں معاون ہوتی ہیں۔ وہ لعاب جس میں کینچلیاں ہوتی ہیں مٹی کی نمی اور غذائیت کو جذب کرتا ہے جس سے بہتر فصل پیدا ہوتی ہے۔

نامیاتی فضلات کا انتظام

بھوا لکر ارتھ ورم ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پونے نے اپنی کارآمد تکنالوجی کو عملی جامہ پہنا کر ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اس تکنالوجی کا استعمال غیر سمتی گھریلو کوڑا کرکٹ اور شراب کی بھٹیوں نیز مچھلی تالابوں سے نکلنے والے ٹھوس اور سیال فضلات کو سڑانے گلانے میں بخوبی ہوا ہے۔ فضلاتی بندوبست کے دوسرے روایتی طریقوں کے مقابلے میں اس طریقے میں نسبتاً کم توانائی صرف ہوتی ہے اور خرچ تو تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ اس تکنالوجی کا سب سے اہم پہلو کینچلیوں کی پیداوار ہے۔ سڑنے گلنے والے نامیاتی فضلات کے نظم و نسق میں کرم پروری کی حیاتیاتی تکنالوجی کو تین طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ پیڑ کے نیچے بایو پروسسنگ

جن کے پاس باغ ہوں ان کو پیڑ کے نیچے ۵ کلوگرام کینچلیاں اور گھریلو نامیاتی فضلات کی سو ملی میٹر کی ایک تہہ بطور ملچ ڈالنی چاہیے۔ ملچ پیڑ کی پانی کی ضرورت کو کم کر دیتا ہے کیوں کہ مٹی سے تبخیر کم ہو جاتی ہے۔ پیڑ پودوں کے لیے یہ غذا بھی فراہم کرتا ہے۔ ملچ ہضم ہو جانے کے بعد مٹی کی سوندھی سوندھی مہک والی طبعی کھاد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب پرانی تہہ ہضم ہو جاتی ہے تو نئی تہہ چڑھا دی جاتی ہے۔ کسی کیمیاوی کھاد یا گوڑائی کے بغیر پیڑ ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح آپ کے باغ کا محض ایک مربع میٹر کا گوشہ اکائی خاندان سے پیدا شدہ تمام تر سڑنے گلنے والے فضلات کو انگیز کر لیتا ہے۔

۲۔ ڈبہ میں بایو پروسسنگ

قدرے کم خوش نصیب افراد جنھیں باغ یا باغیچے میسر نہیں، انھیں اپنی بالکونی یا چھجے میں ۴۰ × ۶۰ × ۸۰ سینٹی میٹر مکعب کا ایک لکڑی کا ڈبہ استعمال کرنا چاہیے۔ ڈبہ میں پانی کی نکاسی کے لیے چند سوراخ بنالیں۔ ڈبہ کی تہہ میں ایک اخبار پر ۵ کلوگرام کینچلیوں کی ایک تہہ بچھا دیں۔ گھر سے روزانہ خارج ہونے والا نامیاتی کوڑا کرکٹ اس ڈبہ میں ڈال دیا کریں۔ کبھی کبھی تھوڑا پانی ڈال دیا کریں کہ سوراخوں سے بس چند قطرے ہی باہر نکل پائیں۔

مذکورہ بالا سائز کا بکس چار نفری خاندان کے لیے ایک سال کے لیے کافی ہوگا۔ اوپری سو ملی لیٹر کی خام سطح کے نیچے کسی بھی وقت تحلیل شدہ سیاہ مادے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ نیچے کی تہوں میں جمع شدہ مادے کو غذائیت سے بھرپور نباتی کھاد کے طور پر گملوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ کرم خوردگی کی مرکزی سہولیات

علاحدہ کیے ہوئے نامیاتی فضلات کو ایک مخصوص طرز کی ردی کی ٹوکری میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ ان ٹوکریوں کی تہہ میں کینچلیوں کی ایک تہہ جمائی جاتی ہے۔ گاہے گاہے بو سے پاک نامیاتی مادے کو نکال کر دوسرے کرم خوردگی مراکز میں منتقل کر دیا جاتا ہے تاکہ مزید پروسسنگ کے بعد طبعی کھاد کو فروخت کیا جا سکے۔

رضاکار تنظیموں کا رول

چند شہروں میں رضاکار ایجنسیوں نے گھروں سے برآمد کوڑے کرکٹ کو ہٹانے کا ایک معقول اور پائیدار نظم قائم کیا ہے۔ چند گھروں سے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہوئے بنگلور کی ایک ایسی ہی تنظیم نے اپنے دائرہ کار میں اب چار سو گھروں کا احاطہ کر لیا ہے۔ کچرا اٹھانے والے چھ افراد پر مشتمل ایک گروپ ہر گھر سے کوڑا کچرا ڈھکن دار ہتھ گاڑی میں ڈھوتے ہیں۔ باشندگان خود ہی کوڑے کی چھٹائی کرتے ہیں اور کوڑا ڈھونے والے کو ۵ روپیہ ماہانہ ادا کرتے ہیں۔ کانچ کے سامان، پلاسٹک اور اخبارات کباڑیوں کو فروخت کر دیے جاتے ہیں۔ مضر فضلات اور ملبہ کارپوریشن اٹھا لیتا ہے اور سڑنے گلنے والے فضلات کو سڑک کے گوشوں میں موجود کوڑا گھروں کی پشت پر دیسی کینچوؤں کی مدد سے کھاد میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جسے باغوں میں استعمال کے لیے علاقوں کے باشندوں کے ہاتھوں ہی فروخت کر دیا جاتا ہے۔ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہی نظم پونے، چنئی اور بڑودہ میں بھی قائم ہے۔

●

بقیہ: زرعی مارکیٹنگ کوآپریٹوز

—— پی۔ آر۔ ڈوبھاشی، ایگری کلچر کوآپریٹو مارکیٹنگ ان انڈیا، انڈین کوآپریٹو ریویو، جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۳۔
—— ایم۔ ایم۔ کے۔ ولی، نیو اکنامک انوائرمنٹ ایپلیکیشنز فار کوآپریٹوز، نیفڈ مارکیٹنگ ریویو، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۔ ۱۴۔
—— ایس۔ کے۔ نائک، رول آف کوآپریٹوز ان ایگری کلچر مارکیٹنگ، دی کوآپریٹر، مارچ ۱۹۹۳ء۔ ص ۴۱۶۔
—— پی۔ آر۔ ڈوبھاشی، لانگ ٹرم اسٹریٹجی فار فارم مارکیٹنگ نیڈز، فائننشیل ایکسپریس، جون ۳، ۱۹۹۴ء۔
—— ایس۔ ایس۔ پرُی، کوآپریٹو مارکیٹنگ، دی کوآپریٹر، نئی دہلی، نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۔ ۲۱۲۔

امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی

بات آزادی سے پہلے کی ہو یا بعد کی، قومی ایکتا، آپسی میل جول اور بھائی چارہ بنائے رکھنے کے لیے کئی لوگوں نے وقت بہ وقت اپنی زندگی قربان کی ہے۔ گنیش شنکر ودیارتھی ایسے ہی وطن پرست تھے جن کو ہندو مسلم فسادات کے دوران ۲۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو کانپور میں بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ ہندی کے اخبار نویس۔ انصاف پسند ادیب و سیاست داں تو تھے ہی مگر سب سے زیادہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ دیش کے ہندو و مسلم کو وہ ایک گاڑی کے دو پہیے اور جسم کی دو آنکھوں کے مانند مانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خوبیوں نے ہم کو متاثر کیا ہے۔

گنیش شنکر ودیارتھی کی پیدائش ۲۶ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں الٰہ آباد کے اتر سوئیا محلے میں ہوئی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں مڈل کا امتحان پاس کیا۔ خاندان کی معاشی حالت ٹھیک نہ ہونے کی باعث نوکری کے لیے کانپور بھیجا گیا۔ ودیارتھی جی چاہتے تھے کہ وہ ابھی اور پڑھیں لہٰذا وہ الٰہ آباد لوٹے اور ۱۹۰۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا مگر آنکھ کی خرابی کے باعث آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکے اور روٹی روزی کی تلاش میں پھر کانپور آگئے وہاں کرنسی دفتر میں کچھ دن کام کرنے کے بعد ٹیچری کی مگر وہاں بھی دل نہیں لگا اور نوکری چھوڑ دی۔

ان کا رجحان اخبار نویسی کی جانب تھا وہ جب الٰہ آباد میں پڑھتے تھے تو ان کے مضامین "سوراج" نامی اخبار میں چھپنے لگے تھے۔ ان کے مضامین "کرم یوگی" الٰہ آباد و "سرسوتی" میں بھی شائع ہونا شروع ہوئے۔ آچاریہ مہاویر پرساد دویدی اُن دنوں کانپور میں رہ کر ہی سرسوتی کی طباعت کر رہے تھے وہ ودیارتھی جی کی صلاحیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی مضمون نگاری کو پہچانا اور ان کو معاون ایڈیٹر کے عہدے سے سرفراز کیا۔ اس طرح گنیش شنکر ودیارتھی نے اخبار نویسی کو پیشے کے طور پر چنا حالاں کہ یہاں پر ان کو صرف ۲۵ روپے ماہوار ہی ملتے تھے۔

سرسوتی اس وقت کا ایک مشہور ادبی اخبار تھا اور اس کا معاون ایڈیٹر بننا بڑی اہمیت رکھتا تھا مگر ان کا رجحان سیاست کی طرف زیادہ تھا لہٰذا وہ یہاں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکے۔ اور "ابھیودے" نامی اخبار میں ۴۰ روپے ماہوار پر کام کرنے کو تیار ہو گئے یہ ایک سیاسی اخبار تھا۔ یہاں ان کو اپنی صلاحیت دکھانے کا بھرپور موقع ملا مگر زیادہ کام کرنے کی باعث ان کی صحت خراب ہو گئی۔

آزاد نظریہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۱۳ء میں کانپور سے 'پرتاپ' نامی اخبار شائع کرنا شروع کیا وہ ایک مشہور مجاہد آزادی تھے۔ وطن کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ دیش کے مجاہدین آزادی سے متاثر ہو کر ہی ان میں قومی جذبہ کے بیج پھوٹے تھے۔ مہارانا پرتاپ سنگھ کی قربانی اور بہادری سے متاثر ہو کر ہی تو انھوں نے اپنے اخبار کا نام 'پرتاپ' رکھا تھا۔ لوکمانیہ تلک کا فوٹو وہ اپنی میز کے سامنے ٹانگ کر رکھے تھے۔ کاکوری کانڈ میں شامل لوگوں کی انھوں نے بھرپور مدد کی اور ان کی پوری عدالتی کارروائی کو اپنے اخبار میں شائع کیا تھا۔

انھوں نے کئی وطن پرستوں و انقلابیوں کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ چندر شیکھر آزاد کی بھگت سنگھ سے ملاقات انھوں نے ہی کانپور میں کرائی تھی۔ پھر انھوں نے بھگت سنگھ کو 'پرتاپ' کا نہ صرف ڈپٹی ایڈیٹر بنایا بلکہ بلونت سنگھ نام سے ان کے وطن پرستی سے متعلق کئی مضامین چھپوا کر مشہور کرایا۔ یہی نہیں وہ انقلابیوں کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ان کو پتا چلا کہ چندر شیکھر آزاد کے والد کی معاشی حالت خراب ہو گئی ہے تو انھوں نے ۲۰۰ روپے بطور مالی مدد بھیجے تھے مگر وہ بات الگ ہے کہ چندر شیکھر نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا 'پرتاپ' اخبار مجاہدین آزادی و انقلابیوں کے آپس میں ملنے کا وسیلہ تھا اور عام ہندوستانی تک ان کی باتیں پہنچانے کا اہم ذریعہ بھی تھا۔

انقلابی ہوتے ہوئے بھی وہ گاندھی جی کی بہت عزت و احترام کرتے تھے گاندھی سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۱۶ء میں کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں ہوئی تھی اسی دوران وہ کانپور آئے اور 'پرتاپ' کے دفتر میں ٹھہرے تھے۔ اس وقت کانپور کے کسی نیتا نے گاندھی جی کو اپنے یہاں ٹھہرانے کی ہمت نہیں دکھائی تھی۔ نیل کی کھیتی سے متعلق چمپارن

ستیہ گرہ کو ودیارتھی جی نے صحیح و وسیع ڈھنگ سے شائع کر کے پورے دیش میں چرچا کا موضوع بنا دیا تھا۔ گاندھی جی ودیارتھی کو پڑھے لکھے لوگوں میں نمونے کے طور پر پیش کرتے تھے۔

وہ ہندی کے زبردست حمایتی اور پرچارک رہے۔ وہ زور دے کر کہتے تھے کہ ہندوستان کی راشٹر بھاشا صرف ہندی ہی بن سکتی ہے اور نظریہ قومیت کو لوگوں میں ان کی ہی زبان میں پہنچانا ضروری ہے۔ کانگریس کے ۱۹۲۵ء کے اجلاس میں ہندی کو اپنایا جانا ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ متحدہ صوبوں کی اسمبلی میں وہ ہندی میں ہی تقریر کیا کرتے تھے۔ متحدہ صوبہ اتر پردیش کے کانگریسی صدر کے عہدے پر رہتے ہوئے وہ ہندی میں کام کاج کرتے تھے۔ ویسے تو وہ ہندی کے تمام اجلاسوں میں شرکت کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ہندی ادبی اجلاس 'پریاگ' کے سالانہ جلسوں میں لازمی شرکت کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں گورکھپور میں ہوئے ہندی ادبی اجلاس کے اکثریتی رائے سے صدر چنے گئے تھے۔ اس وقت وہاں اجلاس کے تین سابق صدر بھی موجود تھے۔ ہندی ان کے لیے ہندوستانی تہذیب کی نگہبان اور قومی یک جہتی کی علم بردار رہی۔

حالاں کہ اس وقت اخبار نویسوں اور ادیبوں کی معاشی حالت اچھی نہیں ہوتی تھی پھر بھی ودیارتھی جی نے ادیبوں کا ایک گروہ بنا لیا تھا۔ انھوں نے ادب اور اخبار نویسی کو بڑھاوا ہی نہیں دیا بلکہ کئی لوگوں کو اس میدان میں آنے کے لیے آمادہ کیا اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی اور انھیں آگے بڑھایا۔ ان میں لکشی نارائن گردے اور بابوراؤ وشنو پراڈکر جیسے غیر ہندی میدان کے اخبار نویس بھی شامل ہیں۔ شری دھر پاٹھک، امبیکا پرساد واجپائی، پنڈت بنارسی داس چترویدی، مکھن لال چترویدی، بھارتیہ آتما بالکرشن شرما نوین، کرشن دت پالیوال، ورینداون لال ورما جیسے لوگوں نے ان کے زیر سایہ ہی شہرت پائی۔ میتھلی شرن گپت کی قومی جذبے سے بھری نظم بھارت بھارتی سب سے پہلے پرتاپ میں ہی شائع ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ایک دوست ایڈیٹر سے کہا تھا کہ تمہارے اخبار کو شائع ہوتے ہوئے اتنے سال ہو گئے مگر تب سے اب تک ایک ادیب بھی نہیں بن پایا۔ بنارسی داس چترویدی نے تو ودیارتھی جی کی سوانح عمری لکھ کر اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

وہ خود بھی ادیب تھے زیادہ پڑھے لکھے نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے وکٹر ہیوگو، پی۔ بی۔ شیلی، جارج برنارڈ شاہ، جے ایس مل، موبس، روسو جیسے مغربی ادیبوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس طرح انھوں نے وکٹر ہیوگو کے 'لامیزربل' اور الیگزینڈر ڈیوما کے 'نائنٹی تھری' کا 'بلیدان' کے نام سے ترجمہ کیا جو شائع نہ ہو سکا۔

ان کا تمام ادب اور اخبار نویسی ادب آزادی ہے 'پرتاپ' کا ہر ایک شمارہ و ضمیمہ وطن پرستی سے متعلق ادب سے بھرا ہوتا تھا۔ اس میں نشرت بندی۔ کلی رواج، سماج سدھار، کسانوں اور مزدوروں کے مسائل۔ انگریزوں کے ذریعے بھارت کی تباہی۔ بھیک مانگنے پر پابندی۔ طوائفوں کو سماجی برابری کے ساتھ نو آباد کرنا۔ دیہی معیشت، سرکاری نوکری میں ہندوستانیوں کے ساتھ تفریق جیسے مضامین اور دوسری خبروں سے بھرا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی مقبولیت کو دیکھ کر سرکار ڈرتی اور گھبراتی تھی۔ انھیں بار بار جیل بھیجتی، ضمانت ضبط کرتی اور ادب پر روک لگاتی۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ریاستوں میں بھی ان کے ادب پر روک لگائی گئی۔ اس وقت پرتاپ اخبار صرف ریلوے اسٹیشنوں اور بس اڈوں پر ہی دستیاب ہو پاتا تھا۔

وہ ایک ایسے نڈر، خوددار، باضمیر اور حوصلہ مند وطن پرست تھے جنھوں نے ہر ایک مرحلے و ذرائع سے نہ صرف انگریزوں کے ظلم و ستم بلکہ ہر طرح کی بے انصافی، ظلم و تباہی کی مخالفت کی۔ ان کا سماج وادی سماج کے قیام میں یقین تھا۔ انھوں نے دیہی اخبار نویسی کو اس وقت بڑھاوا دیا جس وقت اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ خیالی اخبار نویسی میں یقین نہ کر کے عملی باتوں پر بھروسہ کرتے تھے اور اخباروں، رسالوں، کتابوں، اسمبلیوں جیسے سرکاری فورموں کے ذریعے ہندوستانی سماج کی بے غرض خدمت کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ دیش کے لوگوں کی فلاح کے لیے ہی انھوں نے اتنی مصیبتیں جھیلیں۔ اصلی معنوں میں وہ جمہوریت کے پہریدار تھے۔

انھوں نے اخبار نویسی کو دیش اور سماجی خدمت کا سب سے اچھا ذریعہ مانا تھا۔ اخبار نویسی ان کے لیے مشن تھی۔ دوسروں کے لیے وہ مثالی شخصیت تھے۔ اخبار نویسی کی وہ ایک بلند شخصیت تھے جنھوں نے غریبی میں زندگی گزارتے ہوئے کسی سے کچھ نہیں مانگا کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے بلکہ مظلوموں، غریبوں، دین دکھیوں کی مدد کی۔ اپنا ضمیر کبھی نہیں بیچا اور اپنی عزت کو بچائے رکھا۔ ۴۱ سال کی عمر میں ۵ بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا کیا ان کی زندگی کی کم کامیابی مانی جائے گی؟

وہ مانتے تھے کہ ادب سماج کا آئینہ ہی نہیں بلکہ تخلیق کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ اخبار نویسی کا مقصد صرف خبروں کو طبع کرنا نہ ہو کر صحت مند رائے عامہ کا قیام کرنا ہوتا ہے۔ اخبار نویسی کا بنیادی مقصد دیش و سماج کو غلط راستے پر جانے سے روکنا ہے۔ اخبار نویس قوم اور سماج کو بنانے والا ہوتا ہے وہ سماجی ذمے داریوں کے بوجھ سے نہیں بچ سکتا۔ ان کے خیال میں اخبار نویس کو غیر جانب دار، نڈر، خوددار اور حوصلہ مند ہونا چاہیے جس سے وہ فخر کے ساتھ سر اٹھا کر کہہ سکے کہ میں اخبار نویس ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اخبار نویس عیش و آرائش کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو سماج و قوم و دیش کو بدلنے کی بات ان کے من میں آ ہی نہیں سکتی۔

آج دیش کو گنیش شنکر ودیارتھی جیسے نڈر، غیر جانب دار، وطن پرست اخبار نویس کی ضرورت ہے جو دیش کے سامنے موجود چیلنجوں کا سامنا کر سکے۔ برادر پرستی، زبان پرستی، مذہبیت، فرقہ پرستی کے خلاف جہاد چھیڑ کر آپسی میل ملاپ، بھائی چارہ، امن و امان و ہم آہنگی برقرار رکھنے اور تشدد کو روکنے میں قلم کے ساتھ ساتھ اپنی جان کی بھی بازی لگا سکے۔ کاش ہم ان کی شہادت سے کچھ سیکھ سکیں۔

●

ترتیب

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : این۔ این۔ شرما

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

معاون : رقیہ زیدی

تزئین و کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : سندیتا

جلد : ۱۷ ; شمارہ : ۴

جولائی ۱۹۹۱ء (۱۰ اساڑھ تا ۹ شراون شک ۱۹۱۳)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زر سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زر سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر کے پورم (مین) نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ڈاکٹر رئیس احمد

پیشہ ورانہ بندوبست کی ضرورت:

زرعی مارکیٹنگ کوآپریٹوز

ہندوستان میں فی الوقت ۵۹۲۶ ابتدائی مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیاں ہیں جن میں سے ۲۶۳۶ عمومی نوعیت کی اور ۳۲۹۰ خصوصی سامان تجارت کو فروخت کرنے والی سوسائٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۹ سرکاری وفاق، ۲۲ ریاستی سطح کے مارکیٹنگ وفاق اور ۱۷۵ ضلعی سوسائٹیاں ہیں۔ قبائلی اکثریت والے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کثیر المقاصد سوسائٹیاں (LARG SCALE MULTI PURPOSF SOCITIES,LAMPS) بھی کام کر رہی ہیں۔ ملکی سطح پر NAFED کے علاوہ ٹرائبل کوآپریٹو مارکیٹنگ ڈیولپمنٹ فیڈریشن آف انڈیا لمیٹڈ (TRIFED) قبائلی امداد باہمی سوسائٹیوں کو تعاون اور قبائلی علاقوں کے مارکیٹنگ کے مسئلوں پر توجہ دیتی ہے۔

زیر نظر مقالے میں زراعتی امداد باہمی سوسائٹیوں کے بندوبست میں درپیش مسئلوں اور تجارتی سرگرمیوں میں سرکاری مداخلت پر نظرثانی کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالہ تمام مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں میں پیشہ ورانہ انتظام و انصرام کو متعارف کرنے کے سلسلہ میں چند ٹھوس مشورے بھی پیش کرتا ہے۔

یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ لائق اور اہل انتظامیہ کے بغیر کسی تجارتی مہم میں کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ زراعتی مارکیٹنگ سوسائٹیاں جن میں انتظامیہ خوب تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے، موثر انداز میں کام کر رہی ہیں ورنہ بصورت دیگر اکثر سوسائٹیاں غیر موثر، بے جان اور بے کار ہیں۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ تمام زراعتی مارکیٹنگ سوسائٹیاں اہل اور باصلاحیت انتظامیہ کو انگیز کریں تاکہ اس کے ممبران اپنی پیداوار کی نفع بخش قیمتیں پا سکیں اور بے جان سوسائٹیوں کے تن مردہ میں جان آسکے۔ اس طرح مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیاں تاجروں، دلالوں وغیرہ سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گی۔

سرکاری مداخلت

اصول باہمی تعاون کے خطوط پر مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کی صلاحیت میں اضافہ کی راہ میں سرکاری مداخلت ایک بڑی الجھن ہے۔ عرصہ دراز سے جاری سرکاری مداخلت کی وجہ سے زراعتی امداد باہمی مارکیٹنگ سوسائٹیوں کو اناج کی تحصیل کرنے والے سرکاری ایجنٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرکاری مداخلت کو ختم نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ بیشتر سوسائٹیوں کے شیئر کیپٹل میں سرکار کا حصہ اس کے ممبروں سے زیادہ ہے۔ چند مارکیٹنگ وفاقوں میں سرکاری شیئر کی تعداد ۸۰ فی صد سے زیادہ ہے۔ اب انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کے جمع شدہ سرمایہ میں سرکاری شیئر کو کافی کم کر دیا جائے اور اسے لازمی بنایا جائے کہ کسی بھی صورت میں ۶۰ فی صد سے زیادہ نہ ہو۔ ایسی بھی کمپنیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جن میں سرکاری مالی اداروں کا شیئر نہ صرف ان کے کمپنی سازوں سے زیادہ ہوتا ہے بلکہ ۵۰ فی صد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بھی کمپنیاں اپنے طور پر کام کرتی ہیں اور سرکار ان کی تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرتی۔ اسی نہج پر زراعتی مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کو بھی بازار کی ضرورتوں کے مطابق آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ مندرجہ ذیل جدول میں مختلف کمپنیوں میں کمپنی سازوں اور سرکاری مالی اداروں کے شیئر دکھائے گئے ہیں۔

گوشوارہ

کمپنیوں میں کمپنی سازوں اور سرکاری اداروں کے شیئرز

کمپنی کا نام	گروپ	کمپنی سازوں کا شیئر (فی صد)	سرکاری مالی اداروں کا شیئر (فی صد)
اے سی سی	ٹاٹا	۱۱٫۹۶	۴۰٫۷۰
ٹسکو	ٹاٹا	۱۰٫۸۵	۴۴٫۹۳
ٹیلکو	ٹاٹا	۱۹٫۲۶	۴۰٫۷۳
میسور سیمنٹ	برلا	۲۰٫۶۶	۴۸٫۰۷

دی ایکس ایل	برلا	۱۸٫۵۴	۳۵٫۱۲
مہندرا اینڈ مہندرا	مہندرا	۰۸٫۳۵	۴۶٫۳۵
مہندرا یوجین	مہندرا	۲۳٫۷۳	۴۶٫۱۱
کرلوسکر پنیومٹک	کرلوسکر	۲۳٫۵۳	۶۰٫۶۳
بیسٹ اینڈ کرامپٹن	ملایا	۱۸٫۳۸	۵۵٫۷۸
مودی ربر	مودی	۲۶٫۴۹	۵۱٫۰۸
کلکتہ الیکٹرک	گوئینکا	۱۲٫۱۹	۴۹٫۹۴
کامنی انجینئرنگ	گوئینکا	۳۲٫۰۰	۴۱٫۰۰
ڈنلپ	چھابڑا	۰۵٫۳۹	۳۴٫۶۹
اشوک لیلینڈ	ہندوجا	۰۳٫۴۶	۳۸٫۶۸
لارسن اینڈ ٹربو	-	-	۴۱٫۰۴
ایس آئی سپننگ	ایسار	۲۶٫۴۳	۵۶٫۵۱
اوشا ریکٹی فائر	رائے	۲۴٫۶۳	۶۶٫۳۰
ایس پی آئی سی	ایم اے چدمبرم	۱۴٫۳۶	۴۸٫۵۴
اسکارٹس	نندا	۱۴٫۳۹	۴۴٫۵۴
بھارت گیرس	رونق سنگھ	۱۴٫۸۲	۴۲٫۱۸
ٹی وی ایس الیکٹرانکس	ٹی وی ایس	۱۲٫۱۴	۵۸٫۶۹
انڈیا سیمنٹ	سنکالد	۱۱٫۶۵	۵۰٫۴۶
ایس آر ایف	ڈی سی ایم	۰۱٫۳۰	۵۶٫۵۷
لکشمی مِل	لکشمی	۲۰٫۷۵	۴۴٫۴۹

بحوالہ: دی کوآپریٹر، نومبر ۱۹۹۲ء ص ۲۱۵

امداد باہمی سوسائٹیاں: ایک موثر کردار

وقت کا تقاضہ ہے کہ زرعی مارکٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کے کاموں میں سرکاری مداخلت ختم کی جائے۔ امداد باہمی مارکٹنگ سوسائٹیوں کو سرکاری ایجنٹ کی حیثیت سے کام نہیں کرنا چاہیے۔ اسے وہ ضمنی یا ثانوی کام کے طور پر کر سکتی ہیں۔ اُن کا اصل کام مارکٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کے انجمن ساز کسانوں کی پیداوار کی منفعت بخش قیمتیں حاصل کرنے کے مختلف طریقوں کی تلاش ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے اقتصادی منظر اور مسابقاتی دوڑ میں زندہ رکھنے کے لیے ان کو باہمی امداد کے اصولوں کی بنیاد پر خود مختار امداد باہمی مارکٹنگ ایجنسیوں کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ موثر اور فعال مارکٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کو زرعی مارکٹنگ کے میدان میں ایجنسی کی حیثیت سے کام کرنے کی بجائے یہ ضروری ہے کہ انھیں خود مختار حیثیت سے کام کرنے کی آزادی دی جائے۔

کسانوں کے مفادات کا تحفظ

یہ مسابقات کا دور ہے۔ صرف وہی تجارتی انٹرپرائزز کامیاب ہو سکتی ہیں جو عوام کی ضروریات کے مطابق موثر طور پر کام کر رہی ہیں۔ زرعی مارکٹنگ امداد باہمی سوسائٹیاں دیہی علاقوں میں تب ہی زندہ رہ سکتی ہیں جب وہ اپنے ممبروں کو بہترین خدمات دے سکیں، زرعی پیداوار کی نفع بخش قیمتیں حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کر سکیں۔ نیز بچی تاجروں اور اداروں کے لیے منفعت بخش ثابت ہو سکیں۔ اس کے لیے انھیں اپنے تجارتی نظام میں زبردست تبدیلیاں لانی ہوں گی مثلاً بہتر منصوبہ بندی، موثر انتظام و انصرام اور باقاعدہ کارکردگی اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب تجارتی سرگرمیوں میں سرکاری مداخلت ختم کی جائے۔ مارکٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کو خود مختار حیثیت دی جانی چاہیے۔ ۱۹۹۱ء میں برہم پرکاش کمیٹی کے تیار کردہ مسودے کے خطوط پر مثالی امداد باہمی سوسائٹی ایکٹ کے نفاذ میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ آندھرا پردیش نے اس سمت میں پیش رفت کر دی ہے۔ دوسری ریاستوں کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

بنیادی ڈھانچے کا فقدان

کسی بنیادی ڈھانچے کے سہارے کے بغیر موثر زرعی امداد باہمی مارکٹنگ ممکن نہیں۔ گودام اور نقل و حمل کی مناسب سہولتیں ضروری ہیں۔ زرعی پیداوار کے نقل و حمل کے لیے مارکٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کو ریلوے اور پرائیویٹ ٹرک ٹرانسپورٹرز کا سہارا لینا پڑتا ہے کیوں کہ امداد باہمی سوسائٹیاں ابھی تک بڑے پیمانے پر نقل و حمل کی تجارت میں داخل نہیں ہوئی ہیں۔ دور دراز کے علاقوں تک پھلوں، سبزیوں، دودھ اور پولٹری پیداوار کی نقل و حمل کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ ویگن درکار ہے۔ تاوقتیکہ امداد باہمی سوسائٹیاں بڑے پیمانے پر نقل و حمل کی تجارت میں داخل نہیں ہوتیں تب تک انھیں اپنے ممبروں کی پیداوار کو گاؤں سے منڈی منتقل کرنے کے لیے نقل و حمل کی سہولت کو جہاں تک ممکن ہو سکے نسبتاً کم اجرت پر حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

زرعی سامان تجارت کی مارکٹنگ باضابطہ بازاروں میں ہوتی ہے۔ تھوک منڈیوں کی تعداد ۶۰۰۰ سے زائد ہے اور ۲۲۰۰۰ گاؤں میں لگنے والے میعادی ہاٹ ہیں۔ ان بازاروں میں سے بیشتر میں بنیادی سہولتوں مثلاً نیلامی پلیٹ فارموں، پختہ سڑکوں، بیل گاڑیوں کے اڈوں، سرایوں، پانی کی سہولتوں وغیرہ کا فقدان ہے۔ زرعی اشیاء کی درجہ بندی اور تول کے لیے ایسے بازاروں میں تمام تکنیکی خدمات مہیا ہونی چاہئیں۔ غلط ناپ تول کے چلن کا

مکمل طور پر خاتمہ ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ موجودہ دیہی مارکیٹنگ نظام میں دلالوں اور کسانوں کی پیداوار فروخت کرنے والے دلالوں/کمیشن ایجنٹوں کے ذریعے پیداوار سے کٹوتی کے چلن کا بھی مکمل خاتمہ ہونا چاہیے۔

مینجمنٹ کو پیشہ ورانہ مہارت سے مزین کرنا

صرف چند مخصوص اشیاء مثلاً شکر، جوٹ، کپاس وغیرہ کی مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیاں ہی اپنے ممبروں کے لیے مارکیٹنگ کا کام انجام دے رہی ہیں اور بیشتر سرکاری ایجنٹ کی حیثیت سے صرف تحصیل کر رہی ہیں۔ بازاروں پر ان کے اثرات نہیں کے برابر ہیں۔ شکر فیکٹریوں اور ڈیری سیکٹر نے بھی محض چند ریاستوں میں اچھی شہرت کمائی ہے۔ مینجمنٹ کے پیشہ ورانہ پہلو کے علاوہ اپنے ممبروں سے دیرپا اور قابل اعتماد تجارتی رشتوں کی استواری کے لیے کوششوں کا فقدان ان کی کمتر کارکردگی کا سبب ہے۔ امداد باہمی کی فضا میں ممبروں کا اعتماد ایک انمول سرمایہ ہے۔ ایسے اعتماد کی امید اسی صورت میں کی جا سکتی ہے جب امداد باہمی سوسائٹی ان کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتی ہو۔ موجودہ بازار معیشت کی چنوتیوں کے سامنے مینجمنٹ نظام کی اصلاح کی ضرورت واہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔ ایسی سوسائٹیاں جو ممبر۔ صارفین کی اساس پر قائم ہوں اور نسبتاً کم قیمت والے لین دین کرتی ہوں وہ یقیناً اپنے مدمقابل پر بھاری پڑیں گی اگر ان کی کارکردگی بہتر اور موثر ہو۔ اس کے لیے بورڈ آف ڈائرکٹرز سے لے کر سب سے نچلی سطح تک انتظامیہ کے ہر پہلو اور کارکردگی کی تمام سطحوں پر پیشہ ورانہ مہارت پر مبنی ایک نمایاں تبدیلی لانی ہوگی۔

آج کی مسابقاتی فضا میں مارکیٹنگ امداد باہمی سوسائٹیوں کے مینجمنٹ کو پیشہ ورانہ مہارت سے مزین کرنا ان کی بقا کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ کوآپریٹو لیڈران اس مسئلہ سے عرصۂ دراز سے بخوبی واقف ہیں اور انھوں نے کوآپریٹوز کے مینجمنٹ میں پیشہ ورانہ ماہرین کی شمولیت کی عام طور پر سفارش کی ہے۔ لیکن امداد باہمی سوسائٹیوں کی اکثریت نے پیشہ ورانہ مہارت کی حامل مینجمنٹ پر دھیان نہیں دیا ہے جس کا نتیجہ کم اہلی کی صورت میں نمایاں ہے۔ کوآپریٹو تحریک کی ابتدا سے ہر کوآپریٹو سوسائٹی میں ایک انتظامی کمیٹی ہوتی تھی جو مارکیٹنگ کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تجارتی سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی تھی۔ طرز جدید کے نام پر جب سے کمیٹی کا نام "بورڈ آف ڈائرکٹرز" رکھ دیا گیا، وہ عام طور پر تجارتی سرگرمیوں کی اصلاح میں دلچسپی نہ لے کر مارکیٹنگ کوآپریٹوز کے روز بہ روز کے انتظام کو بھی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی ہیں۔ موثر کارکردگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوآپریٹو مارکیٹنگ تنظیمیں اوپر سے نیچے تک اپنے مینجمنٹ کو پیشہ ورانہ مہارت سے مزین کردیں۔ مارکیٹنگ کوآپریٹوز کو اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ضرورتوں کے مطابق اپنے عملہ کی تقرری کر سکیں۔ جہاں جہاں انھیں یہ اختیار حاصل ہے وہاں مارکیٹنگ کوآپریٹوز بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور کم خارجی مداخلت کے ساتھ موثر طور پر مقابلہ آرائی کر رہی ہیں۔ لیکن عام طور پر بیشتر ریاستوں میں صورت حال برعکس ہے۔ اہم عہدوں پر فائز عہدیداران کی تقرری، ان کے مشورہ کے بغیر، ریاستی حکومت کرتی ہے۔ ایک مارکیٹنگ کوآپریٹو سے دوسری میں ان کا تبادلہ آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے بیشتر مارکیٹنگ کوآپریٹو کے بارے میں مناسب واقفیت نہیں رکھتے۔ زرعی مارکیٹنگ کوآپریٹوز کی انتظامیہ میں سرکاری عمال کی تقرری کا چلن یکسر ختم ہونا چاہیے نیز انھیں اپنے عملے کی تقرری کا اختیار سونپا جانا چاہیے تاکہ کامیابی کو یقینی بنایا جا سکے۔

نظام معلومات

مینجمنٹ سے متعلق ایک موثر معلوماتی نظام ایک دوسری اہم ضرورت ہے۔ تغیر پذیر پیداواری رجحانات اور ملکی وبین الاقوامی منڈیوں میں زرعی اشیاء کی قیمتوں کے بارے میں مارکیٹنگ کوآپریٹوز کو اچھی معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔ جدید تجارت میں کمپیوٹر کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا ہے کیوں کہ کمپیوٹر جامع معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ چناں چہ وقت کا تقاضا ہے کہ مارکیٹنگ کوآپریٹوز کو کمپیوٹرائزڈ معلوماتی نظام سے لیس ہونا چاہیے جو ہر سطح پر کوئی رائے قائم کرنے اور فیصلہ لینے میں معاون ہوگا۔ (NAFED) اور ریاستی کوآپریٹو مارکیٹنگ وفاقوں کو آگے بڑھ کر ایسے سائنسی معلوماتی سسٹم سے فیضیاب ہونے کے لیے مطلوبہ سرمایہ اور رہنمائی دینی چاہیے جو مارکیٹنگ کوآپریٹوز کی پیداواری صلاحیت اور اہلیت میں اضافے کے لیے انتہائی اہم اور مرکزی کردار ادا کرے گا۔

حوالہ جات

— ایس۔ ایس۔ کے آچاریہ، این۔ ایل اگروال، ایگریکلچر مارکیٹنگ ان انڈیا: آکسفورڈ آئی۔ بی۔ ایچ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ۔ ص ۲۸۶

— سی۔ بی۔ مموریا، ایگریکلچر پرابلمس آف انڈیا، کتاب محل، الٰہ آباد۔ ص ۷۸۵۔

— اے۔ این۔ شرما، اکنامک اسٹرکچر آف انڈین ایگریکلچر، ہمالیہ پبلشنگ ہاؤس ص ۱۰۔۳۰۹۔

— اقتصادی جائزہ ۹۵-۱۹۹۴ء، وزارت مال، حکومت ہند۔

— بی۔ ایس۔ متھر، کوآپریشن ان انڈیا، ساہتیہ بھون، آگرہ، ص ۲۷۹

— اروند نیتم، نیفڈ مارکیٹنگ ریویو، نمبر ۱۱-۱۲، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴ء، ص ۴۔

— آر۔ ڈی۔ بیدی، تھیوری، ہسٹری اینڈ پریکٹس آف کوآپریشن، ص ۲۷۶۔

— ایچ۔ آر۔ مکھی، کوآپریشن ان انڈیا اینڈ ابراڈ، بی۔ آر۔ پبلیکیشن، دہلی ص ۴۶۔ ۱۶۵۔

— نیفڈ کی سالانہ رپورٹ ۹۴-۱۹۹۳ء اور نیفڈ پروفائل۔

باقی ص ۲۵ پر

امت ۔کے۔ ناگ

شمال مشرقی علاقے کی اقتصادی ترقی

شمال مشرقی ریاستوں کے لیے اقتصادی پیکیج اس خطے میں تیزی سے اقتصادی ترقی لانے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے کیوں کہ یہ ترقی اس خطے کی ریاستوں کی پسماندگی اور بے روزگاری کے اہم مسائل حل کرنے کی کلید ہے۔

شمال مشرقی علاقے میں قدرتی وسائل کی افراط ہے اور بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ حیاتیاتی گوناگونی کے علاوہ یہاں کی ثقافتی روایات بھی شاندار ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے حصول آزادی کے بعد سے اس خطے میں سماجی و اقتصادی ترقی بڑی حد تک غیر مساوی رہی ہے۔ لہٰذا یہ پیکیج بلاشبہ صحیح سمت میں ایک قدم ہے جس کا منشا شمال مشرقی علاقے کو قومی معیشت کے اصل دھارے میں شامل کرنا ہے۔

اس پیکیج پر نویں پنج سالہ منصوبے کے دوران عمل درآمد کیا جائے گا، جس پر ۶۱۔ ارب روپے کے اخراجات آئیں گے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ رقم نویں منصوبے کے سلسلے میں متعلقہ ریاستوں کے لیے مختص کی گئی رقوم کے علاوہ ہے۔ شمال مشرقی خطے کی ترقیاتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے یہ بلاشبہ ایک خوش آئند قدم ہے۔ اس کا محرک یہ احساس ہے کہ ملک میں اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے اقتصادی لحاظ سے پسماندہ علاقے خصوصی اور ترجیحی توجہ کے مستحق ہیں۔

بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے لیے پیکیج

یہ پیکیج اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے کہ مسئلے کا حل مخصوص اسکیموں یا پروجیکٹوں کے لیے مزید رقوم مختص کرنے کے بجائے، قلیل وسائل کے مقررہ مدت کے اندر مناسب استعمال میں مضمر ہے۔ بے روزگاری کے مسئلے کو مقررہ مدت کے اندر مکمل کیے جانے والے منصوبۂ عمل کے ذریعے حل کرنے کو اولین ترجیح دی گئی ہے۔

اس خطے میں بنیادی ڈھانچے کی کمیوں اور کمزوریوں کا پتا لگانے نیز کم سے کم بنیادی خدمات میں اضافے کے معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ایک رکن کی سربراہی میں اس اعلا سطحی کمیشن نے اپنا کام شروع بھی کر دیا ہے۔ اس وقت وہ مختلف شعبوں، خصوصاً بجلی، مواصلات اور ریلوے سے تعلق رکھنے والے مسائل پر غور کر رہا ہے۔ وہ اس بات کا بھی جائزہ لے رہا ہے کہ سات شمال مشرقی ریاستوں میں کم از کم بنیادی خدمات کی فراہمی کے تعلق سے کتنا کام ہونا باقی ہے۔ کمیشن تمام ضرورتوں پر غور و خوض کے بعد شمال مشرقی خطے کی ان سات ریاستوں میں بنیادی ڈھانچے اور کم از کم بنیادی خدمات میں مطلوبہ توسیع و اضافے کے سلسلے میں پالیسیاں اور پروگرام تجویز کرے گا۔ اس کے بعد ان پروگراموں کی تکمیل کے لیے سالانہ بنیاد پر اضافی رقوم مختص کی جائیں گی، جو منصوبے کے لیے مختص کی گئی رقوم کے علاوہ ہوں گی۔ محکمے کے ایک سکریٹری کی سربراہی میں ایک اعلا اختیاراتی کمیٹی شمال مشرقی ریاستوں میں تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری کے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کر رہی ہے۔

موثر پیکیج

اس پیکیج میں ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء تک روزگار کی یقین دہانی کی اسکیم کی شمال مشرقی ریاستوں کے تمام اجتماعی ترقی کے بلاکوں میں توسیع، پورے خطے میں الیکٹرانک میڈیا اور مواصلاتی نظام کا احاطہ، شمال مشرقی علاقے میں قرضوں کی دستیابی کو بہتر بنانا، سیاحت کو فروغ دینا، زراعت اور تجارت و صنعت سے تعلق رکھنے والی تمام مرکزی ایجنسیوں، مثلاً نبارڈ اور مختلف اشیاء کے بورڈوں وغیرہ کو مستحکم بنانا اور شمال مشرقی خطے کے لیے سرحدی تجارت کے بشمول جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ تجارت بڑھانے کے لیے ایکسپورٹ پالیسی وضع کرنا شامل ہیں۔

ادویات، منشیات اور ایڈس کی خوفناک بیماری پر کنٹرول، ریلوے خدمات بہتر بنانے، پانی کا جامع انتظام اور سیلاب کی روک تھام کے اقدامات بھی اس پیکیج کا اہم حصہ ہیں۔

پانی کا جامع انتظام

آسام اور شمال مشرقی ریاستوں کی ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ملک میں پانی کے جامع انتظام کے سلسلے میں قائم کیے گئے کمیشن سے شمال مشرقی خطے میں

بھی سیلاب کی روک تھام اور پانی کے جامع انتظام کے سلسلے میں سفارشات پیش کرنے کو کہا گیا ہے۔ برہم پتر بورڈ کو فوراً فعال بنایا جائے گا اور اس سے سیلاب کی روک تھام، بجلی کی پیداوار اور پانی کے جامع انتظام سے متعلق پروجیکٹوں کی فہرست مرتب کرنے کو کہا جائے گا۔ پانی کے بہتر ڈسچارج اور نقل و حمل کے لیے خطے کی آبی شاہراہوں کی صلاحیت بڑھانے کی غرض سے ان کی تہہ میں جمع شدہ مٹی اور کیچڑ کو نکالنے کا کام بھی انجام دیا جائے گا۔ برہم پتر میں سیلاب کی روک تھام کے تمام پروجیکٹوں کے لیے اب سو فی صد مرکزی گرانٹ دی جائے گی۔

آسام اور شمال مشرق خطے کے عوام کی خواہشات کو دیکھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام اور پانی کے انتظام کے لیے موزوں پروگرام بنانے اور زیر عمل لانے کی اسکیم اس پیکیج کا غالباً سب سے اہم جزو ہے۔ کیوں کہ خطے کے عوام برہم پتر میں سیلاب کی روک تھام کے لیے مرکز کی طرف سے بطور قرض دی جانے والی امداد کو ایک عرصے سے ناکافی تصور کرتے رہے ہیں۔

صنعتی ترقی

وزارت صنعت نے شمال مشرقی ریاستوں کی صنعتی امور کی وزارتوں کے خیالات جاننے کی غرض سے انھیں حال ہی میں ایک بیک گراؤنڈ پیپر بھیجا ہے۔ اس میں کچھ تجاویز پیش کی گئی ہیں جن میں سرمایہ کاری پر سبسڈی کی اسکیمیں، نئے مینوفیکچرنگ یونٹوں کے لیے طویل تر مدت کے لیے ٹیکس مراعات، سرمائے کے تحفظ اور بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے کی تجاویز بھی شامل ہیں۔ دیگر تجاویز ترقیاتی مراکز، طویل مدتی فنڈس کی فراہمی، چالو سرمائے کے لیے رعایتی شرحوں پر امداد، ٹرانسپورٹ سبسڈی اور منڈیوں کی توسیع کے بارے میں ہیں۔

اسکیموں پر عمل درآمد

شمال مشرقی ریاستوں میں اسکیموں کی منظوری اور ان پر عمل درآمد کے سلسلے میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے یہ طے کیا گیا ہے کہ تمام مرکزی وزارتیں اور محکمے اپنے بجٹ کا دس فی صد شمال مشرقی ریاستوں کے پروگراموں کے لیے مخصوص کریں گے اور اس امر کو یقینی بنائیں گے کہ ان پروگراموں پر تیزی سے عمل درآمد کیا جائے۔

اس کے علاوہ مرکزی وزرا، مرکزی وزارتوں اور محکموں کے سکریٹری، خصوصاً وہ جن پر سماجی سیکٹروں، پٹرولیم، سطحی ٹرانسپورٹ، ریلوے، شہری ہوابازی، سیاحت، آبی وسائل وغیرہ کی ذمہ داری ہے، ہر تین مہینوں میں ایک بار تمام شمال مشرقی ریاستوں کا دورہ کریں گے نیز منصوبوں اور پروگراموں پر عمل درآمد کے کام کا جائزہ لیں گے۔

عوام کی شرکت

عوام میں ترقیاتی عمل میں شریک ہونے کا احساس پیدا کرنے کی غرض سے حکومت نے لامرکزیت کو بڑھاوا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیوں کہ شمال مشرقی خطے میں عوام کو فیصلہ لینے کے عمل میں شامل کرنے کے لیے ضلع اور ضلع سے نیچے کی سطحوں پر مزید لامرکزیت لانے کی ضرورت ہے۔

اس پیکیج کو نویں پنج سالہ منصوبے کی مقررہ مدت میں عملی جامہ پہنانے کے واسطے مرکز اور ریاستوں کی طرف سے بہت محنت اور پر خلوص کوششیں کرنے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا شمال مشرقی ریاستوں کی حکومتوں اور عوام سے بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے صاف ذہن اور تیزی کے ساتھ پر خلوص کوششیں کریں گے اور مرکز کی کوششوں کے ساتھ تال میل قائم رکھتے ہوئے اسے اپنا مکمل تعاون دیں گے۔ ●

بقیہ: کوڑھ کی روک تھام

جاتی ہے تاکہ ٹیکہ پوری طرح محفوظ ہو۔ ڈاکٹر طلوار اور ان کی ٹیم نے لیبارٹری میں ٹیکہ تیار کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ اسے ان لوگوں تک پہنچانے کا فیصلہ کیا، جنھیں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ یہ ٹیکہ سب سے پہلے ۱۹۷۹ء میں ممبئی کے ایکورتھ لیپروسی اسپتال میں لیپرومیٹس لیپروسی کے ایک مریض کو لگایا گیا۔ اس کے بعد ایک سو سے زیادہ مریضوں کو یہ ٹیکہ لگایا گیا۔ ان میں سے کچھ مریضوں میں ڈرامائی انداز میں کچھ سدھار دیکھا گیا۔ ان کے اعضا کی ساخت و فعل میں جو خرابی آگئی تھی وہ غائب ہوگئی۔

ٹیکے (ویکسین) کا استعمال عموماً بیماری کو روکنے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن مریضوں میں اس ٹیکے کے لگانے سے جو سدھار دیکھا گیا وہ ایک اضافی فائدہ تھا۔

مہاراشٹر میں مالوانی اور سنت پتی کے مقامات پر بعض گھرانوں کے ان صحت مند لوگوں کو جن کا واسطہ کوڑھ کے مریضوں سے پڑتا تھا لیکن جن میں قوت مدافعت کم تھی، کئی لیبارٹری ٹیسٹوں کے بعد یہ ٹیکے لگائے گئے۔ یہ ٹیکہ نہایت باریک سوئی سے بازو کے اوپر کے حصے میں لگایا جاتا ہے۔ بی۔ سی۔ جی ویکسین کی طرح یہ ٹیکہ لگانے سے بھی کبھی کبھی ہلکا بخار ہو جاتا ہے مگر اس کا کوئی نقصان دہ اثر نہیں ہوتا اور کوئی خاص احتیاط برتنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔

ٹیکے لگانے کے بعد مریضوں کا بغور معائنہ کیا گیا اور اس کے لیے ڈاکٹر کئی بار مریضوں کے گھر گئے ان میں سے ۹۵ فی صد لوگوں میں جن کے اندر قوت مدافعت کم تھی۔ ٹیکہ لگانے کے بعد کوڑھ کے جراثیم سے محفوظ رہنے کی طاقت پیدا ہوگئی۔ ۵ سال سے انھیں زیر مشاہدہ رکھا جا رہا ہے اور ان کی تحفظی صلاحیت مستحکم پائی گئی ہے۔

ہندوستان کے ایک سرکردہ ماہر سرجن ڈاکٹر ایم۔ وی۔ پلاپورکر کا کہنا ہے: "ہمیں یقین ہے کہ یہ ٹیکہ کوڑھ کے تدارک کے لیے پر اثر اور محفوظ ہے اسی لیے ہم نے ست پتی گاؤں کے ان لوگوں کو بطور آزمائش یہ ٹیکے لگائے جو کوڑھ کے مریضوں کے قریبی رابطے میں رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں اس کا بہت اچھا اثر دیکھا گیا ہے۔ ٹیکے کو بخوبی برداشت کیا گیا ہے اور اس کے نتائج اچھے رہے ہیں۔"

وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ آئی۔ سی۔ آر۔ سی ٹیکہ موثر اور بالکل محفوظ ہے۔ اس سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ یہ خطرناک بیماری روئے زمین سے جلد ہی مٹ جائے گی۔ ●

خورشید عالم

انسانی زندگیوں کے لیے ایک زبردست خطرہ:

کرۂ ارض کے درجۂ حرارت میں اضافہ

سائنس دانوں کے ایک سروے کے مطابق گزشتہ ایک صدی میں ۱۸۸۰ء سے اب تک کرۂ ارض کا درجۂ حرارت ۵ء۰ ڈگری سیلیس بڑھ چکا ہے۔ اگر درجۂ حرارت کی یہ تبدیلی اپنے معمول کے مطابق ہوتی تو یہ یقیناً فکر کی بات نہیں تھی لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان کرۂ ارض کی درجۂ حرارت میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا اس کے بعد تقریباً ۳۰ سالوں تک درجۂ حرارت اپنے مقام پر مستحکم رہا۔ البتہ سب سے زیادہ گرم پانچ سال گزشتہ دہائی میں دیکھے گئے۔ ۱۹۹۰ء سب سے زیادہ گرم سال تھا۔ کرۂ ارض کے اس درجۂ حرارت میں تبدیلی ہونا ایک فطری عمل ہے گوکہ اس کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے سیکڑوں اور کبھی کبھار ہزاروں سال بعد اس تبدیلی کا پتا لگتا ہے۔

قدرتی وسائل خصوصاً جنگلات اور پٹرولیم نیز جدید وسائل زندگی کے بے دریغ استعمال نے ماحول کے توازن کو بگاڑ دیا ہے جس کے نتیجہ میں قدرتی ماحول کی تباہی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے جو کہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن سب سے زیادہ سنگین مسئلہ کرۂ ارض کے ماحول کے اوپر چھائی ہوئی اوزون پرت کی بتدریج تباہی ہے، جو کہ ہم کو اور دنیا کی تمام اشیاء کو سورج کی تابکاری سے محفوظ رکھتی ہے اور درجۂ حرارت کو معتدل رکھتی ہے۔ درجۂ حرارت میں یہ یکسانیت دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہر سال کسی مہینہ میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ تقریباً ایک جیسی رہتی ہے۔ یہ اسی اوزون پرت کی مرہون منت ہے لیکن مضر گیسوں کی زیادتی اور زمین پر حرارت بڑھنے کی وجہ سے سورج اور زمین کے درمیان یہ دبیز حفاظتی غلاف کمزور ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ صنعتی سرگرمیوں اور وسائل کا بے دریغ استعمال ہے۔ اس کے علاوہ اوزون پرت کی تباہی نے موسموں کے توازن کو بھی درہم برہم کردیا ہے جس کے نتیجہ میں بے وقت کی بارش، یا بارش میں کمی ہوتی رہتی ہے اور کبھی کبھی غیر معمولی سردی بھی پڑتی ہے، سمندر میں طوفان آتے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی سمندر کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے۔

تقریباً تمام حقیقی گیس اور حرارت پیدا کرنے والی سرگرمیاں اوزون کو کمزور اور تباہ کرتی ہیں لیکن سائنس دانوں نے خاص طور سے تین گیسوں کو اوزون کو دشمن قرار دیا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ، کلورو فلورو کاربن اور میتھین۔ ان میں پہلی صنعتی سرگرمیوں پٹرول جلنے اور بجلی گھروں سے پیدا ہوتی ہے، دوسری ایئرکنڈیشنروں اور تیسری دھان کے کھیتوں سے، ہوا میں آکسیجن کی کمی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ میں اضافہ اوزون اور قدرتی ماحول کی تباہی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ جب کہ آکسیجن پیدا کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ محض جنگلات و نباتات ہیں۔

اوزون گیس

اوزون ایک ایسی گیس ہے جس کی ماحول میں کمی ہوجانے سے انسانی زندگی کو زبردست خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ اوزون گیس آکسیجن کے تین ایٹموں سے مل کر بنتی ہے۔ اوزون گیس کی پرت اس پوری دنیا کے گرد لپٹی ہوئی ہے جس سے خلاء سے آنے والی خطرناک شعاعیں ٹکراکر واپس چلی جاتی ہیں۔ تقریباً ۹۰ فی صد کرنیں اس پرت کی وجہ سے زمین پر نہیں پہنچ پاتی ہیں۔ اوزون کی مقدار فضا میں بہت معمولی ہے یعنی ایک کروڑ میں صرف تین حصہ۔

بہرحال غنیمت یہ ہے کہ یہ زیادہ تر فضائے بسیط میں یکجا رہتی ہے۔ انٹارکٹک کے ۲۵ کلومیٹر اوپر خط استوا سے ۱۵ کلومیٹر۔ یہاں پر اوزون دو خدمات انجام دیتی ہے (۱) خلاء سے آنے والی خطرناک کرنوں کی واپسی اور (۲) زمینی حدت کو خلاء میں خارج ہونے سے روکنا اور جو تھوڑی بہت خارج ہوجائے اس کی کمی کو پورا کرنا۔ یہ کمی اس طرح پوری ہوتی ہے جب آکسیجن کے تین ایٹم یکجا متصل ہوتے ہیں تو ان کی توانائی حدت میں تبدیل ہوجاتی ہے حالاں کہ زمین سے ۱۵۔۲۰ کلومیٹر اوپر درجۂ حرارت اس سے بہت کم ۵۰ ڈگری سیلیس سے لے کر ایک ڈگری سیلیس تک ہی بنا رہتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو زمینی حدت کے اخراج اور

E-368/2۔ ذاکر نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

آسمانی حدت کی برآمد کے درمیان تقریباً توازن بنا رہتا ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں یہ زمین کی گرمی کو بڑھا بھی دیتا ہے۔ اوزون کش سی ایف سی گیس تو ایسی ہے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ کے مقابلے دس ہزار گنا زیادہ گرمی پیدا کرتی ہے۔

اوزون کے سوراخ کی سب سے پہلے کھوج کرنے والے سائنٹسٹ جے سی فارمن کے مطابق ماحول میں اوزون کی کمی زمین کو گرم بھی کر سکتی ہے اور ٹھنڈا بھی کر سکتی ہے۔ اس کا انحصار اوزون کی اونچائی پر ہے۔ اگر ۳۰ کلومیٹر کے آس پاس اوزون کی کمی ہوتی ہے تو زمین کی آب و ہوا گرم ہوتی ہے اور کم اونچائی پر اوزون کی کمی آب و ہوا کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ اثر ۵ سے ۲۰ کلومیٹر کے درمیان آتی اوزون کی کمی سے پڑتا ہے۔

لیکن صنعتی انقلاب کی تباہ کاریوں نے زہریلی گیس کو فضائے بسیط تک پہنچا دیا ہے جو اوزون غلاف میں سوراخ کر دیتی ہیں۔ اس کا انکشاف ۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ ایک رسالہ نیچر (NATURE) میں کیا گیا جس کے مطابق ہر سال موسم سرما میں قطب جنوبی کے اوپر اوزون پرت میں ایک سوراخ ہو جاتا ہے جو صرف دو ہفتہ کے اندر وہاں کی فضائے بسیط کی ۵۰ فی صد اوزون نگل لیتا ہے۔ اگرچہ دوسرے علاقوں سے آنے والی اوزون اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ چناں چہ قطب جنوبی کی اوزون میں ۵ فی صد سالانہ کی کمی ہو رہی ہے اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ۲۰ برسوں میں اوزون پرت غائب۔

گرین ہاؤس

زمین کے درجہ حرارت کی طرح گرین ہاؤس بھی ایک فطری عمل ہے۔ اگر گرین ہاؤس نہ ہوتا تو آج زمین کا درجہ حرارت موجودہ درجہ حرارت سے ۳۰ ڈگری سیلسیس کم ہوتا تو اس وقت زمین پر انسانی زندگی کا وجود نہ ہوتا۔ گرین ہاؤس کچھ مخصوص گیسوں کی دین ہے۔ سائنس کی اصطلاح میں اسے گرین ہاؤس ایفکٹ (GREEN HOUSE EFFECT) کہتے ہیں۔ سبز موسم میں درخت اُگانے کی یہ ترکیب ہوتی ہے کہ انھیں شیشوں کے گھروں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح درختوں کو مناسب مقدار میں سورج کی حدت اور توانائی ملتی رہتی ہے اور دنیا کے ماحول میں کاربن کے متعلق ذرات دنیا کو ایک گرین ہاؤس میں تبدیل کرتے ہیں جن کی کمی بیشی سے ساری دنیا کا درجہ حرارت کم یا زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ کاربن میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ سورج سے آنے والی کرنوں کی فاضل گرمی کو خود جذب کر لیتا ہے جو شعاعوں کے ذریعہ رات گئے تک ہمیں حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح کاربن زمین سے خارج ہونے والی گرمی کو بھی بڑی حد تک خود ہی روک کر اسے زمین سے باہر جانے سے روکے رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہوا میں کاربن ذرات اور بعض دیگر کیمیاوی ذرات کی مقدار بڑھتی چلی جائے تو ساری دنیا کا ماحول بھی اسی حساب سے گرم ہوتا چلا جائے گا جیسا کہ صنعت کاری اور وسائل کے بے دریغ استعمال سے ہو رہا ہے۔

آئی پی سی سی (INTERGOVERNMENTAL PANEL ON CLIMATE CHANGE) نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ اگر گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج پر فوری روک نہیں لگائی گئی تو اگلی صدی میں کرۂ ارض کا درجہ حرارت ۰/۳ ڈگری سیلسیس فی صدی کے حساب سے بڑھے گا۔ یہ اضافہ کم سے کم ۰/۲ اور زیادہ سے زیادہ ۰/۵ ڈگری سیلسیس ہو سکتا ہے گویا کہ ۲۰۲۵ء میں اوسط درجہ حرارت آج سے ایک ڈگری سیلسیس زیادہ ہوگا اور اگلی صدی کے آخر میں درجہ حرارت کا یہ فرق ۳ ڈگری سیلسیس کا ہوگا۔ ہر گزرتا سال گیسز کے اخراج میں تقریباً ۲ فی صد اضافہ کا شاہد ہے۔

کرۂ ارض کے معمولی درجہ حرارت میں ایک ڈگری سیلسیس کے اضافے کی وجہ سے پانی بھاپ زیادہ تعداد میں بنتی ہے جو گرین ہاؤس کے اثرات کو متاثر کر کے آدھا ڈگری سیلسیس درجہ حرارت مزید بڑھائے گی جس کے نتیجہ میں برف پگھلے گی، دھوپ کی تمازت میں کمی آئے گی۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار دوگنی کرنے پر اونچائی پر بادل زیادہ بنیں گے لیکن درمیانہ درجہ کے بادلوں میں کمی آئے گی۔ اس طرح کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار دوگنی کرنے پر زمین کا اوسط درجہ حرارت چار ڈگری سیلسیس بڑھ جائے گا۔

کرۂ ارض کے درجہ حرارت میں اضافے سے سمندر میں پانی کی سطح اوپر اٹھے گی اور گلیشیروں پر جمی برف پگھلے گی۔ ۲۰۳۰ء تک سمندر میں پانی کی سطح ۲۰ سینٹی میٹر ہوگی اور اگلی صدی کے آخر میں سمندر کی لہریں ۶۵ سینٹی میٹر اوپر دکھائی دیں گی۔ اس وقت عالمی ماحول کے درجہ حرارت میں ایک ڈگری سیلسیس کا اضافہ ہو جائے گا اور اس وقت تک قطب شمالی کی تقریباً ساری برف پگھل کر سمندروں میں پہنچ چکی ہوگی۔ اب اگر سطح سمندر آج کی بہ نسبت ۳ میٹر بھی اونچی ہو جائے تو مالدیپ جیسے ممالک تو ختم ہو ہی جائیں گے بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ امریکہ اور کناڈا کے نشیبی علاقے سمندر بن چکے ہوں گے جن میں گرین لینڈ اور قطب شمالی کے برفانی تودے تیر رہے ہوں گے۔

الگ الگ گیسوں میں گرین ہاؤس کو متاثر کرنے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک کلوگرام کاربن ڈائی آکسائیڈ سو سال میں کرۂ ارض کو جتنا گرمائے گی اسے اگر 'ایک' اکائی مان لیا جائے تو میتھین میں کرۂ ارض کو گرمانے کی صلاحیت ۲۱ گنی زیادہ ہے۔ اسی طرح نائٹرس آکسائیڈ ۲۹۰ گنا زیادہ خطرناک ہے۔ سی ایف سی۔ ۱۱۔ اور سی ایف سی۔ ۲۱ بالترتیب ۳۵۰۰ و ۷۳۰۰ گنا زیادہ گرین ہاؤس کو متاثر کرتی ہیں۔

آئی پی سی سی کے سروے کے مطابق گزشتہ دہائی میں گرین ہاؤس کو جن گیسوں نے متاثر کیا ہے ان میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی حصہ داری ۵۵ فی صد تھی اگلے سو سالوں میں یہ حصہ داری ۶۶ فی صد ہونے کی توقع ہے۔ سی ایف سی بہت کم تعداد میں چھوڑے جاتے ہیں لیکن یہ ہزاروں گنا خطرناک ہیں اس لیے یہ ماحول میں لمبے عرصے تک رہتے ہیں۔ آج ان کی تعداد ۲۰ فی صد ہے جو کہ اگلے سو سالوں میں بڑھ کر ۱۲ فی صد ہو سکتی ہے۔

کاربن ڈائی آکسائیڈ

ایک اندازے کے مطابق جانوروں کے ذریعہ ہر سال ماحول میں ۱۰۰۰ کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ چھوڑی جاتی ہے اس کے باوجود یہ بیلنس برقرار رہتا ہے۔ یہ بیلنس اس وقت متاثر ہوتا ہے جب انسان غیر فطری عمل سے ماحول میں کاربن ڈائی آکسائیڈ چھوڑنے لگتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے اس میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ صنعتی انقلاب سے قبل ماحول میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی حصہ داری ۲۸۰ پی پی ایم (تقریباً دس لاکھ) تھی جو ۱۹۹۰ء میں بڑھ کر ۳۵۳ پی پی ایم ہو گئی۔ لکڑی، کوئلہ، تیل وغیرہ کے استعمال سے ماحول میں ہر سال ۵۷۰ کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ پہنچتی ہے۔ پیڑوں کے لگاتار کٹنے اور زمین کے غیر قدرتی استعمال سے ۱۰۰ کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں گھلتی ہے۔ سمندروں کے ذریعہ سوکھنے کے بعد بھی ہماری صنعتی سرگرمیوں کی وجہ سے ہر سال ماحول میں ۳۸۰ کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ گھلتی ہے۔ ۱۹۵۷ء سے ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار پر برابر نگرانی رکھی جا رہی ہے۔ ایک سروے کے مطابق کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھنے کی سالانہ در ۰٫۵ فی صد ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار کو بڑھانے میں ٹرانسپورٹ، بجلی کے پیداوار اور جنگلات کے خاتمہ کا بڑا ہاتھ ہے جن کا حصہ بالترتیب ۲۲٫۵، ۲۲٫۲ اور ۲۳ فی صد ہے۔

یوں تو ماحول میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گھلنے کے کئی قدرتی ذرائع ہیں لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ ماحول میں یہ کتنے عرصے تک موجود رہتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اگر کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اخراج آج کے مقام پر مستحکم ہو جائے تو بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں اضافہ ہوگا اگر اس اخراج کی مقدار آدھی ہو جائے تو کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھنے کی رفتار کچھ دھیمی پڑ جائے گی اور اگر غیر قدرتی اخراج بالکل ہی بند ہو جائے تو کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بہت حد تک گر جائے گی۔

میتھین

انیسویں صدی کے آغاز سے ماحول میں میتھین گیس کی مقدار لگاتار بڑھ رہی ہے گزشتہ دہائیوں سے اس میں خاص طور سے تیزی آئی ہے۔ موجودہ دور میں میتھین بڑھنے کی سالانہ رفتار ۰٫۹ فی صد ہے اس طرح ہر سال ماحول میں تقریباً ۵۰-۵۲ کروڑ ٹن میتھین گھل جاتی ہے۔

میتھین گیس کے بڑھانے میں کھیتی کا بڑا حصہ ہے۔ خاص طور سے دھان کے کھیتوں سے سب سے زیادہ میتھین پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد نم زمینوں کا حصہ ہے۔ یہ دونوں ملا کر کل کے میتھین کے ۴۰ فی صد سے زیادہ کے اخراج کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے ملک میں ہر سال دھان کے کھیتوں سے تقریباً ۹۰-۳۰ لاکھ ٹن میتھین نکلتی ہے اس کے علاوہ جانوروں کی آنت میں موجود فضلے سے بھی میتھین گیس پیدا ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق گائے، بھینس، اونٹ وغیرہ ہر سال ۵۵-۳۵ کلوگرام میتھین پیدا کرتے ہیں جب کہ بکری، بھیڑ اور گھوڑے ۵-۱۵ کلوگرام میتھین چھوڑتے ہیں۔ سور میں یہ مقدار سب سے کم صرف ایک کلوگرام ہے۔ اس طرح جانور کل میتھین پیداوار کا ۱۵ فی صد پیدا کرتے ہیں۔ کھیتی، ڈیزل، لکڑی وغیرہ کے جلانے سے ۸ فی صد میتھین پیدا ہوتی ہے۔ تقریباً ۱۵۰ سال پہلے ماحول میں میتھین کی مقدار ۷۰۰ پی پی بی وی (فی ارب اکائی) تھی جو ۱۹۹۰ء میں بڑھ کر ۱۷۲۰ پی پی بی وی ہو گئی۔

نائٹرس آکسائیڈ

ماحول میں نائٹرس آکسائیڈ لگاتار بڑھ رہی ہے۔ اس کے بڑھنے کی رفتار ۰٫۲۵ فی صد ہے اس کے بڑھنے کے کئی اسباب ہیں جیسے نائٹروجن کا بڑھتا ہوا استعمال، لکڑی، کوئلہ وغیرہ کا جلانا، مٹی میں جانوروں کا فضلہ، سمندر اور مٹی میں موجود نائٹروجن کے قدرتی عمل سے کل میتھین ۳۰-۲۰ فی صد پیدا ہوتی ہے۔ کل نائٹرس آکسائیڈ میں اس کی حصہ داری ۵۰-۲۰ فی صد ہے۔ جانوروں کے فضلہ سے تیار کردہ کھاد بھی زمین میں نائٹرس آکسائیڈ بنانے کا کام کرتی ہے جو آخر میں ہوا میں گھل جاتی ہے۔

نائٹرس آکسائیڈ ہوا میں تقریباً ۱۷۰ سال تک موجود رہتی ہے اس لیے اگر ہم نائٹروجن کھاد کو آج کے مقام پر مستحکم کر دیں تو بھی معمول کے مطابق صورت حال کو آتے آتے ۲۰۰-۱۵۰ سال لگ جائیں گے۔

عالمی ماحول اور کاربن ڈائی آکسائیڈ

اس وقت انسان کی اپنی کارکردگی کے نتیجہ میں ہر سال تقریباً ۶۰۰-۵۰۰ کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی ہے جس میں سے تقریباً تین سو کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ ماحول میں جمع ہو جاتی ہے۔ ایک تازہ امریکی رپورٹ کے مطابق ۲۰۳۰ء میں عالمی درجہ حرارت ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں دو ڈگری اور زیادہ ہو جائے گا۔ اتنی گرمی پچھلے ایک لاکھ ۲۰ ہزار برسوں یعنی پوری انسانی تاریخ میں کبھی نہ پڑی ہوگی۔ حالاں کہ دنیا کا موجودہ درجہ حرارت صنعتی انقلاب سے قبل کے دور سے ۰٫۶ ڈگری سے زیادہ ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ماقبل صنعتی انقلاب کے دور میں کاربن ذرات کی مقدار فی ۱۰ لاکھ صرف ۲۸۰ حصہ تھی جس میں اب تک ۲۵ فی صد اضافہ ہو چکا ہے اور اندازہ ہے کہ آئندہ ایک صدی میں یہ اضافہ سو فی صد ہو جائے گا۔ گرمی پیدا کرنے والے یہ ذرات کاربن ڈائی آکسائیڈ ۵۷ فی صد، سی ایف سی ۲۵ فی صد، میتھین یعنی کھاد اور کوکنگ گیس وغیرہ ۱۲ فی صد، نائٹروجن آکسائیڈ ۶ فی صد ہیں۔

کرۂ ارض کے درجہ حرارت میں تبدیلی سے جہاں پیڑ پودے متاثر ہوں گے وہیں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی مٹی کی نمی میں کمی واقع کرے گی جو کہ پیڑ پودے کو نقصان پہنچائے گی۔ آج جو پودے پہاڑی علاقوں میں دکھائی دے رہے ہیں وہی کل میدانی علاقوں میں دکھائی دے سکتے ہیں۔ اس اتھل پتھل میں پیڑ پودوں کی کچھ قسمیں ناپید ہو سکتی ہیں تو کچھ نئی قسمیں پیدا بھی ہو سکتی ہیں حتیٰ کہ زرعی علاقے میں بھی اس کا اثر ہو سکتا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے زیادہ استعمال سے فصلیں پیداوار

باقی صفحہ ۱۵ پر

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ حامد رضوی کنڈوی

گرین ہاؤس ایفکٹ

آج کل اس ماحولیاتی آلودگی کے چرچوں میں گرین ہاؤس ایفکٹ لفظ کا چرچہ معتول ترین ہے اور اس کا غیر توازن دنیا کے سبھی سائنس دانوں کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا ہے۔ لیکن سب سے پہلے ہمیں جان لینا ضروری ہے کہ یہ گرین ہاؤس ایفکٹ ہے کیا اور کیوں اور کیسے اس کا توازن قائم رہنا تشویش کی ایک شے بن گیا ہے۔ آیئے ان سب سوالوں کا جواب ہم مختصراً اس طرح دیکھتے ہیں۔

کچھ علاقوں میں خاص طور پر وہ علاقے جہاں درجہ حرارت کم اور پودوں کے بڑھنے کے لیے حالات سازگار نہیں ہوتے وہاں ایک گھر بنایا گیا جو کہ صرف شیشوں کا۔ یہ گھر ان علاقوں میں باغبانی کے لیے استعمال ہو چکا ہے۔ جب سورج کی کرنیں زمین کی آب و ہوا کے اوپری سطح پر پہنچتی ہے جہاں کہ اوزون (OZONE) گیس کی پرت موجود ہے جو کہ ازحد بنفشی کرنوں کو واپس لوٹا دیتی ہے اور سورج کی دوسری کرنوں کو آنے کی اجازت دیتی ہے اور چوں کہ یہ کرنیں چھوٹی لمبائی لہر کی ہونے کی بنا پر شیشے کے گھر میں بہ آسانی داخل ہو جاتی ہیں لیکن جب زمین کی سطح اور اس پر دیگر چیزوں کی رابطے میں آتی ہیں تو اس میں سے کچھ زیادہ لمبائی والی لہر کی انفرا ریڈ کرنیں بن کر لوٹ جاتی ہیں۔ اب یہ شیشے کا مکان ان کرنوں کو جو کہ لمبی لمبائی والی لہر رکھتی ہیں۔ باہر نکلنے یا بھاگ جانے سے روک دیتا ہے اور یہ انفرا ریڈ کرنیں گرمی کا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اسی لیے جب یہ کرنیں شیشے کے مکان میں داخل ہو جاتی ہیں تو یہ اس کا اندرونی درجۂ حرارت بڑھا دیتی ہیں اور اسے یعنی اندرونی احاطہ کو موزوں بنا دیتے ہیں۔ ان پودوں کے باقاعدہ بڑھاؤ جو کہ اس کے اندر ہے۔ اس شیشے کے مکان کو گرین ہاؤس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اور لہٰذا انفرا ریڈ کرنوں کے پھندے کے ذریعہ پیدا شدہ گرمی کے اثر کو گرین ہاؤس ایفکٹ کہا جاتا ہے۔

گرین ہاؤس گیس	ہوائی توازن (پی پی ایچ V/V)	سالانہ بڑھوتری (فی صد)
کاربن ڈائی آکسائیڈ	۳۴۴۰۰۰	۰٫۴
میتھین	۱۶۵۰	۱٫۰
نائٹرس آکسائیڈ	۳۰۴	۰٫۲۵
میتھائل کلورو فارم	۰٫۱۳	۷٫۰
اوزون	تبدیل	-
کلورو فلورو کاربن۔ ۱۱	۰٫۲۳	۵٫۰
کلورو فلورو کاربن۔ ۱۲	۰٫۴	۵٫۰
کاربن ٹیٹرا کلورائیڈ	۱٫۲۵	۱٫۰
کاربن مونو آکسائیڈ	تبدیل	۰٫۲

ہمارے ماحول میں ایک خاص طرح کا واقعہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب سورج کی کچھ کرنیں زمین پر پہنچتی ہیں اور انفرا ریڈ نور افشانی (جو کہ لمبی لہر) کی شکل میں زمین سے واپس لوٹتی ہے تب وہ سب کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی چادر میں جکڑ لی جاتی ہے۔ ایسا اس لیے ہو جاتا ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ذرّے ان زمین سے لوٹتی ہوئی کرنوں کو جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کرہ باد کی قریبی زمینی سطح گرم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس گرم ہونے جو کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی پرت کے ذریعہ انفرا رید نور افشانی کے جکڑ جانے سے ہوتا ہے کو گرین ہاؤس ایفکٹ کہتے ہیں۔

پھر بھی کچھ حد تک بھاپ اور اوزون پرت بھی ہمارے کرہ باد میں اس گرین ہاؤس ایفکٹ ہونے کی ذمہ دار ہیں لیکن جب تک بھاپ کی موجودگی صرف زمین کی سطح کے نزدیک تک ہے اور اوزون گیس کی پرت کرہ باد کی اوپری

معرفت خالد سیف اللہ، ڈبلیو۔ ایس۔ برکاکانہ، این۔ ٹی۔ ایس۔ ضلع ہزاری باغ۔ ۸۲۹۱۰۳

سطح میں ہے اس وقت تک یہ گرین ہاؤس ایفکٹ کو بہت مدد نہیں پہنچاتی ہے جیسا کہ کاربن ڈائی آکسائڈ جو کہ تہی کو ہ باد میں پھیلی ہوئی ہیں۔

یہ گرین ہاؤس ایفکٹ ہمارے لیے بہت زیادہ مفید ہیں۔ یہ OPTIMUM درجہ حرارت جو کہ زندگی کا وجود زمین پر برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کو مینٹین رکھنے میں مدد پہنچاتی ہے۔ گرین ہاؤس ایفکٹ کی غیر موجودگی میں ہماری زمین بہت ہی زیادہ ٹھنڈا سیارہ بن کر رہ جاتی ہے اور ہماری زمین پر زندگی کا وجود بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ گرین ہاؤس ایفکٹ کا استعمال ٹھنڈے علاقوں میں باغبانی میں بھی ہوا ہے۔ خاص طور پر چھوٹے مکان میں جن کی دیواریں اور چھت شیشوں کی بنی ہوئی ہے میں پودے اُگانے میں استعمال ہوا ہے۔

آج کل انسانی حرکات کی پیدا کردہ خطرناک گیسوں کے آب و ہوا میں خارج ہونے کے سبب یہ گرین ہاؤس ایفکٹ جو کہ MAINTAIN ہے۔ مثال کے طور پر جنگلات کاٹنے سے اور FOSSII FUFI کو جلانے سے بڑی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس پیدا ہوتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ سی۔ ایف۔ سی (کلورو فلورو کاربن) میتھین نائٹرس آکسائڈ وغیرہ بھی کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کی طرح زمین سے انفرا ریڈ نور افشانی کو ہوا سے خلا میں بھاگنے میں کمی کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہوا اور زمینی سطح لگاتار گرم ہوتی جا رہی ہے۔ ماحول میں اس بڑھتی ہوئی گرمی کے اس CRISIS کو اکثر ہم GLOBAL WARMING کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس گلوبل وارمنگ کی وجہ سے اوزون کی کمی سے موسم میں بدلاؤ، سمندری سطح کا اوپر اٹھنا، شمالی اور جنوبی Poles اور دیگر ٹھنڈے علاقوں کے Glacier کے تیزی سے پگھلنے سے متاثر کر رہا ہے۔ کھیتی کی پیداوار اور دیگر زندگیوں اوزون گیس کی چادر کا تیزی سے Depletion بڑی تیزی سے اوزون کی چادر میں شگاف پیدا کر دے جو کہ آخرکار خطرناک Ultra Violet کرنوں کو زمین کی ہوا اور اس کی سطح پر داخل ہونے کے لیے راستہ ہموار کر دے گا Ultra Violet لہر زمین پر رہنے والوں میں SKIN CANCER پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک گرین ہاؤس FQUILI BRIUM میں ایک IMBALANCE اور بہت ساری مشکلیں پیدا کر دے گا اور نتیجتاً یہ انسانوں اور دیگر زمین پر رہنے والوں کو دھمکا چکا ہے۔

ان ساری مشکلات نے سائنس دانوں میں الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ پھر بھی ان سب خطرات کا حل نکالنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم اپنے ذریعہ استعمال کی ہوئی چیزوں کے باعث جو خطرناک چیزیں اپنے ماحول میں انڈیل رہے ہیں اس پر قابو پایا جائے اور پیڑ پودوں کی کٹائی روک کر اب پیڑ پودے لگائے جائیں۔ اس طرح گرین ہاؤس ایفکٹ کا بہت ہی Crucial Factor ہو گیا ہے۔ ہمارے اپنے سیارے "زمین" پر زندگیوں کے وجود کے لیے۔ ●

بقیہ: جہیز اور جہیزی اموات

سبب ہیں۔ چاہے اس حادثات کو نام کچھ بھی دیا جائے۔ مسائل کی اصل وجوہات میں ازدواجی رشتہ کی پاکیزگی میں کمی، آپسی انانیت کا دخل و ٹکراؤ کے علاوہ ظاہری و مادی خواہشات بھی شامل ہیں۔ بغیر محنت کیے اور ناجائز طریقہ سے پیسہ کمانے یا جیسے تیسے طریقہ کو اپنا کر ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے کی جستجو میں خودغرضی کو بھی دخل ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کا حل بغیر ثبوت و چھان بین کے کرنا تو درکنار، مسئلہ کی اصلیت بھی تلاش نہیں کی جا سکتی۔

اصل سوال سماج کا اخلاقی اقدار کے مقابلہ مادی و معاشی اقدار کو تسلیم کرنا ہے جس کی وجہ سے سماج میں غیر شائستگی کے حالات رونما ہو رہے ہیں۔ تشدد، جنسی تشدد، جہیزی اموات میں اسی غیر شائستگی و غیر سماجی حرکات کا پیش خیمہ ہوا اتنا ہی نہیں اس غیر شائستگی کو ہم ٹی وی کے ذریعہ اپنے گھروں میں بھی داخل کر چکے ہیں۔ ایک پارٹی کا دوسری پارٹی سے جہیز سے متعلق جبر و استبداد کرنا اور دوسری پارٹی کا قانون کا غلط استعمال میں لانا، وکیلوں، پولس و دہشت پسند تنظیموں کی معرفت یا خود خودلوگوں کے ذریعہ ان دونوں پارٹیوں کے ذریعہ اپنائے گئے پہلوؤں کا انجام اکثر و بیشتر تکلیف دہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ اگر ازدواجی تعلقات کی اہمیت و خوشگواری کو بحال کر کے، خاندانی روایات کو مستحکم کرنا ہے تو مسئلہ کو حل کرنا ہوگا اور حل تلاش کرنے کے لیے حقیقت پسندی کے ساتھ حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ و تجزیہ کرنا ہوگا۔ صرف وسیع مطالعہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مرد عورت سے متعلق ایک دوسرے کی مجبوریوں، پریشانیوں کا نفسیاتی طور سے تجزیہ کرنا ہوگا۔ اس مسئلہ کے اصل تدارک سے متعلق ویسے بھی ساری دنیا کی نگاہیں ہندوستان کی طرف ٹکی ہوئی ہیں۔ صدیوں پرانے رجحانات و تاثرات کسی قانونی جھٹکے سے نہیں بدلتے، صحیح و مناسب تبدیلی کے لیے صحیح و مناسب تجزیہ اور اس سمت میں لگاتار کوشش کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ تغیر پذیر حالات میں سدھار کی راہ کیا ہو؟ کیا اختلافات اور ٹکراؤ کی طرف لے جانے والی کیفیت؟ یا کہ آپسی میل ملاپ یا بھائی چارہ کے ذریعہ گھر اور خاندان کو جوڑنے والی راہ؟ ان نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے منزل کی طرف چلنا ہوگا، تب ہی کچھ حل کی امید کی جا سکتی ہے۔ ●

بقیہ: راجستھان میں بھیڑ پالن

لگ بھگ ۱۲ لاکھ بھیڑیں ہر سال مستقل طور پر سفر میں رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے مقصد سے چراگاہ کی ترقی کے لیے عالمی بینک کی امداد سے ایک وسیع پروگرام ہاتھ میں لیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے سیکر ضلع کے فتحپور، جے پور اور چتوڑ گڑھ کے کیا بعض مرکزوں میں یہ اسکیم چلائی جا رہی ہے جس کے تحت دھامن گھاس اور بیج کی پیداوار کی جاتی ہے۔

جودھپور میں بھیڑوں میں ہونے والے مختلف امراض کی جانچ کے لیے "تحقیق امراض لیبارٹری" کام کر رہی ہے جس کے تحت ۱۲ گشتی لیبارٹریاں ۔ جے پور، کوٹہ، بیکانیر، باڑمیر، بھیل واڑہ، ناگور، کرولی، اجمیر، چورو، سورت گڑھ اور اودے پور میں کام کر رہی ہیں۔ یہ لیبارٹریاں معمول کے مطابق علاقے کے دیہاتوں میں گشت کر کے امراض کا علاج کرتی ہیں۔ ●

مرکزی بجٹ ـ سماجی انصاف کے ساتھ ترقی

مشترکہ کم سے کم پروگرام (سی ایم پی) سب کے لیے انصاف کی فراہمی کے مقصد سے سماجی شعبہ کی ترقی کے سلسلے میں حکومت کے مستحکم عزم کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس پروگرام میں سماجی شعبہ کو بنیادی شعبہ کا درجہ دیتے ہوئے ریاستی سطح پر اقتصادی وفاقیت کی بنیاد پر خدمات فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۶-۹۷ء کے اقتصادی جائزے کے مطابق، ۱۹۹۵-۹۶ء کے اقتصادی جائزہ میں جن تین کلیدی چیلنجوں یعنی مالی استحکام، بنیادی ڈھانچہ کی ترقی، روزگار کی فراہمی اور غریبی ختم کرنے کے مقاصد کی نشاندہی کی گئی تھی، انھیں کو مرکزی توجہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

سروے میں مزید کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو منڈی پر مبنی معیشت کے حاشیوں پر ہیں، کم سے کم سماجی خدمات کے سلسلے میں موثر انتظام کرنے نیز روزگار کی فراہمی اور غریبی دور کرنے کے خصوصی پروگرام بنانے کی بنیادی ضرورت ہے۔ غریبی کے خاتمے کے پروگراموں کے مفید اثرات کو زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کے لیے استحکام پیدا کرنا اور اعتدال لانا نیز کچھ تراش خراش کرنا بھی مناسب ہوگا۔ اس طرح بنیادی مقصد سماج کے غریب ترین طبقہ کو دیرپا فوائد پہنچانے کے ساتھ ساتھ انتظامی خرابی کو دور کرنا نیز ان خامیوں کا سدباب کرنا ہوگا، جن سے سب اچھی طرح واقف ہیں۔

اس عزم کا اظہار سماجی خدمات کے لیے مرکزی حکومت کے منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی تصرفات سے ہوتا ہے جن میں ۱۹۹۶-۹۷ء (بی۔ای) میں مجموعی اندرون ملک پیداوار کے ۱۹ر۱ فی صد کا ریکارڈ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ اضافہ ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۹۶ر۰ فی صد تھا۔ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو ۲۴۶۶ کروڑ روپے کی اضافی رقم کم سے کم خدمات پر خرچ کرنے کے لیے مختص کی گئی تھی۔

۱۹۹۷-۹۸ء کے مرکزی بجٹ میں سماجی شعبہ کے لیے تصرفات میں ۳۳ فی صد کا اضافہ کرکے اس عزم کو مزید آگے بڑھایا گیا ہے۔ سال رواں کے بجٹ میں ۱۵۰۷ کروڑ روپے سماجی خدمات کے لیے رکھے گئے ہیں جب کہ گزشتہ سال کے نظر ثانی شدہ تخمینہ میں یہ رقم ۱۱۸۵ کروڑ روپے تھی۔ یہ رقم دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت کے ذریعہ زیر عمل لائے جانے والے غریبی ختم کرنے اور روزگار میں اضافہ کرنے والے پروگراموں کے علاوہ ہے جس کو سال رواں میں ۱۲ر۱ کروڑ روپے کی مزید رقم دی گئی ہے۔

لازمی بنیادی ضروریات فراہم کرنے والے پروگرام کے لیے مختص کی جانے والی رقم کو رواں مالی سال میں ۲۴۶۶ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۳۴۰۰ کروڑ روپے کر دیا گیا ہے۔ اس میں گندی بستیوں کی بہتری کے لیے ۳۴۰ کروڑ روپے کی رقم شامل ہے۔

غریبی کے خلاف لڑائی

بجٹ میں نشاندہی کی گئی ہے کہ غریبی کے خلاف لڑائی بالکل نچلی سطح کی لڑائی ہے۔ غریب وہ ہیں جن کے پاس زمین یا پانی یا تعلیم یا مواقع نہیں ہیں۔ متحدہ محاذ سرکار اس بات میں ٹھوس یقین رکھتی ہے کہ غریبی کے خلاف لڑائی میں غریبی ختم کرنے کے پروگرام کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پروگراموں کے لیے بڑی رقم کی تخصیص کو برقرار رکھتے ہوئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تعداد کو معقول بنایا جائے نیز انھیں زیادہ نمایاں اور موثر بنایا جائے۔ فی الوقت منصوبہ بندی کمیشن جامع اقدامات کر رہا ہے اور غریبی ختم کرنے کے پروگراموں کے نظر ثانی شدہ پورٹ فولیو پر یکم اپریل ۱۹۹۷ء سے عمل ہوگا۔

آج جتنی بھی خود روزگار کی اسکیمیں چل رہی ہیں، مثلاً وزیر اعظم کی روزگار یوجنا (پی ایم آر وائی) اور مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) اور جن کا تعلق مختلف منتخبہ گروپوں سے ہے، ان کے ہنر پر مبنی ٹریننگ، کاروباری ترقی اور سبسڈی سے جڑے ہوئے بینکوں کے قرضوں کی فراہمی کے لیے از سر نو زور دیا جائے گا۔ مقصد یہ ہوگا کہ دس لاکھ نوجوانوں کو خود اپنا منفعت بخش کاروبار شروع کرنے کے قابل بنایا جائے۔

جواہر روزگار یوجنا (جے آر وائی) روزگار فراہم کرنے والی ایک اور اہم اسکیم ہے جس سے ۱۹۹۷ء میں لگ بھگ ۵۲۰ ملین افرادی دنوں کے مساوی روزگار کے مواقع پیدا ہونے کی امید ہے۔ ایمپلائمنٹ انشورینس اسکیم کے تحت ۱۹۷۰ کروڑ روپے کی منظوری دی گئی ہے تاکہ ملک کے تمام بلاکوں میں کم زراعتی سیزن میں

سودنوں تک کے لیے غیر ہنر والے روزگار کے خواہاں افراد کو روزگار فراہم کیا جا سکے۔

بنیادی خدمات کی توسیع

بجٹ کی کوشش بنیادی کم سے کم خدمات کے منصوبہ پر سختی سے عمل کرنے کی ہے۔ ۹۸-۱۹۹۷ء میں ۳۳۰۰روپے کے اضافے شدہ خرچ کے ساتھ اس کا مقصد پینے کا پانی، سب کے لیے صحت، پرائمری تعلیم، ہاؤسنگ، سڑکیں اور پوری آبادی کے لیے سرکاری نظام تقسیم کی ۲۰۰۰ء تک فراہمی ہے۔

اس سلسلے میں ایک قدم گاؤں میں پانی کی سپلائی کا تیز رفتار پروگرام ہے جس سے مارچ ۱۹۹۸ء تک ۹۰ ہزار بستیوں کو پینے کا صاف پانی فراہم کرنے کی توقع ہے۔ اس اسکیم کے لیے آئندہ مالی سال میں ۱۳۰۲ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی گئی ہے اس کے علاوہ ۴۴۸ کروڑ روپے لاکھوں کنوؤں کی اسکیم کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔

ایک اور پروگرام، جس کا نام کستوربا گاندھی شکشا یوجنا رکھا گیا ہے، ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء کو لڑکیوں کے لیے خصوصی اسکول قائم کرنے کے مقصد سے وزیر اعظم کے ذریعہ شروع کیا جائے گا۔ ۹۸-۱۹۹۷ء کے بجٹ میں اس اسکیم کے لیے ۲۵۰ کروڑ روپے فراہم کیے گئے ہیں۔ ۹۶۰ کروڑ روپے پرائمری تعلیم کے سلسلے میں غذائی امداد کے لیے فراہم کیے گئے ہیں اور ۳۱،۱۶۵۱ کروڑ روپے ضلعی پرائمری ایجوکیشن پروجیکٹ کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔

دیہی علاقوں میں مکانات کی قلت دور کرنے کے لیے دیہی مکانات کے سلسلے میں قرض دینے کی ایک اسکیم کا اعلان کیا گیا ہے۔ اپنی ملکیت کی زمین پر اپنا مکان بنانے یا اپنے پرانے مکان کو بہتر بنانے یا اس میں اضافہ کے لیے عام شرح سود پر دو لاکھ روپے تک کا قرض کسانوں کو دیا جائے گا بشرطیکہ مکان کی لاگت کے ایک تہائی حصہ کا انتظام قرض لینے والا کرے۔ اس اسکیم کی تیاری میں آج کل قومی ہاؤسنگ بینک مصروف ہے، جس میں دوسری تنظیمیں بھی حصہ لیں گی۔ اس اسکیم کا افتتاح بھی آئندہ یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم کریں گے اور پہلے ہی برس کے دوران ۵۰۰۰۰ قرضے دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ دیہی غریبوں کے لیے اندرا آواس یوجنا کے تحت لگ بھگ سات لاکھ مکانات کا نشانہ طے کیا گیا ہے۔

حال ہی میں ایک نئے نشانہ شدہ سرکاری نظام تقسیم پر عمل شروع ہوا ہے۔ اس نظام کا مقصد رعایتی شرحوں پر غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے لوگوں کو ضروری اناج فراہم کرنا ہے۔ اس اقدام سے لگ بھگ ۳۲ کروڑ لوگوں کے استفادہ کرنے کی توقع ہے۔ اس سلسلہ میں ۹۸-۱۹۹۷ء کے بجٹ میں اناجوں اور چینی کی سبسڈی کے لیے ۷۵۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جب کہ ۹۷-۱۹۹۶ء کے نظر ثانی شدہ تخمینوں کے مطابق اس مد میں ۶۰۶۶ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ وزیر خزانہ نے ضرورت پڑنے پر نشانہ شدہ سرکاری نظام تقسیم (ٹی ڈی پی ایس) کے تحت راشن کارڈ کے دوہرے نظام پر عمل درآمد کے لیے مزید سرمایہ فراہم کرنے کا بھی یقین دلایا ہے۔

بنیادی کم سے کم خدمات کے پروگرام اور بنیادی ڈھانچہ کی ضروریات کے لیے فنڈ کی فراہمی کے ایک نئے انداز کی کوشش کے تحت مرکز کے ۲۲،۵ فی صد فنڈ کے حصہ کو، جو کالا دھن استعمال کرنے کے لیے رضاکارانہ طور پر انکشاف کرنے کی اسکیم کے ذریعہ حاصل ہوگا، پیداواری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

سماج کے انتہائی کمزور طبقات کی امداد کے لیے بجٹ میں قومی سماجی امدادی پروگرام کے تحت ۷۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ اس فنڈ کے ذریعہ ۴۹،۵۲ لاکھ معمر لوگوں کو معمر افراد کی پنشن کی قومی اسکیم کے دائرہ میں لایا جائے گا۔ کنبے کی بہبود کی قومی اسکیم سے ۳،۱۹ لاکھ ان کنبوں کو فائدہ پہنچے گا جو روزی روٹی کمانے والے اپنے واحد ذریعے سے محروم ہو چکے ہیں۔ ماؤں کی بہبود کی قومی اسکیم کا مقصد آئندہ سال میں ۲۹،۱۵ لاکھ متوقع ماؤں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

بجٹ میں کمزور تر طبقات کی بہبود کے لیے بھی انتظام کیا گیا ہے مثلاً ۶۵ کروڑ روپے میٹرک کے بعد کے تعلیمی وظائف کے لیے رکھے گئے ہیں جس سے ۹۸-۱۹۹۷ء کے دوران لگ بھگ ۲۲،۴۵ لاکھ طالب علموں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ اس کے علاوہ ۲۲۶،۶۰ کروڑ روپے خصوصی کمپونینٹ پلان کے لیے خصوصی مرکزی امداد کی مد میں رکھے گئے ہیں جس سے ۹۸-۱۹۹۷ء کے دوران ۳۰ لاکھ شیڈولڈ کاسٹ کنبوں کو فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ مزید براں ۶۹ کروڑ روپے نیشنل شیڈولڈ کاسٹس ٹرائبس فائنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے لیے مختص کیے گئے ہیں جس سے ۹۸-۱۹۹۷ء کے دوران ۳۰ ہزار ایس سی/ایس ٹی افراد کو فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ ●

بقیہ: دیہی تعمیر نو کا عزم

ہے وہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع بنجر علاقہ ہے۔ وہاں پہلے ہی جو تالاب تعمیر کیے جا چکے ہیں وہ ایک مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ارد گرد پنائی پورم کی زراعتی سرگرمیاں چل رہی ہیں۔ طرح طرح کے درختوں کے پودے تیار کرنے کے لیے تالابوں کے علاقے کے قریب ہی ایک نرسری بنائی جا رہی ہے۔ بارش ختم ہونے کے بعد کے عرصہ میں گاؤں کے مرد تو چلے جاتے ہیں مگر عورتیں گاؤں ہی میں رہ کر کاشت کاری کے کام یا دوسرے کام کرتی ہیں مثلاً وہ بکریوں کی افزائش نسل، پولٹری، سلائی اور بانس کی ٹوکریاں وغیرہ بنانے میں مصروف رہتی ہیں۔ گاندھی گرام دیہی یونیورسٹی گاؤں والوں کو تکنیکی تعاون دیتی ہے۔

پنائی پورم کی کامیابی کی کہانی نے دیہی تعمیر نو کے شعبہ میں امید کی ایک نئی کرن پیدا کی ہے اس نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ محدود وسائل کے باوجود رضاکار تنظیمیں کتنی مفید خدمت انجام دے سکتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق، ملک میں تقریباً ایک لاکھ سے زیادہ غیر سرکاری تنظیمیں کام کر رہی ہیں، جب کہ ملک میں پنچایتوں کی تعداد تین لاکھ سے کم ہے۔ اگر ہر غیر سرکاری تنظیم ایک مقررہ مقصد کے ساتھ 'سارا' ہی کی طرح کام کرنے لگے اور ترقیاتی کام کے لیے مفید ثابت ہونے والی حکمت عملی اختیار کرے تو ملک قلیل عرصہ میں زبردست ترقی کر سکتا ہے۔ ●

دیہات کے غریبوں کی ترقی میں بینکوں کا حصہ

ہمارے ملک کی ۷۰ فی صد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے اور ۶۵ فی صد مزدور زراعت سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ہمیں اپنی کل قومی پیداوار کا ۳۲ فی صد زرعی حلقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر بھی دیہات کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی ۲۷ فی صد بے زمین ہے۔ قومی عملی (اپلائڈ) ریسرچ کونسل نے کچھ عرصہ قبل ایک مطالعہ کیا تھا۔ اس کے مطابق ملک میں زمین کی اوسط جتائی ۱ر۲ ایکڑ ہے۔

دیہات میں غریبی کی خاص وجہ روزگار کی کمی ہے۔ زراعت کے کام میں سبھی مزدوروں کو سال بھر کام نہیں ملتا۔ غیر زراعتی کاموں میں بھی یہاں روزگار کے زیادہ امکانات نہیں ہیں۔ کونسل کے مطالعہ کے مطابق زراعتی مزدوروں کو سال میں اوسطاً ۱۳۷ دن اور غیر زراعتی مزدوروں کو اوسطاً ۱۵۲ دن کام ملتا ہے۔ بیشتر ریاستوں میں مزدوروں کو حکومت سے مقررہ شرح پر مزدوری نہیں ملتی۔ سبھی ریاستوں میں مزدوروں کو یکساں مزدوری بھی نہیں دی جاتی۔ کچھ عرصے پہلے پانڈیچری میں اوسطاً یومیہ مزدوری ۱۹ر۵۰ روپے تھی جب کہ ہریانہ اور پنجاب میں بالترتیب ۳۰ء۵ اور ۳۴ روپے تھی۔

دیہی مزدور ان پڑھ اور غیر منظم ہیں۔ پھر زیادہ تر دیہاتوں میں مزدوری چاہنے والے لوگ زیادہ ہیں اور مزدوری کے مواقع کم ہیں۔ خوشحال کسان اس کا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ غریب مزدور زیادہ تر دلت طبقے کے ہیں۔ اپنی خستہ حالی کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے جدوجہد نہیں کر پاتے۔ زیادہ تر ریاستوں کے دیہی حلقوں میں کم سے کم مزدوری قانون کو نافذ کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ اس بارے میں ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ تنخواہ اور روزگار وغیرہ میں مرد اور عورت کے درمیان کسی بھی قسم کے امتیاز کی ممانعت کے باوجود عورتوں کو مردوں کے برابر مزدوری نہیں ملتی۔ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو کم مزدوری دی جاتی ہے۔ حکومت اس امتیاز کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دیہاتوں کی غریبی کی ایک بڑی وجہ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں غیر منقسم ہندوستان (سندھ، شمالی سرحدی صوبہ، بلوچستان، مغربی پنجاب اور بنگلہ دیش سمیت) ہندوستان کی آبادی تقریباً ۲۸ کروڑ تھی۔ جب کہ یکم مارچ ۱۹۹۱ء کو تنہا ہندوستان کی آبادی ۸۴،۶۳،۰۰۰۰۰ تھی۔ آج ہماری آبادی ۹۰ کروڑ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

ہندوستان دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے کنبہ بندی یا آبادی کنٹرول پروگرام کو قومی سطح پر اپنایا۔ اس سے اضافہ آبادی کی شرح پر قابو پایا گیا۔ سیمپل رجسٹریشن سسٹم کے مطابق ۱۹۷۱ء میں شرح پیدائش ۵ر۲ تھی۔ جو ۱۹۹۳ء میں گھٹ کر ۳ر۲ رہ گئی۔ اسی طرح خام شرح پیدائش جو ۱۹۷۱ء میں ۴۱ر۲ فی ہزار تھی ۱۹۹۴ء میں گھٹ کر ۲۸ر۶ فی ہزار رہ گئی۔ اسی مدت میں یہ شرح اموات جو ۱۹ فی ہزار تھی۔ گھٹ کر ۹ر۲ فی ہزار رہ گئی۔ ملک کی آبادی میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ شرح اموات شرح پیدائش سے کافی کم ہے۔ آبادی میں ناقابل یقین اضافہ ہونے کے باوجود ہم نے زرعی پیداوار کے حلقہ میں قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔ زمین کی فی ہیکٹیر پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کا استعمال کر کے اور زراعت کے نئے طریقے اپنا کر ہم نے اپنی غذائی پیداوار کافی بڑھا لی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جہاں ہماری غذائی پیداوار ۴ کروڑ ٹن کے آس پاس تھی اب وہ قریب قریب ۱۹ کروڑ ٹن ہے۔ خوراکی اناجوں کے علاوہ دالوں، تلہن اور نقدی فصلوں کی پیداوار بھی کافی بڑھی ہے۔ پچاس کے عشرے میں فی نفر ۳۹۵ گرام یومیہ خوراکی اناج دستیاب تھا۔ جب کہ اب فی نفر ۴۸۱ر۶ گرام یومیہ خوراکی اناج دستیاب ہے۔

ہماری سب سے بڑی کامیابی ملک میں وقتاً فوقتاً پڑنے والے قحط کو ختم کرنا ہے۔ آزادی کے بعد نازک غذائی صورت حال کے باوجود ملک کے کسی گوشے میں قحط سے اموات نہیں ہوئیں۔ جب کہ آزادی سے تین چار سال پہلے بنگال کے قحط میں تقریباً ۳ لاکھ آدمی موت کی گود میں چلے گئے تھے۔ پھر بھی یہ سچ ہے کہ ابھی تک سبھی لوگوں کو بھرپور غذائیت کی خوراک نہیں ملتی۔ کچھ حلقوں میں تو اس کی کمی بڑے پیمانے پر ہے۔

روزگار کے زیادہ مواقع

دیہی غریبی کا مسئلہ صرف روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔

آشارانی ووہرا

حقیقت کا صحیح جائزہ ضروری،

جہیز اور جہیزی اموات

"آنٹی" میں تو شادی ہی نہیں کروں گی ۔ گھر والوں کے دباؤ سے اگر کرنی ہی پڑی تو یہ ضرور دیکھوں گی کہ لڑکا اکیلا رہتا ہو، ساس سسر وغیرہ کا کوئی چکر نہ ہو!

کیوں ؟

ارے آنٹی، آپ تو بڑی بھولی ہیں۔ دیکھتی نہیں اچھا خاصا جہیز لانے والی بہوؤں کو بھی جب جلا دیا جاتا ہے تو ہم جیسی غریب لڑکیوں کا کیا ہوگا، نہ بابا نہ! مجھے تو شادی کے نام سے ہی ڈر لگتا ہے۔"

آج کل یہ تاثرات صرف اس ایک لڑکی کے ہی نہیں بلکہ جہیز کے نام پر جو دہشت پھیل رہی یا پھیلائی جا رہی ہے، اس سے لگ بھگ سبھی بیاہ لائق لڑکیوں کے دل و دماغ پر ایسے ہی تاثرات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر سسرال جانے والی نئی نویلی دلہنوں کے نئے خاندان کے ساتھ تعلقات استوار رکھنے یا کسی بھی حالت کا صحیح ڈھنگ سے مقابلہ کرنے کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔

بچپن سے ہی پرائے گھر جانے کی روایات کے مطابق نوجوان لڑکیوں کے دل میں سسرال کا ہوّا یوں بھی کم نہیں بٹھایا جاتا: "ساس بری" "نند چغل خور" "جیٹھانی طعنہ دینے والی" وغیرہ وغیرہ جیسی باتوں کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا باتیں ہمارے لوک گیتوں اور شادی بیاہ کے نغموں میں شامل ہیں۔ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب چھوٹی عمر کی لڑکیاں بیاہ دی جاتیں اور انہیں گھر کے رسم و رواج سکھانے کی ذمہ داری ساس کے ذمہ ہوتی یا پھر ایسے خاندان میں جہاں ساس، بہو کا رشتہ ماں بیٹی جیسا ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کا مطمح نظر جانتا ہوتا، وہاں اچھا خاصا بنھاؤ ہو جاتا۔ اس بنھاؤ کے جذبے میں دونوں خاندانوں کے آپسی میل ملاپ کے جذبات بھی کارفرما ہوتے۔ خاندان کی آبرو و عزت کی خاطر غلطیوں پر پردہ ڈال دیا جاتا۔ کبھی بزرگوں کی دخل اندازی، کبھی برادری کی مداخلت سے بگڑے ہوئے حالات میں بھی سدھار آ جاتا۔ کچھ خاندانی تہذیب سے تو کچھ لڑکیوں کی خود انحصاری کی کمی کے باعث تو کبھی ایک طرف کچھ جھک کر سمجھوتہ کرنے کا جذبہ ہوتا تو دوسری طرف رہبری و سرپرستی کا جذبہ کام کرتا۔ اس لیے خاندان کم منتشر ہوتے اور مشترکہ خاندان میں بچے بھی جذباتی رشتوں کے تحت پلتے پھولتے اور اپنے خاندانی اوصاف و خصوصیات کے حامل ہوتے۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حالات تو بدلے لیکن کیا نئے زمانے کی تیز رفتار کے ساتھ انسانی شعور میں بھی اس رفتار سے بیداری آئی؟ فوری طور پر تو قانون بھی اس ذہنیت کو بدلنے میں مجبور رہے۔ تعلیم کے باوجود بھی شعور میں تبدیلی بھی رفتہ رفتہ ہوتی ہے جب کہ زمانے کی رفتار کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ زمانے کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے سبب انسان میں نئے نئے تغیرات و تفکرات پیدا ہوتے ہیں جس کے باعث اس میں ذہنی ٹکراؤ و انتشار کے جذبات جنم لیتے ہیں۔

آج کے دور میں چاروں طرف انہیں باتوں کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ نئے قانون بھی چونکہ حالات و زمانہ کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں، جو کہ انسانی رجحانات و شعور کو بدلنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتے، اس سے پہلے کہ قانون نافذ العمل ہو، اس کے نفاذ میں اڑچنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور قانون کا استعمال غلط طریقہ سے ہونے لگتا ہے۔

جہیز۔ جہیز۔ جہیز۔ ہر روز اخبار کا مطالعہ کرنے پر قتل و خودکشی کی خبروں کے درمیان ایک نہ ایک خبر۔ جہیز کی وجہ سے کسی بہو کے جل کر مرنے یا جلائے جانے کی ضرور مل جائے گی۔ یہ خبریں پہلے کی طرح اب نہ کسی قسم کی سنسنی پھیلاتی ہیں اور نہ رونگٹے کھڑے کرتی ہیں بلکہ قاری اس کو محض خبر کے طور پر پڑھتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان خبروں سے دہشت ضرور پھیل رہی ہے جیسا کہ مذکورہ سوالات کرنے والی لڑکی کے دل میں بسی ہوئی دہشت۔

یہی اندرونی ہوّا، ان نئی نویلی دلہنوں کو "نبھانے" کے نام پر ایثار پسند، مجبور اور دبّو بناتا ہے تو کہیں ردعمل کے طور پر مطلبی۔ ظالم اور حملہ ور۔ پہلی قسم کی دہشت کی حامل بہوویں، مائیکے کے اچھے پس منظر اور مکمل شخصیت کی حامل ہونے کے باوجود سسرال میں "ڈولی آنے سے موت تک کا سفر طے کرنے" کی روایت کو برقرار رکھنے کے باعث اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا وقت پر مقابلہ تک نہیں کر پاتیں اور نتیجتاً وہ مجبوری کے عالم میں یا تو خودکشی کر لیتی

ہیں یا ظلم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم کی نئی ابھری ذہنیت والی معینہ طور پر باغی لیکن بے سمت آزادیٔ نسواں کی حامی لڑکیاں سسرال میں قدم رکھتے ہی اپنے نجی مفاد کے مدنظر اچھے بھلے گھر کا چین سکون ختم کر دیتی ہیں حتیٰ کہ ایک جھٹکے میں خاندان کے سارے اختیارات اپنے قبضے میں کرنے کے لیے نفرت و لڑائی جھگڑے کے بیج بونے لگتی ہیں اتنا ہی نہیں اس کے کارناموں سے تو ایک بار ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ لڑکی اپنے پچھلے بزرگوں کا بدلہ چکانے آئی ہو۔

ان واقعات کی وجوہات چاہے حقوق حاصل کرنا ہوں یا پھر آپسی انانیت کا ٹکراؤ، مغربی اثر ہو کر گاؤں کا شہروں میں تبدیل ہونا۔ بہر نوع یہ ایک حقیقت ہے کہ لگ بھگ پچھلی دو دہائیوں سے جہیز سے متعلق حادثات تیزی سے رونما ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ سماج میں ہونے والی خودکشی کو جہیز سے منسوب کر دیا جاتا ہے چاہے اس کے پس پردہ کوئی بھی راز مضمر ہوں مثلاً لڑکی کی عمر کے زیادتی ہونا یا کہ والدین کو جہیز دینے کی مجبوری؛ مہنگائی کے اضافہ کے باعث جہیز لینے والے لالچی لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے — بے چاری پھول سی بہو کو ظالموں نے جلا دیا یا پھر بہو کو جلانے کے جرم میں فلاں شوہر یا فلانے ساس گرفتار وغیرہ وغیرہ۔

ایسا نہیں کہ مہنگائی کے بڑھنے کے ساتھ جہیز لینے کی مانگ میں اضافہ نہ ہوا ہو۔ سماجی و اخلاقی قدروں کے مقابلہ مادری قدروں کو اہمیت دینے کے باعث معاشی و جنسی جرائم میں بھی اضافہ ہوا۔ خاندان و ذات برادری کی بندشوں کو توڑنے کے نتیجہ میں ان رشتوں میں بھی اسی نسبت سے ذاتی و سماجی اعتبار سے عدم استحکام کو بڑھاوا ملا۔ یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ جب جب سماج میں عدم استحکام کو فروغ حاصل ہوا تب تب انسان اپنے کو اکیلا محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے سبب سماج میں خودکشی کی وارداتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں خودکشی کے واقعات کی شرحیں بڑھتی ہیں۔ ان اثرات سے ہمارا ملک بھی مبرا نہیں رہ پایا لہٰذا یہاں بھی آئے دن خودکشی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود اس سماجی سروے کے نتائج کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ ہندوستان میں ۵۵ فی صد خودکشی مرد اور ۴۵ فی صد عورتیں کرتی ہیں۔ سابقہ سالوں میں یہ شرح عورتوں کے مقابلہ مردوں میں زیادہ پائی گئی۔ باہری زندگی میں تناؤ اور انتشار کے واقعات میں اضافہ اور عورتوں کی باہری زندگی میں زیادہ حصہ لینے کی وجہ سے مرد و عورت دونوں میں خودکشی کے واقعات کی شرح میں پہلے کی نسبت کمی واقع ہوئی ہے۔ تجزیہ سے معلوم ہوا کہ عشق میں ناکامی، عزتِ نفس و مردانگی کے وقار کے مجروح ہونے نیز حالات کی محرومی سے مقابلہ نہ کر پانے کی حالت میں انسان خودکشی کرتا ہے، عورتوں کی خودکشی کی وجوہات میں مرد کا جذباتی ہونا اور سسرال کے تعلقات میں تناؤ ہونا شامل ہوتا ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ ایک عورت مرد کے مقابلہ قرب و جوار و آپسی رشتوں میں استوارگی و استحکام پیدا کرنے نیز حالات سے مقابلہ آرائی کرنے کی صلاحیت و طاقت زیادہ رکھتی ہے تو پھر کبھی کسی نے یہ سوچا کہ آج عورت اپنی ازدواجی رشتوں کو بہ آسانی کیوں نہیں نبھا پا رہی اور ایسے ہر واقعے کو جہیز سے کیوں جوڑا جا رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسا سیاسی لوگوں نے اپنے ووٹ کی خاطر طبقاتی، سماجی و لسانی مسائل میں عوام کو الجھا رکھا ہے۔ اس طرح دیکھنا ہوگا کہ کہیں صلاح مشورہ اور تحفظ کے نام پر اور قانونی انصاف دلانے کے اپنے اعداد و شمار پورے کرنے کے لیے سیاست سے تحریک پانے والی تنظیموں اور پیسے لے کر کسی دیگر مسئلے کو جہیز کا مسئلہ بنا دینے والے وکیلوں کے ذریعے تو اس سوال کو نہیں الجھایا جا رہا ہے؟

جس مسئلے کو اپنا مقصد حل کرنے کے لیے سنسنی خیز صحافت اپنے ڈھنگ سے لگی ہو اور جس کی زد میں نہ صرف بے قصور شوہر اور ساس عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہونے پر مجبور ہو رہے ہوں اور دوسری طرف خود دوشیزاؤں کے عزت، جان و مال کو خطرہ لاحق ہو گیا ہو تو اس مسئلے کو نہ تو یوں ہلکے پن سے دیکھنا چاہیے نہ اس مسئلہ کو سرسری طریقہ سے حل کیا جانا چاہیے۔

میرے پاس اس موضوع پر کیے گئے تجربات سے متعلق کافی تعداد میں حالات و واقعات کے نتائج موجود ہیں لیکن یہاں صفحات کی کمی کے باعث گوشوارہ پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال میں یہاں اس مسئلہ سے متعلق ماہرین سماجیات کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں کہ وہ حالات حاضرہ کا سائنٹیفک طریقے سے جائزہ لیں اور سماج میں پنپنے والی یا پھیلائے جانے والے غلط فہمیوں کا تدارک کریں۔ میری رہبرانِ قوم۔ سوشل ورکر، مہیلا آیوگ اور خواتین تنظیموں کے ممبران سے اپیل ہے کہ وہ باقاعدہ سروے کر کے ایسے حادثات کے رونما ہونے والے حالات و اسباب کا پتا لگائیں اور تجزیہ کریں کہ کیا حقیقت میں جہیز کی وجہ سے ہونے والی اموات کے پس پردہ جہیز کا مسئلہ ہی اصل موضوع بحث ہوتا ہے یا کہ دیگر وجوہات، اگر ہاں تو پھر دیگر وجوہات کو جہیز کے مسائل سے کیوں ملایا جا رہا ہے؟

میرے تجزیات بتاتے ہیں کہ کچھ فی صد جہیز کے معاملے کو چھوڑ کر، دیگر معاملات کے در پردہ کچھ اور کہانیاں ہوتی ہیں مثلاً کہیں شادی سے قبل اور شادی کے بعد ناجائز تعلقات کا ہونا کہیں ان سے متعلق جھوٹی سچی کہانیوں کے سبب ایک دوسرے پر شک کرنا، کہیں شوہر کی حقیقی یا غیر حقیقی (غیر حقیقی یعنی نفسیاتی وجہ) نامرد ہونا تو کہیں آپسی پیار۔ محبت اور ہمدردی کے جذبات کی بجائے ایک دوسرے کی انا کا سوال۔ اس کے علاوہ عورت کی مرد سے زیادہ کمائی۔ تعلیم، قابلیت وغیرہ وغیرہ نے بھی شوہر کے صدیوں پرانے رتبہ کو ٹھیس پہنچائی، جس سے مرد میں احساس کمتری کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے جس کے نتیجہ میں مرد ذہنی ایذا رسانی محسوس کر رہا ہے اور اس میں جذبہ انتقام ابھر رہا ہے۔ آج کل سماج کنبوں کے بٹوارہ، طلاق، علاحدگی، خاندان میں انتشار، قتل و خودکشی کے پیچھے جو خرابیاں کارفرما ہیں وہی خرابیاں تقریباً ان جہیزی اموات کا بھی

باقی صلا پر

انل چودھری

راجستھان میں بھیڑ پالن

بھیڑ پالن راجستھان کے دیہاتیوں کے لیے روزگار کا خاص ذریعہ ہے۔ مغربی اور شمالی مغربی راجستھان کے ریگستانی علاقوں میں رہنے والے دیہاتیوں کے لیے بھیڑ پالن روزی پیدا کرنے کا خاص ذریعہ ہے۔

راجستھان کی زمین اور آب و ہوا بھیڑ پالن کے موافق ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے مختلف علاقوں میں مختلف النوع نسل، شکل اور صفت رکھنے والی بھیڑیں ملتی ہیں۔ ریاست میں بھیڑوں کی مختلف ذیلی ذاتوں میں مارواڑی، نالی، مگرہ، پوگل، چوکلا، مال پڑا، جیسل میری اور سوناڈی خاص ہیں۔ ان میں "چوکلا" نسل کی بھیڑ سب سے اعلا مانی جاتی ہے۔ اون کی اعلا قسم ہونے کے سبب اسے "ہندوستانی میرینو" بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۹۲ء کی مویشی شماری کے مطابق راجستھان میں ۱۲۴۹۱۰۰۰ بھیڑیں ہیں۔ ان بھیڑوں سے پیداشدہ تقریباً ۱½ کروڑ کلو گرام اون کی فروخت سے تقریباً ۲۰ کروڑ روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست سے ہر سال ۳۰ لاکھ بھیڑوں کے گوشت کی فروخت سے ۹۰ کروڑ روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ ریاست کے لگ بھگ دو لاکھ خاندان بھیڑ پالن سے اپنا روزگار چلا رہے ہیں۔

بھیڑ پالنے والوں کو تربیت دینے کے لیے ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً تربیتی کیمپوں کا انعقاد کرتی ہے۔ تربیت کا خاص مقصد بھیڑ پالنے والوں کو جدید ترین معلومات فراہم کرانا اور مقامی مسئلوں کا علم حاصل کرکے ان کے حل کے لیے ضروری کوششیں کرنا ہے۔ اس تربیت کے تحت ماہر مضامین کے ذریعہ بھیڑوں کی تندرستی کی حفاظت، ان کے اون کی پیداوار، بھیڑوں کے بچے دینے اور ان کی چراگاہوں کی ترقی کے لیے بہ خوبی جانکاری دی جاتی ہے۔

راجستھان میں اون اور گوشت کی پیداوار میں اضافہ کے لیے عالمی بینک کی مدد سے ۱۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک اسکیم چلائی جا رہی ہے۔ اس سے ریاست کے تقریباً ۱۰ لاکھ بھیڑ پالنے والوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس اسکیم کے تحت ریاست کے ۹ ضلعوں، جے پور، شری گنگانگر، ڈونگرپور، چتوڑگڑھ، بھیل واڑہ، بانس واڑہ، جھنجھنو، چورو اور اودے پور میں دوغلی نسل تیار کرنے کا ٹھوس پروگرام چلایا جا رہا ہے۔ ریاست کے فتحپور (سیکر)، جے پور اور چتوڑگڑھ میں چلائے جانے والے بھیڑ گیابھن مرکزوں پر گیابھن کرنے کے لیے بدیسی نسل کی بھیڑیں اور مینڈھے خرید کر پالے جا رہے ہیں۔ سال ۱۹۹۵-۹۶ء میں ریاست کے مختلف بھیڑ گیابھن فارموں پر کل ۱۰۳۲ میمنوں کا جنم کرایا گیا۔ ان میں سے ۱۶۹ بدیسی نسل اور ۷۵۰ دوغلی نسل کے مینڈھے بھیڑ پالنے والوں کو تقسیم کیے گئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پوری ریاست کی تمام بھیڑوں سے حاصل شدہ مختلف قسم کی اون میں ۵ فی صد باریک، ۶۰ فی صد درمیانی اور ۳۵ فی صد موٹی قسم کی ہوتی ہے۔ باریک قسم کی اون کی پیداوار کم مقدار میں ہونے کے سبب سے اس کی کمی کو باہر سے درآمد کرکے پورا کیا جاتا ہے۔ بھیڑوں کی نسل اور اون کی قسم بہتر بنانے اور زیادہ پیداوار کے لیے تبدیلی نسل کی ضرورت کے پیش نظر بھیڑ گیابھن فارموں پر بدیسی نسل کے مینڈھوں سے دیسی نسل کی بھیڑوں میں دوغلے گیابھن کا کام کیا جا رہا ہے۔ نتیجے کے طور پر ۲۵ فی صد بدیسی نسل کے دوغلے میمنے پیدا کیے جا رہے ہیں، جن سے باریک قسم کی اون زیادہ مقدار میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ حالیہ ایام میں دوغلی نسل تیار کرنے کا پروگرام ریاست کے ۱۲ ضلعوں میں۔ جے پور، اجمیر، اودے پور، بھیل واڑہ، ٹونک، چتوڑگڑھ، ڈونگرپور، بانس واڑہ، چورو، جھنجھنو، سیکر اور شری گنگانگر میں چلایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ انتخابی گیابھن پروگرام کے تحت مغربی راجستھان کے باڑمیر، پالی، جالور، جیسلمیر اور جودھپور ضلعوں کے ان بھیڑ پالنے والوں کا رجسٹریشن کیا جا رہا ہے جن کے پاس ۵۰ سے ۱۰۰ بھیڑیں ہیں۔ ان ضلعوں میں تجربے کے طور پر چلائی جانے والی تحریک کے ماتحت رجسٹرشدہ بھیڑ پالنے والوں کو حکومت کے ذریعہ مارواڑی، جیسلمیری یا مگرہ نسل کے اچھے اور زیادہ اون دینے والے مینڈھے تقسیم کیے جا رہے ہیں۔

موجودہ دنوں میں ریاست کے بھیڑ پالنے والوں کے سامنے چراگاہ کا مسئلہ ہے۔ ریاست میں بھیڑوں کی تعداد کے لحاظ سے چراگاہ کے ذرائع ناکافی ہیں۔ قحط کی حالت میں بھیڑ پالنے والوں کو اپنی بھیڑوں کے ساتھ پڑوسی ریاستوں میں - - - - جانا پڑتا ہے۔ ریاست کی

باقی صفحہ پر

فردوس عنبر پاپتی

انسانی دماغ کی تشکیل

انسانی دماغ نے "دماغ" کے موضوع پر خوب سر کھپایا ہے پھر بھی یہ ہمارے لیے راز بنا ہوا ہے۔ پردیپ سبھاچاریہ کے مطابق نئی تکنیک کے ذریعہ اب سائنس دانوں نے اس راز پر سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔

کبھی کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی ماں باپ کے دو بیٹوں میں سے ایک نیک فرماں بردار تو دوسرا تشدد پسند اور مجرمانہ ذہنیت والا بن جاتا ہے۔ ہم میں سے کسی کو موسیقی پیاری لگتی ہے تو کسی کا رجحان تجارت کی طرف ہوتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آئین اسٹائن، آئین اسٹائن بنا اور ہٹلر ہٹلر۔ کوئی بچہ بچپن میں تیز اور ذہین ہونے کے باوجود جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے زندگی کے ہر امتحان میں خود کو ناکام پاتا ہے۔ ہمارے مزاج اور برتاؤ سے جڑے ہوئے ایسے ڈھیر سارے سوالوں کا جواب کائنات کی اس پیچیدہ ترین شئے کی اندرونی دنیا میں چھپا ہوا ہے جسے ہم انسانی دماغ کہتے ہیں۔ پچھلے کچھ سالوں کے دوران پی آئی ٹی اسکین، ایم آر آئی جیسی جدید ترین میڈیکل میپنگ تکنیکوں میں ہوئی ترقی نیز جینی سائنس کے میدان میں ہونے والی دریافتوں کی بنیاد پر سائنس دانوں نے اب ذہن کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانا شروع کر دیا ہے۔ ذہنی سائنس کے میدان میں ہو رہی یہ دریافتیں اتنی اہم ہیں اور آنے والے دنوں میں اس سمت میں ایسے حیران کن نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے کہ سائنس داں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ بیسویں صدی کے آخری دہے کو "ذہنی دہائی" کا نام دیا جائے۔

ان دریافتوں کی بنیاد پر سائنس داں ذہن کی بڑھوار اور کام کاج کی صلاحیت کے بارے میں ایک نئی رائے قائم کر رہے ہیں۔ اب وہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ کسی شخص کے دماغ کی بنیادی تشکیل ارتقا کے مطابق ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے ساتھ اسے آخری شکل دینے میں باہری اثرات نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کے شروع کے دنوں سے ہی یہ اثرات اسے متاثر کرنے لگتے ہیں اس کے علاوہ نئی دریافتیں بتاتی ہیں کہ ہماری زندگی میں کئی ایسے سنگین دور آتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو ہماری ذہنی صلاحیت اور ذہن کی نشوونما کے لیے نہایت اہم ہوتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ دماغ "نیورون" نامی ایک خاص قسم کے سیلوں سے مل کر بنتا ہے جو کہ پیغام رسانی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حمل ٹھہرنے کے فوراً بعد ہی ایسے کچھ سیل ایمبریو کے اوپری حصے پر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں اور دو تین ماہ کے اندر ہی ان کی تعداد بڑھ کر ۲۰ کھرب تک پہنچ جاتی ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کے ۳۰ ہفتے گزرتے گزرتے ان میں سے لگ بھگ آدھے نیورون ختم ہو جاتے ہیں۔

اس دوران حمل کی ذہنی نشوونما میں باہری اثرات ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر حاملہ عورت ذہنی پریشانی کا شکار ہے یا کمزور ہے کسی نشے کی عادی ہے تو اس کا سیدھا اثر بچے کی صحت اور نشوونما پر پڑتا ہے۔ نتیجتاً زیادہ سے زیادہ ذہنی سیل کوئی کام نہ مل پانے کی وجہ سے مرنے لگتے ہیں۔ اس طرح حمل کے دوران ذہنی بڑھوار کے مناسب ماحول یا اثرات نہ ملنے سے بچے کا صرف بچپن ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اسے ایسا نقصان پہنچتا ہے جس کی تلافی باقی زندگی میں نہیں ہو پاتی کیوں کہ نوزائدہ بچہ جو لگ بھگ دس کھرب نیورون لے کر ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے وہی اس کے دماغ کی عمر بھر کی پونجی ہوتی ہے۔ پیدائش کے بعد کبھی بھی نئے نیورون نہیں بنتے اس کا مطلب یہ نہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد نئے سیل نہ بننے کی وجہ سے اس کی ذہنی بڑھوار رک جاتی ہے۔ درحقیقت اب دماغ نیورون کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ نیورون کے مابین سائی نیپس کے ذریعہ تعلق قائم کر کے اپنی سوچنے سمجھنے، دیکھنے، سننے، سیکھنے، تجزیہ کرنے، یاد رکھنے اور کنٹرول کرنے کی صلاحیتوں میں اضافہ کرتا ہے۔

نیوران ایک خاص قسم کا پیغام رساں سیل ہے جس کے دونوں سروں پر دھاگے جیسی بناوٹیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک ایکشون ایک سیل سے دوسرے تک خبر پہنچانے کا کام کرتا ہے تو دوسرا ڈینڈرائیٹ، خبر وصول کرتا ہے۔ ترقی پذیر اور فعال ذہن کی نشانی یہ ہے کہ اس

باقی صفحہ ۲۲ پر

کلامی محلہ، نزد مسجد، اورنگ آباد، بہار-۸۲۴۱۰۱

نثار احمد صدیقی

کوڑھ کی روک تھام

دنیا میں کوڑھ کے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ مریضوں میں سے ہر تیسرا مریض ہندوستان میں ہے۔ کوڑھ انسان کی سب سے خطرناک بیماری ہے جو صدیوں سے امیر کیا غریب کیا لاکھوں افراد کو اپنا شکار بناتی رہی ہے۔

"جب میں اس بیماری سے پوری طرح شفایاب ہو گئی تو بھی میرے شوہر نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا" یہ الفاظ بھیک مانگنے والی ایک عورت کے ہیں، جو ممبئی سے کوئی ۴۷ کلو میٹر دور حاجی ملنگ درگاہ پر بھیک مانگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوڑھ کے مریض کو سب لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے پرائے حتّٰی کہ قریب ترین رشتہ دار بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اسے تنہا اپنی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

عام لوگوں کے خیال کے برعکس کوڑھ کوئی لعنت نہیں ہے۔ نہ ہی یہ باپ دادا کے گناہوں کے نتیجہ میں جو ان کے بچوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ مرض ایک جرثومہ سے پیدا ہوتا ہے، جس کی دریافت جرہارڈ ہیرک آرمیئور ہینسن نے ۱۸۷۳ء میں ناروے میں کی تھی۔

کوڑھ جسے جذام بھی کہتے ہیں ایک خطرناک مرض ہے۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم لیپرومیٹس (LEPROMATOUS) کہلاتی ہے اس کا انفیکشن جلد ہوتا ہے اور اس میں مریض کی جراثیم سے لڑنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے نیز اس کے اعضائے جسمانی کی شکل، ساخت اور فعل میں خلل واقع ہوتا ہے۔ جسم میں کوڑھ کے جراثیم پھیل جاتے ہیں۔ دوسری قسم ٹیوبرکیولائڈ لیپروسی کہلاتی ہے۔ اس میں کھال ایک یا دو جگہوں پر بدرنگ ہو جاتی ہے اور اسے چھونے یا دبانے سے مریض کو کسی طرح کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ کوڑھ کی یہ قسم کم انفیکشن والی ہوتی ہے۔ ان دو قسموں کے علاوہ درمیان کی قسمیں بھی ہیں جن میں مذکورہ بالا دونوں قسموں کی کچھ باتیں پائی جاتی ہیں۔ باقاعدہ علاج نہ کرنے پر مریض کے اعضاء بدشکل اور بدنما ہو جاتے ہیں اور سماج ان کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے۔

کوڑھ کے علاج کے لیے دوائیں دستیاب ہیں۔ لیکن پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ ۱۸ویں صدی میں ایڈورڈ جینر نے اس بیماری سے بچاؤ کا ٹیکہ نکالنے کی بات سوچی لیکن جب کہ سائنس دانوں نے متعدد دوسری بیماریوں کے تحفظی ٹیکے تیار کرنے میں کافی پیش رفت کی، وہ کوڑھ سے بچاؤ کا ٹیکہ نہیں نکال سکے کیوں کہ اگرچہ کوڑھ کی بیماری بیکٹیریا سے پیدا ہوتی ہے اس کے جراثیم کی انسانی جسم سے باہر افزائش نہیں کی جا سکی۔ تقریباً ۲۴ سال پہلے اس بات کا پتا لگایا گیا کہ امریکی براعظم کے ایک جانور میں یہ بیماری پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس جانور کے جسم کے اندر پروردہ بیکٹیریا سے تیار کیے گئے ٹیکے کی جنوبی امریکہ کے شہر وینیزویلا میں آزمائش کی جا رہی ہے۔

ادھر ہندوستان میں ممبئی کے کینسر انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ ڈائرکٹر ایم۔ جی۔ دلو نے ایک نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے کوڑھ کے جراثیم کی برادری کے ایک جرثومہ کا استعمال کرتے ہوئے کوڑھ سے بچاؤ کا ٹیکہ تیار کیا۔ یہ جرثومہ ابتدا انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائرکٹر اور ان کے ساتھی ڈاکٹر کھنڈیلکر نے نہ صرف اس جرثومہ کی افزائش کی بلکہ یہ بھی دکھایا کہ یہ کوڑھ کے جرثومہ سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ اس مشاہدے اور اس سے قبل مذکورہ انسٹی ٹیوٹ میں کیے گئے کچھ اور مشاہدات کی روشنی میں ڈاکٹر دلو نے ۱۹۷۹ء میں آئی۔ سی۔ آر۔ سی سے یہ ٹیکہ تیار کیا۔

آئی۔ سی۔ آر۔ سی بیکٹیریا کو کوڑھ والے ٹشوز سے الگ کیا جاتا ہے اور پھر لیباریٹری میں ان کی کلچر کے طریقے سے افزائش کی جاتی ہے۔ لیباریٹری میں ان بیکٹیریا (جراثیم) کی بیماری پیدا کرنے کی اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کوڑھ کے بیکٹیریا کی طرح سے پھر جمع کر لیے جاتے ہیں خاص کر ان خصوصیات کے اعتبار سے جو ٹیکہ لگانے کے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ان بیکٹیریاؤں کی افزائش نہ ہو اور وہ جسم کو ضرر نہ پہنچائیں انھیں بھابھا ایٹامک انرجی سینٹر، ممبئی میں زوردار شعاع زنی سے مار دیا جاتا ہے۔ شعاع زنی کے بعد مرے ہوئے بیکٹیریا انفیکشن پیدا کرنے کی اہلیت کھو دیتے ہیں لیکن بچاؤ کی قوت برقرار رہتی ہے۔ یہ بنیادی اصول ہے جس کی بنا پر آئی۔ سی۔ آر۔ سی کوڑھ روک ٹیکہ تیار کیا گیا ہے۔

لیباریٹری کی متعدد جانچوں کے ذریعے ٹیکوں کے ہر بیچ کوالٹی پر سخت کنٹرول رکھا جاتا ہے۔ یہ جانچ لیباریٹری میں مختلف ٹیسٹوں سے بار بار رکھے

باقی صـ۶ـ پر

کلامی محلہ نزد مسجد۔ اورنگ آباد۔ ۸۲۴۱۰۱۔ بہار

ڈاکٹر زین رامش

پریم چند اور تصنیفات پریم چند

(ایک تعارفی خاکہ)

اردو اور ہندی فکشن کو یکساں طور پر اعتماد اور اعتبار عطا کرنے والے ناول نگار و افسانہ نگار منشی پریم چند کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ کسی بھی فنکار کو سمجھنے اور اس کے فن کے مختلف پہلوؤں کی بہ حسن و خوبی ترسیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شخصیت کا بھی مطالعہ کیا جائے اور شخصی احوال و کوائف سے بھی پوری واقفیت رکھی جائے۔ اس سلسلے میں خصوصاً پریم چند جیسے فنکار کی شخصیت کو سمجھنا اور ان کے سوانحی خاکہ پر ایک نظر ڈالنا اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایک معمولی گاؤں کے معمولی خاندان میں آنکھیں کھولیں اور اپنی شخصیت کو خود ہی سجا سنوار کر اس قابل بنا یا کہ کسی ایک نہیں بلکہ بیک وقت دو زبانوں کے آسمان ادب پر نیر تاباں بن کر چمکے۔

جیسا کہ ادب کے طالب علم جانتے ہیں منشی پریم چند کا پورا نام دھنپت رائے تھا۔ وہ ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو بنارس ضلع کے پانڈے پور کے قریب ملہی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا۔ ان کے دادا پٹوار گر سہائے لال ملہی گاؤں کے ایک معمولی کسان تھے۔ ان کی والدہ کا نام آنند دیوی تھا جو پریم چند کو کم عمری میں ہی داغ مفارقت دے گئیں۔ اس وقت پریم چند کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ پریم چند کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو ان کے والد منشی عجائب لال بھی اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔

پریم چند نے ابتدائی تعلیم کے طور پر گاؤں میں مولوی صاحب سے اردو اور فارسی پڑھی بعد میں ان کا داخلہ ایک انگریزی اسکول میں ہوا اس وقت ان کی عمر آٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ ۱۸۹۸ء میں انھوں نے بنارس کا لجیٹ اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اعلا تعلیم کے حصول کی خواہش کے باوجود باضابطہ طور پر سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے کی اجازت فکر معاش نے نہیں دی۔ نتیجتاً ایک پرائمری اسکول میں استاد کی حیثیت اختیار کی، لیکن حصول تعلیم کا جذبہ زندہ رہا جس نے ان کی معاونت کی اور دوران ملازمت یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۱۶ء میں ایف۔ اے کرنے کے بعد بی۔ اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔

پریم چند کا ادبی سفر ۱۹۰۵ء کے آس پاس سے شروع ہوا اور ابتدائی آٹھ برسوں تک ان کی تخلیقات نواب رائے کے نام سے شائع ہوتی رہیں۔ نواب رائے ان کے بچپن کا نام تھا اور گھر والے انھیں پیار سے نواب رائے ہی کہا کرتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں جب ان کے ۵ افسانوں پر مشتمل پہلے افسانے مجموعے کی اشاعت ہوئی اور اس میں شامل افسانے قابل اعتراض ہونے کے سبب اس افسانوی مجموعے "سوز وطن" کی کاپیاں ضبط ہو گئیں اور لکھنے پر پابندی لگ گئی تو انھوں نے اپنا نیا قلمی نام پریم چند منتخب کیا۔ بہ حیثیت پریم چند انھیں ۱۹۰۹ء کے بعد سے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۸۹۸ء میں انٹرنس کر لینے کے فوراً بعد ہی پریم چند نے ملازمت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پہلے وہ نیم سرکاری اسکول میں آئے اور پھر ایک سال بعد ہی سرکاری ملازمت حاصل کر لی۔ سرکاری ملازمت کے سبب تبادلوں کا بھی سلسلہ رہا اور وہ اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں گھومتے رہے۔ باوجودیکہ تقریباً ۲۱ برسوں تک اس ملازمت سے ان کی وابستگی رہی لیکن وہ اسے پوری طرح قبول نہیں کر سکے۔ بالآخر ۱۶ فروری ۱۹۲۱ء کو انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ سرکاری ملازمت سے استعفا دینے کے بعد وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے کیوں کہ انھوں نے استعفا ہی گاندھی جی کی تقریر سے متاثر ہو کر دیا تھا۔

پریم چند کی ازدواجی زندگی ان کے لیے ایک بڑا المیہ ثابت ہوئی جس نے انھیں بڑی حد تک متاثر کیا۔ ان کی شادی ان کے والد منشی عجائب لال کی زندگی میں ہی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی۔ ان کی بیوی ایک عمر دراز اور انتہائی بد مزاج خاتون تھیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ پریم چند کو کبھی ازدواجی سکون حاصل نہیں ہونے دیا بلکہ ان کے لیے ذہنی

"ارم کدہ" فخر الدین ہاؤس شکر ٹولی، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

انتشار کا سبب بھی بنیں۔ اس طرح بچپن اور کم عمری میں کرائی گئی یہ شادی پریم چند کو کسی بھی طرح راس نہیں آئی اور پریم چند نے کسی طرح ان سے کنارہ کشی حاصل کر لی۔ اس واقعہ کا ان کے ذہن پر بہت منفی اثر پڑا جس کے نتیجے میں انھوں نے طویل عرصہ تک تنہائی کی زندگی گزاری اور تقریباً ۱۵ سال بعد ایک خاتون شیورانی دیوی سے ہمدردی کی بنیاد پر ۱۹۱۶ء میں شادی کر لی۔

۱۹۲۱ء میں ملازمت سے استعفا دینے کے بعد پریم چند کی مالی حالت جو پہلے ہی سے کچھ اچھی نہ تھی مزید خراب ہو گئی جس کے پیش نظر ان کے حلقۂ احباب اور پرائیویٹ اداروں نے ان کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی، اس طرح مختلف وقتوں میں انھوں نے مختلف عارضی ملازمتیں کیں۔ سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں ہی کانپور کے مارواڑی اسکول سے ہی بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر وابستہ ہوئے لیکن وہ وابستگی بہت ہی مختصر مدت تک قائم رہی لہٰذا اسی سال کاشی ودیا پیٹھ میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں درسی کتابوں کی تصنیف کا کام گنگا پستک مالا لکھنؤ کے لیے شروع کیا۔ اسی دوران نول کشور پریس کے رسالہ "مادھوری" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک وابستہ رہے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں فلم انڈسٹری کی طرف متوجہ ہوئے۔ بمبئی میں اسکرپٹ رائٹر کا کام شروع کیا لیکن ناکام رہے اور ۱۹۳۷ء میں واپس چلے آئے۔

اس دوران ۱۹۲۳ء میں پریم چند نے کانپور میں ایک پریس قائم کیا جس کا نام سرسوتی پریس تھا۔ اس پریس کے قیام کے ایک سال بعد ہی اسے اپنے سوتیلے بھائیوں کے حوالے کر کے جو اس کے حصہ دار بھی تھے پریم چند لکھنؤ چلے گئے تھے لیکن بعد میں جب فلم انڈسٹری نے انھیں ناکام واپس کر دیا اور الٰہ آباد میں قیام پذیر ہوئے تو پریس بھی کانپور سے الٰہ آباد منتقل ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء میں نول کشور پریس کے رسالہ "مادھوری" کے فرائض سے سبکدوش ہونے پر پریم چند نے اپنی ادارت میں ایک ادبی ہندی رسالہ "ہنس" نکالا۔ جس کا پہلا شمارہ مارچ ۱۹۳۰ء میں منظر عام پر آیا۔ "ہنس" کا ہر شمارہ افسانوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اس رسالے کے دو خاص شماروں پر پابندیاں عائد ہوئیں اور پریم چند کو جرمانے کے طور پر رقم ادا کرنی پڑی کیوں کہ اس کا اداریہ پوری طرح سیاسی ہوا کرتا تھا۔ پریم چند نے اس رسالے کی زندگی کی بقا کے لیے اپنی بیش بہا قربانیاں دیں اور مالی ناآسودگی کے باوجود اسے اپنے زندگی تک جاری رکھا۔ اس کا آخری شمارہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

"ہنس" کے اجرا کے چند ہی مہینوں بعد یعنی اسی سال اگست ۱۹۳۰ء میں ہی پریم چند کی ادارت میں "جاگرن" نام کا ایک ہندی ہفتہ وار بھی شائع ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۲ اگست ۱۹۳۰ء کو منظر عام پر آیا۔ اس جریدے کو ونود شنکر پرساد نے بطور پندرہ روزہ شروع کیا تھا لیکن جب اس سے ہونے والا نقصان وہ برداشت نہیں کر پائے اور بند کرنے کا فیصلہ کیا تو پریم چند نے اسے خرید لیا اور پندرہ روزہ کی جگہ ہفتہ وار بنا کر شائع کرنے لگے۔ پریم چند معاشی بحران کا شکار بھی تھے اور مذکورہ رسالہ اور ہفتہ وار سے کسی قسم کی مالی منفعت کا حصول بھی ممکن نہیں تھا پھر بھی انھوں نے "ہنس" اور "جاگرن" کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انھیں مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا اور جسمانی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی۔ کڑی محنت و مشقت اور بے تحاشہ ذمہ داریوں نے ان کی صحت پر اثر ڈالا۔ ۱۹۳۶ء میں شکم کے مرض میں مبتلاً ہو کر باضابطہ بستر پکڑ لیا اور تقریباً چار ماہ کی سخت اذیتوں کے بعد ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پریم چند کی زندگی کے جو حالات سامنے آتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں پوری طرح آسودگی کا منہ کبھی نہیں دیکھا اور مختلف صورتِ حال کے پیش نظر ذہنی انتشار اور فکرمندی کا شکار رہے لیکن اس کے باوجود یہ ان کی شخصیت کا کمال تھا کہ انھوں نے بڑے پیمانے پر تخلیقی کارنامے انجام دیے زبردست شہرت و مقبولیت حاصل کی اور اس دنیا میں صرف ۵۶ سال کی مختصر مدت گزارنے کے باوجود بڑا تخلیقی سرمایہ بھی چھوڑا اور اسی کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی کارنامہ بھی۔

(ایک اندازے کے مطابق انھوں نے ۲۰ سال کی عمر سے ہی یعنی ۱۹۰۰ء کے آس پاس سے لکھنا شروع کر دیا تھا گویا کل ملا کر تقریباً ۳۵ سال تک انھوں نے تخلیق و تصنیف کا کام کیا جس میں ابتدائی وہ تین سال بھی شامل ہیں جو عام طور پر ان کی ادبی زندگی کے حصے کے طور پر زیر تذکرہ نہیں آتے ہیں۔ اسی دوران انھوں نے اردو میں تقریباً سات اور ہندی میں ۱۳ عدد کتابیں لکھیں، جن میں ناول اور افسانوی مجموعے دونوں شامل ہیں۔)

پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز اردو زبان میں تحریر تخلیقات سے ہوتا ہے۔ اردو پریم چند کے گھر کی زبان تھی اور ان کے آبا و اجداد اردو ہی لکھتے پڑھتے اور بولتے تھے۔ لہٰذا ان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی اور انھوں نے لال گنج کے مولوی صاحب کے زیرِ نگرانی اردو اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ ابتدائی سلسلۂ تعلیم شروع کیا۔ یہی نہیں بلکہ ادب کے مطالعے کے طور پر انھوں نے جو کچھ پڑھا وہ سارا کچھ بھی اردو ادب سے ہی متعلق تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق ۱۳ سال کی عمر میں انھوں نے اردو کی اہم داستانوں اور قصوں کو پڑھ ڈالا تھا۔ اردو سے اپنی محبت اور وابستگی کے تعلق سے وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ "کایستھ ہونے اور بچپن سے فارسی کی مشق کرنے کی وجہ سے اردو میرے لیے جتنی فطری ہے ہندی نہیں" اور شاید اسی لیے وہ اپنی مادری زبان کی حیثیت بھی اردو ہی کو دیتے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے باضابطہ طور پر ہندی میں ہی لکھنا شروع کیا بلکہ پوری طرح اختیار بھی کیا اور ان کی تقریباً ساری ادبی سرگرمیاں بھی ہندی پر ہی مرکوز رہ گئیں لہٰذا ۱۹۱۶ء سے انھوں نے جو ہندی میں لکھنا شروع کیا تو آخری عمر تک ہندی ہی میں لکھتے رہے۔ اس دوران صرف ایک مرتبہ اپنے ہندی ناول "سیوا سدن" کو مکمل کرنے کے بعد جو ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر

آیا، فراق گورکھپوری کے کہنے پر انھوں نے اردو میں گوشۂ عافیت لکھنا شروع کیا، جو ۱۹۲۰ء میں مکمل ہوا لیکن اس کا ہندی ایڈیشن "پریم آشرم" پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔ ہندی میں لکھنے کا سلسلہ تب شروع ہوا جب ۱۹۱۶ء میں دوران ملازمت تبادلے کے نتیجے میں پریم چند گورکھپور گئے۔ وہاں ان کی ملاقات مہابیر پرساد پودار سے ہوئی جنھوں نے باضابطہ طور پر ہندی میں ہی براہ راست تخلیقات و تصنیفات کا پریم چند پر زور اور دباؤ دیا۔ اس طرح پہلے تو پریم چند نے اپنی اردو کہانیوں کو ہندی میں منتقل کرنا شروع کیا پھر باضابطہ طور پر براہ راست ہندی میں ہی لکھنے لگے۔

ویسے گورکھپور آنے سے کچھ دنوں قبل سے ہی اردو کی جانب ان کا رجحان کم ہونے لگا تھا اور وہ اس انداز سے سوچنے لگے تھے کہ اردو زبان کو زیادہ دنوں تک اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا ان کی ایک تحریر سے ان کے ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے کہ "اردو کی آج کل ہوا بگڑی ہوئی ہے، اخبار نویسی مشکل ہو گئی ہے، جتنے موجودہ رسالے ہیں کتے کی زندگی جیتے ہیں۔" پھر دوسری جگہ ایک تحریر بھی ملتی ہے کہ "اب ہندی لکھنے کی مشق کر رہا ہوں، اردو میں اب گزارہ نہیں معلوم ہوتا۔ بال مکند مرحوم کی طرح میں بھی ہندی میں ہی زندگی صرف کر دوں گا۔"

پریم چند جب اردو میں لکھتے تھے تب ان تخلیقات کا ہندی میں ترجمہ دوسروں سے کراتے تھے، لیکن جب ہندی میں براہ راست لکھنا شروع کیا تو اس کا اردو ترجمہ خود ہی کیا۔ ویسے زبان کے سلسلے میں یعنی ہندی اور اردو کے تعلق سے پریم چند گاندھی جی کے اس خیال سے متفق تھے کہ اردو ہندی کے اختلاط سے پیدا ہونے والی مشترکہ زبان ہندوستانی کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے تھی کہ

"اگر ہمارے مدرسوں میں ہر طالب علم کے لیے اردو ہندی دونوں ہی زبانوں کا پڑھنا لکھنا دسویں جماعت تک لازمی کر دیا جائے تو ہمارے خیال میں کچھ دنوں بعد تعلیم یافتہ سماج دونوں ہی رسم الخط سے واقف ہو جائے گا اور جو رسم الخط زیادہ پاکیزہ اور آسان جان پڑے گا اس کا استعمال کرے گا۔"

پریم چند کی نگارشات کا مطالعہ کسی حد تک یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ خود منشی پریم چند نے اپنے ان خیالات کو عملی طور پر برتا بھی۔

پریم چند کی وہ سات کتابیں جو براہ راست اردو میں لکھی گئیں ان میں چار ناول "اسرار معابد" "ہم خرما ہم ثواب" "کشنا" اور "جلوہ ایثار" اور تین افسانوی مجموعے "سوز وطن" "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" شامل ہیں۔ ان کا ناول "اسرار معابد" ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک "آواز خلق" کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔ ان کا ناول "کشنا" معجونایاب تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا سال تکمیل ۱۹۰۷ء ہے اور "جلوۂ ایثار" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا ہندی ترجمہ ۱۹۱۲ء میں "وردان" کے عنوان سے طبع ہوا۔ اس ناول کو اس حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ "جلوۂ ایثار" نے ہی پہلی مرتبہ پریم چند کی فنکارانہ عظمت اور ان کی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا۔ افسانوی مجموعوں میں "سوز وطن" پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اس مجموعے میں ان کے پانچ افسانے شامل ہیں جن میں ایک "انمول موتی" ہے۔ اس افسانے کے سبب مجموعے کی اشاعت پر بڑا تنازعہ کھڑا ہوا اور اس کی تمام کاپیاں ضبط ہو گئیں۔ "سوز وطن" کے بعد پریم چند کا افسانوی مجموعہ "پریم پچیسی" دو حصوں میں شائع ہوا اس میں "سوز وطن" کے کئی افسانوں سمیت کل ۲۵ افسانے شامل ہیں۔ "پریم بتیسی" بھی پریم چند کے افسانوں کا ہی مجموعہ ہے۔

"سپت سروج" پریم چند کے افسانوں کا ہندی میں شائع ہونے والا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کے اردو افسانوں کے دو مجموعوں "پریم پچیسی اور پریم بتیسی" کے کچھ افسانوں کا ہندی ترجمہ شامل ہے۔ لیکن ہندی کے افسانوی ادب میں اس افسانوی مجموعے کی اہمیت اس لیے مسلم ہے کہ اس میں ان کے کچھ انتہائی اہم افسانے مثلاً "بڑے گھر کی بیٹی" "پنچ پرمیشور" اور "نمک کا داروغہ" وغیرہ شامل ہیں۔

پریم چند کی ہندی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "نو ندھی" ہے۔ یہ بھی ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ جس میں چند تاریخی نوعیت کے افسانے بھی شامل ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں ہی پریم چند کی ہندی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ "پریم پورنیما" بھی شائع ہوا۔ اس مجموعے میں پریم چند کا ایک بہت ہی اہم اور قابل ذکر افسانہ "ایشور نیائے ہے" شامل ہے۔

پریم چند کا ناول "سیوا سدن" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول معاشرے کی مختلف برائیوں پر لکھا جانے والا اہم ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس کا اردو ایڈیشن کافی دیر بعد ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ "سیوا سدن" مکمل ہونے کے بعد انھوں نے ملک کو درپیش مسئلے کے پیش نظر انقلابی تیور کی ترجمانی کرنے والا ایک طویل ناول لکھنا شروع کیا جو اردو میں "گوشۂ عافیت" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ناول اس سے قبل ہندی میں "پریم آشرم" کے نام سے منظر عام پر آ چکا تھا۔ "رنگ بھومی" بھی پریم چند کا ایک اہم ناول ہے جو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء کے دوران لکھا گیا۔ ہندی میں یہ "رنگ بھومی" اور اردو میں "چوگان ہستی" کے نام سے شائع ہوا۔ "کایا کلپ" دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ہندی ناول ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ہی پریم چند کی ہندی کہانیوں کا ایک مجموعہ "پریم پرمود" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کو ماہنامہ "چاند" نے شائع کیا۔ ماہنامہ "چاند" سے پریم چند کی گہری وابستگی تھی۔ "چاند" کے خصوصی کہانی نمبر کی ادارت کے فرائض بھی پریم چند نے انجام دیے تھے۔ ان کا ناول "نرملا" نومبر ۱۹۲۵ء سے نومبر ۱۹۲۶ء تک قسط وار چاند کے شماروں میں شائع ہوا، اس کی باضابطہ اشاعت بعد میں ہوئی۔ پریم چند کا ناول "پرتگیا" بھی قسط وار ماہنامہ "چاند"

باقی صفحہ ۲۴ پر

ڈاکٹر سلمان عباسی

اردو پر مغرب کے اثرات

اردو پر مغرب کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں سب سے پہلے کلکتہ میں برٹش امپائر کے قائم کردہ ادارے "فورٹ ولیم کالج" کی خدمات پر توجہ دینی ہوگی۔ ہر چند کہ یہ ادارہ اردو پر مغرب کے اثرات نہیں بلکہ مغرب پر اردو کے اثرات کی سمت میں پہلا اور کامیاب قدم ہے۔ لیکن یہ تقابل ضدین بھی دراصل ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ۱۸۰۱ء میں جان گلکرسٹ کی سربراہی میں قائم ہونے والا فورٹ ولیم کالج دراصل انگریز افسروں کے لیے اردو زبان شناسی اور ادب شناسی کا ایک وسیلہ تھا۔ لیکن اس کی سرگرمیوں اور کارکردگیوں کی بدولت اردو اور انگریزی زبانوں کے اختلاط سے جو خوشگوار ماحول تیار ہوا، حتمی طور پر اس سے دونوں زبانوں کے درمیان وسعت ہمہ گیری اور خیرسگالی کے جذبوں کا جنم ہوا۔ پھر یہ جذبے کالج کی چہار دیواری میں پروان چڑھ کر رفتہ رفتہ ہندوستان میں پھیل گئے۔ تحسین کی "نوطرز مرصع" اور میر امن کے "باغ و بہار" نے گا ہے گا ہے انگریزی تہذیب کی جھلکیاں پیش کیں لیکن وہ باقاعدہ سوچی سمجھی اور منظم کوشش نہیں تھیں۔ انشاء اللہ خاں انشا کے ذوق اور آتش وغیرہ نے اپنے کلام میں بعض انگریزی الفاظ کو جگہ دے کر اپنی وسیع النظری کا ثبوت ضرور دیا لیکن اس عمل میں بھی تحریک کا شائبہ نظر نہیں آتا۔

مشہور ناقد شمس الرحمن فاروقی کا خیال ہے کہ زمانہ میر تک اردو پر مغرب کے براہ راست اثرات کا کوئی بین ثبوت نہیں ملتا البتہ غالب نے یہ چراغ روشن کیا اور ان کے متاخرین مثلاً حالی، آزاد اور اقبال وغیرہ نے اسی چراغ سے اپنے چراغ جلائے اور ان کی لو میں اضافہ کیا۔

حالی کی نیچرل شاعری کا تصور دراصل اردو پر مغرب کے اثرات کا حرف اول ہے۔ ۱۸۷۴ء میں آزاد نے غیر منقسم پنجاب کے شہر لاہور میں "انجمن پنجاب" قائم کر کے نظم معریٰ کے موضوعاتی مشاعرے باقاعدگی سے منعقد کیے ان کی اس کوشش کو "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کے مفہوم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انجمن پنجاب کے سلسلے میں سرسید نے ایک خط بھیج کر آزاد کے اس اقدام کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے اس کے ذریعہ اردو نظم کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔ اقبال کے سفر مغرب نے اردو ادب کے دامن پر انگریزی زبان، ادب اور فلسفے کے پھولوں کی گلکاری کر کے اس کی وسعت اور ہمہ گیری میں غیر معمولی اضافے کیے۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں نے میتھیو آرنلڈ، گوئٹے اور نطشے کو اردو ادیبوں اور فلسفیوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ ان انفرادی کوششوں پر بہ حیثیت مجموعی سرسید احمد خاں کی "پرو۔ انگلش" علی گڑھ تحریک کی چھاپ نظر آتی ہے جو انگریزی تعلیم، تہذیب اور ثقافت کو ہندوستانی تعلیم، تہذیب اور ثقافت کے قریب لانے کی منظم اور کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کی جڑیں جلد ہی ہندوستانی معاشرے میں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہی پودا مسلم اینگلو عربک اورینٹل کالج (M.A.O. COLLEGE) کی شکل میں نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسا تناور درخت بن کر دنیائے علم و ادب کو اپنے حلیم اور روح پرور سائے کی نعمتوں سے آج بھی نواز رہا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے عناصر خمسہ، سرسید، حالی، شبلی، آزاد اور نذیر احمد نے ایک طرف تو ہندوستانی معاشرے کو فکر و عمل کی نئی نئی راہیں عطا کیں۔ دوسری جانب عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق اور محمد علی جوہر جیسی شخصیات بھی اسی تحریک کی دین ہیں، جنھوں نے انگریزی علوم و فلسفے کو اردو سے متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا اور یہی وہ زمانہ ہے جب اردو شعر و ادب پر مغربی اثرات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ میرے اس مقالے کے موضوع "اردو پر مغرب کے اثرات" کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ جب مغربی نظریات و اقدار کی شمولیت کے باعث مشرقی طرز فکر عالمی اور آفاقی افق پر ایک درخشندہ اور تابناک سورج کی طرح چمکنے لگا۔ حالی، آزاد، اور اقبال کے نقش قدم پر اردو کے ادیب اور شاعر عالمی نظریات پر مبنی تحریروں اور تخلیقات سے جیسے جیسے بہرہ ور ہوتے گئے، ان کے معاشرہ انتقادا اور شعری شعور میں بھی نمایاں تبدیلیاں

۳/۴-E-۳ پیپر مل کالونی لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۶

نظر آنے لگیں۔ فکر و آگہی کے انداز بدلے، شعور میں بالیدگی اور پختگی آئی، موضوعات کی وسعت اور ہمہ گیری میں اضافہ ہوا۔ غرضیکہ مشرقی رجحانات، نظریات اور شعر و ادب میں ایک انقلابی کیفیت پیدا ہو گئی۔

انھیں حالات میں ترقی پسند تحریک کا لاوا پھوٹ پڑا۔ ہر چند کہ یہ تحریک کارل مارکس اور ولادیمیر لینن کے عقائد و نظریات پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کے بیشتر محرک اور روح رواں مغرب کے تعلیم یافتہ اور مغربی انداز فکر کے کٹر حامی تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ کمیونزم پر مشتمل اس تحریک کا خاکہ لندن میں بیٹھ کر تیار کیا گیا، تشکیل بھی وہیں ہوئی لیکن تنظیم ہندوستان میں ہوئی۔

سجاد ظہیر، صاحب زادہ محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر عبد العلیم سبھی یورپ کے تعلیم یافتہ، مغربی تنقید کے پیرو اور ترقی پسند رجحانات کے علم بردار تھے۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں سے خالص مشرقی ذہنیت رکھنے والے ادیب و شاعر بھی مغربی رجحانات کی لذتوں سے نہ صرف بہرہ یاب ہوئے بلکہ براہ راست متاثر بھی ہوئے۔ حالاں کہ ترقی پسند تحریک سے ہندوستان کی تمام علاقائی زبانیں مثلاً ہندی، بنگالی، پنجابی اور مراٹھی وغیرہ حتی المقدور متاثر ہوئیں لیکن اردو پر اس کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ نتیجتاً اس تحریک کے تاثر سے جتنا ادب اردو میں تخلیق ہوا۔ دیگر ہندوستانی زبانوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہ ہو سکا۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی اغراض و مقاصد کی روشنی میں اولاً نقادوں نے "مغرب دوستی" کا شعار اختیار کیا پھر ان کی تحریروں سے شعرا تک یہ سلسلہ دراز ہوا فیض، مخدوم، اختر الایمان، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر کے نام اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے اثر سے اس دور میں نظم کا عروج اور غزل کا زوال ہوا۔ اس عمل اور رد عمل میں بھی مغربی تاثر کی کارفرمائی شامل تھی۔ حالاں کہ ترقی پسند تحریک کمزور پڑنے کے بعد غزل کو دوبارہ پہلے سے زیادہ اعتبار واستناد حاصل ہوا جو ہمیشہ سے اس کا خاصہ رہا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی ساتھ عصری تقاضوں کے اظہار کا حامی غیر ترقی پسند ادیبوں کا ایک گروہ میراجی، ن۔ م۔ راشد اور قیوم نظر وغیرہ کی قیادت میں "حلقہ ارباب ذوق" کے نام سے منظم ہوا جو فرائڈ کے نظریات کا قائل تھا اور اس کے ہر فرد کا کل فنی اثاثہ مغربی افکار فکر پر مشتمل تھا۔ حلقے کو "مغرب زدہ" قرار دے کر طرح طرح کے الزامات کی بوچھار ہوئی لیکن ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد تجدیدیت کا دور آیا تو راشد اور میراجی کی پھر تجدید ہوئی۔ میراجی تو مر چکے تھے اس لیے راشد کی ادبی اہمیت اور قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ گویا کہ اردو ادب کے قلعے پر مغربی اثرات کا پرچم پھر لہرانے لگا۔

اس صدی کے نصف آخر کا استقبال جدیدیت کے علم برداروں نے بڑی گرم جوشی سے کیا۔ جدیدیت کی یہ تحریک جو امریکہ نواز ادیبوں پر مشتمل تھی وجودی فلسفے اور سارتر کے نظریات پر منحصر تھی۔ اس زمانے میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا اثر بھی بے حد بڑھ گیا تھا۔ پہلے اردو ناقدوں نے ایلیٹ کو گلے سے لگایا۔ پھر ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر شعرا نے تخلیقی فن پاروں کو جنم دیا۔ غرضیکہ اردو ادب میں ایک ایسی مغربی لہر آئی کہ سارے ادیب و شاعر اسی میں ڈوب کر رہ گئے۔

اس صدی کے پورے ادب پر اگر مغربی اثرات کا تجزیہ کیا جائے تو تین اہم مغربی نظریے ۔ ۔ ۔ ۔ (۱) مارکسی فلسفہ (۲) فرائیڈین فلسفہ اور (۳) وجودی فلسفہ ۔ ۔ ۔ اردو شعر و ادب کی رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ غیر ملکی نظریات کے اپنے ادب میں جذب وانگیز کا یہ ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے جس کی مثال شاید دنیا کے کسی اور ادب میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

نظریاتی تحریکوں سے قطع نظر اردو شاعری میں مغربی ساخت اور ہیئت کے بھی بے شمار تجربے کیے گئے۔ اس سلسلے میں اختر شیرانی اور سلام مچھلی شہری کی کاوشوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ورڈس ورتھ اور شیلی کی پیروی میں اختر شیرانی نے مروجہ روایتی رومانی شاعری کی روش سے الگ ہٹ کر اردو میں سانیٹ کی داغ بیل ڈالی جو ان کی جگر کاوی اور پتہ ماری کا بین ثبوت ہے۔ سلام مچھلی شہری نے اپنی تمام عمر ہیئتی تجربوں کی نذر کر دی۔ ان دونوں کی اس کبیدہ کاوش میں مغربی تاثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی انگریزی، پولش، ڈینش، جرمن، فرانسیسی اور دوسری زبانوں کے شعر و ادب سے متاثر ہو کر اردو کے لیے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں جن کی تفصیل کے لیے ایک وسیع کینوس درکار ہے اس لیے فی الوقت اجمالی جائزے ہی پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔ ●

بقیہ: دیہات کے غریبوں کی ترقی میں بینکوں کا حصہ

نابارڈ

خاص طور پر زراعت کی ترقی میں چھوٹی صنعتوں دیہی چھوٹی صنعتوں، دستکاریوں اور دیگر متعلقہ مالی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ نابارڈ کی شیئر پونجی ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۵ سو کروڑ روپے اور ۹۷-۱۹۹۶ء میں ایک ہزار کروڑ روپے کر دی گئی۔ اگلے ۵ سال کے دوران اسے بڑھا کر ۲ ہزار کروڑ کرنے کی تجویز ہے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء کے بجٹ کے مطابق نابارڈ میں دیہی علاقوں میں بنیادی سہولتوں کے فروغ کے لیے ایک فنڈ (آر۔ آئی۔ ڈی۔ الیف) قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ سے ریاستی حکومتوں اور ان کے خود مختار کارپوریشنوں کو دیہاتی عوام پر مبنی تعمیر و تخلیق سے متعلق اسکیموں کو تیزی سے پورا کرنے کے لیے قرض دیا جاتا ہے۔ اس فنڈ سے ۹۷-۱۹۹۶ء درج فہرست کامرس بینکوں کو تقریباً دو ہزار کروڑ روپے دیے گئے۔ ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران دو ہزار ۵ سو کروڑ روپے دینے کا بندوبست ہے۔ کاروباری یا اعلا تکنالوجی والی زراعت اور اس سے متعلق سرگرمیوں میں رقم لگانے کی حوصلہ افزائی کے لیے سبھی ریاستوں میں ترقی زراعت کے مالی ادارے قائم کرنے کی تجویز ہے۔ یہ ادارے زراعت میں جدید ترین تکنالوجی کو داخل کرنے کے لیے مالی مدد دینے کے ساتھ ساتھ اعلا قسم کی تکنالوجی بھی مہیا کرائیں گے۔

وزیر خزانہ نے ۹۷-۱۹۹۶ء کے بجٹ میں نئے نجی مقامی بینکوں کو قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ان بینکوں کا حلقۂ اختیار دو یا تین ضلعوں پر مشتمل ہوگا۔ یہ بینک دیہی بچت کو اکٹھا کرنے کے ساتھ اپنے حلقے میں اس کی منصوبہ بندی بھی کریں گے۔ ریزرو بینک نے سرکاری حلقے کے بینکوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ خاص زرعی قرضہ اسکیمیں تیار کریں۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس اسکیم کے تحت ۱۰۱۲۱ کروڑ روپے تقسیم کیے گئے جب کہ اس کا نشانہ ۱۲۱۲۱ کروڑ روپے کا تھا۔ ●

بھارت کے نوجوانوں کے نام

نسیم بے چین دھلوی

جوانو کام یہ جیون میں تم کو کر دکھانا ہے
نیا اک شانتی کا یگ تمہیں بھارت میں لانا ہے

وطن سے لعنتِ فرقہ پرستی کو مٹانا ہے
سبق ہر اک کو الفت اور محبت کا پڑھانا ہے
وطن کا مان دنیا کی نگاہوں میں بڑھانا ہے
تمہیں بھارت سے ہنسا، انیائے کو مٹانا ہے

جوانو کام یہ جیون میں تم کو کر دکھانا ہے
نیا اک شانتی کا یگ تمہیں بھارت میں لانا ہے

مٹانے کے لیے ہنسا تمہیں تیار رہنا ہے
پریم اور پیار کا ہر دل میں تم کو بیج بونا ہے
سمجھ لو یہ کہ پیالے میں سمندر کو سمونا ہے
نہ شکتی کو تمہیں اپنی کبھی بیکار کھونا ہے

جوانو کام یہ جیون میں تم کو کر دکھانا ہے
نیا اک شانتی کا یگ تمہیں بھارت میں لانا ہے۔

نیائے، امن، اہنسا کا تمہیں پرچار کرنا ہے
کمر کس کر اب اس میدان میں تم کو اترنا ہے
تمہیں بھارت کے نقشہ میں نیا اک رنگ بھرنا ہے
جو راہِ کامیابی ہے اسی رہ سے گزرنا ہے

جوانو کام یہ جیون میں تم کو کر دکھانا ہے
نیا اک شانتی کا یگ تمہیں بھارت میں لانا ہے

اے۔۸۰۔۳۰ سیکٹر۵۔ ڈاکٹر امبیڈکر نگر، نئی دہلی۔ ۶۲

غــــــــزلیں

سید افتخار عابد شفق

کچھ عجب دل پہ وحشت رہی ہے
رات کروٹ بدلتے گئی ہے

صرف پکڑے رہے ہم قلم کو
آنسوؤں نے عبارت لکھی ہے

سارے دروازے گھر کے کھلے تھے
یوں تری راہ دیکھی گئی ہے

شمع جلتی بھی آخر کہاں تک
عمر لمبی بہت رات کی ہے

پی گیا غم کو پانی سمجھ کر
یہ شفق بھی عجب آدمی ہے

۲۲۴۔ سہسوانی ٹولہ، بریلی۔ یو۔ پی

س۔ ش۔ عالم

دل سے بھی کچھ قریب کے پہلو میں رہنا سیکھ
رکھا ہے آپ آپ میں کیا تو میں رہنا سیکھ

گفتار کی صلیب پر چڑھتا ہے کس لیے
سنجیدہ طبع لوگ ہیں قابو میں رہنا سیکھ

آلودگی کا زہر تجھے چاٹ جائے گا
ہر لمحہ انبساط کی خوشبو میں رہنا سیکھ

تیری تلاش تیری تمنا ہو رات دن
تو بھی کسی غریب کے آنسو میں رہنا سیکھ

مٹی کے اک چراغ پہ ہے شب کا انحصار
سورج میں رہنا سیکھ نہ جگنو میں رہنا سیکھ

"الرجال" ۴۴۳/۳۲ زیارت خور ماد رامپور۔ ۲۴۴۹۰۱

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

ہندوستان کاپر لمیٹڈ میں ریکارڈ پیداوار

سرکاری سیکٹر کے ادارے ہندوستان کاپر لمیٹڈ میں ۱۹۹۶-۹۷ء کے مالی برس کے دوران تانبے کے تاروں کی ریکارڈ پیداوار ۴۱۳۸۹ ٹن رہی جو پچھلے برس اس عرصہ کی پیداوار کے مقابلے ۱۱ فی صد زیادہ ہے۔ مالی سال ۱۹۹۶-۹۷ء کے دوران اس ادارے میں ۶۱۰ کلو سونا ۷۰۹۶ کلو چاندی کی پیداوار ہوئی۔

ان دونوں دھاتوں کی پیداوار پچھلے برس کے مقابلے بالترتیب ۲۷ فی صد اور ۹ فی صد زیادہ رہی۔ بہار کے سنگھ بھوم ضلع میں آئی۔ سی۔ سی میں کمپنی کے دھاتیں صاف کرنے کے پلانٹ میں ۱۹۳۸۸ ٹن بلسٹر تانبہ اور ۱۷۷۲۵ ٹن صاف تانبہ تیار کیا گیا جو پچھلے برس کے مقابلے میں ۱۱ فی صد زیادہ ہے۔ ●

کدرے مکھ آئرن اور کمپنی لمیٹڈ اور حکومت کے درمیان مفاہمت کے میمورنڈم پر دستخط

کدرے مکھ آئرن اور کمپنی لمیٹڈ (کے۔ آئی۔ او۔ سی۔ ایل) نے فولاد کی وزارت کے ساتھ ۱۹۹۷-۹۸ء کے مالی سال کے لیے مفاہمت کے ایک میمورنڈم پر دستخط کیے ہیں۔ میمورنڈم کی رو سے ۳/۱۶ ایم۔ ٹی کنسنٹریٹ اور ۲/۱۷ ایم ٹی پیلیٹس تیار کی جائیں گی نیز ۳/۱۶ ایم ٹی کنسنٹریٹ اور ۲/۱۶ ایم ٹی پیلیٹس کی برآمدات عمل میں آئے گی۔

۴۰ کروڑ روپے کے ٹیکس کی ادائیگی کے بعد خالص منافع کے ساتھ ۵۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ کا کاروبار ہونے کی امید ہے۔ ●

غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری کی ۸۳ تجاویز کو منظوری

تقریباً ۱۳۶۵/۵ کروڑ روپے پر مشتمل غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری (ایف ڈی آئی) کی ۸۳ تجاویز کو منظوری دے دی گئی ہے۔ منظور شدہ تجاویز آئندہ پانچ برسوں میں ۱۷۵۳/۲۵ کروڑ روپے سے زیادہ کی مالیت کی برآمدات پر مشتمل ہیں۔

منظور شدہ تجاویز میں کپڑے، بجلی، موٹر گاڑیوں کے پرزے، سافٹ ویئر، مشاورتی خدمات، الیکٹرونک اور انجینئرنگ جیسے مختلف شعبے شامل ہیں۔

ایف۔ ڈی۔ آئی کی ان ۸۳ تجاویز کی منظوری کے ساتھ ہی جولائی ۱۹۹۶ء سے منظور کردہ تجاویز کی تعداد تقریباً ۱۱۰۰ تک پہنچ گئی ہے، جو ۲۱۰۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ کی سرمایہ کاری پر مشتمل ہیں۔

۹۸۰۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ کی مالیت پر مشتمل تقریباً ۵۸۰۰ تجاویز کو پالیسی کے بعد کی مدت میں (یعنی اگست ۱۹۹۱ء سے مارچ ۱۹۹۷ء تک) منظوری دی جا چکی ہے۔ ●

چاول کی حصولی

خریف کی فصل کے فروخت کے سیزن ۱۹۹۷-۹۸ء میں اکتوبر تا ستمبر ۱۹۹/۷۶ لاکھ ٹن چاول کی حصولیابی ہوئی جب کہ پچھلے برس اسی عرصہ میں ۱۸۰/۷۷ لاکھ ٹن چاول حاصل کیا گیا تھا۔ ۱۹۹۶-۹۷ء کے خریف سیزن کے دوران چاول کی کل حصولیابی ۱۹۹/۴۸ لاکھ ٹن تھی۔

مرکزی پول کے لیے سب سے زیادہ ۹۷/۴۱ لاکھ ٹن چاول پنجاب سے ملا۔ اس کے بعد ۴۷/۲۶ لاکھ ٹن چاول آندھرا پردیش سے اور ۱۱/۸۶ لاکھ ٹن چاول ہریانہ سے موصول ہوا۔ ●

جموں و کشمیر، آندھرا پردیش، کیرالا نے ای آئی یو ایس اسکیم کے تحت قابل ذکر کامیابی حاصل کی

۲۰ نکاتی پروگرام کی پندرہویں نکات کی اسکیم شہر کی گندی بستیوں کی ماحولیاتی ترقیاتی اسکیم (ای۔ آئی۔ یو۔ ایس) کے تحت جموں و کشمیر (۱۵۵ فی صد) گجرات (۱۳۲ فی صد)، آندھرا پردیش (۱۱۱ فی صد)، کیرالا (۱۲۰ فی صد) مقررہ نشانوں سے زائد کامیابی حاصل کی ہے۔ دسمبر ۱۹۹۶ء تک کامیابی کا کل ہند اوسط ۶۲ فی صد ہے۔ یہ ایک ریاستی منصوبہ اسکیم ہے عملی طور سے مرکز اس کے نشانے مقرر کرتا ہے اور اس کے نفاذ کی نگرانی کرتا ہے۔

سات بنیادی سہولیات جیسے پانی کی سپلائی، بارش کے پانی کے نالے، عوامی غسل خانے، موجودہ گلیوں کو درست کرنا اور چوڑا کرنا۔ سیور کے تجویز عوامی بیت الخلائیں اور سڑکوں کی لائٹ کے لیے گندی بستی کے ہر ایک رہنے والے سے ۸۰۰ روپے فی کس مہیا کیے جانے کا پروویزن ہے۔

آسام، گوا، منی پور اور میزورم نے اب تک کوئی کارکردگی نہیں دکھائی ہے۔ مرکزی ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو جہاں ہدایات کے باوجود ان کی کارکردگی پروگرام نگرانی کے ضمن اور اعداد و شمار جمع کرنے میں خراب ہے، الکھتی رہی ہے۔ ●

سی ڈاٹ کی ترقی

۹۱-۱۹۹۰ء تا ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران سرکار کے ذریعہ سی ڈاٹ ٹیلی فون نظام کی ترقی پر خرچ کی گئی رقم کی سالانہ تفصیل درج ذیل ہے۔

فراہمی میں اضافہ کریں۔ ایک خط میں زونل ریلویز کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ریلوے اسٹیشنوں پر پانی کی بلا رکاوٹ سپلائی کو یقینی بنانے کے لیے متعلقہ میونسپل حکام کے ساتھ مقامی سطحوں پر قریبی رابطہ قائم رکھیں۔ زونل ریلویز سے کہا گیا ہے کہ وہ پانی کی فراہمی میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں پانی کے کولر اور پمپ لگانے نیز بورنگ والے کنویں بنانے جیسے منظور شدہ کام بغیر کسی تاخیر کے مکمل کریں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ پلیٹ فارموں پر اور اسٹیشنوں کے احاطوں میں نلوں اور پانی کے کولروں کی مرمت کا کام جلد سے جلد مکمل

ہندوستان اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان سرمایہ کاری کے فروغ اور تحفظ سے متعلق معاہدہ

ہندوستان اور سوئٹزرلینڈ نے سرمایہ کاری کے فروغ اور تحفظ سے متعلق ایک معاہدے سے ہندوستان اور سوئٹزرلینڈ کے درمیان اقتصادی تعلقات اور خاص طور سے دونوں ملکوں کے درمیان باہمی سرمایہ کاریوں کو کافی فروغ حاصل ہوگا۔

سوئس کنفیڈریشن کے ساتھ یہ معاہدہ اس طرح کا اٹھارواں معاہدہ ہے، جس پر ہندوستان نے دستخط کیے ہیں۔ ●

سال	کل اخراجات	ٹی او ٹی / رویالٹی آمد	وزارت سے حاصل فنڈ (کروڑ روپے)
۹۱-۱۹۹۰ء	۲۱/۱۶	۱/۸۲	۱۹/۳۴
۹۲-۱۹۹۱ء	۲۵/۶۵	۴/۱۲	۲۱/۵۳
۹۳-۱۹۹۲ء	۴۱/۸۱	۶/۷۱	۳۵/۱۰
۹۴-۱۹۹۳ء	۵۴/۳۴	۱۰/۱۵	۴۴/۱۹
۹۵-۱۹۹۴ء	۴۶/۷۰	۱۰/۳۰	۳۶/۴۰
۹۶-۱۹۹۵ء	۴۹/۳۵	۱۰/۶۷	۳۸/۶۸

اس عرصہ کے دوران مارچ ۱۹۹۶ء تک ۳۲،۵۹ مقامات پر سی ڈاٹ کے ذریعہ آلات (ایکسچینج) بنائے گئے، نصب کیے گئے / تبدیل کیے گئے ہیں۔

پرزوں کی ۵۸۰۰۰ لائنیں سی ڈاٹ نظام کے ذریعہ بنائی گئی لائنوں کے علاوہ غیر ممالک سے درآمد کی گئی ہیں اور مذکورہ عرصہ کے دوران نصب کی گئی ہیں۔

سی ڈاٹ آلات (ایکسچینج) کی ممالک کو برآمدات کی تفصیل اس طرح ہے :-

ویتنام (۲۵۰)، بنگلہ دیش (۱۵۰)، نیپال (۴۰)، یوگانڈہ (۱)، گھانا (۱)، انگولا (۱) نامیبیا (۱)، نائجیریا (۱)، یمن (۱)، ہونڈورس (۱) اور ایتھوپیا (۱)۔

ریلوے اسٹیشنوں اور ریل گاڑیوں میں پینے کے پانی کی فراہمی

ریلوے کی وزارت نے زونل ریلویز کو ہدایت کی ہے کہ وہ موسم گرما کے دوران ریلوے اسٹیشنوں پر اور ریل گاڑیوں میں پینے کے پانی کی

کرائیں۔ ایئر کنڈیشنڈ مسافر ڈبوں میں پانی کے کنٹینر نیز میل اور ایکسپریس ریل گاڑیوں کے فرسٹ کلاس اور سلیپر کلاس کے مسافر ڈبوں میں جیری کین یقینی طور سے فراہم کیے جانے چاہئیں۔ زونل ریلویز کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ اسٹیشنوں پر لائنز کلب، روٹری کلب جیسی رضا کار تنظیموں اور دیگر خیراتی تنظیموں کی مدد حاصل کریں۔ ●

کونکن ریلوے پروجیکٹ

۸ فروری ۱۹۹۷ء تک شروع کیے گئے کام کی پیش رفت تقریباً ۹۸/۲۰ فی صد رہی ہے۔ نامکمل سرنگوں کی موجودہ صورت حال حسب ذیل ہیں۔

ٹیکسٹائل برآمدات

کیا آپ جانتے ہیں؟

—— کپڑوں کی برآمدات پہلے ہی کی طرح ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان کی برآمداتی مالیت میں اس کا ۳۳ فی صد حصہ ہے۔ ملک میں غیر ملکی زر مبادلہ کمانے کا یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ پارچات میں درآمداتی عنصر بہت معمولی ہوتا ہے۔

—— ہندوستان میں ٹیکسٹائل کی برآمدات ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۳۵۵۲۶/۰۵ کروڑ روپے کے بقدر ہوئی جو امریکی سکے میں ۱۰۶۸۵/۰۷ ملین ڈالر کے بقدر رہے۔ پانچ سال پہلے ۹۲-۱۹۹۱ء میں ٹیکسٹائلز کی برآمدات ۱۴۴۰۹/۴۶ کروڑ روپے کے بقدر تھیں جو کہ امریکی ڈالر میں ۵۷۹۶/۸۴ ملین کے برابر ہوتی ہے۔

—— ۹۷-۱۹۹۶ء میں ٹیکسٹائلز کی برآمدات کا نشانہ ۱۱/۸ ملین امریکی ڈالر ہے۔ اپریل تا جنوری ۹۷-۱۹۹۶ء میں ٹیکسٹائلز کی مجموعی برآمدات بشمول ہنڈی کرافٹس، پٹسن، ناریل کا ریشہ۔

لمبائی (میٹر)	باقی ہیڈنگ (میٹر)	ورکس بینچنگ (میٹر)	تکمیل کی مقررہ تاریخ
بندور ۱۶۶۰	۳/۰	۱۵/۰	۳۱/۳/۹۷
پاڈی ۱۹۱۵	-	۶۰/۰	۳۰/۴/۹۷
اولڈ گوا ۵۴۲	-	۱۴۴/۰	۳۱/۵/۹۷
پرنیم ۱۵۳۴	۲۸۲/۰	۵۳۹/۰	۳۰/۶/۹۷ -

۵۴ر۴۸۳۳۴ کروڑ روپے ہوئی جو کہ ۱۶ر۹ بلین امریکی ڈالر کے بقدر ہے اور حاصل شدہ نشانے کے ۸ر۱۸ فی صد کے برابر ہے۔

——— ہندوستان میں ٹکسٹائل برآمدات کا ۴۰ فی صد ریڈی میڈ کپڑوں کی شکل میں ہے۔ اس کے بعد سوتی کپڑوں کی برآمدات کا حصہ ہے۔

——— یوروپی یونین ہندوستان کے تیار شدہ ملبوسات سب سے زیادہ خریدتی ہیں، اس کے بعد امریکہ، کینڈا، جاپان، متحدہ عرب امارات اور سوئٹزرلینڈ میں ہندوستان کے تیار ملبوسات بھیجے جاتے ہیں۔

——— کچھ ترقی یافتہ ملکوں بشمول یوروپی یونین کے لیے برآمدات ملٹی فائبر انتظامات کے تحت کوٹہ کے نظام کے تابع ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو ٹکسٹائل اور پارچات کے سلسلے میں جو معاہدہ ہوا اس کے تحت کوٹہ سسٹم ٹوٹتا جا رہا ہے۔ یکم جنوری ۲۰۰۵ء سے یہ مطلق ختم ہو جائے گا۔

——— دنیا کی پارچات کی عالمی تجارت میں اس وقت ہندوستان کا حصہ صرف ۳ر۲ فی صد ہے۔

——— کتائی شعبوں کے لیے معیار بڑھانے کی غرض سے ایک منصوبہ زیر عمل ہے جس سے سوتی دھاگہ کی برآمدات میں اضافہ ہو سکے۔

——— ۹۸-۱۹۹۷ء کے بجٹ میں پارچات کی مشینری پر کسٹم محصولات میں کمی وغیرہ کے ذریعہ سے اس صنعت کا معیار بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بجٹ میں بھاری سامان بشمول ٹکسٹائل مشینری پر کسٹم محصول ۲۵ فی صد سے کم کر کے صرف دس فی صد رکھا گیا ہے۔

——— ٹکسٹائل سیکٹر کے لیے ٹکنالوجیکل معیار بندی فنڈ بنانے کے لیے غور و خوض ہو رہا ہے تاکہ ہندوستان میں کپڑے کی صنعت دوسرے ملکوں کے معیار کے مقابلے اپنا مقام بنا سکے۔ ●

کیا آپ جانتے ہیں؟

——— ہندوستان میں کافی ایک اہم فصل ہے اور اس سے ملک کو بڑے پیمانے پر غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی ہوتی ہے۔

——— ہندوستان میں ۹۷-۱۹۹۵ء میں دو لاکھ ۲۳ ہزار ٹن کافی پیدا ہوئی۔

——— ہندوستان نے ۹۷-۱۹۹۵ء میں ۱۷۰۵۸۱ ٹن کافی باہر ملکوں کو بھیجی جس سے ۱۵۲۴ کروڑ روپے کے بقدر غیر ملکی زرمبادلہ حاصل ہوا۔

——— کافی کی اندرون ملک کھپت ۵۵ ہزار ٹن ہے۔

——— کرناٹک میں ملک میں کافی کی پیداوار کا ۷۱ فی صد حصہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا نمبر کیرالا کا ہے جہاں کہ ۲۰ فی صد اور اس کے بعد تمل ناڈو میں ۷ فی صد اور دیگر حصوں پر اعشاریہ ۷ فی صد کافی پیدا ہوتی ہے۔

——— اندرون ملک کافی کی رسد زیادہ تر نجی تجارت کے ذریعہ سے ہوتی ہے اس کے لیے کھلی فروخت کوٹہ سسٹم کے تحت سو فی صد کافی فراہم کی جاتی ہے۔ کافی کی برآمدات کے نظم و نسق کے لیے برآمدات کا پرمٹ نظام ہے جو کافی بورڈ کی نگرانی میں ہے۔

——— درآمدات و برآمدات کی پالیسی کے تحت جس کا اعلان یکم اپریل ۱۹۹۵ء کو کیا گیا تھا۔ بھنی کافی اور غیر کیفین کافی کی کھلی درآمدات کی اجازت دے دی گئی تھی بشرطیکہ کسٹم ادا کر دیا جائے۔ سرکار نے انسٹینٹ کافی کی درآمد کی بھی اجازت دے دی ہے جس میں غیر کیفین انسٹنٹ کافی بھی پیکٹوں میں دستیاب ہے۔

——— ہندوستان کی سب سے زیادہ کافی روس، اٹلی، جرمن اور امریکہ جاتی ہے جہاں کہ کل برآمدات کا ۶۰ فی صد حصہ کھپ جاتا ہے۔ ان کے علاوہ پولینڈ اور جاپان بھی ہندوستان کی کافی اہم خریدار ہیں۔

——— کافی کی پیداوار بڑھانے کے لیے وزارت کامرس کے تحت کافی بورڈ نے بہت سے اقدامات کیے ہیں مثلاً یہ کہ بھرپور کاشت، کوالٹی کو بہتر بنانا وغیرہ۔ زرعی تحقیق، توسیعی خدمات، قرضوں کی فراہمی وغیرہ بھی اسی سلسلے کے اقدامات ہیں۔ ●

کچھ اور خبریں۔۔۔۔۔

● مرکزی بجلی اتھارٹی نے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو مشرقی علاقائی گرڈ کے زیادہ فریکوئنسی پر چلنے کی جانچ کرے گی۔ یہ کمیٹی اس سلسلے میں تجاویز رکھے گی کہ کس طرح فریکوئنسی کو متعینہ حدود کے اندر رکھا جائے۔ کمیٹی زیادہ فریکوئنسی استعمال کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کے سلسلے میں بھی تجاویز دے گی۔

مرکزی بجلی اتھارٹی کو اس بات کی شکایات موصول ہو رہی تھیں کہ مشرقی گرڈ میں فریکوئنسی بہت زیادہ ہے۔ اس سے ساز و سامان اور مشینری کو نقصان پہنچتا ہے۔

● چینئی بیچ۔ تیروچ چیراپلی۔ دینڈی گال سیکشنوں میں گیج کی تبدیلی کا کام تیزی سے چل رہا ہے۔ یہ کام بالترتیب مارچ ۱۹۹۸ء اور دسمبر ۱۹۹۸ء میں مکمل کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ دینڈی گال اور مدورائی کو بڑی لائن سے پہلے ہی جوڑا جا چکا ہے۔

● ۹۸-۱۹۹۷ء کے ریل بجٹ میں کیے گئے اعلان کے مطابق احمد آباد اور دہلی کے درمیان ایک ہفتہ وار راجدھانی ایکسپریس، گیج کی تبدیلی کا کام مکمل ہونے اور دہلی۔ احمد آباد سیکشن پر تیز رفتاری کا انتظام ہونے کے بعد ۹۸-۱۹۹۷ء کے دوران شروع کی جائے گی۔

● "ریکوزیشن ہولڈر" اعلا افسروں، وزیروں، ممبران پارلیمنٹ، بہت اہم شخصیتوں کی فوری سفری ضرورت کی تکمیل اور مختلف حلقوں کی دیگر ہنگامی مانگ کی تکمیل کے لیے تمام اہم ٹرینوں میں بہت سی برتھ اور سیٹیں بطور ایمرجنسی کوٹہ، مختص کر دی گئی ہیں۔ یہ کوٹہ عام طور پر ٹرین کی روانگی سے چھ گھنٹے قبل ریلیز کیا جاتا ہے لیکن ان ٹرینوں کے سلسلہ میں جو دوسرے دن صبح ۰۰ر۱۴ بجے تک روانہ ہونے والی ہوتی ہیں کوٹہ ایک دن قبل ریلیز کیا جا سکتا ہے۔ ●

خصوصی شمارہ یوم آزادی ۹۷ء

یوجنا

چیف ایڈیٹر : این۔ این۔ شرما

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

معاون : رقیہ زیدی

تزئین و کتابت : افتخار احمد خان

سرورق : کے۔ کے۔ ورما

جلد : ۱۷ شمارہ : ۵

اگست ۱۹۹۷ء (ساون۔ بھادوں شک ۱۹۱۹)

قیمت خصوصی شمارہ : ۱۰ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) : ڈی۔ این۔ گاندھی

سرکولیشن اینڈ ایڈورٹیزمنٹ منیجر : کے۔ ایس۔ جگناتھ راؤ

مضامین سے متعلق خط کتابت کا پتا :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

●

روشن شعور کی ضرورت

اس زمانے سے، جب سے ہمیں تاریخ کا علم ہے، دنیا کے تمام مذاہب نے یہی پرچار کیا ہے کہ سماج کی نشو و نما کے لیے صاف ستھرا ماحول بنیادی چیز ہے —— سماج کے افراد کے لیے یا اجتماعی طور پر ان کی مسائل دونوں ہی کے لیے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے عناصر کی عظیم قوتوں کو مدد کے لیے پکارنے کو اولیت کیوں دی جاتی تھی۔ اس عمل کا مقصد محض مذہبی نہیں تھا بلکہ ماحولیاتی نعمتوں —— مثلاً ہوا، پانی، زمین وغیرہ —— کی اہمیت جتانا اور انھیں واجب احترام عطا کرنا بھی تھا جن کا استعمال منصفانہ طور پر اور آفاقی منظوری کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ پچھلی صدیوں کے دوران، بدقسمتی سے انسان اپنی متلون مزاجی کے باعث ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں پر چونکہ، ہم قدرتی وسائل کے استعمال کی وجہ بتا نہیں پاتے تھے جواب عارضی اور ناقابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ لگ بھگ اس خیال پر متفق ہو چکے ہیں کہ ہماری یہ روش اگرچہ کلی طور پر غیر ذمہ دارانہ نہ سہی، تنگ نظر ضرور رہی ہے۔ سیارۂ زمین ناقابلِ رہائش ہونے کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے وسائل کثرتِ استعمال کے باعث معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔

ترقی اور ماحولیات پر بحث اُس وقت سے جاری ہے، جب سے صنعت کاری نے مغربی دنیا کو بہت کم وقت میں خوشحالی سے ہم کنار کر دیا۔ دولت اکٹھی کرنے کی جلد بازی میں قدرتی ذرائع کا اندھا دھند استعمال کیا گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ شہر اور قصبوں میں بے انتہا بھیڑ ہے، بے حد شور ہے اور صحت مند انسانی گزر بسر کے لیے بے حد غیر صحت مندانہ ماحول ہے۔ جنگلات برہنہ ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں موسم اور پانی کی جدولوں میں مزید خلل واقع ہوا ہے۔ سمندر نہ صرف یہ کہ آلودہ ہوئے ہیں بلکہ انسانی ندیدے

پنے کے باعث اپنی قدرتی دولت کھو رہے ہیں۔ اُدھر "اوزون" کی گھٹتی ہوئی پرت کا منڈراتا ہوا خطرہ بھی ماحول کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ زمین اکثرت استعمال کے باعث اپنی زرخیزی سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو کیسا منظر نامہ وراثت میں سونپنے جا رہے ہیں!

"اسٹاک ہوم ڈیکلریشن" اور ۱۹۹۲ء کی "ریو چوٹی کانفرنس" نے اجتماعی آفاقی کوششوں کے ذریعے زمین کے وسائل میں ہونے والی کمی کو دور کرنے کے لیے فوری اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ لیکن "یو۔ این۔ ارتھ سمٹ" (زمین سے متعلق اقوام متحدہ کی چوٹی کانفرنس) جو اس سلسلے میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے منعقد ہوئی تھی، بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہو گئی۔ اس نے کہا: ہمیں اس بات پر سخت تشویش ہے کہ کل ملا کر ۱۹۹۲ء کے مقابلے آج رجحانات کہیں بدتر ہیں۔

ترقی اور ماحولیات کو ایک دوسرے کے متضاد کے طور پر نہیں بلکہ لازم و ملزوم کے طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو معقول سہارا دیتے ہیں۔ دونوں ہی انسانی سماج اور قوموں کی نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔ ایک متوازن اور صحت مند ماحول نہ صرف متواتر ترقیاتی کوششوں کے لیے بلکہ کیفیت و معیارِ زندگی کی ضمانت کے لیے بھی ضروری ہے۔ ایک زیادہ صاف ستھرے ماحول کا مطلب ہے کم آلودگی، کم بیماری، کم مصیبت اور اس صاف ستھرے ماحول کا نتیجہ زیادہ پیداواریت کی صورت میں سامنے آئے گا جو ترقی کی سمت لے جائے گا۔ ایک دوسرے پر انحصار کی اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ترقی کی اہمیت نیز ماحولیات کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کے باعمل امتزاج کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اس کا جواب بڑھتے ہوئے شعور کے ذریعے ایک روشن خیال نظریہ اپنانے میں پوشیدہ ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن

ماحولیات کے لیے مددگار زراعت

ماحولیات کے لیے مددگار زراعت خوراک اور روزی کے مستقلاً جاری رہنے والے تحفظ کا ذریعہ ہے۔ اسے حاصل کرنے کا بہتر طریقہ کاشت کار خاندانوں کے ساتھ شراکتی تحقیق نیز بہترین حاشیائی تکنالوجیوں کا روایتی دانائی اور تجربے سے پیدا کیا گیا امتزاج ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے اس کی کامیابی کے لیے ترجیحات اور شرائط بیان کی ہیں۔

سبز انقلاب کی اصطلاح میں جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ڈاکٹر ولیم گاوڈ نے ۱۹۶۸ء میں ایجاد کی تھی اب نہ صرف زیادہ پیداواریت کے ذریعے زیادہ پیداوار بلکہ معیشت حیوانات اور سماج کے لیے کئی منفی اثرات سے بھی منسلک کیے جانے لگے ہیں۔ اکثر اس بات کا بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ پیداوار کی سطحوں میں ٹھہراؤ آجانے اور ۷۰ کی دہائی کے اوائل کے جتنی پیداوار حاصل کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ مقویات کی ضرورت پیدا ہونے کے سبب سبز انقلاب میں سستی آگئی ہے۔

تو کیا اس امر کا امکان ہے کہ جب ہم ایک نئے عہد ہزار سالہ میں داخل ہوں گے تو ہمیں ایسی نئی تکنالوجیوں کا فائدہ حاصل نہیں رہے گا جن سے کاشت کاروں کو کم زمین اور کم پانی سے زیادہ خوراک اور دوسری زرعی اجناس پیدا کرنے میں مدد ملے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم ایسی پوزیشن میں ہیں جب ایک سدابہار سبز انقلاب جس سے زمین اور پانی کے ایک یونٹ سے زیادہ پیداوار، آمدنی اور روزی حاصل کرنے میں مدد ملے، لانے کی کوشش کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنی زرعی تحقیق اور ترقی کی حکمت عملیوں میں ایک بڑی تبدیلی لائیں۔ سبز انقلاب چاول، گیہوں اور مکئی جیسی فصلوں کی کاشت میں جینٹک جوڑ توڑ سے شروع ہوا تھا۔ سدابہار سبز انقلاب کاشت کاری کے ایسے طریقوں

> اب ہم ایسی پوزیشن میں ہیں جب ایک سدابہار سبز انقلاب جس سے زمین اور پانی کے ایک یونٹ سے زیادہ پیداوار، آمدنی اور روزی حاصل کرنے میں مدد ملے، لانے کی کوشش کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنی زرعی تحقیق اور ترقی کی حکمت عملیوں میں ایک بڑی تبدیلی لائیں۔

سے شروع ہوگا جو دستیاب زمین، پانی اور محنت سے معیشت حیوانات یا معاشرہ کو نقصان پہنچائے بغیر زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں مدد دے سکے۔ اس سمت میں پیش رفت ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہم اپنی توجہ کسی ایک جنس پر مرکوز کرنے کی بجائے تمام فصلوں یا پورے نظام کاشت پر مرکوز کریں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم بہتر فصل کے لیے تحقیق کے میدان میں اپنی کوششیں کم کر دیں۔ لیکن ہمیں اتنا ضرور کرنا چاہیے کہ یہ تحقیق یا ریسرچ ایک پورے پیداواری نظام کی پیداواریت اور کارکردگی بڑھانے کی غرض سے کی جائے۔ سست پڑ گئے سبز انقلاب سے ایک سدابہار سبز انقلاب کے دور میں داخل ہونے کے لیے کسی ایک فصل پر مرکوز انداز نظر کی بجائے پورے نظام کاشت پر محیط انداز نظر اختیار کرنا اور تکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تشہیر و اشاعت کرنا ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک "سپر چاول"، جو فی ہیکٹر دس ٹن سے زائد پیداوار دے سکے،

سکالنے کے امکانات ہی کو لیجیے۔ اس قسم کے چاول کے پودے کے لیے فی ہیکٹیر کم از کم ۲۰۰ کلوگرام ایندھن کی ضرورت ہوگی اس کے ساتھ ساتھ دوسرے بڑے اور چھوٹے مقویات بھی درکار ہوں گے۔ لیکن اگر زمین کو اس قسم کے مقویات صرف معدنی کھادوں کے ذریعے سے دیے جائیں گے تو اس سے شدید قسم کے ماحولیاتی مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اس لیے باری باری سے دالوں کی کاشت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اب سائنس دانوں کے سامنے ایک نادر موقع ہے کہ وہ فی ہیکٹیر "زیادہ خوراک، زیادہ آمدنی اور زیادہ روزی" کے سہ گونہ نصب العین کے حصول کے لیے موزوں نظام کاشت وضع کریں۔ اس کے لیے انھیں بایوٹکنالوجی، اطلاعات، جی آئی ایس کے نقشوں، خلائی ٹکنالوجی، قابل تجدید توانائی (شمسی، ہوائی، بایو گیس اور بایوماس) کی ٹکنالوجیوں جیسی حاشیائی ٹکنالوجیوں کے روایتی علم و دانش کے ساتھ امتزاج سے حاصل ہونے والی ایکو ٹکنالوجیوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔

عالمی ماحولیاتی مسائل جن میں درجۂ حرارت، سطح سمندر میں تبدیلی اور الٹرا وائلٹ بی، شعاع زنی شامل ہیں، کے لیے صنعتی ممالک ذمہ دار ہیں۔ جہاں صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں کاشت میں مزید گھنا پن، لانا معیشت حیوانات کے لیے تباہ کن ہوگا وہاں ترقی پذیر ممالک میں زراعت میں گھنا پن اور تنوع لانے میں ناکامی سماجی طور پر تباہ کن ہوگی۔ کیوں کہ ترقی پذیر ممالک میں روزگار کے سب سے زیادہ مواقع زراعت ہی مہیا کرتی ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ زراعت جس میں فصلوں کی کاشت، مویشی پروری، جنگل بانی، زرعی شجرکاری، ماہی پروری اور زراعت پر مبنی صنعتیں شامل ہیں۔ ہماری ۰۰ فی صد آبادی کی روزی کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں ہمیں ہر سال گیارہ ملین نئی روزیاں پیدا کرنی ہوں گی اور یہ کام بڑی حد تک زرعی پیداوار اور دیہی صنعتوں کے شعبوں کو کرنا ہوگا۔ اس لیے بیرون ملک سے خوراک اور دیگر زرعی اجناس کی درآمد بے روزگاری درآمد کرنے کے مترادف ہوگی۔ لہٰذا آج ہمیں ایک ایسے سبز انقلاب کی ضرورت ہے جسے ماحولیات کے اعتبار سے جاری رکھا جا سکتا ہو اور جو سماجی لحاظ سے منصفانہ ہو اسے دوسرے الفاظ میں سدا بہار سبز انقلاب کہا جا سکتا ہے۔

چنوتیوں کا مقابلہ

ایم۔ ایس سوامی ناتھن ریسرچ فاؤنڈیشن (ایم۔ ایس۔ آر۔ ایف) نے ان چنوتیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جو طریقے نکالے اور آزمائے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

(الف) کسی علاقے کی معیشت حیوانات کے تحفظ کو مقامی آبادی کی روزی کے تحفظ سے جوڑنا اور تحفظ کے معاشی پہلو کو اجاگر کرنا۔

ایم۔ ایس۔ آر۔ ایف کا کمیونٹی بایوڈائی ورسٹی پروگرام یہ بتاتا ہے کہ بایوڈائی ورسٹی (حیاتیاتی کثرت) والے علاقوں میں کیسے باہمی طور پر فائدہ مند رابطے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ قبائلی اور دیہی خاندان جنھوں نے حیاتیاتی کثرت (بایوڈائی ورسٹی) کو بڑھایا ہے، بدستور غریب رہتے ہیں اور وہ لوگ جو ان کی کوششوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں امیر بن جاتے ہیں۔ چوں کہ قدرتی ایکو سسٹم کی حفاظت کرنے والے اس حفاظت کے اقتصادی اور سماجی پہلو سے ناآشنا ہوتے ہیں اس لیے قدرتی ایکو سسٹم کا زیاں تیزی سے ہونے لگتا ہے۔ ایم۔ ایس۔ آر۔ ایف نے حیاتیاتی کثرت کی حفاظت کے اقتصادی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے ایک سہ رخی حکمت عملی اختیار کی ہے جو درج ذیل ہے:

(۱) ایک کھلا اور قابل عمل طریقہ نکالا گیا ہے جس میں انواع و اقسام کے پودوں کے تحفظ کے لیے نظیر طریقے شامل کیے گئے ہیں تاکہ جینیٹک وسائل کے تحفظ اور افزائش کے لیے غیر رسمی ایجادات کو تسلیم کر کے ان پر انعامات دیے جائیں۔

(۲) کمرشل کمپنیوں اور قبائلی و دیہی خاندانوں کے درمیان ایک علامتی سماجی کنٹریکٹ کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے جس کے تحت مقامی لوگ ان کمپنیوں کی دلچسپی والے جینیٹک میٹریل کی کاشت اس شرط پر کریں گے کہ پیداوار کو یہ کمپنیاں ہی واپس خرید لیں گی۔ اس طرح کا رابطہ یا تعلق قائم ہونے سے پرائمری میٹریل کے استحصال اور خاتمہ کو روکا جا سکے گا۔

(۳) مقامی مردوں اور عورتوں کو حیاتیاتی کثرت (ڈائی ورسٹی) کی فہرستیں بنانے اور ان پر نگاہ رکھنے یا دوسرے الفاظ میں بایو مانیٹرنگ کی تربیت دی جا رہی ہے تاکہ وہ اپنی ذہنی ملکیت کے خود مالک بن سکیں۔ اس طرح کے تربیت یافتہ مردوں اور عورتوں سے زرعی بایوڈائی ورسٹی کی حفاظت کرنے والی ایک کور (جماعت) بن جاتی ہے۔

ٹکنیکل ریسورس سینٹر

ایم۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ ایف نے مقامی لوگوں کو بایوڈائی ورسٹی کے تحفظ میں مدد دینے کے لیے ایک ٹکنیکل ریسورس سینٹر قائم کیا ہے جو حیاتیاتی کثرت سے

اب سائنس دانوں کے سامنے ایک نادر موقع ہے کہ وہ فی ہیکٹیر "زیادہ خوراک، زیادہ آمدنی اور زیادہ روزی" کے سہ گونہ نصب العین کے حصول کے لیے موزوں نظام کاشت وضع کریں۔

متعلق کنونشن کی اکو یجّا سے متعلق دفعات کو عمل میں لائے گی۔ چوں کہ دنیا میں یہ اپنی قسم کا پہلا سینٹر ہے اس کے چھ بڑے اجزا درج ذیل ہیں:

(۱) تمل ناڈو، کیرالہ، آندھرا پردیش اور اڑیسہ کی ریاستوں اور لکش دویپ اور جزائر نکوبار میں بنیادی اطلاعات جمع کرکے زراعتی بایوڈائیورسٹی کی حفاظت اور افزائش کے لیے قبائلی اور دیہی خاندانوں کی خدمات کی مکمل فہرست مرتب کرنا۔

(۲) قبائلی اور دیہی علاقوں کے ایسے نوجوان مرد اور عورتوں کو زراعتی بایوڈائیورسٹی کنزرویشن کوروں کی صورت میں منظم کرنا جو مناسب تربیت کے بعد مقامی بایوڈائیورسٹی کی فہرستیں بنانے، اپنے اپنے قبیلے کی جینیٹک تحفظ کی روایات کو زندہ کرنے اور مختلف حیاتیاتی اشاریوں کی مدد سے ایکو سسٹم کی صحت کی مانیٹرنگ کے کام انجام دے سکیں۔ ان کوروں کے اراکین اپنی اپنی برادریوں کو کنونشن کی متعلقہ دفعہ کے تحت آنے والے معاملوں کے حل میں مدد دے سکیں گے۔

(۳) زراعتی بایوڈائیورسٹی کی حفاظت اور بہتری کے لیے قبائلی اور دیہی خاندانوں کی خدمات کی ملٹی میڈیا ڈاٹا بیس ڈاکیومینٹنگ کو فروغ دینا تاکہ وہ قومی اور عالمی کمیونٹی جین فنڈس، سے اپنا استحقاق حاصل کرنے کے قابل بن سکیں۔

(۴) ایک کمیونٹی جین بینک اور ذخیرۂ نباتات کا اہتمام کرنا۔ جنوبی ہند کے قبائلی علاقوں سے کاشت کاروں کے محفوظ رکھے یا تیار کیے ہوئے بیج بہ حفاظت رکھنے کے لیے ایک کمیونٹی جین بینک قائم کیا گیا ہے۔ اس بینک میں رکھے ہوئے میٹریل کا کیٹلاگ تیار کیا جائے گا اور ٹکنیکل ریسورس سینٹر کے ڈاٹا بیس سے تال میل قائم کیا جائے گا۔ ذخیرۂ نباتات یا HERBARIUM نباتات اور جڑی بوٹیوں کی شناخت کے لیے ایک حوالہ جاتی مرکز کے طور پر کام کرے گا۔

(۵) قبائلی اور دیہی خاندانوں کی پودوں کی جینز کو محفوظ رکھنے کی روایات کو پھر زندہ کرنا۔ یہ کام ان خاندانوں کی خدمات کو تسلیم کرکے اور ان کے کام کو ایک اقتصادی اہمیت دے کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قبائلی اور دیہی خاندانوں کے ذریعے تجارتی اہمیت کے پودوں کی کاشت کے کنٹریکٹ میں پرائیویٹ سیکٹر کی شمولیت کے ماڈل تیار کیے جاتے ہیں۔

(۶) قانونی مشورے کا شعبہ۔ یہ شعبہ قبائلی اور دیہی خاندانوں کو ذہنی ملکیت کے حقوق اور پودوں کی اقسام کے تحفظ سے متعلق معاملات میں مناسب قانونی مشورہ دے گا۔

(ب) آبادی کے بوجھ کو برداشت کرنے کی معیشت حیوانات کی صلاحیت اور مقامی سماج کے پیدائش و اموات کے اعداد و شمار اضافہ آبادی کو اس حد تک جس حد تک کہ زمین، پانی، جنگلات اور ایکو سسٹم کے دیگر عناصر اس کا بوجھ برداشت کرسکیں محدود کرنے کی ضرورت کا احساس کرانے کے لیے ایسے تربیتی ماڈیول تیار کیے گئے ہیں جن سے گاؤں کی سطح کے جمہوری اداروں کے ممبر مرد اور عورتیں اپنے اپنے گاؤں کے پیدائش و اموات کے اعداد و شمار کے چارٹ تیار کراسکیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ مقامی منصوبے تیار کرسکیں اور مقامی آبادی کی جو ضرورتیں پوری نہیں کی جاسکی ہیں ان کی تکمیل کے لیے ترجیحات مقرر کرسکیں۔ پیدائش و اموات کے اعداد و شمار کے ان چارٹوں سے مقامی سماج کو آبادی سے متعلق مسائل کو سماجی ترقی کے سیاق و سباق میں دیکھنے میں مدد ملے گی اور پھر وہ اس بات کو یقینی بناسکیں گے کہ بچے صرف کسی طرح زندہ رہنے کے لیے نہیں بلکہ خوشی دینے کے لیے پیدا ہوں۔

(ج) اطلاعات اور ہنرمندی۔ اس کے لیے اطلاعاتی گاؤں (انفارمیشن ویلیج) کا نظریہ وضع کیا گیا ہے۔ جس کے تحت تربیت یافتہ دیہی عورتیں اور مرد اطلاعات کی ایسی "دکانوں" کی حیثیت سے کام کریں گے جہاں موسمی، تنظیمی اور مارکٹنگ کے بارے میں مقامی نوعیت کی اطلاعات فراہم کی جائے گی۔ تربیت یافتہ کاشت کار عورتیں اور مرد خود تربیت کار بن جاتے ہیں۔ اطلاعاتی دکانوں، میں کمپیوٹری طریقِ کار مقامی خاندانوں کو حکومت اور دوسرے پروگراموں کے تحت ملنے والے حقوق کے بارے میں بھی بتاتا ہے۔ انفارمیشن تکنالوجیاں دیہی علاقوں میں زیادہ فائدہ مند روزگار فراہم کرتی ہیں۔ اگرچہ نئی تکنالوجیاں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں "لوک میڈیا" ان لوگوں تک جن تک کہ پہنچا نہیں جاسکا ہے پہنچنے میں زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے لوک ناٹک، لوک آرٹ اور تھیٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

زراعت جس میں فصلوں کی کاشت، مویشی پروری، جنگل بانی، زرعی شجر کاری، ماہی پروری اور زراعت پر مبنی صنعتیں شامل ہیں۔ ہماری ۷۰ فیصد آبادی کی روزی کا ذریعہ ہے۔

(د) زراعت میں ماحولیاتی اعتبار سے درست گھناپن اور تنوع۔

یہ مقصد کاشت کار خاندانوں کے ساتھ شراکتی تحقیق کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ کیڑوں کی روک تھام کی مربوط تکنالوجی اور زمین کو مقویات کی فراہمی کی مربوط تکنالوجی استعمال کی جاتی ہے۔ ایکو تکنالوجی کی ترقی کے لیے حاشیاتی تکنالوجی کے بہترین اجزاء اور روایتی عقل و دانش اور تجربے کو ملاکر ایک امتزاج تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح جدید سائنس اور ماضی کی عقل و دانش دونوں کو ملایا جاتا ہے۔

ایکو اگلچر میں بھی ایکو ٹکنالوجیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ زراعت اور ایکو اگلچر کی مربوط تکنیکوں کے استعمال سے کھیت کی آمدنی بھی بڑھتی ہے اور گھر کی روزی روٹی کا تحفظ بھی ہوتا ہے۔ پورے گاؤں میں ایسی مربوط اور گھنی کاشت کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دستیاب زمین اور پانی سے زیادہ خوراک، زیادہ آمدنی اور زیادہ روزگار کے سہ گونہ مقصد کے حصول کے لیے اس طریقے کا استعمال ضروری ہے۔ گھنی کاشت کے سات بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

(۱) مٹی کی دیکھ بھال

مستقل نوعیت کی گھنی کاشت کے لیے اچھی مٹی کی دیکھ بھال ایک بنیادی ضرورت ہے۔ گھنی کاشت کے طریقوں کا استعمال کرنے والے کاشت کاروں کو مٹی کی صحت کا کارڈ، بنانے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ مٹی کی زرخیزی پر طریق ہائے کاشت کے مادی، کیمیاوی اور مائکرو بایولاجیکل اجزاء پر نگاہ رکھ سکیں۔

(۲) بارش سے آب پاشی

گھنی کاشت کے طریقے استعمال کرنے والے خاندان بارش کا پانی بچا کر رکھتے ہیں تاکہ اسے دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والے پانی کے ساتھ فصلوں کی آبیاری کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ جن علاقوں میں پانی سب سے بڑا مسئلہ ہے وہاں پر ایسی ٹکنالوجیاں اختیار کی جاتی ہیں جن سے ہر لیٹر پانی کا استعمال اس طرح کیا جا سکے کہ آمدنی اور روزگار دونوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔

(۳) فصل اور کیڑوں سے حفاظت کا بندوبست

زمین کو مقویات کی ایک مربوط انداز سے سپلائی اور فصلی کیڑوں کی روک تھام کا مربوط انتظام گھنی کاشت کے طریقے کے اہم اجزاء ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ٹھیک ٹھیک کتنا استعمال کیا جائے، اس کا دارومدار طریق کاشت کے ساتھ ساتھ علاقے کے زرعی معیشت حیوانات اور مٹی کی حالت پر ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کا استعمال کرنے والے توسیعی سسٹم سے کاشت کار خاندانوں کو مٹی، پانی، کیڑوں اور فصل کی کٹائی کے بعد زمین کے بندوبست کے بارے میں بروقت اور ٹھیک ٹھیک اطلاعات مل سکتی ہیں۔

(۴) توانائی کا بندوبست

توانائی پیداوار کے لیے ایک اہم اور ضروری لاگت ہے۔ زمین، پانی اور فصلی کیڑوں کی روک تھام کے علاوہ بایو گیس، بایو ماس، شمسی اور ہوائی توانائی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی کھیت کے کاموں مثلاً پمپ سے پانی نکالنے اور اناج اور دوسری اجناس کو سکھانے کے لیے شمسی اور ہوائی توانائی کے ساتھ ساتھ بایو گیس کا استعمال کیا جائے گا۔

(۵) فصل کی کٹائی کے بعد کا بندوبست

گھنی کاشت کے طریقوں پر عمل پیرا کاشت کار پھلیاں کوٹ کر دانے نکالنے، اور اناج کی اسٹوریج اور پراسیسنگ کے بہترین طریقوں کا استعمال کرنے کے علاوہ پودے کے ہر حصے یا جانور سے VALUE ADDED پروڈکٹس حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ فصل کی کٹائی کے بعد استعمال کی جانے والی ٹکنالوجی جلد خراب ہونے والی چیزوں مثلاً پھلوں، سبزیوں، دودھ، گوشت، انڈوں، مچھلیوں اور پراسیس شدہ خوراک وغیرہ کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر پیداوار اور کٹائی کے بعد کی ٹکنالوجیوں میں صحیح تال میل نہ ہو تو اس کا کاشت کاروں اور صارفین دونوں ہی پر مضر اثر پڑتا ہے۔ برعکس ہماری شہر کاری کے عمل سے خوراک کی عادتوں میں تنوع پیدا ہوتا ہے اس کے نتیجے میں دودھ، پنیر، انڈوں اور پراسیس شدہ خوراک کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ صارفین کی مانگ کی بنیاد پر زرعی پیداوار کی پراسیسنگ کی صنعتیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ دیہات کے نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھانے کی غرض سے گاؤں میں فوڈ پراسیسنگ انڈسٹریز کے قیام کو بڑھاوا دیا جا سکتا ہے۔ اس سے خوراک میں غذائیت بخش اجزاء کی کمی دور کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

ملکی صارفین اور برآمدات دونوں ہی کو عمدہ خوراک مہیا کرنے کے لیے صفائی ستھرائی کے انتظامات بہت ضروری ہیں۔ گھنی کھیتی کے مربوط طریقوں کی اشاعت میں مدد دینے کے لیے حکومت کو اسٹوریج (ذخیرہ سازی)، سڑکوں، نقل و حمل کی سہولیات اور صفائی ستھرائی کے انتظامات پر ایک بڑی سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔

(۶) فصل اور کاشت کے لیے جانور کا انتخاب

گھنی کاشت کے مربوط طریقوں میں نظام کاشت کے مختلف اجزاء پر دھیان دینا ضروری ہے۔ فصل اور کاشت کے لیے جانور اور ایکو اگلچر کے طریقے کا انتخاب مٹی کی حالت، پانی کی دستیابی، موسمی خصوصیات وغیرہ کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ عقبی علاقے میں مرغی پالن سے آمدنی اور غذائیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۷) اطلاعات، ہنرمندی، تنظیم اور مارکیٹنگ

گھنی کاشت کا مربوط طریقہ درست فارمنگ پر مبنی ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے ایک موثر اور بامعنی اطلاعات کا نظام اور ہنرمندی ضروری ہے۔ پیداوار کے لا مرکزی نظاموں کو کلیدی نوعیت کی کچھ مرکزی علامات

> اگرچہ نئی ٹکنالوجیاں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں "لوک میڈیا" ان لوگوں تک جن تک کہ پہنچا نہیں جا سکتا ہے پہنچنے میں زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے لوک ناٹک، لوک آرٹ اور تھیٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

مثلاً قرضوں، بیجوں، فصلی کیڑوں کو مارنے والی دوائیوں، مویشیوں کی بیماریوں کے تشخیص و علاج کی سہولیات کی ضرورت ہوگی۔ تربیت یافتہ مقامی نوجوانوں کو "اطلاعات کی ایک دکان" کھولنی ہوگی جو کاشت کار خاندانوں کو موسم، بندوبست اور مارکٹنگ وغیرہ کے بارے میں بروقت اطلاعات فراہم کرسکے اور انھیں ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کرسکے۔ تنظیم اور بندوبست کلیدی عناصر ہیں۔ رقبۂ کاشت اور طریق کاشت کے مطابق چھوٹے پروڈیوسروں کو پراسیسنگ اور مارکٹنگ کے فائدے بہم پہنچانے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔

گھنی کاشت کے مربوط طریقے کا فروغ سائنس دانوں اور کاشت کار خاندان کے درمیان شراکتی ریسرچ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے جن گاؤوں میں یہ طریقہ رائج ہے ان میں اقتصادی مضبوطی اور ماحولیاتی بہتری آئی ہے اور سماج میں اور مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ تبھی کامیاب ہوگا جب یہ محض تکنالوجی کا ایک پروگرام ہونے کی بجائے انسان ہوگا۔ گھنی کاشت کا مربوط طریقہ کاشت کار خاندانوں اور ان کے قدرتی وسائل (مثلاً زمین، پانی، جنگلات، نباتات اور دھوپ) کے درمیان ایک علامتی شراکت ہے۔ لیکن چھوٹے کاشت کاروں کے لیے اس وقت تک یہ طریقہ اختیار کرنا مشکل ہوگا جب تک کہ سرکار زمینی اصلاحات، لگان داری کے تحفظ، قرضوں کی بہم رسانی، بنیادی ڈھانچے کی سہولیات، کھیتی کی لاگت اور پیداوار، قیمتوں کے تعین اور مارکٹنگ کے بارے میں ایسی پالیسیاں اختیار نہ کرے جو ان کے لیے فائدہ مند ہوں۔

(۸) کھیتوں پر اور کھیتوں سے باہر روزگار

بایو ویلیج (حیاتیاتی گاؤں) کا پروگرام تین کلیدی شعبوں۔ وسائل کے انحطاط، فصلوں اور جانوروں کی پیداواریت بڑھانے اور غربت کے خاتمہ پر توجہ مبذول کرتا ہے۔

یہ پروگرام جو پانڈیچری میں زیر عمل ہے کھیتوں پر اور کھیت سے باہر روزی کمانے کے مواقع پر یکساں زور دیتا ہے۔ البتہ یہ خاتمۂ غربت کے لیے سرپرستی کے رویّے سے احتراز کرتا ہے۔

یہ غریبوں کو پروڈیوسر اور اختراعات کنندہ سمجھتا ہے اور ان کے وقت اور محنت کی قیمت بڑھا کر انھیں اپنے اثاثے بنانے میں مدد دیتا ہے۔ بنیادی زور اثاثے بنانے اور جاری رہنے والی انسانی ترقی پر ہے۔

پروگرام قدرت، غریبوں اور عورتوں کے حق میں بنائے جاتے ہیں۔ اس میں غریبوں کی روزی کے تحفظ پر زور دیا جاتا ہے — مستقلاً جاری رہنے والی ترقی کا بایو ویلیج، ماڈل اقتصادی اور سماجی طور پر پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود کے گرد گھومتا ہے۔

انسان پر مرکوز

لہٰذا یہ ترقی کا 'انسان پر مرکوز' پروگرام ہے۔ اس کے لیے انٹرپرائزز مارکٹنگ کے مواقع کو دیکھتے ہوئے چنے جاتے ہیں — غریبوں کو تکنالوجی سے متعارف کرنا اور انھیں ہنرمند بنانا اس کا ایک خاص پہلو ہے۔ چوں کہ انٹرپرائزز کا رخ مارکیٹ کی طرف ہوتا ہے اس لیے "بایو ویلیج" ماڈل کی اقتصادی مضبوطی یقینی ہے۔ پیداواری اور فصل کٹنے کے بعد کی تکنالوجیاں اور کھیتوں پر اور کھیت سے باہر روزگار کے مواقع اس طرح باہم مربوط کیے جاتے ہیں کہ پروڈیوسروں اور صارفین دونوں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔

حیاتیاتی علاقوں کے گرد 'بایو ویلیج' پروگرام کو زیر عمل لانے سے خوراک، ایندھن، چارے وغیرہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں مدد ملے گی۔ شہری علاقوں کے نزدیک "بایو ویلیج" پروگرام پر عمل درآمد سے دیہی پروڈیوسروں اور شہری صارفین کے درمیان باہمی طور پر فائدہ مند شراکت پیدا ہوتی ہے۔ قصبات اور شہروں کے نزدیک واقع گاؤوں میں پراسیس شدہ اور نیم پراسیس شدہ خوراکی اشیاء، جن کی شہری علاقوں میں مانگ ہوتی ہے، کے کارخانے لگانے سے دیہی غربا کو روزگار کی تلاش میں شہروں میں ہجرت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہےگی۔

ماحولیات کے لیے مددگار زراعت خوراک اور روزی کے تحفظ کا ذریعہ ہے۔ یہ قدرتی وسائل کے غیر استحصال پسندانہ استعمال اور گاندھی جی کے اس نظریے پر مبنی ہے کہ "قدرت ہر شخص کی ضرورتیں پوری کرتی ہے ہر شخص کا لالچ نہیں" لالچ کا بڑھنا ہی ہمارے قدرتی نظام کو نقصان پہنچاتا ہے۔ شمسی توانائی کے استعمال اور ماحولیات کے لیے مددگار زراعت پر مبنی سدابہار سبز انقلاب ہم سب کے لیے ایک پیداواری اور صحت مند زندگی کی ضمانت ہوسکتا ہے۔ ●

بقیہ۔ جنگلوں کو آگ سے کیسے بچایا جائے

میں آنا چاہیے۔

(۶) ترسیلی نظام کے ساتھ ساتھ ان کے نقل و حمل کا بھی عمدہ انتظام ہونا چاہیے تاکہ وہ جائے حادثہ پر بلا تاخیر پہنچ سکیں۔ اس کے لیے پہاڑی علاقوں میں ڈویژنل لیول پر ہر ڈی۔ ایف۔ او کے پاس کم از کم ایک اضافی جیپ ہونا چاہیے۔

(۷) گاؤں کے لوگ آگ بجھانے میں مدد کر پائیں یا نہ کر پائیں انھیں عمارتی لکڑی لے جانے کے جائز حق سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔

(۸) ریاستی سرکار اس بات کو یقینی بنائے کہ جنگلات کے آگ سے تحفظ کے کاموں کے لیے محکمۂ جنگلات کو کافی فنڈ فراہم ہو۔ اس مقصد کے لیے فنڈ مرکز کے تعاون سے چلنے والی اسکیم کے ذریعہ فراہم کیا جائے۔ ●

پانی اور پائیدار ترقی

پانی کی صورتِ حال کے اس جائزے میں مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستان میں پانی کے وسیلے کو فروغ دینے پر زیادہ توجہ رہی ہے جب کہ اس کے کارگر مساویانہ اور مضبوط بنیادوں پر استعمال پر کم توجہ دی گئی۔ بالخصوص سماج کے کمزور طبقات کے لیے پینے کے پانی کی ضرورت، عوامی سطح پر اس سلسلے میں معلومات بہم پہنچانے، زمینی پانی کے بے روک ٹوک استعمال اور سطحی پانی کے خراب معیار پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں منصوبہ بند کوششوں کی تجویز پیش کرتے ہوئے مصنف نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آبی وسائل کا انتظام و انصرام اور ملک کو خوراک کے سلسلے میں تحفظ فراہم کرنے کا انحصار اسی نقطۂ نظر پر ہوگا۔

ہندوستان کی ترقی میں پانی کی بڑی اہمیت ہوگی۔ میں نے کہیں اور یہ بتایا ہے کہ اب مزید قابل کاشت زمین نہیں ہے لہٰذا ملک میں زراعت کی ترقی زیادہ فصلیں اُگاکر یا بہتر تکنالوجی کو بروئے کار لاکر ہی ممکن ہے۔ دوسری طرف خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہونے کی ضرورت، ملک میں زرعی اشیا کی مانگ میں گوناگوں اضافے جس میں اناج سے زیادہ غیر اناج فصلوں کی مانگ زیادہ ہوگی کے پیش نظر مانگ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس کے علاوہ زرعی اشیا کی برآمدات میں ۱۲ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے جو جاری رہے گا۔ زیادہ فصلیں اُگانے اور نئی تکنالوجی استعمال کرنے دونوں معاملوں میں پانی کی کلیدی حیثیت ہے۔ لیکن ہم پانی کے انتظام و انصرام سماجی تنظیموں معاشی پالیسیوں اور تکنالوجی کو اس طرح مربوط نہیں کرتے جیسے ہمیں کرنا چاہیے۔

پینے کے پانی اور غیر زرعی صارفوں کے پانی کے استعمال کے سلسلے میں بھی یہی صورت حال ہے۔ اس کوشش میں سائنس اور تکنالوجی کو اہم رول ادا کرنا ہے۔

زمین اور پانی دو اہم ترین وسیلے ہیں جن پر کسی ملک کی مجموعی ترقی منحصر ہوتی ہے۔ ان کے درمیان مضبوط رشتہ اور سماجی و ماحولیاتی نظام کے دیگر عناصر پر باہمی انحصار اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ ترقی کی کسی بھی کوشش میں ان وسائل کی مرکزی حیثیت ہونی چاہیے۔ پانی کے شعبہ میں اب تک ہندوستان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اس وسیلے کو فروغ دیا جائے۔ اس کے کارگر مساویانہ اور پائیدار استعمال کو یقینی بنانے پر بہت کم توجہ دی گئی۔ سطحی پانی کے وسیلے پیدا کرنا اور آب پاشی کی معاون نہروں کا جال بچھانا ہماری پانی کے انتظام کی حکمت عملی کی بنیاد رہا ہے۔ جہاں نہریں نہیں ہیں وہاں سطحی پانی سے کام لیا جا رہا ہے۔ ایک ایسی عجیب صورت حال پیدا ہوگئی ہے جہاں نہروں کے پانی کے وسیلوں کے پاس پانی زیادہ ہے اور زمین میں کھاری پن آگیا ہے جب کہ دوسرے علاقوں میں پانی کی سطح گر رہی ہے۔ تقریباً ۸ر۵ ملین ہیکٹیئر علاقے میں پانی بھرا ہوا ہے جب کہ ۲۴۲ بلاک سطحی پانی کے بہت زیادہ استعمال کا شکار ہیں۔ ہمارے زمین کا بڑا خطہ زمین کے کٹاؤ اور پیڑوں کے کم ہونے کی وجہ سے زمین کا بھاری نقصان ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دلچسپ بات ہے کہ جو لوگ ان مسائل کی بات کرتے ہیں وہ ملک میں ہی دستیاب ان مسائل کے حل پر بہت کم غور کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے مطالعات میں پانی بھر جانے کے تاریخی واقعات کا ذکر ہے لیکن WAP COS کے ذریعہ ... کے دوسرے مرحلے کی منصوبہ بندی یا سردار سرو ور پروجیکٹ کے نہروں کے جدید ترین انتظام کا

ذکر نہیں ملتا۔ حال ہی میں مجھے میکونگ کے طاس کے سلسلے میں مربوط تکنیکی و معاشی منصوبہ بندی کی ایک دلچسپ مثال ملی جس کا ذکر ضروری ہے اس لیے بھی کیوں کہ اس سے ہندوستان کے تکنیکی کارنامے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپریل ۱۹۹۶ء میں میکونگ ندی کمیشن اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) نے میکونگ طاس کے لیے طویل مدتی بنیادی منصوبہ بندی کے لیے تبادلہ خیالات کرنے کے لیے ماہرین کی ایک میٹنگ منعقد کی چار ممالک سے ندی کی گھاٹیوں کی منصوبہ بندی کرنے والے ماہرین مدعو کیے گئے جنھیں نئے منصوبے بنانے کا تجربہ تھا۔ ان میں ایک آسٹریلین تھے جنھیں مرے ڈارلنگ منصوبہ پیش کرنا تھا۔ ایک برازیل کے تھے جنھیں ساؤ پاؤلو ندی کا منصوبہ پیش کرنا تھا، ایک اسپین کے تھے جنھیں اسپین کا قومی آبی منصوبہ پیش کرنا تھا۔ مجھے سردار سرور منصوبہ پیش کرنا تھا، اس منصوبہ کو بین اقوامی سطح پر آبی وسائل کی منصوبہ بندی کی غیر معمولی کوشش تسلیم کیا گیا ہے۔ میں اس معاہدے کے تین پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ میکونگ ندی کے ممالک میانمار، تھائی لینڈ لاؤس، ویتنام، کمبوڈیا اور چین نے ۱۹۹۳ء میں میکونگ ندی کے استعمال اور ترقی کے لیے ایک سمجھوتہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ میکونگ پر جھگڑوں کی لمبی تاریخ ہے اور ماضی قریب میں بھی اس پر جنگیں لڑی گئیں۔ اس معاہدے میں آبی وسائل کی کارکردگی اور ترقی کے ضوابط ہیں۔ اس معاہدے کا دوسرا دلچسپ پہلو میکونگ سے فیضیاب ہونے والے ممالک کے آبی حقوق کا مفصل بیان ہے۔ تین مثالیں اس کو واضح کریں گی۔ اس معاہدے میں میکونگ میں سیلاب کے زمانے میں ٹونلے سیپ جھیل میں دریا کے الٹے بہاؤ کی کم از کم ضرورت سے متعلق شق۔ یہ بڑی ہی دلچسپ چیز ہے کہ جھیل میں دریا کے الٹے بہاؤ کو بین اقوامی منظوری حاصل ہے۔ آج سے ۲۰ برس قبل آبی وسائل کے سلسلے میں اتنی باریک باتوں اور تفصیلات کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ آبی حقوق کو نظر انداز کرنے کی مثالیں ہیں مثلاً گجرات میں سیہو پانی کے حقوق کا معاملہ چنتی کا کاوید یا نے بجا طور پر اٹھایا تھا۔ دوسری مثال میکونگ معاہدے میں مسائل کے حل کے لیے سہ رخی نقطہ نظر ہے۔ اعلاترین سطح پر اس کمیشن میں اعلا سیاسی شخصیات شامل ہیں جن میں شریک ممالک کے نائب وزرا اعظم ہیں۔ یہ لوگ اس معاہدے کے نفاذ میں آنے والے سیاسی مسائل کو حل کرتے ہیں اور کمیشن کو اپنے کام کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ دوسری سطح پر کمیٹی میں ایک طریقہ کار ہے۔ جس کے تحت پروگراموں کی تفصیلاً وضع کی جاتی ہیں۔ تیسری سطح پر عمل درآمد کرنے والی کا گروپ ہے جو پہلی سطح پر طے شدہ منصوبہ اور دوسری سطح پر ماہرین کے ذریعہ لیے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کرتے ہیں۔

لیکن ہم اپنے آپ کو ان مسائل میں الجھا لیتے ہیں۔ ہائیڈرولوجی کا معاملہ لیجیے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اے پی سی کا چیرمین تھا اور بعد میں بی آئی سی پی کا چیرمین تھا تو عدالتیں تکنیکی معاملوں میں کبھی بھی خود مختار تکنیکی کمیٹیوں یا کمیشنوں کی رائے پر سوالیہ نشان نہیں لگاتی تھیں۔ لیکن آج جس طرح مرکزی آبی کمیشن کی پانی سے متعلق کی گئی تحقیق پر عوامی سطح پر اظہار خیال کیا جاتا ہے وہ حیرتناک ہے۔ وہ لوگ جو مافٹ اور کیوسک کے درمیان فرق بھی نہیں جانتے وہ پانی کی دستیابی یا عدم دستیابی سے متعلق فیصلے صادر کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہزاروں کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری رک جاتی ہے یا پھر پانی کا استعمال صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا۔ سائنس کے ماہرین کی میٹنگ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے سوالات پر غور کرنے کے لیے تکنیکی معیار وضع کرے۔

نہروں کے انتظام کے کامیاب پروجیکٹوں پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح زرعی اور معاشی اعداد و شمار کو کنٹرول اور ضابطہ بندی کا نظام وضع کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ میں ماڈلنگ کے اعتبار سے کافی عرصہ قبل اظہار خیال کر چکا ہوں اور رتن دیسائی کمیٹی اسے منصوبہ بندی کے معیار کے طور پر مقرر کر چکی ہے۔ لیکن سافٹ ویئر ماڈلنگ کے لیے معاون اشیا، کے استعمال کے معیار مستثنیات میں شامل ہیں۔ بہت کم گروپوں کو یہ پتا ہے کہ زمین آب و ہوا اور کسانوں کے معاشی ردعمل کو عوام تک سہولتوں کو پہنچانے کے نظام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ معاشی پیمانوں کی بنیاد پر کیا گیا کام جو ہندوستانی کسانوں کے برتاؤ کی یکسانیت کو واضح کرتا ہے وہ فرانس کے بڑے فارموں اور امریکن کیلی فورنیا ایکواڈکٹ کے بہ آسانی دستیاب شیڈیولس کا نعم البدل بن سکتا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ بیرون ہند ہندوستان کے اس تکنیکی کام کو سراہا گیا ہے جس نے ایشیا کی کسانوں کی معیشت کو آب پاشی کے جدید نظاموں کے ڈیزائن سے مربوط کیا ہے جو بنیادی طور پر مغرب میں وضع کیا گیا تھا۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ میکونگ طاس کی بنیادی طویل مدتی منصوبہ بندی کے سلسلے میں منعقدہ پہلے جلسے میں اختتامی کلمات میں نرمدا سے متعلق مندرجہ ذیل کا ذکر تھا:

"میں ڈاکٹر الگم نے اجلاس ہی میں اس بات کی بہترین مثال پیش کی کہ کس طرح زرعی اور معاشی بنیاد پر شمار کرنے کے ماڈلوں کو آبی وسائل کی منصوبہ بندی میں استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی مدد سے آب پاشی کے بڑے نظاموں کو ڈیزائن کیا جاتا ہے اور ان کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مسٹر ہارٹ نے کیلی فورنیا کے آبی منصوبے کو پیش کرتے ہوئے اس بات کا اشارہ دیا کہ کس طرح شہری معاشی شماریات کے ماڈلوں کی مدد سے شہروں کی پینے کی پانی کی

ضروریات کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سبھی قسم کے ماڈلوں کی تیاری کے لیے اعداد و شمار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان اعداد و شمار کا صحیح ہونا ضروری ہے تب ہی یہ کارآمد ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر لوکس نے کہا، غلط ماڈل اکثر آبی وسائل کی منصوبہ بندی کی تشریح میں کام آتے ہیں۔ لیکن یہ آبی وسائل کی جامع اور مربوط منصوبہ بندی کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

مختصراً کمپیوٹر ماڈل اکثر کم پانی اور کم لاگت سے آبی منصوبہ بندی کے ماہرین کو بڑے کارنامے انجام دینے میں مدد دیتے ہیں۔

مرے ڈارلنگ، کیلی فورنیا اور اسپین کے منصوبوں میں پن بجلی کے ذخیروں، آب پاشی کے نظاموں اور نقل و حمل کی سہولتوں کے ذریعہ معاشی ترقی کا فروغ خاص مقام کا حامل رہا۔ حالیہ نرمدا اور یانگتزے دریاؤں کے منصوبوں میں یہ مرکزی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ گنگا کے پانی کی تقسیم کے معاملے میں ہم نے گفت و شنید کے بعد اپنے مسائل کو حل کیا ہے اور اب ایک ایسا معاہدہ موجود ہے جس کے تحت پانی کے بٹوارے کے معاملے میں عملی طریقہ کار اپنایا جاسکتا ہے جو دونوں ہی ممالک کے لیے مفید ہے۔ اس کے علاوہ توانائی اور دور مواصلات کے شعبوں میں بھی مشترکہ پروجیکٹوں کی خبر ہے۔ بعض گروپ جن کے اپنے مقاصد ہوتے ہیں ان کے لیے یہ آسان بات ہے کہ وہ سماج کے لیے فائدے مند آبی پروجیکٹوں کو رکوادیں اور اس سلسلے میں لوگوں کے جذبات بھڑکا دیں۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ اس طرح کے گروپوں نے آبی وسائل کی ترقی کے پروجیکٹوں میں رکاوٹ ڈال کر تاخیر کرادی اور عوام ان پروجیکٹوں سے استفادہ حاصل کرنے سے محروم رہے۔ آبی وسائل کے پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی میں سماجی تنظیموں کی بڑی اہمیت ہے۔ آبی وسائل کے اچھے پروجیکٹوں میں عوامی تنظیموں کی شمولیت ہونی چاہیے تاکہ ان کی لاگت کا ایمانداری سے اندازہ لگایا جاسکے اور ان کے فوائد گاؤں اور قصبات کے لوگوں تک پہنچ سکیں۔ اس طرح عوام پر امداد باہمی کے فوائد ظاہر ہوسکتے ہیں اور گمراہ کرنے والے اور سماج کو توڑنے والے عناصر سے بچا جاسکتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ کاویری ندی کے پانی کی تقسیم سے متعلق کام جو مجھے پچھلے برس سونپا گیا تھا جب میں نے فریقین کو یہ سمجھا دیا کہ کرناٹک میں اس ندی کے چار ذخیروں میں اکتوبر کے نصف آخر میں ۳ کیومک پانی کا اضافہ ہوتا ہے۔ جب کہ اس برس پانی دو کیومک کم آیا۔ اس طرح ۵ کیومک پانی کی کمی پڑی جو مسئلہ کی اصل وجہ تھی اور اس نقصان کو سب کو برداشت کرنا چاہیے۔ سینئر افسران نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں فیلڈ میں نہ جاؤں لیکن میں نے ان کے مشورے کو نہ مانتے ہوئے تمل ناڈو کے تھانجاوور ضلع میں تقریباً ۷۰۰ کلومیٹر کا سفر طے کیا اور اتنی ہی مسافت کرناٹک میں گارڈن علاقوں میں طے کی۔ ایک مرتبہ بھی مجھے اپنے کام کے سلسلے میں غیر منطقی ردعمل دیکھنے کو نہیں ملا۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ آبی مسائل کے سلسلے میں معلومات فراہم کرنے، کھلے پن اور سماجی دلچسپی پیدا کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ ایسی صورت حال پیدا کرنے کے لیے ہم نے ایک بلو ربن کمیشن تشکیل دیا ہے جس کا دائرہ اختیار حسب ذیل ہوگا۔

——— پینے، آب پاشی، صنعتی استعمال، سیلاب پر قابو پانے اور دیگر کاموں میں استعمال میں آنے والے آبی وسائل کو ترقی دینے کے لیے مربوط آبی منصوبے کی تیاری۔

——— دریاؤں کو آپس میں جوڑ کر پانی کی کمی والے علاقوں کو فاضل پانی والے علاقے سے پانی پہنچانے کے طریقہ کار تجویز کرنا۔

——— موجودہ اور نئے پروجیکٹوں کی نشاندہی جنھیں ترجیحی بنیادوں پر مکمل کیا جانا ہے۔ ان کی تکمیل کے مختلف مراحل طے کرنا۔

——— زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کرنے کے لیے پانی کے شعبے میں تکنیکی اور بین موضوعاتی تحقیق کی نشاندہی۔

——— پانی کے شعبے کے لیے جگہ اور مالی وسائل پیدا کرنے کے طریقے تجویز کرنا۔

——— کوئی اور متعلقہ معاملہ۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کمیشن ان مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہوگا۔

آبی حقوق

آبی حقوق کا سوال نہایت اہم ہے۔ ۱۹۸۷ء کی آبی وسائل سے متعلق قومی پالیسی میں پینے کے پانی کو اعلاترین ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن یہ ترجیح ابھی عملی شکل اختیار نہیں کرسکی ہے۔ ایسے بھی پروجیکٹ ہیں جہاں نہروں کے نظام کے بالائی علاقوں سے پانی لے کر دور دراز علاقوں تک پہنچایا گیا۔ آب پاشی کے پروجیکٹوں کے سلسلے میں اکثر یہ معاملہ اٹھایا گیا کہ پانی کو صنعتوں کے استعمال میں لایا گیا جب کہ پینے کے پانی اور زراعت میں استعمال ہونے والے پانی کی ضروریات کو نظرانداز کردیا گیا۔ بعض معاملوں میں منصوبہ بندی کے وقت قومی آبی پالیسی کی ترجیحات کو منصوبہ بندی کے وقت مدنظر نہیں رکھا گیا۔ دیگر معاملوں میں صاحب حیثیت اور صاحب اقتدار گروپ وسائل کا رخ ایسی جانب موڑ دیتے ہیں جس کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔ زیر زمین ایکوی فائرس کے معاملے میں یہ صورت حال زیادہ سنگین ہے۔ جن لوگوں کے پاس وسائل ہیں وہ آبی پروجیکٹوں کا تجربہ کرسکتے ہیں جب کہ ایسے لوگ جن کے پاس وسائل

نہیں ہیں، تالابوں اور ٹیوب ویلوں میں اپنے حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کا تکنیکی حل یہ ہے کہ ایکوی فائر کے انتظام کے ماڈل تیار کیے جائیں۔ اگر پانی استعمال کرنے والے لوگوں کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہے اور سماج کے مختلف طبقات کے پاس آبی حقوق نہیں ہیں تو لوگوں کی پانی، کھانے اور چارے کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ دیہات میں طاقتور گروپوں نے گاؤں میں تالاب کے چاروں طرف کی جگہ خرید لی اور دیگر افراد کو پانی استعمال کرنے سے روک دیا۔ اکثر ساحلی علاقوں میں پانی کے کھارے پن کے سبب ہیوی ڈیوٹی پمپوں کے ذریعہ پانی کھینچنا پڑتا ہے جس سے دیہات میں پریشانی ہوتی ہے۔

یہ کہا جا رہا ہے کہ بہت سی جگہوں پر پینے کے پانی کی دستیابی کی ذمہ داری نجی شعبہ کے سپرد ہوگی۔ ایک حالیہ مطالعہ کے مطابق وڈودرا شہر کی پانی کی ۲/۵ ضروریات نجی وسیلوں سے پوری کی جاتی ہیں، اس سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ جو لوگ پانی حاصل کرنے کی مالی قوت نہیں رکھتے وہ کس طرح اس بنیادی ضرورت کو پورا کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ جو لوگ پانی کے حصول کی قیمت ادا کر سکتے ہیں انھیں یہ ادا کرنی چاہیے لیکن جو لوگ اس پانی کو نہیں خرید سکتے ان کی ضروریات بھی پوری کی جانی ہیں۔ اسی سے مقامی آبی نظام کے انتظام کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس کے لیے مالی امداد یا سبسڈی درکار ہے تو وہ ترجیحی بنیادوں پر دی جانی چاہیے۔ متحدہ محاذ حکومت کے کم از کم بنیادی خدمات کے پروگرام میں، بجا طور پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سب لوگوں کو پینے کا پانی بنیادی ضرورت کی تکمیل کے طور پر دیا جائے گا۔ اس پروگرام کو جولائی ۱۹۹۶ء میں وزرائے اعلا کی کانفرنس میں قطعی شکل دی گئی تھی۔ اس کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دیہی اور شہری علاقوں میں پینے کے محفوظ پانی کی سو فی صد دستیابی۔
۲۔ دیہی اور شہری علاقوں میں صحت کی دیکھ بھال کی بنیادی خدمات کی سو فی صد دستیابی۔
۳۔ ہر ایک کو پرائمری تعلیم۔
۴۔ بے مکان غریب خاندانوں کو مکانات کی فراہمی میں امداد۔
۵۔ تمام دیہی بلاکوں اور شہری جھگی جھونپڑیوں میں اور کمزور طبقات کے لیے اسکولوں میں دوپہر کے کھانے کی فراہمی۔
۶۔ تمام ایسے دیہات اور بستیوں کو جو ابھی تک دیگر علاقوں سے الگ تھلگ ہے، جوڑنا۔
۷۔ راشن کی تقسیم کے نظام کو اس طرح درست کرنا کہ اس میں غریب افراد پر توجہ دی جائے۔

ان نشانوں کو ۲۰۰۰ء تک پورا کیا جانا ہے لیکن ہر ریاست کو اگلے دو برس میں تین مقاصد پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ پینے کا پانی اور تعلیم خاص توجہ کے حامل ہیں گو اس سلسلے میں انتخاب ہر ریاست کو خود کرنا ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تکنالوجی کے سلسلے میں اس میٹنگ میں عملی پہل ہونی چاہیے۔

عوام پانی کی حفاظت اور ترسیل کی اسکیموں کے خواہش مند ہیں۔ ہر تعلقہ میں پانی کی ترقی کی ایسی حکمت عملی پر عمل کرنے کی ضرورت ہے جس میں پانی کی ضرورت مقامی طور پر پوری ہو سکے۔ آٹھویں منصوبے میں پانی کے انتظام کے قومی پروجیکٹ میں دکھایا گیا تھا کہ تین ہزار روپیہ فی ہیکٹیئر سرمایہ کاری سے نچلے درجے کے نہروں کے نظام گجرات کے آب پاشی کے نظام میں اچھی اور زیادہ پیداواریت دے سکتے ہیں۔ نویں منصوبے میں دس ملین ہیکٹیئر تک کا نشانہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ زرعی اور موسمی اعتبار سے ہر خطے کے لیے آب پاشی کا منصوبہ بنایا گیا ہے اس کو مفصل بنانے اور اس پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا کسان پانی کی قیمت ادا کرے گا۔

یہ ایک نظری سوال ہے کیوں کہ دراصل وہ قیمت ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر مہسانا ضلع میں کیے گئے مطالعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح بجلی کارپوریشنوں کو اپنے سرمایہ کاری پر اچھا منافع مل رہا ہے اور وہ پانی کی اچھی قیمت وصول کرتے ہیں۔ جب بجلی نہیں ہوتی تو کسان پمپ سے پانی کھینچنے کے لیے ڈیزل پر خرچ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں کسان پانی کی مناسب قیمت ادا کرے گا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ لیک ہونے والے آب پاشی کے نالوں اور پانی اور بجلی کی غیر متواتر اور خراب سپلائی کے لیے پیسہ نہیں ادا کرے گا لیکن اگر اس کی ضروریات پوری ہو جائیں تو وہ ضرور قیمت ادا کرے گا۔ اسی لیے میرے خیال میں دیہی سطح پر غیر مرکوز سطح پر پانی کا انتظام بہت اہم ہے اور یہ قابل عمل بھی ہے۔ نچلی سطح پر امداد باہمی کے ادارے اور کسانوں کی تنظیمیں اس سلسلے میں کامیابی حاصل کر سکتی ہیں بشرطیکہ پانی کی سپلائی کی تکنالوجی میں اس کی گنجائش ہو اور سماجی تنظیمیں ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

پانی کی بچت کرنے والے آلات بالخصوص ڈرپس اور سپرنکلرس کے معاملے میں ہندوستان بہت پیچھے ہے۔ ایسے بہت سے دلچسپ پروجیکٹ ہیں جو پانی کی بچت کے ایسے آلات کو آب پاشی کی نہروں سے جوڑنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ہمیں لاکھوں ہیکٹیئر زمین میں ایسے منصوبوں کی ضرورت ہے۔ شہری علاقوں میں پانی کے دوبارہ استعمال کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ساحلی علاقوں میں بہت سے صنعتی پروجیکٹوں میں پانی کا

کھارا پن دور کرنے کا انتظام ہے۔ دیگر علاقوں میں بھی ایسی ہی کوششوں کی ضرورت ہے۔

زمینی پانی کی بہ آسانی دستیابی اور اس کے قابل بھروسہ ہونے، پمپوں کی تیار اور بر مائی کی تکنالوجی کی آسانی سے دستیابی کے پیش نظر اس قابل تجدید وسیلے کے استعمال پر زیادہ زور دیے جانے کی توقع ہے۔ زمینی پانی کے بہت زیادہ استعمال سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ ہریانہ، پنجاب، گجرات، کرناٹک اور تمل ناڈو میں سامنے آئے ہیں۔

پانی کی مقدار کے ساتھ ساتھ اس کے معیار کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔ صنعتی فضلات، بڑھتی ہوئی آبادی اور شہروں کا تیز پھیلاؤ سطحی پانی کے معیار کو گرا رہا ہے۔ اسی طرح زراعت میں استعمال ہونے والی کیمیاوی اشیاء اور کیمیاوی کھادوں کے استعمال سے زمینی پانی کے معیار پر برا اثر پڑ رہا ہے۔

اس صورت حال نے مجموعی نقطہ نگاہ اپنانے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے جس کے تحت زمین اور پانی کو ایک ہی حرکی نظام کے حصہ کے طور پر دیکھا جائے۔ تمام ہائیڈرولوجیکل عوامل میں پن دھارا رابطے کا قدرتی ذریعہ ہے اور اسی کے ذریعہ آبی وسائل کی زیادہ سے زیادہ ترقی ہو سکتی ہے۔

اختتامیہ

حکومت نے مختلف اقدامات کیے ہیں جن کے ذریعہ مربوط طریقہ کار اپنایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۷ء کی قومی آبی پالیسی اور زمین کے استعمال سے متعلق پالیسی کے مسودے دونوں میں ہی مربوط انتظام کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں منصوبہ بندی کمیشن نے آب و ہوا کے اعتبار سے زراعت کے سلسلے میں جو پروجیکٹ شروع کیا تھا اس کا مقصد بھی اسی تصور کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ اس طرح ہندوستان کو آب و ہوا، طبعی اور انتظامی بنیاد پر آب و ہوا کے اعتبار سے زراعت سے متعلق ۱۵ زونوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ زرعی تحقیق کی کونسل نے زرعی ماحولیات کے اعتبار سے زون بنانے کے تصور میں زمینی اعداد و شمار اور ترقی کے عنصر کو بھی شامل کیا ہے۔ حکومت ہند، آبی وسائل، زراعت، دیہی علاقوں اور روزگار اور ماحولیات اور جنگلات کی وزارت میں مختلف پروگراموں کے ذریعہ پن دھارا کے انتظام کے تصور کو عام کر رہی ہے۔

حکومت کی کوششوں میں امداد دینے کے لیے رضاکار اداروں کو بھی اس کام میں شامل کرنے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ گجرات، مہاراشٹر اور راجستھان میں اس سلسلے میں خاصی کامیابی ملی ہے اور اس سے آبی انتظام میں عوامی شرکت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رالے گاؤں سدھی، سکھو ماجری اور پانی پنچایتوں کی کوششیں رہنمایانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ حکومت نے آبی وسائل کی قومی کونسل اور زمین کے استعمال سے متعلق قومی بورڈ کے ذریعہ مرکز اور ریاستی حکومتوں کے درمیان تال میل کا طریقہ کار وضع کیا ہے۔ یہ تمام کوششیں قابل تعریف لیکن اس سلسلے میں پیش رفت کی موجودہ رفتار کی روشنی میں مزید کوششیں کرنے اور تیزی سے نتائج حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ تحقیق اور تدریس کے شعبہ سے وابستہ افراد کو اپنی کاوشوں میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے اور ایسے طریقے وضع کرنے چاہئیں جن سے عوام کی خواہشات کو سائنسی برادری سے مود مل سکے۔ سائنس اور تکنالوجی کے محکمے نے ایسے پروگرام وضع کیے ہیں جن کا تعلق قدرتی وسائل کے انتظام اور دیگر سماجی معاملات سے ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کے محکمے کے پاس، محکمہ موسمیات، درمیانہ رینج کی موسمی پیش گوئی کے قومی مرکز اور سروے آف انڈیا جیسے ادارے ہیں جو ایک ایسا مربوط ڈھانچہ فراہم کر سکتے ہیں جس سے پانی کے شعبہ میں کام کرنے والے ادارے اپنے مسائل پر تبادلہ خیال کر سکیں اور ان کے ممکنہ حل تلاش کر سکیں۔ آبی وسائل کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور ملک کو خوراک کے معاملے میں تحفظ فراہم کرنے کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسی ہی مربوط کوششوں کی ضرورت ہے۔ پانی امرت ہے اسے پیاس بجھانے اور جھگڑے مٹانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

●

بقیہ: آزاد ہندوستان میں اقلیتوں کی پیش رفت

تبدیلیاں آئی ہیں۔ اقتصادی کھلے پن اور مواصلات و اطلاعات کے میدان میں انقلابی پیش رفت نے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی کارکردگی کے زمین و آسمان بدل کر رکھ دیے ہیں۔ یہ دنیا اطلاعات کی شاہراہ عظیم یعنی انفارمیشن سپر ہائی وے کی ہے جس پر آدمی کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیت اور اس کے حواس و عقل کی بیداری ہی اسے قائم رکھ سکتی ہے۔ اس عالم میں شکوے شکایتیں اور آہ و بکا صرف اپنی شکست کو آواز دینا ہے۔ آج کا وقت ہر نفی میں اثبات، ہر انتشار میں تنظیم، ہر انہدام میں تعمیر اور ہر افتراق میں اتحاد کی جستجو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ہندوستان کی اقلیتیں بھی پوری قوم کے ساتھ، اس کی تقدیر سے پیوست اور اس کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوکر، اس کے مسائل کو محسوس کرتے ہوئے ان کے حل کے اجتماعی کوششوں کی صورت میں ہی اپنے مقصود کو حاصل کر سکتی ہیں۔ اقلیتوں نے مایوسی کے تمام پیغام بروں کی نفی کرتے ہوئے ہمیشہ اثبات کا انتخاب کیا ہے اور آئندہ ایسا نہیں ہوگا یہ سوچنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

آر.سی. شرما

دریاؤں کی صفائی اور تحفظ

ملک کے چودہ دریاؤں میں سے بیشتر دریاؤں کا پانی انسانی سرگرمیوں میں اضافہ اور صنعتوں کے غیر منصوبہ بند قیام و ترقی کے سبب آلودہ ہو چکا ہے۔ گنگا ایکشن پلان کے ایک افادیتی جائزہ میں کہا گیا ہے کہ اس پلان سے ٹھوس نتائج برآمد ہوئے ہیں اور یہ پلان دوسرے دریاؤں کے لیے بھی موزوں ہے۔ تاہم ایسے پروگراموں کے جاری رہنے کا دارومدار مالیات پر ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ریاستوں کو مرکز کے مشورے سے وسائل جٹانے کے تدابیر سوچنے ہوں گے۔

کرہ ارض پر زندگی کے لیے پانی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس قیمتی شے کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ دریا ہیں۔ انسانی سرگرمیوں میں بے پناہ اضافہ اور ۸۰ کی دہائی کے ابتدائی سالوں تک صنعتوں کے غیر منصوبہ بند قیام و ترقی کے سبب ہندوستان کے دریاؤں پر بہت دباؤ پڑا ہے اور ان کا پانی آلودہ ہوگیا ہے۔ یہ مسئلہ دو باتوں سے اور پیچیدہ ہوگیا ہے ایک تو وقت اور رقبہ کے لحاظ سے پانی کی غیر مساوی تقسیم اور دوسرے آبپاشی کی ضرورتوں کے لیے دریاؤں کے بالائی حصوں میں ہونے والا انتزاع۔

ہندوستان میں ۱۴ بڑے دریا ہیں جن میں سے زیادہ تر دریاؤں کے کسی نہ کسی حصے میں آلودگی پیدا ہو چکی ہے۔ گنگا کو سب سے زیادہ آلودہ دریاؤں میں شمار کیا گیا۔ مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ نے ۱۹۸۴ء میں بتایا تھا کہ اس دریا کی ۷۵ فی صد آلودگی کا سبب اس کے کنارے واقع بڑے اور متوسط شہروں کے میونسپل سیویج کا کیمیاوی عمل سے گزار کر صاف کیے بغیر دریا میں چھوڑا جانا اور باقی ۲۵ فی صد آلودگی کی وجہ صنعتوں کے صاف شدہ یا غیر صاف شدہ کچرے اور بے کار مادوں کا دریا میں بہایا جانا ہے۔ مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ دریا میں دیگر وجوہات مثلاً رفع حاجت کے لیے استعمال کیے جانے والے میدانوں، کوڑے کے ڈھیروں اور کھیتوں وغیرہ سے بہہ کر آنے والے گندے پانی، جلی یا ادھ جلی لاشوں اور مردہ جانوروں کے دریا میں بہائے جانے اور جانوروں کو دریا میں نہلانے وغیرہ سے پیدا ہونے والی آلودگی کی مقدار یا تناسب کا تعین کرنا مشکل ہے۔

انسانی سرگرمیوں میں بے پناہ اضافہ اور ۸۰ کی دہائی کے ابتدائی سالوں تک صنعتوں کے غیر منصوبہ بند قیام و ترقی کے سبب ہندوستان کے دریاؤں پر بہت دباؤ پڑا ہے اور ان کا پانی آلودہ ہوگیا ہے۔

ہندوستان میں دریاؤں کی صفائی کا پروگرام جون ۱۹۸۵ء کو شروع ہوا تھا جب اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے "گنگا ایکشن پلان" کا آغاز کیا تھا۔ یہ پروگرام حکومت ہند کی وزارت ماحولیات و جنگلات کے زیر اہتمام شروع کیا گیا تھا اس کے لیے فنڈ بھی وہی مہیا کرتی ہے۔ اب اس پروگرام کی توسیع دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام کے تحت ملک کے دوسرے آلودہ دریاؤں پر بھی کر دی گئی ہے۔

اغراض و مقاصد

گنگا ایکشن پلان کا خاص مقصد آلودگی پیدا کرنے والے مادوں کے داخلے کو روک کر دریائے گنگا کے پانی کی کوالٹی بہتر بنانا ہے۔

ہندوستانی دریاؤں کے لیے مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ کے مقرر کردہ بہترین استعمال کے معیار کے مطابق دریائے گنگا کے پانی کی بہترین مقرر کردہ مطلوبہ کوالٹی "نہانے کے زمرہ" کی ہے جس کے لیے دیگر خصوصیات کے علاوہ تین ایم جی/ایل (زیادہ سے زیادہ) کی بایو کیمیکل ڈیمانڈ (بی او ڈی) اور پانچ ایم جی/ایل (کم سے کم) حل شدہ آکسیجن کا ہونا ضروری ہے۔

ہندوستان میں ۱۴ بڑے دریا ہیں جن میں سے زیادہ تر دریاؤں کے کسی نہ کسی حصے میں آلودگی پیدا ہو چکی ہے۔ گنگا کو سب سے زیادہ آلودہ دریاؤں میں شمار کیا گیا۔

ایکشن پلان ان ۲۵ شہروں کے ۱۳۴۰ ملین لیٹر یومیہ کے میونسپل سیوریج میں سے اندازاً ۸۷۳ ملین لٹر یومیہ (یہ دونوں اعداد و شمار سال ۱۹۸۵ء کے ہیں) سیوریج کو روک اور ان کا منہ موڑ کر کیمیاوی عمل سے صاف کرنے پر سب سے زیادہ توجہ مبذول کرنا ہے۔ باقی ماندہ سیوریج پر گنگا ایکشن پلان کے دوسرے مرحلے میں توجہ دی جائے گی، جو اب چل رہا ہے۔ پروگرام میں اوپر بیان کی گئی دیگر وجوہات کے سبب آلودگی میں ہونے والے اضافہ کو روکنے کی اسکیمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان اسکیموں کے تحت دریا کے کنارے بنے ہوئے اشنان گھاٹوں کو بہتر بنایا جائے گا اور نئے اشنان گھاٹ تعمیر کیے جائیں گے نیز دریا تک جانے والے راستوں کو حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق صاف ستھرا رکھنے کا انتظام کیا جائے گا۔ دریا میں صنعتوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی پر برابر نگاہ رکھی گئی ہے اور موجودہ ماحولیاتی قوانین کے تحت اس کی روک تھام کی کوشش کی گئی ہے۔

گنگا ایکشن پلان کے تحت آلودگی پیدا کرنے میں معاون وجوہات کو دور کرنے کے لیے ۲۶۱ اسکیموں کی منظوری دی گئی ہے۔ ان میں سے ۸۸ اسکیمیں میونسپل سیوریج کے بہاؤ کا رخ موڑنے کے لیے ۳۵ سیوریج کو کیمیاوی عمل سے صاف کرنے کے لیے، ۴۳ کم خرچ بیت الخلا بنوانے کے لیے، ۲۸ بجلی کے شمشان گھر تعمیر کرنے کے لیے، ۳۵ دریا کے سامنے کے حصے کو بہتر بنانے کے لیے اور ۳۲ دوسرے مختلف مقاصد کے لیے ہیں۔

گنگا ایکشن پلان کے تحت کیپٹل ورکس کی موجودہ منظور شدہ لاگت ۴۶۲٫۰۴ کروڑ روپے ہے۔ سارا فنڈ مرکزی سرکار نے مہیا کیا ہے۔ منظور شدہ لاگت میں عالمی بینک اور نیدر لینڈس کی مہیا کی ہوئی امداد بھی شامل ہے۔

موجودہ صورت حال

اس وقت تک ۲۵۱ اسکیمیں مکمل کی جا چکی ہیں۔ باقی اس اسکیموں میں سے ایک اتر پردیش میں، چار بہار میں اور ۵ مغربی بنگال میں زیر عمل لائی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں دریاؤں کی صفائی کا پروگرام جون ۱۹۸۵ء میں شروع ہوا تھا جب اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے "گنگا ایکشن پلان" کا آغاز کیا تھا۔

پروگرام کے تحت کل ۳۵ سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹس تعمیر کیے جانے ہیں۔ ان میں سے ۲۸ پلانٹ تعمیر کیے جا چکے ہیں اور وہ چالو بھی ہو چکے ہیں۔ باقی سات پلانٹ تعمیر کے آخری مرحلے میں ہیں۔ اس وقت تک ہر روز ۶۸۳ ملین لٹر سیوریج کیمیاوی عمل سے گزار کر صاف کرنے کی صلاحیت پیدا کی جا چکی ہے۔ اگرچہ الہ آباد میں ٹریٹمنٹ پلانٹ ہنوز زیر تعمیر ہے لیکن جب تک یہ پلانٹ مکمل نہیں ہو جاتا اس وقت تک کے لیے اس میں صاف کیا جانے والا تقریباً ۶۰ ملین لٹر سیوریج کھیتی باڑی کے لیے کھیتوں میں پہنچایا جا رہا ہے۔ ایکشن پلان ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء تک مکمل ہو جانا چاہیے تھا لیکن تین ریاستوں میں رفتار عمل سست رہنے کی وجہ سے دس زیر عمل اسکیمیں ۹۸-۱۹۹۷ء میں مکمل کی جائیں گی۔ اس طرح پلان پر عمل درآمد ۹۸-۱۹۹۷ء کے آخر تک مکمل ہونے کی امید ہے۔

۴۶۲٫۰۴ کروڑ روپے کی منظور شدہ لاگت میں سے اس وقت تک تقریباً ۴۴۰٫۲۳ کروڑ روپے مختلف پروگراموں پر صرف کیے جا چکے ہیں۔

گنگا ایکشن پلان کی نوعیت اور حجم کا پروگرام ملک میں پہلی بار شروع کیا گیا ہے۔ اس کے چھ سات سال میں مکمل ہونے کی توقع تھی لیکن اس کی تکمیل میں مندرجہ ذیل وجوہات کے سبب تاخیر ہوئی:

۱۔ چوں کہ یہ اپنی قسم کا پہلا پروگرام تھا اس لیے مرکز اور ریاستوں دونوں ہی سطح پر تجربے کی کمی تھی۔

۲۔ سیوریج ٹریٹمنٹ اور پمپنگ اسٹیشنوں کی تعمیر کے لیے زمین حاصل کرنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔

۳۔ کانپور، الہ آباد اور کلکتہ میں مقدمہ بازی کی وجہ سے بھی عمل آوری میں تاخیر ہوئی۔

۴۔ کلکتہ اور پٹنہ میں جن دو جگہوں پر بڑی تعمیرات ہوئی ہیں وہاں کچھ لوگوں نے کافی عرصے سے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔

۵۔ بہار میں سبھی ۷ سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹوں کے لیے اور مغربی بنگال میں دو پلانٹوں کے لیے کئی بار ٹینڈر مانگنے

پڑے۔ اس کے علاوہ دیگر کئی پروجیکٹوں میں کنٹریکٹ کی تعمیل میں دشواری پیش آئی۔

۶۔ کانپور اور مرزا پور میں نیدرلینڈس سے بیرونی امداد آنے میں کافی دیر ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کو رسمی کارروائیاں پوری کرنی تھیں۔ بہرحال یہ اسکیمیں اب مکمل ہو چکی ہیں۔

> پروگرام میں سیوریج ٹریٹمنٹ سے کارآمد مادے حاصل کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ ان سے ہونے والی آمدنی پروگرام کو جاری رکھنے میں معاون ہو سکے۔

۷۔ اترپردیش اور بہار کی سرکاروں نے ایکشن پلان کے لیے فراہم کیے گئے فنڈس دوسرے کاموں پر صرف کر دیئے جس کی وجہ سے مرکز نے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے مزید رقوم دیر سے جاری کیں۔

نگرانی

گنگا ایکشن پلان کی عمل آوری پر ریاستی اور مرکزی سطحوں پر ایک کثیر سطحی مانیٹرنگ نظام کے ذریعہ نگرانی رکھی جاتی ہے۔

> نامیاتی مادوں کے دریا میں بہائے جانے کے عمل میں گنگا ایکشن پلان کے تحت کافی کمی آئی ہے جو پانی کی کوالٹی بحال کرنے کی جانب پہلا قدم ہے۔

ریاستی سطح:

(۱) فیلڈ انجینیئروں کی ایک ٹیم ہر روز کی کارگزاری پر نگاہ رکھتی ہے۔ (۲) چیف ایگزیکیٹیو سطح پر ماہانہ کارگزاری کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ (۳) ایک ریاستی رہبر کمیٹی جس کا صدر ریاست کا چیف سکریٹری ہوتا ہے رفتار ترقی کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتی رہتی ہے۔

مرکزی سطح:

(۱) دریائی تحفظ کی قومی اتھارٹی (این۔ آر۔ سی۔ ڈی) افسران باقاعدگی سے رفتار عمل کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور معائنہ کے لیے وہ موقع پر بھی جاتے ہیں۔ (۲) ہر تین ماہ بعد ایک مرکزی رہبر کمیٹی جس کا صدر متعلقہ مرکزی وزارت کا چیف سکریٹری ہوتا ہے، رفتار ترقی کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کمیٹی کے اراکین میں متعلقہ ریاستوں کے چیف سکریٹریان اور صحت عامہ سے متعلق انجینیئرنگ اور دیگر شعبوں کے ماہرین شامل ہوتے ہیں۔ (۳) منصوبہ بندی کمیشن کے ممبر برائے ماحولیات کی سربراہی میں ایک مانیٹرنگ کمیٹی ہر تین ماہ بعد پروگرام کے سائنسی اور تکنیکی پہلوؤں اور دریا کے پانی کی کوالٹی پر مختلف اقدامات کے اثرات کا جائزہ لیتی ہے۔ (۴) وزیر اعظم کی زیر سرکردگی دریائی تحفظ کی قومی اتھارٹی رفتار ترقی کا سالانہ جائزہ لیتی ہے۔ اس کمیٹی میں دوسروں کے علاوہ متعلقہ ریاستوں کے وزراء اعلیٰ بھی شامل ہوتے ہیں۔

پروگرام کے تحت تعمیر شدہ اثاثہ جات کے استعمال اور رکھ رکھاؤ کی ذمہ داری بالآخر متعلقہ ریاستی حکومت کی ہوتی ہے۔ تاہم استعمال اور رکھ رکھاؤ کے پورے اخراجات ستمبر ۱۹۸۹ء تک مرکزی حکومت نے ادا کیے اور اس کے بعد مرکزی اور متعلقہ ریاستی حکومت نے نصف نصف کے تناسب سے برداشت کیے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ۲۵٫۳۰ کروڑ روپے کی بالائی حد ختم نہ ہو جائے۔ اب یہ بالائی حد قریب قریب ختم ہو چکی ہے اس لیے آئندہ تمام اثاثوں کے استعمال اور رکھ رکھاؤ کے اخراجات متعلقہ ریاستی حکومتوں کو ہی برداشت کرنے ہوں گے۔

مشکلات

گنگا ایکشن پلان کی بڑی مشکلات حسب ذیل ہیں:

خصوصاً اترپردیش اور بہار کی ریاستیں بڑے اثاثوں مثلاً سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹ اور پمپنگ اسٹیشنوں کو چلانے اور ان کے رکھ رکھاؤ کا انتظام کرنے کے لیے کافی فنڈس فراہم کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ اس وقت تک یہ اخراجات مرکز اور ریاستیں نصف نصف کے تناسب سے برداشت کرتی تھیں۔ مغربی بنگال میں تمام اثاثوں کے استعمال اور رکھ رکھاؤ کی پوزیشن کافی بہتر ہے۔

سیور اور انٹرمیڈیٹ پمپنگ اسٹیشنوں کے رکھ رکھاؤ کے اخراجات صرف ریاستی سرکاروں کو ہی برداشت کرنا ہوں گے۔ یہ رکھ رکھاؤ ٹھیک سے نہیں ہو رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ریاستیں اس کے لیے کافی رقومات مہیا نہیں کر پا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سہولیات کے دستیاب ہونے کے باوجود کئی مقامات پر سیوریج اب بھی دریا میں جا رہا ہے۔ اس سے ایکشن پلان کا مقصد ناکامی کا شکار ہو رہا ہے۔

پمپنگ اسٹیشنوں کو چلانے کے لیے بجلی کی مسلسل سپلائی بھی دستیاب نہیں ہے کیوں کہ اس میں خلل پڑتا رہتا ہے اسی لیے سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹوں اور برقی شمشانوں کا چلانا بھی مشکل ہو گیا ہے اگرچہ ان تنصیبات کے لیے بجلی کی مسلسل اور بے خلل سپلائی کی امید کی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر صاف شدہ سیوریج اب بھی دریا میں پہنچتا رہتا ہے۔

دوسری سہولیات مثلاً بیت الخلاؤں

۱۰ راشنان گھاٹوں کی دیکھ بھال بھی عدم توجہی کا شکار ہو رہی ہے۔

دریائے گنگا کا فرخ آباد سے وارانسی تک کا حصہ عموماً اور کانپور میں خصوصاً بہت آلودہ ہے وہاں دریا کا بہاؤ بھی بہت کم ہے۔ کانپور میں میونسپل سیوریج اور صنعتی کچرے وغیرہ کی مقدار جو دریا میں گرائی جاتی ہے بہت زیادہ ہے۔ نتیجتاً وہاں گنگا کے پانی کی کوالٹی مطلوبہ معیار تک بہتر نہیں بنائی جاسکی ہے۔

دریا میں پہنچنے والی نامیاتی آلودگی تو (جس کا اندازہ بایو کیمیکل آکسیجن ڈیمانڈ سے ہوتا ہے) گنگا ایکشن پلان کی مداخلتی کارروائیوں سے کم کی جاسکی ہے مگر کیمیاوی عمل سے صاف کیے گئے سیوریج میں جرثومے آلودگی میں محض معمولی کمی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جرثومی آلودگی کو ختم کرنے کے لیے دستیاب طریقے یا تو خطرناک ہیں یا زیادہ خرچیلے ہیں۔ اس لیے جرثومے آلودگی کو کم کرنے کے لیے اندرونِ ملک موزوں اور کم خرچ طریقے دریافت کرنے کے لیے تحقیقی پروجیکٹوں کے ذریعے ریسرچ کا کام شروع کیا گیا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ اتر پردیش اور بہار میں برقی شمشانوں کی قبولیت کی رفتار سست ہے جب کہ مغربی بنگال میں مقبول ہو رہے ہیں۔

اثر

۲۵۱ اسکیموں پر عمل درآمد کے نتیجے میں بایو کیمیکل آکسیجن ڈیمانڈ اور گھلی ہوئی آکسیجن کے اعتبار سے گنگا کے پانی کی کوالٹی میں بہتری آئی ہے۔ (انہی دو اہم عناصر سے دریائی پانی کی کوالٹی ماپی جاتی ہے) گنگا ایکشن پلان کے آغاز سے قبل (۱۹۸۶ء) اور بعد (۱۹۹۶ء) کے پانی کی کوالٹی کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں:-

شہر	بی او ڈی (بایو کیمیکل آکسیجن ڈیمانڈ) (ایم جی / لٹر) معیار: ۳۔ ایم جی / لٹر (زیادہ سے زیادہ)		ڈی او (گھلی آکسیجن) (ایم جی / لٹر) ۵۔ ایم جی / لٹر (کم سے کم)	
	۱۹۸۶ء	۱۹۹۶ء	۱۹۸۶ء	۱۹۹۶ء
رشی کیش	۱٫۷	۱٫۰	۸٫۱	۸٫۹
کانپور	۸٫۶	۴٫۱	۶٫۷	۶٫۴
الٰہ آباد	۱۵٫۵	۳٫۳	۶٫۶	۸٫۵
وارانسی	۱۰٫۶	۲٫۳	۵٫۹	۷٫۷
پٹنہ	۲٫۲	۱٫۶	۸٫۱	۷٫۰
الوبیریا	۱٫۵	۲٫۰	۵٫۸	۵٫۵

اگرچہ کانپور اور الٰہ آباد میں گنگا کے پانی کی کوالٹی میں نمایاں بہتری آئی لیکن پھر بھی وہ اب بھی بی او ڈی کے مقررہ معیار ۳۔ ایم جی / لٹر سے اوپر ہے۔ اس کی بڑی وجوہات یہ ہیں:-

(الف) کانپور میں ۳۶۰ ملین لٹر یومیہ میں سے صرف ۱۶۰ ملین لٹر یومیہ اور الٰہ آباد میں ۱۱۰ ملین لٹر یومیہ میں سے ۹۰ ملین لٹر یومیہ سیوریج کو گنگا ایکشن پلان کے پہلے مرحلے میں روک کر اس کا رخ موڑا گیا ہے۔

(ب) گنگا کے فرخ آباد سے وارانسی تک حصے میں عموماً اور کانپور والے حصے میں خصوصاً پانی کا بہاؤ بہت کم ہے جس کی وجہ سے سیوریج وغیرہ بخوبی اس میں مل کر آگے نہیں جا پاتا۔

(ج) دریا میں آلودگی کم کرنے والے تعمیرات کا پورا اثر تو ان تعمیرات کے مکمل ہونے کے بعد ہی دکھائی دے گا۔

> گنگا ایکشن پلان اپنے مقصد کے اعتبار سے ایک موزوں پروگرام ہے جسے دوسرے دریاؤں کے لیے بھی شروع کیا جاسکتا ہے۔

اس پروگرام کی بدولت سیوریج ٹریٹمنٹ کی کچھ موزوں تکنالوجیاں دریافت کی گئی ہیں۔ مثلاً یو۔ اے۔ بی۔ ایس، بہتر قسم کے آکسی ڈیشن پانڈس، باغات کے ذریعے سیوریج ٹریٹمنٹ ایکوا کلچر وغیرہ۔ یہ نئی تکنالوجیاں کم خرچ ہیں۔ ان کے استعمال سے ریاستی حکومتوں کا سیوریج ٹریٹمنٹ کا خرچ بھی کم ہو جائے گا اور گنگا ایکشن پلان اور آئندہ پروگراموں کو جاری رکھنے میں مدد ملے گی۔

ہند۔ ڈچ سینی ٹیشن پروجیکٹ کے تحت جاجامئو کانپور میں چمڑا کمانے اور رنگنے کے ۱۷۵ کارخانوں میں ترسیل اور ٹریٹمنٹ کا ایک مشترکہ نظام شروع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کروم کی صفائی اور رنگائی کے ایک یونٹ میں ایک کروم ریکوری ڈیمانسٹریشن پلانٹ لگایا گیا ہے۔ وہاں چمڑا صاف کرنے اور رنگنے کے ۸۷ یونٹ ہیں جن میں کروم تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ ڈیمانسٹریشن کروم ریکوری پلانٹ سے استعمال کی گئی کرومیم کا ۷۰ فی صد

حصہ بحال ہو جاتا ہے۔ چمڑا رنگنے کے باقی کارخانوں سے نکلنے والے گندے پانی کے دھارے کی ٹریٹمنٹ کے لیے مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ اور یو پی آلودگی کنٹرول بورڈ کے زیر ہدایت پرائمری ٹریٹمنٹ پلانٹ لگائے گئے ہیں جو کرومیم وغیرہ کو الگ کرتے ہیں۔ جاجامؤ کے چمڑا رنگنے کے کارخانوں سے گندہ پانی نکالنے کے لیے ایک مشترکہ نظام قائم کیا گیا جس کے ذریعہ یہ گندہ پانی ایک سینٹرل ویسٹ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ میں پہنچتا ہے جس کی گندہ پانی صاف کرنے کی صلاحیت ۳۶ ملین لٹر یومیہ ہے۔ اس پلانٹ میں سیوریج اور چمڑا رنگنے کے کارخانوں کا گندہ پانی یو۔ اے۔ ایس۔ بی تکنالوجی سے صاف کیا جاتا ہے۔ یہاں صاف کیے گئے گندے پانی کو دوبارہ ایک پوسٹ ٹریٹمنٹ پلانٹ میں صاف کیا جاتا ہے تاکہ اس میں آلودگی پیدا کرنے والا مادوں اور کرومیم کو علاحدہ کیا جا سکے۔ اس وقت سارا اخراج جاجامؤ سیوریج فارم میں جاتا ہے۔ مئی ۱۹۹۷ء میں ۱۳۰ ملین لٹر یومیہ کی صلاحیت رکھنے والے مین ٹریٹمنٹ پلانٹ کے چالو ہو جانے کے بعد چمڑے کے کارخانوں کا پانی اور میونسپل سیوریج ٹریٹمنٹ کے بعد ہر لحاظ سے آب پاشی کے لیے موزوں ہو جائے گا۔

پروگرام میں سیوریج ٹریٹمنٹ سے کارآمد مادے حاصل کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ ان سے ہونے والی آمدنی پروگرام کو جاری رکھنے میں معاون ہو سکے۔ یہ مادے ہیں: بجلی پیدا کرنے کے لیے بائیو گیس، ٹریٹمنٹ کے عمل سے گزارنے کے بعد بچا ہوا سیوریج ایک اچھا بائیو فرٹیلائزر ہوتا ہے جو کھیتی باڑی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

> گنگا ایکشن پلان کا ماڈل ضروری اصلاحات کے ساتھ اس پلان کے دوسرے مرحلے کی دو اسکیموں اور این۔ آر۔ سی۔ پی (دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام) کے تحت ملک کے تمام بڑے دریاؤں پر لاگو کر دیا گیا ہے۔

گنگا ایکشن پلان کے تحت تعمیر کیے گئے بیسٹرا اسٹیبلائزیشن پونڈس میں مچھلیاں پالنے کی تجویز ہے۔

میونسپل پمپنگ اسٹیشنوں اور سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹوں کو چلانے اور ان کی مناسب دیکھ بھال کے لیے افسران اور عملے کو باقاعدگی سے تربیت دی جاتی ہے تاکہ ان کی معلومات کو تازہ ترین بنایا جا سکے۔

دریاؤں کی معیشت حیوانات اور حیاتیاتی دولت کو بحال کرنے کی غرض سے حیاتی مانیٹرنگ اور حیاتی تحفظ کے پروجیکٹ شروع کیے گئے ہیں۔ جن کے تحت مطالعاتی جائزوں میں آبی جانوروں کی مختلف نسلوں کو بطور اشاریہ استعمال کیا جائے گا۔ ہمالیائی خطے میں مہاسیر کو اور ہر بار سے کانپور تک کے خطے میں اور بلاؤ اور مگرمچھوں کو، کانپور سے وارانسی تک کے خطے میں بڑی کارپ مچھلیوں کو اور بہار کے حصے میں ڈولفن مچھلیوں کو مطالعاتی جائزوں کے لیے اشاراتی نسلیں تصور کیا جائے گا۔ ہیم وتی نندن بہوگنا یونیورسٹی گڑھوال، جیواجی یونیورسٹی گوالیار، سینٹرل ان لینڈ کیپچر فشریز ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بیرک پور اور پٹنہ یونیورسٹی کے سائنس داں حیاتی مانیٹرنگ اور حیاتی تحفظ کے بارے میں مطالعاتی جائزوں میں مصروف ہیں۔

> جمنا ایکشن پلان کی تعمیرات کافی آگے کے مرحلے میں پہنچ گئی ہیں۔ تاہم دہلی کے ساتھ لگنے والے جمنا کے بارہ کلو میٹر لمبے حصے پر صورت حال آلودگی اور دریا میں پانی کا بہاؤ کم ہونے کی وجہ سے بہت خراب ہے۔

افادیت کا جائزہ

گنگا ایکشن پلان کی افادیت کے بارے میں آزاد ایجنسیوں (یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں) نے اپریل ۱۹۹۵ء میں ایک جامع جائزہ لیا۔ اس جائزے کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ نامیاتی مادوں کے دریا میں بہائے جانے کے عمل میں گنگا ایکشن پلان کے تحت کافی کمی آئی ہے جو پانی کی کوالٹی بحال کرنے کی جانب پہلا قدم ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ گنگا ایکشن پلان اپنے مقصد کے اعتبار سے ایک موزوں پروگرام ہے جسے دوسرے دریاؤں کے لیے بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ رپورٹ میں پروگرام کی خامیوں کا ذکر بھی کیا گیا جنھیں آئندہ پروگرام وضع کرتے ہوئے ملحوظ رکھا جائے گا۔

گنگا ایکشن پلان کے تحت وارانسی (اترپردیش) اور نب دیپ (مغربی بنگال) میں شروع کی گئی اسکیموں کی افادیت کا بھی یہ جاننے کے لیے جائزہ لیا گیا کہ لوگوں اور خصوصاً ان لوگوں کی صحت پر، جو گنگا کے پانی سے متاثر ہو چکے تھے کیا اثر پڑا ہے۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ اینڈ ہائی جین، کلکتہ نے نیری ناگپور کے ساتھ مل کر ان دونوں شہروں کا جائزہ لیا۔ اس جائزے سے معلوم ہوا کہ جوں جوں گنگا ایکشن پلان کے پروجیکٹ مکمل ہوتے گئے توں توں پانی سے لاحق ہونے والی بیماریاں کم ہوتی گئیں۔ لیکن سیوریج فارم پر کام کرنے والوں میں دستوں، جلدی بیماریوں اور سانس کی نلی میں انفیکشن کی تکالیف پائی گئیں۔

اس وقت گنگا ایکشن پلان کے تحت لاگت کے مطابق فائدے کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس جائزے کی سفارشات پر عمل کیا جائے گا تاکہ آئندہ پروگراموں کو فائدہ مند طریقے سے زیر عمل لایا جائے گا۔ عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے طلبا کا تعاون حاصل کیا جا رہا ہے اور نمائشوں، سیمناروں، پد یاتراؤں اور جنگل بانی کے پروگراموں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

صنعتوں سے پیدا ہونے والی آلودگی کی روک تھام کے لیے گنگا کے کنارے واقع ۶۸ ایسی صنعتوں کی شناخت کی گئی ہے جو دریا میں آلودگی پیدا کر رہی ہیں۔ ان صنعتوں کی سختی سے مانیٹرنگ کی جاتی ہے۔ گنگا ایکشن پلان شروع ہونے پر صرف ۱۴ صنعتی اکائیاں ایسی تھیں جنھوں نے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگا رکھے تھے۔ اس کے مقابلے میں جون ۱۹۹۵ء میں ۵۵ اکائیوں نے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگا لیے تھے۔ ۱۲۔ اکائیاں مستقل طور پر بند کردی گئی تھیں جب کہ باقی ماندہ اکائیوں نے تکنالوجی بدل لی تھی جس کے بعد انھیں ٹریٹمنٹ لگانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس وقت ۴۵ ٹریٹمنٹ پلانٹ تسلی بخش طریقے سے کام کر رہے ہیں اور باقی ۲۳۔ اکائیاں بند کردی گئی ہیں۔

حصہ دوئم

گنگا ایکشن پلان اور دریائی تحفظ کا قومی پلان

گنگا ایکشن پلان کا ماڈل اب تک کے تجربے کی بنیاد پر ضروری اصلاحات کے ساتھ اس پلان کے دوسرے مرحلے کی دو اسکیموں اور این۔ آر۔ سی۔ پی (دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام) کے تحت ملک کے تمام بڑے دریاؤں پر لاگو کر دیا گیا ہے۔ جب کہ گنگا ایکشن پلان کے مکمل اخراجات مرکز برداشت کرتا ہے۔ ان پروگراموں کے مصارف سرمایہ مرکز اور متعلقہ ریاستوں کی سرکاریں نصف نصف کے تناسب سے برداشت کرتی ہیں۔

گنگا ایکشن پلان کے دوسرے مرحلے کے تحت ۵ ریاستوں کے ۹۵ شہروں میں گنگا کے خاص کے چار بڑے دریاؤں کے تعلق سے مندرجہ ذیل تعمیرات شروع کی گئی ہیں۔

۱۔ دریائے گنگا کے بڑے معاون دریا، جمنا، گومتی اور دامودر ہیں۔

۲۔ دریائے گنگا کے کنارے واقع باقی ماندہ بڑے شہروں میں جو گنگا میں آلودگی کے لیے ذمہ دار ہیں۔ آلودگی کی روک تھام کے لیے تعمیرات۔ گنگا ایکشن پلان کے مرحلہ اول میں جن ۲۵ شہروں میں ایسی تعمیرات کا فیصلہ کیا گیا تھا ان میں سے کچھ شہروں میں یہ کام کیا نہیں جا سکا تھا۔ ان شہروں میں مرحلہ دوئم میں یہ تعمیرات کی جائیں گی۔

ان پروگراموں کی کامیابی کا دارومدار صرف اس بات پر ہوگا کہ ریاستیں اس شعبے کو کتنی ترجیح دیتی ہیں۔

۳۔ سپریم کورٹ کے حکم کے تحت مزید ۳۰ شہروں میں تعمیرات۔

۴۔ سپریم کورٹ کے حکم ہی کے تحت کلکتہ کے چمڑا کمپلیکس کے لیے مشترکہ ٹریٹمنٹ پلانٹ۔

اس پروگرام کے لیے ۱۲۸۱ر۱۶ کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں، جن کا ۵۰ فی صد مرکزی حکومت فراہم کرے گی۔ مرکزی حکومت اپنے حصے میں سے ۴۰ کروڑ روپے جاری کر چکی ہے۔

دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام کے تحت دس ریاستوں میں ۱۸ بین ریاستی دریاؤں کے قریبی علاقوں میں آلودگی کی روک تھام کرنے والی تعمیرات شروع کی گئی ہیں۔ ان تعمیرات کے لیے ۷۷۲ر۰۸ کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں۔ تمام اخراجات مرکز اور متعلقہ ریاستوں کی سرکاریں نصف نصف کے تناسب سے برداشت کریں گی۔ مرکز اپنے حصے کے اخراجات کے لیے اس وقت تک ۴۰ کروڑ روپے جاری کر چکا ہے۔

گنگا ایکشن پلان کے مرحلہ دوم اور دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام کی اسکیموں میں تجربے کی روشنی میں درج ذیل اصلاحات کی گئی ہیں:۔

۱۔ یہ اسکیمیں اخراجات میں مرکز اور ریاستی حکومتوں کی برابر کی حصہ داری کی بنیاد پر شروع کی گئی ہیں۔ تعمیرات کے استعمال اور رکھ رکھاؤ کے اخراجات متعلقہ ریاستی حکومتیں ہی برداشت کریں گی۔

۲۔ شہروں سے نکلنے والے گندے پانی کے بارے میں تحقیقات اور حقیقی جائزوں کی بنیاد پر سسٹم ڈیزائنوں کو بہتر بنایا گیا ہے۔

۳۔ سیوریج وغیرہ کو روکنے، اس کا رخ موڑنے اور ٹریٹمنٹ کی اسکیموں کے لیے لامرکزی طریق کار اختیار کیا گیا ہے۔

۴۔ اسکیموں کی تکمیل میں تاخیر کے تدارک کے لیے ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن کی بدولت زمین حاصل کرنے کا کام بروقت پورا ہو سکے۔

۵۔ جہاں مناسب سمجھا گیا ہے وہاں کم خرچ اور موزوں تکنالوجیاں (مثلاً یو۔ اے۔ ایس۔ بی، اسٹیبلائزیشن تالاب اور کرنال تکنالوجی) اختیار کرنے کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

۶۔ ایک مربوط انداز نظر اختیار کر کے پروگراموں کو بہتر اور زیادہ موثر بنانے کے لیے دوسری متعلقہ وزارتوں مثلاً شہری امور اور روزگار، غیر روایتی وسائل توانائی، آبی وسائل وغیرہ کی وزارتوں سے صلاح مشورہ کیا جاتا ہے۔

۷۔ نہروں، آبی ذخائر اور حرارتی بجلی گھروں جیسے بڑے ترقیاتی پروجیکٹوں کی منظوری دیتے وقت دریا میں پانی کا مناسب بہاؤ برقرار رکھنے کی ضرورت اور دریا کے ایکشن پلان کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

۸۔ جن چھوٹے شہروں میں بجلی کی سپلائی پے خلل نہ ہونے کی وجہ سے برقی شمشان گھر معقول نہیں ہوئے ہیں وہاں لکڑی کا استعمال کرنے والے بہتر قسم کے شمشان گھر بنائے گئے ہیں۔

۹۔ کم خرچ بیت الخلاؤں کی جائے تعمیر کا انتخاب حقیقی جائزوں کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ ان کی تعمیر، رکھ رکھاؤ کی ذمہ داری مشہور غیر سرکاری تنظیموں کو سونپنے کی تجویز ہے۔

۱۰۔ پروجیکٹ منیجروں کی تربیت کے پروگرام وضع کیے اور زیر عمل لائے گئے ہیں تاکہ بہتر بندوبست کے ذریعے پروجیکٹوں کی تکمیل کم از کم وقت میں کی جاسکے۔

۱۱۔ پروگراموں کو جاری رکھنے کے لیے عوام میں بیداری پیدا کرنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ شہریوں کی مانیٹرنگ کمیٹیوں کو پروگرام میں شریک کیا جا رہا ہے۔ کچھ سیوریج ٹریٹمنٹ پلانٹوں کو چلانے اور ان کے رکھ رکھاؤ کا انتظام کرنے کی ذمہ داری تجربے کے طور پر غیر سرکاری ہاتھوں میں سونپنے کی بھی تجویز ہے۔

جمنا

جمنا ایکشن پلان کی تعمیرات کافی آگے کے مرحلے میں پہنچ گئی ہیں۔ تاہم دہلی کے ساتھ لگنے والے جمنا کے بارہ کلومیٹر لمبے حصے پر صورت حال آلودگی اور دریا میں پانی کا بہاؤ کم ہونے کی وجہ سے بہت خراب ہے۔ - - - - - - - - - - - - - - پانی کا بہاؤ تیز نہ ہونے کی وجہ سے گندگی بہہ کر آگے نہیں جا پاتی۔ اگرچہ جمنا ایکشن پلان اور دہلی کے ترقیاتی منصوبے کے تحت جمنا کی صفائی پر تقریباً ۹۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جانے کے باوجود پانی کی کوالٹی اتنی بہتر نہ بنائی جا سکے گی کہ اس کا شمار نہانے کے مطلوبہ زمرہ میں کیا جا سکے۔ جمنا ایکشن پلان جس کے لیے ۱٫۷۷ بلین ین کی بیرونی امداد دستیاب ہے، کے مارچ ۱۹۹۹ء تک مکمل ہونے کا امکان ہے۔

برطانیہ کی کمپنی او۔ڈی۔اے دریائے گومتی کے لکھنؤ کے حصے کے لیے مزید مالی امداد مہیا کرنے پر سرگرمی سے غور کر رہی ہے۔ مرحلۂ اول کی تعمیرات کے لیے وہ ۴٫۲ ملین برطانوی پونڈ کی ایک گرانٹ پہلے ہی منظور کرچکی ہے۔ اب وہ لکھنؤ میں بڑی تعمیرات کے لیے ایک مفصل ماسٹر پلان تیار کر رہی ہے۔ اس کے جون ۱۹۹۷ء تک مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ اس کے بعد برطانوی حکومت کی منظوری حاصل کرنے میں چار پانچ ماہ اور لگیں گے۔ دریں اثنا جونپور اور سلطان پور میں تعمیرات کا کام جاری ہے۔

ادھر گنگا ایکشن پلان کے مرحلۂ دوم اور دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام کے دیگر اجزا، جن کی منظوری جولائی ۱۹۹۵ء سے مختلف اوقات میں دی گئی تھی، کی تکمیل کا کام بھی جاری ہے۔ ان تمام تعمیرات کو مراحل میں مکمل کرنے میں تقریباً دس سال لگیں گے۔

گنگا ایکشن پلان کے مرحلۂ دوم اور دریاؤں کے تحفظ کے قومی پروگرام کو ایک بڑی مشکل اخراجات میں ریاستوں سے ان کا ۵۰ فی صد حصہ حاصل کرنے میں پیش آرہی ہے۔ بہت سی ریاستیں اپنے حصے کی رقم وقت پر فراہم نہیں کر پا رہی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ مرکز اپنے حصے کی جو رقوم ریاستوں کو جاری کرتا ہے وہ بھی عمل درآمد کرنے والی ایجنسیوں تک وقت پر نہیں پہنچ پاتیں۔ اس کی وجہ سے پروجیکٹوں پر عمل آوری میں تاخیر ہو رہی ہے۔

ان پروگراموں کی کامیابی کا دارومدار صرف اس بات پر ہوگا کہ ریاستیں اس شعبے کو کتنی ترجیح دیتی ہیں۔ دریاؤں کی صفائی کے پروگراموں پر بہت خرچ آتا ہے خواہ وہ سرمایہ جاتی اخراجات ہوں یا مکرر الوقوع اخراجات۔

ریاستیں ان کاموں کے لیے جو رقوم مخصوص کرتی ہیں وہ یکسر ناکافی ہوتی ہیں۔ جب تک وہ کافی فنڈس فراہم نہیں کریں گی ان پروگراموں کی بقا مشکوک رہے گی۔ زیر بحث مقصد کے لیے وسائل کی فراہمی بڑھانے کا ایک طریقہ پروگرام سے مستفید ہونے والوں پر اضافی ٹیکس عائد کرنا ہو سکتا ہے یا پھر اس شعبے کو غیر سرکاری ہاتھوں میں دے دیا جائے لیکن اس صورت میں بھی بوجھ تو پروگرام سے مستفید ہونے والوں پر ہی پڑے گا۔ بہرحال ریاستیں اس شعبے کے لیے اپنے وسائل کس طرح بڑھائیں اس بارے میں انھیں مرکز کے ساتھ مشورہ کرنا ہوگا۔

> ریاستیں ان کاموں کے لیے جو رقم مخصوص کرتی ہیں وہ یکسر ناکافی ہوتی ہیں۔ جب تک وہ کافی فنڈس فراہم نہیں کریں گی ان پروگراموں کی بقا مشکوک رہے گی۔

بقیہ کور ۲: ہوشیار! پانی تیزی سے کم یاب ہوتا جارہا ہے

پانی کی دستیابی کے سلسلے میں درپیش رکاوٹوں کو ملحوظ رکھ کر کی جانی چاہیے۔ ملک میں پانی کی زون بندی کی جانی چاہیے اور اس طرح کی زون بندی کے مطابق اقتصادی سرگرمیاں انجام دی جانی چاہئیں۔

اس وسیع اصول پر عمل درآمد کرنے کے لیے، پالیسی دستاویز میں تجویز کیا گیا ہے کہ پانی کے مختلف استعمال کے سلسلے میں استعمال کی اثر پذیری کو بہتر بنایا جانا چاہیے اور" ایک کم یاب وسیلے کے طور پر پانی کے بارے میں بیداری کو فروغ دیا جانا چاہیے "۔ اس میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ عوام میں پانی کی بچت کے بارے میں بیداری کو تعلیم، ضابطہ بندی، ترغیبات وغیرہ کے ذریعے فروغ دیا جانا چاہیے۔

زراعتی شعبے میں، جہاں پانی کا سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے، پانی کو ان علاقوں تک میں بھی، جہاں یہ ابھی کم یاب وسیلہ نہیں بنا ہے، کم یاب وسیلہ سمجھے جانے کی ضرورت محسوس کرانی ہوگی۔ اس لیے پانی ایک ایسا وسیلہ ہے کہ اس کی بچت کرنے کے لیے عوامی تحریک کے ذریعے اجتماعی کوشش کرنی ہوگی۔ فصلوں کی پیداوار کے سلسلے میں پانی کا موثر اور کفایتی استعمال درحقیقت ایک بین شعبہ جاتی موضوع ہے اور اس کے لیے انجینیروں، زرعی سائنس دانوں، سماجی سائنس دانوں اور کاشت کاروں کے صلاح مشورے کی ضرورت ہے۔

مرکزی آبی کمیشن کے تیار کردہ تخمینوں کے مطابق، پانی کے سطحی ذرائع سے کل قابلِ استعمال پانی کی مقدار تقریباً ۶۹۰ مکعب کلو میٹر ہے۔ اس کے علاوہ زیرِ زمین پانی سے متعلق مرکزی بورڈ کے تخمینے کے مطابق، قابلِ احیا زیرِ زمین پانی کی صلاحیت تقریباً ۴۵۲ مکعب کلو میٹر ہے۔ اس طرح کل دستیاب پانی کی مقدار ۱۱۴۲ مکعب میٹر ہو جاتی ہے۔ اس میں سے اس وقت ۴۶۰ مکعب کلو میٹر پانی کا استعمال زراعت کے لیے کیا جا رہا ہے، جس میں ۳۰۰ مکعب کلو میٹر سطحی پانی اور ۱۶۰ مکعب کلو میٹر زیرِ زمین پانی شامل ہے۔

مختلف شعبے جو پانی خرچ کر رہے ہیں، اس کی پاداش کے لیے بارش ہی واحد ذریعہ ہے۔ ملک میں اوسطاً سالانہ تقریباً ۱۱۲ سینٹی میٹر بارش ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر کل سالانہ بارشیں ۴۰۰۰۰۰۰ ملین مکعب میٹر ہوتی ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۸۰ فی صد بارشیں جنوب مغربی مانسون سے حاصل ہوتی ہیں اور صرف چار مہینوں کی مختصر مدت کے لیے رہتی ہیں۔ پانی اور بجلی سے متعلق مرکزی کمیشن نے اندازہ لگایا ہے کہ کل سالانہ بارشوں میں سے تقریباً ۸۰۰۰۰۰ ملین مکعب میٹر پانی زمین میں چلا جاتا ہے، تقریباً ۱۷۰۰۰۰۰ ملین مکعب میٹر پانی دریاؤں میں بہہ جاتا ہے، جو سطحی پانی کے طور پر دستیاب ہوتا ہے اور بقیہ پانی بخارات بن کر فضا میں چلا جاتا ہے۔

پانی کی جو مقدار قدرتی طور پر مٹی میں چلی جاتی ہے، وہ خود بہ خود مٹی کے نچلے حصے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ پانی کی وہ مقدار جو بخارات بن کر اور زمین پر بہہ کر یا دریاؤں میں جاکر سمندر میں چلی جاتی ہے اور اس طرح ضائع ہوتی ہے، اسے مصنوعی طریقوں سے ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔ درحقیقت یہی وہ امکان ہے، جس سے پانی کی دستیابی میں اضافہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

دستیابی میں اضافہ کرنا

پانی کو محفوظ رکھنے کا سب سے پرانا طریقہ، جو بارش کے پانی کو اکٹھا کرنے کے اصولوں پر مبنی ہے، تالابوں کی تعمیر کرنا تھا تاکہ علاقے کے بہتے ہوئے پانی کو ایک جگہ پر جمع کیا جا سکے۔ یہ پرانا نظام فصلوں کی آب پاشی کے لیے اور لوگوں کی پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پانی کا قابلِ اعتماد ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ ملک کے نیم بنجر علاقوں مثلاً مغربی اور وسطی ہندوستان یعنی راجستھان اور مالوہ پلا ٹو، نیز پورے جنوبی ہندوستان میں کافی مقبولِ عام رہا ہے۔ قدیم ادب، خاص طور سے جنوبی ریاستوں مثلاً آندھرا پردیش، کرناٹک اور تامل ناڈو کا قدیم ادب اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ ان ڈھانچوں کا احترام اجتماعی اثاثوں کے طور پر کیا جاتا تھا اور بادشاہ، زمین دار، گاؤوں کے پردھان یا مکھیا اور لوگ ان کا انتظام اور دیکھ بھال بہت اچھے ڈھنگ سے کرتے تھے۔

لیکن ملک میں برطانوی حکومت قائم ہونے اور برطانوی قانون کے نفاذ سے صورت حال میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی جس کا مقصد پانی کو انفرادی طور سے یا سرکاری ملکیت کا وسیلہ سمجھنا تھا، جس کا استعمال تجارتی پیمانے پر کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر سیاسی اور انتظامی عناصر کی وجہ سے بھی بارش کا پانی اکٹھا کرنے کے نظاموں کی عرصے سے چلی آرہی اہمیت رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی گئی۔ تالابوں کو برقرار رکھنے اور ان کی دیکھ بھال کے سلسلے میں لوگوں کا کردار ختم ہو گیا۔ انتظامیہ نے بھی، جو دیگر امور میں پہلے سے معروف تھی، اس پہلو کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے تالاب، جن سے صدیوں سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا آیا تھا، گزشتہ ۲۰۰ برسوں میں استعمال میں نہیں رہے۔ ان کی بحالی ایک کارِ عظیم ہے، جس کے لیے بہت زیادہ رقوم کی ضرورت ہے۔ متعدد ریاستوں نے اس مقصد کے لیے وسیع اور جامع منصوبے تیار کیے ہیں، جن پر مناسب طور سے اور صحیح ڈھنگ سے عمل درآمد کیے جانے کی ضرورت ہے۔

گزشتہ دو صدیوں میں پانی اکٹھا کرنے کے رجحانات سے پتا چلتا ہے کہ باندھ تعمیر کر کے مقابلتاً بڑے ذخائر میں پانی جمع کرنے نیز نہروں کے ایک نظام کے ذریعے کھیتوں اور دیگر مصارف کے لیے اس پانی کو سپلائی کرنے کے سلسلے میں قابلِ ذکر تبدیلی آگئی ہے۔ آزادی کے بعد کے دور میں، یہ نظریہ آب پاشی اور پن بجلی کے کثیر مقصدی پروجیکٹوں کے ذریعے آبی وسائل کی ترقی و فروغ کے ایک جامع پالیسی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

جدید تکنیک

سطحی پانی کا ذخیرہ کرنے اور اس کی سپلائی کرنے کے نظام کی توسیع سے متعدد مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم مسئلہ پانی کے ایک جگہ جمع ہونے کا ہے، جو گندے پانی کی نکاسی کے مناسب اور اسی کی مناسبت سے وسیع نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے اکٹھا ہو جاتا ہے۔ زراعت کے لیے کم قیمت پر دستیاب پانی کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی وجہ سے بھی اس مسئلے میں اضافہ ہوا ہے، جس کے نتیجے میں وہ متعدد علاقے، جو اب تک کھیتی باڑی کے لحاظ سے زرخیز تھے، بنجر ہو گئے ہیں۔ گزشتہ کچھ دہوں میں، خاص طور سے پانی اکٹھا ہونے اور مٹی کے کھارے پن، سطحی پانی کی غلط اور نامناسب تقسیم نیز اس کے ضرورت سے زیادہ استعمال کے مسئلہ کی اہمیت سمجھ لیے جانے کے بعد سے مٹی کے تحفظ اور پانی کی بچت کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا ہے اور اس سلسلے میں بیداری بڑھی ہے۔ تاہم اس جانکاری کی اہمیت کو پوری طرح سے نہیں سمجھا گیا ہے اور ان معلومات سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے پانی کی بچت اور اس کے تحفظ کے جدید طریقوں پر مشتمل پانی سے متعلق نیز ٹکنالوجی کے پروگرام کے ذریعے آب پاشی کے پانی کے سائنسی انتظام کو فروغ دینے کی لازمی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔

سطحی پانی کے نظام کی توسیع کے ساتھ ساتھ کنوئیں کھود کر زیر زمین پانی کے زیادہ سے زیادہ استعمال کا عمل بھی آزادی کے بعد کے دور میں تیزی سے چلتا رہا۔ نہروں کے نظام والے کمانڈ علاقوں میں کنوؤں اور ٹیوب ویلوں کے فروغ سے پانی کی سطح کو خطرناک حد تک بڑھنے سے روکنے کا مفید مقصد حاصل ہوا، جس کی وجہ سے پانی اکٹھا ہو جاتا تھا۔ نیز مٹی کے کھارے پن اور زمینی خرابی کے مسائل پیدا ہوتے تھے، جو اس سے وابستہ تھے۔ یہ معاملہ کچھ علاقوں میں ایک نعمت ثابت ہوا۔ پانی کے نظام کو سب سے زیادہ نقصان ان علاقوں میں زیر زمین پانی کے ضرورت سے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوا ہے، جہاں بارشوں کے ذریعہ پانی کی سالانہ بھرپائی پانی کی سالانہ نکاسی سے کم ہے، جس سے پورا ماحولیاتی نظام درہم برہم ہوا ہے۔

اگرچہ ملک کے بہت سے علاقوں میں زیر زمین پانی میں کمی واقع ہونے کی علامتیں نظر آ رہی ہیں، لیکن ابھی اس کمی کی حد کا کوئی ٹھوس تخمینہ نہیں لگایا گیا ہے۔ 'کالے'، 'بھورے' اور 'سفید' کے طور پر علاقوں کی زمرہ بندی کے موجودہ طریقے سے صرف کمی واقع ہونے کی شرح کا پتا چلتا ہے۔ یہ زمرے لازمی طور سے نکالے جانے والے پانی کی سالانہ بھرپائی کے تناسب پر مبنی ہیں۔ جن بلاکوں میں پانی کے استعمال کی شرح ۸۵ فی صد سے زیادہ ہے، انھیں 'کالے' قرار دیا جاتا ہے۔ جن علاقوں میں یہ شرح ۶۵۔ اور ۸۵ فی صد کے درمیان ہے، انھیں 'بھورے' قرار دیا جاتا ہے اور باقی علاقوں کو 'سفید' قرار دیا جاتا ہے۔

درحقیقت قومی سطح کے اوسط اعداد و شمار سے زیر زمین پانی کے ضرورت سے زیادہ استعمال کے مسئلے کی اہمیت کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی ہے۔ اگرچہ پانی کے قومی اوسط استعمال کی شرح پانی کی سالانہ بھرپائی کا صرف ۳۰ فی صد ہے، کچھ ریاستوں میں خاص طور سے پنجاب اور ہریانہ میں اوسطاً ۸۰۔ اور ۹۸ فی صد کے درمیان کی شرح سے پانی نکالا جا رہا ہے جو کہ شدید تشویش کا باعث ہے۔ پنجاب کے چھ اضلاع (کپورتھلہ، جالندھر، سنگرور، پٹیالہ، لدھیانہ اور امرتسر) اور ہریانہ کی شرح ۱۴۰ فی صد سے زیادہ ہے۔ کپورتھلہ میں تو پانی کے استعمال کی شرح کا تخمینہ ۲۵۹ فی صد لگایا گیا ہے۔ تامل ناڈو، راجستھان، گجرات کے کچھ علاقوں اور دیگر بہت سے الگ تھلگ علاقوں میں بھی پانی کے استعمال کی شرح کافی زیادہ ہے۔

پانی کے استعمال اور اس کے سلسلے میں حقوق سے متعلق پرانے قوانین، پانی کے اثاثوں کی دیکھ بھال اور استعمال کے سلسلے میں کمیونٹی کے کنٹرول اور اجتماعی فیصلہ کرنے کا خاتمہ، پانی سے متعلق چار جزو میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں سیاسی عزم اور خواہش کی کمی نیز فصلوں کے سلسلے میں پانی کے استعمال میں بہتری لانے کے اقدامات کو فروغ دینے میں ناکامی اس شعبے کی خرابیوں کی کچھ اہم وجوہات ہیں۔

مداخلت کی ضرورت

لطف کی بات یہ ہے کہ زیر زمین پانی سے متعلق حق ابھی تک اس قانون کے تحت آتا ہے، جو برطانیہ کے عام قانون کے خطوط پر گزشتہ صدی میں نافذ کیا گیا تھا۔ اس فرسودہ قانون سے کسی زمین مالک کو اپنی زمین کے نیچے موجود پانی کا قطعی حق مل جاتا ہے۔ چناں چہ ایک فرد زمین سے کتنی بھی مقدار میں پانی نکالنے کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے موجودہ صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قانون میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے۔

محسوس کردہ سماجی ضروریات اور معاصرانہ آئینی اقدار کی روشنی میں ساحلی حقوق کے اصول کی بھی ازسرنو تشریح کرنے کی ضرورت ہے، جو کہ ہندوستان میں سطحی پانی کے شعبے سے متعلق قانون کی بنیاد ہے۔ سپریم کورٹ نے زندگی کے ایک بنیادی حق کے طور پر پانی کے حق کو شامل کرنے کے لیے ہندوستان کے آئین کی دفعہ ۲۱ کی ازسرنو تشریح کر کے پانی سے متعلق قوانین کے بنیادی اصولوں کو ایک نئی جہت پہلے ہی فراہم کر دی ہے۔ اس کے علاوہ آئین کی دفعہ ۳۹ (ب) (مملکتی پالیسی کے ہدایتی اصول) کے تحت مملکت کے لیے اس بات کو یقینی بنانا لازمی کر دیا گیا ہے کہ کمیونٹی کے مادی وسائل کی ملکیت اور کنٹرول کو اس طرح سے تفویض کیا جائے کہ بہترین ممکنہ انداز میں تمام لوگوں کا بھلا ہو سکے۔

چوں کہ پانی پر سبھی لوگوں کا حق ہے، اس لیے پانی سے متعلق قوانین میں رسائی، انصاف، سماجی مساوات کے اصولوں کا خیال رکھا جانا چاہیے۔ ان قوانین میں آبی وسائل

کے ہائیڈرولوجیکل یونٹ کی اہمیت کو تسلیم کرنے نیز سطحی اور زیر زمین پانی کا اجتماعی طور سے استعمال فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام سطحی پانی اور زیر زمین پانی سے متعلق حقوق کو یکجا کرکے انجام دیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ پانی کے استعمال کے سلسلے میں کفایت اور اثر پذیری کو یقینی بنانے کے لیے پانی سے متعلق نجی حق کی ایک حد ضروری ہے، تاہم اس طرح کا حق اکثر ایک کم یاب وسیلے کے طور پر پانی کے استعمال کے سلسلے میں مساوات اور ماحولیاتی تحفظ کے مطلوبہ نظریات کے خلاف کام کرکے پیداواریت مخالف ثابت ہوتا ہے۔ چناں چہ حقوق کے اس نظام کو اس طریقے سے وضع کرنے کی ضرورت ہے، جس سے کہ نہ صرف اجتماعی نکاسی کے لیے حدیں مقرر کرنے کے سلسلے میں، بلکہ علاقوں اور افراد میں پانی کی تقسیم کے عمل کو نافذ کرنے اور اس کی نگرانی کرنے کے سلسلے میں بھی مناسب اور موثر سماجی کنٹرول کو یقینی بنایا جاسکے۔

لیکن چوں کہ پانی کی ضابطہ بندی نیز اس کو بہتر بنانا اور اس میں اضافہ کرنا لازمی طور سے ایک ریاستی موضوع ہے، اس لیے مرکز پانی کے سلسلے میں حقوق سے متعلق قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ جو وہ کرسکتا ہے اور جو اس نے واقعتاً کیا ہے، وہ ایک ماڈل بل تیار کرنا اور اس کو ریاستوں کے پاس اس تجویز کے ساتھ بھیجنا ہے کہ ان کے قانون میں کم و بیش ان خطوط پر ترمیم کی جانی چاہیے۔ ماڈل بل تیار کرکے ۱۹۷۰ء میں ریاستوں کے پاس بھیجا گیا تھا، لیکن اس سلسلے میں ریاستوں کا ردعمل قدرے حوصلہ شکن تھا۔ بل میں منجملہ دیگر چیزوں کے ریاستی حکومتوں کو یہ اختیار دینا شامل تھا کہ وہ افراد یا برادری کے ذریعے کنویں، بورنگ والے کنویں، ٹیوب ویل وغیرہ سمیت زیر زمین پانی نکالنے کے ڈھانچے تعمیر کرنے کی روک تھام کریں۔ اس میں پینے کے لیے پانی نکالنے کا معاملہ شامل نہیں تھا۔

دو دہوں سے بھی زیادہ عرصے کے بعد آبی وسائل کی مرکزی وزارت نے ایک بار پھر ۱۹۹۰ء میں تشکیل کردہ ماہرین کے ایک گروپ کے ذریعے بل کی دفعات پر نظر ثانی کرائی۔ ترمیم شدہ بل جو اس پینل کے سفارشات پر مبنی تھا، ۱۹۹۲ء میں دوبارہ ریاستوں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ لیکن ریاستوں کا ردعمل ایک بار پھر بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔

اسی طرح سے اگرچہ پانی سے متعلق شرحوں میں اضافہ کرنے کی ضرورت کافی عرصہ سے محسوس کی جارہی ہے، لیکن ریاستی حکومتوں کو ایسا کرنے کے لیے ابھی مناسب سیاسی حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ درحقیقت بہت سی ریاستوں نے اس کے برعکس قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ غیر ضروری استعمال کی روک تھام کرنے کی غرض سے شرحوں میں اضافہ کرنے کی بجائے، یہ شرحیں یا تو کم کردی گئیں ہیں یا مکمل طور سے ختم کردی گئی ہیں۔ اس طرح کے عمل سے کچھ عرصے کے لیے تھوڑا بہت سیاسی فائدہ حاصل کرنے میں تو مدد مل سکتی ہے، لیکن آگے چل کر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہونا لازمی ہے۔

اس کے باوجود اگرچہ پانی کی بچت اور تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے قانونی اقدامات لازمی ہیں لیکن ایسا کرنے کے لیے یہ واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ فصل اگانے کے طریقے کی گوناگونی، 'کالے' اور 'بھورے' علاقوں میں، بجلی کے نئے کنکشن جاری کرنے پر پابندی، چھڑکاؤ اور ڈرپ نظاموں جیسے آب پاشی کے جدید طریقوں کی شروعات وغیرہ جیسے اقدامات سے بھی پانی کے بہت زیادہ استعمال کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔

مزید برآں، زیر زمین پانی کی مصنوعی بھرپائی کی اسکیموں کو فروغ دینے کی بھی فوری ضرورت ہے، جو ایک لحاظ سے قدرتی زیر زمین ذخیرے میں پانی جمع کرنے کے مترادف ہے۔ اس سیاق و سباق میں، 'پن دھارا' کی ترقی و فروغ پر اب جو زور دیا جارہا ہے، وہ بروقت اور صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کا مقصد مونسون کے دوران حاصل ہونے والے بارش کے پانی کو محفوظ رکھنا اور بعد میں اس کو مفید طور سے استعمال میں لانا ہے۔ اس مقصد کے لیے اختیار کردہ سول اور انجینئرنگ کے طریقوں سے بھی مٹی اور پانی کی خرابی کی روک تھام کرنے اور اس طرح ماحولیات کے تحفظ کو فروغ دینے میں مدد ملتی ہے۔

●

بقیہ: اسپتالوں کے غلاظت

وا تاورن کی ٹیم نے اس کام کو اتنا آسان بنادیا ہے کہ اب اس کو شروع کرنے کے لیے کوئی زیادہ سرمایہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوڑے کو ڈھیر لگانے کا کام ایک منظم عمل ہے۔ یہ روزمرہ کا عمل ہے اس کے لیے لگن کی ضرورت ہے۔ وا تاورن کسی بھاری مشین یا ساز و سامان کے بغیر کوڑے کو ٹھکانے لگانے کا ایک اہم کام انجام دے رہا ہے۔ یہ ایک گاندھیائی اسکیم ہے جس میں محنت مقدم ہے۔ سبھی صفائی دستے صرف اتنا ہی پیسہ جٹانے کی کوشش کرتے ہیں جتنے میں ان کے اخراجات پورے ہوجائیں۔ وا تاورن نے اس کام کو اپنے لیے آمدنی کا ذریعہ کبھی نہیں سمجھا۔ یہ ایک رضاکارانہ کام ہے جس کا مالی فائدہ تو کچھ نہیں ہے لیکن اسے ان سیکڑوں کارکنوں کی نیک تمنائیں حاصل ہیں جن کی زندگی وا تاورن کے صفائی دستے سے وابستہ ہونے کے بعد بدل گئی۔ لوگوں تک پہنچنا اور انھیں صفائی دستے قائم کرنے کے لیے آمادہ کرنا راقم الحروف کے لیے ایک خوش کن تجربہ رہا ہے۔ دہلی کے اٹھارہ بیس لاکھ باشندے جن کے کوڑے کباڑ کو صفائی دستے ٹھکانے لگاتے ہیں وا تاورن پریوار کا حصہ ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی اس ذمہ داری کو سمجھتا ہے کہ کوڑا ہماری وجہ سے ہوا اور اس کو اس طرح ٹھکانے لگانا بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ماحولیات پر اس کے نقصان دہ اثرات نہ پڑیں:

ڈاکٹر پی. ڈی. شرما

قبائلی لوگ اور جنگلات کا انتظام

مصنف کے مطابق، ملک میں جنگلات کے انتظام سے متعلق جو نظام ہے، وہ جنگلات میں پولیس تعینات کرنے اور اس سے زیادہ سخت اقدامات کرنے پر مبنی ہے لیکن اس سے نہ تو جنگلات کی پامالی کی روک تھام کرنے میں کامیابی ملی ہے اور نہ ہی ان جنگلات پر انحصار کرنے والے لوگوں کی صورت حال میں کوئی بہتری آئی ہے۔ جمہوری، لامرکزی اور پائیدار ترقی وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس سلسلے میں ماہرین بشریات ایک مفید کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہندوستان میں مجموعی طور سے جنگلات کا علاقہ ملک کے کل جغرافیائی علاقے کے تقریباً ۲۳ فی صد حصے پر مشتمل ہے۔ ملک میں ریکارڈ شدہ جنگلاتی علاقہ ۷۷٫۰۱ ملین ہیکٹیر ہے۔ اس طرح یہاں اس وقت دنیا کے کل جنگلاتی علاقے کا صرف دو فی صد حصہ ہے لیکن یہ علاقہ دنیا کی ۱۵ فی صد سے زیادہ آبادی کو مستفید کر رہا ہے۔ ہندوستان کے قبائلی لوگوں کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی میں جنگلات کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ اس بات سے سبھی بخوبی واقف ہیں کہ قبائلی آبادی کی اکثریت گزشتہ کئی صدیوں سے ہم آہنگی تحفظ اور ایک دوسرے پر اعتماد کے ساتھ ہندوستان کے جنگلاتی علاقوں میں ملک کی باقی آبادی سے الگ تھلگ رہتی ہے اور اس نے جنگلات کے ساتھ اپنا معاشی تعلق قائم کر رکھا ہے۔

جنگلاتی ماحول سے قبائلی لوگوں کو زندگی بھر گہری قبائلی روایات اور جذبات کے سلسلے میں تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بیشتر قبیلے کسی متوفی قبائلی شخص کو جنگلی علاقے کے قریب زمین میں دفناتے ہیں۔ اس طرح مرنے کے بعد بھی قبائلی لوگوں کا تعلق جنگلات سے برقرار رہتا ہے۔

جنگلات سے قبائلی لوگوں کو اور ان فرقوں کو، جو جنگلات کے قریب رہتے ہیں، بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں مثلاً مسکن، پناہ گاہ اور سایہ، گھریلو ساز و سامان کے لیے خام مال، گوند، رنگ وغیرہ جیسی اشیا، مکانات، باڑ، اوزار وغیرہ بنانے کے لیے لکڑی، آگ جلانے کے لیے لکڑی، دوائیں تیار کرنے کے لیے جڑی بوٹیاں، مویشیوں کے لیے چارہ اور چراگاہیں، دیگر ثقافتی اشیا مثلاً زیورات، مذہبی اشیا وغیرہ۔ یہ وہ کچھ براہ راست فوائد ہیں، جو قبائلی لوگ اور دیگر فرقے جنگلات سے حاصل کرتے ہیں۔

> ہندوستان کے قبائلی لوگوں کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی میں جنگلات کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ اس بات سے سبھی بخوبی واقف ہیں کہ قبائلی آبادی کی اکثریت گزشتہ کئی صدیوں سے ہم آہنگی، تحفظ اور ایک دوسرے پر اعتماد کے ساتھ ہندوستان کے جنگلاتی علاقوں میں ملک کی باقی آبادی سے الگ تھلگ رہتی ہے اور اس نے جنگلات کے ساتھ اپنا معاشی تعلق قائم کر رکھا ہے۔

ہندوستان میں قبائلی لوگوں کی زندگی اور معیشت جنگلات سے بہت زیادہ وابستہ ہے۔ یہاں قبائلی آبادی کی اکثریت واقعتاً جنگلات میں رہتی ہے نیز جنگلاتی پیداوار پر جس میں زیادہ تر خوردنی جڑیں شامل ہیں، اور چھوٹے جانوروں کا شکار کر کے اپنا گزر بسر کرتی ہے۔ شکار کرنے اور جنگلاتی پیداوار اکٹھا کرنے والے یہ قدیم قبائلی فرقے، جن کی

تعداد بہت کم ہے، زیادہ تر اڑیسہ، بہار، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں رہتے ہیں۔ ان قدیم قبائلی لوگوں کی بقا چھوٹی جنگلاتی پیداوار، مثلاً مہوا پھول، سال کے بیجوں، سال اور تیندو کی پتیوں، خوردنی جڑوں، بانسوں اور جنگلی پھلوں وغیرہ پر منحصر ہے۔

اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور بہار میں قبائلی لوگوں کے بارے میں کیے گئے مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ جنگلات میں رہنے والے ۸۰ فی صد سے زیادہ لوگ ۲۵ فی صد سے لے کر ۵۰ فی صد تک اپنی خوراک جنگلات سے حاصل کرتے ہیں۔ چناں چہ شکار کرنے والے اور جنگلی پیداوار اکٹھا کرنے والے قبائلی فرقوں مثلاً بیرہور، کوروا، پہاڑیہ، اسور، بہرجیا، چینچو، کادر، پالیان وغیرہ کے لیے جنگلاتی پیداوار ان کی بقا کا اہم ذریعہ ہے۔ وہ قبائلی لوگ، جو سکونت پذیر کاشت کار ہیں مثلاً سانتھل، منڈا، اوراؤں، ہو، بھیل، گونڈ، بائیگا وغیرہ، نیز جنھیں وسطی ہندوستان کے قبائلی علاقے کے اہم قبیلے سمجھا جاتا ہے، ان چھوٹے قبیلوں کے مقابلے میں معاشی طور سے کہیں زیادہ بہتر ہیں، جو وسطی اور مشرقی ہندوستان کے جنگلاتی علاقوں میں یا ان کے قریب رہ رہے ہیں۔ ہندوستان کی شمال مشرقی ریاستوں میں رہنے والے بہت سے منگولوئیڈ قبیلے، ناگا، کوکی قبیلے جنگل کے اندر ہی "جھوم" کاشت کاری کر کے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ جھوم کاشت کاری کو بستر کے ماریا 'پینڈا' اور اڑیسہ کے کھونڈ 'پوڈو' کہتے ہیں۔ جھوم کاشت کاری سے کسی حد تک جنگل پامال ہوتا ہے۔ چناں چہ اس بات پر تبادلۂ خیالات کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا موجودہ سیاق و سباق میں اس طریقۂ کاشت سے مکمل طور سے گریز کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ ان قبائلی لوگوں کی بقا کا انحصار "جھوم" کاشت کاری پر ہی ہے۔

اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور بہار میں قبائلی لوگوں کے بارے میں کیے گئے مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ جنگلات میں رہنے والے ۸۰ فی صد سے زیادہ لوگ ۲۵ فی صد سے لے کر ۵۰ فی صد تک اپنی خوراک جنگلات سے حاصل کرتے ہیں۔ چناں چہ شکار کرنے والے اور جنگلی پیداوار اکٹھا کرنے والے قبائلی فرقوں کے لیے جنگلاتی پیداوار بقا کا اہم ذریعہ ہے۔

جنگلات سے متعلق پالیسی

ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت قائم ہونے سے پہلے جنگلات میں رہنے والے لوگ اور دیگر فرقے آزادی کے ساتھ جنگلات سے فائدہ حاصل کرتے تھے یا اپنی گزر بسر کے لیے جنگلاتی وسائل سے مستفید ہوتے تھے۔ جنگلات کی زمینوں اور ان کی پیداوار پر لوگوں کے حق کے سلسلے میں محض رسمی ضابطہ موجود تھا۔ اس رسمی ضابطے کی وجہ سے جنگلات کے وسیع علاقوں اور چھوٹی سی آبادی کے وجود کے لیے کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ جنگلات میں رہنے والے لوگ نیز جنگلات کے اطراف رہنے والے لوگ صرف درختوں سے گرے ہوئے پتے، ٹہنیاں اور پھل ہی اکٹھا کرتے تھے اور جنگل میں کوئی درخت نہیں کاٹتے تھے، جس سے قدرتی جنگلات کے تحفظ میں مدد ملتی تھی۔

سرکاری جنگلات کے انتظام اور تحفظ کے لیے قواعد و ضوابط نافذ کرنے کے سلسلے میں پہلا قانون ۱۸۶۵ء میں منظور کیا گیا تھا۔ اس قانون کا اہم مقصد جنگلات پر سرکاری کنٹرول قائم کرنا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں برطانوی حکومت نے جنگلات کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا۔ ہندوستانی جنگلات سے متعلق جامع قانون ۱۹۲۷ء میں نافذ کیا گیا جس میں اس سے پہلے کے قانون کی تمام اہم دفعات شامل تھیں۔

برطانیہ کے نوآبادیاتی انتظامیہ نے جنگلات کی تجارتی اہمیت کا اندازہ لگایا اور مالیہ میں اضافہ کرنے کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس عمل میں اس نے جنگلات پر جنگل میں رہنے والے لوگوں اور دیگر لوگوں کے حق کی ضابطہ بندی کرنی شروع کر دی۔

۱۸۵۵ء میں جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے حقوق کو محدود کرنے کے سلسلے میں رہنما خطوط فراہم کرنے کے لیے ایک میمورنڈم جاری کیا گیا تھا اور سرکاری جنگلات کے انتظام اور تحفظ کے لیے قواعد و ضوابط نافذ کرنے کے سلسلے میں پہلا قانون ۱۸۶۵ء میں منظور کیا گیا تھا۔ اس قانون کا اہم مقصد جنگلات پر سرکاری کنٹرول قائم کرنا تھا۔ ایک اور جامع قانون یعنی ہندوستان کے جنگلات سے متعلق قانون، ۱۸۷۸ء میں جنگلات کی زمرہ بندی تین حصوں میں کی گئی ہے۔ (۱) مخصوص کردہ جنگلات، (۲) محفوظ کردہ جنگلات اور (۳) دیہی جنگلات۔ ریزرو کردہ جنگلات میں کچھ کاموں مثلاً ان میں داخل ہونے اور مویشیوں کو چرانے کی ممانعت کی گئی تھی۔ مقامی حکومتوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ جنگلاتی زمین یا بے کار زمین پر حکومت اور کسی شخص کے حق کی نوعیت اور حد کا پتا لگانے کے بعد کسی بھی جنگل یا زمین کو محفوظ کردہ جنگل کے طور پر اعلان کریں۔

۱۸۹۴ء میں برطانوی حکومت نے جنگلات کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان کیا، جس میں خاص طور سے جنگلات کے تجارتی استعمال پر زور دیا گیا تھا۔ اس سے جنگلاتی زمین اور پیداوار پر جنگلات میں

رہنے والے لوگوں کے حقوق اور مراعات کی ضابطہ بندی کے لیے راہ ہموار ہوگی ہندوستانی جنگلات سے متعلق جامع قانون ۱۹۲۷ء میں نافذ کیا گیا، جس میں اس سے پہلے کے قانون کی تمام اہم دفعات شامل تھیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ حکومت ہند سے متعلق قانون' ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی قانون ساز مجلسیں تشکیل دی گئیں اور جنگلات کا موضوع اس قانون کے تحت صوبائی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد متعدد صوبوں نے جنگلات کی ضابطہ بندی نیز جنگلاتی زمین اور پیداوار پر جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے حقوق اور مراعات کی ضابطہ بندی کے سلسلے میں خود اپنے قوانین وضع کیے۔ جنگلات کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی زیادہ تر تجارتی مفاد پر مبنی تھی اور اس کا مقصد نوآبادیاتی جنگلات پر مبنی صنعتوں کے لیے لکڑی اور دیگر جنگلاتی وسائل فراہم کرنا تھا۔ جنگلات کے تجارتی استحصال کا مقصد نوآبادیاتی حکمرانوں کے زیادہ سے زیادہ مفاد کے لیے جنگلات میں رہنے والے لوگوں، قبائلی لوگوں اور دیگر فرقوں کے مفادات کو قربان کر کے' اس کی حوصلہ افزائی کرنا اور اسے بڑھاوا دینا تھا۔ انھوں نے مستقبل کے نتائج پر غور کیے بغیر لائسنس شدہ ٹھیکے داروں کو ہر طریقے سے جنگلاتی وسائل اکٹھا کرنے کی اجازت دی تھی۔

نوآبادیاتی قوانین کی وجہ سے ہندوستان کی تقریباً ۹۰ فی صد جنگلاتی زمین سرکاری ملکیت میں آگئی، جس سے جنگلات کے لیے عوام کی رسائی محدود ہو گئی۔ جنگلاتی علاقے

> آزادی کے بعد جنگلات سے متعلق پالیسی کے سلسلے میں نئے سرے سے غور کیا گیا تھا۔ حکومت ہند نے ۱۹۵۲ء میں جنگلات کے بارے میں نئی قومی پالیسی کا اعلان کیا تھا، جس میں جنگل بانی کے ماحولیاتی اور سماجی پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا نیز تجارت و صنعت اور مالیہ جمع کرنے کی ضروریات کو محض ثانوی اہمیت دی گئی تھی۔

میں کمی واقع ہونے اور تیزی سے جنگلات ختم ہوتے جانے کی وجہ سے مقامی فرقوں پر سماجی، معاشی اور ماحولیاتی اثرات اور زیادہ رونما ہونے لگے۔ اردگرد کے ماحول کی خرابی اور سخت جنگلاتی قوانین کے سبب مقامی فرقوں کی خوراک تک رسائی، گزر بسر کا ذریعہ اور معیار زندگی پر خراب اثر پڑا ہے۔ حقیقی زندگی میں اس طرح کے فرقے سخت جنگلاتی قوانین کی وجہ سے جنگلاتی زمین کی پامالی اور جنگلاتی وسائل تک ان کی کم رسائی دونوں کے نتیجے میں بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

آزادی کے بعد جنگلات سے متعلق پالیسی کے سلسلے میں نئے سرے سے غور کیا گیا تھا۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۵۲ء میں جنگلات کے بارے میں نئی قومی پالیسی کا اعلان کیا تھا، جس میں جنگل بانی کے ماحولیاتی اور سماجی پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا نیز تجارت و صنعت اور مالیہ جمع کرنے کی ضروریات کو محض ثانوی اہمیت دی گئی تھی۔ ایک طرح سے یہ برطانوی حکومت کے دوران اختیار کردہ پالیسی کی ایک توسیع تھی، جس میں کہا گیا ہے کہ جنگلات کے قریب رہنے والے فرقوں کے دعوؤں کو قومی مفادات پر فوقیت نہیں دی جانی چاہیے۔ جنگلات اور

> ہندوستان کی آٹھ فی صد آبادی کے لیے، جس کی نمائندگی قبائلی لوگ کرتے ہیں، جنگلات گذر بسر کا اہم ذریعہ ہیں اور زراعت کے بارے میں قومی کمیشن (۱۹۷۶ء) کا پیش کردہ "سماجی جنگل بانی" کا نظریہ ایندھن، چارے اور دیگر چھوٹی جنگلاتی پیداوار کے لیے قبائلیوں اور غریب دیہی آبادی کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔

جنگلاتی پیداوار کا استعمال کرنے کے سلسلے میں جنگلات کے قریب رہنے والے لوگوں کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں زراعت کے متعلق قومی کمیشن نے جنگلاتی زمینوں کی زمرہ بندی (۱) محفوظ جنگلات، (۲) پیداواری جنگلات اور (۳) سماجی جنگلات کے طور پر کی تھی۔ کمیشن نے دیہی آبادی کی ضروریات کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا لیکن چھوٹی جنگلاتی پیداوار کے لیے قبائلی لوگوں اور جنگلات میں رہنے والے لوگوں کی ضرورت کا خیال نہیں رکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ کمیشن نے جنگلاتی ساز و سامان، پرال کی چھت ڈالنے مکان بنانے کے لیے لکڑی، پھلوں، پھولوں اور جڑیوں، جو خوراک کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں، یا خوردنی تیل نکالنے کے لیے بیجوں وغیرہ کے سلسلے میں آدی واسیوں کی ضرورت پر مناسب توجہ نہیں دی ہے — زراعت سے متعلق قومی کمیشن جنگلاتی کام کاج میں، آدی واسیوں کو روزگار فراہم کرنے کی بات تو کرتا ہے لیکن یہ اس بات کو نظر انداز کرتا ہے کہ قبائلیوں کے لیے گذر بسر کا اہم ذریعہ جنگلات کے محکمے کا فراہم کردہ براہِ راست روزگار نہیں، بلکہ چھوٹے جانوروں کا شکار اور جنگلاتی پیداوار اکٹھا کرنا ہے۔

ہندوستانی جنگلات سے متعلق بل ۱۹۸۰ء کا جھکاؤ امیروں اور شہروں کی طرف ہے اور یہ گاؤوں کے لوگوں کے مفاد کے منافی ہے۔ اس میں محفوظ کردہ اور مخصوص کردہ جنگلات کے سلسلے میں متعدد امتناعی قوانین کا ذکر کیا گیا ہے۔ بل میں سخت سزا کا ذکر ہے نیز اس کے ذریعہ سرکاری عملے کو بہت زیادہ اختیارات اور تحفظات فراہم

کیے گئے ہیں۔ قبائلی لوگ جو جنگلات پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں، اس بل سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں، کیوں کہ وہ ہمیشہ جنگلات سے متعلق عملے کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔

ہندوستان کی آٹھ فی صد آبادی کے لیے، جس کی نمائندگی قبائلی لوگ کرتے ہیں، جنگلات گذر بسر کا اہم ذریعہ ہیں اور زراعت کے بارے میں قومی کمیشن (۱۹۷۶ء) کا پیش کردہ "سماجی جنگل بانی" کا نظریہ ایندھن، چارے اور دیگر چھوٹی جنگلاتی پیداوار کے لیے قبائلیوں اور غریب دیہی آبادی کی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ قبائلی معیشت بنیادی طور سے خوراک اور گذر بسر پر مبنی معیشت ہے۔ روایتی طور سے وہ صرف اپنے لیے اور اپنی برادری کے لیے پیداوار کرتے ہیں۔ محکمۂ جنگلات کا یہ عام خیال ہے کہ قبائلی لوگ جھوم کاشت کاری، جلانے کی لکڑی کے لیے اندھا دھند درختوں کو کاٹنے وغیرہ جیسے اپنے نقصان دہ طریقوں سے جنگلات کو تباہ و برباد کردیتے ہیں۔

جنگلات سے متعلق قومی پالیسی

۱۹۸۸ء گزشتہ پالیسیوں سے نمایاں طور سے الگ ہے، خاص طور سے اس لحاظ سے کہ اس میں اس بات کا واضح طور سے اعتراف کیا گیا ہے کہ ہمارے جنگلات کا بنیادی کام ماحولیاتی استحکام کو برقرار رکھنا ہے۔ پالیسی کے مطابق جنگلات سے متعلق پالیسی کا اہم مقصد فضائی توازن سمیت ماحولیاتی استحکام اور توازن کو یقینی بنانا ہونا چاہیے، جو زندگی کی تمام شکلوں، یعنی انسان حیوان اور پودوں کی بقا کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ نئی پالیسی کا واضح اور خاص مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی جنگلاتی دولت کا تحفظ کیا جائے۔ بنجر زمینوں پر جنگل بانی کو فروغ دیا جائے اور ہندوستانی جنگلات کے جینیاتی وسائل کا تحفظ کیا جائے۔ ۱۹۸۸ء کی قومی جنگلاتی پالیسی کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں جنگلات کے انتظام کے کام میں جنگلات میں رہنے والے لوگوں، قبائلی لوگوں اور جنگلات کے قریب رہنے والے لوگوں کو شامل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

وقت کی اہم ضرورت

یہ بات اب واضح ہوگئی ہے کہ جنگلات کے سرکاری انتظام کا ایک ایسا نظام ماضی میں ناکام ثابت ہوا ہے جو جنگلات کے بارے میں پالیسی وضع کرنے اور زیادہ سخت تعزیری اقدامات کرنے پر مبنی ہو۔ پائیدار ترقی کے لیے جنگلات کا جمہوری، لامرکزی اور اشتراکی انتظام وقت کی ضرورت ہے۔ پائیدار ترقی ماحولیاتی حلقوں میں سرگرداں ایک نیا لفظ ہے۔ پائیدار ترقی سے عام طور پر مراد "معاون ماحولیاتی نظام کی گنجائش کے اندر انسانی زندگی کے معیار کو بہتر بنانے" سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اب یہ بات ممکن ہے کہ عوام پر مبنی ایسی پالیسیاں وضع کی جائیں، جن میں جنگلات میں رہنے والے لوگوں اور قبائلی لوگوں کو ایک ذمہ داری نہیں بلکہ انسانی اثاثہ سمجھا جائے گا۔ پائیدار ترقی کے اصولوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے ماحولیات، انسانیات اور اقتصادیات کے مناسب تال میل کی معلومات ہونے کی ضرورت ہے، جس سے جنگلات اور قبائلیوں کی مربوط اور ہم آہنگانہ ترقی عمل میں آسکتی ہے۔ جنگلات کا انتظام ایک بہت وسیع نظریہ ہے جو جنگلات کے استعمال اور تحفظ کے سلسلے میں انتظامی، معاشی، سماجی، رویہ جاتی، قانونی، تکنیکی اور سائنسی جہتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جنگلات کے پائیدار انتظام میں جنگلاتی ماحول کے تحفظ اور اسے برقرار رکھنے کے سلسلے میں مسلسل اور دانستہ انسانی مداخلت شامل ہے۔ جنگلات کے لامرکزی اور شرکت پر مبنی انتظام کو ملک میں جنگلات کے ختم ہوتے جانے اور ماحولیاتی خرابی کے مسائل کا واحد طویل مدتی حل سمجھا گیا ہے۔

۱۹۸۸ء کی قومی جنگلاتی پالیسی میں جنگلات کے انتظام کے کام میں جنگلات پر انحصار کرنے والے گاؤوں کے لوگوں کو شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اس نئے نقطۂ نظر کی وجہ سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ جس نے ان دنوں بہت زیادہ اہمیت حاصل کرلی ہے۔ جنگلات کی پائیدار ترقی و فروغ کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے گاؤوں کے لوگوں اور جنگلات سے متعلق عملے کو اور زیادہ قریب لانے کے سلسلے میں اب غیر سرکاری تنظیمیں آگے آئی ہیں۔

چوں کہ مختلف علاقوں کے قبائلی لوگوں کی مختلف سماجی، معاشی اور ثقافتی خصوصیات ہیں۔ اس لیے جنگلات کے انتظام کے کام میں قبائلی لوگوں کی شمولیت کی نوعیت اور حد مختلف حالات میں مختلف رہے گی۔ قبائلیوں کو شامل کرتے ہوئے جنگلات کا مشترکہ انتظام ایک علاقے میں بہت کامیاب ثابت ہوسکتا ہے تو دوسرے علاقے میں کامیاب ثابت نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس کا انحصار قبائلی لوگوں کے ذریعے حکومت کے اس نئے طریقے کو سمجھنے اور اسے اپنانے کی صلاحیت پر ہے۔ لیکن ملک کے بہت سے علاقوں میں غیر سرکاری تنظیموں نے اس سمت میں شروعات

> ہندوستان کے بہت سے حصوں میں جنگلات کے مشترکہ انتظام نے متعلقہ پروگرام کی کامیابی سے سماجی تبدیلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے سماجی علوم اور انتظامیہ سے متعلق محققین کے لیے نئے نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔

کر دی ہے۔ شرکت کرنے کے سلسلے میں قبائلیوں کو ترغیب دینے کے بعد "جنگلات کے مشترکہ انتظام" سے متعلق پروگراموں پر منظم طور سے عمل درآمد کرنے سے گاؤوں کی سطح پر قبائلیوں میں نیز حکومت کی افسر شاہی تنظیم میں رویے اور رجحان کے لحاظ سے مطلوبہ کافی تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ اس جگہ ماہرین انسانیات کے کردار کی ضرورت ہے۔ انسانیاتی عملی تکنیکوں سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کے پروگرام کی کامیابی میں کافی مدد ملتی ہے۔

قبائلی لوگوں اور گاؤوں کے لوگوں نیز جنگلات سے متعلق عملے کے رویے میں تبدیلی آنے کا اندازہ لگانے کے لیے معیار کے لحاظ سے اطلاعات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے اطلاعات کے مقابلے میں، جیسا کہ ظاہری ہے، معیار کے لحاظ سے اطلاعات اندرونی، موضوعی، زبانی اور توصیفی ہیں۔ اس طریقے میں کچھ سرگرمیوں یا خصوصیات کا مشاہدہ کرنا شامل ہے۔ جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق پروگرام میں شرکت کرنے کے بعد قبائلی لوگ اب جنگلات میں کیسے رہتے ہیں اور ان کا رویہ کیا رہتا ہے، وہ اس سے پہلے کیسے رہتے تھے اور ان کا رویہ کیا تھا، وہ اب جنگلات سے متعلق عملے کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں اور ان سے کیسے بات چیت کرتے ہیں، جب وہ جنگلات سے ایندھن کی لکڑی کا اپنا مقررہ حصہ اکٹھا کرتے ہیں تو انھیں کیسا محسوس ہوتا ہے (اس سے قبل قبائلی لوگوں کو مجرم سمجھا جاتا تھا) چھوٹے پیمانے پر منصوبہ بندی کرنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیالات کرنے کی غرض سے یا گاؤں کے کسی جھگڑے میں مصالحت کرانے والے کا کام انجام دینے کے لیے، خواہ اس جھگڑے کا تعلق جنگلات سے متعلق سرگرمیوں سے نہ ہو، جنگلات میں رہنے والے لوگ اسی سطح پر گاؤوں والوں کے ساتھ کیسے بیٹھتے ہیں (کیا وہ اب بھی کچھ دوری برقرار رکھتے ہیں یا ان میں اب بھی کچھ برتری یا کمتری کا احساس پایا جاتا ہے؟)

جنگلات کے مشترکہ انتظام کی کامیابی نیز جنگلات، جنگلات میں رہنے والے لوگوں اور قبائلی لوگوں کی پائیدار ترقی کے لیے ان تمام سرگرمیوں کا بغور جائزہ لینا ہوگا۔

ہندوستان کے بہت سے حصوں میں جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق پروگرام کی کامیابی سے سماجی تبدیلی کے عمل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے

> جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق پروگرام کی زیادہ سے زیادہ کامیابی کے لیے قبائلیوں اور دیگر فرقوں نیز جنگلات سے متعلق عملے کو اپنے اصولوں، رویے اور طریقہ کار میں ازسرِ نو تبدیلی لانی ہوگی۔

کی غرض سے سماجی علوم اور انتظامیہ سے متعلق محققین کے لیے نئے نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ جنگلات سے متعلق محکمے اور جنگلات میں رہنے والے لوگوں کے درمیان جنھیں پروگرام میں ساجھے دار کی حیثیت سے ذمہ داری اور اختیارات دیے گئے ہیں، مربوط عمل اور زیادہ سے زیادہ تعاون کی وجہ سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کا پروگرام بہت سے علاقوں میں کامیاب رہا ہے۔ جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق پروگرام کی زیادہ سے زیادہ کامیابی کے لیے قبائلیوں اور دیگر فرقوں نیز جنگلات سے متعلق عملے کو اپنے اصولوں، رویے اور طریقہ کار میں ازسرِ نو تبدیلی لانی ہوگی۔ ایک ساتھ بیٹھ کر انھیں ایک دوسرے کے مسائل، خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے اور ان پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہیے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جنگلات کے تحفظ سے متعلق کمیٹی میں گاؤوں کی عورتوں کی شرکت سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کا پروگرام اور زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ خاتون اراکین پڑوسی گاؤوں کی عورتوں کو اپنے مخصوص جنگلات سے لکڑی اکٹھا کرنے سے روک سکتی ہیں۔

اگرچہ دیہی کمیونٹی کے اراکین عمر، جنس، ذات، قبیلے، پیشے وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں لیکن اگر وہ جنگلات کے تحفظ کے سلسلے میں متحد رہتے ہیں تو جنگلات کے مشترکہ انتظام کا پروگرام ملک بھر میں کامیاب رہے گا۔

حکومت ہند کے محکمۂ جنگلات نے جنگلات کے مشترکہ انتظام، شرکت پر مبنی گاؤں کا جائزہ لینے کے طریقے، جنس سے متعلق امور وغیرہ کے بارے میں آئی۔ ایف۔ ایس افسران کے لیے لازمی تربیت کا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ جنگلات سے وابستہ ہونے والے ان نئے لوگوں کو ذمہ داری سے پُر ان کے اس کام سے واقف کرایا جائے، جن پر پائیدار ترقی کے لیے ہمارے جنگلات کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ ●

بقیہ: قدرتی کھاد اور کھیتی باڑی

۹ فروری ۱۹۹۷ء کو نئی دہلی میں زرعی تحقیق کے ادارے کے جلسہ تقسیم اسناد میں دیا تھا۔

• ماحولیاتی تحریک کے انتہا پسند عناصر جو بین اقوامی مالیاتی اداروں پر کافی اثر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ان اداروں کے ذمہ داران کے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ کیمیاوی کھادوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور قدرتی کھادوں سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ یہ بات حقیقت سے کتنی دور ہے۔ محض قدرتی کھاد استعمال کرکے ہم دنیا کی خوراک کی ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتے بالخصوص سہارا کے جنوب کے افریقی ممالک میں جہاں قدرتی اشیا بہت کم مقدار میں دستیاب ہیں۔ ایسی سفارش کرنا افریقی ممالک کی بربادی والی بات ہے۔ یہ وقت ہے کہ دنیا اس خطرے کے تئیں بیدار ہو۔"

●

جے پی گپتا، امل کار اور اے۔ ایس۔ فروڈا

ریگستان کا پھیلاؤ: مسائل اور ممکنہ حل

ریگستان کا بننا اور پھیلنا قدرتی اسباب کے ساتھ ساتھ انسان کی اپنی سرگرمیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا ہونے سے جہاں ہمیں زمین سے کم پیداوار حاصل ہوتی ہے وہاں ماحولیاتی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں مصنفین نے مسئلے کی بنیادی وجوہ کا تجزیہ کیا ہے اور ممکنہ حل بھی تجویز کیے ہیں۔

ریگستان خشک، نیم خشک اور خشک و نیم مرطوب خطوں میں مختلف عناصر کے سبب زمین کی تنزلی کی وجہ سے بنتے ہیں اور ان عناصر میں موسمی تغیرات اور انسانی سرگرمیاں دونوں شامل ہیں (نامعلوم ۱۹۹۵ء) زمین کی صلاحیت پیداوار بالکل ختم یا کم ہو جاتی ہے اور ایشیائی ممالک میں یہ ایک بڑا ماحولیاتی مسئلہ ہے۔ ہندوستان میں خشک زمینوں کا رقبہ ملک کے کل جغرافیائی رقبے کا ۶۱۱۹ فی صد (۲۰۳ ملین ہیکٹیر) ہے اور یہ خشک زمینیں گرم خشک، نیم خشک اور خشک و نیم مرطوب علاقوں میں ہیں۔ (نقشہ دیکھیے) کیا ستم ظریفی ہے کہ ان علاقوں میں آبادی میں کافی اضافہ ہو رہا ہے اور محدود زمین اور آبی وسائل پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ نئی نئی صنعتیں وہاں قائم ہو رہی ہیں جو فضا، مٹی اور پانی میں زہریلے مادے چھوڑ رہی ہیں۔ ان کا نتیجہ ہے ریگستان بننے کی جانب پیش قدمی یا دوسرے الفاظ میں زمین کی تنزلی اور ان موسمی طور پر معتدل خطوں کی صلاحیت پیداوار میں بتدریج کمی حکومت ہند کے ایک حالیہ اندازے کے مطابق ملک کی ۳۲۶۷ فی صد زمین (۱۰۷۶۴۳ ملین ہیکٹیر رقبہ اراضی) تنزلی کے عمل کا شکار ہے (نامعلوم ۱۹۹۴ء) اور اس تنزلی کو روکنے کے لیے سنجیدہ غور و خوض کی ضرورت ہے۔

وجوہ

ہندوستان کے بعض حلقوں میں ریگستانی حالات پیدا ہونے کے عمل کو سمجھنے کے لیے نظام قدرت کے تحت جغرافیائی عوامل

ہندوستان میں خشک زمینوں کا رقبہ ملک کے کل جغرافیائی رقبے کا ۶۱۱۹ فی صد (۲۰۳ ملین ہیکٹیر) ہے اور یہ خشک زمینیں گرم خشک، نیم خشک اور خشک و نیم مرطوب علاقوں میں ہیں۔

کو اور ان عوامل کی رفتار تیز کرنے میں انسانی مداخلتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ خشک خطوں کے بارے میں تحقیق کرنے والے مرکزی انسٹی ٹیوٹ (سی۔ اے۔ زیڈ۔ آر۔ آئی) واقع جودھپور نے ہندوستان کے خشک مغربی حصے میں ریموٹ سینسنگ اور فیلڈ انفارمیشن کا استعمال کرتے ہوئے حال ہی میں کچھ جائزے لیے ہیں (فروڈا اینڈ سنگھ — ۱۹۹۷ء) اس خطے میں زیادہ تر دو موسمی عمل پائے جاتے ہیں: فلیوریئل (FLURIAL) اور الولین (AEOLIAN) اگرچہ کچھ اور عمل بھی وہاں دیکھے گئے ہیں مثلاً فلیو میرین (FLURIO-MARINE) وغیرہ جنھوں نے زمین کی بڑی اور اونچی اشکال مثلاً پہاڑیوں، چٹانوں اور وسیع زرخیز میدانوں ریتیلے ٹیلوں وغیرہ کی نشو و نما میں ایک بڑا رول ادا کیا ہے۔ حال ہی میں وہاں کچھ اور خصوصیات دیکھی گئی ہیں جو ریگستانی حالات کا ایک اچھا اشاریہ ہیں۔

پانی کا کٹاؤ

مٹی کے کٹاؤ سے سوراشٹر اور کچھ کے وسیع علاقے اور تھار ریگستان کا مشرقی حاشیہ متاثر ہوا ہے جہاں سالانہ بارش کی اوسط ۳۵۰ تا ۵۰۰ ملی میٹر اور مغربی حاشیے پر ۲۵۰ ملی میٹر ہے۔ (کار — ۱۹۹۶ء) اس کا مظہر پانی کے کٹاؤ سے بننے والے نالے

نالیاں اور چشمے ہیں۔ گزشتہ دہائیوں میں زیادہ ہل چلانے، ایندھن کے لیے درخت اور جھاڑیاں وغیرہ کاٹنے، مویشیوں کو چرانے اور دوسرے تباہ کن استعمالوں سے مٹی کے کٹاؤ کی رفتار تیز ہو گئی ہو گی لیکن مستند تفصیلات میسر نہ ہونے کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مٹی کے کٹاؤ وغیرہ میں کتنا ہاتھ انسانی سرگرمیوں کا ہے اور کتنا قدرتی عوامل کا۔ گجرات میں مسئلے کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہاں گزشتہ صدیوں کے دوران قدرتاً زمین کی سطح کافی

> ہوا سے ہونے والے مٹی کے کٹاؤ/جماؤ کی واضح ترین مثالیں تھار ریگستان میں ریت کے اونچے اونچے ٹیلوں اور ریت کے اڑنے اور ایک جگہ پر جمع ہو جانے سے بننے والی دوسری اشکال میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اوپر اٹھ گئی ہے جس سے بنیادی سطح بدل گئی ہے اور کٹاؤ بڑھ گیا ہے۔

ہوا سے ہونے والا مٹی کا کٹاؤ/جماؤ

ہوا سے ہونے والے مٹی کے کٹاؤ/جماؤ کی واضح ترین مثالیں تھار ریگستان میں ریت کے اونچے اونچے ٹیلوں اور ریت کے اڑنے اور ایک جگہ پر جمع ہو جانے سے بننے والی دوسری اشکال میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ نزدیکی مشاہدہ سے پتا چلا ہے کہ ریت کے کٹاؤ یا جماؤ سے بننے والی زمینی اشکال مشرقی تھار میں مغربی تھار کی بہ نسبت زیادہ مستحکم ہیں۔

روایتی ہل کی جگہ ٹرکوں کا استعمال شروع ہو جانے سے ریگستان کے وسیع حصوں میں AEOLIAN عمل کے لیے ریت کی مقدار کئی گنا بڑھ گئی ہے اور ریت کی نقل و حرکت بھی تیز ہو گئی ہے۔ اس کے لیے قدرتی ہریالی کی تباہی، ایندھن اور چارے کے لیے پیڑ پودوں اور گھاس کی کٹائی اور کھیتی باڑی کی کم موزوں ریتیلے علاقوں پر توسیع بھی ذمہ دار ہیں۔ اراولی کی پہاڑیوں کی تلہٹی میں واقع ریگستان کے مشرقی حصے میں اس قسم کی سرگرمیوں سے پانی سے ہونے والا کٹاؤ بڑھ گیا ہے جیسا کہ نالوں اور چشموں کے بننے سے ظاہر ہے۔ کاشت کار یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ٹریکٹر استعمال نہ کیے جائیں تو ان کی زراعتی سرگرمیوں سے مٹی کا کٹاؤ نہیں بڑھتا۔ اگرچہ وہ مشرق میں نالوں اور بدر روؤں کے بننے سے ناآشنا نہیں ہیں۔ بہت سے کاشت کاروں کا خیال ہے کہ فصل کاٹنے کے بعد وہ کھیتوں میں پودوں وغیرہ کا جو حصہ (ٹھونٹھ) زمین میں چھوڑ دیتے ہیں وہ ریت کو باندھے رکھتا ہے اور جو زمین پانی کے کٹاؤ سے نالے نالیوں میں بدل جاتی ہے وہ قدرت کا آہستہ آہستہ رونما ہونے والا کھیل ہے۔ ریگستان کے دوسرے حصوں میں کاشت کار تسلیم کرتے ہیں کہ ٹریکٹروں سے گہری جُتائی، ٹیلوں کی ڈھلانوں پر کھیتی یا زمین کو خالی چھوڑنے کے پرانے طریقے پر عمل نہ کرنے سے ریت کی نقل و حرکت بڑھتی ہے اور اس کے نتیجے میں زمین کا زوال شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ کیا کریں کیوں کہ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس طرح بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتیں اور اقتصادی ملحوظات ماحولیاتی ملحوظات پر ترجیح پا جاتے ہیں۔

> تھار ریگستان میں اندرا گاندھی کینال کمانڈ ایریا (آئی۔ جی۔ این۔ پی) میں سیم (واٹر لاگنگ) اور شور ریت۔ الکلی کا مسئلہ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

ایک اور مسئلہ

ایک اور بڑا مسئلہ مٹی میں سیم اور شور ریت۔ کھاری پن پیدا ہونے کا ہے۔ یہ مسئلہ خصوصاً ان میدانوں میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے جہاں سیلابی مٹی آکر جمع ہوتی رہتی ہے یا جہاں زمینی پانی سے آب پاشی کی جاتی ہے۔ کچھ اور سوراشٹر کے سمندر کے قریب واقع میدانوں میں جہاں سیلابی ریت مٹی آکر جمع ہوتی رہتی ہے۔ زمین کے نیچے کا صاف پینے لائق پانی پمپوں کے ذریعے حد سے زیادہ مقدار میں نکال لیے جانے کے بعد بہت سے ساحلی علاقوں میں زمین میں سمندر کا کھاری پانی آ گیا ہے۔ چوں کہ کاشت کاروں کے پاس فصلوں کو پانی دینے کے لیے کوئی اور ذریعہ نہیں ہے اس لیے وہ اس مقصد کے لیے زمینی پانی ہی استعمال کرتے رہتے ہیں گو اس پانی کی کوالٹی سمندری پانی کی یورش سے بہت متاثر ہو چکی ہے۔ تھار ریگستان میں اندرا گاندھی کینال کمانڈ ایریا (آئی۔ جی۔ این۔ پی) میں سیم (واٹر لاگنگ) اور شور ریت۔ الکلی کا مسئلہ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ آئی۔ جی۔ این۔ پی کے مرحلۂ اول کے تحت لائے گئے علاقوں میں سیم زدہ زمین کا رقبہ ۱۹۸۱ء میں ۲۴۲ مربع کلومیٹر سے بڑھ کر ۱۹۹۰ء میں ۹۸۰ مربع کلومیٹر ہو گیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ریتیلی مٹی کے نیچے اتھلی گہرائی کا جپسم اور کیلسیم والی مٹی کا جماؤ پیدا ہو گیا ہے۔ شور ریت کا یہ جماؤ ریگستان کے جنوبی اور وسطی حصے میں آبپاشی کے چھوٹے تالابوں کے کمانڈ ایریا میں اور ایسی جگہوں پر دیکھا گیا ہے جہاں نہر کے راستے میں ایسے چینل آ گئے ہیں جن میں بہت زیادہ نمک ہے۔ نالیاں وغیرہ نکالنے کی غلط پلاننگ بھی زمین کی تنزلی کے لیے ذمہ دار ہے۔ مثال کے طور پر گنگا نگر ضلع میں گھگر (سرسوتی) کی خشک وادی جس کا مکمل انحصار نہر ہی پر ہے، ایک چھوٹی نہر جاکھر والی اور صورت گڑھ کے درمیان واقع اٹھارہ زرخیز میدانوں کو ملانے کے لیے اس امید کے ساتھ نکالی گئی کہ فالتو پانی ریت جذب کر لے گی۔ اس کا نتیجہ سنگین واٹر لاگنگ اور شور ریت

والکلی کی شکل میں نکلا جس کی وجہ سے انھیں اپنی زمین اور مکان چھوڑنا پڑا اور بے پناہ سماجی واقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

صنعتی کچرا

صنعتوں سے خارج ہونے والا گندہ پانی اور کچرا راجستھان میں زمین اور پانی کی آلودگی کا ایک بڑا سبب بن گیا ہے۔ یہ مسئلہ خاص کر جودھپور، پالی اور بالوترا شہروں میں کافی شدت اختیار کر چکا ہے جہاں کپڑا رنگنے اور چھاپنے کی صنعتوں کا استعمال شدہ کیمیاوی پانی چھوٹے چھوٹے عارضی ندی نالوں میں بہایا جاتا ہے جس سے نچلے علاقوں میں سطح زمین سے اوپر اور نیچے کا پانی آلودہ ہو گیا ہے۔ آب پاشی کے لیے اس زہریلے پانی کے استعمال سے زمین کی کوالٹی میں ابتری آئی ہے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ۲۴۵۰۰ ہیکٹیر اراضی متاثر ہوئی ہے۔ اس میں سے ۲۴ فی صد عارضی پر معتدلانہ اثر پڑا ہے اور ۳۴ فی صد اراضی شدید طور پر متاثر ہوئی ہے۔ (سنگھ اور رام۔ ۱۹۹۷ء) صنعتوں سے نکلنے والے اس کیمیاوی پانی کو صاف کر کے اسے دوبارہ قابل استعمال بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

کان کنی

مغربی راجستھان میں تقریباً بیس بڑی دھاتیں اور ۹ چھوٹی دھاتیں کانوں سے نکالی جاتی ہیں۔ کان مالکوں کی لوٹ سے فی صد سے زائد کانیں کھلے دہانے والی کانیں ہیں۔ باقی زمین دوز کانیں ہیں۔ کانوں کا علاقہ دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے۔ خیال ہے کہ ۲۰۰۰ء تک جیسلمیر ضلع کا ۰٫۵ فی صد علاقہ اور جھنجھنوں ضلع کا ۱٫۵ فی صد علاقہ کان کنی کی سرگرمیوں کے تحت آجائے گا۔

سطحی کان کنی سے زمین کی کوالٹی خراب ہوتی ہے۔ کھدائی کا کام مکمل ہو جانے کے بعد کانوں کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور زمین کو دوبارہ قابل کاشت بنانے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ زرعی اراضی پر کان کنی، خواہ وہ زمین کی سطح پر ہو یا زیر زمین، کھدائی کا ملبہ وغیرہ پھینکے جانے سے زمین کی پیداواریت کم ہو جاتی ہے۔ معدنیات کی پراسیسنگ، مثلاً سیمنٹ انڈسٹری کے لیے چونے کا پتھر اور چینی مٹی کے برتن بنانے کی صنعت کے لیے کیلسائٹ اور سوپ اسٹون کے پیسے جانے سے زمین پر تین گنا خراب اثر پڑتا ہے۔ ان اشیا کی پسائی کے دوران باریک ذرات اڑتے ہیں اور فضا میں مل جاتے ہیں اور بعد میں آس پاس کی زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے زمین کی پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔

کان کنی کی وجہ سے زمین کے نیچے پانی کی نقل و حرکت محدود ہو جاتی ہے۔ سبزہ اور ہریالی کے ختم ہو جانے سے زمین کے پانی جذب کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور علاقے میں آبی توازن بدل جاتا ہے اور زمین میں شوریت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب چینی مٹی، بنٹونائٹ اور کھریا مٹی کی کانوں کی کھدائی کا ملبہ ریتیلی زمین پر ڈھیر کر دیا جاتا ہے تو اس سے زمین پر ایک نئی پرت جمع ہو جاتی ہے۔ مون سون کے دوران ان علاقوں میں باڑھ کا پانی آجاتا ہے اور رفتہ رفتہ زمین میں شوریت پیدا ہو جاتی ہے۔ سوڈیم سالٹ کی کانوں کی کھدائی سے سطح زمین کے اوپر نمک جمع ہونے لگتا ہے اور ہریالی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

ہریالی کا خاتمہ

ریگستانی حالات کے پیدا ہونے کی پہلی علامت قدرتی ہریالی کا خاتمہ ہے اور یہی ریگستان بننے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھنے کے نتیجے میں ہریالی کی کمی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ گاؤں کے آس پاس کی مشترکہ چراگاہوں کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے کیوں کہ ان کا بہت زیادہ استعمال کیا جارہا ہے اور ان کی دیکھ بھال اور رکھ رکھاؤ سے عدم توجہی برتی جارہی ہے۔ چرائی کی بہت سی زمین زراعت کے لیے استعمال کی جانے لگی ہے۔ ریگستان کے راجستھانی حصے کے کچھ مطالعاتی جائزوں سے معلوم ہوا ہے کہ اگرچہ اوسطاً ۴۰۰ ملی میٹر سالانہ بارش اچھی قسم کی گھاس پیدا کرنے والے علاقوں میں سے کسی میں بھی ہریالی تقریباً سات فی صد سے گھٹ کر ایک فی صد نہیں ہوئی ہے لیکن ۳۰۰ ملی میٹر سالانہ سے زیادہ بارش کی اوسط والے خطے میں درخت اور جھاڑیاں وغیرہ آٹھ فی صد سے گھٹ کر ایک یا دو فی صد رہ گئی ہیں۔ جوں جوں کارآمد پودوں کا حد سے زیادہ استعمال ہوتا ہے توں توں ان کی جگہ غیر کارآمد اور گھٹیا قسم کے پودے یا ایسے پودے لے لیتے ہیں جن کی افزائش سست اور محدود ہوتی ہے۔ اس طرح سے بایوماس پروڈکشن بھی بہت محدود ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً چراگاہوں میں چارے سے

صنعتوں سے خارج ہونے والا گندہ پانی اور کچرا راجستھان میں زمین اور پانی کی آلودگی کا ایک بڑا سبب بن گیا ہے۔

ریگستانی حالات کے پیدا ہونے کی پہلی علامت قدرتی ہریالی کا خاتمہ ہے اور یہی ریگستان بننے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھنے کے نتیجے میں ہریالی کی کمی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

اور کٹی وغیرہ کی ضرورت بھی پوری نہیں ہو پاتی۔

ان جائزوں اور مصنوعی سیارے سے موصول تصاویر اور دیگر ذرائع کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی راجستھان میں ۱۲ فی صد علاقہ مدھم رفتار سے، ۴۰ فی صد درمیانی رفتار سے اور ۲۱ فی صد تیز رفتار سے ریگستان بننے کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔ تدارکی اقدامات کرنے کی غرض سے یہ تمام اطلاعات نقشوں کی شکل میں مرتب کر لی گئی ہیں۔

> مغربی راجستھان میں ۱۲ فی صد علاقہ مدھم رفتار سے، ۴۰ فی صد درمیانی رفتار سے اور ۲۱ فی صد تیز رفتار سے ریگستان بننے کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔

تدارکی اقدامات

ریتیلے ٹیلے: راجستھان کے تقریباً ۵۸ فی صد حصے میں مختلف قسموں کے ریتیلے ٹیلے ہیں۔ انھیں نئے اور پرانے دو زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ نئے ٹیلوں پر جھاڑیوں سے جنگل سے آگے بڑھتے ہیں جو کئی مسئلے پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے ٹیلے پرانی طرز کے ہیں اور وہ دوبارہ زندگی پانے کے مختلف مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔ خشک علاقوں کے بارے میں تحقیق کرنے والے انسٹی ٹیوٹ (سی۔ اے۔ زیڈ۔ آر۔ آئی) نے ریتیلے ٹیلوں کو مستحکم بنانے کے لیے موزوں تکنالوجیاں تیار کی ہیں:۔

(۱) ان ٹیلوں کو حیاتی مداخلتوں سے بچانا (۲) ٹیلوں کی چوٹی سے نیچے بنیاد تک متوازی یا بساط شطرنج کے انداز کے "مائکرو وِنڈ بریکس" بنانا (۳) "مائکرو وِنڈ بریکس" کے درمیان گھاس یا بیلیں بونا اور "بریکس" کے درمیان ۵×۵ میٹر کے فاصلے سے نرسری میں اُگائے ہوئے پودے روپنا۔ اس مقصد کے لیے چارے اور گھاس کی موزوں ترین قسمیں ہیں۔ اسرائیلی ببول، پھوگ، موہنی، گنڈی، سیوان، دھمان اور کھیما۔

ریت کے ۸۰ فی صد ٹیلے کاشت کاروں کے ہیں اور ان پر زیادہ تر کاشت مون سون کے موسم میں کی جاتی ہے۔ ایسے ٹیلوں کو مستحکم بنانے کے لیے بھی تکنیک وہی ہے لیکن سارے ٹیلے پر درخت نہیں اُگانے چاہئیں۔ درخت قطاروں میں لگانے چاہئیں۔ درختوں کی دو قطاروں کے درمیان فصل/گھاس اگائی جا سکتی ہے۔ اس تکنیک پر عمل کرکے کاشت کار غلہ بھی حاصل کر سکتا ہے اور اپنے ٹیلے والے پلاٹ کو مستحکم بھی بنا سکتا ہے۔

سایہ دار قطاریں

کھیتی باڑی کی سطح زمین پر مٹی میں ریت کی موجودگی کے سبب تیز ہوائیں چلنے پر کافی زیادہ مٹی اڑ کر چلی جاتی ہے اور یہی مٹی کے کٹاؤ کا باعث ہوتا ہے۔ گرمی کے مہینوں میں تیز ہوائیں کبھی کبھی ۷۰-۸۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں۔ مٹی کا ضیاع بہت زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ فی ہیکٹیئر ۵ ٹن تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر ہوا کے الٹے رخ پر درختوں کی تین سے پانچ قطاریں لگا دی جائیں تو مٹی کے کٹاؤ کی مقدار کم کی جا سکتی ہے۔

درختوں کی یہ قطاریں ہوا کی تیز رفتاری میں دو انچ سے ۱۰ انچ تک کے فاصلے پر ۲۰ سے ۴۶ فی صد کی کمی کر دیتی ہیں اور مٹی کا ضیاع صرف ۱۸۴ کلوگرام فی ہیکٹیئر رہ جاتا ہے جب کہ ان علاقوں میں جہاں سایہ دار درختوں کی قطاریں نہیں ہیں مٹی کا کٹاؤ ۵۴۶ کلوگرام فی ہیکٹیئر ہوتا ہے (دگپتا — ۱۹۹۷ء) اس کے علاوہ سایہ دار درختوں والے علاقوں میں دوسرے علاقوں کی بہ نسبت مٹی میں ۱۴ فی صد زیادہ نمی ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ درختوں کی چھنٹائی سے چارے کی ضرورت بھی پوری کی جا سکتی ہے۔

فضائی بیجائی

مٹی ریتیلی ہونے کی وجہ اس کی پانی کو اپنے اندر جذب رکھنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بیجائی دو تین دن میں پوری کر لی جائے تاکہ انکور جلدی پھوٹ سکیں۔ اس قدر وسیع اور رسائی کے ناقابل خطے میں جہاں مٹی میں بہت کم نمی ہے، بارش غیر یقینی ہوتی ہے اور مٹی ریتیلی اور ڈھیلی ہے، شجرکاری کے روایتی طریقے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں فضائی بیجائی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

> یہ تکنالوجی ملک کی خشک سالی کے امکان والی ریاستوں مثلاً گجرات، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں آزمائی گئی ہے۔ اس کے تحت درختوں اور مختلف قسم کی گھاس کے بیج ملا لیے جاتے ہیں اور مون سون سے پہلے اور بعد ہوائی جہاز سے بڑے پیمانے پر بوائی کی جاتی ہے۔

یہ تکنالوجی ملک کی خشک سالی کے امکان والی ریاستوں مثلاً گجرات، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں آزمائی گئی ہے۔ اس کے تحت درختوں اور مختلف قسم کی گھاس کے بیج ملا لیے جاتے ہیں اور مون سون سے پہلے اور بعد ہوائی جہاز سے بڑے پیمانے پر بوائی کی جاتی ہے۔ بیجوں کو مٹی، پالمبر (جل عکسی) اور

کھیتوں میں ڈالی جانے والی کھاد میں لپیٹ کر گولیاں سی بنالی جاتی ہیں۔ لیکن اگر چرائی جاری ہو اور مٹی بہت زیادہ نم ہو تو بہت سے بیج بے کار جا سکتے ہیں۔ ایک جائزہ بتاتا ہے کہ ایسے حالات میں صرف ایک دو فی صد درخت ہی آئندہ سالوں میں بھرے پورے درخت بن سکے۔ گھاس کی پیداوار میں آئندہ سالوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا لیکن بہت زیادہ چرائی کی وجہ سے گھاس کی جڑیں تک ختم ہو گئیں۔ لہٰذا اس عمل کو چار یا پانچ برس تک لگاتار دوہرانا چاہیے تاکہ عمدہ بارش والے میں اچھے نتائج برآمد ہو سکیں۔ علاقے کو حیاتی مداخلتوں سے بچانا چاہیے۔

درختوں کی پرورش کا نیا طریقہ

ایندھن اور چارے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیڑ پودوں کی اندھادھند کٹائی سے ریگستان بننے کی جانب پیش رفت تیز ہو رہی ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے ایک باقاعدہ طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے تمازت آفتاب اور تیز ہواؤں سے ہونے والے مٹی کے کٹاؤ کو روکنے میں مدد ملے گی اور طویل مدتی بنیاد پر پیداواریت بڑھے گی۔ وسائل کا تحفظ ہوگا اور اقتصادی استحکام آئے گا۔ اگر صرف درخت ہی فی ایکڑ ۷۰ کوئنٹل ایندھن کی لکڑی اور گھاس فی ایکڑ ۴۶ کوئنٹل چارہ فراہم کرتی ہیں تو درخت اور مختلف گھاس مشترکہ طور پر اگانے سے فی ایکڑ ۵۰ کوئنٹل ایندھن کی لکڑی اور ۸/۵ ۵ کوئنٹل گھاس حاصل ہوئی۔ مختلف قسم کے درخت اور مختلف قسم کی گھاس مشترکہ طور پر اگانے کا طریقہ مختلف حالات میں موزوں ثابت ہو سکتا ہے۔

> ایندھن اور چارے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیڑ پودوں کی اندھادھند کٹائی سے ریگستان بننے کی جانب پیش رفت تیز ہو رہی ہے۔

اس کے لیے کچھ موزوں درخت اور گھاسیں ہیں ببول، لوبیکا، کھبھات، انگریزی ببول، نوتن اور لانا۔ یہ سبھی قسمیں خشک اور نیم خشک علاقوں کے لیے موزوں ہیں۔

زرعی معاشیات

کم از کم جتائی، کیاریوں کی

شکل میں بیج بونے، نمی کے تحفظ اور غیر ضروری خودرو سرکنڈوں وغیرہ کو ہٹانے کے لیے کھیتوں کو جوتنا ضروری ہے۔ لیکن خشک حالات میں تیز ہواؤں سے مٹی کا کٹاؤ ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ خطے کے کاشتکار عام طور پر تین چار برس کی کھیتی کے بعد زمین کے نیچے کی مٹی کو اوپر لے آتے ہیں اور پھر اس پر فصلیں اگاتے ہیں کیوں وہ زیادہ زرخیز ہوتی ہے۔ لیکن اس طریقے سے تیز ہواؤں سے مٹی کے اڑ جانے اور مٹی کا کٹاؤ پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ایک جائزے کے نتائج (گپتا ۱۹۹۳ء) سے معلوم ہوا کہ مون سون سے قبل بہت زیادہ جتائی سے ۵ ملی میٹر سے بڑے سائز کے ڈھیلوں کا فی صد تناسب کم ہو جاتا ہے اور ہواؤں سے ہونے والا مٹی کا کٹاؤ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس کم جتائی سے زیادہ بڑے ڈھیلے باقی رہتے ہیں اور ہواؤں سے مٹی کا کٹاؤ بھی کافی کم ہو جاتا ہے۔ اس لیے حساس علاقوں میں گرمیوں میں جتائی کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ پہلی بارش کے بعد محدود جتائی جس میں مٹی میں زیادہ نمی موجود ہو، سے ڈھیلوں کے بننے میں مدد ملتی ہے اور سطح روکھی رہتی ہے جس سے ہواؤں سے مٹی کا کم سے کم کٹاؤ ہوتا ہے۔

آج کل ترقی یافتہ ممالک میں تحفظی جتائی/کاشت مٹی اور مٹی کی نمی کے تحفظ اور کفایتی ایندھن کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ تاہم جتائی کی قسم اور نوعیت کا انحصار مٹی کی نوعیت، موسمی حالات اور اگائی جانے والی فصلوں پر ہوتا ہے۔

> کھیتوں میں فصل کی کٹائی کے بعد جو ٹھنٹھ باقی رہ جاتے ہیں وہ دوسری فصل کی بوائی تک ہوا سے کھیت کی مٹی اڑ کر جانے نہیں دیتے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مٹی کی حفاظت کرتے ہیں۔

اسٹبل ملچ فارمنگ

کھیتوں میں فصل کی کٹائی کے بعد جو ٹھنٹھ باقی رہ جاتے ہیں وہ دوسری فصل کی بوائی تک ہوا سے کھیت کی مٹی اڑ کر جانے نہیں دیتے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مٹی کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر اس طریقے کو اچھی طرح سے استعمال کیا جائے تو یہ مٹی کا کٹاؤ روکنے کا بہت عمدہ طریقہ ہے۔ شمالی امریکہ میں یہ طریقہ جسے "اسٹبل ملچ" کہتے ہیں آج سے بہت پہلے ۱۹۱۰ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اگر یہ ٹھنٹھ کھیت میں سیدھے کھڑے ہوں تو یہ چرے ہوئے یا چپٹے ٹھنٹھوں سے زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ بیکانیر کی ریتیلی زمین پر فی ہیکٹیر ۲ تا ۵ ٹن ٹھنٹھ اور باجرہ کی فصل کے ۴۵ سینٹی میٹر اونچے ٹھنٹھ ہوا سے مٹی کے اڑنے کو روکنے میں بہت کارگر ثابت ہوئے۔ اس لیے کھیتوں میں فصل کاٹنے کے وقت ۳۰ سے ۴۵ سینٹی میٹر اونچے ٹھنٹھ چھوڑ دئے جانے چاہئیں۔ موٹے اناج کے اونچے ٹھنٹھ چھوٹے ٹھنٹھوں کی اسی مقدار کے بمقابلہ زیادہ کارگر پائے گئے ہیں۔ لیکن خشک علاقوں میں فصل کے ٹھنٹھ "ملچ فارمنگ" کے لیے عموماً کم مقدار میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں سرکنڈوں کو جو ہر موسم میں پائے جاتے ہیں

تو ڈکر مٹی کی سطح پر بچھا دینا چاہیے۔

اسٹرپ کراپنگ

یہ مٹی کے کٹاؤ کو روکنے کا ایک اچھا طریقہ ہے۔ اس طریقے کے تحت فصلیں قطار در قطار پٹیوں کی شکل میں ہوا کے رخ کی سیدھ میں اُگائی جاتی ہیں۔ ایک قطار وہ فصل لگائی جاتی ہے جو مٹی کا کٹاؤ نہیں ہونے دیتی اور دوسری قطار میں وہ جس میں مٹی کے کٹاؤ کا امکان ہوتا ہے۔ اس طریقے کا خاص فائدہ یہ ہے کہ مٹی کا کٹاؤ روکنے والی فصل تیز ہواؤں کے اثر کو روکتی ہے جس سے مٹی کے کٹاؤ کے امکان والی قطار کی مٹی محفوظ رہتی ہے اور اڑ کر نہیں جانے پاتی۔ قطار یا پٹی کی چوڑائی کا انحصار مٹی کی نوعیت اور اُگائی جانے والی فصل کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ عموماً یہ چوڑائی ریت کے لیے ۶۰ میٹر اور ریتیلی مٹی کے لیے ۳۰ میٹر ہوتی ہے۔ جودھپور میں خشک خطوں کے بارے میں تحقیق کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ کے فارم پر ہوا کے رخ کو دھیان میں رکھتے ہوئے صحیح زاویے پر سدا بہار گھاس کی پٹیاں بنا دینے سے تیز ہواؤں کا اثر کم ہو گیا اور اس سے مٹی کا کٹاؤ روکنے میں مدد ملی۔ حفاظتی پٹیوں کے درمیان اُگائی گئی فصل کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ ایک اور مطالعاتی جائزہ مظہر ہے کہ بیکانیر میں ۲۰-۱۸ سال پرانی گھاس کی پٹیوں سے ریت کا اڑنا پوری طرح سے رک گیا۔ زرعی اراضی کی حفاظت بیچ بیچ میں گھاس کی چوڑی چوڑی پٹیاں بنا کر اور کنارے کی پوری زمین پر گھاس اگا کر کی جا سکتی ہے۔

آبپاشی کے لیے پانی کا دانشمندانہ استعمال

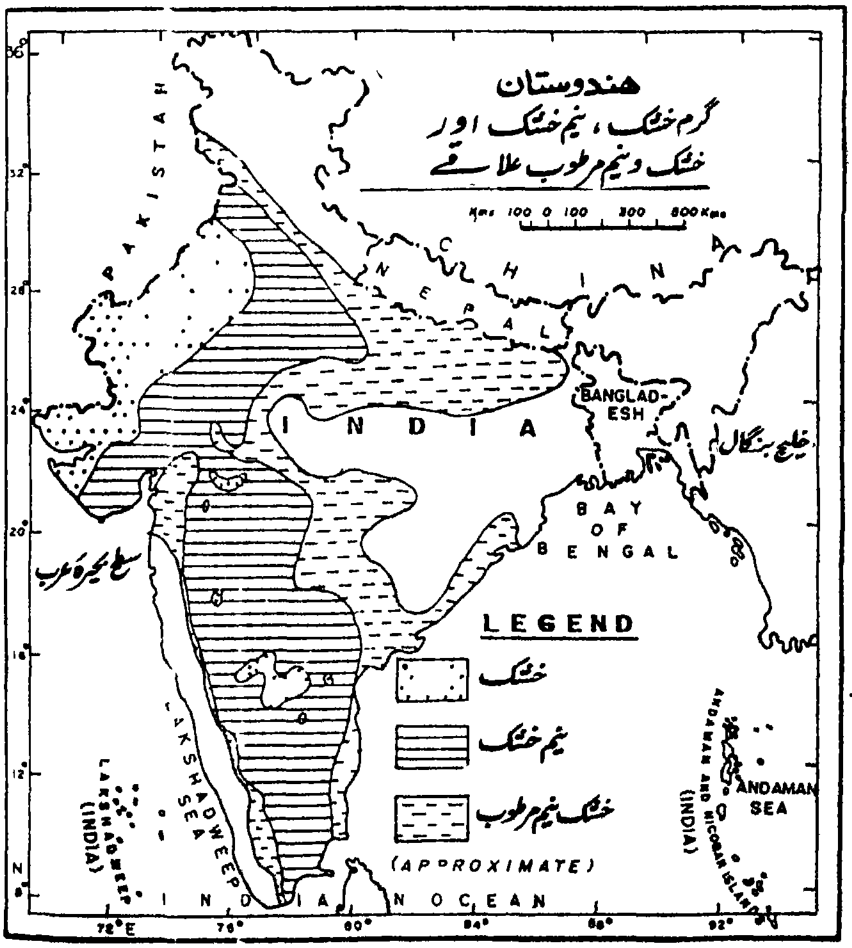
آبپاشی ریگستانی حالات پیدا نہ ہونے دینے میں بہت مدد کرتی ہے۔ بہت زیادہ ریتیلے اور ٹیلوں والے علاقوں میں چھڑکاؤ کے طریقے سے آبپاشی فصلیں اور سبزیاں اگانے میں بہت مددگار ثابت ہوئی ہے۔ راجستھان کے دور کے مغربی علاقے میں دیکھا گیا ہے کہ اس سے پانی بھی خرچ ہوا اور

کی پیداوار بھی بڑھی۔ اس کے برعکس ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے سے واٹر ٹیبل" اونچی اور فصل کی پیداوار کم ہو جاتی ہے۔

اس امر کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ شمالی راجستھان کے کینال کمانڈ ایریا میں "واٹر ٹیبل" ۰ء۳۴ سے ۲۱۰ میٹر بڑھ رہی ہے اور اس کی سالانہ اوسط ایک میٹر ہے۔ دوسری طرف زمینی پانی کی کوالٹی بھی خراب ہو رہی ہے۔ اس علاقے میں مختلف گہرائیوں میں کافی نمک ہے اور نمک کی بہتات قریب مستقبل میں ایک سنگین مسئلہ بن سکتی ہے۔

کان کنی کی سرگرمیوں پر کنٹرول

اس وقت کان کنی کی سرگرمیوں سے متاثرہ زمین یا تو بنجر ہے یا اس پر بہت کم ہریالی (۸-۵ فی صد) ہے۔ اس پر ہریالی اگانے کی ضرورت ہے۔ کچھ خاص قسموں کے درخت مثلاً PROSOPIS JULIFLORA
COLOPHOSPERUNM ACACIA
DISCHROSTACHYS اور TORTILIS
خشک حالات میں موزوں ثابت ہوئے ہیں۔ انھیں کانوں کے قریب کی بے کار پڑی ہوئی زمین پر لگایا جا سکتا ہے اور اسے پھر سے ہرا بھرا بنایا جا سکتا ہے۔



اوما شنکر سنگھ

جنگلوں کو آگ سے کیسے بچایا جائے

ہر سال جنگلوں میں آگ لگ جانے سے ایک بہت بڑے قطعۂ زمین کے حیاتیاتی تنوع اور پیداواری قوت میں کمی آجاتی ہے۔ مصنف کے خیال میں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگلاتی آگ سے متعلق ایک قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جانا چاہیے جہاں اس سلسلے کی جامع معلومات دستیاب ہوں۔ اس کے علاوہ اس طرح کی آگ کو روکنے کے لیے جدید ترین تکنالوجی اختیار کرنے کی خاطر دیگر محکموں کے ساتھ ربط و تعاون بھی ضروری ہے۔ جنگل میں آگ لگنے کے واقعات پر قابو پاکر انسانی مشکلات اور اقتصادی نقصانات دونوں کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

بھارت میں ۷۶۵۲۱۰ مربع کلو میٹر زمین پر جنگلات پھیلے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ۶۳۹۶۰۰ مربع کلومیٹر زمین پیڑ پودوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یہاں کے جنگلات میں مختلف اقسام کے حیوانات اور نباتات پائے جاتے ہیں۔ تاہم متعدد اسباب سے جنگل تیزی سے کٹ رہے ہیں۔ ان اسباب میں ایندھن کی لکڑی کی روز افزوں مانگ چارہ، عمارتی لکڑی، جنگل کے تحفظ کے ناکافی اقدامات اور جنگل کے علاقوں کا صنعتی یا رہائشی مصرف کے لیے استعمال جیسے امور شامل ہیں۔ لیکن جنگل کی پیداواری قوت اور اس کے حیوانات و نباتات کو جنگل میں لگنے والی آگ سے سب سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق بار بار کی آگ کی وجہ سے جنگلی علاقوں کا تقریباً ۶۰ فی صد حصہ آگ کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ جنگل میں آگ لگنے کا واقعہ کوئی نیا نہیں ہے۔ زمانۂ قدیم سے اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

رامائن اور مہابھارت جیسے عظیم رزمیوں میں بھی جنگل کی آگ کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم آج جنگل کے حیاتیاتی نظام میں انسان کی حد سے زیادہ مداخلت اور آگ پر قابو پانے کے ناکافی وسائل کی وجہ سے جنگلوں میں آگ لگنے کی زیادہ وارداتیں پیش آرہی ہیں اور جنگل میں لگنے والی آگ پر قابو پانے کی کوششوں میں ناکامی کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ جنگل بانی کے شعبے کے لیے فنڈ بہت کم دیا جارہا ہے۔ دوم یہ کہ آگ پر قابو پانے کے منظم طریقۂ کار کے تصور کے تئیں ہماری ترجیحات بالکل بدل گئی ہیں۔

ہندوستان میں جنگلوں کا ۹۲ فی صد سے بھی زیادہ حصہ حکومت کی تحویل میں ہے۔ چناں چہ جنگلوں میں آگ لگنے کے واقعات کو روکنا اور جنگلوں کا تحفظ کرنا سراسر ریاستوں کے محکمۂ جنگلات کی ذمہ داری ہے۔ ایسی صورتِ حال میں جنگلوں میں لگنے والی آگ پر قابو پانی کی خاطر ایک منظم لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے ایک قومی پلان کی اشد ضرورت ہے۔ قومی جنگلات پالیسی میں بھی جنگلات کو آگ سے برباد ہونے سے روکنے کے لیے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ آگ لگنے کے موسم میں خصوصی احتیاطی اقدامات کیے جائیں اور آگ لگ جانے کی صورت میں اس پر قابو پانے کے لیے جدید ترین وسائل کو بروئے کار لایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگلات کی منصوبہ بندی اور انتظام کے زمرے میں اب بھی درج بالا تجاویز کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جس کی وہ مستحق ہیں۔

اسباب

جنگل میں آگ لگنے کے چند خاص اسباب یوں ہیں:

۱۔ جنگل سے شہد یا اس طرح کی دیگر چیزیں حاصل کرنے کے لیے مزدور آگ کا استعمال کرتے ہیں جو بسا اوقات پورے جنگل میں آگ لگنے کا سبب بن جاتا ہے۔

۲۔ کبھی کبھی کوئی مزدور/راہ گیر/چرواہا اپنی لاپرواہی میں کوئی جلتی ہوئی چیز مثلاً بیڑی وغیرہ سوکھی گھاس یا پتوں پر پھینک دیتے ہیں جو دھیرے دھیرے سلگتے رہتے ہیں پھر آگ میں بدل جاتے ہیں۔

۳۔ کئی بار گاؤں والے محض انتقاماً بھی حریف کے جنگل میں آگ لگا دیتے ہیں اور

۴۔ بعض اوقات گاؤں والے جان بوجھ کر آگ لگا دیتے ہیں تاکہ ان کے مویشیوں کے چارہ کے لیے نئی گھاس پیدا ہو سکے۔

نقصانات کا اندازہ

جنگلات سے متعلق علم کی یہ ایک نئی شاخ ہے جس کے بارے میں جامع تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے مطالعے سے نہ صرف یہ کہ جنگلاتی دولت یا حیوانات و نباتات کے نقصانات کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مستقبل میں ملک کے جنگلاتی شعبے کے لیے کتنے فنڈ کی ضرورت ہوگی۔ اگر نقصانات کی مالی قدر کا تعین کیا جاسکے تو اس سے ملک کی جنگلاتی دولت کی مالی قدر و قیمت کا بھی صحیح اندازہ لگایا جاسکے گا۔ اس وقت ملک میں جنگلات کے شعبے سے متعلق دو اہم ادارے ہیں۔ ایک "انڈین کاؤنسل آف فارسٹری ریسرچ اینڈ ایجوکیشن" اور دوسرا "فارسیٹ سروے آف انڈیا"۔ ان دونوں اداروں کے قیام کا مقصد جنگلات سے متعلق جامع تحقیقات و معلومات حاصل کرنا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان میں کسی نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔ اتر پردیش فارسیٹ پلان سرکل کے ایک تجزیے کے مطابق ہر سال جنگلات میں آگ لگ جانے کی وجہ سے تقریباً ۹ کروڑ روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ حالاں کہ اسی طرح کے نقصانات کا مالی حیثیت کے مطابق اندازہ لگانا مشکل کام ہے لیکن موجودہ شرح، جو تقریباً ڈھائی گنی ہے، کے اعتبار سے اس اندازہ کو بھی درست مان لیا جائے تو سالانہ نقصان ۲۲ سے ۲۳ کروڑ تک

جا پہنچتا ہے۔ واضح رہے کہ اس میں وہ بالواسطہ نقصانات شامل نہیں ہیں جو مثلاً زمین کی زرخیزی میں کمی، مٹی کے کٹاؤ، درختوں کی سالانہ شرح افزائش میں کمی، کمیاب قسم کے پودوں کے ختم ہو جانے اور کئی اقسام کے حیوانات و نباتات کے نابود ہو جانے کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ اگر نقصانات کا اندازہ کرتے ہوئے ان بالواسطہ نقصانات کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ نقصان کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ جنگلوں میں لگاتار آگ لگنے کی وجہ سے کون کون سے پھل پھول جڑی بوٹیاں ختم ہو گئیں جو اگر باقی رہتیں تو انسانی ارتقار کے عمل میں کوئی بہت اہم رول انجام دیتیں۔ چناں چہ زیادہ ضروری یہ ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے نقصانات کے تمام پہلوؤں کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ صرف ظاہری نقصانات کی مالی قدر و قیمت کے تعین سے بات نہیں بنتی۔

جنگلاتی آگ کے بارے میں ابھی تک ایک غیر سنجیدہ رویہ پایا جاتا ہے۔ آج بھی محکمہ جنگلات اور نیشنل ریموٹ سینسنگ ایجنسی، انڈین میٹرولوجیکل ڈیپارٹمنٹ اور فارسیٹ سروے آف انڈیا کے درمیان کوئی تال میل نہیں ہے۔ محکمہ جنگلات کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ جنگل میں لگی آگ پر بروقت قابو پا سکے۔ چناں چہ نہ صرف یہ کہ جنگلات سے متعلق ایک ٹھوس پروگرام کی ضرورت ہے بلکہ جنگلات میں لگنے والی آگ سے متعلق ایک قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس سلسلے میں مل جل کر کام کیا جاسکے۔

جنگل میں لگنے والی آگ کی اطلاع محکمے کے انتظامیہ کی بالکل نچلی سطح یعنی فارسیٹ گارڈ سے ملتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں ہوتا یہ ہے کہ فارسیٹ گارڈ اپنی ہفتہ وار رپورٹ میں آگ کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ جب یہ رپورٹ اوپر پہنچتی ہے تو وہاں نقصانات کو کچھ اور کم دکھا دیا جاتا ہے اس طرح ہیڈ کوارٹر تک پہنچتے پہنچتے یہ اتنا کم ہو جاتا ہے کہ ان کی بنا پر نقصانات کا تخمینہ لگانا قطعی غلط ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ فارسیٹ گارڈ جان بوجھ کر غلط اطلاع فراہم کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر انھوں نے آگ کی زیادہ وارداتوں یا زیادہ نقصانات کی رپورٹ دی تو کہیں انہی کے خلاف کوئی "ایکشن" نہ ہو جائے۔ اس بات کا اندازہ درج ذیل میزان سے بھی بخوبی ہو جائے گا جس میں ملک میں جنگل میں لگنے والی آگ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

۱۹۹۱-۹۴ء کے دوران جنگل میں آگ لگنے کے واقعات

نمبر	ریاستیں/مرکز کے زیر انتظام علاقے	۱۹۹۱-۹۲ء	۱۹۹۲-۹۳ء	۱۹۹۳-۹۴ء	آگ کے بڑے حادثوں کی تعداد
۱۔	آندھرا پردیش	–	–	–	–
۲۔	اروناچل پردیش	۱	۲	۲	۳
۳۔	آسام	–	–	–	–
۴۔	بہار	۷	۱۵	۱۰	–
۵۔	گوا	۴	–	–	–

۶۔	گجرات	۵۰۷	۶۲۳	۶۵۴	—
۷۔	ہریانہ	—	—	—	—
۸۔	ہماچل پردیش	۶۰۵	۳۵۲	۶۰۰	۱۹
۹۔	جموں وکشمیر	۱۸۰	۱۹۸	۴۱۸	—
۱۰۔	کرناٹک	۱۰۶	۱۶	—	۱
۱۱۔	کیرالا	۲۱۱	۹۰	۱۱۲	—
۱۲۔	مہاراشٹر	۱۴۵۶	۱۴۲۸	—	—
۱۳۔	مدھیہ پردیش	۶۲۹	۳۷۱	۴۶۱	۳۴
۱۴۔	منی پور	۲	۴	۶	—
۱۵۔	میزورم	—	—	—	—
۱۶۔	پنجاب	۱۵	۳۱	۱۰۷	۱۵
۱۷۔	تامل ناڈو	۱۰۱	۹۳	۹۰	۲
۱۸۔	تری پورہ	—	—	—	—
۱۹۔	اتر پردیش	۶۰۲	۴۸۲	۲۵۸	—
۲۰۔		—	—	—	—
۲۱۔	چنڈی گڑھ	—	—	—	—
۲۲۔	دادرا و ناگر حویلی	۱۳	۳۳	۲۳	—
۲۳	دمن و دیو	—	—	—	—
۲۴۔	لکش دویپ	—	—	—	—
۲۵۔	پانڈیچری	—	—	—	—
۲۶۔	دہلی	۱	۱	۱	—
	کل میزان	۴۴۴۰	۳۷۴۹	۱۵۰۰	۱۳۴

اعداد و شمار: وزارت ماحولیات و جنگلات

درج بالا گوشوارے سے پتا چلتا ہے کہ مدھیہ پردیش، کرناٹک، پنجاب، تامل ناڈو ہماچل پردیش اور ارونا چل پردیش کے سوا دوسری ریاستوں کے جنگلوں میں آگ لگنے کا کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آیا اور آندھرا پردیش، آسام، تری پورہ ریاستوں میں تو قطعی نہیں۔ جنگلات کے علوم میں دلچسپی رکھنے والا اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ بعض ریاستوں میں تین سال کے دوران آگ لگنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جنگلات کی نگہبانی پر مامور لوگ کس طرح سچ تسلیم کرنے سے کترا رہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنگل کے شعبے کے لیے بہت کم رقم مختص کی جا رہی ہے اور اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ اگر صرف اتر پردیش کے جنگلوں میں آگ لگنے کے حادثوں کا سال بہ سال جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ہر چار سال میں آگ کا کوئی بڑا حادثہ پیش آتا ہے۔ درج ذیل میزان میں اتر پردیش کے جنگلوں میں آگ لگنے کے واقعات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

> ہندوستان میں جنگلوں کا ۹۲ فی صد سے بھی زیادہ حصہ حکومت کی تحویل میں ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں آگ لگنے کے واقعات کو روکنا اور جنگلوں کا تحفظ کرنا سراسر ریاستوں کے محکمہ جنگلات کی ذمہ داری ہے۔ ایسی صورت حال میں جنگلوں میں لگنے والی آگ پر قابو پانے کی خاطر ایک منظم لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے ایک قومی پلان کی اشد ضرورت ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

جنگل میں لگنے والی آگ سے متاثرہ علاقے

(رقبہ مربع کلومیٹر میں)

سال	کماؤں ڈویژن	گڑھوال ڈویژن	کل
۱۹۸۴ء	۴۶۰	۶۶۲	۱۱۲۲
۱۹۸۵ء	۵۰	۶۶۴	۷۱۴
۱۹۸۶ء	۲۲	۰۵	۰۲۷
۱۹۸۷ء	۱۰۲	۶۴	۱۶۶
۱۹۸۸ء	۳۱۴	۴۹	۳۶۳
۱۹۸۹ء	۰۳	۱۸۷	۱۹۰
۱۹۹۰ء	۱۲۹	۰۵	۱۳۴
۱۹۹۱ء	۱۳۵	۱۴۲	۲۷۷
۱۹۹۲ء	۲۰۸	۱۵۱	۳۵۹
۱۹۹۳ء	۰۷	۱۱	۱۸
۱۹۹۴ء	۵۴	۰۶	۶۰
۱۹۹۵ء	۳۳۴	۵۹۷	۹۳۱

حوالہ: اتر پردیش فارسٹ فائر پروجیکٹ

احتیاط اور قابو

جنگلات میں لگنے والی آگ سے بچاؤ اور قابو کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جاتے ہیں۔

(الف) بچاؤ: یہ آگ لگنے سے پہلے کا مرحلہ ہے جس میں دو باتوں پر توجہ رکھنی پڑتی ہے۔

(۱) کسی چیز کو جلتی ہوئی حالت میں نہ چھوڑنا۔
(۲) جنگلاتی مٹی کو صاف رکھنا۔

(ب) قابو: یہ آگ لگنے کے بعد کا مرحلہ ہے۔ اس کے اجزا یہ ہیں۔

(۱) آگ کا پتا چلانا
(۲) اطلاع
(۳) آگ بجھانا

موجودہ صورت حال

اگرچہ دنیا میں ہر جگہ جنگلوں میں آگ لگتی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستان میں اس مسئلے کو ترجیحی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ جنگلاتی منصوبہ بندی کا تصور تبدیلیٔ وقت کے زیر اثر بدلتی ہوئی مالی منصوبہ بندی کی وجہ سے بدل گیا ہے۔ اب جب کہ حیات کے مختلف شعبوں میں لگاتار منصوبہ بند طریقے سے کام کیا جا رہا ہے۔ جنگلات کے شعبے میں صحیح منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے فنڈ میں بتدریج کمی ہوئی ہے۔ پہلے جنگلات کی نگہبانی کرنے والوں کے لیے آگ پر قابو پانا اور جنگلاتی پٹی کو صاف رکھنا ایک مقدس فریضہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ چناں چہ سارے کام طے شدہ وقت کے مطابق ہوتے تھے۔ وقت بدلا تو اقتصادیات کے نئے محاورے زیادہ اہم ہوگئے۔ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنے کی کوشش میں جنگلاتی سیکٹر میں ضرورت سے زیادہ مزدور لگائے جانے لگے اور اس طرح جنگل کی حفاظت کے لیے مخصوص کی گئی رقم کا بڑا حصہ اُجرتوں اور انتظامی امور میں صرف ہونے لگا۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ اس مسئلہ کو تو پیدا ہونا ہی تھا لیکن اس کے تدارک کے لیے کوئی دوسرا زیادہ مستحکم وسیلہ دریافت کیا جانا چاہیے تھا۔ آج یہ ایک اور طرح کے سماجی اقتصادی مسئلے کا روپ لے چکا ہے کیوں کہ جس رقم کو جنگلات کے تحفظ کے کام آنا تھا وہ کسی اور کام میں صرف ہو رہی ہے۔

مرکزی اسکیم

ملکی سطح پر جنگلوں میں آگ لگنے کے

معاملے کی اہمیت کا اندازہ تب ہوا جب ۱۹۸۴ء میں یو۔ این۔ ڈی۔ پی کی طرف سے "جنگلوں میں آگ پر قابو پانے کے جدید طریقوں کی شروعات" نامی پروجیکٹ اتر پردیش اور مہاراشٹر کے کچھ حصوں میں شروع کیا گیا۔ پروجیکٹ کا مقصد جنگلوں میں لگنے والی آگ کا پتا لگانا، اُسے بجھانا اور احتیاطی اقدامات کرنے کے اصولوں اور طریقوں سے روشناس کرانا تھا۔ یہ پروجیکٹ ۱۹۹۰-۹۱ء تک چلا۔

> پہلے جنگلات کی نگہبانی کرنے والوں کے لیے آگ پر قابو پانا اور جنگلاتی پٹی کو صاف رکھنا ایک مقدس فریضہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وقت بدلا تو اقتصادیات کے نئے محاورے زیادہ اہم ہوگئے۔ روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنے کی کوشش میں جنگلاتی سیکٹر میں ضرورت سے زیادہ مزدور لگائے جانے لگے اور اس طرح جنگل کی حفاظت کے لیے مخصوص کی گئی رقم کا بڑا حصہ اُجرتوں اور انتظامی امور میں صرف ہونے لگا۔

اس کے بعد یو۔ این۔ ڈی۔ پی نے دستِ تعاون کھینچ لیا۔ ان سات برسوں میں یو۔ این۔ ڈی۔ پی نے ۵۱۰۶۵۶۷ امریکی ڈالر کے برابر رقم فراہم کی جب کہ ہندوستان سرکار نے تقریباً ۸۹۴ لاکھ روپے فراہم کیے۔ اس پروجیکٹ کا نتیجہ ابتدائی مرحلے میں کافی شاندار رہا جیسا کہ درج ذیل میزان سے ظاہر ہے۔

گوشوارہ نمبر ۳
پروجیکٹ اتر پردیش میں (ہلدوانی، نینی تال، پتھوراگڑھ)

کل پروجیکٹ ایریا۔ ۳۷۲۶۹۳ ہیکٹیر

سال	آگ سے جلے ہوئے رقبے کا کل حصہ (فی صد میں)
۱۹۸۴ء	۴٫۲۴ فی صد
۱۹۸۷ء	۱٫۲۶ 〃
۱۹۸۸ء	۱٫۳۱ 〃
۱۹۸۹ء	۲٫۹۰ 〃
۱۹۹۰ء	۰٫۴۳ 〃

پروجیکٹ مہاراشٹر میں (چندر پور)

کل پروجیکٹ ایریا۔ ۱۶۲۸۴۴ ہیکٹیر

سال	جلا ہوا رقبہ (فی صد میں)
۱۹۸۴ء	۱۴٫۸۲ فی صد
۱۹۸۶ء	۹٫۱۲ 〃
۱۹۸۷ء	۳٫۷۶ 〃
۱۹۸۸ء	۲٫۰۶ 〃
۱۹۸۹ء	۱٫۸۶ 〃
۱۹۹۰ء	۱٫۰۰ 〃

اعداد و شمار: وزارت جنگلات و ماحولیات

درج بالا میزان سے جنگلوں کی آگ سے تحفظ جیسے پروگراموں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاہم یو۔ این۔ ڈی۔ پی کے دستِ تعاون کھینچ لینے کے بعد وزارتِ جنگلات و ماحولیات نے اس طرح کے پروگرام کی توسیع کی ضرورت پر توجہ نہیں کی، حالاں کہ اس سلسلے میں مختلف سطحوں پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ یہاں اس حقیقت کا بیان بھی ضروری ہے کہ پروگرام گرچہ دو مقامات کے لیے شروع کیا گیا تھا لیکن بعد میں تین اور ریاستوں میں بھی اسی طرح کا پروگرام شروع کیا گیا۔

خامیاں

جنگلات میں آگ روکنے کی اسکیم دو اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلا ان دو میں کا پرزوں کی دیکھ ریکھ (جو یو۔ این۔ ڈی۔ پی کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے) اس کے اخراجات سینٹرل سیکٹر اسکیم (سی۔ ایس) کے ذریعہ پورے

ہوتے ہیں اور دوسرا آگ سے جنگلات کے تحفظ کے لیے دیگر عملی اقدامات جن کے اخراجات سینٹرلی اسپانسرڈ اسکیم (سی۔ایس ایس) کے ذریعہ پورے ہوتے ہیں۔

وزارت ماحولیات وجنگلات کے فراہم کردہ اعداد وشمار کے مطابق ۹۳-۱۹۹۲ء سے ۹۷-۱۹۹۶ء تک ان دو ہیلی کاپٹروں پر ۴ کروڑ ۵۸ لاکھ ۶۶ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ یہ ہیلی کاپٹر آگ کا مقابلہ کرنے اور گھنے جنگلوں کی نگرانی کے لیے رکھے گئے ہیں۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ آگ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر کا استعمال بے سود ہے کیوں کہ اس سے مسئلہ اور شدید ہو جاتا ہے۔ ہیلی کاپٹروں کے نیچے پانی کی ٹنکی لگی ہوتی ہے جس سے آگ پر پانی ڈالتے ہیں۔ لیکن اس کے اخراجات، گرمیوں میں پانی کی دستیابی اور زیادہ نیچے پرواز کرنے کے خطرات وغیرہ ایسے مسائل ہیں کہ ہیلی کاپٹروں کا استعمال بہت مشکل ہے۔ ان ہیلی کاپٹروں کو استعمال میں لانے سے پہلے اگر مسئلے کا صحیح ڈھنگ سے جائزہ لیا گیا ہوتا تو ان کی دیکھ ریکھ پر صرف ہونے والی خطیر رقم کو زیادہ بہتر مصرف میں لایا جا سکتا تھا۔ مثلاً ایسی تیز رفتار گاڑیاں خریدی جا سکتی ہیں جن سے آگ پر قابو پانے والے عملے کو فوراً جائے حادثہ پر پہنچایا جا سکے یا وائرلیس مواصلاتی نظام قائم کیا جا سکتا تھا تاکہ آگ لگنے کا جلد پتا چل جائے یا آگ پر قابو پانے والے دیگر ساز وسامان خریدے جا سکتے تھے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں اتر پردیش اور ہماچل پردیش کے جنگلوں میں جیسی بھیانک آگ لگی تھی اس کے پیش نظر وزارت جنگلات وماحولیات کو کسی طرح کی تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور جلد ہی ایک جامع ایکشن پلان تیار کرنا چاہیے۔

موجودہ منظر نامہ

آگ سے جنگلات کے تحفظ کی صورت حال پورے ملک میں بہت غیر یقینی ہے۔ زیادہ تر ریاستی حکومتوں کے پاس جنگلات میں آگ کو روکنے اور قابو پانے کے لیے کوئی مستقل پروگرام نہیں ہے۔ جب کہ جنگلات کے تحفظ کی اہمیت اور جنگل کے پورے حیاتیاتی نظام پر اثرات سے ہم لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ ہندوستان کے جنگلات میں لگنے والی آگ کے سلسلے میں ایف۔اے او کی بین اقوامی مشاورتی ٹیم نے اپنی تکنیکی رپورٹ میں بھی اس مسئلے کی سنگینی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ہندوستان میں آگ کی صورت حال تشویشناک ہے۔ ہندوستان میں جنگلات کی آگ کے سلسلے میں معاملے کے اقتصادی یا ماحولیاتی کسی بھی پہلو پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جنگلات کی نگرانی پر مامور عملے کو جو تربیتیں دی جاتی ہیں ان میں آگ سے متعلق علم اور تکنالوجی کی واقفیت بس واجبی طور سے دی جاتی ہے۔ نہ یہاں آگ

> آگ سے جنگلات کے تحفظ کی صورت حال پورے ملک میں بہت غیر یقینی ہے۔ زیادہ تر ریاستی حکومتوں کے پاس جنگلات میں آگ کو روکنے اور قابو پانے کے لیے کوئی مستقل پروگرام نہیں ہے۔ ہندوستان کے جنگلات میں لگنے والی آگ کے سلسلے میں ایف۔اے۔او کی بین اقوامی مشاورتی ٹیم نے اپنی تکنیکی رپورٹ میں بھی اس مسئلے کی سنگینی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

سے متعلق کوئی حکمت عملی ہے نہ اس سلسلے کی منصوبہ بندی کے تئیں کوئی بیداری۔ ملک کے منصوبہ سازوں نے اب کہیں جا کر اس طرف توجہ دینا شروع کی ہے اور آگ کے نتیجے میں جنگلات کی اقتصادیات کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کے بارے میں معلومات بہت محدود رہیں۔ جنگلات میں آگ سے متعلق جو اعداد وشمار دستیاب ہیں وہ قابل اعتبار نہیں ہیں کیوں کہ یہ سائنسی طریقے اور تجربے سے نہیں حاصل کیے گئے ہیں۔ آگ کے موسم کی پیش گوئی خطرات کی شرح، آگ لگنے کی اطلاعات اور بچاؤ کے اقدامات کے لیے کوئی سسٹم نہیں بنا ہوا ہے۔ ہندوستان کے جنگلات کو آگ کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لیے ایک جامع نظام کی ضرورت ہے جس پر عمل درآمد ریاستی سطح پر ہو جب کہ عملے کی تربیت، تحقیق اور عوام میں اس کے تئیں بیداری کا کام مرکزی سرکار کرے۔

اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں اور ہماچل پردیش کے جنگلوں میں ۱۹۹۵ء کے بھیانک آگ حادثے کے بعد وزارت ماحولیات وجنگلات نے جناب آر پی کھوسلہ کی زیر قیادت ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے بھی آگ سے تحفظ اور بچاؤ کے لیے متعدد تجاویز کی سفارش کی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اپریل، مئی اور جون کے مہینوں میں آگ پر نگاہ رکھنے والے زیادہ سے زیادہ عملے تعینات کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔

(۲) آگ کی پٹیاں بنائی جائیں اور ان کی دیکھ ریکھ کی جائے۔ فنڈ کی کمی سے یہ سلسلہ تقریباً موقوف ہے۔

(۳) جلدی آگ پکڑنے والے پتوں کو ایک جگہ جمع کر کے محفوظ طریقے سے جلا ڈالنے کا پرانا طریقہ پھر سے اختیار کیا جانا چاہیے۔

(۴) ایسے خشک پتوں کو کسی دوسرے اور مالی اعتبار سے منافع بخش کام میں استعمال کرنے کے لیے بھی کوششیں کی جانی چاہئیں۔

(۵) محکمۂ جنگلات کے عملے کے پاس ایک مکمل ترسیلی نظام ہو تاکہ وہ جنگل میں لگنے والی کسی آگ یا غیر قانونی طور سے درخت کاٹنے کی کسی خبر پر فوراً حرکت

باقی صفحہ ۸ پر

اربندا گھوش

قدرتی کھاد اور کھیتی باڑی

اس تجزیہ میں مصنف نے خبردار کیا ہے کہ کیمیاوی کھادوں کے سلسلے میں سخت گیر رویہ نہ اپنایا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ صرف کیمیاوی کھادوں پر انحصار غلط ہوگا لیکن صرف قدرتی کھادوں سے خوراک کی دستیابی کی صورت حال مستحکم رہ سکتی ہے، یہ کہنا بھی غیر حقیقت پسندانہ ہوگا۔ مصنف کے خیال میں ان دونوں کے امتزاج کی ضرورت ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ بنی نوع انسان نے دس ہزار سال قبل زراعت کا پیشہ باقاعدہ طور پر اپنایا۔ عرب، وادی سندھ اور یانگ تزے اور ہوانگ ہو کے طاس غالباً وہ علاقے تھے جہاں زراعت اور مویشی پالن کی شروعات ہوئی۔ کھیتی باڑی کے ابتدائی دور میں بارش کی شروعات کے ساتھ فصل لگائی گئی جسے آج خریف کی فصل کے طور پر جانا جاتا ہے مثلاً چاول، باجرہ، جوار وغیرہ۔ اگلا کام تھا فصل کاٹنا۔ بعض ٹھنڈے خطوں میں گیہوں جاڑے کے شروع میں بویا گیا اور موسم بہار میں فصل کاٹی گئی۔

بیجوں کے علاوہ بارش ایک ایسا وسیلہ تھی جس سے زراعت کے ابتدائی دور میں کام لیا گیا۔ ہم نے کسی ایسی چیز کے بارے میں نہیں سنا جو اس دور میں فصلوں کو غذا کے طور پر دی گئی ہو۔ یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیوں کہ اس دور میں بہت زیادہ زمین دستیاب تھی اور آبادی کم تھی اور جب بھی کمی کا خدشہ ہوتا مزید علاقوں کو زیر کاشت لے آیا جاتا۔

فصلیں اگانے اور جانور پالنے کے دوران یہ بھی محسوس کیا گیا ہوگا کہ گائے کا گوبر، فصلوں کا بچا کھچا بے کار حصہ، بکری، خنزیر اور مرغیوں کا فضلہ وغیرہ اگر اناج کی کھیتی میں ڈالا جائے تو اس سے پیداوار بڑھ سکتی ہے۔ ہزاروں برس سے انسان ایسی ہی زراعت پر عمل پیرا ہے۔

بیج چھڑک کر بوئے جاتے ہیں، ممکن ہونے پر آب پاشی کا انتظام کیا جاتا ہے دستیاب قدرتی کھاد کا استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح فصلوں کو غذا فراہم کی جاتی ہے۔ آبادی میں کئی گنا اضافے، بڑی بڑی سلطنتوں کے قیام، تہذیب کے ارتقا کے باوجود زراعت کے بنیادی نظام میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی جیسی آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ زمین یا تو زرخیز تھی اور وہاں پانی بھی تھا یا پھر زمین بنجر تھی۔ اناج، ریشے دار فصلوں، چارے اور جلانے کی لکڑی کے کھیتوں اور جنگلوں میں قدرتی کھاد پر ہی اکتفا کی گئی۔

لیکن صنعتی انقلاب اور سائنسی علوم کے بے پناہ فروغ کے نتیجے میں بالخصوص یوروپ میں اٹھارویں صدی سے یہ سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ زراعت نے ایک سائنسی علم کی شکل اختیار کرلی اور زرعی سائنس دانوں نے اپنی تجربہ گاہوں میں زراعت پر تجربے کرنے شروع کردیے۔ اس طرح یہ واضح ہوگیا کہ انسان کے علم میں اب تک آئے سو عناصر میں سے کم از کم سولہ پودے میں موجود ہوتے ہیں اور پودے کو غذا فراہم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ سولہ عناصر ہیں کاربن (C) ہائیڈروجن (H) آکسیجن (O) نائٹروجن (N) فاسفورس (P) پوٹیشیم، سلفر (S) کیلشیم (CA) میگنیشیم (MG) زنک (ZN) لوہا (FE) مینگنیز (MN) تانبہ (CN) بورون (B) کلورین (CL) اور مولی بیڈنم (MO)

اگر ان سولہ عناصر میں سے کسی کی بھی کمی واقع ہوجائے تو پودے کی صحت مند نشوونما رک جاتی ہے اور پودے اپنی زندگی کا چکر پورا بھی نہیں کرپاتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سے کسی بھی عنصر کی کمی اگر پوری نہ کی گئی تو اس سے پودے کی نشوونما محدود ہوکر

رہ جائے گی اور فصل کم پیدا ہوگی۔ یہ انکشاف سب سے پہلے لی بگ نے کیا۔ اسے غذائیت پیدا کرنے والے عناصر کی کمی کا اصول کہا جاتا ہے۔ کاربن ہائیڈروجن آکسیجن اور کچھ حد تک نائٹروجن کے علاوہ بقیہ غذا پودے زمین سے حاصل کرتے ہیں۔

سائنس دانوں نے پتا لگایا ہے کہ ہر زمین کی غذا فراہم کرنے کی صلاحیت اور ہر پودے کی زمین سے غذا لینے کی صلاحیت الگ الگ ہوتی ہے۔ بہتر زمین اور پودوں کی بہتر نسل کے سبب یہ ضروری ہے کہ قدرتی اور کیمیاوی کھادوں کی فراہمی کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ حیدرآباد کے جے۔ سی کٹیال (نیشنل اکیڈمی برائے زرعی تحقیق اور انتظامیہ) کے۔ ایل۔ شرما، کے سری نواس اور ایم۔ نرسمہا ریڈی (مرکزی انسٹی ٹیوٹ برائے ڈرائی لینڈ ایگری کلچر) نے فرٹیلائزر ایسوسیشن آف انڈیا کے ذریعہ شائع شدہ فرٹیلائزر نیوز کے اپریل ۱۹۹۷ء کے شمارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

جب یوروپ میں یہ انکشافات ہو رہے تھے تو ہندوستان جو اس وقت برطانیہ کے زیر تسلط تھا صرف قدرتی کھادوں پر ہی اکتفا کر رہا تھا۔ ۱۸۹۹ء کے قحط اور ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال نے زراعت میں سائنس کے اطلاق کی اہمیت اجاگر کی اور زرعی تحقیق کی ہندوستانی کونسل قائم ہوئی اور ملک میں متعدد زرعی کالج اور ادارے قائم ہوئے۔ انھوں نے زراعت کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا۔ لیکن ہندوستان میں زراعت میں کم و بیش قدرتی کھادوں کا استعمال ہی ہوتا رہا۔

۱۹۴۳ء کے قحط بنگال، دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی خراب صورت حال اور اناج کی کمی نے اور اس حقیقت نے کہ ۳۰ کروڑ آبادی والے ملک میں (۱۹۴۷ء میں) صرف ۵۰ ہزار ٹن مصنوعی کھاد یا کیمیاوی کھاد استعمال ہوتی ہے، سائنس دانوں اور انتظامی اہل کاروں کو اس سلسلے میں سوچنے پر مجبور کر دیا اور "زیادہ اناج اگاؤ" اور "زراعت کی زبردست ترقی کا پروگرام" سارے ملک میں شروع کیے گئے۔ اسی دوران بالخصوص زراعتی تحقیق کے انسٹی ٹیوٹ (IARI) کے سائنس داں گیہوں کی نئی نئی اقسام کے تجربے کر رہے تھے جن سے گیہوں کا ایسا پودا تیار کیا گیا جو قد میں چھوٹا تھا مگر اس سے زیادہ گیہوں پیدا ہوا۔

یہ اس ملک کی خوش نصیبی تھی کہ جب ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال جیسی صورت حال پیدا ہونے کو تھی اور لگاتار دو برس یعنی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء میں جنوب مغربی مانسون کے فیل ہو جانے کے سبب بارش نہیں ہوئی تھی۔ امریکہ کے پبلک لا (PL) ۴۸۰ کے تحت وہاں سے بڑی مقدار میں گیہوں درآمد کیا جا رہا تھا۔ گیہوں کی پیداوار بڑھانے میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی جو نوبل انعام یافتہ ماہر زراعت اور دنیا کے مشہور بھوک سے لڑنے والے مجاہد ڈاکٹر نورمن بورلاگ کی شرکت اور تعاون سے ممکن ہو سکی۔ یہ کامیابی "کلیان سونا" اور "سونالیکا" جیسے گیہوں کے بیج تیار کر کے حاصل ہو سکی۔ اس سے ہندوستان میں گیہوں کا منظر نامہ ڈرامائی طور پر بدل گیا۔ برائے ریکارڈ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی زرعی تحقیق انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں تیار کردہ یہ بیج ایک روپیہ فی بیج اور تین ہزار روپیہ فی کلو گرام کے حساب سے فروخت ہوئے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کے لیے آب پاشی کو یقینی بنانا ضروری ہے اور بڑی مقدار میں کیمیاوی کھادوں کی ضرورت ہے جن میں یوریا ڈائی امونیم فاسفیٹ (DAP) میوریٹ آف پوٹاش (MOP) اور ان کی مختلف اقسام شامل ہیں۔

ہندوستان نے ۱۹۷۷ء میں امریکہ سے گیہوں درآمد کرنا بند کر دیا اور اناج کی پیداوار پہلے پنج سالہ منصوبے کی ابتدا میں ۵ کروڑ ٹن سے بڑھ کر حالیہ برسوں میں ۱۹ کروڑ ٹن ہو گئی۔ ابھی دو برس پہلے تک سرکاری اداروں مثلاً فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے پاس ساڑھے تین کروڑ ٹن فاضل اناج (گیہوں اور چاول) کا ذخیرہ تھا۔ کامیابی کی اس داستان کے پیچھے صرف زیادہ پیداوار دینے والی اقسام اور آب پاشی کا ہی نہیں بلکہ مقررہ مقدار میں دی گئی کیمیاوی کھادوں کا بھی ہاتھ تھا۔ چھوٹے دہائی کے وسط میں بہار میں سندری میں امونیم سلفیٹ تیار کرنے والے کیمیاوی کھاد کے پہلے کارخانے کے قیام کے بعد سے آج ہندوستان کیمیاوی کھادوں کی تیاری کے معاملے میں دنیا کا چوتھا سب سے بڑا ملک ہے۔ ہندوستان میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں نائٹروجن کی پیداوار ۸/۸۷ ملین ٹن رہی۔ ہندوستان کو پوٹاش کھادیں درآمد کرنی پڑیں کیوں کہ ملک میں پوٹاش کے وسیلوں کا کوئی علم نہیں ہے۔ (کیمیاوی اشیا اور کیمیاوی کھادوں کے محکمے کی سالانہ رپورٹ برائے ۹۷-۱۹۹۶ء)۔

اس کے علاوہ زرعی علوم کی قومی اکیڈمی (NAAS) نے اپریل ۱۹۹۷ء میں

> قدرتی کھادوں وغیرہ کو بروئے کار لا کر کیے جانے والی زراعت کیا ہے؟ زراعت اور امداد باہمی کی وزارت کی جانب سے جاری کردہ ایک دستاویز کے مطابق اس طرح کی زراعت میں کیمیاوی کھادوں اور زرعی کیمیاوی اشیا استعمال نہیں کی جاتیں اور فصلوں کو غذا فراہم کرنے کے لیے صرف قدرتی کھادوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔

جاری کردہ ایک دستاویز میں کہا ہے کہ ۲۰۲۵ء تک ملک کی آبادی کے ایک ارب ۴۴ کروڑ ہو جانے کے تخمینے اور کیلوری کی کم از کم ضروریات کے پیش نظر ملک کو ۳۰ کروڑ ٹن اناج کی ضرورت ہوگی جسے پیدا کرنے کے لیے مختلف ذرائع سے تین ساڑھے تین کروڑ ٹن نائٹروجن، پوٹاش اور پوٹیشیم کھاد کی ضرورت ہوگی۔ اس کے علاوہ ۲۰۲۵ تک باغبانی اور دیگر قیمتی فصلوں کے لیے ۱.۴ سے ۱.۵ کروڑ ٹن کیمیاوی کھاد درکار ہوگی۔ اس طرح چار ساڑھے چار کروڑ ٹن نائٹروجن پوٹاش اور پوٹیشیم کھادوں کی ضرورت ہوگی۔

"پودوں کو غذائیت فراہم کرنے والی اشیا کی ضروریات سپلائی کارگری اور پالیسی معاملات (۲۰۲۵-۲۰۰۰ء)" کے موضوع پر منعقدہ مذاکرے پر مبنی اس دستاویز میں زور دے کر کہا گیا ہے کہ

(۱) کیمیاوی کھاد زمین کی پیداواریت بڑھا کر زرعی پیداوار بڑھانے کا کلید ہے اور زمین کی بچت کا ایک ذریعہ ہے۔

(۲) دنیا کا کوئی بھی ملک خواہ وہ ترقی یافتہ ہو یا ترقی پذیر کیمیاوی کھادوں کا استعمال بڑھائے بغیر زرعی پیداواریت میں اضافہ نہیں کر سکتا اور ہندوستان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

لیکن اسی مذاکرے میں جو ۹ تا ۱۱ اپریل ۱۹۹۶ء حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا۔ یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ ہم نے پیداواریت بڑھانے زراعت اور مٹی کو زرخیز بنانے اور ماحولیاتی حفاظت کے کام میں کیمیاوی کھادوں کے ساتھ ساتھ قدرتی کھادوں، کمپوسٹ اور زرعی کوڑے سے خاطر خواہ مدد نہیں لی۔ اس مذاکرے میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ مقامی سطح پر جتنی بھی قدرتی کھاد دستیاب ہے اسے بروئے کار لا کر فصلوں کو غذا فراہم کی جائے۔

قدرتی کھادوں وغیرہ کو بروئے کار لا کر کی جانے والی زراعت کیا ہے؟ زراعت اور امداد باہمی کی وزارت کی جانب سے جاری کردہ ایک دستاویز کے مطابق اس طرح کی زراعت میں کیمیاوی کھادوں اور زرعی کیمیاوی اشیا استعمال نہیں کی جاتیں اور فصل کو غذا فراہم کرنے کے لیے صرف قدرتی کھادوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قدرتی کھادوں پر مبنی زراعت ایک ایسا نظام ہے جس میں مٹی کی زرخیزی اور جراثیم پر قابو پانے کے لیے قدرتی طریقے اور ماحولیاتی عمل اور ردعمل کو اپنایا جاتا ہے۔ اس طریقہ زراعت کا اہم جزو غذائیت والے عناصر کی فراہمی کے ذریعہ زمین کی زرخیزی برقرار رکھنا ہے۔

قدرتی کھادوں پر مبنی زراعت کا سود مند پہلو یہ ہے کہ اس سے نہ صرف پودوں کی غذائی ضروریات پوری ہوتی ہیں بلکہ مٹی کی طبعی خصوصیات، جراثیم پیدا کرنے کی صلاحیت اور زمین کی اوپری سطح جو سڑے گلے پتوں سے بنی ہو، اس میں بہتری آتی ہے اور زمین کی پانی کو اپنے پاس رکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

ضروری ہے کہ پودوں کو غذا فراہم کرنے والی اشیا کے قدرتی وسیلوں کی دستیابی کا اندازہ لگایا جائے۔

اس طریقہ زراعت میں عہد قدیم سے ہی نہ صرف قدرتی کھادوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے بلکہ کیڑوں سے بنی کھاد، ہری کھاد اور حیاتیاتی کھادوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ قدرتی کھادوں میں جانوروں کا گوبر، کوڑا کرکٹ، فصلوں کا بچا ہوا بے کار حصہ مرغیوں کا فضلہ وغیرہ شامل ہیں۔ شہری اور دیہی کوڑے سے بھی کمپوسٹ کھاد بنتی ہے۔ کیڑوں سے کھاد بنانے کے تحت کیچوؤں کو کوڑے کرکٹ میں پیدا کیا جاتا ہے اور ان سے خارج ہونے والے مادے سے نائٹروجن پوٹاش اور پوٹیشیم حاصل کیا جاتا ہے۔ ہری کھاد بنانے کے لیے تیزی سے بڑھنے والے پھل دار پودوں مثلاً دھائینچا کو اگایا جاتا ہے اور بعد میں انھیں دوبارہ زمین میں ڈال کر کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔ اس سے مٹی میں جراثیم بڑھتے ہیں۔ سورج کی روشنی میں غذا حاصل کرنے کا عمل فروغ پاتا ہے اور زیادہ فصل پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حیاتیاتی کھادیں ہیں جیسے رائزوبیم جو پھل دار فصلوں کو ماحولیاتی نائٹروجن مٹی میں لینے میں مدد دیتے ہیں بلو گرین الگی، ایزوٹو بیکٹر ایزوا ایزوس پیرلیم ہیں جو چاول کی کھیتی کے لیے موزوں ہیں اور فصلوں کے لیے نائٹروجن کے اچھے وسیلے ہیں۔

اقوام متحدہ کی خوراک اور زراعت کی تنظیم (FAO) کے زیر اہتمام ہندوستان میں کیے گئے ایک مطالعے میں جو سبز انقلاب کے دور عروج میں ہوا تھا یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ معدنی کیمیاوی کھادیں اور قدرتی کھادیں دونوں کے ہی الگ الگ مٹی پر اچھے اثرات ہوتے ہیں لیکن دونوں کو ملا کر استعمال کرنے سے بہترین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ (پروجیکٹ فیلڈ دستاویز نمبر ۱۴) یہ مطالعہ ہر چند کہ خاصا پرانا ہے لیکن اس کے بعض نتائج حسب ذیل ہیں:

(۱) قدرتی کھادیں فصل کو فوری غذا فراہم کرتی ہیں لیکن وہ مٹی کی طبعی خصوصیات کو متاثر نہیں کرتیں۔ ان میں غذائیت کم ہوتی ہے لیکن یہ مٹی کی طبعی، طبعی و کیمیاوی اور حیاتیاتی خصوصیات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان سے ملنے والی غذائیت سست رفتار ہوتی ہے لیکن اس میں پائیداری ہوتی ہے۔

(۲) معدنی کھادوں اور قدرتی کھادوں کا الگ الگ استعمال کرنے سے مٹی کی کیمیاوی، طبعی اور جراثیمی خصوصیات پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ فاسفیٹک کھادوں کے علاوہ معدنی کھادوں کے مسلسل استعمال سے مٹی کے ڈھانچے اور اس کی خصوصیات پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔

قدرتی کھادوں سے مٹی کا ڈھانچہ بہتر ہوتا ہے۔

(۴) اس طرح قدرتی کھادوں کے استعمال سے ہی مٹی کی طبعی اور جراثیمی خصوصیات بہتر ہوتی ہیں۔ صرف معدنی کھادوں کے استعمال سے ہی فصل کو غذائیت فراہم کرنے والے عناصر کی مقدار بڑھتی ہے۔ دونوں کے ساتھ ساتھ استعمال سے مٹی میں اچھے جراثیم بڑھتے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ پودوں کو غذا فراہم کرنے والی اشیا کے قدرتی وسیلوں کی دستیابی کا اندازہ لگایا جائے۔ زرعی سائنس کی قومی اکیڈمی کی دستاویز کے مطابق جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ملک میں صرف ۲۷ سے ۳۰ کروڑ ٹن قدرتی کھاد موجود ہے جس سے ۴۴ سے ۶۰ لاکھ ٹن نائٹروجن پوٹاش اور پوٹیشیم ملتا ہے۔ یہ تخمینے بہت کم اعداد و شمار پر مبنی ہیں۔ زرعی کوڑے کرکٹ اور فصلوں کے بچے ہوئے حصہ کو دوبارہ کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ مستقبل میں ان ضروریات کی تکمیل کی راہیں تلاش کرنے اور ٹکنالوجی وضع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس سلسلے میں امکانات کو بروئے کار لایا جاسکے۔

اس دستاویز میں زرعی استعمال کے لیے ممکنہ مقوی اشیا کی دستیابی کا تخمینہ اس طرح ہے:

فصلوں کا بچا ہوا حصہ۔ ۵۶ لاکھ ٹن سے ۷۸ لاکھ میٹرک ٹن ہونے کا امکان، زرعی استعمال کے لیے ۱۷ لاکھ ٹن سے ۲۶ لاکھ میٹرک ٹن۔

جانوروں کا گوبر۔ امکانی مقدار ۴۲ لاکھ ٹن سے ۵۷ لاکھ ٹن۔ زرعی استعمال کے لیے امکانی مقدار ۱۰ لاکھ ٹن سے ۱۷ لاکھ ٹن۔

فضلات۔ امکانی مقدار ۵ا سے ۱۸ لاکھ ٹن۔ زرعی استعمال کے لیے امکانی مقدار ۱۲ سے ۱۴ لاکھ ٹن۔ کل امکانی مقدار ۱۰۵ سے ۱۴۲ لاکھ ٹن۔ زرعی استعمال کے لیے امکانی مقدار ۳۹ سے ۵۷ لاکھ ٹن۔

وزارت زراعت اور امداد باہمی کی مذکورہ بالا دستاویز میں کہا گیا ہے کہ ملک میں چوپائے جانوروں کی تعداد ۱۹۸۷ء کے شمار کے مطابق ۴۲۰٫۷ لاکھ ہے۔ اس سے ہر برس ۸۳۰۰ لاکھ ٹن گوبر ملتا ہے۔ اس میں یہ مانا گیا ہے کہ گوبر کا ۲۰ فی صد جمع نہیں کیا جاتا ۲۵ فی صد ایندھن کے طور پر جلا دیا جاتا ہے اور صرف ۵۵ فی صد ہی کمپوسٹنگ کے لیے بچتا ہے۔

اس دستاویز میں تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دیہی علاقوں میں دستیاب قدرتی فضلات میں کمپوسٹنگ کے لیے ۴۵۷ لاکھ ٹن گوبر ۱۱۷۶٫۶ لاکھ ٹن کوڑا اور ۳۰۰ لاکھ ٹن دیگر کوڑا دستیاب ہوتا ہے اس طرح کل ۹۳۳٫۶ لاکھ ٹن کی دستیابی ہے۔ اس میں سے اگر سوکھنے کی وجہ سے ہونے والے ۳۰ فی صد نقصان کو الگ کر دیا جائے تو ۶۵۳ لاکھ ٹن کمپوسٹ تیار کیا جا سکتا ہے۔

شہری کیچڑ بھی فصلوں کو غذا فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نیم اور چڑیوں کی بیٹ سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ شہری کمپوسٹ کی امکانی مقدار ۱۶۰ لاکھ ہونے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

ایک سوال یہ ہے کہ مختلف قدرتی کھادوں سے اہم ثانوی اور کم مقدار کے مقوی اجزا کس حد تک ملتے ہیں۔ وزارت کی مذکورہ دستاویز کے تخمینے حسب ذیل ہیں:

	نائٹروجن	پوٹاش	پوٹیشیم	کل غذائیت کا تناسب
دیہی کمپوسٹ	۰٫۷۵	۰٫۵	۰٫۵	۱٫۷۵
شہری کمپوسٹ	۱٫۰۰	۱٫۰۰	۱٫۰۰	۳٫۰۰
نیم	۵٫۲۰	۱٫۰۰	۱٫۴۰	۷٫۶۰
قدرتی کھاد	۰٫۶۰	۰٫۲۰	۰٫۶۰	۱٫۴۰
مرغیوں وغیرہ کی بیٹ	۳٫۰۰	۲٫۶۰	۱٫۴۰	۷٫۰۰

جے۔ سی کٹیال، کے۔ شرما، کے۔ سری نواس اور ایم نرائن ریڈی (جن کا حوالہ پہلے بھی دیا گیا ہے) نے زیادہ مفصل اعداد و شمار فراہم کیے ہیں جن میں کم مقدار میں غذائیت فراہم کرنے والی اشیا بھی شامل ہیں جو حسب ذیل ہیں:

قدرتی کھادوں اور فصلوں کے بچے ہوئے حصوں میں (سوکھے وزن کی بنیاد پر)

کیمیاوی اجزا

	غذائیت فراہم کرنے والے بنیادی عناصر			غذائیت فراہم کرنے والے چھوٹے چھوٹے عناصر						C : N تناسب
قدرتی کھاد	۲٫۲۸	۰٫۲۴	۱٫۴۵	۱۳۰۰	۲۵	۷۵	۲٫۴	۳٫۵	۲٫۴	۱۸
قدرتی کھاد	۱٫۰۰	۰٫۵۴	۰٫۹۰	۲۶۰۰	۵۷	۲۵۰	۲٫۵	۲٫۱	۴٫۷	۳۵
قدرتی کھاد	۱٫۳۰	۰٫۲۸	۰٫۴۰	۱۴۶۵	۴۰	۶۹	۲٫۸	۸٫۴	۳٫۱	۲۶
خنزیر کی کھاد	۱٫۸۸	۲٫۱۴	۰٫۸۷	۱۲۰۰	۵۰	۷۰	۸٫۹	-	-	-
مرغیوں کی کھاد	۱٫۸۹	۱٫۹۰	۱٫۶۰	۱۴۰۰	۹۰	۲۱۰	۷٫۱	۵٫۰	-	-
مرغیوں کی کھاد	۱٫۸۵	۱٫۸۱	-	۱۰۷۵	۵۰	۱۹۶	۶٫۹	۶٫۰	-	-
انسانی فضلا	۱٫۶۰	۰٫۵۰	۰٫۴۶	-		-	-	-	-	-

شہری کھاد	۱٫۵۰	۰٫۵۰	۱٫۰۰	-	۴۰۰	۵۶۰	۱۵۰	۱۵	۹	-
سیوریج کی کھاد	۰٫۶۵	۰٫۵۰	۰٫۰۳	-	۲۵۷۰	۱۵۰	۰٫۶۱	۴۶۰۰	-	-
نالیوں کی گندگی	۲٫۴۰	۱٫۲۰	۰٫۰۰۲	-	۳۳۵۹	۲۶۲	۶۴۳	۹	۶	-
ہری کھاد	۲٫۲۵	۰٫۳۷	-	۱۴۰	۱۷	۸۰	۳٫۲	۲۰	۰٫۲	۱۳
گیہوں کا بھوسہ	۰٫۵۵	۰٫۰۷	۱٫۶۰	۱۹۰	۲۵	۹۰	۳٫۴	۵	۰٫۱۱	۷۸
چاول کا بھوسہ	۰٫۴۵	۰٫۱۳	۱٫۲۰	۲۸۰	۲۰	۳۴۰	۳٫۵	۵	۰٫۰۵	۸۵
پریس کا کوڑا	۱٫۲۰	۱٫۹۶	۲٫۲۰	۱۱۴۰	۹۴	۴۵۰	-	-	-	-
گنے کا چھلکا	۰٫۲۵	۰٫۱۲	-	۲۴۰	۱۷	۵۰	-	-	-	-
کسٹرکیک	۵٫۷۰	۰٫۷۸	۱٫۴۰	۵۹۰	۷۶	۵۰	-	-	-	-
ایزولا	۴٫۰۳	۰٫۲۹	۱٫۷۰	-	-	-	-	-	-	۸

قدرتی کھادوں میں مختلف کیمیاوی اجزا کی موجودگی مندرجہ بالا گوشوارہ میں دکھائی گئی ہے۔ اس مقدار میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔

(فصلوں کو غذائیت فراہم کرنے والے اہم عناصر ہیں نائٹروجن، پوٹاشس اور پوٹیشیم۔ ثانوی ہیں سلفر، کیلشیم اور میگنیشیم، غذائیت کی غرض سے کم مقدار میں درکار عناصر ہیں لوہا، زنک، مینگنیز، تانبہ بورون اور مولی بیڈنم۔

ان چارٹس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ تمام قدرتی کھادوں میں ضروری مقوی اجزا کی اصل موجودگی بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر اگر گیہوں کی فصل کے لیے ۱۲۰ کلوگرام نائٹروجن کی ضرورت ہے تو ۱۲ ٹن قدرتی کھاد استعمال کرنی ہوگی۔ اس طرح اس کھاد سے ۰٫۸ ۲ فی صد نائٹروجن ہی مل پائے گی۔ ایک ہزار ہیکٹیئر علاقے میں لگے گیہوں کے لیے صرف نائٹروجن فراہم کرنے کے لیے چار ہزار سے ۱۲ ہزار ٹن قدرتی کھاد درکار ہوگی۔ ہو سکتا ہے کھاد کی اس مقدار سے فصل کو تھوڑی سی پوٹاشش اور پوٹیشیم بھی مل جائے ۹۶-۱۹۹۵ء کے معاشی جائزے کے مطابق ۲۵۱ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں گیہوں کی فصل کے لیے سالانہ ۱۰ سے ۳۰ کروڑ قدرتی کھاد درکار ہوگی۔ اس سے اتنا ۰٫۸ ۲ فی صد نائٹروجن ہی مل سکے گی۔

۹۷-۱۹۹۶ء کے معاشی جائزے کے مطابق ۴۲۹ لاکھ ہیکٹیئر علاقے میں پیدا ہونے والے چاول ۱۷٫۲۰ سے ۵۱۶۰ لاکھ ٹن قدرتی کھاد درکار ہوگی تاکہ فصل کو نائٹروجن پوٹاشش اور پوٹیشیم فراہم کی جا سکے خواہ اس کی مقدار پوری ہو یا نہ ہو۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صرف دھان اور گیہوں کے لیے ۲۷۲۰ سے ۸۱۶۰ لاکھ ٹن قدرتی کھاد درکار ہے۔ اتنی کھاد نہ ملک میں دستیاب ہے نہ اسے جمع کرنا ممکن ہے۔

> دونوں قسم کی کھادوں کو ساتھ ملا کر استعمال کرنا بہترین ہے اور اسی کے لیے کوشش ہونی چاہیے۔ آج بھی ہندوستان میں کیمیاوی کھادوں کا صرفہ کم ہے اور دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے یہاں فصلوں کی پیداوار کم ہے۔

پھر اتنی بڑی مقدار میں کھاد کو کھیتوں تک لے جانے کا مسئلہ ہے۔ اس پر آنے والی لاگت سے گیہوں اور چاول کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اس کے علاوہ دیگر فصلوں کو بھی ضروری عناصر فراہم کرنے کے لیے قدرتی کھاد کی ضرورت ہوگی۔

اس طرح ملک میں کیمیاوی کھادوں کی جگہ قدرتی کھادوں کا استعمال خارج از امکان ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ان دونوں قسم کی کھادوں کو ساتھ ملا کر استعمال کرنا بہترین ہے اور اسی کے لیے کوشش ہونی چاہیے۔ آج بھی ہندوستان میں کیمیاوی کھادوں کا صرفہ کم ہے اور دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے یہاں فصلوں کی پیداوار کم ہے۔ لیکن اس سے مٹی کی صحت اور پیداواریت برقرار رکھنے میں قدرتی کھادوں کے رول پر اثر نہیں پڑتا۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ زراعت میں چین کی شاندار کامیابی قدرتی کھادوں کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ چین میں فصلوں کی پیداوار ۵٫۴ ٹن فی ہیکٹیئر ہے جب کہ ہندوستان میں یہ شرح ۲ ٹن فی ہیکٹیئر ہے۔

دسمبر ۱۹۹۶ء میں نئی دہلی میں فرٹیلائزر ایسوسی ایشن آف انڈیا کے تحت "کیمیاوی کھادیں اور زراعت۔ نئی مجبوریاں" عنوان کے تحت سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر کاؤ نے کہا تھا۔

"چین میں کھیتوں میں ہوئی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ قدرتی اور کیمیاوی کھادوں کو ملا کر استعمال کرنے سے فصلوں کی پیداوار بہت اچھی ہوئی۔" انھوں نے "کھادوں کے امتزاج کے اس نوع کے استعمال" کی وکالت کی جیسا کہ چین میں ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قدرتی کھادوں کے استعمال کی مقدار تھوڑی بڑھی ہے لیکن قدرتی کھادوں میں نائٹروجن، پوٹاشش اور پوٹیشیم کا حصہ کم ہوا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ۹۹٫۹ فی صد سے گھٹ کر یہ ۱۹۹۰ء میں ۳۶٫۷ فی صد ہو گیا۔ (فرٹیلائزر نیوز جنوری ۱۹۹۷ء)

چین کے زرعی سائنس داں کا یہ بیان اس خیال کی تنسیخ کرتا ہے کہ دنیا میں کیمیاوی کھادوں کا استعمال ترک کر کے صرف قدرتی کھادیں استعمال ہونی چاہئیں۔ آخر میں ڈاکٹر نورمین بورلاگ کے اس خطبہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو انھوں نے

باقی صفحہ ۲۸ پر

بقیہ کور ۳: اوزون کی پرت میں شگاف

تین ملی میٹر دبیز ہوں گے۔ لیکن فضائے قائمہ میں اوزون کی یہ پتلی سی پرت سمجھے کرۂ ارض پر موجود تمام زندگیوں کے لیے انتہائی اہم ہے کیوں کہ یہ سورج سے خارج ہونے والی مضر الٹرا وائلٹ شعاعوں کو زمین تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ اگر اوزون کی پرت نہ ہوتی تو حیاتِ انسانی پر اس کے انتہائی خطرناک اثرات ہوتے۔ الٹرا وائلٹ بی (UV-B) شعاعیں زندہ چیزوں کو سڑا دیتی ہیں۔ انسان کی جلد پر UV-B شعاعیں پڑنے سے کینسر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان کو سورج کے سائے میں زندگی بسر کرنا ہے تو اس کے لیے اوزون پرت کا باقی رہنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوزون پرت میں شگاف کا ظاہر ہونا ایک زبردست تشویش کی بات ہو گئی ہے۔

کلورو فلورو کاربنس

کلورو فلورو کاربنس یا CFCS قدرتی طور پر نہیں پائے جاتے۔ اسے کلورین، فلورین اور کاربن جوہروں کے آمیزہ سے انسان نے بنایا ہے۔ اس کمپاؤنڈ کو پہلی بار ۱۹۲۰ء میں تیار کیا گیا تھا۔ ایک دہائی کے اندر ریفریجریٹروں میں ٹھنڈا کرنے والے رقیق کے طور پر امونیا کے بدلے ان کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ لیکن ۶۰ کی دہائی تک ان کا استعمال مقابلتاً محدود تھا۔ اس کے بعد بالخصوص یوروپ اور امریکہ میں ان کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوا۔ CFCS کا استعمال ایئر کنڈیشننگ اور ریفریجریشن کے علاوہ بھی متعدد کاموں میں ہونے لگا۔ CFCS کے اس قدر متنوع اور وسیع استعمال کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ یہ کمپاؤنڈ بہت بے ضرر سمجھا جاتا تھا۔ تب شاید ہی کسی نے اس کے بے مہار استعمال کے مضر اثرات کے بارے میں سوچا ہوگا۔

۱۹۷۳ء میں پہلی بار دو امریکی سائنس دانوں نے دنیا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ CFCS اوزون کو برباد کر رہے ہیں۔ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۸ء میں امریکہ اور یوروپ کے کئی ممالک نے CFCS کی مدد سے ڈبے بند کیے جانے پر پابندی لگا دی۔ لیکن اس کے اصل خطرناک نتائج کی طرف توجہ اس وقت کی گئی جب ۱۹۸۴ء میں انٹارکٹکا کا سروے کرنے والی ایک برطانوی ٹیم نے جنوبی برفانی علاقوں سے اوزون کی پرت میں معدوم ہونے کا انکشاف کیا۔ تحقیقات سے ثابت ہوا کہ انٹارکٹیکا کے ایک چھوٹے سے خطے میں اکتوبر ۱۹۸۴ء تک اوزون کی پرت تقریباً ۳۰ فی صد پتلی ہو گئی تھی۔ کرۂ ارض کی حفاظت کرنے والی اوزون پرت میں شگاف پڑ گیا تھا۔ اس زمانے میں سیارچوں کے ذریعہ کھینچی گئی تصویروں کی مدد سے بھی اسی تحقیق کو درست پایا گیا۔ ۱۹۸۷ء تک انٹارکٹیکا میں اوزون

ہیں تو ایک طرح کا بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد مختلف کیمیائی مادوں پر ایک دوسرے کے ردعمل اور تفاعل اور ان کے اثرات کا تجزیہ کرنے پر یہ پتا چلا کہ انٹارکٹیکا پر فضا میں اوزون شگاف کی وجہ کیا ہے۔

اگرچہ اوزون میں کمی کی پہلی رپورٹ انٹارکٹکا سے ملی لیکن بعد میں قطب شمالی کے (ARCTIC) علاقے اور معتدل درجۂ حرارت والے عرض البلاد TEMPERATE LATITUDE سے بھی اوزون کم ہونے کی رپورٹیں موصول ہوئیں۔ ناسا (NASA) کے بالائی فضا کے تحقیق والے سیارچے نے جو تفصیلات فراہم کیں ان سے اوزون کی تعداد کم ہونے کے اسباب پر روشنی پڑی۔ سیارچے کی بھیجی گئی تفصیلات کے تجزیہ سے ثابت ہوا کہ اس کے مضر اثرات صرف انٹارکٹیکا کے برفانی خطے پر ہی نہیں پڑ رہے ہیں بلکہ

> فضائے قائمہ میں اوزون کا کم ہو جانا اب ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اور بنی نوع انسان پر اس کے اثرات کے تئیں تشویش بجا ہے۔ یہ ہمارے سیارہ پر حیات کو درپیش کسی سنگین خطرے کا اعلامیہ ہے۔ اس کے بارے میں ابھی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کی پرت ۵۰ فی صد تک پتلی ہو گئی تھی۔ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی اور اب جاگنا ضروری تھا۔

بربادکن سلسلہ

۱۹۸۸ء تک یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ CFCS ہی اوزون کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ اوزون پرت کو مزید نقصان سے بچانے کے اقدامات کیے جائیں۔ یہ جاننا زیادہ ضروری ہو گیا کہ CFCS اسے کس طرح نقصان پہنچا رہے ہیں۔ سائنس داں اس بات پر دنگ تھے کہ CFCS جیسے بظاہر ساکت کمپاؤنڈ اوزون کو کیسے برباد کر سکتے ہیں۔ لیکن دھیرے دھیرے اسرار کھلنے لگے اور اس کی وجہ سمجھ میں آنے لگی، یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ بظاہر بڑے بے ضرر کیمیائی مادے جو دنیا والوں کے اتنے کام آتے ہیں، جب فضا میں پہنچتے

دنیا میں جہاں جہاں اس کمپاؤنڈ کا استعمال ہو رہا ہے وہاں وہاں فضا کے کیمیائی نظام پر اس کے ضرر رساں اثرات ثبت ہو رہے ہیں۔ ایک حلقے کا خیال تھا کہ آتش فشاں کے پھٹنے سے جو سلفیورک ایسڈ خارج ہوتا ہے اس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ قطبی خطوں (POLAR REGIONS) کے آس پاس کے خطوں کی فضا بلکہ دور دراز میں بھی اوزون کی سطح متاثر ہوتی ہے۔ اس کے لیے ۱۹۸۲ء میں میکسیکو میں کوہ ایل شیکون یا ۱۹۹۱ء میں فلپائن کے پیناتوبو پہاڑ کے آتش فشاں پھٹنے کے واقعات کو مثال بنایا گیا۔

یہ تحقیقات بڑی غیر متوقع تھیں کیوں کہ اوزون کے گھٹنے کا معاملہ گرمیوں میں پیش آیا جب کہ یہ وہ دن ہوتے ہیں

جن میں فضائے قائمہ میں اس طرح کی کسی تبدیلی کا امکان بہت کم ہوتا ہے اور یہ بات بہت تشویشناک تھی کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان، حیوانات اور نباتات جو POLES سے دور دراز کے خطوں میں ہیں ان پر U V . B کی مضر شعاعیں اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ بعض ماہرین کے مطابق یہ معلومات تو محض ٹپ آف دی آئس برگ (کل کا محض ایک قلیل جزو) ہی ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے یہ کسی بہت بڑے خطرے کا محض اشارہ بھر ہو۔

زندگی خطرے میں

فضائے قائمہ میں اوزون کا کم ہو جانا اب ایک مسلمہ حقیقت ہے اور بنی نوع انسان پر اس کے اثرات کے تئیں تشویش بجا ہے۔ یہ ہمارے سیارہ پر حیات کو درپیش کسی سنگین خطرے کا اعلامیہ ہے۔ اس بارے میں ابھی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ابھی ہم نے اس بارے میں تو خاصی جانکاری حاصل کر لی ہے کہ کون سا کیمیائی عمل فضائے قائمہ میں اوزون کو نقصان پہنچانے کا ذمہ دار ہے لیکن الٹراوائلٹ شعاعوں کے زندہ اشیاء پر کیا اثرات ہوں گے اس بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ ابھی حال ہی میں سائنس دانوں نے اس بات کی تحقیق کی طرف توجہ کی ہے کہ اوزون کے معدوم ہو جانے سے جاندار، نباتات اور زیر آب رہنے والے جانداروں پر کیا اثرات ہوں گے۔ البتہ جانداروں پر اس کے بعض اثرات کا ہمیں پہلے سے علم ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ الٹراوائلٹ شعاعوں کے براہ راست اثر سے جانداروں کا مدافعتی نظام کمزور ہو سکتا ہے۔ موتیا بند اتر سکتا ہے یا جسلد کا کینسر ہو سکتا ہے۔ تقریباً ۲۰۰ اقسام کے پودوں پر الٹراوائلٹ شعاعوں کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا۔ پتا چلا کہ تقریباً دو تہائی پودے ان شعاعوں کے مضر اثرات کا شکار ہو گئے۔ ان میں بین، مٹر اور گوبھی کے خاندان کی سبزیاں بھی شامل ہیں۔ الٹراوائلٹ شعاعوں کے اثر سے ان کے پتے چھوٹے ہو گئے یا نمو کم ہوئی یا بیج کمتر درجے کا پیدا ہوا اور جڑوں میں کیڑے لگ گئے۔ آبی حیاتیاتی ماہرین نے انٹارکٹکا کے اردگرد کے سمندروں میں جو تجربے کیے ان سے ثابت ہوا کہ الٹراوائلٹ شعاعوں کی وجہ سے آبی نباتات کی پیداواریت میں چھ سے بارہ فی صد کی کمی واقع ہو گئی۔ اس کے علاوہ مختلف اقسام کے آبی حیوانات کے لاروا (LARVAE) اور ان کے عضویاتی نظام کو نقصان پہنچا۔

اس طرح کی تبدیلیاں بعد میں بہت بھیانک خطرہ بن کر سامنے آ سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر انٹارکٹیکا کے پانیوں میں نباتات کی پیداواریت میں کمی KRAILL نامی اُن چھوٹے چھوٹے جھینگا نما مکوڑوں کی فنا کا باعث ہو سکتی ہے جو سمندری تہہ میں رہتے ہیں۔ کرل ختم ہوئے تو ان کا اثر مچھلیوں اور دیگر آبی پرندوں اور جانداروں پر پڑے گا۔ یہ ختم ہوئے تو سیل اور وہیل جیسی بڑی بڑی مچھلیاں بھی فنا ہو جائیں گی کیوں کہ ہر چھوٹا جاندار بڑے جاندار کا خوراک اور اس کی حیات کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ تو محض قیاسیات ہیں۔ اوزون پرت میں شگاف کے مسئلے کی سنگینی کا خطرہ تو ابھی ظاہر ہونا شروع ہوا ہے۔ گو ضروری نہیں کہ جو ہم آج جانتے ہیں حقیقت مطلق ہو۔

مانٹریال پروٹوکول

اوزون پرت کے معدوم ہو جانے سے انسانی زندگی کو جن خطرات کا سامنا ہے ان کے پیش نظر ستمبر ۱۹۸۷ء میں دنیا کے ۲۴ ممالک کے مندوبین مستقبل کے لیے لائحہ عمل طے کرنے کی خاطر کناڈا کے شہر مانٹریال میں جمع ہوئے۔ انھوں نے ایک عہد نامے پر دستخط کیے، جسے مانٹریال پروٹوکول کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ان تمام کیمیائی مادوں کے استعمال کو ایک خاص وقت کے اندر ختم کر دینے کا عہد کیا گیا جو اوزون کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس پروٹوکول میں اوزون کو نقصان پہنچانے والے دو طرح کے کیمیائی مادوں کی نشاندہی کی گئی۔ ایک تو CFCS کمپاؤنڈ ہیں، دوسرا HALONS ہیں جو آگ بجھانے کے کام آتے ہیں۔ طے ہوا کہ پروٹوکول پر دستخط کرنے والے سبھی ممالک ان دونوں کیمیائی مادوں کا محدود استعمال ہی کریں گے۔ پروٹوکول کے مطابق ان ممالک میں ان کیمیائی مادوں کی پیداوار اور استعمال پر پابندی لگانے کی بات کہی گئی جنھوں نے اس پروٹوکول پر دستخط نہیں کیے ہیں۔ اس پابندی کی صورت یہ نکالی گئی کہ یہ ۲۴ ممالک دیگر ممالک سے ان کیمیائی مادوں کی درآمد کا کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔

اوزون پرت کے معدوم ہو جانے سے انسانی زندگی کو جن خطرات کا سامنا ہے ان کے پیش نظر ستمبر ۱۹۸۷ء میں دنیا کے ۲۴ ممالک کے مندوبین مستقبل کے لیے لائحہ عمل طے کرنے کی خاطر کناڈا کے شہر مانٹریال میں جمع ہوئے۔ انھوں نے ایک عہد نامے پر دستخط کیے، جسے مانٹریال پروٹوکول کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے ان تمام کیمیائی مادوں کے استعمال کو ایک خاص وقت کے اندر ختم کر دینے کا عہد کیا گیا جو اوزون کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

مانٹریال پروٹوکول میں اگلے ۱۵ سال کے اندر CFCS کا استعمال پوری طرح بند کر دینے کا نشانہ متعین کیا گیا ہے۔ پروٹوکول پر کاربند رہنے کی صورت میں توقع ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ۲۰۰۰ تک اور ترقی پذیر ممالک ۲۰۱۰ تک CFCS کے استعمال اور پیداوار میں کافی حد تک کٹوتی کر دیں گے۔

دریں اثنا CFCS کا متبادل تلاش کرنے کے لیے دنیا بھر میں کوششیں چل رہی ہیں۔ حاصل اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں جس قدر CFCS کی کٹوتی کا عہد کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس کا تقریباً ایک تہائی ہی استعمال ہوتا ہے۔

باقی صفحہ ۵۰ پر

بی۔ بھٹاچاریہ

ماحولیات اور تجارت۔ چند مسائل

چند ترقی یافتہ ممالک کے شروع کردہ ماحولیاتی تدابیر کی وجہ سے ہندوستانی برآمدات بالخصوص چمڑے اور کپڑا بننے کی صنعت کو جو خطرہ لاحق ہے وہ شدید ہو گیا ہے۔ مصنف کے بقول زرعی برآمدات کو بھی ان تدابیر سے خطرہ لاحق ہے۔ بایں ہمہ ہندوستان کو ماحولیاتی معیاروں کی بلندی تک پہنچنا ہے تاکہ تجارتی شریکوں کی مانگ کو پورا کیا جا سکے۔

معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی بوسیدگی کے مسائل در آتے ہیں۔ معاشی ترقی کی بلند سے بلند تر شرح کے ضبط کی ایک دہائی گزر جانے کے بعد عالمی برادری کو یہ محسوس ہوا۔ قابل برقرار ترقی ہی جستجو کے قابل ہے، تاہم برقرار رہنے والی ترقی کا حصول بھی اسی وقت ممکن ہے جب کہ دنیا کے اکثر ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اس کے علاوہ کچھ ممکنہ تجارتی قضیے اور تنازعے بھی ہوتے ہیں جن سے سمجھوتہ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ مثلاً برساتی جنگلات کا تحفظ انسان کے لیے چوں کہ کلیدی ماحولیاتی ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ان کا تحفظ بھی گہری تشویش کا سبب ہے لیکن ملیشیا جیسے ملک کے لیے جہاں برساتی جنگلات کا ذخیرہ ہے اس کی حیثیت وہاں کے معاشی ذریعہ کی ہے اور معاشی ترقی کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اسے صلاح دی جا رہی ہے کہ وہ عالمی برادری کے نفع کی خاطر اپنے اس ذریعہ کی قربانی دے دے۔ قابلِ برقرار ترقی کی منزل کی طرف عالمی ارتقائی سفر میں ایسے مشکل مسائل ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔

ماحول کے موضوع پر بہت سے بین اقوامی معاہدات جن کا تجارت پر کافی اثر پڑتا ہے پر گفت و شنید کی گئی ہے۔ مزید برآں کچھ ممالک اپنی ملکی سطح پر ماحولیاتی تحفظ کے لیے اقدامات کر رہے ہیں جو شریک تاجروں کے لیے تجارتی معنویت رکھتے ہیں۔

عالمی تجارتی تنظیم GATT (WTO) اپنی ابتدائی شکل میں اس تحقیقی مطالعہ میں لگی رہی ہے کہ یوروگوئے راؤنڈ URUGUAY ROUND کے بعد کہاں کہاں تجارت اور ماحولیات کے مسائل ایک ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ اس مضمون کا مقصد ان ارتقائی امور پر نظر ڈالنا ہے۔

پچھلی تین دہائیوں میں ماحولیات کے تحفظ اور حیاتی تنوع کے بارے میں بہت سے بین اقوامی کنونشنوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان میں سے ان چند کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں ہندوستان بھی ایک فریق کی حیثیت سے شریک ہوا۔

سی۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ ایس

۳ مارچ ۱۹۷۳ء کو زیرِ خطر نباتات و حیوانات بین اقوامی تجارت پر کنونشن بلایا گیا اور یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو لاگو کیا گیا۔ اس سے زیرِ خطر حیوانات و نباتات اور ان سے حاصل کردہ نمونہ جات کی سرحد پار سودا بازی کی روک تھام کے لیے کنٹرول کا عالمی نظام قائم ہوا ہے۔ سی۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ ایس نے ایسی تجارتی تدابیر استعمال کی ہیں جن سے معدوم ہونے والی انواع کا تحفظ ہو سکے۔ (ضمیمہ۔ ۱) اور ان انواع کا بھی جن کو تجارت کی سخت ضابطہ بندی نہ ہونے کی صورت میں خطرہ ہو سکتا ہے۔ (ضمیمہ۔ ۲) ان انواع کی تجارت کی منظوری اسی وقت دی جائے جب کہ معاہدہ میں شامل فریق ملک کے متعینہ افسر اس کا جواز تسلیم کرتے ہوں۔ امپورٹ ایکسپورٹ پالیسی کے تحت ہندوستان نے سی۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ ایس کے ضمیمہ۔ ۱۔ اور ۲ میں شامل انواع کی تجارت پر پابندی عائد کر دی ہے اور اسی طرح جنگلی حیوانات جن میں ان سے بننے والی چیزیں اور ان کے اعضا مثلاً ہاتھی دانت کا سامان وغیرہ شامل ہیں، ان کی درآمد بھی ہندوستان میں ممنوع ہے۔ تاہم

چور چکاری اور غیر قانونی تجارت کو روکنا ایک مشکل کام ہے چوں کہ تعمیل کرانے والے موجودہ عملہ کی بنیادی سہولتیں مطلوبہ حد سے کم ہیں۔ پھر بھی انضباطی ایجنسیوں نے زیر خطر نباتات وحیوانات کی غیر قانونی تجارت وشکار کو کم کرنے میں قدرے کامیابی حاصل کی ہے۔

بیسل کنونشن

پرخطر فضلات اور ان کی فروخت کی سرحد پار نقل وحرکت پر کنٹرول کے بارے میں بیسل کنونشن ۲۲ مارچ ۱۹۸۹ء کو بلایا گیا اور ۵ مئی ۱۹۹۲ء کو اس پر عمل درآمد شروع ہوئی۔ اس کنونشن کا مقصد یہ ہے کہ پرخطر اور زہریلی اشیاء کی فروخت سے متعلق بڑے مسائل پر توجہ کی جائے۔ ان بے کار اشیاء میں ان کی سرحد پار نقل وحرکت اور ان کی فروخت اور ترقی یافتہ ممالک سے ترقی پذیر ملکوں کی طرف ان کو ٹھکانے لگانے کے عمل پر غور وخوض کرنا شامل ہے۔ مارچ ۱۹۹۴ء میں کنونشن کی دوسری میٹنگ ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ خطرناک فضلات جن کو انجام کار OECD (تنظیم برائے اقتصادی تعاون وترقی) ممالک سے غیر OECD ممالک میں ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔ ان کی سرحد پار نقل وحرکت پر فوری طور پر روک لگائی جائے۔ ردی مال کی بازیافت اور پھر سے اس استعمال کے مقصد کو ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ء تک پالینے کے لیے خطرناک ردی مال کی سرحد پار نقل وحرکت کو بتدریج واپس لینے کے لیے ایک اور قرارداد اختیار کی گئی۔

کچھ عرصہ سے چند ہندوستانی صنعتوں میں ایسا ردی مال صنعتی استعمال کے لیے درآمد کیا جارہا ہے مگر اب عدالتی فیصلہ کی بنیاد پر ان کی درآمد پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔

مانٹریل پروٹوکول

اوزون کُش مادوں خاص طور پر [illegible] اور [illegible] کا اخراج اوزون پرت کے خاتمہ کا سبب ہے اس کے نتیجے میں بھاری تعداد میں ماورائے بنفشی شعاعیں خارج ہوتی ہیں جو انسانی صحت وماحولیات کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔ اوزون پرت کے تحفظ کے لیے عالمی تعاون کو ویانا کنونشن نے ۱۹۸۵ء میں اور مانٹریل پروٹوکول نے ۱۹۸۷ء میں ادارہ کی صورت بخشی۔ ODS کے استعمال اور اس کی پیداوار کو منضبط کرنے کے لیے مانٹریل پروٹوکول کی تشکیل کی گئی۔ سب سے زیادہ رائج ODS وہ CFCs ہیں جو ریفریجریشن صنعت، ایروسول ایندھن کی پیداوار اور بالائی پرت کے اصلاحی عامل کی حیثیت سے بنیادی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے زیادہ رائج CFCs کو ۱۹۹۶ء تک رفتہ رفتہ استعمال سے خارج کرنا تھا۔ پروٹوکول نے ترقی پذیر ممالک کو جن کی منضبط مادوں کی خرچ کی سطح ۳/۱۰-کلوگرام سے کم ہے۔ دس سال تک ان اشیاء کے استعمال کے بتدریج ترک کو ملتوی رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ پروٹوکول نے مالی امداد کا بھی اہتمام کیا ہے تاکہ مروجہ میٹریل کو نئے میٹریل اور تکنالوجی میں تبدیل کیا جاسکے۔ ہندوستان کا شمار ایسے ہی نچلی سطح کے صارفین کے زمرے میں ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کو ان میٹریلوں کے ترک کی مدت میں زیادہ چھوٹ دی گئی ہے۔ عالمی بینک نے حال ہی میں ہندوستان میں دو اہم پروجیکٹوں کو منظوری دی ہے تاکہ یہاں ODS اور متعلقہ مسائل کے متبادل کو فروغ دیا جائے تاہم تکنالوجی کے ٹرانسفر اور امداد کی صورت میں مانٹریل پروٹوکول کے مثبت محرکات ہندوستان میں کسی ٹھوس صورت میں ابھی سامنے نہیں آئے ہیں۔

عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کے مسائل

یوروگوئے راؤنڈ میں بین اقوامی تجارت اور ماحولیات کے درمیان تعلق کے موضوع پر بحث ہوئی۔ عالمی برادری عالمی بنیاد پر قابل برقرار ترقی کے لیے پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت پر اس مباحثہ سے پہلے ہی غور وخوض کرچکی ہے۔ ماحولیات پر RSO کے اعلان اور ایجنڈا ۲۱ میں اس تشویش کی جھلک ملتی ہے۔ حقیقتاً اس معاہدہ میں جس کی رو سے عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کا قیام عمل میں آیا ہے مذکور ہے کہ تجارت اور معاشی کوششوں کے میدان میں تعلقات اس طرح چلائے جائیں کہ ان سے زندگی کا معیار بلند ہو، بھرپور ترقی، اچھی اور واقعی آمدنی اور موثر طلب میں مسلسل اضافہ ہو، تجارت پھلے پھولے، مال کی پیداوار بڑھے اور قابل برقرار ترقی کے مقصد کے موافق عالمی وسائل کا مناسب استعمال ہو اور ساتھ ہی ماحولیات کے تحفظ اور وسائل کے فروغ کا مقصد اس طرح حاصل ہو کہ معاشی ترقی کی مختلف سطحوں پر ان کی ضرورت وسائل سے مربوط ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ایک طرف غیر امتیازی اور منصفانہ کثیر فریقی تجارتی نظام کی برقراری وتحفظ اور دوسری طرف پائدار ترقی کے فروغ اور ماحولیات کے تحفظ کے درمیان پالیسیوں میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

اپریل ۱۹۹۴ء میں مرہ کیش میں یوروگوئے راؤنڈ گفت وشنید کے ثمرات کو منظوری دیتے وقت میٹنگ میں یہ فیصلہ

ماحول کے موضوع پر بہت سے بین اقوامی معاہدات جن کا تجارت پر کافی اثر پڑتا ہے پر گفت وشنید کی گئی ہے۔ مزید برآں کچھ ممالک اپنی ملکی سطح پر ماحولیات کے تحفظ کے لیے اقدامات کررہے ہیں جو شریک تاجروں کے لیے تجارتی معنویت رکھتے ہیں۔

بھی کیا گیا کہ عالمی تجارتی تنظیم کے تحت تجارت وماحولیات پر کی کمیٹی ترتیب دے رہی ہے۔ یہ پروگرام کثیر فریقی تجارتی نظام کے تمام شعبوں پر محیط ہے جس میں مال، خدمات اور دانشورانہ خصوصیت سب کچھ شامل ہے۔ کمیٹی برائے تجارت و ماحولیات کو تجزیاتی اور ہدایتی ہر دو اختیار حاصل ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تجارت اور ماحولیات سے متعلق تدابیر کے درمیان رشتوں کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے کہ قابل برقرار ترقی کو بڑھاوا ملے اور میں صراحت کردہ کثیر فریقی تجارتی نظام کی موجودہ گنجائشوں میں ترامیم کے ضرورت پر سفارشات کی جاسکیں۔

کی یہ رپورٹ دسمبر ۱۹۹۶ء میں سنگاپور میں کی منسٹیریل کانفرنس کو پیش کی گئی۔

رپورٹ میں یہ اقرار کیا گیا ہے کہ غربت اور ماحولیاتی بوسیدگی میں قریبی تعلق ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ایک بے لاگ، منصفانہ اور غیر امتیازی تجارتی نظام جو صارفین تک رسائی پانے میں مددگار ہو، ترقی پذیر ممالک کے ماحولیاتی وسائل کے قابل برقرار انتظام سے متعلق مناسب ماحولیاتی پالیسیوں کو نافذ کرنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ صرف تجارتی عمل کی آزادی سے ماحولیاتی بوسیدگی کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اس کے برعکس تجارت کو پابند کرکے بھی ماحولیاتی مسائل کا حل نہیں نکل سکتا۔ چند تحقیقی مطالعے جو ترقی یافتہ ملکوں میں کیے گئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ تجارت میں آزادی کے عمل سے کچھ صورتوں میں ماحولیات میں سدھار پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ ترقی پذیر ممالک جن کا ماحولیاتی معیار گھٹیا ہے ان کی خراب صنعتوں کی باز آبادکاری کے سلسلہ میں ترقی یافتہ ملکوں کے اعلا ماحولیاتی معیار نظریاتی سطح پر رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔ تاہم زیادہ تر تحقیقی مطالعات سے منکشف ہوتا ہے کہ اس مفروضہ کی تائید میں شواہد کم ہیں۔ بالخصوص اگر ترقی پذیر ممالک میں آزاد تجارت سے اونچی سطح آمدنی کا راستہ ہموار ہوتا ہے تو وہاں ماحولیات پرور پیداواروں کی مانگ میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس لیے ممکن ہے کہ تجارت کے آزادانہ عمل سے مجموعی ماحولیاتی معیار عالمی سطح پر انجام کار بہتر ہو جائیں۔

ہندوستانی سیاق وسباق

تاہم یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ جملہ اقسام کی صنعت کاری کے عمل سے کچھ ماحولیات کی دولت کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً متحدہ امریکہ کے سلی کون وادی میں سب سے زیادہ خراب مٹی ہے۔ کمپیوٹر کے پرزوں کی صفائی میں استعمال ہونے والے کیمیکل ماحولیاتی مسئلہ کی جڑ ہیں۔ صنعتی سرگرمیوں کی وجہ سے تین پہلوؤں پر قربانی دینی پڑتی ہے۔ اول اس کے نتیجہ میں قابل برقرار سطح سے اوپر قدرتی وسائل کا استحصال اور ان کی بوسیدگی جیسے جنگلات کے وسائل وغیرہ۔ دوم پیداوار کے عمل کی وجہ سے آلودگی کا پیدا ہونا جیسے چمڑے کی رنگائی اور رنگ وروغن کے مسالوں کی پیداوار کا عمل۔ سوم اس کے نتیجہ میں صحت کے انتظام سے متعلق خرابیاں جیسے کہ بڑے شہری علاقوں میں آلودگی سے تنفس کے مسائل میں اضافہ وغیرہ۔ ہندوستان کے بارے میں عالمی بینک کے حالیہ تحقیقی مطالعہ میں ماحولیاتی نقصان کا محتاط اندازہ ۳۴۰ بلین سالانہ ہے۔ درج ذیل گوشوارہ میں اس رپورٹ کی متعلقہ تفصیل دی جاتی ہے۔

اگرچہ تمام صنعتیں کسی حد تک آلودگی پیدا کرتی ہیں مگر ان میں کچھ زیادہ آلودگی پیدا کرنے والی ہیں۔ نیچے دی ہوئی صنعتوں کی اس حیثیت سے نشان دہی کی گئی ہے کہ وہ اوسط سے زیادہ ماحولیاتی آلودگی پیدا کرتی ہیں۔

۱۔ بنیادی دھاتیں پیدا کرنے والی صنعتیں جن میں زنک، سیسہ، تانبا، ایلومینیم اور اسٹیل شامل ہیں۔
۲۔ کاغذ۔ پلپ اور اخباری کاغذ۔
۳۔ کیڑے مار دوائیں۔
۴۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے۔
۵۔ کیمیاوی کھادیں۔
۶۔ رنگ۔
۷۔ روغن۔
۸۔ چمڑا رنگائی۔
۹ مصنوعی ریشم۔
۱۰۔ سوڈیم/پوٹاشیم سائنائڈ۔
۱۱۔ بنیادی دوائیں۔
۱۲۔ ڈھلائی۔
۱۳۔ اسٹوریج بیٹری۔
۱۴۔ پلاسٹر۔
۱۵۔ ربر سنتھیٹک۔
۱۶۔ سیمنٹ۔
۱۷۔ پہاڑ کپاس۔
۱۸۔ تخمیری صنعت۔ خمیر سازی۔
۱۹۔ برقی ملمع کاری۔

ہندوستان کی برآمدی تجارت

گوشوارہ
ماحولیاتی خرچ پر عالمی بینک کا اندازہ

مسئلہ	اثر	کم اندازہ، امریکی ڈالر ملین	زیادہ اندازہ، امریکی ڈالر ملین
شہری ہوائی آلودگی	صحت	۵۱۷	۲۱۰۲
آبی آلودگی	صحت (خصوصاً اسہالی امراض)	۳۰۷۶	۸۳۴۴
مٹی کی بوسیدگی	زرعی حصوں میں کمی	۱۵۱۶	۲۳۶۸
چراگاہوں کی بوسیدگی	مویشی پرورانہ صلاحیت کی کمی	۲۳۸	۴۱۷
جنگلات کا کٹاؤ	قابل برقرار کم پیداوار کا نقصان	۱۸۳	۲۴۴
ٹورزم	ٹورزم کی آمدنی میں گراوٹ	۱۴۲	۲۸۳

ذریعہ: عالمی بینک ۱۹۹۵ء

میں ان میں سے کچھ صنعتوں کی بہت اہمیت ہے مثلاً چمڑا، رنگنے کا مسئلہ، کیمیاوی درمیانی مرکبات، ادویہ سازی۔ حقیقت میں سوتی کپڑا بُننے کی صنعت جو مجموعی طور پر ہندوستان کی برآمدات کا ۳۰ فی صد حصہ ہے۔ ماحولیاتی نقصان کا بڑا سبب بن سکتی ہے۔ کپاس کی کاشت میں کثرت سے کیڑے مار دوا استعمال ہوتی ہے۔ تیاری کے مرحلہ پر کپڑا بُننے کی صنعت میں بڑی مقدار میں کیمیکل رنگ استعمال ہوتے ہیں جن کا ماحول پر الٹا اثر پڑتا ہے۔

ہی ہے جیسا چمڑے کی صنعت کے میدان میں اس صنعت پر۔

ترقی یافتہ ممالک کے دباؤ ڈالنے کے نتیجہ میں شروع کیے جانے والے اقدامات کے علاوہ اپنے طور پر بھی ملک میں کچھ ایکشن لیا گیا ہے۔ مثلاً آبی کاشت کی صنعت ماضی قریب میں غیر ملکی زر مبادلہ کا اہم ذریعہ بن کر ابھری ہے۔ تاہم آندھرا پردیش اور تامل ناڈو کے ساحلی علاقے جو آبی کاشت کا گڑھ ہیں وہاں ماحولیاتی نقصان کا اندیشہ ہے اس

ترقی یافتہ ممالک کے دباؤ ڈالنے کے نتیجہ میں شروع کیے جانے والے اقدامات کے علاوہ اپنے طور پر بھی ملک میں کچھ ایکشن لیا گیا ہے۔ مثلاً آبی کاشت کی صنعت ماضی قریب میں غیر ملکی زر مبادلہ کا اہم ذریعہ بن کر ابھری ہے۔

چند ترقی یافتہ ملکوں کی شروع کی ہوئی ماحولیاتی تدابیر کی وجہ سے ہندوستان کی چمڑا اور کپڑا بُننے کی صنعت کی برآمدات پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے زرعی برآمدات پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔

کچھ ترقی یافتہ ممالک (جن میں جرمنی سرفہرست ہے) نے چمڑا سازی میں PCP کے استعمال پر پابندی لگادی ہے۔ PCP کے متبادل اگرچہ زیادہ مہنگے ہیں مگر دستیاب ہیں۔ جب کہ PCP کے متبادل کی طرف تبدیلی کے عمل سے مسابقتی لاگت گھٹ جاتی ہے۔ مگر ماحول پر منفی کے بجائے اثر مثبت ہوجاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کپڑا بُننے کی ماحولیات موافق صنعتوں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ کپڑا بُننے کی ماحولیات موافق صنعتوں میں کیمیکل کم سے کم استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ متعلقہ ایجنسیوں نے ممنوعہ کیمیکلز کی ایک فہرست مرتب کرلی ہے۔

مئی ۱۹۹۷ء میں جاری کردہ ایک اعلان میں حکومت نے کپڑا بُننے کی صنعت میں ... کے استعمال پر پابندی لگادی ہے۔ ایسے تمام اقدامات کا اثر ایسا

لیے ایک عدالتی فیصلہ کے ذریعہ آبی کاشت کے فروغ پر روک لگادی گئی ہے۔ تامل ناڈو کی حکومت نے ایک ایکٹ پاس کردیا ہے جس میں صراحت کردی گئی ہے کہ مچھلی پالن کے تمام پروجیکٹوں کی رسمی کارروائی کو ڈسٹرکٹ کونسل بہ شمول ڈسٹرکٹ کلکٹر، آلودگی کنٹرول بورڈ کا نمائندہ اور دیگر متعلقہ افسران پورا کریں گے۔ تامل ناڈو میں عدالتی فیصلہ کی رو سے چمڑا رنگنے کے کارخانوں کی بڑی تعداد کو اس لیے بند کردیا گیا ہے کہ وہ ماحولیاتی نقصان کی وجہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو مستقبل میں ماحولیاتی معیار کی بلند سطح تک پہنچنا ہے چوں کہ ملک کے ماحولیاتی تحفظ کے لیے اس کی ضرورت بھی ہے اور اہم تجارتی شرکاء کا مطالبہ بھی ہے۔

بقیہ: اوزون کی پرت میں شگاف

پروٹوکول میں ایک ایسے بین اقوامی فنڈ کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے جس سے ترقی پذیر ممالک کو اوزون کے تئیں بے ضرر کیمیائی مادے دریافت کرنے میں تعاون حاصل ہوگا۔ بھارت نے اس سلسلے میں پیش رفت کی ہے۔ کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی دو قومی لیباریٹریاں۔ نیشنل کیمیکل لیباریٹری، پونے اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹکنالوجی حیدرآباد۔ میں تحقیق جاری ہے اور HCFC-22 اور HCFC-134 کے نام کے دو متبادل کیمیائی مادے تیار بھی کرلیے گئے ہیں۔

تاہم CFC کا محفوظ متبادل تلاش کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کمپریسر تکنالوجی کو بھی بدلنا ہوگا اور یہ کام راتوں رات نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ اگر مانٹریال پروٹوکول کے مقاصد حاصل کرنے ہیں تو CFC کا متبادل بھی تلاش کرنا ہوگا اور کمپریسر تکنالوجی میں بھی تبدیلی لانی ہوگی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ HCFCs یعنی ہائیڈرو کلورو کاربنس بھی پوری طرح محفوظ متبادل نہیں ہے۔ کیوں کہ CFCs کے مقابلے دھیرے ہی سہی لیکن اوزون کو نقصان یہ بھی پہنچاتے ہیں۔ مانٹریال پروٹوکول کے سلسلے میں ۱۹۹۲ء میں کوپن ہیگن میں جو اجلاس طلب کیا گیا تھا اس میں HCFCS کے استعمال میں بتدریج کٹوتی کا معاملہ بھی زیر غور آیا۔ طے پایا کہ ۲۰۰۴ء اور ۲۰۳۰ء کے درمیان پانچ مرحلوں میں HCFCs کا استعمال بھی پوری طرح ترک کردیا جائے۔ اس کے شانہ بشانہ ریفریجریشن تکنیک کا متبادل دریافت کرنے کے لیے متعدد کوششیں جاری ہیں۔

اوزون کا مسئلہ ناقص علم اور تکنالوجی کے بے مہار استعمال کا پیدا کردہ ہے لیکن اس کا حل بھی مٹی اور آلودگی سے پاک تکنالوجی کی دریافت اور ایسی مصنوعات کی ایجاد کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے جو کرۂ ارض کے نازک اور حساس ماحولیاتی نظام کے لیے ضرر رساں نہ ہوں۔

ڈاکٹر اقبال ملک

اسپتالوں کی غلاظت، مناسب انتظام کی ضرورت

اسپتالوں کا فضلہ زیادہ خطرناک قسم کی گندگی ہے کیوں کہ یہ بیماری پھیلانے والے جراثیم سے آلودہ ہوتا ہے۔ دہلی کے اسپتالوں سے نکلنے والے کوڑے کرکٹ اور غلاظت کو دور کرنے کے انتظام کے جائزے کے بعد مصنف نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ایسی غلاظت کو ٹھکانے لگانے کا سخت انتظام کرنے اور غلاظت پھیلانے سے روکنے کے لیے لوگوں میں آگاہی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی بحث اور تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ غلاظت اور کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کے لیے مل جل کر کام کیا جائے تو اس کے زیادہ مفید اور دور رس اثرات نمودار ہوں گے۔

راجدھانی دہلی میں رہائشی علاقوں، بازاروں، ہوٹلوں اور تقریب گاہوں سے روزانہ تقریباً ۵۵۰۰ میٹرک ٹن ٹھوس کچرا نکلتا ہے۔ یہاں کے اسپتالوں سے مزید ۶۰ ٹن غلاظت خارج ہوتی ہے۔

اگرچہ ہمارے ارد گرد ہر جگہ کوڑے کے ڈھیر ہیں لیکن کچھ کوڑے کے ڈھیر زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اسپتالوں سے خارج ہونے والی غلاظت کا تعلق زیادہ تر بھرتی رہنے والے مریضوں سے ہے۔ ایسا ہر مریض روزانہ ڈیڑھ کلو فضلے کا سبب بنتا ہے۔ اسپتال سے جو غلاظت خارج ہوتی ہے ان میں سے تقریباً ۱۴ فی صد حصہ طبی۔ حیاتیاتی فضلہ ہے اور یہ فضلہ مضر ہوتا ہے کیوں کہ یہ بیماری پھیلانے والے جراثیم سے آلودہ ہوتا ہے۔ انسانی فضلے کے علاوہ خون، پیپ یا دیگر مواد والی پٹیاں، بے کار ہو جانے والے طبی ساز و سامان، گندی روئی، پلاسٹر اور آپریشن یا طبی جانچ کے بعد خارج ہونے والی گندگی صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہو سکتی ہے کیوں کہ بیکٹریا، وائرس اور دیگر جراثیم ایسی گندگیوں میں زیادہ تیزی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جتنی دیر میں اس طرح کی غلاظتوں کو جلا کر یا کسی اور طرح سے ٹھکانے لگایا جاتا ہے اتنی دیر میں مختلف اقسام کے متعدی جراثیم تیزی سے آس پاس پھیل جاتے ہیں۔ آپریشن اور جانچ کے نتیجے میں خارج ہونے والی غلاظتوں کو اگر بے اثر نہ کیا جائے تو وہ زیادہ بیماری پھیلانے کا سبب ہو سکتی ہیں۔

اسپتالوں سے نکلنے والی غلاظتوں کو مناسب طرح سے ٹھکانے لگانے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریاں تو بے شمار ہیں مگر ان میں سے زیادہ تر بیماریاں مہلک ہوتی ہیں مثلاً ایڈز، تپ دق، دمہ، ہیضہ اور جگر کی خرابی۔

> اسپتالوں سے نکلنے والی غلاظتوں کو مناسب طرح سے ٹھکانے لگانے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریاں تو بے شمار ہیں مگر ان میں سے زیادہ تر بیماریاں مہلک ہوتی ہیں مثلاً ایڈز، تپ دق، دمہ، ہیضہ اور جگر کی خرابی۔

دہلی میں ۲۷ بڑے اسپتال ہیں، سیکڑوں نرسنگ ہوم رہائشی علاقوں میں کھلے ہوئے ہیں ان کے علاوہ مرکزی سرکار کے طبی مراکز، چھوٹے موٹے شفاخانے اور جانوروں کے اسپتال ہیں۔ روزانہ لاکھوں لوگ شفا و صحت کے لیے ان اسپتالوں اور شفاخانوں میں جاتے ہیں۔ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بھی۔ پھنسیوں کا علاج کروانے والے بھی ہوتے ہیں اور کسی حادثے میں زخمی ہونے والے بھی، لیکن شاید ان میں سے کوئی نہیں جانتا کہ جو سوئی اس کو لگائی جا رہی ہے وہ اسپتال کے پچھواڑے پھینکے گئے کوڑے سے نکال کر لائی ہوئی ہو سکتی ہے یا جو پانی اس

کی شکل میں چڑھایا جا رہا ہے وہ کچرے سے نکالی گئی بوتل ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں، پرائیویٹ طور پر شفاخانے چلانے والے ڈاکٹر کسی گھر یا فلیٹ کے کسی حصے میں ہی آپریشن کرتے ہیں اور اس سے جو غلاظت نکلتی ہے اسے مناسب طرح سے ٹھکانے لگانے کی بجائے میونسپلٹی کے کوڑا ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ حتی کہ وہ تمام نام نہاد بڑے اسپتال، جو مریضوں کو مقابلتاً بہتر سہولیات فراہم کرتے ہیں، غلاظتوں کو ٹھکانے لگانے کے معاملے میں لاپروا ہیں۔ زیادہ تر ڈسپنسریوں والے غلاظتوں مثلاً گندی پٹیوں اور پلاسٹر کو اپنی دیوار کے پیچھے ڈال دیتے ہیں۔ تقریباً سبھی ڈاکٹر جو چھوٹے چھوٹے شفاخانے چلاتے ہیں، استعمال کے بعد سوئی کو یا تو کوڑے میں ڈال دیتے ہیں یا دوکان کے باہر ہی پھینک دیتے ہیں۔ ہزاروں میں شاید ایک ہی پرائیویٹ اسپتال ایسا ملے گا جو وزارت صحت کے بتائے گئے اصولوں پر پوری طرح عمل کرتا ہو۔

ہندوستان میں اسپتال سے نکلنے والی غلاظتوں کے مسئلے کے تین خطرناک پہلو ہیں۔ انسانی فضلے مثلاً خون، مواد، یا تجربہ گاہ میں جانچ کیے گئے پیشاب پاخانہ تھوک وغیرہ، جو متعدی جراثیم سے آلودہ ہوتے ہیں انھیں یوں ہی بہا دیا جاتا ہے۔ زیادہ تر اسپتالوں میں اس طرح کے انسانی فضلے کو ایک خاص درجۂ حرارت تک گرم کر کے بے ضرر نہیں بنایا جاتا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ایک بار کے استعمال کے بعد پھینک دینے والے زیادہ تر سازوسامان مثلاً سرنج، مریض کے بدن سے پیشاب وغیرہ نکالنے والی نلکیاں، آئی وی بوتلیں، خون کی تھیلیاں دوبارہ صاف کر کے یا کئی بار بغیر صاف کیے بار بار استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ گندی روئی اور پٹیوں کو دریاں اور بچھونے بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اسپتال سے نکلنے والے زیادہ تر کچرے میں سے کباڑیے اس طرح کی دوبارہ استعمال میں آجانے والی چیزیں نکال کر بیچ دیتے ہیں۔ پلاسٹک کی ۹۰ فی صد اشیاء ضائع نہیں کی جاتیں بلکہ انھیں بار بار استعمال کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح یہاں ڈائی آکسین یا فیوران کا مسئلہ اتنا بڑا نہیں ہے جتنا اسپتالوں سے نکلنے والے کچرے کے بار بار استعمال میں پھیلنے والی مہلک بیماریوں کا ہے۔

موثر تدبیریں

آئیے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ موجودہ صورتِ حال میں اسپتال کی غلاظت کو بہتر ڈھنگ سے کس طرح ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔

زیادہ تر اچھے اسپتالوں کے پاس غلاظت کو آگ میں گلانے کا انتظام ہے۔ ایسے اسپتالوں میں صرف جدید کاری کی ضرورت ہے۔ یہ اس مسئلے کا سب سے سستا اور بہتر حل ہے۔ چھوٹے نرسنگ ہوموں اور ڈسپنسریوں کے لیے غیر آباد جگہوں پر فضلہ جلانے والے آتشدان (انسی نیریٹر) نصب کیے جا سکتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت فرسودہ تکنالوجی استعمال کرنے اور شہر کے اندر فضلے جلانے والے آتشدان لگانے کی اجازت نہ دے۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ کتنا فضلہ جلانے کی ضرورت ہے اور پھر اس کے حساب سے انسی نیریٹر لگائے جائیں۔ اسپتالوں سے جو فضلہ نکلتا ہے اس کا تقریباً ۲۵ فی صد حصہ جلانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً دہلی کے اسپتالوں سے نکلنے والے فضلے میں سے دو تا تین ہزار کلو فضلہ روز جلانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ۲۰۰ کلوگرام صلاحیت والے دس پندرہ انسی نیریٹر کافی ہوں گے۔

اب اسپتالوں میں ایک بار استعمال کے بعد پھینک دینے والے سازوسامان زیادہ استعمال کیے جا رہے ہیں جس سے علاج کئی گنا مہنگا ہو گیا ہے۔ اگر اسپتال پلاسٹک سے بنی ہوئی چیزیں استعمال کرنا ترک کر کے شیشے کی چیزیں استعمال کریں تو اس سے نہ صرف یہ کہ استعمال شدہ چیزوں کو دوبارہ استعمال میں آنے سے روکا جا سکے گا بلکہ علاج کا خرچ بھی کم ہو جائے گا۔ اس کے لیے تمام اسپتالوں کے پاس سازوسامان کو بھاپ کے ذریعہ جراثیم سے پاک کرنے کی سہولیات کا ہونا ضروری ہے۔ یہ سسٹم فی الحال شاید کسی کے پاس نہیں ہے۔ جو اسپتال، اس کے بعد بھی ایک بار کے استعمال کے بعد پھینک دینے والی چیزیں استعمال کرنا چاہیں وہ یہ ذمہ داری لیں کہ ایسی چیزیں دوبارہ استعمال میں نہ آئیں۔

> ہمارے شہروں اور قصبوں میں جس طرح جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر نظر آتے ہیں اس سے کم از کم یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ ان کا صحیح انتظام نہیں ہے۔ کوڑا کباڑ اب مصیبت بنتا جا رہا ہے۔ انتظامیہ کے بنائے گئے کوڑا گھر ناکافی ہو رہے ہیں۔

مجوزہ اقدامات

۱۔ چھوٹے اسپتالوں کے عملے کو حیاتیاتی طبی فضلے کو ٹھیک طرح سے ٹھکانے نہ لگانے کے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے تربیتی پروگرام بنائے جائیں۔

۲۔ اسپتالوں میں فضلہ جمع کرنے کے انتظام کو سخت کیا جائے۔

۳۔ جہاں انسی نیریٹر ہیں وہاں اس سسٹم کو اور بہتر بنا کر دو تین مرحلے میں کام کرنے والے نیریٹر لگائے جائیں۔

۴۔ تمام اسپتالوں میں فضلہ ٹھکانے لگانے کے کام پر نظر رکھنے کے لیے نگرانی کا شعبہ قائم کیا جائے جو یہ دیکھے کہ

مختلف طرح کے فضلے الگ الگ رکھے گئے اور انھیں الگ الگ ٹھکانے لگایا گیا۔ جو غلاظت جراثیم آلودہ ہو اسے اسی وارڈ / شعبے میں جراثیم سے پاک کیا گیا۔ صرف جراثیم سے آلودہ فضلے کو ہی جلایا گیا اور جلانے کے دوران صحیح اینڈ صحیح درجہ حرارت اور وقت کا خیال رکھا گیا۔

۵۔ انسی نیریٹر میں صرف وہی پیٹرو کیمیکل بطور ایندھن استعمال کی جائے جو ۹۰۰ تا ۱۲۰۰ ڈگری سیلسیس پر جلتی ہوں۔

۶۔ پلاسٹک سے بنے ہوئے طبی ساز و سامان مثلاً بوتل، خون کی تھیلی اور سرنج وغیرہ کی جگہ شیشے سے بنی ہوئی مصنوعات استعمال کی جائیں۔

۷۔ تمام اسپتالوں میں آٹو کلیونگ (یعنی بھاپ کے دباؤ سے جراثیم کو ہلاک کرنے) کی سہولت دستیاب ہو۔

۸۔ جراثیم آلودہ پٹیوں کو جراثیم سے پاک کر کے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تاکہ دوبارہ استعمال میں نہ آسکیں۔

۹۔ ان نرسنگ ہوموں کو سخت سزا دی جائے جو اپنا فضلہ میونسپلٹی کے کوڑا گھر میں ڈلواتے ہیں۔

۱۰۔ آلودگی کی روک تھام سے متعلق مرکزی بورڈ مختلف اسپتالوں کے انسی نیریٹروں سے نکلنے والے دھوئیں اور راکھ کی جانچ کرے اور

۱۱۔ طبی، نرسنگ اور انتظامی عملے کے لیے فضلے کو ٹھکانے لگانے کا ایک مربوط کورس شروع کیا جائے۔

آئیے اب اس کچرے کی بات کریں جو رہائشی مکانوں سے نکلتا ہے۔

ہمارے شہروں اور قصبوں میں جس طرح جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر نظر آتے ہیں اس سے کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی ہے کہ ان کا صحیح انتظام نہیں ہے۔ کوڑا کباڑ اب مصیبت بنتا جا رہا ہے۔ انتظامیہ کے بنائے گئے کوڑا گھر ناکافی ہو رہے ہیں۔ نتیجے میں سڑک کے کنارے، گلیاروں اور پارک تک میں لوگ کوڑا پھینک دیتے ہیں۔ اس طرح کے کوڑے سے زمین کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ہندوستان کی زمینوں کا تقریباً ۸ فی صد حصہ بنجر ہو گیا ہے کیوں کہ کوڑا ڈالنے سے زمین اپنی زرخیزی کھو دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس طرح کے کوڑے کے ڈھیر میں طاعون، ہیضہ، تپ دق، پیلیا اور جلد کی مختلف بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم پنپتے ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر کا اگر صحیح انتظام نہ کیا جائے تو اس سے دیگر پریشانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً نالیاں جام ہو جاتی ہیں یا بدبو پھیل جاتی ہے جس میں زہریلے مادے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی آب و ہوا میں اگر کوڑے کو آٹھ سے بارہ گھنٹے تک یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو اتنے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ آدمی کی صحت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ گڑھوں یا نشیبی زمینوں کو غیر سائنسی طریقے پر کوڑے کچرے سے بھر دینے

دہلی میں ٹھوس کوڑے کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری زیادہ تر میونسپل کارپوریشن آف دہلی، ایم سی ڈی کی ہے۔ ایم سی ڈی نے کالونیوں میں جھاڑو لگانے، کچرا اٹھانے اور کوڑے کو سات مختلف جگہوں پر ٹھکانے لگانے کے لیے تقریباً تین ہزار ملازمین کو کام پر رکھا ہوا ہے۔ ان ملازمین کی تنخواہوں اور کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے لے جانے پر ہر مہینے لاکھوں خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن لاکھوں روپے جس مد پر خرچ کیے جاتے ہیں وہ نہ سائنٹفک ہے، نہ ماحول دوست اور نہ عوام کے حق میں مفید۔ اس طریقے سے کوڑا اٹھوانے یا صاف کروانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایم سی ڈی کا سب سے زیادہ خرچ کوڑے کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانے پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوڑے کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ ڈال دینے کا مطلب کوڑے کو ٹھکانے لگا دینا ہرگز نہیں ہے۔

صفائی دستے کی مہم "واتاورن" نے کوڑے کو ٹھکانے لگانے کی اپنی مہم کو توسیع دے کر اسکولوں، کالجوں، ہوٹلوں، ہوسٹلوں، فوج کے میسوں اور چھاؤنی تک پہنچا دیا ہے۔ ان جگہوں کے لیے "واتاورن" نے کیڑوں مکوڑوں یا مائکروب یعنی جراثیم کے ذریعہ کمپوسٹنگ کو ترجیح دی ہے۔

سے میتھین نامی زہریلی گیس پیدا ہوتی ہے جو صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔

مثال کے طور پر دہلی کو لیجیے۔ دہلی کا زمینی رقبہ گھروں سے نکلنے والے کوڑے کچرے کی وجہ سے سمٹ رہا ہے۔ کچرے کو جہاں تہاں ڈال دینے کے رجحان کے نتیجے میں بہت سی زمینیں بنجر ہو رہی ہیں جب کہ یہاں زمین یوں ہی کم ہے۔ اس لاپروائی سے ماحولیاتی نقصانات تو ہوتے ہی ہیں، زمین کی زرخیزی پر بھی اس کے نقصان دہ اثرات پڑ رہے ہیں۔ دہلی میں تقریباً ۸ ہزار کھلے کوڑا گھر ہیں جن میں کوڑے کا ڈھیر روز بڑھ رہا ہے۔ اندازہ کے مطابق دہلی کی ۵ فی صد زمین کوڑے کی وجہ سے بنجر ہو چکی ہے۔

صفائی دستہ

آئیے اب اس کا موازنہ ایک ایسی اسکیم سے کریں جو کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے دیسی طریقے سے چلائی جا رہی ہے۔ یہ سائنٹفک بھی ہے، ماحول دوست بھی ہے اور عوام کے لیے بھی مفید ہے۔ اس اسکیم کو ایک غیر سرکاری تنظیم "واتاورن" کے ایک صفائی دستے کی مدد سے چلایا جا رہا ہے۔ پہلا صفائی دستہ ساڑھے تین سال پہلے کام میں لگایا گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس میں اضافہ ہوا ہے۔ حال ہی میں اس دستے نے وسنت کنج کے کئی سیکٹروں اور نوئیڈا میں اپنی مہم شروع کر دی ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کیمپس، جس میں

ساڑھے نو سو رہائش گاہیں، آٹھ ہاسٹل، مہمان خانے، متعدد انتظامی اور تعلیمی شعبے، بازار، صحت مراکز، ڈھابے، کینٹین اور جانوروں کے باڑے ہیں۔ یہاں سے نکلنے والے تمام کوڑے کو صاف کرنے اور ٹھکانے لگانے کا کام بھی صفائی دستہ کر رہا ہے۔

اسکیم کا طریقہ کار بہت سادہ ہے جب کسی علاقے کے لوگ اپنے اردگرد کوڑے کے بے ہنگم ڈھیر سے پریشان ہو جاتے ہیں اور سرکاری محکمے ان کی شکایات پر کان نہیں دھرتے تو وہ واتاورن سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اس تنظیم کے ماہرین اس جگہ پہنچ کر کوڑے کے ڈھیر اور اس کی قسم کا معائنہ کر کے یہ طے کر دیتے ہیں کہ اس پر کتنا خرچ آئے گا اور اس کے لیے فی مکان کتنے روپے ماہانہ ادا کرنے پڑیں گے۔ عام طور سے یہ خرچ ماہانہ ۳۰ سے ۳۵ روپے کا پڑتا ہے۔ کوڑے کے ڈھیر کو کمپوسٹ یعنی گھورا یا کھاد میں تبدیل کرنے کے لیے علاقے میں ہی کوئی بے کار پڑی ہوئی جگہ چن لی جاتی ہے۔ کباڑا اٹھانے والے اور بے روزگار نوجوانوں کو مہم میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ انھیں منظم طریقے سے کوڑا اٹھانے، الگ الگ کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان کے لیے وردی، دستانے اور ٹوپیاں اور کوڑا ڈھونے کے لیے ٹھیلے خرید لیے جاتے ہیں۔

لوگوں کو کوڑے کے تئیں زیادہ ذمہ دار بنانے کے لیے میٹنگیں کی جاتی ہیں۔ انھیں اس بات کی ہی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ کوڑا کس طرح پھینکیں۔ گھروں میں کوڑے کے دو ڈبے استعمال کرنے کو کہا جاتا ہے تاکہ کوڑا شروع میں ہی الگ الگ ہو جائے۔ انھیں کہا جاتا ہے کہ وہ صفائی دستے کے کارکنوں کو اپنا سمجھیں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ ایک ماہ کی تیاری کے بعد اسکیم شروع ہو جاتی ہے۔

کچرے میں سے ایسی چیزیں جو خراب ہو جاتی ہیں انھیں کمپوسٹ کر دیا جاتا ہے اور چیزیں دوبارہ کام میں لائی جا سکتی ہیں، انھیں بیچ دیا جاتا ہے۔ اس سے جو پیسے آتے ہیں اور علاقے کے لوگوں سے جو ماہانہ رقم وصول کی جاتی ہے اس سے کارکنوں کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ ہر صفائی دستے میں ایک سپروائزر، ایک ڈپٹی سپروائزر اور کئی اور کارکن ہوتے ہیں۔

چوں کہ اس اسکیم کا زیادہ تر کام افراد انجام دیتے ہیں اس لیے جہاں ایک طرف روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، وہیں اس کے لیے کوئی بھاری ساز و سامان یا کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے کسی خالی نشیبی زمین کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اس اسکیم میں سرمایہ کچھ نہیں لگتا۔ تھوڑی بہت آمدنی ضرور ہو جاتی ہے۔ صفائی دستے کو لگاتار سیکھ دی جاتی ہے۔ وہ کام کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور کسی بھی کالونی میں اسکیم شروع ہونے کے ۱۵ دن کے اندر اپنی شاندار کارکردگی کا نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔

پیتم پورہ میں واقع پری جات اپارٹمنٹس میں "واتاورن" نے وہاں کی بھنگنوں کو ہی صفائی دستے میں بھرتی کر لیا۔ یہ عورتیں وہاں برسوں سے کوڑا اٹھانے کا کام کرتی تھیں لیکن وہ کوڑے کو کالونی کے ایک کونے میں پھینک آتی تھیں۔ اب تربیت کے بعد اور صفائی دستے کے لڑکوں کی مدد سے وہ کوڑے کو کمپوسٹ کر دیتی ہیں۔

کوڑے کو ایروبک اور اینے روبک یا کیڑوں اور مائکروبس کے ذریعہ کمپوسٹ کیا جا سکتا ہے۔ رہائشی کالونیوں کے لیے اینے روبک کمپوسٹ کا طریقہ اپنایا گیا۔ اس کے اسباب کئی ہیں۔ اول یہ کہ اس میں کوئی خاص خرچہ نہیں آتا، دوسرا یہ کہ کوڑے کا ڈھیر نہیں لگتا اور نہ ہی بدبو ہوتی ہے۔ تیسرا یہ کہ ہر طرح کے کچرے کو کمپوسٹ کیا جا سکتا ہے اور چوتھا کہ دہلی کی زیادہ تر کالونیوں میں پانی کی قلت ہے اور اس طریقے کی کمپوسٹنگ میں پانی کی ضرورت نہیں پڑتی۔

صفائی دستے کی مہم کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں کوڑا زمین کو نہیں چھوتا۔ گھر کے لوگ اپنا کوڑا کباڑ، کارکن کے حوالے کرتے ہیں یہاں سے یہ رکشے میں ڈال کر چھانٹ لیا جاتا ہے اس کے بعد خراب ہو جانے والے چیزوں کو سیدھے کمپوسٹ کرنے والی جگہ پر لے جا کر ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔

اس آسان طریقے کو ۲۰ کالونیوں میں ۲۰ بار آزما لینے کے بعد واتاورن نے کوڑے کو ٹھکانے لگانے کی اپنی مہم کو توسیع دے کر اسکولوں، کالجوں، ہوٹلوں، ہاسٹلوں، فوج کے میس اور چھاؤنی تک پہنچا دیا ہے۔ ان جگہوں کے لیے واتاورن نے کیڑوں مکوڑوں یا مائکروب یعنی جراثیم کے ذریعہ کمپوسٹنگ کو ترجیح دی۔

وسنت ویلی میں واقع فادر ایگنس اور بلو بیل نامی اسکولوں میں کیڑوں مکوڑوں کے ذریعہ کمپوسٹنگ کا طریقہ بہت مقبول ہوا۔ واتاورن کے کارکن کیڑے مکوڑوں کی اہمیت سے طلبا کو آگاہ بھی کرتے ہیں۔ طلبا اپنی بایولوجی کی کلاس میں کمپوسٹ کرنے کا طریقہ سیکھتے ہیں اور کیمسٹری کی کلاس میں کمپوسٹ کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لیڈی سری رام کالج میں کینٹین کے کوڑے کو مائکروبس کے ذریعہ کمپوسٹ کیا جاتا ہے کیوں کہ اس کوڑے میں انڈا گوشت مچھلی وغیرہ کا بچا کھچا زیادہ ہوتا ہے۔

حال ہی میں فوج نے بھی واتاورن کی خدمات حاصل کی ہیں۔ فوج کے جوان اپنے میس میں ہی کیڑے مکوڑے پال رہے ہیں اور فوجی افسروں کی بیویاں اپنے رہائشی علاقوں میں اس کی مدد سے صفائی دستہ بنانے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ کنٹونمنٹ بورڈ جو چھاؤنی علاقے کا کوڑا اٹھواتا ہے، برسوں سے کوڑے کو اٹھوا کر نکولسن رینج کی طرف پھینکوا دیتا تھا جہاں یہ جمع ہو ہو کر بعد میں سڑ جاتے تھے۔ واتاورن نے فوج کے پاس موجود بلڈوزروں کی مدد سے اس جگہ کے سارے کوڑے کو اٹھوایا۔ مائکروبس کی مدد سے ۸۰۰ ٹن کوڑے کو کمپوسٹ کر کے ۵۰۰ ٹن کھاد یا گھورا بنایا گیا۔ پلاسٹک کی اشیا کو الگ کرنے کا کام جوانوں نے کیا۔ اس طویل مہم کے دوران جوانوں نے بڑی محنت کی اور افسروں نے انھیں بھرپور تعاون دیا۔ کسی بھاری مشین کی ضرورت نہیں پڑی۔

باقی صفحہ ۲۳ پر

کرشن مہاجن

ماحولیاتی قوانین کا نفاذ۔ کچھ مسائل

مصنف کا کہنا ہے کہ ماحولیات سے متعلق قوانین کی کوئی کمی نہیں ہے۔ عدالت عالیہ نے بھی کہا ہے کہ پائیدار اور مسلسل ترقی کا معاملہ ہر حکومت کی ایک قانونی ذمہ داری ہے۔ ماحولیات کے بڑھتے ہوئے معاملات اور ان معاملات سے تیزی کے ساتھ نمٹنے میں مشینری کی کمی کے پیش نظر، نفاذ کا معاملہ بظاہر بہت مشکل نظر آرہا ہے۔

ہندوستان کے آئین میں ۱۹۵۰ء میں ماحولیاتی تحفظ کے بارے میں خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے آئین کے نافذ ہونے کے ۲۶ سال بعد، پارلیمنٹ نے ۱۹۷۶ء میں ۴۲ویں ترمیم کرکے ماحولیات کو فروغ دینا اور اس کا تحفظ کرنا مرکز میں اور ریاستوں میں ہر ایک حکومت کا بنیادی فرض قرار دے دیا تھا۔ دفعہ ۴۸۔اے کو اُن ہدایتی اصولوں میں شامل کیا گیا تھا، جنھیں آئین میں ملک کا انتظام چلانے کے سلسلے میں بنیادی قرار دیا گیا ہے۔ مذکورہ دفعہ کے مطابق، مملکت ماحولیات کا تحفظ کرنے اور اسے بہتر بنانے نیز ملک کے جنگلات اور جنگلی جانوروں کا تحفظ کرنے کی کوشش کرے گی۔ اسی ترمیم کے ذریعہ آئین کی دفعہ ۵۱۔اے (جی) کے تحت ہر ایک شہری کا یہ ایک بنیادی فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ جنگلات، جھیلوں، دریاؤں اور جنگلی جانوروں سمیت قدرتی ماحول کا تحفظ کرے اور اسے بہتر بنائے نیز تمام مخلوق کے تئیں ہمدردی اور رحم کا جذبہ رکھے۔ لیکن صرف ۱۹۸۰ء میں پہلا ماحولیاتی مقدمہ سپریم کورٹ میں آیا یعنی رتلام میونسپلٹی بنام وردھی چند جین۔ اس کے بعد جب اقتصادی ترقی اور ماحولیات کا مسئلہ بڑھا تو عدالت عالیہ میں دریاؤں، زیر زمین پانی اور فضائی آلودگی نیز جنگلات کی اندھا دھند کٹائی و پامالی سے متعلق مقدمات کا سیلاب سا آگیا۔ آج سپریم کورٹ نے، جس کے فیصلوں کے سبھی لوگ آئین کے تحت پابند ہیں، اصول وضع کر دیے ہیں۔ مسئلہ اب قانونی اصول موجود نہ ہونے کا نہیں ہے، بلکہ ان پر عمل درآمد کا ہے۔

ہمارے آئین کے نافذ ہونے کے ۲۶ سال بعد، پارلیمنٹ نے ۱۹۷۶ء میں ۴۲ویں ترمیم کرکے ماحولیات کو فروغ دینا اور اس کا تحفظ کرنا مرکز میں اور ریاستوں میں ہر ایک حکومت کا بنیادی فرض قرار دے دیا تھا۔

سپریم کورٹ میں رتلام میونسپلٹی کے پہلے مقدمے سے ایک ایسے ہندوستان کی حقیقت آشکار ہوئی، جو شہروں کی شکل میں ترقی کر رہا ہے جہاں میونسپلٹیاں اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں کے لیے بنیادی شہری سہولیات یا تو مہیا نہیں کرنا چاہتی ہیں یا پھر وہ یہ سہولیات فراہم نہیں کر سکتیں۔ کھلے گندے نالے اور نالیوں، شراب کے ایک کارخانے سے گندگی کے کھلے اخراج اور قریبی گندی بستیوں میں رہنے والے لوگوں کے کھلے میں حاجت رفع کرنے سے پیدا ہونے والی بدبو سے سخت پریشان رتلام میونسپلٹی کے باشندوں نے میونسپلٹی سے کہا تھا کہ وہ یہ سب روکنے کے لیے میونسپلٹی قانون کے تحت اپنا قانونی فرض انجام دے۔ جب ادھر سے کوئی کامیابی نہیں ملی تو وہاں کے باشندوں نے اس سب کی روک تھام کرنے کے لیے ضابطہ فوجداری کے تحت مقامی مجسٹریٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجسٹریٹ

نے میونسپلٹی کو ہدایت کی کہ تعفن تکلیف کے باعث ہر کو ختم کرنے کے لیے چھ ماہ کے اندر ایک منصوبے کا مسودہ تیار کرے۔ سیشن کورٹ نے اس حکم کے خلاف فیصلہ دیا اور ہائی کورٹ نے سیشن کورٹ کے خلاف فیصلہ سنایا۔ آخر میں میونسپلٹی نے سپریم کورٹ میں اپیل کی۔

سپریم کورٹ نے تین اصول وضع کیے تھے۔ ایک یہ کہ ہندوستان میں کسی بھی میونسپلٹی کے لیے اس بنا پر پیسے کی کمی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے باشندوں کی صحت اور حفاظت کے سلسلے میں اپنا بنیادی فرض انجام نہیں دے رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ عوامی سہولیات کی عدم موجودگی نیز آلودگی پیدا کرنے والی ایسی صنعتوں کی روک تھام نہ کرنا، جن سے شہریوں کی صحت متاثر ہونا لازمی ہے، عزت اور صفائی ستھرائی سے رہنے کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کرنے کے مترادف ہیں، جو کہ ایک میونسپلٹی پر ناقابل گفت و شنید یا ناقابل سمجھوتہ اولین الزامات ہیں اور تیسرا یہ کہ ان افسران اور عملے کو جو کہ پریشانی دور نہ کر کے ان فرائض کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ضابطہ تعزیرات ہند کے تحت جیل کی سزا یا جرمانہ، یا دونوں ہو سکتے ہیں۔ ایک واضح فیصلے میں عدالت عالیہ نے کہا کہ انچارج افسران کو اور یہاں تک کہ منتخب نمائندوں کو بھی قانون کے تحت سزا بھگتنی ہوگی، اگر وہ آئین اور اس کے بعد کے قوانین کے تحت اپنے فرائض انجام نہیں دیتے ہیں۔ خلاف ورزی کا بھگتان سزا ہے۔ لیکن اس فیصلے میں ۱۹۷۷ء میں آئین میں کی گئی ترمیم کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے، جو کہ دفعہ ۴۸۔ اے اور ۵۱۔ اے (جی) میں شامل کی گئی ہے۔

۱۹۹۵ء میں عدالت عالیہ نے ویریندر گوڑ بنام ریاست ہریانہ کے مقدمے میں کہا تھا کہ صفائی ستھرائی اور صحت کے لیے مفید ماحول ہونا شہریوں کا بنیادی حق ہے نیز میونسپلٹیوں کا ایک آئینی فرض ہے۔ عدالت نے کہا تھا کہ لفظ ماحولیات ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں صحت کے لیے مفید ماحول اور معیشت حیوانات کا توازن دونوں آتے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ نے پانی میں آلودگی کی روک تھام اور اس پر قابو پانے سے متعلق قانون منظور کیا تھا۔ مفاد عامہ کے ایک مقدمے کی شکل میں اس قانون کے تحت پہلے مقدمے کا فیصلہ ۱۹۹۱ء میں سپریم کورٹ نے کیا تھا۔ سبھاش کمار بنام ریاست بہار مقدمے کا تعلق بوکارو دریا میں کوئلے کی گندگی بہانے سے تھا۔ عدالت عالیہ نے ماحولیات کو آئین کی دفعہ ۲۱ میں زندگی کے بنیادی حقوق میں شامل ایک بنیادی حق قرار دے کر ماحولیات کو سب سے زیادہ ممکنہ قانونی اہمیت دی تھی۔ اس طرح صاف ہوا اور پانی کے لیے شہریوں کے حق کو حکمراں سیاست دانوں کے عام ترمیمی اختیار سے بالاتر رکھا گیا تھا۔ ماحولیاتی امور کے سلسلے میں مفاد عامہ کے مقدمے کے ممکنہ غلط استعمال کے متعلق ایک تنبیہ میں عدالت نے کہا تھا: "جینے کا حق آئین کی دفعہ ۲۱ کے تحت ایک بنیادی حق ہے اور اس میں زندگی کے بھرپور لطف کے لیے آلودگی سے پاک پانی اور ہوا سے مستفید ہونے کا حق شامل ہے۔ اگر کسی بات سے یا چیز سے زندگی کے معیار میں کمی آتی ہے یا اسے خطرہ لاحق ہوتا ہے تو ایک شہری کو یہ حق ہے کہ وہ پانی یا ہوا کی ایسی آلودگی کو ختم کرانے کے سلسلے میں دفعہ ۳۲ کا سہارا لے جو کہ زندگی کے معیار اور کوالٹی میں خرابی کا باعث ہو سکتی ہے۔ متاثر افراد کی طرف سے نیز سماجی کارکنوں یا صحافیوں کے ایک گروپ کی طرف سے بھی آلودگی کی روک تھام کے سلسلے میں دفعہ ۳۲ کے تحت درخواست قابل سماعت ہے۔ لیکن آئین کی دفعہ ۳۲ کے تحت کارروائیوں کی پیروی ایک ایسے شخص کو کرنی چاہیے، جو کمیونٹی کی جانب سے سماج کے تحفظ کے سلسلے میں مخلصانہ دلچسپی رکھتا ہو۔" ۱۹۹۳ء میں سپریم کورٹ نے اس نئے بنیادی حق کو مستحکم بنا دیا۔ یہ کام اس نے نیلابتی بہیرا بنام ریاست اڑیسہ مقدمے میں یہ فیصلہ دے کر کیا کہ کسی بنیادی حق کی خلاف ورزی کے سلسلے میں مالی معاوضہ دینے سے متعلق بنیادی حق موجود ہے۔ معاوضہ کا یہ حق نقصانات کے سلسلے میں طویل دیوانی مقدموں کی دیگر قانونی تلافیوں سے امتیازی اور جداگانہ ہے۔

> ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ نے پانی میں آلودگی کی روک تھام اور اس پر قابو پانے سے متعلق قانون منظور کیا تھا۔ عدالت عالیہ نے ماحولیات کو آئین کی دفعہ ۲۱ میں زندگی کے بنیادی حقوق میں شامل ایک بنیادی حق قرار دے کر ماحولیات کو سب سے زیادہ ممکنہ قانونی اہمیت دی تھی۔

زبردست لہر

مفاد عامہ کے مقدمے کے ذریعے

معاوضے کا بنیادی حق قائم ہونے کے بعد ۱۹۹۵۔۹۷ء سے فیصلوں کی ایک زبردست لہر سی آ گئی۔ ہماچل پردیش کے کتھا جنگلات سے متعلق گنیش ووڈ پروڈکٹس مقدمے میں عدالت عالیہ نے مسلسل اور پائیدار ترقی کو ہر حکومت کی ایک قانونی ذمہ داری قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمراں سیاست دانوں اور منتظمین کو قدرتی وسائل پر مبنی کسی بھی صنعت کے لیے اجازت دینے سے پہلے، وسائل کی بنیاد پر اس صنعت کے اثرات کا پیشگی جائزہ لینا ہوگا۔ اثرات سے متعلق جائزہ کا تعلق نہ صرف موجودہ ضروریات سے بلکہ بین نسلی مفادات کے اصول پر مستقبل کی ضروریات سے بھی ہونا چاہیے۔ موجودہ نسل آئندہ نسلوں کے لیے کچھ نہ

چھوڑتے ہوئے تمام وسائل ختم نہیں کرسکتی۔ اس مقصد کے لیے عدالت نے واضح کیا کہ پبلک یا سرکاری جنگلات اور نجی جنگلات میں کوئی فرق نہیں ہے، کیوں کہ مجموعی طور سے جنگلات ملک کی دولت ہیں۔

چار بنیادی اصول وضع کرنے کے بعد عدالت عالیہ نے ماحولیاتی قانونی کارروائی سے متعلق ہندوستانی کونسل (ایچ ایسڈ) ویلوریٹی زن فورم (چمڑا رنگنے کے کارخانے) اور ایس۔جگن ناتھن (آبی پیداوار) کے مقدمات کی شنوائی کرتے ہوئے مزید تین بنیادی اصول مقرر کیے۔ ایک یہ کہ آلودگی پیدا کرنے والے کو ادائیگی کرنی ہے۔ دوسرا یہ کہ احتیاطی اصول، یعنی یہ تمام حکام کا فرضِ منصبی ہے کہ وہ آلودگی کی روک تھام کریں اور عوام کے لیے مضرِ صحت چیزوں کو ختم کریں۔ تیسرا یہ کہ ماحولیات کو برقرار اور بحال رکھنے کا اصول۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آلودگی پیدا کرنے والے یا پھیلانے والے کو نہ صرف کیے گئے نقصان کا بھگتان کرنا ہوگا بلکہ کسی علاقے میں اس کی تباہ کردہ ماحولیات کی بحالی کے لیے بھی ادائیگی کرنا ہوگا۔

ان سات اصولوں پر عمل درآمد کے لیے قانونی لڑائی بہت پیچیدہ اور تضادات سے پُر تھی، جیسا کہ شری رام فوڈ اینڈ فرٹیلائزرس کے اولیم گیس رساؤ میں اور اس کے بعد یونین کاربائیڈ کارپوریشن کے مقدمے میں ظاہر ہوا ہے۔ دونوں مقدمات سے صنعتی ترقی کے لیے درکار خطرناک کیمیاوی اشیا اور ان کیمیاوی اشیا سے شہریوں کی صحت اور سلامتی کے لیے پیدا ہونے والے خطرات کے درمیان لڑائی کا اظہار ہوا۔ ان افسوسناک واقعات کے بعد ہی، جن میں یونین کاربائیڈ کی بھوپال فیکٹری دنیا کے سب سے بدترین صنعتی سانحہ کا سبب بنی، پارلیمنٹ نے ماحولیات کے تحفظ کا قانون ۱۹۸۶ء اور پبلک لائبلیٹی انشورنس ایکٹ ۱۹۹۱ء وضع کیا۔ شری رام مقدمے میں کہا گیا کہ نجی منافع کے لیے خطرات سے پُر سرگرمی کے سلسلے میں صرف اسی شرط پر اجازت دی جاسکتی ہے کہ نجی منافع کے لیے پُرخطر سرگرمی انجام دینے والا ادارہ یا صنعت ان سبھی لوگوں کو ہرجانہ ادا کرتی ہے، جو اس طرح کی سرگرمی انجام دینے کی وجہ سے متاثر ہوتے ہیں، خواہ اس سرگرمی کے دوران احتیاط برتی گئی ہے یا لاپروائی۔ لیکن اس کے کچھ ہی عرصے بعد، جب یونین کاربائیڈ کے بھوپال پلانٹ سے میتھائیل آئیسو سائینیٹ گیس خارج ہوئی تو یہ پتا چلا کہ مسئلہ قوانین موجود نہ ہونے کا نہیں تھا، بلکہ ان کے نفاذ کا تھا۔ جب وہ گیس خارج ہوئی تو فیکٹریوں سے متعلق قانون، ضابطۂ فوج داری نیز ہوا میں آلودگی کی روک تھام اور اس پر قابو پانے سے متعلق قانون، ۱۹۸۱ء کے تحت اس قسم کی سرگرمی بااحتیاط انجام دینے کے سلسلے میں متعدد قوانین موجود تھے۔ کاربائیڈ معاملے کے نتیجے میں پارلیمنٹ نے ایک خصوصی قانون وضع کیا، جس کے ذریعے مرکز میں اس وقت کی حکومت نے اس نظریے کی بنا پر کہ مملکت اپنے تمام شہریوں کے کنبے کی سربراہ ہوتی ہے، معاوضے کے دعووں کے سلسلے میں پورا مقدمہ اپنے اختیار میں لے لیا۔ اس نے عدالت عالیہ سے ایک متنازعہ تصفیہ بھی پیش کیا، جس پر بعد میں عدالت کو خود ہی نظرِ ثانی کرکے فوج داری مقدمے بازی سے متعلق اپنی دی ہوئی چھوٹ میں ترمیم کرنی پڑی تھی۔ فوج داری مقدمہ اب بھی چل رہا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ دعووں کے سلسلے میں کمشنروں کی مشینری کی سرگرمیاں بھی چل رہی ہیں۔

گرین بینچیں

سات اصولوں کی موجودگی میں، جو وضع قانون اور نفاذ کے درمیان خاموشی کے زبردست تنازعات میں گھرے ہوئے ہیں، عدالت عالیہ نے دریائے گنگا کی آلودگی، صنعتی آلودگی، دہلی رِج، موٹر گاڑیوں سے پیدا ہونے والی آلودگی، پارکوں کی پامالی، دہلی میں کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنے، ملک بھر میں جنگلات کی تباہی و بربادی اور زہریلی کیمیاوی بے کار اشیا کی برآمدات کے معاملے دیکھے ہیں۔ اصول وضع کرنے اور کچھ کارروائی کی شروعات کو یقینی بنانے کے بعد، ان میں سے بہت سے مقدمے متعلقہ ہائی کورٹوں کو منتقل کردیے گئے ہیں اور ان کے چیف جسٹس صاحبان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ان امور سے تیزی سے نپٹنے کے سلسلے میں گرین بینچیں قائم کریں۔

اپنی ہدایات پر عمل درآمد کے سلسلے میں عدالت نے دو نظریے اختیار کیے ہیں۔ ایک یہ کہ متعلقہ افسران کو سیدھے عدالت میں طلب کیا جائے، ان کو ان کا قانونی فرض بتایا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ کیا انھیں اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں درپیش کسی مسئلے کے لیے کسی طرح کے احکامات کی ضرورت ہے۔ تب عدالت ان کی مدد سے ایک مقررہ مدت مقرر کرے گی، جس کے اندر انھیں وہ کام انجام دینا ہوگا۔ جس معاملے میں عدالت مطمئن نہیں تھی، اس نے عمل درآمد کے کام کی نگرانی کرنے اور اس کی رپورٹ عدالت کو دینے کے لیے اپنے کمشنر ایڈووکیٹوں کو بھیجا ہے۔ بنیادی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کے متعلقہ متعلقہ حقائق جمع کرنے کے سلسلے میں خود اپنے کمشنر مقرر کرنے کے اختیار کا اعلان

> سپریم کورٹ نے اولیم گیس کے اخراج مقدمے میں کہا تھا کہ زندگی، صحت اور ماحولیات کے امور کو بے روزگاری اور مالیے کے نقصان سے متعلق ترجیح حاصل ہے۔ اس کا مطلب ہے مملکت کی پوری اقتصادی سمت میں یکسر تبدیلی۔

الت عالیہ نے ۱۹۸۴ء میں بندھوا مکتی مورچہ
نام یونین آف انڈیا کے مقدمے میں کیا تھا اور
س کی توثیق عدالت کی پانچ ججوں پر مشتمل
یک بنچ نے شری رام فوڈس اینڈ فرٹیلائزرس
ایم ۔ سی ۔ مہتہ بنام یونین آف انڈیا) مقدمے
ں کردی تھی ۔ اگر کارکردگی میں بہت زیادہ
رابی پائی جاتی ہے تو عدالت عمل درآمد کرانے
ے لیے توہین عدالت کے اپنے اختیارات
استعمال کرسکتی ہے ۔ دوسرا نظریہ متعلقہ
فران کے ساتھ روبرو بات چیت کرنے
نہیں ہے، بلکہ عدالت کے مقرر کردہ مشیر
ں فراہم کی ہوئی اطلاعات کی بنیاد پر ہدایات
اری کرنے سے متعلق ہے، جو کہ شہریوں کی
حت اور ماحولیات کے تحفظ کا زیادہ
امیاب طریقہ ہے ؟ اس کے بارے میں ابھی
ک کہیں بھی کوئی سروے نہیں کرایا گیا ہے ۔
درایں اثنا ماحولیاتی طور سے محفوظ ماحول
ائم کرنے کے سلسلے میں حکمراں سیاست دانوں
ے فرائض کے بارے میں عدالت عالیہ کی
ہت سی تجاویز صرف فیصلوں کے صفحات
ں ہی محفوظ ہیں ۔ یہ بات قابلِ افسوس
ہے کہ قانونی امداد کی سرکاری مشنری گندی
ستیوں اور گاؤوں میں رہنے والے ان کے
صوں غریب لوگوں کی قانونی امداد کے
رورت کے تئیں ابھی تک بیدار نہیں ہوئی
ہے ۔

سُست رفتاری

یہ ایک کارِ عظیم ہے ۔ اس بات کو خود
الت عالیہ نے بھی ماحولیات سے متعلق مقدمات
ے دوران محسوس کیا ہے اور اس کو تسلیم کیا ہے ۔
ں نے ان میں سے بہت سے مقدمات مختلف
ئی کورٹوں کی گرین بینچوں کو منتقل کر دیے
ں ۔ لیکن یہ کام انجام دینے کے لیے مجموعی طور
ے مشنری تکلیف دہ حد تک کم ہے ۔ ماحولیاتی
ریبونل عدالتیں ابھی قائم کی جانی ہیں ۔
یزی سے تلافی یا تدارک کا معاملہ، جو ان کے
ور میں راحت کے لیے انتہائی اہم ہے، خواب
یلگتا ہے ۔ پچھلے سالوں میں سپریم کورٹ
ماحولیاتی امور کے بارے میں مکمل طور سے
سماعت کے لیے کام کاج کے ہر ہفتے میں
کم سے کم ایک بار ایک نشست کرتی تھی ۔
اگر ضروری ہوتا تھا تو روزانہ سماعت ہوتی تھی
تاکہ تمام فریقین کو سننے کے بعد ماحولیاتی
نقصان کی حد کے بارے میں تیزی سے
فیصلہ کیا جاسکے ۔ عدالتِ عالیہ افسران اور
عملے کو طلب کرتی تھی اور ان میں مطلوبہ عجلت
کا احساس پیدا کرتی تھی ۔ یہ سب اب باقی
نہیں رہا ہے کیوں کہ عدالتِ عالیہ کو اپنی توجہ
دیگر قانونی معروفیات کی جانب مبذول کرنی
پڑ رہی ہے ۔

قانونی محاذ پر اس سست رفتاری
کی دو نمایاں وجوہ ہیں ۔ موٹر گاڑیوں سے
پیدا ہونے والی آلودگی اور صنعتوں کے
مقدمات کی منتقلی ۔ دہلی سے متعلق موٹر
گاڑیوں سے پیدا ہونے والی آلودگی کے
سلسلے میں مقدمہ ۱۹۸۶ء سے چل رہا ہے ۔ یہ
مقدمہ آج بھی زیر سماعت ہے اور عدالت
ایک کے بعد ایک حکم صادر کر رہی ہے لیکن
کوئی قطعی مستقل حل نہیں نکلا ہے ۔ عدالتِ
عالیہ کو یہ بتانے کے لیے کوئی مشنری موجود
نہیں ہے کہ اس نے جن صنعتوں کو منتقل کرنے
کا حکم دیا تھا، وہ واقعتاً منتقل کردی گئی ہیں
یا نہیں ۔ عدالت عالیہ نے کہا تھا کہ مرکزی
حکومت آلودگی پر قابو پانے سے متعلق مرکزی
بورڈ کے تحت ایک ماحولیاتی دستہ قائم
کرے ۔ اس پر ابھی مکمل طور سے عمل درآمد
کیا جانا باقی ہے ۔ درایں اثنا مقدمات کا
انبار لگنا شروع ہوگیا ہے اور بہت سے
امور پر عدالتِ عالیہ کے فیصلے کا انتظار ہے ۔

ہندوستان کے طویل ساحلی علاقے
کے استعمال سے متعلق آبی پیداوار کے بارے
میں پورا فیصلہ روک دیا گیا ہے اور اس معاملہ
پر ایک بار پھر سماعت ہوتی ہے ۔ بنیادی
حقوق کی خلاف ورزی کے سلسلے میں سابق
وزرا کی ذمہ داری پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے ۔
تاج محل کے تحفظ کے سلسلے میں اقدامات
سے متعلق عدالت عالیہ کے فیصلے پر ابھی مکمل
طور سے عمل درآمد ہونا باقی ہے ۔ سپریم کورٹ
نے اولیم گیس اخراج مقدمے میں کہا تھا کہ
زندگی، صحت اور ماحولیات کے امور کو بے
روزگاری اور مالیہ کے نقصان سے متعلق ترجیح
حاصل ہے ۔ اس کا مطلب ہے مملکت کی پوری
اقتصادی سمت میں یکسر تبدیلی ۔ قانون کے اعلان
اور فیصلے نیز سیاسی معیشت کی حقیقت کے
درمیان ارتقار کا عمل مضمر ہے، جس میں قانون
منطق نہیں، بلکہ تجربہ ہوسکتا ہے ۔ ●

مودی خصارہ یوجنا نئی دہلی

فرحت احساس

آزاد ہندوستان میں اقلیتوں کی پیش رفت

(ایک تجزیہ)

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی محض ایک سیاسی واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک وسیع تر تہذیبی وقوعہ تھا۔ یہ اس عظیم اور قدیم ملک اور تہذیب کی صدیوں پرانی تاریخ کا ایک ایسا لمحہ تھا جب ہم نے وقت کے ساتھ ایک نئے عہد نامے پر دستخط کیے تھے۔ تحریک آزادی کے بالبصیرت رہنماؤں نے بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے محض ایک سیاسی جدوجہد نہیں کی تھی، انھوں نے ایک خواب کی پرورش بھی کی تھی، خواب ایک ایسے نئے ہندوستان کا جس میں ہر مذہب، ذات، طبقے، زبان، علاقے اور ثقافت کے لوگ متحد ہو کر ایک نئی سماجی، سیاسی اور تہذیبی وحدت کی تشکیل کریں گے۔ ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی شب، ایک نئی صبح میں بیدار ہونے والے ہندوستان نے، آزاد ہند کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے لفظوں میں، اپنی "تقدیر کے ساتھ" یہی "عہد" کیا تھا۔

اپنی تقدیر کے ساتھ کیے گئے اس عہد کو تکمیل کی منزلوں سے ہم کنار کرنا، سنگین سماجی اور اقتصادی مسائل سے دوچار نو آزاد ہندوستان کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ ان مسائل کو آزادی کے ساتھ ملک کی تقسیم کے زخم نے سنگین تر کر دیا تھا۔ مذہبی بنیادوں پر ملک کی اس تقسیم سے مذہبی منافرت اور قتل و غارت گری کا ایک ایسا ہولناک طوفانی پھوٹ پڑا جو کسی طرح تھمنے میں نہیں آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے برطانوی حکمرانوں کا یہ قول درست ثابت ہو جائے گا کہ شدید سماجی تضادات کا شکار یہ ملک اپنی آزادی کو سہار اور سنبھال نہیں سکے گا اور جلد ہی ٹوٹ بکھر جائے گا لیکن ان برطانوی استحصال کاروں نے صرف ہندوستان کے جسم کو دیکھا تھا۔ اس کے باطن کی پر اسرار صداقتوں کی انھیں دور دور تک خبر نہیں تھی۔ انھیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ سطح پر بھانت بھانت کے عقیدوں، زبانوں، طور طریقوں، رسوم و رواج اور ثقافتی روایتوں کے خانوں میں بٹا ہوا یہ ملک اپنی روح میں فکر و احساس کی ایسی وحدتیں لیے اور چھپے بیٹھا ہے جن کی آغوش میں تمام اختلافات اور تضادات آخر کار حل ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تہذیبی باطن میں صبر و تحمل اور قوت برداشت کی ایسی کیمیا ہے جس نے اسے ایک ناقابل یقین سمائی سے ہم کنار کر رکھا ہے، جو منفی جذبوں کی ہر شورش کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ دراصل ہندوستانی ذہن ایک ایسی عقل سلیم سے لیس ہے جس نے اسے تمام بحرانوں سے بہ سلامتی گزر جانے کی صلاحیت بخشی ہے۔

مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی جغرافیائی اور تہذیبی وحدت کی تقسیم کا زخم بہت کاری تھا اور اس پر جذباتی رد عمل بڑا شدید۔ عین ممکن تھا کہ اس زخم کی تکلیف اور جذباتی ہیجان کی شدت ہندوستانی ذہن کو بہکا دیتی اور اسے ملک کو ایک ایسا سیاسی کردار دینے کی طرف بہا لے جاتی جو ہندوستان کی تہذیبی سرشت کے منافی ہوتا مگر ہماری تہذیبی عقل سلیم نے اس تکلیف اور ہیجان پر اعتدال و توازن کے پھاہے رکھے اور بند باندھے اور ہمارے روشن ضمیر رہنماؤں نے ہندوستان کو ایک سیکولر جمہوری ملک بنانے کا فیصلہ کیا۔ جمہوریۂ ہند کے آئین نے ساری دنیا کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا جس میں ملک کی مذہبی، لسانی اور ثقافتی اقلیتوں کو برابر کے حقوق اور مواقع کی ضمانت دی گئی تھی۔ یہ آئین اس لیے اور بھی حیران کن تھا کہ تقسیم کی ضرب سے پیدا ہونے والے زخم کی سرحد کے دوسری طرف آج بھی نہ کوئی مستحکم آئین ہے اور نہ اقلیتوں کے حقوق کی کوئی ٹھوس ضمانت۔

ہندوستان کا آئین محض ایک قانونی دستاویز نہیں تھی۔ یہ ایک سماجی، سیاسی اور تہذیبی عہد نامہ بھی تھا اور اس بات کا اعلان بھی کہ ہندوستان صرف ایک خاص مذہب یا ثقافت کے لوگوں کا نہیں، ان تمام لوگوں کا ہے جو اس کی خاک سے اٹھے ہیں اور اسی کی خاک میں واپس چلے جائیں گے۔ آئین نے آزادی کے فوراً بعد کے حالات میں ڈری سہمی اقلیتوں کو ڈھارس دی اور مضبوط عزم کے ساتھ یہ یقین دلایا کہ ان کے بعض عاقبت نااندیش، تنگ نگاہ اور استحصال کار رہنماؤں نے ان کی راہ میں جو کانٹے بوئے ہیں وہ انہی کے پیروں کے زخم بن کر رخصت ہوئے اور اب ان کے سامنے نئے، متحدہ اور فراخ

باطن ہندوستان میں انسانی امکانات کی ایک شاہراہ کھلی ہوتی ہے جس پر چل کر وہ تعمیر و ترقی کی کسی بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

آزاد ہندوستان کی آئینی تشکیل سے حوصلہ اور یقین حاصل کر کے پورے ملک کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی پیش رفت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے اور جس کے دوران کامیابیوں اور کامرانیوں کے بے شمار روشن سنگ میل ہیں جو اس سفر کو ایک مثبت کردار عطا کرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کو نشان آغاز مقرر کر کے اس کے منظر نامے پر نگاہ ڈالیں تو اقلیتوں کی سماجی اور اقتصادی صورت حال میں نمایاں پیش رفت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ پیش رفت دیہات سے لے کر قصبوں اور شہروں تک ایک عام حقیقت بن گئی ہے۔ اوسط آمدنی، تعلیم اور خود اعتمادی تینوں اعتبار سے اقلیتیں آگے بڑھی ہیں۔ راقم الحروف اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے شہر بہرائچ کا رہنے والا ہے۔ وہ اپنے بچپن سے آج تک اپنے گرد و پیش کا قریب اور گہرائی سے مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ قومی ترقی کی شاہراہ سے کٹی ہوئی یہ اونگھتی ہوئی بستی کس طرح دھیرے دھیرے زندگی کے حقائق کی تیز دھوپ میں آنکھیں کھول کر آگے بڑھی ہے یہ کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہاں کثیر تعداد میں مسلمان رہتے ہیں۔ بیس پچیس سال اُدھر تک ان میں بیشتر لوگ کچے خستہ حال ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں اتنی ہی خستگی کے عالم میں گذر بسر کرتے تھے۔ روزگار کے مواقع اور آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ تعلیم کا شعور نہیں کے برابر تھا۔ ان کی زندگیوں میں کوئی حرکت اور حرارت نہیں تھی۔ لوگوں نے اپنی تقدیر سے ہار مان لی تھی۔ ہر طرف ایک پژمردگی کا عالم تھا۔ مگر دھیرے دھیرے انہی مکانوں کی کچی دیواروں میں پختگی آتی گئی اور ان کے شانوں پر رکھے ہوئے، بارشوں میں زار و قطار آنسو بہانے والے کھپریل، چھپروں کی جگہ پکی چھتیں آگئیں۔ در و دیوار میں پختگی آئی تو ان مکانوں کے مکینوں نے بھی کمر کس لی اور ایک نئے اعتماد کے ساتھ زندگی اور زمانے سے اپنا حق چھیننے نکل پڑے۔ اب حال یہ ہے کہ اسی شہر میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سرکاری ملازمتوں اور تجارت میں لگی ہوئی ہے۔ ہر محلے میں اسکول ہیں جہاں صاف ستھرے خوش رنگ یونیفارموں میں ملبوس بچوں کے ہجوم نظر آتے ہیں۔ عید، بقرعید، شادیوں کی تقریبات میں لوگ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں میں زبردست خود اعتمادی ہے۔

یہ کسی ایک بستی کا قصہ نہیں ہے۔ سارے ملک میں یہی صورت حال دیکھی جاسکتی ہے۔ بڑے شہروں میں تو حالات اور بھی بہتر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ بہتری آئی کیسے۔ اقلیتوں کے ساتھ عموماً کچھ خوف اور اندیشے لگے رہتے ہیں۔ یہ ایک فطری سماجی حقیقت ہے۔ ہندوستان کی اقلیتیں بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد چند برسوں تک تو یہ اندیشے اور بھی زیادہ تھے پھر یہ ہوا کہ اقلیتوں کو آزادی کے بعد بہت سے ناخوشگوار واقعات سے بھی گزرنا پڑا۔ فرقہ وارانہ تشدد نے بہت سے اندیشوں اور شکوک و شبہات کو جنم دیا۔ ان حالات میں منفی جذبات کو بھی ہوا دی۔ لیکن اس سب کے باوجود ایک چیز ہمیشہ اپنی جگہ برقرار اور قائم رہی۔ ہندوستان کا آئین۔ آئین میں درج اقلیتوں سے متعلق مساوی حقوق اور مذہبی آزادی کی ضمانتیں اور ملک کا سیکولر جمہوری کردار مخالف سمت سے اٹھنے والی تیز ہواؤں کے باوجود ایستادہ رہا۔ ہندوستان کے اسی کردار نے اقلیتوں کو یہ یقین اور اعتماد بخشا کہ وہ اس ملک میں تنہا اور بے یار و مددگار نہیں ہیں اور یہ کہ یہاں ایسے لاکھوں کروڑوں لوگ ہیں جن کا مذہب الگ ہو سکتا ہے مگر جو ہندوستانی شہری ہونے کی حیثیت سے ان کی زندگی کی جد و جہد اور ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں ان کے ساتھ ہیں۔ ہم نوائی اور ہم نصیبی کا اتنا یقین زندہ رہنے والوں کے لیے بہت ہوتا ہے۔ کتنے ملک ہیں جن کی اقلیتوں کو یہ ہم نوائی اور ہم سفری نصیب ہے۔ اتنی بڑی جمہوریت ہونے کے باوجود امریکہ کے سیاہ فام آج بھی اپنے حال میں شریک اور اپنے دکھوں کا احساس رکھنے والے ہم وطنوں سے محروم ہیں۔ خود ہمارے پڑوس میں مہاجروں کی حالت دیدنی ہے کہ ایک ہی مذہب کا ہونے کے باوجود ان کے ساتھ سوتیلوں سے بھی بدتر سلوک کیا جارہا ہے۔

سطور بالا میں جو تجزیہ پیش کیا گیا اس کا مقصد یہ بتانا قطعاً نہیں کہ ہندوستانی اقلیتیں خوشحالی کے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہیں اور ان میں غریبی، ناخواندگی، بیماری، کم خوراکی اور اندیشوں کا نام و نشان تک ختم ہوگیا ہے۔ محور سخن صرف یہ اشارہ کرنا ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے دوران اقلیتوں کی صورت حال مقابلتاً بہتر ہوئی ہے اور قوم کی مجموعی ترقی میں ان کی بھی حصے داری رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان میں آج بھی کروڑوں لوگ ہیں جو ترقی اور خوش حالی کی شاہراہ سے دور پڑے ہیں اور جن کے لیے زندگی آج بھی محض ایک خواب ہے جس کی تعبیر کی کوئی اچھی صورت دور دور تک نظر نہیں آتی۔ ان لوگوں میں اقلیتیں بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ صرف اقلیتوں کا نہیں، پوری ہندوستانی قوم کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ہماری منصوبہ بندی اور اقتصادی نظام کا ہے جس سے نمٹنے کی کوششیں جاری ہیں۔

اس مثبت اور حوصلہ افزا صورت حال کے باوجود اقلیتوں میں بعض افراد آج بھی موجود ہیں جو انھیں ہندوستانی قوم سے الگ رکھ کر کچھ خاص مسائل میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اقلیتیں بے چارگی، کمتری اور ایک خاص قسم کی اذیت کے احساس کے حبس کدے میں قید رہیں۔ ایسے نفی پرستوں کو نہ زندگی کا شعور ہے نہ زمانے کا۔ انھیں خبر ہی نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ وہ آج بھی زمانے کی شکایت اور وقت سے شکووں کے دفتر کھولے بیٹھے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے گھوما ہے اور دنیا میں ہوش ربا

باقی صفحہ ۱۳ پر

نئی دہلی
یوجنا

چیف ایڈیٹر : این۔ این۔ شرما

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

فون : 6177591

معاون : رقیہ زیدی

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : سندیتا

جلد : ۱۷ : شمارہ : ۶
ستمبر ۱۹۹۶ء (بھدر۔ اشون شک ۱۹۱۹)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے
زرِ سالانہ ۵۰ روپے
(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)
زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

سرکولیشن اینڈ ایڈورٹیزمنٹ منیجر : کے۔ ایس۔ جگناتھ راؤ

مضامین سے متعلق
خط کتابت کا پتا:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (ایسٹ) نئی دہلی۔ ۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

ترتیب

ٹھوس کوڑے کرکٹ کا دوبارہ استعمال

ہماری آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں صحت کا معیار متاثر ہو رہا ہے اور ماحولیات پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں۔ پینے کے صاف پانی کی مقدار میں کمی آ رہی ہے اور شہروں میں صفائی ستھرائی کی سہولتیں ناکافی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس صورت حال کو اگر ٹھیک کرنے کے لیے مناسب اقدامات نہ کیے گئے تو یہ اور بگڑ جائے گی مصنف نے سبھی متعلقہ محکموں پر اس بات کے لیے زور دیا ہے کہ وہ ایک قومی سطح کے عملی پلان کو وقت کی ضرورت سمجھیں اور وہ سبھی محکمے جو اس سلسلے کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہیں، اس کی افادیت کو پہچانیں۔

ہندوستان کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۳۴ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی جو بڑھ کر ۱۹۹۱ء میں ۸۴ کروڑ ۷۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر ۸۴ لاکھ ۶۰ ہزار ہندوستانیوں میں سے ۲۲ لاکھ ہندوستانی تقریباً ۴ ہزار شہری آبادیوں میں بستے ہیں۔ شہری آبادی کا ۴۰ فی صد حصہ غریب ہے اور گندی بستیوں میں رہتا ہے یا پھر فٹ پاتھ پر زندگی گزارتا ہے۔ ان کو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں اور صفائی ستھرائی کی سہولتوں کو تو ذکر ہی کیا۔

اندازہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی اس صدی کے آخر تک ایک ارب تک پہنچ جائے گی۔ شہری آبادی ۲۰۱۵ء تک بڑھ کر ۷۴ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اس مدت میں شہروں میں عوام کے معیار زندگی میں برابر گراوٹ آتی جا رہی ہے اور بنیادی سہولتوں میں کمی آ رہی ہے۔ دیہات کی صورت حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس تبدیلی کے عمل میں شہری غریب آبادی سب سے زیادہ متاثر ہو رہی ہے۔ آبادی کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ پینے کے صاف پانی میں کمی آ رہی ہے۔ شہروں میں صفائی ستھرائی کی صورت حال مزید گراوٹ کی طرف ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ تمام متعلقہ شعبے اپنے اپنے کام کو باہمی تال میل کے ساتھ انجام دیں اور شہروں میں ٹھوس فضلے اور کچرے کو نیز رقیق گندے پانی۔ فضلے اور کچرے کو مناسب ڈھنگ سے کارآمد بنانے کے لیے مناسب اور نئی تکنالوجی سے کام لیں۔ اگر اس حکمت عملی کو بروئے کار نہ لایا گیا تو موجودہ صورت حال اور بگڑ جائے گی۔ سالڈ ویسٹ (SOLID WASTE) ایک عام اصطلاح ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مینوفیکچرنگ کے دوران جو سامان کچرے کی صورت میں باہر آتا ہے یا جسے بے کار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے اور جس کی مالک کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی، وہ فضلہ، کچرا یا بے کار سامان کہلاتا ہے، انگریزی اصطلاح میں اسے سالڈ ویسٹ کہا جاتا ہے۔ عملی طور پر یہ محض ٹھوس شکل میں ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ

ہندوستان کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۳۴ کروڑ ۲۰ لاکھ تھی جو بڑھ کر ۱۹۹۱ء میں ۸۴ کروڑ ۷۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر ۸۴ لاکھ ۶۰ ہزار ہندوستانیوں میں سے ۲۲ لاکھ ہندوستانی تقریباً چار ہزار شہری آبادیوں میں بستے ہیں۔ شہری آبادی کا ۴۰ فی صد حصہ غریب ہے اور گندی بستیوں میں رہتا ہے یا پھر فٹ پاتھ پر زندگی گزارتا ہے۔ ان کو پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں اور صفائی ستھرائی کی سہولتوں کو تو ذکر ہی کیا۔

کنستروں میں گیس دار مادے یا رقیق مادوں کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔

اس طرح کی ایک اور اصطلاح ہے جسے میونسپل سالڈ ویسٹ کہتے ہیں۔ اس کا مختصر نام ایم۔ ایس۔ ڈبلیو ہے۔ اس سے مراد ایسے ٹھوس ضائع شدہ مادوں سے ہے جن کو کچرا سمجھ کر میونسپلٹی کسی ایک جگہ جمع کرا لیتی ہے، اس لیے مقامی حکام کا یہ فرض ہے کہ اس ٹھوس کچرے کو مناسب طور پر کام میں لائیں کیوں کہ اگر اسے پھیلا رہنے دیا جائے اور اسے مناسب جگہ ڈال کر اس کو کارآمد نہ بنایا جائے تو اس سے بیماریاں پھیل سکتی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں دہلی میں ہیضہ کی بیماری اس لیے پھیلی تھی کہ اس ٹھوس کچرے کو ٹھیک ڈھنگ سے ٹھکانے نہیں لگایا جا سکا تھا اور اس بیماری کے پھیلنے سے تقریباً ایک سو افراد آنتوں کی سوزش کے مرض کی وجہ سے وفات پا گئے تھے۔

ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل اے۔ ۴۸ کے مطابق ریاستوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ماحول کی حفاظت کریں، اس آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ ریاست ماحول کو صاف ستھرا بنانے اور اس کے تحفظ کے لیے تدابیر کرے گی اور وہ جنگلات کا تحفظ کرے گی اور ملک میں جنگلی جانوروں کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالے گی۔

کچرے اور فضلے کو ڈھنگ سے ٹھکانے لگانے کی ضرورت اس لیے ہے تاکہ صحت کا نظام باقاعدگی اور موثر ڈھنگ سے چلایا جا سکے، لہٰذا اس آرٹیکل کی رُو سے ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ فضلہ کو ڈھنگ سے کارآمد بنائے۔

وفاقی سطح پر کوئی ایسا قانون نہیں جو براہِ راست ٹھوس فضلے کو کارآمد بنانے کی ذمہ داری بتاتا ہو۔ البتہ ہندوستان میں ماحولیات سے متعلق تمام قوانین ماحولیات کے تحفظ کے قانون مجریہ ۱۹۸۶ء کے تحت آتے ہیں۔ اس طرح ٹھوس فضلہ بھی اس قانون کے تحت آتا ہے۔ ماحولیات سے متعلق قانون آلودگی سے متعلق قوانین کی صراحت کرتا ہے۔ اس کے تحت گندے پانی کے نکاس کی حد بندی کی وضاحت موجود ہے، اس طرح یہ فضائی آلودگی کی حد کا بھی تعین کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ صنعتوں کے تحت جو گندا پانی نکلتا ہے یا ان سے جو فضائی آلودگی پھیلتی ہے، اس کو کس حد تک پھیلنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ ماحولیات سے متعلق قانون صنعتی فضلہ تک محدود ہے اس کے دائرہ کار میں میونسپل علاقوں کا ٹھوس فضلہ نہیں آتا۔

ہر ریاست میں صحت کے کاموں کی دیکھ بھال کا ایک محکمہ ہوتا ہے جسے پبلک ہیلتھ انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ کہتے ہیں۔ یہ پانی کی سپلائی اور صفائی کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ البتہ ٹھوس فضلہ کو ٹھکانے لگانے والی خلعات پر حقیقی عمل درآمد کی ذمہ داری مقامی شہری تنظیموں پر ہوتی ہے۔ ریاستی سرکار اس میں زیادہ تر مالی نوعیت کی

ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل اے۔ ۴۸ کے مطابق ریاستوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ماحول کی حفاظت کریں، اس آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ ریاست ماحول کو صاف ستھرا بنانے اور اس کے تحفظ کے لیے تدابیر کرے گی اور وہ جنگلات کا تحفظ کرے گی اور ملک میں جنگلی جانوروں کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھالے گی۔

مدد کرتی ہے کیوں کہ اس کو بروئے کار لانے کے لیے درکار رقومات لوکل باڈیز پوری نہیں کر پاتیں۔

مقامی سطح پر ٹھوس فضلے کے نظم و نسق پر عمل درآمد کے لیے تین مختلف قسم کی تنظیمیں ہیں۔ ایک تنظیم ہے واٹر سپلائی اور سیوریج بورڈ۔ یہ بورڈ آسام، بہار، گجرات، کرناٹک، کیرالہ، مہاراشٹر، پنجاب، اتر پردیش اور تمل ناڈو میں قائم ہیں۔ دوسری طرح کی تنظیم ایسے الگ سے میونسپل بورڈ ہیں جو بنگلور، حیدرآباد اور چنئی میں قائم ہیں۔ ممبئی، دہلی اور چنئی جیسے بڑے شہروں میں میونسپل کارپوریشنیں ہیں جو ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری اور کچھ متعلقہ دیگر امور انجام دیتی ہیں، کچھ بڑے شہروں نے ایسے ہی قوانین وضع کیے ہیں جس سے کہ ٹھوس فضلے کو کارآمد بنایا جا سکے۔ میونسپل قانون ممبئی کے تحت جو صفائی کرنے، جھاڑو لگانے کا محکمہ ہے، اس کے مطابق میونسپلٹی ایسے ڈرم فراہم کرتی ہے جس میں دھول، گرد، فضلہ اور گندی چیزوں کو ڈالا جا سکے۔ تجارت کے دوران جو گندی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، اس کو بھی اس میں ڈالا جاتا ہے، مویشیوں کے پنجر اور دیگر کچرا ان میں بھرا جاتا ہے۔

اس کے برعکس تمام احاطوں کے مالکان اور ان پر قبضہ کرنے والوں کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ مویشیوں کے پنجر وغیرہ کو چھوڑ کر باقی سبھی طرح کا کچرا اکٹھا کریں۔ اس سلسلے میں ایک خصوصی دفعہ موجود ہے جس کی رُو سے تمام گھروں اور ان کے مالکان کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ سب کچرا ڈرم میں ڈالیں اور میونسپلٹی کا یہ فرض ہے کہ ان سرکاری ڈرموں میں سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ کچرا نکال لیں اور پھر ان کو ایسی جگہ لے جا کر ٹھکانے لگائیں جس سے عوام کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ میونسپلٹی کا فرض ہے کہ وہ ان ڈرموں کو قابل قبول حالت میں رکھیں۔

ہندوستان کے حوالے سے ایک بات اور بھی اہم ہے، یہاں شہروں سے کہیں زیادہ آبادی دیہات میں ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی ۸۴ کروڑ ۴۰ لاکھ آبادی میں سے ۲۱ کروڑ ۷۰ لاکھ آبادی شہری علاقوں میں آباد ہے۔ گویا کہ کل آبادی کا ۲۵٫۷۱ فی صد۔ اگرچہ شہری آبادی ہر سال بڑھتی جا رہی ہے لیکن پھر بھی چار میں سے ایک شخص ہی شہری علاقے میں رہتا ہے۔ دیہی علاقوں کے

سلسلے میں ٹھوس کچرے کے حوالے سے اعداد و شمار دستیاب نہیں لہٰذا دیہات میں کچرے کو ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں اگر کوئی تجزیہ کیا جائے گا تو وہ بہ لحاظ مقدار نہیں ہوگا۔

کچرے کی پیدائش

گھروں سے کچرا باہر آتا ہے، اس کے علاوہ سڑکوں اور گلیوں پر بھی کچرا ہوتا ہے جس کی تقسیم ماحولیات کے تحقیقی قومی ادارے واقع ناگپور کے ڈاکٹر اے ڈی۔ بھنڈے نے کی ہے جو اس طرح ہے۔

قدرتی کوڑا کرکٹ

کچرا وغیرہ غیر استعمال شدہ سڑکوں سے اڑنے والی دھول، پیڑ پودے اور ان سے گرنے والی پتیاں، مرجھائے ہوئے پودے، حاشیائی علاقوں یا مختلف طرح سے گراتے ہوئے بیج اور پھر ان کے جم جانے اور ان سے ظاہر ہونے والے پودے۔

سڑک کے ٹریفک سے پیدا شدہ کچرا، کوڑا، کرکٹ

سڑکوں کی سطح سے ٹوٹ کر، گھس کر جو کوڑا کرکٹ بنتا ہے، سڑکوں پر گاڑیاں چلتی ہیں، ان سے سڑکیں گھستی ہیں اور یہ کچرا سامنے آتا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں دھیکلز کے پارٹس، تیل، پٹرول، بھینس گاڑی، اونٹ گاڑی وغیرہ کے چلنے کے دوران ان جانوروں کا فضلہ گوبر وغیرہ بھی سڑکوں پر رہتا ہے۔

لاپرواہی والے مزاج کے زیر اثر کوڑا کرکٹ

چلتے چلتے پیدل مسافر بیڑی وغیرہ کے بچے ٹکڑے اور دیگر ردی کاغذ عادتاً زمین پر پھینکتے چلے جاتے ہیں، ان کو کسی کوڑے دان وغیرہ میں نہیں ڈالتے۔ یہی صورت حال ان مسافروں کی ہے جو موٹر سائیکلوں اور آٹو گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔

چناں چہ میونسپلٹیاں جو کوڑا کرکٹ اور کچرا اٹھاتی ہیں، اس کا کافی بڑا حصہ درج ذیل چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے:۔

۱۔ **سڑکوں پر جھاڑو**:۔ دھول، گرد، ریت، پتھر، پتیاں اور دیگر خراب شدہ ترکاریاں اور پیڑ پودوں کی ڈنڈیاں وغیرہ۔

۲۔ **بازاروں کا کچرا**: دوکانوں اور بازار کے علاقوں سے اکٹھا کیا گیا کچرا، اس میں کاغذ، تنکے، گتہ کا ایسا سامان جو ڈبوں وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ گلے سڑے پھل، ترکاریاں اور دیگر طرح کا پھینکا ہوا سامان۔

۳۔ کچھ دیگر اشیاء میں ایسا ٹھوس کچرا ہوتا ہے جو اسپتالوں، اسکولوں، دفاتر، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں وغیرہ سے باہر آتا ہے۔

ہندوستان میں میونسپلٹیوں کے ذریعے سے جس طرح کا ٹھوس کچرا اکٹھا کیا جاتا ہے، اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ البتہ ۱۹۷۱-۷۲ء کے دوران سینٹرل پبلک ہیلتھ اینڈ انوائرنمنٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اسی طرح کا ایک سروے کیا تھا۔ یہ ادارہ نیشنل انوائرنمنٹل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے قبل کا ادارہ تھا۔ اس سروے میں ۴۳ شہروں کا سروے کیا گیا تھا۔ اس سروے میں اس وقت کی آبادی کے ۲۲ فی صد حصہ کا احاطہ کیا گیا تھا۔ لیکن اس سروے کو ۲۰ سال ہو چکے ہیں، اس لیے اس کی افادیت باقی نہیں رہی ہے لیکن مصنف اسی کے اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر بات کرتا ہے کیوں کہ اس کے علاوہ دوسرے اعداد و شمار بھی تو نہیں ہیں۔

ہر شہر میں ٹھوس کچرے کی پیداوار بہ لحاظ فی کس الگ الگ ہے عمومی طور پر ہندوستان میں اس کچرے کے پیدا کرنے میں فی کس اوسط تقریباً ۳۵۰ گرام ہے لیکن یہ ۳۰۰ گرام سے لے کر ۵۰۰ گرام تک ہر ایک کے حصے میں آتا ہے، ۱۹۸۹ء میں اور صحت کی عالمی تنظیم نے مہاراشٹر اور گجرات کے متعدد شہروں میں جو سروے کیا، اس کے مطابق میونسپل ٹھوس کچرا پیدا کرنے میں فی کس اوسط فی دن ۳۳۰ گرام سے لے کر ۴۲۰ گرام تک ہے۔ اس سروے نے بہت سے انکشافات کیے۔ ایک یہ بات سامنے آئی کہ شہروں اور قصبوں کا چھوٹا اور بڑا ہونا الگ بات ہے مگر ہر جگہ فی کس کچرے کی پیداوار کا اوسط تقریباً ایک سا ہی ہے: مثال کے طور پر ممبئی میں آبادی دس لاکھ ہے اور سنانند کی آبادی صرف ۲۵ ہزار ہے مگر ہر دو جگہوں پر کچرے کی پیداوار کے فی کس اوسط میں صرف ۳۸ گرام کا فرق ہے۔ مزید یہ کہ شہروں کے بڑا یا چھوٹا ہونے کی بات سے فی کس کچرے کی پیداوار کا کوئی مثبت جوڑ نہیں ہے۔

میونسپل کچرے کا ملک گیر پیمانے پر فی کس اوسط تقریباً ۳۵۰ گرام ہے جسے شہر کی ۲۱ کروڑ ۷۰ لاکھ کی آبادی اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ چناں چہ ہندوستان کے شہری علاقوں میں بہ حیثیت مجموعی میونسپل ٹھوس کچرے کی پیداوار تقریباً ۷ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن یومیہ ہے۔

محفوظ ڈھنگ سے اس کو ٹھکانے لگانا

شہروں میں ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگانا میونسپلٹیوں کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح سے ماحول کا تحفظ بھی ہوتا ہے اور

> ہر شہر میں ٹھوس کچرے کی پیداوار بہ لحاظ فی کس الگ الگ ہے عمومی طور پر ہندوستان میں اس کچرے کے پیدا کرنے میں فی کس اوسط تقریباً ۳۵۰ گرام ہے لیکن یہ ۳۰۰ گرام سے لے کر ۵۰۰ گرام تک ہر ایک کے حصے میں آتا ہے، ۱۹۸۹ء میں اور صحت کی عالمی تنظیم نے مہاراشٹر اور گجرات کے متعدد شہروں میں جو سروے کیا، اس کے مطابق میونسپل ٹھوس کچرا پیدا کرنے میں فی کس اوسط فی دن ۳۳۰ گرام سے لے کر ۴۲۰ گرام تک ہے۔

شہریوں کی صحت کی حفاظت بھی انجام پاتی ہے اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ کچرے کو ٹھکانے لگانے کے لیے مناسب تکنیکی طریق کار وضع کیا جائے اور یہ ایسا ہو کہ کچرے کو محفوظ طریقے سے کار آمد کر لیا جائے اور اس پر آنے والی لاگت کم سے کم رہے۔ اس کام کے لیے درکار رقومات فراہم کی جائیں۔ انفرادی شہری، صنعتیں، اسپتال اور رضاکارانہ ادارے میونسپل حکام کے ساتھ تعاون کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ شہروں کا ٹھوس کچرا محفوظ ڈھنگ سے ٹھکانے لگایا جا سکے۔

کچھ ایسے ٹھوس غیر نامیاتی مادے ہیں جن کو دوبارہ کار آمد بنایا جا سکتا ہے مثلاً پلاسٹک، شیشہ، دھاتیں، کاغذ۔ ایسے سامان کو اکٹھا کرنے کے لیے ہر گھر میں تھیلے، ٹین الگ سے رکھے جائیں اور ان میں ان اشیاء کو ڈالتے رہیں۔

جہاں تک ممکن ہو ہر گھر کا ٹھوس کچرا جمع کر لیا جائے اور سب گھروں سے ان کو روزانہ اکٹھا کر لیا جائے۔ ان کاموں کے لیے غیر سرکاری اداروں، رضاکار اداروں، کچرا جمع کرنے والوں یا پھر ان کے کوآپریٹو اداروں سے کام لیا جائے اور یہ لوگ گھروں سے یا جگہ جگہ رکھے گئے کنٹینروں وغیرہ میں سے یہ سامان نکالتے رہیں۔

اس سامان کو ہر گھر سے اٹھانے کے لیے مناسب ڈیزائن کی پہیوں سے چلنے والی تین پہیہ گاڑیاں وضع کی جانی چاہئیں۔ جن گاڑیوں پر کچرا اٹھا کر ڈالا جاتا ہے اور پھر ان گاڑیوں سے ٹرانسپورٹیشن گاڑیوں پر اس کوڑے کرکٹ کو منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ کام اگر براہ راست طریقے پر انجام دیا جائے تو اس سے نقل و حمل کی گاڑیوں کو کم وقت لگے گا اور یہ نظام اپنی لاگت کے اعتبار سے بھی کفایتی ہو گا۔ یہ کام روزانہ انجام پانا چاہیے۔

سبزیوں اور پھلوں کے بازاروں سے یہ کچرا کم سے کم دن میں دو بار اٹھایا جائے۔ یہ سامان ایسی جگہ پر گڑھوں میں ڈالا جائے جو کمپوسٹ تیار کرنے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ بڑی بڑی منڈیوں میں مویشیوں کے چارے یا حیاتیاتی گیس کے لیے وہیں پر ایسا نظام ہو جس کے ذریعے سے چارے یا گیس کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔ بڑے بڑے ریستورانوں اور ہوٹلوں میں بھی ایسا انتظام ہونا چاہیے جہاں کچرے کو ٹھکانے لگایا جا سکے۔ ان مقامات پر ایسا نظام ہو جس سے حیاتیاتی گیس کو کار آمد بنا لیا جائے، کمپوسٹ کھاد تیار کر لی جائے اور مویشیوں کے لیے چارہ تیار کیا جا سکے۔

ٹھوس کچرے کی نقل و حمل کے کام سے جڑی گاڑیاں اس حساب سے وضع کی جائیں کہ وہ کچرے کو ڈھونے کے لیے مناسب ہوں۔ اس میں پانی کے انڈیلنے اور سامان کو جلد سے جلد چڑھانے اور اتارنے کا انتظام اچھا ہو۔ کچرا ڈھونے والی تمام گاڑیاں ڈھکی ہونی چاہئیں تاکہ یہ کچرا ابھرتا ہوا نہ جائے اور فضائی آلودگی نہ بڑھے۔

ٹھوس کچرے کے نقل و حمل کے کام سے جڑی گاڑیاں اس حساب سے وضع کی جائیں کہ وہ کچرے کو ڈھونے کے لیے مناسب ہوں۔ اس میں پانی کے انڈیلنے اور سامان کو جلد سے جلد چڑھانے اور اتارنے کا انتظام اچھا ہو۔ کچرا ڈھونے والی تمام گاڑیاں ڈھکی ہونی چاہئیں تاکہ یہ کچرا ابھرتا ہوا نہ جائے اور فضائی آلودگی نہ بڑھے۔

کچرے کا بندوبست

شہروں میں ٹھوس فضلہ، کچرے وغیرہ میں ٹھکانے لگانے کا ایک اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان سے کھائی دار زمینوں کو پُر کر لیا جائے۔ یہ طریقہ مقابلتاً چھوٹے شہروں میں بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ خالی زمینوں کو کچرے سے ہموار کر کے اُسے آہستہ آہستہ خوشنما بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے ماحول کو صاف ستھرا بنانے کے لیے اقدامات ضروری ہیں۔ اس کے اچھے اثرات صحت پر مرتب ہوں گے اور ماحولیات کی خرابی سے صحت پر پڑنے والے مضر اثرات سے بچا جا سکے گا۔

بڑے بڑے شہروں میں منصوبہ بند طریقہ پر علاقوں کے فروغ اور ان کو ڈیولپ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنے والے حکام کے پاس ایسی کافی گنجائش ہونی چاہیے جس سے کہ وہ کچرے سے گڑھوں وغیرہ کو بھر سکیں یہ زمینیں خطہ واری بنیادوں پر ہونے چاہئیں اور اراضی کے استعمال کی منصوبہ بندی کی بنیاد پر ڈیولپ کی جانی چاہئیں۔ چھوٹے اور متوسط شہر اس سلسلے میں میونسپلٹی کے سطح پر باہمی طور پر تال میل قائم کر کے یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ یہ کام میٹروپولیٹن کے فروغ کی سہولتوں کے ذمہ دار حکام کے توسط سے انجام دیا جا سکتا ہے یا پھر علاقائی سطح پر اس کام کی انجام دہی کے لیے کوئی اور مناسب حاکم متعین کیا جا سکتا ہے۔

ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ کمپوسٹ کھاد ان کے ذریعے سے تیار کی جائے اور اس کے ساتھ ہی جس کچرے کو کمپوسٹ کھاد کے طور پر کام میں نہیں لایا جا سکتا، اسے اراضی کو ڈیولپ کرنے کے لیے کام میں لایا جائے۔ اس طرح سے میونسپل ٹھوس کچرے کا تقریباً ۲۰ تا ۲۵ فی صد ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ ہر شہر کی آبادی اور اس کی وسعت کے لحاظ سے کمپوسٹ بنانے والے پلانٹوں میں مشینوں سے مدد لی جانی چاہیے اور اس میں ایروبک اور غیر ایروبک دونوں طریقوں سے کام لیا جانا چاہیے۔ چھوٹے شہروں میں کم لاگت والی تکنیک کے

ذریعے ایسے کمپوسٹ پلانٹ تیار کیے جانے چاہئیں جن میں مشینوں کی کم سے کم ضرورت ہو اور جو محنت مزدوری کرنے والے افراد کو کام پر لگا کر تیار کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے شہروں میں جو ٹھوس کچرا ملتا ہے، اس کی گرمی پیدا کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے، اس میں نمی زیادہ ہے اور ایسا مادہ کم ہے جو آتش گیر کم ہوتا ہے اس لیے وہ نذر حل ٹکنالوجیوں کے لیے موزوں نہیں۔ البتہ تحقیق و جستجو کی ایسی کوششوں کو آگے بڑھانا چاہیے جس سے کچھ ایسی ٹکنالوجیاں وضع کی جا سکیں جو اس کچرے کو حرارت پیدا کرنے کے سلسلے میں کارآمد بنا سکیں۔ اس سلسلے میں کچرے کو نذر آتش کرنے کی تکنیک، یا دھاتوں یا لکڑی کے چھوٹے فرنیس میں کچرے کو ڈال کر اسے کارآمد بنانے، یا پھر دوسری اشیار کی مدد سے اسے کارآمد بنانا یا پھر اس کے ذریعے گیس کی تیاری کے عمل کی تکنیک وضع کرنا، یہ چند اور اس طرح کے اور بہت سے ایسے گوشے ہیں جن سے اس کی افادیت جانچی اور پرکھی جا سکتی ہے، یہ کام نجی سیکٹر کے ساتھ تعاون کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میونسپل حکام اور تحقیقی کاموں میں مصروف اداروں کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعے بھی اسے آگے بڑھایا جا سکتا اور ان شعبوں میں تجربہ اور مہارت رکھنے والے اداروں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

شہری ترقی کے کاموں سے متعلق حکام اور ریاستوں کے انسداد آلودگی کے بورڈ اعداد و شمار کی مدد سے ایسی صنعتوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو خطرناک قسم کا ٹھوس کچرا نکالتی ہیں، ان صنعتوں کی جائے وقوع، ان سے نکلنے والے کچرے کی مقدار اور نوعیت، قسم وغیرہ کی نشاندہی بھی یہی حکام یا ریاستی بورڈ کر سکتے ہیں۔ اسی کام کے لیے کچھ موجودہ اداروں کو مستحکم بنانے کی ضرورت ہے مثلاً۔

۱- آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف ہائی جین اینڈ پبلک ہیلتھ کلکتہ
۲- آئی۔آر۔ٹی۔سی (IRTC) لکھنؤ
۳- نیری (NEERI) ناگپور
۴- NIOH دا این آئی او ایچ) احمدآباد

یہ ادارے علاقائی مراکز کے طور پر کام کریں گے اور کیمیاوی اجزا کی تیاری سے متعلق صنعتوں کی فہرست تیار کریں گے۔ اس کے علاوہ ان اداروں کی ذمہ داری یہ بھی ہو گی کہ وہ نشیلی اشیار کی تیاری کے دوران باہر پھینک دیے جانے والے فضلہ کے بارے میں ایک رپورٹ مرتب کریں اور یہ بتائیں کہ اس کو کس طرح کارآمد بنایا جا سکتا ہے نیز یہ کہ اس نشیلے کچرے سے صحت اور ماحول کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صنعتی کچرے کو ٹھکانے لگانے کے موجودہ طریقوں سے ماحول اور صحت پر کیا کیا مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

یہ مراکز ماحول اور صحت کو ممکنہ خطرات کے بارے میں پیشگی آگاہی دیں گے اور ایسے طریقے بتائیں گے جن سے نشیلے کچرے کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ یہ مراکز ایسے تحقیقی مطالعوں اور کوششوں کو بڑھاوا دیں گے جن سے کچرے کو ٹھکانے لگانے، اسے کارآمد بنانے کے لیے نئے نئے طریقے سامنے آ سکیں۔

جو صنعتیں خطرناک قسم کے ٹھوس کچرے کو باہر نکالتی ہیں، وہ انسداد آلودگی سے متعلق بورڈ کے ماتحت آنی چاہئیں۔

صحت کے لیے خطرناک صنعتی ٹھوس کچرا، جو نشہ آور اشیار کی تیاری کے دوران باہر آتا ہے، اس کو ٹھکانے لگانے اور اس میں سے نشتر کا جزو نکال دینے کی ذمہ داری متعلقہ صنعتوں کی ہی ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ہی اس کچرے سے زمین کے گڑھے کھائی یا گہری زمینوں کو اس سے پُر کرنا چاہیے۔ ایسی خالی اراضی اس سے پُر کرنی چاہیے جس سے کہ ماحول پر مضر اثرات نہ پڑیں۔

وسائل کی بازیافت

کچرے کو ٹھکانے لگانے اور اسے کارآمد بنانے کے لیے مادے کو شروع ہی میں الگ الگ کر لینا چاہیے۔ اس وقت جھاڑو دینے کا جو طریقہ رائج ہے کہ سڑکوں پر جھاڑو لگا کر گندگی کو اور بے کار چیزوں کو ڈھیر کی شکل میں کناروں پر لگایا جاتا ہے، اس کی جگہ ایک ایسا منظم طریقہ وضع کیا جانا چاہیے کہ ایسی گاڑیاں ہوں جو دوبارہ سے قابل استعمال بنا دیے جانے والے مادوں اور اشیار کو اکٹھا کر کے انہیں ٹرانسپورٹ کے لیے گاڑیوں میں بھر دیں۔ یہ کام کو آپریٹو اداروں کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔ میونسپل حکام ایسے لوگوں کی مدد لے سکتے ہیں جو چیتھڑے اور متفرق اشیار کوڑے دانوں میں سے اٹھاتے پھرتے ہیں، ان کے ذریعے سے بھی ایسی اشیار اکٹھی کرائی جا سکتی ہیں جن کو دوبارہ سے کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔

ایسی صنعتوں کو جو کہ بے کار پڑی ہے اشیار کو دوبارہ سے قابل استعمال بنانے کے عمل میں مصروف ہیں، مثلاً کاغذ، پلاسٹک، شیشہ، دھاتیں وغیرہ، ان کو مالی امداد ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنی ٹکنالوجی کو فروغ دے سکیں اور بہتر معیار کی اشیار تیار کر سکیں اور جو اپنی پیداوار کی لاگت گھٹا سکیں اور اپنی اشیار کو منڈی میں بہتر طور پر فروخت کر سکیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ ٹکنالوجیوں کے عملی استعمال کے امکانات

> ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ کمپوسٹ کھاد ان کے ذریعے سے تیار کی جائے اور اس کے ساتھ ہی جس کچرے کو کمپوسٹ کھاد کے طور پر کام میں نہیں لایا جا سکتا، اس اراضی کو ڈیولپ کرنے کے لیے کام میں لایا جائے۔

کی تلاش کی جائے اور ایسی ٹکنالوجیوں کے افادیت کا مطالعہ کیا جائے جو کوڑے کرکٹ، کٹے پھٹے پھلوں وغیرہ کے لگے گندگی کے ڈھیروں کے لیے مناسب ہوں۔ یہ کام تحقیق و ترقی کے پروجیکٹوں کے تحت انجام پاسکتا ہے اور ان کے ذریعے نئی نئی ٹکنالوجیاں معرض وجود میں آسکتی ہیں اور موجودہ ٹکنالوجیوں کا معیار بڑھایا جاسکتا ہے۔

ایسے انتظامی اور قانونی اقدامات ضروری ہیں جن سے دوبارہ سے کارآمد بنائی گئی پلاسٹک یا شیشہ کی اشیاء یا ردی کاغذ کی اشیاء کا استعمال فروغ پائے۔ اس کے لیے کچھ امدادی اقدامات اور ترغیبی عمل ضروری ہے۔ یہ کام ریاست اور مرکز دونوں ہی کو انجام دینا ہے۔ اس سلسلے میں ایسی اشیاء کی تیاری میں لگے پلانٹوں اور مشینری کو ٹیکسوں اور محصولات سے مستثنیٰ کرنا ہے۔

قانونی اور مالی اقدامات

اسی کام کو قانونی اقدامات کے ذریعے بھی آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عوامی شعور کو بھی بیدار کرنا ہے، یہ کام اس طرح انجام پائے کہ شہروں میں ٹھوس کچرے کو محفوظ طریقے پر ٹھکانے لگایا جائے، اس کام کو تسلسل کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اس سلسلے میں ہر ریاست کو ان موجودہ قانونی اقدامات کا جائزہ لینا ہے جو اس وقت میونسپلٹیوں سے متعلق ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ٹاؤن اینڈ کنٹری پلاننگ ایکٹ کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف موثر کارروائی ہوسکے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ چھوٹی چھوٹی میونسپلٹیاں آپس میں مل کر ٹھوس کچرے کو کارآمد بنانے کا عمل انجام دیں۔ اس کے بعد سرکار قانون اور انتظامی دفعات کو لاگو کرنا ضروری ہوگا اور مرکزی/ریاستی سرکاروں کی طرف سے مالی امداد فراہم کی جانی ضروری ہے۔

شعور کی بیداری

عوام کو اس بارے میں باخبر کرانا ضروری ہے کہ ان کی شہری ٹھوس کچرے کو صاف ستھرے ڈھنگ سے کس طرح ٹھکانے لگانا ہے۔ یہ کام ان لوگوں کو کرنا ہے جو عوام کی رائے بناتے ہیں، یا جو صنعت کار ہیں، اسپتالوں سے متعلق عملے کے افراد ہیں یا جو پالیسیاں بناتے ہیں اور شہری انتظامیہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ میونسپل حکام، رضاکار ادارے اور شہریوں کی تنظیمیں اس تحریک کو آگے بڑھانے میں حصہ لے سکتی ہیں۔

شہری ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگانے اور اسے کارآمد بنانے کی ذمہ داری متعدد محکموں کی نگرانی میں آتی ہے۔ اس طرح کی کوششوں کو موثر بنانے کے لیے ان مختلف محکموں میں آپس میں تال میل ضروری ہے۔ اس کام کو ایک قومی سطح کی پالیسی بناکر انجام دیا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں ایک عملی پلان وضع کیا جانا چاہیے۔ سفارش کردہ پالیسی کے تحت ان باتوں پر زور ہونا چاہیے:-

۱۔ کچرے کی پیدائش کم سے کم ہو۔
۲۔ مختلف طرح کے کچرے اور فضلہ کو ابتدائی مقام پر ہی الگ الگ کردیا جائے۔
۳۔ یہ کام گھر پر، اسپتال میں یا صنعت میں ہی انجام پاجانا چاہیے۔
۴۔ ان کو دوبارہ سے کارآمد بنانے کا وسیلہ ہونا چاہیے تاکہ یہ روزمرہ کی زندگی میں مفید اشیاء کی صورت میں سامنے آسکے۔
۵۔ محفوظ طور پر اشیاء کو جمع کرنا، ان کی نقل و حمل اور ٹھوس مادوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے مناسب ٹکنالوجی کا ہونا ضروری ہے۔

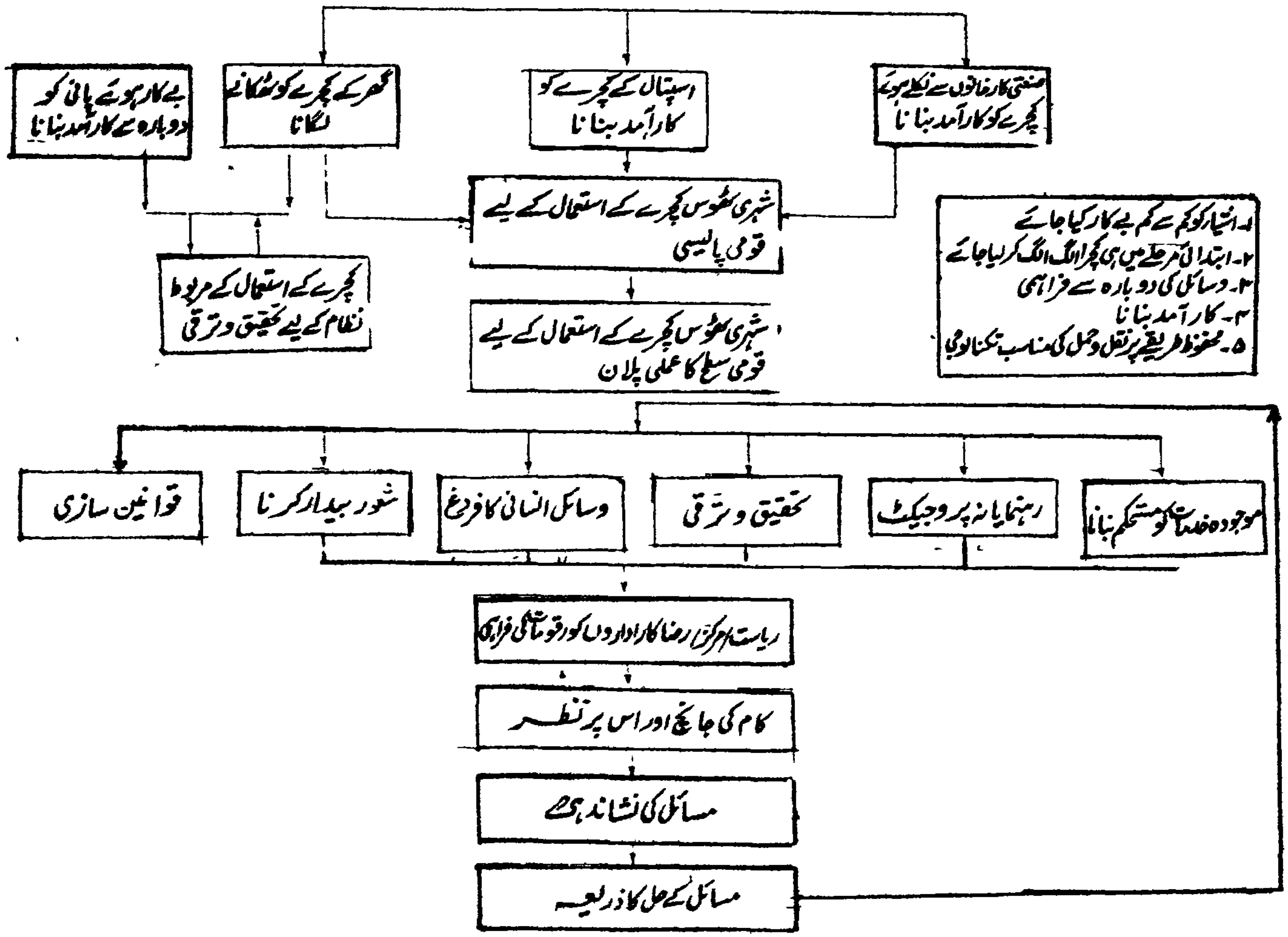
اس سلسلے میں قومی سطح پر جو عملی پلان وضع کیا جائے، اس کی خاص خاص باتیں یہ ہوں:

۱۔ ہر سطح پر سماج کے ہر طبقے کو اس بارے میں آگاہی دینا۔
۲۔ صنعتوں، اسپتالوں وغیرہ میں اس بارے میں شعور بیدار کرنا۔
۳۔ اس سلسلے کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لیے قانونی اقدامات وضع کرنا۔
۴۔ شہری ٹھوس کچرے کے بہتر نظام کے لیے انسانی وسائل کا فروغ۔
۵۔ ٹھوس کچرے کو کارآمد بنانے کے لیے تحقیقی کوششوں کا فروغ۔
۶۔ مشترکہ سیکٹر میں ایسے رہنمایانہ پروجیکٹ جس سے شہری ٹھوس کچرے کو تجربہ میں آئی ہوئی ٹکنالوجیوں کے تحت کارآمد بنایا جاسکے۔
۷۔ موجودہ خدمات کو مستحکم بنانا جن سے شہری ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔
۸۔ کوڑا کباڑ، چیتھڑے اور پلاسٹک وغیرہ چننے والوں کے کوآپریٹو ادارے قائم کرنا۔

اس سلسلے میں مختلف شعبوں کے کاموں میں تال میل قائم کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے وسائل کو متحرک بنانا ضروری ہے۔ یہ کام رقومات اور عملے کی فراہمی کے ذریعے انجام پاسکتا ہے۔ اس طرح کے آپسی تال میل سے عملی پلان کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے یہ کام ایک مشن کے طور پر انجام دیا جانا چاہیے اور مختلف شعبوں سے اسے جوڑ دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے پروگرام جڑے ہونے چاہئیں، البتہ اس انداز نظر میں مقابلہ ہر کام کرنے والی مختلف قوتوں اور اداروں کے درمیان یہ طے کرنا مشکل ہوگا کہ کس کو فوقیت دی جائے اور کس کو وافر مقدار میں مالی امداد دی جائے۔

> ہمارے شہروں میں جو ٹھوس کچرا ملتا ہے، اس کے گرمی پیدا کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے، اس میں نمی زیادہ ہے اور ایسا مادہ کم ہے جو آتش گیر کم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ تھرمل ٹکنالوجیوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔

شہری ٹھوس کچرے کا مناسب استعمال



ماخذ:- شہری ٹھوس کچرے کو ٹھکانے لگانے کے موضوع پر منصوبہ بندی کمیشن کی اعلا اختیاراتی کمیٹی کی رپورٹ

گوشوارہ نمبر ۱

شہری آبادی میں اضافہ (چند شہروں کے حوالے سے) اور حجم آبادی

	شہری آبادی (کل کا فی صد)			شہری آبادی سالانہ شرح ترقی بحساب فی صد		(دس لاکھ سے زیادہ آبادی والے شہروں میں آبادی کا تناسب		سب سے بڑے شہری آبادی شہری آبادی کا تناسب بحساب فی صد	بڑا شہر جہاں آبادی کا دباؤ سب سے زیادہ ہے
	۱۹۶۰ء	۱۹۹۱ء	۲۰۰۰ء	۱۹۶۰-۹۱ء	۱۹۹۱-۲۰۰۰ء	۱۹۹۰ء	۱۹۸۰ء		
ہانگ کانگ	۸۹	۹۴	۹۶	۲٫۴	۱	۱۰۰	۱۰۰	ہانگ کانگ	۵۰۴۸
سنگاپور	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱٫۷	۱	۱۰۰	۱۰۰	سنگاپور	۴۱۶۰
تھائی لینڈ	۱۳	۲۳	۲۹	۴٫۶	۴	۵۷	–	بنکاک	۳۴۸۶
چین	۱۹	۳۳	۴۷	۳٫۸	۴٫۹	۲۷	۶	بیجنگ	۴۰۳۹
مصر	۳۸	۴۷	۵۴	۳٫۱	۳٫۶	۵۲	۳۹	قاہرہ	۲۹۳۹۳
پاکستان	۲۲	۳۲	۳۸	۴٫۳	۴٫۶	۴۲	۲۱	کراچی	۳۹۹۰
ہندوستان	۱۸	۲۷	۳۲	۳٫۶	۳٫۹	۳۲	۶	کلکتہ	۸۸۱۳۵
بنگلہ دیش	۵	۱۶	۲۳	۶٫۸	۶٫۲	۴۷	۳۰	ڈھاکہ	۹۹۳۰
جاپان	۶۳	۷۷	۷۸	۱٫۶	۰٫۵	۳۶		ٹوکیو	۱۳۹۷۳
امریکہ	۷۰	۷۵	۷۷	۱٫۳	۰٫۹	۴۸		نیویارک	۸۷۲۲

ماخذ:۔ انسانی وسائل کے فروغ کی رپورٹ ۱۹۹۳ء

گوشوارہ نمبر ۲

کچھ سرکل ملکوں کے شہروں میں شرح اموات، محفوظ پانی اور صفائی

ملک	۵ برس کے تحت شرح اموات		آئی۔ ایم۔ آر		کل آبادی	شہر آبادی جسے محفوظ پانی دستیاب ہے	شہری حفظان صحت	او۔آر۔ٹی کا استعمال	٪ شہر کاری شدہ آبادی
	۱۹۶۰ء	۱۹۹۲ء	۱۹۶۰ء	۱۹۹۲ء	۱۹۹۲ء				
بھوٹان	۳۲۴	۲۰۱	۲۰۳	۱۳۱	۱٫۶	۶۰	۵۰	۸۵	۶
پاکستان	۲۲۱	۱۳۷	۳۷	۹۵	۱۲۴٫۸	۸۰	۵۵	۳۴	۳۳
نیپال	۲۷۹	۱۲۸	۱۸۶	۹۰	۲۰٫۶	۶۷	۵۲	۱۴	۱۲
بنگلہ دیش	۲۴۷	۱۲۷	۱۵۱	۹۷	۱۱۹٫۳	۸۲	۶۳	۲۴	۱۸
ہندوستان	۲۳۶	۱۲۴	۱۴۴	۸۳	۸۷۹٫۵	۸۷	۵۳	۳۷	۲۶
میانمار	۲۳۷	۱۱۳	۱۵۸	۸۳	۴۳٫۷	۳۷	۳۹	۱۹	۲۵
ملیشیا	۱۰۵	۱۹	۷۳	۱۴	۱۸٫۸	۹۶	۹۶	۴۷	۴۵
امریکہ	۳۰	۱۰	۲۰	۹	۲۵۵٫۲	–	–	–	۷۶
برطانیہ	۲۷	۹	۲۳	۷	۵۷٫۵	–	–	–	۸۹
جاپان	۴۰	۶	۳۱	۴	۱۲۴٫۵	۱۰۰	۸۵	–	۷۷

ماخذ:۔ اسٹیٹ آف ورلڈ چلڈرن یونیسیف ۱۹۹۴ء

سی۔ پی۔ او برائے

متواتر شجرکاری تسلسل کے ساتھ ترقی کی کنجی

جنگلات کی کمی سے ملک کی معیشت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ جنگل بانی کے لیے سرکاری رقومات کی فراہمی میں بتدریج کمی آ رہی ہے۔ جنگلات سے متعلق پروجیکٹوں کے لیے بھی سرکاری رقومات کم سے کم ہوتی جا رہی ہیں۔ جنگلات کی بحالی اور ان کے تحفظ کے کام میں سماج کو زیادہ سے زیادہ لگانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جنگلات سے بالآخر سماج کے فائدے وابستہ ہیں۔ مصنف کے خیال میں ملک کی ہریالی کی بحالی کے لیے سماج کو کلیدی رول نبھانا ہے۔

ترقی پذیر ملکوں میں جنگلات معاشی بحالی کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ توانائی، تعمیر مکانات، چارہ اور عمارتی لکڑی وغیرہ کے سلسلے میں ملک کی کثیر آبادی یعنی تقریباً تین چوتھائی آبادی جنگلات پر انحصار رکھتی ہے۔ جنگلاتی پیداوار کی مانگ میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے، ادھر بڑھتی ہوئی آبادی زمین کی خریداری کے لیے ہر وقت کوشاں نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ غریبی، یہ وہ اسباب ہیں جن کے باعث جنگلاتی دولت میں کمی آتی ہے۔

ملک میں قدرتی جنگلات مسلسل روبہ زوال ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ جنگلاتی پیداوار کو ان کے تناسب سے زیادہ حاصل کرنے پر زور ہے۔ عمارتی لکڑی کی مانگ، چراگاہیں، جنگلاتی زمین کو کھیتی باڑی کے لیے کام میں لانا، یہ وہ ضرورتیں ہیں جن کے باعث جنگلات کاٹے جا رہے ہیں۔ متعدد ریاستوں میں مختلف اسباب کی بنا پر غیر جنگلاتی اراضی میں شجرکاری کے پروگرام خاطر خواہ پیمانے پر آگے نہیں بڑھائے جا سکے۔

زرعی اراضی میں جنگلات اُگانے کے پروگرام کے تحت سرکار کی شجرکاری کی کوششیں اور نجی زمینوں پر درخت لگانے کی کوششیں بھی خاطر خواہ اپنا اثر نہیں دکھا سکی ہیں کیوں کہ اس طرح کے پروگراموں کے لیے ترغیب عمل کی خاطر جو رعایتیں دی جاتی ہیں، وہ عوام کی امیدوں سے بہت کم ہیں۔

ترقی پذیر ملکوں میں جنگلات معاشی بحالی کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ توانائی، تعمیر مکانات، چارہ اور عمارتی لکڑی وغیرہ کے سلسلے میں ملک کی کثیر آبادی یعنی تقریباً تین چوتھائی آبادی جنگلات پر انحصار رکھتی ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ جنگلاتی دولت سے فائدہ اٹھانے والے عوام یہ نہ جانتے ہوں کہ جنگلاتی وسائل میں کمی آتی جا رہی ہے اور اس کا خمیازہ انھیں بھگتنا ہوگا۔ اس مسئلے پر مختلف آرا سامنے آتی ہیں۔ البتہ آبادی کا بڑا حصہ جنگلاتی دولت سے محرومی کے مضر نتائج سے باخبر ہے، ان کو صرف اس بات سے دلچسپی ہے کہ ان کی فوری ضرورتیں پوری ہو سکیں وہ ان وسائل کی تسلسل کے ساتھ برقراری سے کچھ دلچسپی نہیں رکھتے۔ یہ بات محسوس کر لی گئی کہ ایسی صورت حال میں جب کہ زندگی کے لیے جنگلات کی اہمیت ہے، جنگلات کا معیار اور ان کی بقا کا انحصار درج ذیل باتوں پر ہے۔

1۔ ایسی اراضی پر جہاں کہ جنگلات میں کمی آئی ہو، بھرپور انداز پر جنگل بانی کی جائے، غیر جنگلاتی اراضی بشمول اس اراضی پر جس پر مختلف طرح کی شجرکاری کے پروگرام چلائے جا رہے ہوں، تسلسل کے ساتھ شجرکاری کی جائے،

2۔ جنگلاتی وسائل کا دانشمندانہ استعمال،

عوامی تعاون کا حصول اور جنگلات کا بہتر نظم ونسق اور ان کا فروغ۔

موجودہ جنگلاتی منظر نامہ

ملک میں ریکارڈ کے مطابق جنگلاتی رقبہ ۷ کروڑ ۶۵ لاکھ ہیکٹیئر اراضی ہے جو ملک کے کل رقبے کا تقریباً ۲۳ فی صد ہے۔ اس میں سے ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی یعنی کل رقبے کے ۱۹٫۵ فی صد رقبے پر درخت اُگے ہوتے ہیں۔ اس میں سے ۳ کروڑ ۸۶ لاکھ ہیکٹیئر اراضی پر اچھی جنگلاتی پیداوار ہے۔ کچھ جنگلاتی رقبہ عملاً خالی پڑا ہے، اس میں جھاڑ جھنکار بھی نہیں، ۱۹۹۵ء کی جنگلاتی رپورٹ کے مطابق ملک میں ۵۰۷ مربع کلو میٹر رقبے پر ۱۹۹۳ء کے مقابلے میں جنگلات میں کمی آتی جارہی ہے۔ گھنے جنگلات کے رقبے میں بھی کمی آرہی ہے۔ یہ صورت حال روز بروز ابتر ہوتی جارہی ہے۔ مختلف قوانین کے تحت جنگل بانی کے پروگرام شروع کیے گئے اور ان کی حفاظت کی گئی جس کے نتیجے میں ملک میں درختوں سے ڈھکی اراضی ۱۹۸۷ء کے بعد سے ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ہیکٹیئر ہوگئی ہے۔

۱۹۸۷ء کے بعد سے ایک سال چھوڑ کر دوسرے سال میں جنگلاتی دولت کے لگائے گئے اندازے فارسٹ سروے آف انڈیا کے مطالعے کی روشنی میں درج ذیل ہیں۔

نمبر شمار	سال جس کا اندازہ لگایا گیا	جنگلات سے ڈھکا رقبہ (مربع کلو میٹر میں)			میزان
		گھنے جنگلات	رقبہ جن پر گھناپن کم ہوا	رنگ سازے کے کام کے درخت	
۱۔	۱۹۸۷ء	۳۵۷۶۸۶	۲۷۶۵۸۳	۴۰۴۶	۶۴۲۰۴۱
۲۔	۱۹۸۹ء	۳۷۸۴۷۰	۲۵۷۴۰۹	۴۲۵۵	۶۴۰۱۳۴
۳۔	۱۹۹۱ء	۳۸۵۶۱۰	۲۵۰۴۸۲	۴۲۲۲	۶۴۰۶۹۴
۴۔	۱۹۹۳ء	۳۸۵۵۷۶	۲۳۰۲۷۵	۴۲۵۶	۶۴۰۱۰۷
۵۔	۱۹۹۵ء	۳۸۵۷۵۶	۲۴۹۳۱۱	۴۵۳۳	۶۳۹۶۰۰

طلب اور رسد کی صورت حال

ہندوستان میں ۴٫۷۴ بلین ایم ۳ کا بڑھتا ہوا اسٹاک ہے۔ اس میں ہر سال ۸۷٫۶۲ ملین ایم ۳ کا اضافہ ہوجاتا ہے بلکہ قومی پارکوں، جنگلی جانوروں کی حفاظت گاہوں، حیاتیاتی تحفظی مقامات وغیرہ کے لیے ایک کروڑ ہیکٹیئر اراضی ہے مگر اس اراضی سے تجارتی مفادات کے تحت کوئی چیز حاصل نہیں کی جاتی۔ سرکاری طور پر ایندھنی لکڑی کا ۴۰ ملین ایم ۳۔ اور عمارتی لکڑی کا ۱۲ ملین ایم ۳ حاصل کیا جاتا ہے مگر موجودہ حقوق کے تحت غیر ریکارڈ شدہ لکڑی وغیرہ جو مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت عمارتی لکڑی کی مانگ تقریباً ۳ کروڑ ایم ۳ ہے۔ اس میں ۸۳ لاکھ ایم ۳ کاغذ، لگدی اور پینل مصنوعات کے لیے درکار ہوتی ہے اور ایک کروڑ ۵۴ لاکھ ایم ۳۔ آرا مشینوں کے لیے درکار ہوتی ہے جو مکانات فرنیچر وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں تقریباً ۶۰ کروڑ امریکی ڈالر کے بقدر لکڑی اور لکڑی کا سامان باہر ملکوں سے منگایا گیا تھا۔ ۲۰۱۰ء تک عمارتی لکڑی کی مانگ بڑھ کر ۶ کروڑ ایم ۳ تک پہنچ جائے گی (اس میں ۲ کروڑ ۵ لاکھ ایم ۳ کاغذ، لگدی اور پینل مصنوعات کے لیے ہوگی جب کہ ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ایم ۳۔ آرا مشینوں کے لیے درکار ہوگی۔ اس وقت ملک کو ۲۸ کروڑ ٹن لکڑی ایندھن کے لیے درکار ہے: ۲۰۰۱ء تک یہ مانگ بڑھ کر ۳۵ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح مانگ بڑھتی رہے گی اور رسد اس کے تناسب سے نہیں ہو پائے گی۔

جنگلات سے متعلق قومی پالیسی

جنگلات کی قومی پالیسی ۱۹۸۸ء کا خاص مقصد یہ ہے کہ ماحولیاتی استحکام کو یقینی بنایا جائے اور جنگلات کی بحالی اور تحفظ کے ذریعے سے علم معیشت حیوانات کا توازن برقرار رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ دیہی آبادی اور قبائلی آبادی کی ایندھن، چارہ، جنگلات کی چھوٹی موٹی پیداوار اور عمارتی لکڑی کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کی جاسکیں، اس پالیسی کے تحت ملک میں مجموعی خشک رقبے کا ایک تہائی حصہ جنگلات سے ڈھکا ہونا چاہیے۔ پہاڑی علاقوں میں تقریباً دو تہائی حصہ پر درخت ہونے چاہئیں تاکہ مٹی کے کٹاؤ کو روکا جاسکے اور زمین کو خراب ہونے سے بچایا جاسکے اور نرم و نازک معاشیاتی نظام کو مستحکم رکھا جاسکے۔ اس مقصد کے تحت ضرورتوں کو سامنے رکھ کر شجر کاری ایک ایسا بڑا پروگرام شروع کیا جاتا ہے جو وقت مقررہ کے اندر اندر پورا ہوسکے۔ یہ شجر کاری خراب زمینوں، بے کار پڑی اراضی، اجتماعی اراضی، زرعی اراضی وغیرہ پر کی جائے گی۔ اس کے تحت چارہ اور ایندھن کی فراہمی پر خاص زور ہوگا۔ پالیسی کے تحت اراضی کے قوانین میں ترمیم کی جانی چاہیے تاکہ لوگوں کو شجر کاری کی طرف مائل کیا جاسکے اور چارہ فراہم کرنے والے پودوں کی پیداوار بڑھائی جاسکے۔ زمین پر گھاس اور کئی خاص قسم کے چارہ فراہم کرنے والے پودے اُگائے جاسکیں۔ جہاں تک اس کام میں عوام کے تعاون کی ضرورت کا سوال ہے، اس پالیسی میں جنگلات کے تحفظ کے کاموں میں اس کی اہمیت اور افادیت تسلیم کی گئی ہے۔ خاص طور پر عورتوں کا تعاون اس کام میں حاصل کیا جائے گا۔ اسی سلسلے میں یکم جون ۱۹۹۰ء کو ریاستوں اور مرکز

کے زیر انتظام علاقوں کو رہنما یانہ خطوط جاری کیے جا چکے ہیں۔ اس کے لیے عوامی شرکت سے چلنے والے جنگلات کے فروغ کے مشترکہ نظام کی سفارش کی گئی ہے۔ اب تک ۱۷ ریاستوں نے ایسی انتظامی قرار داد یں جاری کی ہیں جن میں اسی مشترکہ نظام کے تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد اس بیج پر ہے کہ اس میں شرکت کرنے والوں کو بھی اس سے فائدہ ہوگا۔ مقامی آبادی کو دیہی سطح کے اداروں میں منظم کرکے اور دیہی جنگلاتی کمیٹیاں تشکیل دے کر اس نظام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

ملک میں ریکارڈ کے مطابق جنگلاتی رقبہ ۷ کروڑ ۶۵ لاکھ ہیکٹیر اراضی ہے جو ملک کے کل رقبے کا تقریباً ۲۳ فی صد ہے۔

جنگلاتی دولت کے فروغ کے وسائل

ہندوستان میں انسانی آبادی بھی بہت زیادہ ہے اور پھر یہاں مویشیوں کی بھی بڑی تعداد ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے غریب عوام زیادہ تر دیہات میں بستے ہیں۔ اندازہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف طرح کی جنگلاتی مصنوعات کی مالیت ۴۰ ہزار کروڑ روپے سالانہ ہوتی ہے۔ یہ تخمینہ بازار کی قیمت پر ان تمام مصنوعات اور اشیا کا ہے جو قیمتاً فروخت ہوتی ہیں اور جو فروخت نہیں ہوتیں اس کے لیے سرمایہ کاری کی مد پر صرف ۴ ہزار کروڑ روپے صرف ہوتے ہیں گویا کہ کل حاصل شدہ اشیا اور مصنوعات کی مالیت کا صرف دس فی صد یہ رقم ملک کے منصوبہ جاتی مصارف کا صرف ایک فی صد ہوتی ہے۔ جن علاقوں میں جنگلات رو بہ زوال ہیں، وہاں ان کی بحالی کے لیے مشکل ہی سے مالی وسائل فراہم ہوتے ہیں۔ جنگلات کے فروغ کے سلسلے میں سرمایہ کاری کا بہ حیثیت مجموعی منظر نامہ یہ امید نہیں بندھا تا کہ جنگلات کی بحالی کے لیے کوئی تدریجی بہتری عمل میں آئے گی۔ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر بات یہ ہے کہ جنگلاتی دولت کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے پر زور رہے گا اور جوں جوں آبادی میں اضافہ ہوگا، اس کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جنگلاتی دولت کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوتا رہے گا۔ اس سے قبل غریبی دور کرنے کے پروگراموں کے تحت دیہی علاقوں میں سماجی شجرکاری کے لیے اچھی خاصی رقومات مختص کی گئی تھیں لیکن اب غریبی دور کرنے کی جو مختلف اسکیمیں زیر عمل ہیں، ان کے تحت اس مقصد کی نشاندہی کے ساتھ کوئی رقم نہیں رکھی گئی ہے۔ ایسی صورت میں جنگلات کی دولت سے فائدہ اٹھانے والے صارفین کا خود یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان کی مستقل بنیادوں پر ترقی کے لیے کوئی نظام سرمایہ کاری وضع کریں اور جو لوگ اس وقت اس اہم مسئلے کے تئیں بے خبر ہیں اور جو جنگلات کے مستقبل سے بے پروا ہیں، ان کو اس کی طرف توجہ دلائیں۔ جنگلات کی بحالی کے لیے ایک ایسا نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس کے تحت جنگلاتی پیداوار کی فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا نہ صرف یہ کہ قومی سطح پر اندازہ لگایا جائے بلکہ اس آمدنی کا معتد بہ حصہ جنگلات کی بحالی کے لیے نقد اور محنت ہر دو صورتوں میں لگایا جائے۔ جنگل بانی کے شعبے کے لیے یکے بعد دیگرے پنج سالہ منصوبوں میں مختص کی جانے والی رقومات اور پلان کے مجموعی مصارف کے ساتھ اس کے تناسب کا نقشہ درج ذیل ہے:-

نمبر شمار	منصوبہ	جنگلاتی شعبے کے لیے مختص کردہ رقم	مجموعی مصارف کا فی صد تناسب
۱۔	پہلا	۷۶۴	۰٫۳۹
۲۔	دوسرا	۲۱۲۱	۰٫۴۶
۳۔	تیسرا	۴۵۸۵	۰٫۵۳
۴۔	چوتھا	۸۹۴۲	۰٫۵۴
۵۔	پانچواں	۲۰۸۸۴	۰٫۵۱
۶۔	چھٹا	۶۹۲۴۹	۰٫۷۱
۷۔	ساتواں	۱۸۵۹۱۰	۱٫۰۳
۸۔	آٹھواں	۴۰۰۰۰۰۰	۱٫۰۰

جنگلاتی شعبے کے فروغ اور دیگر متعلقہ مسائل کے حل کے لیے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام اور خوراک زراعت کی عالمی تنظیم کی مدد سے جنگل بانی کے فروغ کے لیے قومی سطح پر ایک عملی پلان تیار کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ستمبر ۱۹۹۷ء تک یہ مکمل کر لیا جائے گا۔

نئی پیش قدمیاں

جنگلات کے فروغ سے متعلق قومی پالیسی بحریہ ۱۹۸۸ء کے تحت مقررہ نشانوں کو پورا کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تقریباً ۴ کروڑ ۵۵ لاکھ ہیکٹیر اراضی پر مزید جنگلات لگا دیے جائیں اور دو کروڑ ۵۰ لاکھ ہیکٹیر اراضی پر رو بہ زوال جنگلات کو نئے سرے سے جما دیا جائے۔ یہ کام اس مفروضے کے تحت انجام دیا جائے کہ جنگلات میں مزید گراوٹ نہیں آئے گی۔ جنگل بانی کی ضرورتوں کا طلب کی بنیاد پر ۱۹۸۵ء میں ایک جائزہ لیا گیا تھا۔ اس وقت یہ اندازہ ۵۰ لاکھ ہیکٹیر سالانہ تھا۔ چناں چہ بے کار پڑی اراضی کے فروغ کے

قومی بورڈ کی تشکیل کی گئی تھی تاکہ یہ نشانہ پورا کیا جاسکے۔ اس سطح پر درخت لگانے کے لیے ایک مضبوط بنیادی ڈھانچے کی ضرورت ہے جس کو سال بہ سال توسیع دی جاسکے۔ شجر کاری کی مذکورہ ضرورتوں کے مقابلے میں اس سلسلے کی موجودہ کوششیں نہ صرف بہت کم اور بہت ناکافی ہیں بلکہ ان میں بھی کمی کا رجحان ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس مد کے لیے مختص کی جا رہی رقومات پہلے کے مقابلے کم ہیں۔ پہلے پنج سالہ منصوبے سے لے کر چھٹے پنج سالہ منصوبے کے دوران ۸۲ لاکھ ہیکٹیئر اراضی پر درخت لگائے گئے۔ ساتویں منصوبے میں ۸۸ لاکھ ۸۰ ہزار ہیکٹیئر اراضی پر شجر کاری کی گئی۔ اس سلسلے میں سالانہ نشانے اور حاصل شدہ نتائج "سالانہ منصوبوں (۹۱-۱۹۹۰ء) (۹۲-۱۹۹۱ء) اور آٹھویں منصوبے کے تعلق سے درج ذیل گوشوارے میں ہیں:۔

جب کہ صنعتی مقاصد کے تحت درکار لکڑی کی بڑھتی ہوئی مانگ باقی قدرتی جنگلات کو کاٹنے پر مجبور کرے گی۔ لکڑی کے متبادل جنس اشیا کو کام میں لانے کی کوشش کی جارہی ہے مثلاً یہ کہ المونیم، پلاسٹک یا زمرد کی اشیار ان سے آلودگی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس وجہ

لکڑی فراہم کرنے والے درخت لگانے ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی جن رقبوں پر جنگلات گر رہے ہیں یا کاٹے جا رہے ہیں، ان کو بھی دوبارہ سے شجر کاری کے لیے اپنے پروگراموں میں شامل کرنا ہوگا۔ ان سے دیہات کے غریب عوام کی بقا اور بنیادی ضرورتوں کی

> جنگلات کی بحالی کے لیے ایک ایسا نظام مرتب کرنے کی ضرورت ہے جس کے تحت جنگلاتی پیداوار کی فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی کا نہ صرف یہ کہ قومی سطح پر اندازہ لگایا جائے بلکہ اس آمدنی کا معتد بہ حصہ جنگلات کی بحالی کے لیے نقد اور محنت ہر دو صورتوں میں لگایا جائے۔

سے بھی صنعتی کاموں کے لیے درکار لکڑی کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔
مالی وسائل کی کمی کے سبب اعلا کوالٹی

تکمیل وابستہ ہے، جنگلاتی رقبوں میں انسانی آبادی کا نفوذ اور مویشیوں کی دراندازی یہ دو ایسے اسباب ہیں جو ان کی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ رو بہ زوال جنگلاتی رقبوں میں جنگلات کی بحالی کے لیے عوامی اشتراک عمل کی پالیسی اپنائی گئی۔ جنگلات کے مشترکہ نظم و نسق کے پالیسی ڈھانچے کے مطابق مقامی آبادی کے تعاون سے ایسے رقبوں میں شجر کاری کے پروگرام شروع کیے گئے ہیں جہاں درخت کم ہوتے جا رہے ہیں۔

جنگلات کے نظم و نسق کا مشترکہ نظام

اس سلسلے کی پالیسی سے متعلق راہبر خطوط میں کہا گیا ہے کہ جنگلاتی پیداوار میں ایندھن کی لکڑی، چارہ، غیر عمارتی جنگلاتی پیداوار اور عمارتی لکڑی کی پیداوار اولین ذمہ داری ہے۔ پالیسی سے متعلق اس دستاویز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگلاتی دولت پیدا کرنے والے افراد کو جنگلات کے تحفظ کے کاموں سے وابستہ کرنے کے لیے ترغیب عمل دی جائے اور ان کو جنگلات کی افادیت اور اس کے بے پناہ فائدوں سے روشناس کرایا جائے، البتہ مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے لوگوں کی صلاحیت سے استفادہ کے لیے کیا ذرائع اور طریقے استعمال کیے جائیں جس سے کہ جنگلات کی صورت حال بہتر ہوسکے۔

مدت	شجر کاری کا نشانہ (ملین ہیکٹیئر اراضی)	نتائج (ملین ہیکٹیئر اراضی)
۱۹۹۰-۹۱ء	۱٫۸۰	۱٫۳۹
۱۹۹۱-۹۲ء	۱٫۸۰	۱٫۷۳
۱۹۹۲-۹۳ء	۱٫۷۹	۱٫۶۸
۱۹۹۳-۹۴ء	۱٫۸۴	۱٫۵۲
۱۹۹۴-۹۵ء	۱٫۹۵	۱٫۵۲
۱۹۹۵-۹۶ء	۱٫۶۹	۱٫۵۲
۱۹۹۶-۹۷ء	۱٫۶۹	

ظاہر ہے کہ موجودہ ضرورتیں اور بڑھتی ہوئی مانگ موجودہ شرح ترقی سے پوری نہیں ہوسکتی۔ جس پیمانے پر شجر کاری کی جارہی ہے اس سے بھی یہ ضرورتیں پوری نہیں کی جاسکتیں۔ شجر کاری زیادہ تر سرکاری خرچے پر ہو رہی ہے۔ جن علاقوں میں جنگلات رو بہ زوال ہیں، وہاں صرف دس لاکھ ہیکٹیئر اراضی سالانہ پر درخت لگائے جاسکے ہیں۔ نجی اراضی اور غیر جنگلاتی زمینوں پر ۴ تا ۵ لاکھ ہیکٹیئر اراضی پر درخت لگائے گئے ہیں، اس سے تو تسلسل کے ساتھ ملک کی ایندھن کی ضرورت بھی پوری نہیں ہوگی

کے درختوں کو لگانے میں دشواری آتی ہے۔ سرکاری اخراجات سے ایندھنی لکڑی فراہم کرنے والے درخت لگانے اور چھوٹی موٹی عمارتی لکڑی یا چارے کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ مقامی آبادی اور قبائلی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے جنگلات پر ہی انحصار رکھتے ہیں۔ ان اشیار کی مانگ اور رسد میں فرق کو کم کرنے کے لیے سرکار کو تقریباً ۳۰ لاکھ ہیکٹیئر سالانہ کے حساب سے ایندھن کی لکڑی، چارہ اور عمارتی

ہندوستان کے مختلف حصوں میں سماجی اور اقتصادی حالات اس قدر مختلف ہیں کہ ملک کے سبھی لوگوں کے لیے کسی ایک یکساں پالیسی کا وضع کرنا ناممکن ہے۔ بھارت سرکار نے یکم جون ۱۹۹۰ء کے رہبرانہ خطوط کی روشنی میں ریاستوں پر یہ کام چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ عوام کو اس کام میں شریک کرنے کے لیے مناسب طریقِ کار وضع کریں۔ ہر جگہ کے اپنے مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ بہت سی ریاستوں میں جنگلات کے فروغ کے مشترکہ نظام بہت سی ریاستوں میں ایک ادارہ جاتی نظام کے طور پر شروع کیا جا چکا ہے۔ جنگلات کے فروغ کے لیے دیہی کمیٹیاں تشکیل دیے جانے پر زور رہے۔ یہ کمیٹیاں ایسے علاقوں میں کام کریں گی جہاں جنگلات کم ہوتے جا رہے ہیں، اس کام میں شریک لوگوں کو جنگلاتی اراضی کی ملکیت دیے بغیر صرف ان کو برابر کا شریک مانا گیا ہے۔ یہ لوگ گھاس، درختوں کی پتیوں، ٹوٹی ہوئی شاخوں اور چھوٹی موٹی پیداوار سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فصل پک جانے سے ہونے والی آمدنی میں بھی ان کا حصہ ہوگا۔ مختلف ریاستوں میں جن لوگوں کو اس منافع میں شریک کیا گیا ہے، وہ ۲۵ فی صد سے لے کر سو فی صد تک ہے۔ اب تک ۱۷ ریاستوں میں جنگلات کے فروغ سے متعلق دیہی کمیٹیوں کی تشکیل کے لیے قرارداد یا نوٹیفکیشن جاری کیا جا چکا ہے۔ اندازہ ہے کہ دیہات میں جنگلات کے فروغ کے کام سے تقریباً ۱۵ ہزار کمیٹیاں وابستہ ہیں جو اب تک تقریباً ۱۴ لاکھ ہیکٹیر اس اراضی پر جنگلات کی بحالی کا کام کر رہی ہیں، جہاں درخت گرائے جا چکے ہیں۔

مستقل بنیادوں پر جنگلات کے نظام سے مراد یہ ہے کہ جنگلات کے تحفظ اور فروغ کے لیے ہمہ گیر پروگرام شروع کیے جائیں۔ قدرتی وسائل کا تحفظ اور ان کا فروغ ضروری ہے اور یہ سماج کی ترقی کے لیے بے حد اہم ہے کیوں کہ عوامی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے جو ریاست اور عوام دونوں کے اشتراکِ عمل سے ہی طے پا سکتا ہے۔ جنگل بانی کے کام کو بتدریج آگے بڑھانے کے لیے بہت سی ایسی صنعتوں کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے جو لکڑی پر منحصر ہیں، اس سلسلے میں رضاکار اداروں کا بھی تعاون حاصل ہے اور وہ ہندوستان کو ہرا بھرا بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، اس طرح کے بامقصد اداروں کے آپسی تال میل سے ہندوستان کی جنگلاتی دولت فروغ پا سکتی ہے اور انھیں کوششوں سے ہندوستان کی ہریالی کی عظیم الشان حالت دوبارہ سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ ●

> مالی وسائل کی کمی کے سبب اعلا کوالٹی کے درختوں کو لگانے میں دشواری آتی ہے۔ سرکاری اخراجات سے ایندھن، لکڑی فراہم کرنے والے درخت لگانے اور چھوٹی موٹی عمارتی لکڑی یا چارے کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ مقامی آبادی اور قبائلی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے جنگلات پر ہی انحصار رکھتے ہیں۔

بقیہ: مدر ٹریسا

عطا کی۔ اس کے لیے کسی خاص رنگ، نسل اور جنس کا ہونا ضروری نہیں بلکہ دل میں سچی لگن، محنت اور لگاتار کوشش، بے پناہ جذبے کے ساتھ ایک ایسا سینہ چاہیے جو بیم و ریا سے پاک ہو۔ ان کی بلند ہمتی کے سامنے دنیا کی ساری دیواریں گر جاتی ہیں ـــــ رنگ و نسل کی دیوار ہو، یا جغرافیائی علاقوں کی دیوار۔ ان کے منہ سے نکلے کبھی بھی نہ مٹنے والے اس لازوال جملے کا لفظ لفظ ان کی اعلا ظرفی کا ثبوت ہے:۔

"میرے لیے جغرافیہ اور زبان کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ساری دنیا میرے بچوں کی طرح کی ہے۔ میری زندگی ان کی خدمت کے لیے ہے۔" ●

بقیہ: دُم دار ستارے - روایت اور حقیقت

کے مطابق کوئیپر بیلٹ میں ۱۰۰ کلو میٹر سے بڑی جسامت کے کم از کم ۳۵۰۰۰ تودے ہیں۔

ادھر واشنگٹن کے خط تاریخ سے نیو میکسیکو دارالتجربہ کے ایک اہل کار کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اگر ایک کلو میٹر قطر کے کسی دُم دار ستارے سے زمین کی ٹکر ہو جائے تو اس سے جو توانائی پیدا ہوگی وہ ہیروشیما پر گرائے گئے جوہری بم (۶ اگست ۱۹۴۵ء) سے پیدا شدہ توانائی سے ۱۵ لاکھ گنا زیادہ ہوگی۔ اس ٹکر سے جو لہریں پیدا ہوں گی وہ نیویارک ٹریڈ سینٹر (۴۲۰ میٹر) جتنی اونچی ہوں گی اور یہ سمندر کے دونوں کناروں تک پہنچ جائیں گی۔ بحرِ اٹلانٹک سے نکل کر پانی سارے فلوریڈا کو ڈھک لے گا۔ اس سے جو بھاپ پیدا ہوگی وہ برفیلے بادلوں کو جنم دے گی اور اس سے برسہا برس تک آفتاب کی شعاؤں کا گزر نیچے نہیں ہو سکے گا۔

۱۹۸۰ء میں "سائنس" میگزین میں شائع شدہ ایک خبر کے بموجب ۱۰ کلو میٹر قطر کا ایک دُم دار ستارہ زمین سے ۶۵ میلین سال پہلے ٹکرایا تھا۔

دُم دار ستاروں کا ہیبت ناک وجود خدائے بزرگ و برتر کی بے پناہ عظمت کی توثیق ہی تو ہے! خالقِ کائنات و مالکِ دو جہاں نے چیونٹی بھی بنائی اور ہاتھی بھی بنایا، گلہری بھی بنائی اور پہاڑ بھی بنایا۔ اب تک معلوم دُم دار ستاروں میں سب سے کم عرصہ (۳٫۳ سال) میں ظاہر ہونے والے ان کے دُم دار ستارہ (ENCKEYS COMET) بھی بنایا اور ۴ ہزار سال کے وقفے پر نمودار ہونے والا ہیل بوپ دُم دار ستارہ بھی بنایا۔

ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن

بھوک سے آزاد ہندوستان کی جانب

مہاتما گاندھی نے کہا تھا "بھوکے کے لیے روٹی بھگوان ہے"۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ملک کے ہر گھر سے بھوک کی لعنت کا خاتمہ ہوگیا ہے؟

ہندوستان قدرتی وسائل اور حیاتیاتی نیز ثقافتی تنوع سے مالا مال ہے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ نیرنگی لطفِ حیات ہے۔ اس کے برعکس ناانصافی زہرِ حیات ہے۔ یو۔ این۔ ڈی۔ پی کی فروغ انسانی کی رپورٹ ۱۹۹۶ء نے مندرجہ ذیل اعداد و شمار کی روشنی میں جاری اقتصادی ناانصافی کی نشاندہی کی ہے۔

★ آج دنیا کے بیشتر ممالک دس سال کے بہ نسبت اقتصادی طور پر زیادہ بدحال ہیں۔ خوش حال ملکوں کے مابین کنیڈا، فن لینڈ اور آئی لینڈ آج ۱۹۸۰ء کے مقابلے میں زیادہ بدحال ہیں۔ ۷۰ ترقی پذیر ملکوں میں آمدنی کی سطح ۱۹۶۰ء یا ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ علاوہ ازیں نہ صرف جنگ سے بدحال ہیتی، لائبیریا، نکاراگوا، روانڈا اور سوڈان بلکہ گھانا اور وینی زویلا جیسے ۱۹ ملکوں میں ۱۹۶۰ء اور اس سے قبل کے مقابلے میں آج فی کس آمدنی کم ہوگئی ہے۔

★ ۸۵-۱۹۷۵ء کے دوران عالمی مجموعی قومی پیداوار میں ۴۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے لیکن اس اضافے سے صرف چند ملکوں کو فائدہ حاصل ہوا ہے۔ دوسری جانب دنیا میں غریبوں کی تعداد ۱۷ فی صد بڑھ گئی ہے۔

★ امیر، امیر ترین ہوگئے۔ آج دنیا کے ۳۵۸ ارب پتیوں کا مجموعی سرمایہ عالمی آبادی کے ۴۵ فی صد عوام پر مشتمل ملکوں کی مجموعی سالانہ آمدنی کے برابر ہے۔

ہمارا ملک بھی ایسی شدید نابرابری کا شکار ہے۔ ایسی صورت حال میں جب امیر اور زیادہ امیر ہو رہے ہوں اور غریب سطح غربت سے اور نیچے جا رہے ہوں، ہم بھوک سے آزاد ہندوستان کے نصب العین تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ اس چیلنج کو ہنگر پروجیکٹ انڈیا نے قبول کر لیا ہے اور زیرِ نظر مضمون میں اسی پروجیکٹ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خوراک اور غذا کا قومی تحفظ

کفالت خوراک کے لیے قومی پالیسی کو اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ:

(الف) صحت مند اور بارآور زندگی کے لیے متوازن غذا، صاف ستھرے پانی، صحت کی بنیادی نگہداشت اور تعلیم تک ہر فرد کی جسمانی، معاشی اور ماحولیاتی رسائی ہو۔

(ب) خوراک ان موثر اور ماحولیات پسند تکنالوجیوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے جو زمینی اور سمندری ماہی گیری، بندوبست جنگلات، زراعت اور جانوروں کی پرورش و پرداخت کے فطری وسائل کو محفوظ رکھتی ہیں نیز اس میں اضافہ کا سبب ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا مقاصد کی اہم عملی دشواریاں مندرجہ ذیل ہیں:

اولاً یہ کہ خوراک تک متواتر جسمانی رسائی کے لیے کیمیاوی اور مشینری پیداواری عمل سے ماحولیاتی زرعی تکنالوجیوں کی جانب منتقلی لازمی ہوگی۔ دوئم یہ کہ معاشی رسائی پر اصرار آمدنی کے گوناگوں مواقع کے ذریعہ یا ذریعہ معاش کے فروغ کی ضرورت کو بڑھا دیتا ہے۔ سوئم یہ کہ ماحولیاتی رسائی اگر ایک جانب مٹی کی نگہداشت، پانی کی ذخیرہ اندوزی اور بندوبست، جنگلات کے تحفظ اور بایوڈائیورسٹی کی جانب توجہ مبذول کراتی ہے تو دوسری جانب امور صحت، ماحولیاتی حفظانِ صحت، صحت کی بنیادی نگہداشت اور بنیادی تعلیم کا احاطہ کرتی ہے۔

اگر اس مشن کے نفاذ میں سیاسی بصیرت سے کام لیا گیا تو اضافۂ آبادی پر روک تھام نسبتاً آسان ہوگی اور ۱۹۷۵ء میں دی گئی مارٹس ڈی کنڈوسٹ کی وہ پیش گوئی حقیقت کا جامہ پہن لے گی جس میں اس نے کہا تھا کہ اگر بچے محض وجود کے لیے نہیں بلکہ خوش حالی کے لیے پیدا ہوں تو اضافۂ آبادی خود بخود تھم جائے گا۔

فرد پر توجہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ خاندان ایک ہی قسم اور نوع

کے افراد پر مشتمل نہیں ہوتا۔ مردوں اور لڑکوں کے مقابلے میں عورتیں اور لڑکیاں کم خوراکی کی زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ یو۔ این۔ ڈی۔ پی کی ۱۹۹۵ء کی فروغ انسانی رپورٹ میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی مفلسی و ناداری کے تشویشناک اعداد وشمار دیے گئے ہیں۔ کفالت خوراک کے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے پیش نظر ہمیں بھوک سے آزاد علاقہ۔ پروگرام HUNGER FREE AREA PROGRAMME (HFAP) کی شروعات درج ذیل خطوط پر کرنی چاہیے۔

(الف) مناسب خدمات کے پیکج اور عوامی پالیسیوں کے تعاون کے ساتھ ماحولیاتی تکنالوجیوں کی ترقی اور ترویج کے ذریعہ خوراک کی پیداوار کو اضافے آبادی پر غالب رکھتے ہوئے خوراک کی متواتر فراہمی کو یقینی بنانا۔ ماحولیاتی تکنالوجی ماضی کی ماحولیاتی دانش وبینش اور تکنالوجی کو جدید ترین تکنالوجیوں بالخصوص بائیوتکنالوجی، خلائی تکنالوجی، تجدید پذیر توانائی تکنالوجی اور مینجمنٹ تکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ماحولیاتی تکنالوجی کے تعاون کے بغیر زراعت سے وابستہ افراد ماحولیاتی دیرپا بنیاد پر کم زمین، پانی اور توانائی وسائل استعمال کے ساتھ زیادہ اناج اور دیگر زرعی اشیاء نہیں پیدا کرسکیں گے۔

(ب) فصلوں اور جانوروں کی پیداوار میں متواتر اضافہ کے لیے ضروری ماحولیاتی اساس کے تحفظ اور اصلاح کے ذریعہ قدرتی وسائل کے سرچشموں کی زرخیزی کو بنائے رکھنا۔

(ج) حوصلہ افزا سماجی تحفظ مثلاً املاک کے تخمینے، ملازمت اور تنظیمی اور مارکیٹنگ اختیارات سونپنے کے ذریعہ خانگی آمدنی کو ضروریات کی تکمیل کے قابل بنائے رکھنا۔ زرعی پروگراموں کا مقصد بیک وقت زیادہ خوراک، زیادہ روزگار اور زیادہ آمدنی ہونا چاہیے۔ آمدنی میں اضافے اور دیہی زندگی کے تحفظ کے لیے زرعی اور غیر زرعی روزگار پر پوری توجہ اور بنیادی زرعی اشیاء کی قدر میں اضافہ ضروری ہوگا۔

(د) سماجی تحفظ کے اقدامات مثلاً روزگار کی ضمانت اور غذائی پروگراموں کے لیے خوراک کے ذریعہ کمزور اور غیر محفوظ طبقوں کو غذا کی فراہمی کو یقینی بنانا۔

(ہ) مندرجہ ذیل امور پر خاص توجہ دینے کے پیش نظر قومی ترقیاتی کونسل کے ساتھ ساتھ ایک قومی کفالت ایکٹ برائے خوراک ومعاش کو متعارف کرانا:

۱۔ اراضی، پانی، جنگلات، بایوڈائیورسٹی کی حفاظت اور فضائی تحفظ۔

۲۔ ماحولیاتی تکنالوجیوں کے ذریعے زرخیزی میں اضافہ۔

۳۔ سبکری کی بیخ کنی کے لیے تقسیم کے نظام کی اصلاح۔

۴۔ کافی غذائی کفالت کے سرچشموں کی نگہداشت۔

۵۔ بہتر مابعد فصل تکنالوجی کے لیے تکنیکی بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانا اور صحت وصفائی سے متعلق اقدامات میں توسیع کرنا اور

۶۔ بین اقوامی بازار میں روز افزوں مواقع کا فائدہ اٹھانے کے لیے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے بھی کہ عوامی فائدوں میں اضافے کے لیے جاری تحقیقات کو مناسب عوامی تعاون حاصل ہو رہا ہے یا نہیں، موثر تحقیقات، تعلیم، توسیع، مارکیٹنگ سسٹم کو بروئے کار لانا۔

عوامی فلاح وبہبود کے لیے تحقیقات کا فروغ

سال ۱۹۹۶ء میں عالمی زرعی تحقیقات کے میدان میں ٹریڈ۔ رلیٹڈ انٹلکچول پراپرٹی رائٹس (TRIPS) کی آمد سے ایک نئے عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔ انٹلکچول پراپرٹی رائٹس (IPR) کے تیزی سے پھیلتے ہوئے ماحول میں ہم عوامی فلاح وبہبود کے لیے تحقیقات کو کس طرح فروغ دیں؟ ایسے حالات میں یہ مشورہ دوں گا کہ زرعی میدان میں عوامی بہبود کے فروغ کے لیے مخصوص تحقیقات کے لیے کم از کم ۱۰۰ کروڑ روپیوں کے بنیادی مصارف سے حکومت ہند ایک قومی ٹرسٹ فنڈ برائے ماحولیاتی تکنالوجی قائم کرے۔

بھوک سے آزاد۔ علاقہ پروگرام (HFAP)

اس پروگرام کے چند اہم نکات حسب ذیل ہیں:

(۱) شدید کم غذائیت اور ناقص غذائیت کے بنیادی اسباب کی شناخت کرنا۔

(۲) بھوک کے خاتمہ کے لیے مہیا مواقع اور جاری پروگراموں کے بارے میں معلومات میں تطابق کرنا۔

(۳) بھوک کے خاتمہ کی مہم میں او جھل عناصر کو روبہ کار لانے کے لیے کوششیں کرنا۔

(۴) نویں پنجسالہ منصوبے کے خاتمہ تک سبکری کے انسداد کے مقصد کے حصول کے لیے مقامی سطح کے سماجی عزم وسرگرمی کو مہمیز دینا اور ماس میڈیا کا تعاون حاصل کرنا۔

(۵) (الف) مطلوبہ مالی ذرائع، (ب) صنعتیاتی مختاری کے لیے لازم صنعتی وسائل اور (ج) مطلوبہ انتظامی اور تنظیمی وسائل کے امکانات کا جائزہ لینا۔

(۶) ہر HFAP علاقے میں بھوک کے خاتمہ کے لیے (۱) منتخب عوامی نمائندوں، (۲) سرکاری ایجنسیوں، (۳) مدنی سوسائٹی: ۔۔۔ غیر سرکاری تنظیموں، رضاکار ایجنسیوں، فلاحی تنظیموں مثلاً روٹری کلب، لائنز کلب وغیرہ، (۴) حلقہ دانشوران: تحقیقی اور

اور تربیتی اداروں اور یونیورسٹیوں، (۵) کارپوریٹ سیکٹروں، (۶) مالی اداروں اور (۷) ماس میڈیا کے اشتراک کی عملی کوشش کرنا۔

یہی اشتراک بڑے انسداد بھکمری کے HFAP کی منصوبہ سازی، نفاذ اور نگرانی کا ذمہ دار ہوگا۔ گرام سوراج کے تصور میں گاندھی جی نے خود اعتمادی اور عوامی شرکت کے جن اصولوں کی نشاندہی کی تھی ان کی بنیاد پر ضلع واردھا، مہاراشٹر کی ترقی کے لیے راقم السطور کی سرکردگی میں ۸۲-۱۹۸۱ء میں پلاننگ کمیشن نے ایک کمیٹی تشکیل کی تھی۔ مقصد واردھا کو ترقی دے کر گاندھی ضلع میں تبدیل کرنا تھا۔ گاندھیائی خطوط پر اس کمیٹی کے تیار کردہ واردھا ضلع پلان، جسے پلاننگ کمیشن نے اپریل ۱۹۸۲ء میں شائع کیا ہے، ظاہر ہے کہ ضلع میں غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے ۸۰۰۰ خاندان صحت و تندرستی کی بابت جانکاری اور 'سب کے لیے کام' کے مشترکہ پروگرام کے ذریعہ کس طرح بہتر اور زیادہ محفوظ زندگی گزار سکتے ہیں۔

تامل ناڈو کے وزیر اعلا ڈاکٹر ایم۔ کرونا ندھی نے ریاست میں HFAP شروع کرنے کے لیے اپنی سرکار کے عزم وارادہ کا اعلان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ان کی بجٹ تقریر مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء سے ماخوذ ہے:

"بھوکوں کو کھانا دو

اور

سماج کو اوپر اٹھانے کے لیے

لوگوں کو تعلیم سے آراستہ کرو

مہا کوی بھرتیار کے خوابوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے یہ سرکار ایک نیا ہنگر فری ایریا پروگرام شروع کرے گی جس کا مقصد غربت و افلاس سے پیداشدہ بھکمری کا مکمل خاتمہ ہے۔ غربت کے خاتمے اور لوگوں کے مختلف طبقوں کی غذائی حاجتوں کی تکمیل کے پیش نظر متعدد اسکیمیں جاری ہیں۔ ان کے نفاذ میں جو کمیاں رہ گئی ہیں انھیں HFAP کے ذریعہ دور کیا جاسکے گا۔ ڈاکٹر ایم ایس سوامی ناتھن کی عملی شرکت کے ساتھ اس پروگرام کے نفاذ کی تفصیلی حکمت عملی تیار کرنے کے لیے بجٹ میں گنجائشیں رکھی گئی ہیں۔"

تصور سے بنیادی سطح کے عمل تک

چیلنج یہ ہے کہ بھوک سے آزاد علاقہ پروگرام کے خاکے کو عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے۔ اس صدی کے باقی سالوں کے دوران ایسے پروگرام میں شہروں اور گاؤوں میں غربت کی سطح سے نیچے رہنے والے لوگوں کو روزی روٹی کمانے کے مزید مواقع فراہم کرنے پر خاص توجہ دینی ہوگی۔ عورتوں کی بڑھتی مفلسی ان پر اور لڑکیوں پر خصوصی توجہ کی طالب ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء سے، جو آزادی ہند کی پچاسویں سالگرہ کا دن ہے، ملک کے طول و عرض میں بھوک سے آزاد علاقہ (HFAP) کے قومی پروگرام کے لیے مطالعات نیز اہم پروجیکٹ کے طریقۂ کار کے بارے میں چند مشورے درج ذیل ہیں۔

پہلا مرحلہ: خلا اور بندشوں کا تجزیہ

یہ مرحلہ خلا اور بندشوں کے تجزیے سے متعلق ہوگا۔ "گیپ تجزیہ" پروگرام کے تحت، مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے پروگراموں کے ذریعے غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے لوگوں کو فی الحال حاصل مراعات و حقوق کی فہرست تیار کی جائے گی۔ سماجی تحفظ اور غذائی فراہمی پروگراموں کو روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے پروگراموں سے ممیز کرنے کے لیے فہرست کی مناسب طریقے سے درجہ بندی کرنی ہوگی۔

حقوق و مراعات کی فہرست تیار ہو جانے کے بعد ضلع کے کم و بیش سو گاؤوں میں دفعتاً جانچ تکنیک کے ذریعہ یہ پتا لگایا جائے کہ حق بحق دار رسید ہوا یا نہیں۔ پھر درون خاندان یہ پتا لگایا جائے کہ حقوق کی دستیابی میں مرد و عورت میں کیا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ غربا جن مراعات کے حق دار ہیں اور وہ مراعات جو انھیں دستیاب ہیں' دونوں کے مابین فرق کو جنس اور معاشی حیثیت کے اعتبار سے درجہ بندی کی جائے گی۔ (یعنی وہ افراد جن کے پاس زمین' چوپائے' مچھ تالاب یا پیڑ ہیں اور وہ جن کے پاس یہ سب کچھ نہیں ہیں۔)

خلا (GAP) کے تجزیے کے مکمل ہو جانے کے بعد اس کی وجوہات اور ان پریشانیوں کے بارے میں جو غریبوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے میں لاحق ہوتی ہیں، انتہائی عمیق مطالعہ کیا جائے گا۔ یہ جاننے کے لیے کہ محروموں تک رسائی کے لیے انسداد مفلسی کے کون سے براہ راست یا بالواسطہ طریقے اپنائے جائیں، خلا اور بندشوں کا یہ تجزیہ نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ خلا کے تجزیے میں شامل گاؤں میں فعال رضاکار تنظیموں کی ایک فہرست تیار کی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ غریبوں اور سرکاری ایجنسیوں کے مابین ربط قائم کرنے کے پیش نظر ان تنظیموں کے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔ رضاکار تنظیموں اور پنچایتوں اور نگر پالیکاؤں کے منتخب مرد و عورت ممبران سے صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے کیا جائے گا کہ "خلا" کا کس طرح خاتمہ ہو سکتا ہے نیز انسداد غربت پروگراموں کے نظام تقسیم کی اصلاح اس کی کارکردگی اور اثرات کے لحاظ سے کس طرح ممکن ہے۔

دوسرا مرحلہ: پیام رسانی اور مدبرانہ منصوبہ سازی۔

یہ مرحلہ مدبرانہ منصوبہ سازی کا ہوگا جس میں مندرجہ ذیل امور پر خصوصی توجہ دی جائے گی:

(الف) حقوق و مراعات اور ان کی فراہمی کے درمیان خلا کو پر کرنے کے اقدامات۔

(ب) عوام کی نارسیدہ کم سے کم ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے پروگراموں کی شروعات اور جاری پروگراموں کی تقسیم کاری کو بہتر بنانے کے لیے متعلقہ علاقوں میں انسانی، مالی اور تکنیکی وسائل کو متحرک کرنے کے مواقع کی تلاش۔

(ج) تمام پروگراموں کے مابین خواہ وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری، اتحاد و اتفاق کی راہیں تلاش کرنا۔

(د) زرعی اور غیر زرعی دونوں ہی پر مبنی روزی روٹی کے نئے مواقع پر غور و خوض کرنا۔

(ہ) ان تنظیمی اور انتظامی طریقوں کو اپنانا جو ثالثوں کے تحفظ کو مزید تقویت دینے کے لیے بنائے گئے پروگراموں کے نفاذ میں بنیادی ثالثوں کی موثر شرکت اور نگرانی کو یقینی بنائیں اور

(و) متعلقہ گاؤں میں نوجوان عورتوں اور مردوں کو منتخب کر کے بھکمری کے خلاف لڑنے والوں HUNGER FIGHTERS کا ایک دستہ تیار کرنا۔ یہ نوجوان سپاہی بہت سی ذمہ داریاں قبول کریں گے مثلاً لوگوں کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنا، نظام تقسیم کو درست کرنا اور ماحولیاتی حفظان صحت نیز فضلات اور سیویج کی از سر نو درستگی کو فروغ دینا۔ بھکمری مخالف سپاہیوں کو سفر خرچ، متفرقہ خرچ اور ان کے وقت کے معاوضے کے بطور ایک قلیل رقم دی جائے گی۔ بھکمری مخالف دستے کے جوانوں کا انتخاب ان کے گاؤں میں ان کی سماجی اور معاشی حیثیت کے پیش نظر کیا جائے گا۔ ایسے دستوں میں عورتوں اور مردوں کی تعداد مساوی ہوگی۔

تیسرا مرحلہ: لائحہ عمل کو قطعی شکل دینا مرحلہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے دوران کی گئی کوششوں کے نتیجے میں مفلسی کے خاتمے کے امکانات کے بارے میں بیداری، مطلوبہ ہدف کے حصول کے طریقوں کا تجزیہ اور ایک قابل نفاذ لائحہ عمل کا خاکہ سامنے آیا ہوگا۔ لائحہ عمل تب ہی موثر ہوگا جب مفلس خاندانوں کی آرا بھی اس میں شامل ہوں۔ اسی لیے یہ مرحلہ انسداد بھکمری کے لیے فضائی سطح کے ایک اشتراک کی تشکیل کا موزوں ترین موقع ہوگا۔ اس اشتراک میں لوکل سیلف سرکاری اداروں کے نمائندوں، بھکمری اور غربت مخالف سرکاری ایجنسیوں، دانشوروں، مدنی سماج، کارپوریٹ سیکٹر، عورتوں اور نوجوانوں کی تنظیموں، مالی اداروں اور ماس میڈیا کی شمولیت ممکن ہو سکتی ہے یہ اشتراک اپنے ہر ممبر کو عوامی بیداری، وسائل کی فراہمی، کام کے عملی نفاذ، نگرانی اور جائزے کے میدانوں میں مخصوص ذمہ داریاں سونپے گا۔ اس اشتراک کا مقصد عمودی سرکاری پروگراموں کو افقی جہت دینا ہوگا۔ اشتراک کے ارکان حقوق نسواں کی بازیابی اور سماجی برائیوں مثلاً جہیز اور شراب نوشی کے خاتمے کی بھی تدبیریں کریں گے۔ مارچ ۱۹۹۷ء کے آخر تک مقامی سطح کے متعدد بھوک مخالف اشتراک منتخب علاقوں سے ۲۰۰۰ء تک بھکمری اور محرومیوں کے خاتمے کے لیے منصوبہ بند پروگرام کا آغاز کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے مطلوبہ مالی، تکنیکی اور انتظامی وسائل کا نہ صرف تعین درکار ہوگا بلکہ ان کی درجہ بندی بھی حسب ذیل انداز میں کرنی ہوگی:

(الف) وہ وسائل جو حاصل ہیں، اور

(ب) مطلوبہ نئے اور اضافی وسائل

چوتھا مرحلہ: خوراک اور غذائی طور پر خود کفیل ہندوستان کی جانب اس دوران HFAP کے نفاذ کی حکمت مقامی سطح کے قابل نفاذ لائحہ عمل میں ڈھل چکی ہوگی۔ بھکمری کی مکمل بیخ کنی کے لیے حاصل غیر معمولی مواقع کے بارے میں سماج کے تمام گوشوں کو سریع الحس بنانے کی زبردست کوششیں کی جائیں گی۔ منصوبہ سازی اور نفاذ دونوں ہی مرحلوں میں غربا خود فعال رول ادا کریں گے۔ بھوک مخالف دستے کے اکثر جوانوں کا تعلق بے زمین مزدور خاندانوں سے ہوگا۔ اس دستے میں پنچایتوں اور نگر پالیکاؤں کے منتخب ممبر بھی شامل ہوں گے تاکہ وہ عوام اور منتخب مجالس کے مابین ربط پیدا کر سکیں۔ ہر گاؤں یا قصبے سے کم از کم دو ممبر اس دستے میں شامل ہوں گے تاکہ وہ نہ صرف ماحولیاتی حفظان صحت اور صفائی ستھرائی کی صورت حال کی اصلاح کر سکیں بلکہ ان گاؤوں / قصبوں کے خاندانوں کو صحت اور غذائی تحفظ بھی دے سکیں۔

خوراک تک ماحولیاتی رسائی

تمام ترقیاتی سرگرمیوں کو واضح ماحولیاتی اساسی ضوابط کے تابع کرنے کی ضرورت کے عوامی رجحان نے حالیہ دہائیوں میں بالخصوص ۱۹۷۲ء میں انسانی ماحول پر منعقدہ اسٹاک ہوم کانفرنس کے بعد زور پکڑا ہے۔ ۱۹۹۲ء ریوڈی جینیرو میں منعقد ماحول اور ترقی پر اقوام متحدہ کانفرنس نے شہریوں کے ماحولیاتی شعور کو بیدار کرنے اور اسے وسعت بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ماحولیاتی موضوعات پر کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کی تعداد میں اضافے اور ماحولیاتی اصولوں کی شدید خلاف ورزیوں کے خلاف عدالتوں میں قانونی چارہ جوئیوں کے واقعات میں اضافے، دونوں ہی سے اس شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ بھوپال اور چرنوبل جیسے سانحوں نے بے احتیاط صنعتوں کے شدید ماحولیاتی اور انسانی اثرات کو اجاگر کر دیا ہے۔

ریو اور اس کے مابعد متعدد قانونی اور لازم بین اقوامی معاہدے وجود میں آئے۔ یہ تمام عالم کے مشترکہ مسائل مثلاً موسم، بائیو ڈائیورسٹی، جنگلات کاری، سمندر اور مضر فضلات سے متعلق ہیں۔ تاہم ان معاہدوں کے نفاذ کی عملی کوششوں کی رفتار سست رہی ہے اور انھیں انسانی دردمندی کے زاویہ سے دیکھنے کی بجائے قانونی موشگافیوں کا موضوع زیادہ قرار دیا گیا ہے۔ ناقابل تلافی ماحولیاتی نقصانات سے تحفظ کے اقدامات افراد کی سطح پر تو لیے گئے ہیں لیکن اجتماعی کوششیں ہنوز کم یاب ہیں۔

صحت مند ماحول کے لیے انفرادی کوششوں کو عوامی تحریک میں بدلنے کے لیے ہم اداری ڈھانچوں کے دو سیٹوں کے فروغ پر غور کر سکتے ہیں۔

اولاً یہ کہ با شعور عالمی شہری کی حیثیت سے ہمیں ایک ایمنسٹی ماحولیاتی تنظیم کی تشکیل کرنی چاہیے جو انسانی ورثے کی شدید خلاف ورزی کی نگرانی کرنے نیز ان کے تحفظ کے لیے کوششیں کرنے میں ممد و معاون ہو۔ مثلاً نشا اولمپکس ماس میڈیا کی رسائی اور اختیار کی بیّن گواہ ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل حقوق انسانی کی پامالیوں کے خلاف آواز اٹھانے کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ دھرتی کے باشندوں کو قوت و اقتدار کے مظالم سے محفوظ و مامون رکھنے کے لیے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی خدمات اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایمنسٹی ماحولیات اس سے کہیں زیادہ اہم ہے کیوں کہ ایسی تنظیم آنے والی نسلوں کے تحفظ میں معاون ہوگی۔ لیکن ایسی تنظیم اسی وقت موثر ہوگی جب اس کی سرگرمیوں کا محور بنی نوع انسان اور فطرت میں ہم آہنگی کو از سر نو استوار کرنا اور اس ربط کو تقویت دینا ہو۔ اسے اپنی معتبریت قائم رکھنے کے لیے سیاسی طور پر محرک بیانات اور دخل اندازیوں سے گریز لازم ہے۔ دنیا کی مشہور و معروف ماس میڈیا تنظیموں (پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا، دونوں ہی) کا تعاون اگر اسے حاصل ہو تو یہ اور بھی موثر ہو سکتی ہے صحت مند انسانی ماحول کے لیے میڈیا کا ایسا عالمی اشتراک اور پیشہ ورانہ طور پر جاری ایمنسٹی ماحولیات، دونوں مل کر ہمارے معاون حیات نظام کے تحفظ اور اصلاح کے پیش نظر مناسب سیاسی اور عوامی اقدامات کے لیے عوام کی آواز کو بلند کرانے میں معاون ہوں گے۔ ورلڈ بینک اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (IMF) ترقی پذیر ممالک میں اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ معاشی اصلاحات کر رہے ہیں۔ لیکن تمام ملکوں بالخصوص صنعتی ملکوں میں اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ سے کہیں زیادہ شدید ضرورت قوت بخش اسلوب حیات کی ہے۔

جمہوریت ـــ اور بھوک سے نجات

قومی سطح پر، بہتر ماحول کے لیے شہریوں کے اقدامات کو بنیادی جمہوری اداروں کا تعاون حاصل ہے۔ خوش قسمتی سے ملک کے بیشتر حصوں میں اب منتخب پنچایتوں اور نگر پالیکاؤں کا راج ہے۔ اپنے گاؤں/قصبوں کے لیے انھیں سماجی۔ عمرانی منشورات کی تیاری کے قابل بنانے کے لیے ترسیلی اختیارات ناگزیر ہیں۔ ایسے منشور انسانی آبادی اور ماحولیاتی نظام کی آبادی کو برداشت کرنے کی استعداد کے مابین ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ پنچایت نگر پالیکا کے سماجی۔ عمرانی منشور میں مندرجہ ذیل امور پر توجہ دی جائے گی :

(الف) ماحول : ٹھوس اور سیال فضلات کا بند و بست، مچھروں کا حیاتیاتی۔ ماحولیاتی بند و بست، گھروں کے اطراف کا صاف ستھرا ماحول۔

(ب) حفظان صحت : غور و فکر کے ساتھ ساتھ زچہ بچہ کی صحت اور محفوظ نیز قابل قبول مانع حمل خدمات پر توجہ۔

(ج) تعلیم : خواندگی اور تکنیکی معلومات۔

(د) تحفظ خوراک : خورد و کلاں غذائیت، پینے کے لائق صاف پانی۔

(ہ) تحفظ روزگار : زرعی اور غیر زرعی روزگار کے موثر مواقع۔

(و) جنس کوڈ : جنسی تناسب اور UNDP ۱۹۹۶ء کے CAPABILITY POVERTY MEASURES

عالمی اور مقامی سطح پر ایسی ادارہ جاتی خدمات کے ذریعے ماحول کی کوالٹی کو تحفظ بخشنے کے عام آدمی کے اختیار کو وسعت دی جا سکتی ہے۔ خوراک اور روزگار کے تحفظ کے لیے اضافہ آبادی پر پابندی اور قدرتی وسائل کا تحفظ دونوں ضروری ہیں۔

بنیادی سطح پر جمہوری اداروں کے پھیلاؤ اور سائنس اور تکنالوجی کی پیش رفت نے خوراک کے لحاظ سے خود کفیل ہندوستان کے لیے غیر معمولی مواقع کو جنم دیا ہے۔ ایک متعین میعاد میں محرومیوں، جنسی اور سماجی نابرابری اور بھکمری کے مرض کہنہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کرنے کا کوئی بھی سیاسی، سماجی، سائنسی، معاشی اور ماحولیاتی عذر قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

(فاضل مقالہ نگار، ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن ریسرچ فاؤنڈیشن، تھرڈ کراس اسٹریٹ، تارامنی انسٹی ٹیوشنل ایریا، چینئی۔ ۶۰۰۱۱۳ (تامل ناڈو) کے چیئرمین ہیں۔ زیر نظر مقالہ گجرات ودیا پیٹھ، احمد آباد میں دیے گئے ان کے کمل نین بجاج یادگاری خطبے پر مبنی ہے۔)

●

بقیہ: ایڈس ـــ سبب اور انسداد

ہے کہ نطفے کا ایک قطرہ ۸۰ قطرے خون کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اسی زمرے میں ایک حکیم کی یہ صلاح بالمواجہہ پیش ہے۔

کسی نے حکیم سے مشورہ طلب کیا کہ میں اپنی منکوحہ کے پاس سال میں کتنی بار جاؤں، تو جواب تھا ـــ "ایک بار" پھر اس نے مزید اصرار کیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، فاصلہ اور کم کیجیے۔ اس نے کہا "چھ ماہ پر" اس طرح وہ اصرار کرتا گیا اور یہ حکیم فاصلہ کم کرتے گئے جب بات ایک ماہ تک آئی تو پھر اس نے اصرار کیا۔ اس پر حکیم کا جواب تھا "تمہاری مرضی۔ قبر کھدوالو" یہ بات تو محض جملہ معترضہ ہے جس کا سارا دار و مدار ضبط نفس سے ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں تزکیہ نفس بہت ضروری ہے اور ضبط نفس پر عمل تمام بیماریوں سے مدافعت کا اہم وسیلہ۔

"ایڈس" کے بارے میں خطرناک اور مشکوک بیانات سامنے آئے ہیں، اپنے دل و ذہن کو ایسے شکوک و شبہات سے پاک رکھنا چاہیے کہ "ایڈس" نسلی بیماری ہے اور یہ متعدی بیماری کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس مرض سے متعلق ان حقائق کے علاوہ باقی سب بے بنیاد افواہ ہے۔ یہ ہوتا نہیں۔ ہاں! اپنے روزمرہ کے معمولات، کھانے پینے کو چست اور درست رکھنے کے ساتھ کردار کو پاکیزہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سومناتھ گھوش

ماحولیاتی جانچ پڑتال۔ ایک ابھرتا تصور

ماحولیاتی جانچ پڑتال (آڈٹنگ) کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعہ کسی صنعتی ادارے کے ریکارڈز اور پیداواری سہولتوں کی جانچ کی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ اس صنعتی ادارے نے کس حد تک ماحولیاتی قوانین اور ضوابط کی پابندی کی ہے، اس بات کی تصدیق کی جاسکے کہ قوانین اور ضوابط کے نفاذ میں موجودہ نظام کس قدر موثر ہے! ماحولیاتی آلودگی اور اس کے مضر اثرات (تمام معلوم اور غیر معلوم آلودگیاں جو ابھی تک شامل نہ کی گئی ہوں) کی نشاندہی اور نقائص سے ذمہ داروں کو باخبر کیا جاسکے اور اصلاحی تدبیریں کی جاسکیں۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے صنعتی اداروں کو ایک ایسا نظم قائم کرنا چاہیے جس سے اس امر کی تصدیق ہوسکے کہ ایک صنعتی اکائی ماحولیاتی تحفظ کے قواعد وضوابط کی پابندی کر رہی ہے یا نہیں۔ جس طرح مالیاتی آڈٹنگ یہ دیکھتی ہے کہ کوئی کمپنی متعین قواعد وضوابط کے مطابق مالی اسٹینڈرڈز کی پابندی کرتی ہے یا نہیں، بالکل اسی طرح ماحولیاتی آڈٹنگ اس بات پر نگاہ رکھے گی کہ کوئی صنعتی اکائی مضر رساں دھوئیں، دھول اور فضلات کے اخراج سے مٹی، ہوا اور پانی کو کس قدر آلودہ کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ماحولیاتی آڈٹنگ بچاؤ کے سجھاؤ بھی دے گی۔ وہ انتظامیہ کو ماحولیاتی آلودگی کے خطرات سے بھی آگاہ کرے گی۔

خطرات آلودگی کی قسمیں

ماحولیات کو لاحق تمام خطروں کی درجہ بندی درج ذیل انداز میں کی جاسکتی ہے۔

(الف) معلوم خطرات آلودگی جن کا احاطہ قوانین اور ضابطوں کے ذریعے کیا جاچکا ہو۔

(ب) معلوم خطرات آلودگی جن کا احاطہ قوانین اور ضابطوں کے ذریعے نہ ہوا ہو۔

(ج) وہ خطرات آلودگی جن کی شناخت وسائل اور علم وآگہی کی موجودہ سطح کی مدد سے ممکن ہو لیکن اس جہت میں اب تک کوئی کوشش نہ کی گئی ہو۔

(د) وہ آلودگیاں جن کی شناخت علم کی موجودہ سطح سے ممکن نہ ہو۔

ماحولیاتی آڈٹنگ کا رول

ماحولیاتی آڈٹنگ کسی صنعتی اکائی کو درپیش آلودگی سے متعلق قوانین اور ضوابط کے اندیشوں کو زائل کرنے کی کوشش حسب ذیل طریقوں سے کرتی ہے:

اگر صنعتی اکائی میں آلودگی سے متعلق قاعدوں اور ضابطوں نیز ریکارڈ رکھنے کی پابندی کو یقینی بنانے کا کوئی سسٹم ہو تو اس کی اثر آفرینی کو پرکھنا۔

آیا صنعتی اکائی آلودگی کنٹرول کرنے والی اتھارٹی کے بنائے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کر رہی ہے یا نہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا یونٹ کے پاس ماحولیات سے متعلق مطلوبہ پرمٹ یا لائسنس ہیں، یہ کہ یونٹ وقفہ وقفہ سے نگراں اتھارٹی کو مطلوبہ رپورٹ پیش کر رہا ہے، یہ کہ مضر فضلات کی مناسب طریقہ سے نکاسی ہو رہی ہے اور یہ کہ مضر فضلات اتھارٹی کی متعین کردہ حدود کے اندر ہیں یا نہیں؟

مصنوعات کی پیداوار کے دوران تمام اخراجات کو جانچنا اور اگر یہ پتا چلے کہ یونٹ آلودگی سے متعلق قاعدوں اور ضابطوں کی خلاف ورزی کر رہی ہے تو اصلاحی اقدامات کے مشوروں کے ساتھ انتظامیہ کو اس سے باخبر کرنا۔ مثال کے طور پر اگر جانچ سے یہ پتا چلے کہ آلودگی کنٹرول کرنے والا آلہ پیداوار کے دوران نکلنے والے مضر اخراجات کو متعینہ حدود کے اندر رکھنے میں ناکام ہے تو صورت حال کی اصلاح کے لیے فوری قدم اٹھانا چاہیے۔ اگر نئے آلہ کی ضرورت ہو تو اس کا مشورہ انتظامیہ کو دیا جانا چاہیے۔

اُن آلودگیوں کے بارے میں رپورٹ کرنا جن کا احاطہ موجودہ آلودگی کنٹرول ضابطوں کے تحت نہیں کیا گیا ہے لیکن جن سے یہ اندیشہ لاحق ہے کہ وہ ماحول اور جانداروں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ایسی آلودگیوں کے تدارک کے سلسلہ میں مشورے بھی دیے جانے چاہئیں۔ اس قسم کی آلودگیاں صنعتی یونٹ کو مستقبل قریب و بعید میں زبردست نقصان پہنچا سکتی ہیں خواہ اس وقت ان سے کوئی نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔ صنعتی اکائیاں ان خطرات کو کسی صورت نظرانداز نہیں کرسکتیں۔ یہ وہ زبردست خطرات ہیں جو فیکٹریوں کی وجہ سے ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔

پیداواری عمل کے دوران خارج شدہ فضلات کے تجارتی استعمال کے امکانات پر غور کرنا مثلاً فضلات کو مزید پروسسنگ کے لیے خام مال کی حیثیت سے استعمال کرنا یا اسے کسی دوسرے صنعت کار کے ہاتھوں فروخت کرنا تاکہ وہ فضلات سے کوئی نئی شے تیار کرسکے۔

ماحولیاتی آڈٹنگ کے امکانات

کسی صنعتی یونٹ میں ماحولیاتی آڈٹنگ کے امکانات کا انحصار مندرجہ ذیل پر ہے:

— کمپنی کے اغراض و مقاصد۔

— ماحولیاتی آڈٹنگ کے مقصد کے لیے مختص وسائل۔

— میعاد یعنی آڈٹنگ مکمل کرنے کے لیے دیا گیا وقت۔

— آڈٹ ہونے والی پیداواری سہولتوں کی طبعی پراگندگی کی حد۔

— ملازمین کا تعاون۔

— ماحولیاتی آڈٹنگ کے تئیں انتظامیہ کا عزم اور پابندی۔

فوائد

ماحولیاتی آڈٹنگ کے صحیح نفاذ کی صورت حال میں صنعتی یونٹوں کو درج ذیل فائدے حاصل ہوں گے:

کسی کمپنی میں ماحولیاتی آڈٹنگ سے آلودگی کے تدارک کے تئیں ذمہ داریوں کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ ملازمین کمپنی سے متعلق افراد اور پورے سماج کی نگاہوں میں یہ اس کمپنی کی عمدہ تصویر پیش کرتی ہے۔

ماحولیاتی آڈٹنگ کا نفاذ ماحولیاتی آلودگیوں کو کنٹرول کرنے والی اتھارٹیوں کے معاندانہ رویے میں کمی کا باعث ہوتا ہے۔ یہ اتھارٹی اور انڈسٹری کے مابین غیر ضروری تناؤ اور رسہ کشی کو کم کر دیتا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ کمپنی نے پہلے ہی سے اپنے یہاں ماحولیاتی آڈٹنگ کا مناسب نظم کر رکھا ہے تو ممکن ہے کہ اتھارٹی مفصل جانچ پڑتال سے گریز کریں۔ کمپنی کے ذریعے ماحولیاتی قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کو یہ بہتر بناتی ہے۔ اگر ماحولیاتی آڈٹنگ کے ذریعہ کسی خلاف ورزی کا علم ہوتا ہے تو ماحولیاتی آڈیٹر کے مشوروں کی بنیاد پر اصلاحی تدبیریں فوری طور پر کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح متوقع جرمانہ سے بچا جاسکتا ہے نیز کمپنی کے بند ہوجانے کا خدشہ بھی باقی نہیں رہتا۔

ماحولیاتی آڈٹ کے مناسب نفاذ کے سبب آلودگی کنٹرول آلات نصب کرنے ضروری ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کمپنی اپنی ابتدائی سرمایہ کاری اپنی مالی استطاعت کے مطابق کرے گی۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر ایک آلودگی مخالف آلات نصب کرنے پڑے تو غیر متوقع اخراجات کی وجہ سے کمپنی کو بند نہیں کرنا پڑے گا۔

کسی کمپنی کو خریدنے کی صورت میں اگر خریدار کمپنی خریدی ہوئی کمپنی کا ماحولیاتی آڈٹ کراتی ہے تو وہ پیداواری عمل کے دوران آلودگیوں کے اخراج کے بارے میں کماحقہ واقف ہوجائے گی اور اس جانکاری کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ ایسی کمپنی کو خریدا جائے یا نہیں اور اگر خریدا بھی جائے تو اس کی کیا قیمت مقرر کی جائے۔ اس طرح خریدار کمپنی غیر ضروری خطرات اور مشکلات سے دامن بچا سکتی ہے۔

ماحولیاتی آڈٹنگ کے تاریک پہلو بھی ہیں۔ ماحولیاتی آڈٹنگ کے ذریعہ کسی کمپنی کے ذریعہ خارج مضر فضلات اور ماحولیاتی آلودگی مشتہر ہوجاتی ہے جس سے کارپوریٹ حوصلہ کو نقصان پہنچتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ملازمین کی حوصلہ شکنی بھی ہوتی ہے۔ اس کا خیال رکھا جانا چاہیے۔

حاصل کلام

ماحولیاتی آڈٹنگ کی کامیابی کے لیے اس کا لچکدار ہونا ضروری ہے تاکہ یہ صنعتی یونٹ کی مخصوص ضرورتوں پر پوری اتر سکے۔ کسی کمپنی کو درپیش ماحولیاتی آلودگیوں کے مسئلہ کا اندازہ کرنے، ماحولیاتی قواعد و ضوابط کی خلاف ورزیوں پر نگاہ رکھنے اور نقائص کو دور کرنے کے لیے اپنی سفارشات پیش کرنے کے مقصد کے تحت ماحولیاتی آڈٹنگ کا ایک واضح طریقہ کار ہونا چاہیے۔ ماحولیاتی آڈٹ رپورٹ تفصیلی نوعیت کی ہونی چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو اسے تنقید سے پاک ہونا چاہیے۔ ●

بقیہ: جہیز کی لعنت کیسے ختم ہو؟

حاصل کرکے بھی آدمی نہیں بن پائے۔ آخر ہم لڑکی والوں سے جہیز کے روپ میں دھن دولت اور طرح طرح کا سامان کیوں مانگتے ہیں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس سوال کا جواب دہلی پریس سے شائع ایک کتاب ". . . . ." میں سُدارشن چوپڑہ نے دیا ہے، جو کافی صحیح لگتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے "ہمارے سماج میں شروع سے ہی عورت کو بوجھ اور مصیبت سمجھا جاتا ہے اور یہ سوچا جاتا ہے کہ اگر کسی عورت سے کوئی شادی کرے گا تو اس کا نقصان ہی ہوگا۔ اسی نقصان کی بھرپائی کے لیے ہی جہیز دیا جاتا ہے" یہ سچائی ہے۔ ہم حقیقت میں عورت کو بوجھ اور مصیبت مانتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے لوگ اپنی بیٹی کے گھر زیادہ کھانا پینا پسند نہیں کرتے۔ وہ سوچتے ہیں اس سے ہمارے داماد یا ہماری بیٹی کے سسرال والوں پر اور بوجھ پڑے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے اسی ذہنیت کی وجہ سے ہی کہ عورت بوجھ ہے، مصیبت ہے، جہیز کی روایت شروع ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں اس روایت کو ختم کرنے کے لیے اس ذہنیت کو چھوڑنا ہوگا اور اپنے اندر اخلاق کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ یعنی ہمیں یہ عزم کرنا ہوگا کہ ہم مفت میں کسی سے کچھ نہیں لیں گے۔ آخر جہیز مفت کے سامان کا ہی تو نام ہوتا ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا جہیز کی لعنت جاری رہے گی۔ اسے کوئی نہیں مٹا پائے گا۔ بھلا عورت کو بوجھ سمجھنے والوں اور مفت کے مال پر ہاتھ پسارنے والوں سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ موقع پڑنے پر جہیز نہیں لیں گے اور کم جہیز لانے پر عورتوں کو ستائیں گے نہیں، ان کا قتل نہیں کریں گے؟ ●

بقیہ کور ۳: فضائی آلودگی کی روک تھام

بے ہوش بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے اسہال بھی ہو سکتا ہے نیز دماغ، جگر اور گردوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آٹوموبائلز سے خارج ہونے والے ہائڈرو کاربن اور نائٹروجن آکسائڈ انسان میں بے چینی، سانس لینے میں تکلیف اور آنکھوں میں جلن، لالی اور دھندلا پن پیدا کرتے ہیں۔

موٹر گاڑیوں سے پیدا ہونے والی آلودگی کو کم کرنے کے اقدامات

اپریل ۱۹۹۵ء میں چار میٹروپولیٹن شہروں دہلی، ممبئی، کلکتہ اور چنئی میں سیسے سے پاک پٹرول کا استعمال شروع کیا گیا ہے۔ یہ فضا میں موٹر گاڑیوں سے نکلنے والے سیسے کے اجزار کم کرنے کی سمت میں ایک بڑا اقدام ہے۔ گاڑیوں میں کیٹالیٹک کنورٹر لگا کر بھی آٹوموبائلز سے پیدا ہونے والی فضائی آلودگی کی روک تھام کی جا سکتی ہے کیوں کہ بھاپ نلی میں کیٹالیٹک کنورٹر لگا دینے سے نقصان دہ گیسوں کے اخراج کو روکا جا سکتا ہے۔ اس کنورٹر کی قیمت تقریباً ۱۵۰۰۰ روپے ہوتی ہے اور یہ غیر ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ اسے لگا دینے سے چار پہیوں والی موٹر گاڑیوں کی قیمت میں اضافہ تو ہوتا ہی ہے مگر یہ ہے بہت فائدہ مند۔ اس کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ یہ انجن سے نکلنے والی کاربن مونو آکسائڈ اور ہائڈرو کاربن جیسی گیسوں کو بالترتیب کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں بدل کر ان کو بے ضرر بنا دیتا ہے۔

سی این جی ایندھن

سی این جی ایندھن ہائڈرو کاربن گیسوں کا مرکب ہوتا ہے۔ اس میں خاص کر میتھین شامل ہوتی ہے جو کمپریس شدہ صورت میں پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں کے لیے ایک اچھا ایندھن ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک درآمد شدہ کٹ لگا کر آٹوموبائلز کو بہ آسانی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ کار کے بوٹ میں ایک سی این جی سلینڈر لگایا جا سکتا ہے جو گیسوں کو مکمل طور پر جلا دیتا ہے پھر گاڑیوں سے کوئی نقصان دہ اخراج نہیں ہوتا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اوسطاً ۱۵۰ کلومیٹر روزانہ چلنے والے ۴۰۰۰ موٹر گاڑیوں میں سی این جی کا استعمال کیا جائے تو کاربن مونو آکسائڈ کے اخراج میں ۳۵۰۰۰ ٹن سالانہ کی اور کاربن ڈائی آکسائڈ کے اخراج میں ۲۳۶۰۰۰ ٹن سالانہ کی کمی ہوگی۔ لیکن بہت کم صارفین کو سی این جی کی جانکاری ہوگی۔ علاوہ ازیں اس کی کٹس اور ریفل سلینڈر کی درآمدات میں بھی کافی مشکل پیش آتی ہے۔ لہٰذا اس وقت صرف پچاس سے کچھ زائد موٹر گاڑیاں ہی سی این جی سے دہلی میں چل رہی ہیں۔ اگر ریاستی حکومتیں اپنی سرکاری گاڑیوں کو سی این جی ایندھن سے چلائیں تو اس سے ٹرانسپورٹ پر آنے والا خرچ بھی کم ہوگا اور شہر کی فضا میں آلودگی میں بھی کمی آئے گی۔

دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی گاڑیاں سی این جی ایندھن سے چلانی شروع کر دی ہیں۔ اگر حکومت سی این جی کے تعلق سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کرے، اس سلسلے میں کافی ترغیبات مہیا کرے اور اسے سستا بنانے کے اقدامات کرے تو سی این جی متبادل کامیاب ثابت ہو سکتا ہے۔ ماحول کو آلودگی سے پاک رکھنے والے اس ایندھن کو مقبول عام بنانے کی ضرورت ہے۔

اگر کاربوریٹر کو اس طرح رکھا جائے کہ ہوا اور ایندھن کا صحیح تناسب یقینی ہو جائے تب بھی موٹر گاڑیوں سے ہونے والے اخراج کو مقررہ حدود کے اندر رکھا جا سکتا ہے۔ اگر ایک اچھی ورکشاپ میں گاڑیوں کی باقاعدگی سے سروسنگ کرائی جائے اور انجن، اسپارک پلگ، فیول انجکشن سسٹم کی صفائی کرائی جاتی رہے تو اس سے بھی فضائی آلودگی کی روک تھام میں کافی مدد ملے گی۔

چناں چہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ماحولیاتی نظام میں موٹر گاڑیوں سے پیدا ہونے والی آلودگی کو کم سے کم کریں۔ یہ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے بھی فائدہ مند ہوگا۔

●

بقیہ کور ۲: نیشنل سیکورٹی گارڈس کی..

حاصل کرنے کے بعد قومی یا بین اقوامی اہمیت کا کوئی بھی کام کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یرغمالوں کی رہائی، مصیبت میں گرفتار لوگوں کو نکال کر لانا، دہشت گردوں کی پناہ گاہوں پر اچانک دھاوا بولنا، بسوں، ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنا یا کسی بھی مشکل اور خطرناک مشن کی تکمیل۔

این ایس جی کی اعلا روایات کو برقرار رکھتے ہوئے حال ہی میں اس فورس کے تین کمانڈوز نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار بے انت سنگھ کی حفاظت کرنے کی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے اپنی جان تک قربان کر دی۔ یہی نہیں، بلکہ اس وقت تک این ایس جی کے آٹھ جوان اپنے پر چیلنج فرائض کی انجام دہی میں اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔

فلاح و بہبود کے کام

این ایس جی فلاحی کاموں اور سماجی خدمات پر بھی زور دیتی رہی۔ وہ دو گاؤوں نورنگ پور اور مانیسر میں حفظان صحت اور لوگوں کا تعلیمی معیار بلند کرنے کا کام کر رہی ہے۔ وہاں وہ دو ہفتوں میں ایک بار مفت طبی کیمپ لگاتی ہے۔ غریب اور ضرورت مند بچوں میں اسکول کی یونیفارم اور کتابیں مفت تقسیم کرتی ہے۔ این ایس جی کے عملے کے ارکان کی بیویوں کو مانیسر میں این ایس جی کے خاندانی بہبود مرکز پر اسکول یونیفارم کی سلائی پر مامور کیا گیا ہے جس کی انھیں اجرت دی جاتی ہے۔ اس سے این ایس جی کے جوانوں کی آمدنی بڑھتی ہے اور ان کی ذاتی بہبود و بہتری میں اضافہ ہوتا ہے۔

این ایس جی نے ۲۵ تا ۲۹ جون ۱۹۹۶ء کے دوران پٹودی (گوڑگاؤں) کے سیلاب زدہ علاقوں میں پھنسے ہوئے افراد کی امداد و راحت رسانی کے کام میں سول حکام کی مدد کی ہے۔ اندازاً ۱۵ گاؤوں کے لوگوں کو راحت پہنچائی گئی تھی۔ اس طرح این ایس جی ملک کی داخلی سلامتی کے لیے ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔

●

اے۔ کے۔ گوکاک

ٹیلی مواصلاتی شعبے کی زبردست پیش رفت

دنیا بھر میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے درکار بنیادی ڈھانچہ میں ٹیلی مواصلات کی ایک خاص اہمیت ہے۔ بھارت جیسے وسیع و عریض ملک میں، جہاں زبانوں، ثقافتوں اور روایتوں کی کثرت ہے، ٹیلی مواصلات کی خدمات نہ صرف سماجی و اقتصادی ترقی میں مدد کرتی ہیں بلکہ اتحاد و قومی یک جہتی کو بھی فروغ دیتی ہیں۔

حصول آزادی کے وقت ٹیلی مواصلاتی سروسز کی ایک چھوٹی سی ابتدا کے بعد سے محکمۂ ٹیلی مواصلات تیزی سے بدلتی ہوئی ٹکنالوجیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں ہم اپنے یہاں ترقی یافتہ ممالک کی ٹیلی مواصلاتی خدمات کی سی گوناگونی، کوالٹی اور وسعت پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں اور اس میں ہم نے کامیابی بھی حاصل کی ہے۔

ٹیلی مواصلات کا آغاز

بھارت میں ٹیلی مواصلات کا آغاز قریب قریب اسی زمانے میں ہوا تھا جب ترقی یافتہ ممالک میں ہوا تھا۔ ہمارے یہاں ٹیلی گراف سے پہلا رابطہ کلکتہ اور ۱۲ میل دور واقع ڈائمنڈ ہاربر کے درمیان ۱۸۳۹ء میں قائم کیا گیا تھا۔ لیکن ٹیلی گراف لائن ۱۸۵۱ء میں ٹریفک کے لیے، خصوصاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرکاری کام کے واسطے کھولی گئی تھی۔ ۱۸۵۵ء تک ٹیلی گراف کی سہولت برطانوی حکومت والے دوسرے شہروں میں بھی پہنچ گئی۔

ہندوستان میں ہاتھ سے چلائے جانے والے پہلے ٹیلیفون ایکسچینج ۱۸۸۲ء میں ممبئی، کلکتہ اور چینئی میں کھولے گئے۔ پہلا آٹومیٹک (خودکار) ٹیلی فون ایکسچینج ۱۹۱۴ء میں شملہ میں قائم کیا گیا جس میں ۴۰۰ ورکنگ کنکشنوں کے لیے ۷۰۰ لائنیں تھیں۔ آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں بھارت میں ۷،۳۳۰ ٹیلی گراف آفس کام کر رہے تھے۔ اس وقت ملک میں ۳۲۱ ٹیلی فون ایکسچینج اور ۸۲۹۸۵ ٹیلی فون تھے۔ ان کے علاوہ ۲۱۶۶ پرائیویٹ اور پرائیویٹ برانچ ایکسچینج بھی کام کر رہے تھے جن کے دائرۂ کار میں مزید ۲۸۱۵۵ ٹیلی فون تھے۔

آزادی کے بعد حکومت نے ٹیلی مواصلات کے شعبہ کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں لے لیا اور اسے محکمۂ ڈاک و تار (پی اینڈ ٹی ڈپارٹمنٹ) کے تحت کر دیا۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کی مدت میں اس کی ترقی محکمۂ ڈاک و تار کے زیر سرپرستی سالانہ بنیاد پر جاری رہی۔ ٹیلی مواصلات کا جدید سامان تیار کرنے کی غرض سے انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز لمیٹڈ کے نام سے پبلک سیکٹر میں ایک کارخانہ کا قیام اسی مدت میں عمل میں آیا، جو واقعی ایک بڑا قدم تھا۔

ترقی کے لیے منصوبہ بندی

چھٹے منصوبے کے اختتام تک محکمہ کے انتظام و انصرام میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ ۱۹۸۵ء میں محکمۂ ڈاک کو ٹیلی مواصلات سے الگ کر دیا گیا اور ٹیلی مواصلات کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا گیا۔ اس طرح ایک کے بجائے دو محکمے ہو گئے۔ بعد میں ۱۹۸۶ء میں ممبئی اور نئی دہلی کے میٹروپالیٹن شہروں میں ٹیلی مواصلاتی خدمات پبلک سیکٹر کی ایک کارپوریشن کے سپرد کر دی گئیں، جس کا نام مہانگر ٹیلی کام نگم لمیٹڈ (ایم ٹی این ایل) ہے۔ ۱۹۸۹ء میں محکمۂ ٹیلی مواصلات کو ایک ٹیلی مواصلاتی کمیشن میں بدل دیا گیا نیز مینوفیکچرنگ اور سروسز کے شعبے میں حکومت کے اختیارات اسے منتقل کر دیے گئے۔

منصوبہ بندی کے ابتدائی دور میں قومی منصوبہ سازوں کی توجہ ٹیلی مواصلاتی شعبے پر نہیں گئی۔ اس زمانے میں ٹیلی مواصلات کی اہمیت اتنی نہیں سمجھی جاتی تھی جتنی کہ آج سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا چھٹے پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک ٹیلی مواصلاتی شعبے میں صرف ۴۸،۷۳ بلین روپے کا سرمایہ لگایا گیا تھا۔ ہمارے قومی منصوبہ سازوں نے ساتواں منصوبہ تیار کرتے وقت ہی ٹیلی مواصلاتی شعبے کی اہمیت تسلیم کی اور اس کے لیے ۴۰،۱۰ بلین روپے مخصوص کیے گئے۔ آٹھویں منصوبے میں اس شعبے کے لیے ۲۳۶،۱۵ بلین روپے مختص کیے گئے ہیں۔

زبردست پیش رفت

آزادی کے ۳۰ سال بعد ملک میں ٹیلیفونوں کی تعداد تقریباً ۱۵ لاکھ تھی۔ اس کے بعد کی دو دہائیوں میں یہ تعداد زیادہ تیزی سے بڑھی، تاہم ٹیلی مواصلات کے شعبے کی زبردست پیش رفت ۱۹۸۵ء سے ہی کی۔ ملک میں ٹیلیفونوں کی تعداد ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲۰ لاکھ سے بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۳۰ لاکھ ہو گئی۔ اگلے دس برسوں میں یہ تعداد قریب قریب

جارگنی ہوگئی اور اضافے کا یہ رجحان مسلسل جاری ہے۔

اس وقت بھارت میں ۲۱۰۰۰ ٹیلی فون ایکسچینج ہیں، جن کی مجموعی صلاحیت ۱۵٫۷۵ ملین لائنوں کی ہے نیز کام کر رہے ٹیلی فونوں کی تعداد ۱۲٫۰۳ ملین ہے۔ آٹھویں منصوبے کے دوران حاصل کی گئی ایک اہم کامیابی نئی ٹکنالوجیوں کا استعمال ہے۔ اس سلسلے کے تحت ملک میں ڈیجیٹل سوئچنگ اینڈ ٹرانسمشن سسٹم، آپٹیکل فائبر سسٹم اور دیہی نیٹ ورک میں ملٹی ایکسس رورل ریڈیو سسٹم کا استعمال ہونے لگا ہے۔

آج ہمارے ٹیلی مواصلاتی نظام کا شمار ایشیا کے سب سے بڑے ٹیلی مواصلاتی نظاموں میں ہوتا ہے۔ ہمارا نیٹ ورک زمینی مواصلاتی نظام کے ساتھ ساتھ گھریلو سیٹلائٹ نیٹ ورک اور دوسرے جدید سوئچنگ اور ٹرانسمشن سسٹموں پر مشتمل ہے۔ نیشنل سبسکرائبر ڈائلنگ (این ایس ڈی) کے ساتھ جڑے ہوئے اسٹیشنوں کی تعداد ۱۱۰۰۰ تک پہنچ گئی ہے اور اس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

بین اقوامی مواصلات کے شعبے میں سیٹلائٹ کمیونیکیشنز اور آبدوزوں کے ذریعے قائم شدہ رابطوں کی بدولت زبردست ترقی عمل میں آئی ہے۔ سمندر پار مواصلات کی قریب قریب پوری ذمہ داری ودیش سنچار نگم لمیٹڈ (وی ایس این ایل) سنبھالتی ہے۔ یہ کام وہ "انٹیل سیٹ" سیٹلائٹ کی مدد سے کرتی ہے، جو بحر ہند کے اوپر ایک ساکن مدار میں قائم ہے۔ اس سیٹلائٹ کا رابطہ دو سیٹلائٹ زمینی اسٹیشنوں سے ہے جن میں سے ایک پونے کے نزدیک آروی کے مقام پر اور دوسرا اتر پردیش میں دہرہ دون میں واقع ہے۔ اس نیٹ ورک کے ذریعے ٹیلی فون، ٹیلیکس اور ٹیلی گراف کی خدمات نیز ڈاٹا سروس دنیا کے قریب قریب تمام حصوں کو فراہم کی جاتی ہے۔ تجارتی اور کاروباری حلقوں کو خاص خاص مقامات کے درمیان ہاٹ لائن، ٹیلیکس، انٹرنیشنل ٹرنک ڈائلنگ اور دیگر ٹیلی کام سروسز فراہم کی گئی ہیں۔

اس وقت تمام ممالک کے ساتھ انٹرنیشنل سبسکرائبر ڈائلنگ سروس دستیاب ہے۔ ٹرانسمشن نیٹ ورک میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور وہ ایک مربوط ڈیجیٹل نیٹ ورک بننے کی طرف گامزن ہے۔ متوازی مائکرو ویو سسٹم اور کوا کیسل کیبل کی جگہ آپٹیکل فائبر کیبلز اور ڈیجیٹل سسٹمز لے رہے ہیں۔ آج ۳۸۰۰۰ روٹ کلومیٹر سے زائد آپٹیکل فائبر کیبلز نصب کیے جا چکے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں کمپیوٹروں کے استعمال میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی ہے اور ڈاٹا ٹرانسمیشن کے لیے ان کی مانگ بڑھی ہے۔ کمپیوٹروں کی بدولت اب ٹیلی کمیونیکیشنز نیٹ ورک کے بندوبست و نگرانی کے لیے ایک زیادہ قابل اعتماد نیٹ ورک بنانا ممکن ہو گیا ہے۔ اب نہ صرف دفاتر میں، بلکہ ٹیلی فون بل تیار کرنے کے نظام، خرابی ٹھیک کرنے کی سروس اور ڈائرکٹری انکوائری سسٹم کے لیے بھی وسیع پیمانے پر کمپیوٹر کا استعمال ہونے لگا ہے۔

سب کے لیے ٹیلی فون

حکومت اپنے پنج سالہ منصوبوں میں دیہی، پسماندہ اور پہاڑی علاقوں کی اقتصادی ترقی پر زور دیتی رہی ہے۔ ساتویں اور آٹھویں منصوبوں کے دوران گاؤوں میں ٹیلی مواصلات کے شعبے میں انقلابی تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اندرون ملک تیار کردہ آلات کی تنصیب کے ساتھ دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل ٹیلی فون ایکسچینجوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ آج ۱۲۱۰۰۰ ایکسچینجوں میں سے ۱۷٬۰۰۰ ایکسچینج دیہی سیکٹر میں واقع ہیں اور ان میں مجموعی طور پر ۱۹ لاکھ لائنیں ہیں۔ ٹیلی مواصلاتی کمیشن نے ہر گاؤں میں ٹیلی فون کی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے ایک بڑا پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت تقریباً ۶۰۰۰۰۰ گاؤوں میں ٹیلی فون کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔ مارچ ۱۹۹۶ء تک یہ سہولت ۲۱۱۰۰۰ گاؤوں میں بہم پہنچائی جا چکی ہے۔

محکمہ ٹیلی کمیونیکیشنز ملک کے اندر ٹیلی مواصلات کا ساز و سامان تیار کرنے پر بھی توجہ دیتا رہا ہے۔ انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز لمیٹڈ کا قیام آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ تب سے پبلک سیکٹر کی اس کمپنی نے نمایاں ترقی کی ہے۔ آج اس کی مینوفیکچرنگ اکائیاں بنگلور، سرینگر (جموں و کشمیر)، پالگھاٹ (کیرالہ)، نینی، مانک پور اور رائے بریلی (اتر پردیش) چھ شہروں میں کام کر رہی ہیں۔

ان فیکٹریوں میں پُش بٹن ٹیلی فون آلات، الیکٹرانک ڈیجیٹل لوکل اور ٹرنک آٹومیٹک ایکسچینج، ڈیجیٹل کمیونیکیشن اکوپمنٹ، کمپیوٹر سافٹ ویئر وغیرہ مختلف قسموں کے آلات تیار کیے جا رہے ہیں۔ ان کے بعد دو اور کارخانے قائم کیے گئے ان میں سے ایک کا نام ہندوستان ٹیلی پرنٹرز لمیٹڈ ہے جو ٹیلی پرنٹر تیار کرتا ہے۔ دوسرا کارخانہ ہندوستان کیبلز لمیٹڈ ہے، جو ٹیلی کام کیبلز تیار کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ ایک اور کارخانہ بھیلائی (مدھیہ پردیش) میں مائکرو ویو ٹاورز تیار کرنے کے لیے ۱۹۷۸ء میں قائم کیا گیا ہے۔

نرم صنعتی پالیسی اور اس کے بعد

حکومت کی نرم صنعتی پالیسی اور ٹیلی فون کا تمام ساز و سامان پرائیویٹ سیکٹر میں تیار کرنے کے فیصلے سے ٹیلی مواصلات کا سامان اندرون ملک تیار کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ سوئچنگ، کیبلز اور ٹیلی فونوں کی ضرورتیں خود اپنے تیار کردہ پروڈکٹس سے پوری کرنے کے قابل بن گئے ہیں بلکہ یہ اشیاء غیر ممالک کو برآمد کرنے کی ہماری صلاحیت میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ نئی صنعتی پالیسی اور قواعد و ضوابط کی پابندیاں اٹھا لیے جانے سے سیلولر موبائل ٹیلی فونوں، ریڈیو پیجنگ سروس اور الیکٹرانک ڈاک یعنی ڈاک اور ویڈیو ٹیکس جیسی جدید ترین خدمات کے شروع کیے جانے کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔

اس طرح بھارت میں ٹیلی مواصلات کی تکنالوجی میں ایک زبردست انقلاب آگیا ہے اور وہ دستی الیکٹرو مکینیکل سسٹم کے زمانے سے نکل کر الیکٹرونک اینا لاگ اور اس کے بعد ڈیجیٹل سسٹم کے دور میں پہنچ گئی ہے۔ تکنالوجی روز بدل رہی ہے۔ انٹیگریٹڈ سروسز ڈیجیٹل نیٹ ورک،

باقی صفحہ ۲۶ پر

توانائی کے روشن امکانات

ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے تیل اور قدرتی گیس کو معیشت کا ایک انتہائی اہم جزو قرار دیا جاسکتا ہے۔ توانائی سے ترقی کی رفتار میں تیزی آتی ہے۔ تیل اور قدرتی گیس توانائی کی عالمی پیداوار اور کھپت کے اہم عناصر ہیں۔ اس وقت ملک میں جو توانائی استعمال ہوتی ہے اس میں تیل کا حصہ تقریباً ۳۵ فی صد ہے۔ سڑک ٹرانسپورٹ پر بڑھتے ہوئے انحصار اور معیشت کی مسلسل شرح ترقی کے ساتھ ہی مستقبل میں اس کی فی صد شرح میں اضافہ بھی متوقع ہے۔

اس وقت ملک میں کچے تیل کی مانگ میں سالانہ چھ فی صد سے زیادہ کا اضافہ ہو رہا ہے جب کہ اندرون ملک پیداوار میں محض برائے نام اضافہ کا امکان ہے۔ اس لیے سال بہ سال مانگ اور فراہمی میں کمی بڑھتی جائے گی اور موجودہ اندازوں کے مطابق ۱۹۹۰-۹۱ء میں خود کفیل ہونے کی ۷۰ فی صد کی حاصل شدہ سطح ۲۰۰۰-۱۹۹۱ء تک گھٹ کر ۲۳ فی صد کی سطح تک آجانے کا امکان ہے۔ تیل کی قیمت یا زر مبادلہ کی شرح کا ادائیگیوں کے توازن پر بھی خراب اثر پڑے گا اور ملک کے اقتصادی استحکام پر بھی۔

پٹرولیم مصنوعات کی بڑھتی ہوئی مانگ پوری کرنے کے لیے حکومت نے ملک میں خام تیل کی پیداوار بڑھانے کے لیے بہت سے ٹھوس قلیل اور طویل مدتی اقدامات کیے ہیں۔ قلیل مدتی اقدامات میں جلد پیداوار شروع کرنے کے انتظامات، موجودہ تیل کے کنوؤں کو گہرا کرنے، مستریہ وقت سے زیادہ کام کرنے اور بہتر تکنالوجی استعمال کرنے کے اقدامات شامل ہیں۔

تیل کے معاملے میں اطمینان کے لیے مجوزہ حکمت عملی

بڑھتی ہوئی تیل کی مانگ کے پیش نظر تیل کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کے لیے ملک میں تیل کی تلاش کی کوششوں کو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پس منظر میں حکومت نے تیل تلاش کرنے کے کام میں تیزی لانے کا ایک پروگرام (اے پی ای ایکس) بنایا ہے۔ وزارت پٹرولیم و قدرتی گیس نے بھی تیل کی تلاش کی سرگرمیوں کو وسعت دینے کے لیے تیل تلاش کرنے کی ایک نئی لائسینسنگ پالیسی (این ایل ای پی) تجویز کی ہے۔

مقابلہ جاتی قیمت پر غیر ممالک میں کافی تیل حاصل کرنے کے لیے پبلک سیکٹر کی تیل کی انڈر ٹیکنگس کو زیادہ مالی اور کارگزاری کے اختیارات کی ضرورت ہوگی۔ قومی تیل کمپنیوں کی کوششوں میں تعاون دینے کے لیے تیل کی تلاش اور پیداوار میں نجی سرمایہ کاری کی اہم پالیسی اقدامات کے ذریعے حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

سرکردہ ملکوں اور کمپنیوں سے اندرون ملک اور بیرون ملک بھی تیل تلاش کرنے اور پیداوار کرنے کے مقصد سے معاہدے کیے گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تیل کی تلاش اور پیداوار کے کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا نیز ملک میں تیل اور گیس کی تلاش کے لیے زیادہ سرمایہ بھی آئے گا اور نئے نئے ارضیاتی نظریات بھی سامنے آئیں گے۔ قومی تیل کمپنیوں کی از سر نو ڈھانچہ سازی کی بھی کوششیں کی جارہی ہیں تاکہ ملک میں وسائل کی قدر و قیمت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوسکے۔

قدرتی گیس بطور گھریلو ایندھن

۱۹۸۰ء کے دہے کے شروع سے قدرتی گیس کے استعمال میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت استعمال ہونے والی بنیادی توانائی میں قدرتی گیس کا حصہ ۸ فی صد ہے۔ سال رواں میں ۱۷.۵ ایم۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ ڈی قدرتی گیس پیدا ہونے کی توقع ہے جو کہ دو کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن پٹرولیم مصنوعات کی سالانہ پیداوار کے مساوی ہے۔ گیس کا استعمال خاص طور سے بجلی اور کیمیائی کھادوں کے شعبہ میں کیا جاتا ہے اور صنعتی ایندھن کے طور پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ گجرات، آسام اور تریپورہ میں قدرتی گیس کو چھوٹے پیمانہ پر گھریلو ایندھن کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

جنوبی بیسین فیلڈ اور گندھار فیلڈ کی مزید ترقی کے ذریعہ گھریلو گیس کی پیداوار بڑھائی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں نئی فیلڈوں کو بھی ترقی دی جارہی ہے مثلاً ایس۔ اسینڈز، بی۔ ۵۵ وغیرہ کی فیلڈیں، جو مغربی ساحلی علاقوں میں ہیں۔

اب ایل پی جی آسام میں دولیاجان، مدھیہ پردیش میں جے پور، گجرات میں ہزیرا اور واگھوڑیا نیز مہاراشٹر میں اورن میں گیس سے حاصل کی جارہی ہے۔ دو نئے کارخانے آسام میں لکوا اور مہاراشٹر میں اوسار کے مقام پر قائم کیے جارہے ہیں۔ قدرتی گیس کی بڑھتی ہوئی مانگ اور گھریلو وسائل سے اس کی محدود دستیابی کے پیش نظر حکومت نے

مشرقِ وسطیٰ سے قدرتی گیس درآمد کرنے کے اقدامات کیے ہیں۔

درآمد شدہ قدرتی گیس ایل این جی کی دستیابی کے بعد شمالی اور مغربی ہندوستان نیز ہندوستان میں بھی قدرتی گیس کی اضافی مانگ پوری کرنا ممکن ہو جائے گا۔ حکومت نے اصولی طور پر جنوبی گیس گرڈ کے تصور کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔

اس وسیلہ کے مقامی استعمال کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت نے شمال مشرقی علاقے میں قدرتی گیس کی رعایتی قیمت مقرر کی ہے۔ وسائل کو، جو دوبارہ پورے نہیں کیے جا سکتے، زیادہ عرصہ تک باقی رکھنے کے لیے دو رخی حکمت عملی اور اشتراکی عمل اختیار کرنا ہوگا۔ قومی سطح پر ٹرانسپورٹ، صنعت اور زراعت کے شعبوں نیز گھریلو شعبہ میں پٹرولیم مصنوعات کی بچت کے لیے بہت سے اقدامات کرنے ہوں گے۔ ان میں ایندھن کی صلاحیت بڑھانے کے لیے مناسب حال طریقے اختیار کیے جانے اور ٹرانسپورٹ سیکٹر میں ٹریننگ کے پروگرام، ایندھن کی بچت کرنے والے طریقوں کو فروغ دینے اور صنعتی و زراعتی سیکٹر میں بہتر آلات کے فروغ کی طرح کے اقدامات شامل ہیں۔

بین اقوامی توانائی کانفرنس

بڑی سطح پر توانائی پیدا کرنے والے اور استعمال کرنے والے ملکوں کے درمیان مفید تعاون کی فوری ضرورت ہے۔ وسیع سیاسی، اقتصادی اور ماحولیاتی تناظر میں پیداوار کرنے اور استعمال کرنے والوں ملکوں کے درمیان توانائی کے شعبہ میں اشتراک عمل کے لیے نیز تیل اور توانائی کے دیگر وسائل کو دیرپا اقتصادی ترقی میں استعمال کرنے کے لیے بین اقوامی توانائی کانفرنس (آئی ای سی) کو ایک فورم کا درجہ دیا گیا ہے۔ توانائی کے عالمی وسائل کو زیادہ سوچ سمجھ کر اور بہتر صلاحیت کے ساتھ استعمال کرنے نیز فروغ دینے کے لیے پیداوار کرنے والے اور استعمال کرنے والے ملکوں میں زیادہ تعاون کے پہلو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

●

بقیہ: فانوس

داداجان کی آنکھوں کا فانوس میرے دماغ پر بری طرح مسلط تھا۔ اسکول میں استاد کا لکچر اور آج کا سبق کچھ میرے پلے نہیں پڑا۔ تمام وقت دادا جان کی کہی باتوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

داداجان کل کیا کہہ رہے تھے۔ وہ کون سی بات تھی جسے وہ چھپانا چاہ رہے تھے۔ بس یہی سب کچھ ذہن پر حاوی رہا مگر یہ لاعلمی کی کیفیت دوپہر سے زیادہ نہیں رہی۔ اسکول سے تھکا جب گھر پہنچا تو دور ہی سے رونے دھونے کی آوازیں کان میں پہنچیں۔

بغیر کچھ سوچے سمجھے بدحواس داداجان کے کمرے کی طرف دوڑا۔ لیکن خالہ جان نے راستے میں روک کر کہا:

کہاں جا رہے ہو میرے لعل؟ داداجان تو سو رہے ہیں۔ تمہارے ماں باپ کا بھی برا حال ہے۔

ابو جان پر نظر پڑی جو رونی صورت بنائے دیوار سے سر لگائے کھڑے تھے۔ آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ پورے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ گلے میں اینٹھن سی محسوس کرنے لگا۔ آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔

داداجان کی کہی بظاہر بے معنی باتیں اب میری سمجھ میں آگئیں تھیں۔ شاید قبل از وقت ان کو آج کے حادثے کا علم ہو گیا تھا! اب حافظ کے شعر کا مطلب بھی میری سمجھ میں آرہا تھا جسے داداجان بار بار گنگنا رہے تھے۔

میں نے اپنے دانتوں کو سختی سے ایک دوسرے پر جما لیا تاکہ جسم کی کپکپاہٹ میرے کاموں میں مانع نہ ہوں۔ بے چینی کے عالم میں کانپتی انگلیوں سے اپنے اسکول بیگ سے مضمون نویسی کی کاپی نکالی اور ادھورے مضمون کو پورا کیا۔

دادا جان، آپ غلط کہہ رہے تھے۔ آج جس کو خزاں کی ٹھنڈی ہوا نے توڑ دیا وہ اپنے گھر کے درخت کا تنہا خشک پتا نہیں تھا بلکہ میرا ننھا سا دل تھا اور ہاں دادا جان آپ کی یادیں ہمارے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔

●

بقیہ: کپڑا

والی ملوں میں روئی کے ریشوں کی ۸۸ فی صد سے زیادہ کھپت ہوتی ہے۔ کپڑے کے سیکٹر میں فائبر کی کل کھپت میں ۶۵ فی صد حصہ روئی کے ریشوں کا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد ملک میں روئی کی پیداوار ۵۱-۱۹۵۰ء میں تین ملین گانٹھوں سے بڑھ کر ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۱۶ ملین گانٹھیں ہو گئی۔

● سنہری ریشے یا پٹ سن کو ۲۱ ویں صدی کا ریشہ سمجھا جا رہا ہے۔ اپریل ۱۹۹۵ء سے مارچ ۱۹۹۶ء کے دوران ملک میں پٹ سن کی ۴۳ر۱ ملین ٹن مصنوعات تیار کی گئیں۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۲۵ر۶ ملین روپے کی پٹ سن کی مصنوعات غیر ممالک کو برآمد کی گئیں۔

●

بقیہ: ٹیلی مواصلاتی شعبے کی زبردست پیش رفت

جس میں مختلف ذرائع، آڈیو ڈاٹا اور ویڈیو سے موصولہ الیکٹرانک سگنلز کو عام سوئچنگ اور ٹرانسمیشن پر بھیجا جاتا ہے، تیزی سے رواج پا رہا ہے۔ دہلی، ممبئی، کلکتہ، چنئی، حیدرآباد، بنگلور، احمد آباد، جے پور، رانچی، لکھنؤ اور کانپور گیارہ شہروں میں تو یہ رائج بھی کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی کانفرنسیں، الیکٹرانک ڈاک، صوتی ڈاک، ویڈیو ٹیکس اور دوسری بہت سے خدمات بھی جلد ہی عام ہو جائیں گی۔

نرم بنائی گئی ٹیلی مواصلاتی پالیسیوں اور ٹیلی مواصلاتی شعبے میں پرائیویٹ سیکٹر کے داخلے کے نتیجے میں ترقی کی رفتار میں تیزی آئے گی اور آنے والے دنوں میں خدمات کی کوالٹی اور کارکردگی میں بھی کافی بہتری ہو گی۔ امید ہے کہ اعلا کوالٹی کی ٹیلی مواصلاتی خدمات میں تیز رفتار توسیع و اضافہ کی بدولت "ہر شخص اور ہر جگہ کے لیے" ٹیلی فون مہیا کرنے کا خواب پورا ہو سکے گا نیز قومی اور بین اقوامی حدود کو پار کرتے ہوئے عالمی اتحاد اور امن کے لیے راہ ہموار ہو گی۔ ●

اعجاز بن ضیا او گانوی

ایڈس — سبب اور انسداد

انسان کا وجود اربع عناصر یعنی مٹی، ہوا، آگ پانی کے اشتراک کا نتیجہ ہے اور اس بات سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ تمام ذی روح کی حیات میں صحت منداور غیر صحت مند عناصر کو دخل ہے۔ چاہے وہ نباتات ہو، حیوانات ہو یا یہ حضرت انسان — ان تمام زندگیوں کے ساتھ فنا یعنی موت بھی لاینفک کی مانند لاینحل صداقت پر مبنی اٹل حقیقت ہے۔ چاہے طویل سے طویل تر عمر کے رفرف پر سوار کیوں نہ ہو دیر یا سویر اس صداقت کو لبیک تو کرنا ہی پڑتا ہے اور یہ بھی یقینی امر ہے کہ کسی بھی مرض میں مبتلا یہ حیات اکثر و بیشتر دائم الحبس بن جاتی ہے۔ کوئی اس سے پوچھے جسے دائمی مرض آ جکڑا ہو اور اسے بھی احساس ہو کہ یہ مرض لادوا ہے تو پھر اس کے قطرہ قطرہ پگھلنے کا اندازہ لگائیے۔ ایسی مہلک بیماریاں ہر دور میں ابھرتی اور پنپتی رہی ہیں اور پھر اس پر قابو بھی پایا جاتا رہا ہے۔ ہر نئی بیماری ایک آفت ناگہانی کی مانند وبا بن کر مہلک نما ہمارے درمیان در آتی ہے اور اس پر تحقیق و ادویہ ایجاد کرتے کرتے سیکڑوں اور ہزاروں کو اپنی گرفت میں لے کر موت کی آغوش میں پہنچا دیتی ہے اور اس سے پہلے کہ داخلی یا خارجی سطح پر یا یوں کہیں کہ بین اقوامی سطح پر قابو پا لیا جائے تو ایک نئی بیماری کی گھس پیٹھ پھر شروع ہو جاتی ہے اور پھر اس کے نتائج تو معلوم ہی ہیں۔

ہمارے درمیان آج جتنی بھی بیماریاں ہیں ان میں سے زیادہ تر اپنی جوانی کے زعم میں کیا کیا گل کھلا چکی ہیں، اس کے اعداد و شمار سرکاری کھاتوں میں محفوظ ہیں۔ میرا منشا آنکڑے پیش کرنا نہیں اور نہ ہی ان بیماریوں کی نشاندہی کرنا ہے، جن پر ہم قابو پا چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے درمیان ایسی بھی بیماریاں موجود ہیں جن پر ہم حتمی طور پر قابو تو نہ پا سکے لیکن کسی حد تک جزوی طور پر انسداد کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ابھی جس نئی آفت سے متعلق شور و غوغا ہے تمام عالمی برادری اس سے نجات حاصل کرنے کی سر جوڑ کوشش کر رہے ہیں وہ ہے "ایڈس" (AIDS)

آج کل ساری دنیا میں "ایڈس" تہلکہ مچانے والا ایک ہوّا ہے۔ ٹی وی، ریڈیو، اخبارات و دیگر نشر و اشاعت کے وسیلے سے "ایڈس" سے متعلق مسلسل عوام کو خبردار کیا جا رہا ہے۔ عوام میں اس مرض سے متعلق بے شمار مشتبہ روایتیں۔۔۔۔ پھیلتی جا رہی ہیں، جس کا سائنسی سماجی و اخلاقی مداوا لازمی ہے۔ ورنہ عوام الناس پر پھیلے نفسیاتی برے اثرات مرض کی شرح اموات (DEATH RATE) میں اضافہ کا سبب بن سکتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسم میں دفاعی صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے مختلف امراض ایک ساتھ ہی حملہ آور ہوتے ہیں جو مستقبل میں انسان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ جسم کو کمزور پا کر کھانسی، بخار، تپ دق یہاں تک کہ کینسر، بھوک کی کمی، جسمانی کمزوری، لاغرپن، پیچش وغیرہ امراض ایک ساتھ مل کر دھاوا بول دیتے ہیں تو یہ صورت حال بڑی ہی دشوار کن اور خوفناک ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال کو ہی مختلف امراض کا مجموعہ یعنی انگریزی زبان میں "ایڈس" کہہ سکتے ہیں۔ "ایڈس" انگریزی کے چار لفظوں (ACQUIRED IMMUNO DEFICIENCY SYNDROME) کے اشتراک کے ابتدائی حروف سے بنا ہے۔

جیسا کہ میں نے اشارہ کیا ہے کہ "ایڈس" جسم کی دفاعی صلاحیت کے معدوم ہو جانے سے پیدا ہونے والے مختلف امراض کا اجتماع یا ملی ہوئی شکل ہے جس طرح کسی ملک کی دفاعی قوت کے کمزور ہو جانے سے دیگر پڑوسی ملک جو کبھی بھی اس کے دشمن نہیں تھے اور نہ کبھی مخاصمت رہی اس پر بلا وجہ اجتماعی طور پر حملہ آور ہو کر اسے اپنے تصرف میں لے لیتے ہیں اسی طرح جسم میں بھی دفاعی صلاحیت نہیں رہنے کی وجہ سے چھوٹے موٹے جراثیم، زہریلے مادے (VIRUS) وغیرہ کے جراثیم ایک ساتھ مختلف امراض پیدا کر دیتے ہیں جس سے اثر انداز ہو کر جسمانی ریاست برباد ہو جاتی ہے۔ عام طور پر یہ جراثیم کمزور ہونے کے مواقع کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"ایڈس" متعدی بیماری نہیں اس سے متعلق کچھ روایت صداقت سے پرے ہے۔

اردو شعبہ، بہار قانون ساز اسمبلی، پٹنہ-۸۰۰۰۱۵

جیسے کھانسنے، چھینکنے یا ہاتھ ملانے سے یہ بیماری بڑھ سکتی ہے یا اس کے مریض کے پاس بیٹھنے بات چیت کرنے سے یہ بیماری لگ سکتی ہے۔ تو بھی یہ بات لازمی ہے کہ لوگ چومنے سے، دوسروں کے پہنے ہوئے کپڑوں کے پہننے سے، کتا، مرغا، سور وغیرہ متعدی پھیلانے والے جانوروں سے محلہ یا گاؤں میں کسی ایک فرد کے متاثر ہو جانے سے، کسی طرح کا خون چڑھانے سے اس بیماری میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس مرض کو تقویت اسی وقت ملتی ہے جب اس مرض میں مبتلا عورت کے ساتھ مجامعت کی جائے، یا متاثر مرد کے نطفے کا اخراج صحت مند عورت میں منتقل ہو، اثر انداز مریض کا خون کسی اچھے شخص کو چڑھایا جائے ایسی عورت کا دودھ جو اس بیماری سے متاثر ہے کسی بچے کو پلایا جائے یا ایسی زچہ جو اثر انداز ہے اس کے بچے کو وغیرہ — کسی حد تک اس کے VIRUS رال اور آنسوؤں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ غیر متعدی شکل میں ہوتے ہیں۔

"ایڈس" معمولی سردی اور زکام کی طرح نہیں ہے جن کے جراثیم ایک دو دنوں کے بعد ہی اپنا اثر دکھانے لگتے ہیں اس میں متعدی حملے کے درمیان کی مدت ایک یا دو برس کی ہو سکتی ہے۔ جسم میں دفاعی صلاحیت کے کم ہو جانے سے اور بار بار اس سے اثر انداز ہونے سے سرطان ہو جاتا ہے، بار بار بخار آتا ہے جو خصوصًا چار ہفتے تک لگاتار رہتا ہے۔ گلا، بغل یا دیگر خلیے کے رسولی یا غدود میں سوجن آجاتی ہے۔ دو ہفتے سے زائد مسلسل دست کی شکایت رہتی ہے، مریضوں میں بھوک کی کمی اور اس کے وزن میں دن بدن کمی لاحق ہونے کی شکایت ہو جاتی ہے۔ کھانسی، بخار، جلدی سرطان، بھوک کی کمی، پیچش وغیرہ جیسی بیماریاں پہنچتی ہیں۔ مذکورہ امراض کے مشترکہ حملے کی وجہ سے جسمانی دفاعی صلاحیت میں بالترتیب بے انتہا کمی آجاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں کسی بھی متعدی بیماری سے لڑنے کی جسم کی قدرتی طاقت فنا ہو جاتی ہے اور مریض کچھ ہفتے، مہینے یا سال دو سال میں مر جاتا ہے۔

"ایڈس" کے تحت آنے والے جن امراض کا ذکر اوپر گزر چکا ہے ان کے برعکس خورد و نوش، رہن سہن پر ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ ضبط نفس (RESTRAINT) ہی اس بیماری کی سب سے بہتر دوا ہے۔ مقوی اور سادہ غذا، سبزیوں کا زیادہ استعمال اور گوشت سے پرہیز کرنے سے کسی حد تک خود کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ "ایڈس" جتنی بیماریوں کا مجموعہ ہے اس میں ہر ایک بیماری کا علاج ایک وقت میں ممکن نہیں۔

اسی لیے درمیانہ ایسی زندگی کا اصول اپنایا جانا چاہیے کہ جسم میں کوئی خرابی لاحق پیدا نہ ہو پائے۔ عام طور پر جو بھی غذا لی جائے، اسے چبا چبا کر اور وقت پر کھایا جائے تاکہ غذا پیٹ میں جا کر مناسب طریقے سے ہضم ہو سکے۔ پیٹ کو صحت مند رکھنے کے لیے قابل ہضم، غذا یا اجناس، پکے ملائم پھل، دودھ، شہد، ساگ سبزی کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں سویرے سونا اور الصباح جاگنا کے مقولے پر سدا عمل کرنا چاہیے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل اٹھ کر حوائج ضروریہ سے سبکدوش ہو کر کھلی فضا میں چہل قدمی اور کسرت کرنی ضروری ہے۔ جسم کے قدرتی جوڑوں کو ساکت یا بے مصرف نہیں رکھنا چاہیے اس کے مطالبے کو لحاظ خاطر میں لانا چاہیے۔ بھوک، پیاس لگنے پر ہی لیکن فورًا خورد و نوش کرنا چاہیے۔ حوائج ضروریہ محسوس ہوتے ہی اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اس میں تاخیر ہونے سے بیماریوں کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ عام زندگی میں گاہے گاہے سفوف ترپھلا (ہرڑ، بہیڑا اور آملہ) کا استعمال سودمند ہے۔ اس سے قبض، ریاح کا جماؤ یا بھوک کی کمی نہیں ہونے پاتی ساتھ ہی ساتھ جسمانی قوت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اچھے کردار، مقوی غذا اور مناسب ادویہ کے استعمال سے کف، صفرا (پت) ریح وغیرہ کے رجحان میں اعتدال قائم رہتا ہے اور انسان ہر مرض سے پاک ہو کر طویل عمر حاصل کر سکتا ہے۔ صحت مند زندگی کے لیے شراب نوشی، گوشت، مچھلی، انڈا، لہسن، اچار، مرچ، زیادہ میٹھا کھانا وغیرہ قابل ترک ہیں گائے کے دودھ کا استعمال زندگی کے روزنامچے میں شامل کر لینے سے حیرت انگیز فوائد سامنے آتے ہیں۔

مذکورہ شق میں جن جن احتیاطی قدم کی جانب اشارہ منضبط ہے وہ کسی حد تک الگ الگ عام بیماریوں کے لیے تو ہو سکتا ہے بالمشافہ "ایڈس" کے لیے نہیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف بیماریوں کے یکجا ہونے کا نام ہی "ایڈس" ہے اور اس زمرے میں کب، کیوں اور کیسے پر اختصار و ایجاز کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے، لیکن اصل واقعہ کی جانب اشارہ بھی لازمی ہے — اور جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہمیں درمیانہ زندگی کا اصول اپنانا چاہیے تاکہ جسم میں کوئی خرابی لاحق نہ ہو تو ہماری نگاہیں اس نکتہ پر آ کر جیسے ٹھہر جاتی ہیں کہ ہمارا معاشرہ یعنی ہندوستانی قدیم ثقافت اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتی کہ اس حیات عارضی کے دور میں مغربی تہذیب کو اپنائیں۔ بے راہ روی اختیار کریں ہمارا قدیم ثقافتی اثاثہ مغربی تہذیب کی تقلید میں پامال ہوا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مغربی آب و ہوا مشرقی آب و ہوا سے بے میل ہے۔ یوں تو بہت ساری باتیں ہیں لیکن یہاں صرف ایک یہ کہ جہاں کا کلچر اس بات کی اجازت دے اور اسے قانونًا جائز قرار دیا جائے کہ ہم جنس کے ساتھ شادی بیاہ میں کوئی مضائقہ نہیں تو پھر غور کیجیے؟ مغربی تہذیب کو الگ رکھ کر ہم اپنے ترقی یافتہ دور پر نگاہ ڈالیں تو یہاں بھی قدرے بے راہ روی کے شکار لوگ نظر آئیں گے۔ ہم جنس سے شادی بیاہ نہ سہی لیکن لواطت سے نفس کی تسکین۔ چہ معنی دارد؟ اس کے علاوہ یہ مغربی تہذیب کی تقلید کا ہی خمیازہ ہے کہ یہاں کی بعض اونچی سوسائٹی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں اس بات کی کھلی چھوٹ ہے، ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شادی بیاہ سے قبل بھی میل ملاپ، گھومنا پھرنا اور نہ جانے کیسی کیسی بیہودہ حرکت بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اسے فیشن تصور کیا جاتا ہے اگر اس پر روک ٹوک کی بات اٹھتی ہے تو بزرگوں کے کو GENERATION GAP کا پیرا ہن دار کر کے انھیں خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے فعل نے بھی مہلک بیماریوں کو ہوا دی ہے اور اس سے "ایڈس" کی مشمولہ بیماریوں کو تقویت ملی ہے۔ اطبا کا قول

باقی صفحہ 19 پر

عظیم اقبال

دُم دار ستارے ۔ روایت اور حقیقت

بے کراں آسمان کی مانوس فضا میں جب کوئی نامانوس شے نظر آجائے تو اسے دیکھ کر اس کی حقیقت جاننے کی بجائے بیشتر لوگ وسوسوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی فطری ضعیف الاعتقادی عود کر آتی ہے اور وہ سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ دُم دار ستاروں کے ظہور سے ایک ایسا ہی ماحول بنتا ہے۔

اس وقت آسمانِ بسیط میں ایک نیا دم دار ستارہ (COMET) دکھائی دے رہا ہے۔ اس صدی کا یہ ایک اہم ترین دُم دار ستارہ ہے۔ اس دُم دار ستارے کا نام دو سائنس دانوں کے نام پر، ہیل بوپ' (HALE-BOPP) رکھا گیا ہے۔ گزشتہ نومبر ۱۹۹۶ء سے ہی یہ آسمان میں چمکنے لگا ہے۔ اس دُم دار ستارے کو دور بین کے بنا بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سیارہ مشتری (JUPITER) کے راستے سے دور اس دم دار ستارے کی دریافت دو امریکی شوقیہ خلائی سائنس دانوں نے کی تھی۔ ایلین ہیل (ALLEN HALE) اور ٹامس بوپ (THOMAS BOPP) نے یہ دریافت ۲۳ جولائی ۱۹۹۵ء کو کی تھی۔ یکم اپریل ۱۹۹۷ء سے یہ دُم دار ستارہ مزید روشن ہو گیا ہے۔ ابھی یہ آفتاب کی جانب گامزن ہے۔

خلائی سائنس دانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس دم دار ستارے کی دُم نیلی، سبز ہو جائے گی، مزید بڑی اور چمکیلی دکھائی دے گی۔

ہبل خلائی ٹیلی اسکوپ سے اس دم دار ستارے کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ دراصل یہ دم دار ستارہ برف اور دھول کا تودہ ہے۔

ہیل بوپ دُم دار ستارہ زمین سے سات خلائی اکائی کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک خلائی اکائی ۱۴ کروڑ ۹۶ لاکھ ۴ ہزار ۵۰۰ کلو میٹر ہوتی ہے۔ امکانی طور پر یہی زمین سے آفتاب کی اوسط دوری ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دونوں خلائی سائنس دانوں نے الگ الگ مقامات سے اس دُم دار ستارے کو دیکھا۔ نیو میکسکو میں ایلن ہیل نے اپنی سولہ انچ کی دور بین سے اَبھی ٹیریم ستاروں کی انجمن میں اس دم دار ستارے کو دیکھا۔ اسی رات ٹامس بوپ نے بھی ایری زون کی فضا میں اپنی ۱۷٫۵ قطر کی دور بین سے اسے دیکھا۔ خلائی سائنس دانوں کو اس فاصلے پر دم دار ستارے کی چمک سے کافی حیرت ہوئی۔ سائنس دانوں کے خیال میں گزشتہ ۲۰ سالوں میں یہ روشن ترین دُم دار ستارہ ثابت ہوگا۔ اس دم دار ستارے کو آفتاب کے قریب پہنچنے میں تقریباً ڈیڑھ سال لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ خلائی سائنس دانوں کو اس کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا ہے۔

اس دریافت کے دو ہفتے بعد خلائی سائنس دانوں نے شمار کیا کہ یہ دم دار ستارہ آفتاب کا ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً ۴ ہزار سال لیتا ہے۔ خلائی سائنس داں برائن مائسن کے بقول یہ دم دار ستارہ ۱۸۱۱ کے گریٹ کامیٹ جیسا ہی ہے، جس کی دُم ایک خلائی اکائی کے مساوی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہیل بوپ جیسے روشن دُم دار ستارے آسمان میں شاذ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ سارے دُم دار ستارے دُم دار نہیں ہوتے۔ اپنے سفر کے دوران کوئی ایسا ستارہ آفتاب سے پرے جاتے ہوئے محض ایک غیر شفاف برف کا گولہ ہوتا ہے۔ اس برف کے گولے میں جو منجمد گیسیں ہوتی ہیں، ان میں امونیا، میتھین اور کاربن ڈائی آکسائڈ خاص ہیں۔ ان میں گرد بھی ہوتی ہے۔ آفتاب کے قریب پہنچنے پر اس ستارے کی دُم دکھائی دیتی ہے۔ شمسی توانائی دُم دار ستارے کے بالائی حصے (COMA) کو گرم کر دیتی ہے اور گیسوں میں بھاپ بننے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آفتاب سے دور رہتے وقت یہ گیسیں ٹھوس ذرات میں منجمد ہو جاتی ہیں۔ شمسی توانائی کے زیرِ اثر یہ گیسیں کافی پُرکشش چمک دار دُم بنا لیتی ہیں۔ کچھ دُم دار ستاروں کی دُم اس قدر روشن ہو جاتی ہے کہ یہ دن کے وقت بھی دکھائی دیتی ہے۔ دم دار ستارے کی دُم ہمیشہ آفتاب سے دوسری سمت میں ہی ہوتی ہے۔

ایڈمنڈ ہیلے (EDMUND HALLEY) نے ثابت کیا کہ دُم دار ستارے نظامِ شمسی کے حصے ہیں۔ سیاروں کے مدار دائرہ نما ہوتے ہیں، جب کہ دُم دار ستاروں کے مدار کافی پُرپیچ ہوتے ہیں۔ اسی سبب دُم دار ستارے کبھی کبھی آفتاب کے بالکل قریب آجاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ آفتاب سے بے حد دور بھی چلے جاتے ہیں۔

گنج ۲ بتیا۔ ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

۱۹۹۵ء میں ہیلے کا دُم دار ستارہ نمودار ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں ہیاکوٹاکے (HYAKUTAKE) دُم دار ستارہ ظہور پذیر ہوا اور اس سال ہیل بوپ دُم دار ستارہ جلوہ نما ہوا ہے۔

دُم دار ستاروں کی اب تک معلوم تعداد ۴۵ ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ شو میکر لیوی، مشتری (JUPITER) کے نو دُم دار ستاروں کے خاندان کا ہی ایک رکن تھا۔ اس دُم دار ستارے کے ۲۱ ٹکڑے مشتری سیارے پر ٹوٹ کر بکھر گئے۔ جولائی ۱۹۹۴ء میں یہ حادثہ ہوا۔ بعد میں خلائی مطالعہ سے پتا چلا کہ ۸ جولائی ۱۹۹۲ء کو یہ دُم دار ستارہ سیارہ مشتری سے ۴۰۰۰۰ کلومیٹر کے فاصلے سے گزرا تھا۔ یہ فاصلہ اس قدر کم تھا کہ اس بسیط سیارہ کی قوت کشش سے اس دُم دار ستارے کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ نتیجے کے طور پر ہر ٹکڑا اپنے آپ میں چھوٹا دُم دار ستارہ بن گیا۔

ویسے 'ہیلی' دُم دار ستارے کو ہی اب تک کا سب سے روشن دم دار ستارہ ہونے کا فخر حاصل رہا ہے، لیکن اس وقت "ہیل بوپ" نے اندرونی نظام شمسی میں داخلہ پا لیا ہے۔ یکم اپریل ۱۹۹۷ء سے یہ دُم دار ستارہ روشن ترین اور پُرکشش ترین دم دار ستارے کے طور اپنا مقام بنا چکا ہے۔

دُم دار ستارے کی دُم کی لمبائی ایک سے دس کروڑ کلومیٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ یہی دُم اس کی وجہ تسمیہ بنی ہے۔ اب تک پیمائش کی گئی سب سے بڑی دُم ۱۸۴۳ء کے گریٹ کامیٹ کی ۳۰ کروڑ کلومیٹر یعنی زمین اور آفتاب کے درمیانی فاصلے سے دوگنی لمبی تھی۔ دُم دار ستارہ جیسے ہی آفتاب کی جانب بڑھنے لگتا ہے، اس کی دُم کی لمبائی بڑھتی جاتی ہے۔ آفتاب سے دور ہٹتے وقت یہ دُم چھوٹی ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہے۔

جب بھی دُم دار ستارہ آفتاب کی گردش کے بعد لوٹتا ہے، اس کی جسامت کم ہو جاتی ہے۔ اس کے بننے اور سکڑنے کے عمل کے دوران بہت سی دھول و گیس خلا میں پھیل جاتی ہے۔ ہیلی دُم دار ستارہ اپنے آفتابی سفر کے دوران اپنے وزن کا دس ہزارواں حصہ کھو دیتا ہے۔ یعنی کل دس ہزار گردشوں کے بعد یہ نابود ہو جائے گا۔ یہ دُم دار ستارہ ہر ۷۶ سال کے بعد آفتاب کا چکر لگاتا ہے۔ اس حساب سے اس کی کل عمر ہوئی — ۷۶۰ ہزار سال یا ساڑھے سات لاکھ سال۔

ہمارے نظام شمسی کی عمر ۴۵۰ کروڑ سال پیمائش کی گئی ہے۔ اگر سارے دُم دار ستاروں کی پیدائش ۴۵۰ کروڑ سال قبل ہوئی ہوتی تو تقریباً سارے دُم دار ستارے اپنی عمر پوری کرکے نابود ہو چکے ہوتے، لیکن دُم دار ستارے آج بھی شان سے گھومتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دُم دار ستاروں کی عمر نظام شمسی سے کم ہے اور انھوں نے کافی بعد میں جنم لیا ہے۔

سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کچھ لاکھ سال پہلے ہی وجود میں آئے تو اس کے قبل وہ کہاں تھے؟ اس سوال کا جواب دیا ۱۹۵۰ء میں ڈچ خلائی سائنس داں جین اُورٹ (JANE OORT) نے۔ آفتاب سے ۷۵ کھرب کلومیٹر (آفتاب اور زمین کے فاصلے کا پچاس ہزار گنا) دور برفیلے چٹانی ڈھیر (ROCKY MASS) کا ایک دائرہ نما علاقہ ہے۔ اُورٹ کے بادل (OORT CLOUD) نامی یہ علاقہ ہی دُم دار ستاروں کی جائے پیدائش مانا گیا ہے۔

قریب سے گزرتا ہوا کوئی ستارہ جب اِن ڈھیروں کو متاثر کرتا ہے، تب کوئی ڈھیر اس بادل کو خیرباد کہہ کر اندرونی نظام شمسی میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان ڈھیروں میں سے کچھ تو مشتری اور زحل (SATURN) جیسے بڑے سیاروں سے ٹکرا کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں، کچھ اپنا راستہ بدل کر نظام شمسی سے ہی باہر نکل جاتے ہیں۔ باقی ماندہ ڈھیر آفتاب کی جانب بڑھتے ہوئے دُم پیدا کرکے اس کی گردش کرنے لگتے ہیں۔

۱۹۴۹ء میں آئرلینڈ کے سائنس داں ایج ورتھ اور ۱۹۵۱ء میں خلائی سائنس داں گیرارڈ کوپئر نے تجویز دی کہ ہمارے نظام شمسی کے باہری حصے میں 'نیپچون' و 'پلوٹو' سیاروں کے پرے چٹانی ٹکڑوں کی ایک چپٹی پٹی (FLAT BELT) ہونی چاہیے۔ یہ پٹی کافی کم گھنی رہی ہوگی۔ اس لیے اس کے ٹکڑے آپس میں مل کر سیارے نہیں بن پائے ہوں گے۔ آفتاب سے اتنی دور ہونے کے سبب ان کا درجۂ حرارت کافی کم ہوگا اور دُم دار ستارے کے مرکزی حصے کی طرح یہ ٹکڑے برف و منجمد گیسوں سے بنے ہو سکتے ہیں۔ یہی چوڑی پٹی کوپئر بیلٹ کہلائی۔ کوپئر نے مانا کہ مختصر عرصہ کے (۲۰۰ سال سے کم وقفہ سے نظر آنے والے) سارے دُم دار ستارے اسی کوپئر بیلٹ سے ہی نکلتے ہیں۔

کافی وقت تک کوپئر بیلٹ کا تصور متنازعہ بنا رہا۔ ۱۹۸۷ء سے کوپئر بیلٹ کی دریافت میں لگے خلائی سائنس دانوں ڈیوڈ جیوٹ اور جین لو کو ۳۰ اگست ۱۹۹۲ء کو ملا۔ ایک سیارہ نما ڈھیر۔ اس ڈھیر کی دریافت کی گئی ہے یونیورسٹی آف ہوائی میں واقع ۲.۲ میٹر لمبی دُور بین سے۔ دھیمی رفتار سے گامزن یہ ڈھیر سیارہ پلوٹو سے بھی دور تھا۔ آفتاب سے اس کا فاصلہ ۶ ارب کلومیٹر پایا گیا۔ یہ فاصلہ آفتاب اور زمین کے فاصلے کا ۴۰ گنا ہے۔ ۵۰۰-۲۰۰ کلومیٹر جسامت کے اس ڈھیر کا نام رکھا گیا — QB ۱۹۹۲ء۔ کچھ مہینے بعد مارچ ۱۹۹۳ء میں QB 1 ۱۹۹۲ء جیسا ایک دوسرا ڈھیر دریافت کیا گیا۔ FW ۱۹۹۳ء نام کا یہ ڈھیر بھی آفتاب سے ۶ کلومیٹر دور تھا، لیکن یہ پہلے ڈھیر کی مخالف سمت میں تھا۔ ایسا قیاس کیا گیا کہ یہ دونوں ڈھیر کوپئر بیلٹ خاندان سے ہی متعلق ہیں۔ ۱۹۹۵ء تک کل ۳۲ تودوں کی تلاش کی جا چکی ہے۔ یہ سبھی تودے زمین کے مدار پر تھوڑا خمیدہ ہیں۔ یہ خم مختصر عرصہ کے دُم دار ستاروں کے خموں کے مساوی ہے۔ ان سب کی جسامت ۱۰۰-۴۰۰ کلومیٹر تک ہے۔ یوں تو تلاش شدہ تودوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، لیکن ان کی موجودہ تعداد سے کوپئر بیلٹ کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سبھی تودے نیپچون کے مدار سے باہر واقع ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'نیپچون' ہی اسی پٹی (کوئپر بیلٹ) کے اندرونی سرے کی حد طے کرتا ہے۔ ایک اندازے

باقی صفحہ ۱۳ پر

اظہار احمد ندیم

مدر ٹریسا

نیلے بارڈر کی سفید ساڑی زیبِ تن کیے ہوئے ایک خاتون کی تصویر آپ نے یقیناً دیکھی ہوگی۔ جس میں ساڑی کے آنچل سے ہمیشہ اس کا سر ڈھکا رہتا ہے۔ اس عورت کا مبارک ہاتھ کبھی کسی ننگے بچے کے سر پر رہتا ہے تو کبھی وہی ہاتھ بے سہارا بچوں کو سہارا دیتا نظر آتا ہے۔ اس عالم میں اس عورت کے چہرے پر ایسی خوشیاں بکھری ہوئی ہوتی ہیں گویا کسی ماں نے اپنے کھوئے ہوئے بچے کو پا لیا ہو اور اسے بے تحاشا پیار کیے جا رہی ہو اور اس ماں کا دل یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر اب کبھی نہ جانا۔ تصویروں میں بظاہر عام سی نظر آنے والی اس عظیم ہستی کو ہم 'مدر ٹریسا' کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۲۷ اگست ۱۹۱۰ء میں یوگوسلاویہ کے ایک شہر اسکوپجے میں ہوئی۔ ان کے والدین البانیہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان دین دار رومن کیتھولک تھا۔ گھر کے مذہبی ماحول نے انھیں آج اس مقام پر پہنچانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ اس لیے کہ ماں کی گود کے بعد ہر بچہ اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ جس میں گھریلو ماحول کو بہت اہمیت ہے۔

کبھی کبھی انسان کا اصل نام پیچھے رہ جاتا ہے اور اس کے کام کے حوالے سے اس کو جانا جانے لگتا ہے اور اسی مناسبت سے دنیا اس کو ایک پسندیدہ نام دے دیتی ہے۔ اسی طرح کا واقعہ مدر ٹریسا کے ساتھ بھی پیش آیا۔ آج دنیا میں مدر ٹریسا کو کون نہیں جانتا مگر ان کا اصل نام ایگنس گونشا بوژائیو ہے۔ یہ بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں اور بہت کم لوگ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثر لوگ ان کو ان کی سماجی خدمات کے حوالے سے جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور تعریف و تحسین کے کلمات زبان پر لاتے ہیں۔

مادّہ پرستی کے اس دور میں جب کہ اپنوں کے لیے ہی جی لینا ایک مسلسل امتحان سے گزرنے کے مترادف ہو گیا ہے، ایسے میں دوسروں کے لیے اپنوں کا سا سلوک کرنا ایک مشکل بات بن گئی ہے۔ جس کے سبب دوسروں کے کام آنے والوں کے گراف میں گراوٹ آتی جا رہی ہے۔ اس عالم میں اگر کوئی صرف اور صرف دوسروں کے لیے جیے اور اسی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے تو یقیناً اس کا شمار عظیم ترین ہستیوں میں ہوگا۔ دوسروں کے دکھ بانٹنا، ان کے غم غلط کرنا اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ کی کلیاں کھلانا مدر ٹریسا کے اندازِ زندگی میں شامل ہے اور اسی کام کے لیے انھوں نے اپنے کو مکمل طور پر وقف کر رکھا ہے۔ دنیا کا ایک عظیم کام یعنی دوسروں کو تعلیم دینا طالب علمی کے ابتدائی دور سے ہی مدر ٹریسا کا شوق تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت اور پختگی آتی گئی۔ پھر ایک وقت دورانِ تعلیم ایسا آیا کہ کیتھولک مشن کی طرف سے دوسرے ممالک میں تعلیم دینے کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔ منہ مانگی مراد مل جانے پر مدر ٹریسا کو بے حد خوشی ہوئی اور اپنے گھریلو ماحول اور تعلیمی زندگی میں جو کچھ بھی اخلاقی اور کتابی علم حاصل کیا تھا اس کو دوسروں تک پہنچانے کا موقع آ گیا۔ اس بڑے کام کے لیے ان کے حصے میں اپنا پیارا، گنگا جمنی ملک ہندوستان آیا۔ مدر ٹریسا نے صرف ۱۸ سال کی عمر میں ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے شہر کلکتہ کا انتخاب کیا۔ کلکتے کے انٹالی علاقے میں "سینٹ میری اسکول" میں استانی کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ اب انھوں نے تعلیم دینا شروع کیا۔ تعلیم دینے کی اسی خدمت کے دوران کلکتے کے عوام نے انھیں ایگنس گونشا بوژائیو کے بدلے مدر ٹریسا کے لقب سے یاد کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ لوگ ان کے اصل نام کو بھولتے گئے اور نئے نام سے پکارنے لگے۔ مدر کو اس ملک سے پھر ایسا لگاؤ ہوا کہ آج تک وہ یہاں سے واپس جانے کے اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ جو انھوں نے ہندوستان آنے کے ابتدائی دور میں کیا تھا۔ گنگا جمنی تہذیب کی کشش ان کی دامن گیر ہوئی، یہاں کی مٹی کی خوشبو ان کے نتھنوں میں سما گئی۔ مدر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی ملک کی ہو گئیں۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں ہندوستان کی شہریت مل گئی۔

کلکتے کے سینٹ میری اسکول میں صرف درس و تدریس سے ان کے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ اس لیے کہ سماجی خدمت کا ایک بحرِ بیکراں ان کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا، جس کے سبب

۱۱۸۔ نرمدا ہاسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی۔۶۷

انھوں نے 'موتی جھیل' کے گندے علاقے میں جانا شروع کر دیا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ بھوکے ننگے، معذور اور بیمار بچوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جاسکے اور ان مسکین چہروں پر خوشیوں کے پھول کھِل سکیں۔ غربت، جہالت، بیماری اور خاص کر کوڑھ کے مرض سے لڑائی لڑی جاسکے اور لوگوں کو ان سب سے چھٹکارا دلانے میں مدد کر سکیں۔ رفتہ رفتہ ان کا دائرہ عمل موتی جھیل کے علاقے سے آگے کی طرف بڑھتا گیا۔ انھوں نے کلکتے کے دوسرے گندی بستیوں میں بھی خدمت خلق کا کام شروع کر دیا۔ ابتدا میں بیماروں کی خدمت میں انھیں تھوڑی پریشانی آتی تھی اس لیے کہ اس وقت تک وہ طب کے علم سے مکمل طور پر واقف نہیں تھیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے امریکی تربیتی مرکز برائے طبّی مشنری، پٹنہ میں داخلہ لیا اور نرسنگ کا کورس مکمل کیا۔ کلکتے واپس آکر غریب، گندے، بھوکے، نیم جاں، بیمار اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی طبّی امداد کے علاوہ انھوں نے دوسرے امدادی پروگرام پر بھی عمل شروع کیا۔ سماجی خدمات کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا اور اسی دوران ۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا۔ جہاں بچوں کو تعلیم دی جانے لگی۔ وقت کا کارواں یوں ہی رواں دواں تھا کہ انھیں ایک ایسے گھر کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں ان بے سہارا لوگوں کو ٹھکانہ فراہم کیا جاسکے۔ آخری عمر میں جن کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ اپنی کوشش اور محنت سے ایک گھر حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوگئیں۔ اس گھر کا نام انھوں نے "نرمل ہردے" رکھا۔ نرمل ہردے میں ہر مذہب و ملت، رنگ و نسل کے عمر رسیدہ بے سہارا انسانوں کو پناہ دی جانے لگی۔ قریب المرگ بے سہارا لوگوں کی بے لوث خدمت کرنے کے جذبے نے عوام کے دلوں کو موہ لیا۔ اس خدمت کے سلسلے میں ایک پریس رپورٹر نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے اس صحافی کو انتہائی خوب صورت اور مکمل جواب دے کر حیرت میں ڈال دیا:۔

"موت سے بچانے کے قابل ہی نہیں ہوں، وہ اپنے وقت پر ضرور آئے گی۔ لیکن ان بے سہارا اور مرتے ہوئے لوگوں کو آرام پہنچا کر انھیں آخری سانسوں میں یہ خوشی دینا چاہتی ہوں کہ ان کا بھی خیال رکھنے والا ہے۔"

مدر ٹریسا بلا تفریق رنگ و نسل، ذات پات ــــ انسانی بھلائی کی سوچتی ہیں۔ اس بنا پر سماج کی خدمت کے ارادوں کو کامیابی کا جامہ پہناتی ہیں۔ ان کے کام کو کلکتے کے رہنے والے ہی نہیں ساری دنیا نے سراہا اور ان کی شخصیت کا اعتراف کیا۔ مدر کو انسانیت کا درد رکھنے والے اعلا اور ارفع مقام والے اشخاص کی صف میں جگہ دی۔

مدر ٹریسا کی ممتا کی بارش سبھوں پر یکساں ہوتی ہے۔ خواہ وہ ہندوستان کا رہنے والا ہو یا کسی بیرونی ملک کا۔ جس کے سبب ہندوستان کے علاوہ ویتنام، ایتھوپیا، امریکہ، آئرلینڈ، آسٹریلیا وغیرہ ہر جگہ انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھیں ہمیشہ دوسروں کی مدد کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ کبھی بستر مرگ پر پڑے لوگوں کی، کبھی بے سہاروں کی، کبھی قحط زدوں کی تو کبھی یتیم بچوں کی اور کبھی معذور لوگوں کی۔ ایسے سبھی ضرورت مندوں کے کام آکے انھیں روحانی خوشی ملتی ہے۔ اسی وجہ سے انھیں کبھی 'غریبوں کی ننھی بہن'، تو کبھی 'جگت ماں' کے نام سے پکارا گیا اور کبھی ان کے پرستاروں نے انھیں 'مجدید مریم' بھی کہا۔ کچھ ایسے چھوت والے امراض ہوتے ہیں جو کسی کو ہو جائیں تو سماج میں ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایسے مریضوں کے لیے کلکتے میں مدر نے 'پریم دان' نام کا ایک مرکز قائم کیا۔ جہاں ان مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔ جب انھیں بیماری سے شفا ہو جاتی ہے تو انھیں 'پریم نواس'' نامی گھر میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں یہ اپنی زندگی کے باقی دن آرام سے گزارتے ہیں۔

ایک طرف جہاں غریب اور بے سہارا لوگوں نے مدر ٹریسا کو بے حد عزت و احترام دیا وہیں ہندوستانی حکومت کے علاوہ دوسرے ممالک نے بھی ان کی خدمت کا اعتراف کیا۔ مختلف انعامات کی صورت میں اس کا اقرار بھی کیا۔ ان میں ہم سب سے پہلا انعام بے سہارا اور مجبور انسانوں کے دلوں سے نکلی نیک دعاؤں کو کہہ سکتے ہیں۔ دوسری طرف ظاہری شکل میں انعام ہندوستانی حکومت کی طرف سے "پدم شری" کا اعزاز صدر جمہوریہ کے ہاتھوں مدر ٹریسا کو ۱۹۶۲ء میں ملا۔ کسی حکومت کی طرف سے ملنے والا یہ پہلا ایوارڈ تھا۔ اسی سال ان کو 'میگ سیسے' ایوارڈ بھی ملا۔ جس کی بین اقوامی شہرت ہے۔ وقت کا قافلہ منزلیں طے کرتا رہا اور ۱۹۷۹ء کا وہ زمانہ آیا جب انھیں امن کے لیے دنیا کا اہم ترین انعام 'نوبل پرائز'' ملا۔ ۱۹۸۰ء میں ہندوستان کے اعلاترین اعزاز "بھارت رتن" سے انھیں نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بے شمار ملکوں نے مختلف اعزازات کی شکل میں ان کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کیا گیا۔ مگر قربان جائیے مدر کے اس خلوص پر کہ اعزازات میں ملی رقم میں سے ایک دھیلہ بھی انھوں نے اپنے ذاتی مصارف میں خرچ نہیں کیا۔ بلکہ کبھی بے سہارا/ مجبور، عمر رسیدہ لوگوں کے رہنے کے لیے گھر مہیا کیا تو کبھی لاوارث بچوں کے لیے سائبان، کبھی ان کی تعلیم کے لیے اسکول کھولے تو کبھی ان کی بیماری کے لیے شفاخانے۔ یعنی اوروں کو خوشی و مسرت دینے کے اپنے فطری جذبے کو جاری و ساری رکھا۔

مدر ٹریسا نے جس فلاحی پروگرام کا آغاز کلکتے سے کیا تھا۔ وہ اب دنیا کے بیشتر ممالک میں چل رہا ہے اور لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں۔ جب کبھی ان سماجی خدمات کا احاطہ کرنے بیٹھیے تو ذہن حیران رہ جاتا ہے کہ ایک عورت نے اپنے کندھوں پر اتنی عظیم ذمہ داریاں کیسے اٹھا رکھی ہیں۔ آخر وہ کیا قوت ہے، وہ کیا حوصلہ ہے جو ایک ۸۷ سالہ خاتون کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا۔ وہ آہنی حوصلہ، وہ دنیا کو بہتر بنانے کا عزم جس کو لے کر ایک ۱۸ سالہ لڑکی نے ایک نئی زندگی کی شروعات کی تھی، دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ویسے کے ویسے ہیں۔ حالات کی آندھی، وقت کی گرد اسے دھندلا نہیں سکی۔ بلکہ بڑھتی عمر نے ان کے ارادے اور بلند کیے، مزید ثابت قدمی

باقی صفحہ ۱۴ پر

سدھیر کمار پرواز

جہیز کی لعنت کیسے ختم ہو؟

ہمارے ملک میں ہر دن جہیز کی وجہ سے عورتوں کو ستائے جانے، گھر سے نکال دینے اور قتل کر دینے کے حادثے پیش آتے ہیں۔ ہر روز ایسی خبریں اخباروں کی سرخیاں بنتی ہیں۔ مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ اب ایسی خبریں ہمیں پریشان نہیں کرتیں، بلکہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ سب تو چلتا ہی رہے گا۔ یقیناً ہمارے ایسا سوچنے سے یہ چلتا ہی رہے گا۔ اس لیے ہمارا یہ طرزِ فکر بہت غلط ہے۔ خواتین ہمارے سماج کا نصف حصہ ہیں اس لیے ہمیں یہ سوچنا ہی ہوگا کہ جہیز کی وجہ سے ان پر جو ظلم ہوتا ہے اس سے انھیں کیسے نجات دلائی جائے۔

جہاں تک جہیز کی روایت جو ایک لعنت بن چکی ہے، کا سوال ہے یہ قدیم زمانے سے ہمارے یہاں موجود ہے۔ تلسی داس نے 'رام چرت مانس' میں بتایا ہے کہ رام نے بھی اپنی شادی میں جہیز لیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ روایت بڑی پرانی ہے۔ لیکن پہلے اس رسم کی وجہ سے عورت کو دکھی نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر آج حالت بدل گئی ہے۔ آج عورت پر سب سے زیادہ ظلم جہیز کے سبب ہی ہوتا ہے۔ آج جہیز کی روایت ہمارے سماج کے لیے ایک روگ اور ایک کلنک بن گئی ہے۔ پہلے یہ "جہیز پرتھا" صرف ہندو سماج تک ہی محدود تھی مگر اب اس نے ہر سماج کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اب یہ کسی ایک سماج کی نہ ہو کر پورے ہندوستانی سماج کی ہے۔ اب تو سبھی اس سے پریشان ہیں۔ غریب لوگوں کا تو بہت برا حال ہے۔ وہ رات دن اس فکر میں رہتے ہیں کہ بیٹی کی شادی کے لیے سامان کیسے جٹائیں۔ بنا جہیز کے کوئی شادی کرنے والا نہیں ملتا۔ بھلا جو لوگ جہیز لے کر بھی کسی کی بیٹی کو پریشان کرتے ہیں، ہلاک کر دیتے ہیں وہ بنا جہیز کے کسی کی لڑکی کو کیسے اپنا سکتے ہیں؟ دکھی اس پر تھا سے امیر بھی ہیں۔ ان کے یہاں بھی جہیز کو لے کر سودے بازی ہوتی ہے۔ کم جہیز لانے پر ان کی بیٹیاں بھی دکھ جھیلتی ہیں، مار دی جاتی ہیں۔ یہ جہیز کی لعنت اتنی بری ہے، اتنی بھیانک ہے کہ اس کی وجہ سے عورتیں شادی کے بعد تو ظلم سہتی ہی ہیں۔ کچھ شادی سے پہلے بھی مر جاتی ہیں! مثال کے طور پر کانپور کے واقعے کو لیجیے۔ وہاں کچھ برسوں قبل تین سگی بہنوں نے اس لیے خودکشی کر لی تھی کہ ان کے ماں باپ رات دن اس خیال سے بے چین رہتے تھے کہ وہ اپنی بیٹیوں کے جہیز کے لیے سامان کیسے جٹائیں؟ لڑکیوں سے ان کی پریشانی دیکھی نہیں گئی تو انھوں نے موت کو گلے لگا لیا۔ دو چار روز تک ہم نے اس حادثے پر غم ظاہر کیا، غصہ دکھایا۔ مگر پھر ہم اسی ڈھرے پر چلنے لگے۔ بعد میں بھی ایسے واقعات ہوئے مگر ہم نے جہیز لینے یا دینے سے توبہ نہیں کی۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم لڑکی کو لکشمی کہتے ہیں اور دوسری طرف کسی کی بیٹی کو بنا لکشمی کے بہو کے روپ میں اپنانے کی ہمت بھی نہیں رکھتے! ہمیں بہو کے روپ میں اپنے گھر آئی کسی کی بیٹی تبھی اچھی لگتی ہے جب وہ اپنے ساتھ لکشمی یعنی ڈھیر ساری دولت اور بہت سا سامان بھی لائی ہو۔ عورت کی اہمیت کسی بھی طرح مرد سے کم نہیں ہے۔ اس دنیا کو چلانے کے لیے جتنا ضروری مرد ہے اتنی ہی ضروری عورت ہے۔ یہ دنیا صرف مردوں سے ہی نہ تو چلتی ہے نہ چلے گی اور نہ کبھی چلی ہے۔ لیکن پھر یہ رسم کیوں ضروری بنا دی گئی ہے کہ جب کسی عورت کی شادی ہو تو اس میں جہیز دیا جائے؟ ہمارے معاشرے میں آدمی کے لیے تعلیم کو شروع سے ہی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ صحیح معنی میں وہ تعلیم سے ہی آدمی بنتا ہے۔ مگر بہت سے لوگ جہیز کے روپ میں لڑکی والوں سے وہ پیسہ بھی مانگتے ہیں، جو پیسہ ان کے لڑکے کی پڑھائی لکھائی پر خرچ ہو چکا ہوتا ہے۔ بتلائیے یہ کتنی بڑی بے حیائی ہے۔ اگر لڑکے کی تعلیم پر پیسہ خرچ ہوتا ہے تو کیا لڑکی کے پڑھنے لکھنے پر نہیں ہوتا؟ مگر اس پیسے کا ذکر بھی نہیں ہوتا جو لڑکی کی پڑھائی پر صرف ہوتا ہے۔ دراصل جو لوگ اپنی تعلیم کا خرچ جہیز کے طور پر لڑکی والوں سے مانگتے ہیں ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تعلیم

باقی صفحہ ۲۱ پر

جالونگر سہارنپور۔ یوپی ۲۴۷۰۰۱

جوزف چندرا کمار

عورتوں کو اختیارات دینے کے لیے اہم قدم:

ابتدائی تعلیم

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں اور اسکولوں میں نیا تعلیمی سال شروع ہو گیا ہے۔ ہمیں سڑکوں پر رنگ برنگی یونیفارموں میں بچے، لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی بھاری بھاری بستے لیے ہوئے اسکول جاتے نظر آتے ہیں۔ موٹے طور پر یہ منظر اس بات کی علامت ہے کہ ملک یقیناً ترقی کر رہا ہے۔ لیکن یہاں ایک لمحے کے لیے توقف کر کے یہ سوچنا ضروری ہے کہ کیا ابتدائی تعلیم کو عام بنانے کی کوششیں متوازن ہیں یا اس میں لڑکیوں خصوصاً غریب اور کمزور طبقوں کی لڑکیوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

وہ دن گئے جب تعلیم کے معاملے میں عورتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ آج لڑکیوں کی تعلیم بھی اتنی ہی اہم سمجھی جاتی ہے جتنی کہ لڑکوں کی۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ عورتیں زندگی کے کسی بھی شعبے میں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ اسی لیے عورتوں کو ہر شعبے میں مناسب نمائندگی دی جا رہی ہے۔

پنچایتوں اور مقامی اداروں میں عورتوں کے لیے ریزرویشن پہلے ہی ایک حقیقت بن چکا ہے۔ پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز مجلسوں میں خواتین کے لیے ۳۳ فی صد نشستیں مخصوص کرنے کا بل بھی پارلیمنٹ میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اس سے خواتین کو مستقبل میں بے شمار مواقع میسر آئیں گے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ خواتین کی نئی نسل اس چنوتی کا مقابلہ کرنے اور ان مواقع سے مستفید ہونے کے لیے تیار ہو جائے، جو ان کے منتظر ہیں۔ عورتوں کو اختیارات دینے کے سلسلے میں پہلا اور سب سے اہم قدم لڑکیوں کو پرائمری تعلیم دلانا ہے۔

اہم فیصلہ

آزادی کے پچاسویں سال میں حکومت نے ابتدائی تعلیم کو چھ سے ۱۴ سال تک کے بچوں کا بنیادی حق قرار دینے کا اہم فیصلہ کیا ہے۔ اس کے لیے ہندوستان کے آئین میں ترمیم کی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک واضح اہتمام بھی کیا جائے گا، جس کے تحت چھ سے ۱۴ سال تک سبھی بچوں کو ابتدائی تعلیم کا موقع فراہم کرنا سبھی والدین کا ایک بنیادی فرض ہو گا۔ سب کے لیے ابتدائی تعلیم کو ۱۹۵۰ء سے ایک قومی نصب العین قرار دیا جا چکا ہے۔

ہندوستان میں چھ سے ۷ سال کی عمر کے ۷/۶ کروڑ بچے پرائمری اسکولوں میں حصول تعلیم کے لیے جاتے ہیں جب کہ ۲/۲ کروڑ بچے اسکول نہیں جاتے۔ چھ سال کی عمر کے ۸۰ فی صد بچوں کے نام اسکولوں میں لکھے ہوئے ہیں مگر اس میں سے ۱۵ تا ۲۰ فی صد بچے باقاعدگی سے اسکول نہیں جاتے۔ چھ سے دس سال تک کی عمر کے تقریباً ۷۰ فی صد بچے باقاعدگی سے اسکول جاتے ہیں لیکن ان میں سے ایک تہائی تعداد پرائمری تعلیم مکمل کرنے سے قبل ہی اسکول جانا بند کر دیتی ہے۔

تعلیم کے معاملے میں لڑکیاں سب سے پیچھے ہیں۔ ہندوستان میں خواتین میں شرح خواندگی صرف ۳۹ فی صد ہے۔ پرائمری اسکولوں میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد ۴۳/۱۱ فی صد اور اپر پرائمری اسکولوں میں ۳۹/۴۲ فی صد ہے۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۲ء کے درمیان اسکولوں میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد میں ۳۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ گاؤوں میں درج فہرست ذاتوں کی ۷۵ فی صد اور درج فہرست قبائل کی ۶۰ فی صد لڑکیاں درمیان ہی میں اسکول آنا بند کر دیتی ہیں۔ لیکن حال ہی میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر اسکول آنا بند کر دینے والی لڑکیوں کی تعداد میں نمایاں کمی آئی ہے۔

کیرالا نے قریب قریب مکمل شرح خواندگی حاصل کر کے دکھا دیا ہے کہ اگر مناسب پالیسی اختیار کی جائے اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے تو پورے ملک میں بھی مکمل خواندگی حاصل کرنا ممکن ہے۔ کیرالا میں شرح خواندگی ۸۶ فی صد ہے، جو ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ مہاراشٹر میں شرح خواندگی ۵۲ فی صد، تامل ناڈو میں ۵۱ فی صد اور پنجاب میں ۵۰ فی صد ہے۔ درمیان میں ہی اسکول چھوڑ دینے والوں کی تعداد کیرالا میں صفر ہے جب کہ بہار میں یہ تعداد لڑکوں میں ۶۲ فی صد اور لڑکیوں میں ۶۶ فی صد ہے۔ اس کے

مقابلے میں ہر یانہ میں یہ تعداد لڑکوں میں صرف دو فی صد اور لڑکیوں میں ۶ فی صد ہے۔

تاہم گزشتہ سو برسوں میں ہندوستان میں شرح خواندگی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں ملک میں شرح خواندگی فقط ۴۳/۶ فی صد تھی مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر یہ ۱۹۹۱ء میں ۵۲/۲ فی صد ہو گئی ہے۔ اگر ہم ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک شرح خواندگی میں ہوئے اضافے کی بنیاد پر سوچیں تو ہندوستان کو مکمل خواندگی حاصل کرنے میں پانچ چھ دہائیاں اور لگیں گی۔ لیکن اگر زیادہ موثر پالیسیاں بنائی جائیں اور ان پر موثر ڈھنگ سے عمل درآمد کیا جائے تو یہ مدت یقیناً کم ہو سکتی ہے۔ پھر بھی خیال ہے کہ چین، ملیشیا اور انڈونیشیا جیسے ملک ہندوستان سے بہت پہلے ابتدائی تعلیم کے معاملے میں سو فی صد کامیابی حاصل کر لیں گے۔

لڑکیوں کی تعلیم پر زور

تعلیم نسواں ہمیشہ سے حکومت ہند کے لیے ایک ترجیحی معاملہ رہی ہے۔ اس کے سامنے نصب العین یہ ہے کہ پورا تعلیمی نظام اس طرح چلایا جائے کہ تعلیم کے معاملے میں عورتوں کی صورت حال بہتر بن سکے اور ان کو اختیارات دیے جا سکیں۔ اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے لیے اسکولوں میں لڑکیوں کے داخلے نہ صرف یہ کہ بڑھائے جائیں بلکہ برقرار بھی رکھے جائیں۔ دیہی خواتین کو بطور ٹیچر مقرر کیا جائے اور نصابات میں عورتوں اور مردوں کے درمیان تفریق و امتیاز ختم کیا جائے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں شروع کی گئی "آپریشن بلیک بورڈ" اسکیم کے تحت یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ تمام اسکولوں میں کم از کم دو بڑے کمرے فراہم کیے جائیں، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ بیت الخلاء بنائے جائیں اور ہر اسکول میں کم از کم دو ٹیچر مہیا کیے جائیں، جن میں سے ایک خاتون ہو۔ اس کے علاوہ سبھی اسکولوں میں درس و تدریس کا سب سامان موجود ہو۔ نظر ثانی شدہ بلیک بورڈ اسکیم کے تحت اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کل جتنے اساتذہ بھرتی کیے جائیں ان میں کم سے کم نصف تعداد خواتین کی ہونی چاہیے۔ غیر رسمی تعلیم کی اسکیم کے تحت صرف لڑکیوں کے لیے چلائے جانے والے مراکز کو ۹۰ فی صد امداد دی جاتی ہے۔ سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کی طالبات کے لیے ہاسٹل اور قیام کی سہولیات فراہم کرنے کی اسکیم کو مزید مستحکم کیا جا رہا ہے۔

مختلف ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کی حکومتیں لڑکیوں کے لیے مفت تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔ چنانچہ کیندریہ ودیالیوں اور نوودیہ اسکولوں میں بارہویں جماعت تک لڑکیوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ دسویں جماعت کے بعد پڑھائی چھوڑ دینے والی لڑکیوں کے لیے پیشہ ورانہ تعلیم کے پروگرام بنائے گئے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگانے کی تربیت پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ اسکیم مرکز کے زیر سرپرستی چلائی جا رہی ہے۔ اس کے تحت عورتوں کو نئی تکنالوجیاں سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس سال ۱۵ اگست سے وزیر اعظم "کستوربا گاندھی شکشا یوجنا" کے نام سے لڑکیوں کے لیے ایک نیا تعلیمی پروگرام شروع کریں گے جس کے تحت ان اضلاع میں، جہاں لڑکیوں میں شرح خواندگی کافی کم ہے، لڑکیوں کے لیے خصوصی اسکول کھولے جائیں گے۔ ۹۸-۱۹۹۷ء میں اس اسکیم کے لیے بجٹ میں ۲۵۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

ڈسٹرکٹ پرائمری ایجوکیشن پروگرام میں اسکولوں تک لڑکیوں کی رسائی اور شمولیت بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ پروگرام تامل ناڈو سمیت گیارہ ریاستوں کے ۱۵۲ اضلاع میں زیر عمل ہے۔ اس کا مقصد ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کے لیے منصوبہ بندی کے عمل کو لامرکزی بنانا ہے۔ اس پروگرام کو زیر عمل لانے کے واسطے تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ایسے اضلاع کو چنا گیا ہے جہاں عورتوں کی شرح خواندگی قومی اوسط سے کم ہے۔

ڈسٹرکٹ پرائمری ایجوکیشن پروگرام تعلیم کے شعبے میں ملک کا سب سے بڑا اور جامع پروگرام ہے۔ منصوبہ بندی اور منصوبوں پر عمل درآمد کے معاملے میں اس کی نوعیت لامرکزی ہے۔ نومبر ۱۹۹۴ء سے شروع کیے گئے اس پروگرام کا دائرہ کار وسیع کیا جا رہا ہے اور چند ماہ کے اندر یہ ملک کی ۱۴ ریاستوں کے ایسے ۱۲۰ اضلاع میں نافذ ہو جائے گا، جہاں عورتوں میں خواندگی کی شرح کافی کم ہے۔ اس کا خاص مقصد اسکولوں میں داخلوں اور ان داخلوں کو برقرار رکھنے میں لڑکے اور لڑکیوں میں امتیاز نیز سماجی نابرابریوں کو کم کرنا ہے۔

دوپہر کے کھانے کی اسکیم

بچوں کی غذا کے معیار کو بہتر بنانے، پرائمری اسکولوں میں ان کے داخلوں کی حوصلہ افزائی کرنے، ان داخلوں کو برقرار رکھنے اور اسکول میں حاضری بڑھانے کی غرض سے ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء سے ملک بھر میں اسکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا فراہم کرنے کا پروگرام شروع کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کا بنیادی مقصد ابتدائی تعلیم کو عام بنانے کی کوششوں کو بڑھاوا دینا ہے۔ یہ پروگرام تین سال کے اندر اندر تمام سرکاری امداد یافتہ اسکولوں اور میونسپل اسکولوں میں لاگو کیا جائے گا، جس سے گیارہ کروڑ بچوں کو فائدہ پہنچے گا۔ پروگرام کے تحت گجرات، کیرالا، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، تامل ناڈو اور پانڈیچری میں اسکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا پہلے ہی سے فراہم کیا جا رہا ہے۔

ان دنوں بہت سی خیراتی انجمنیں بھی سماج کے کمزور طبقوں کے طلبہ کو مفت کتابیں اور دوسری امداد مہیا کر رہی ہیں۔ ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران دوپہر کے کھانے کی اسکیم کی توسیع

عورتوں کی کم شرح خواندگی والے ۱۹۲۷ بلاکوں کے لیے کی گئی، جس کے بعد ملک کے ۴۷۵ اضلاع میں کل ملا کر ۴۴۲۶ بلاک اس اسکیم کے تحت آگئے ہیں۔ ۹۷-۱۹۹۶ء کے آخر تک پہلی سے پانچویں جماعت تک کے قریباً ۵ء۵ کروڑ طلبا اس اسکیم سے مستفید ہونے لگے تھے۔ ملک کے باقی ماندہ بلاکوں اور شہری علاقوں کے تمام پرائمری اسکولوں کو ۹۸-۱۹۹۷ء تک اس اسکیم کے تحت لانے کی تجویز ہے جس سے ۱۰٫۸۲ کروڑ بچوں کو فائدہ پہنچے گا۔

پرائمری تعلیم کی اہمیت

اس بات سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کی مجموعی ترقی کے لیے پرائمری تعلیم کتنی اہم ہے۔ شیر خوار بچوں کی شرح اموات کا پرائمری تعلیم سے براہ راست تعلق ہے۔ ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کو مقبول بنانے میں بھی تعلیم معاون ثابت ہوتی ہے۔ اتر پردیش اس کی ایک مثال ہے وہاں عورتیں جس قدر تعلیم یافتہ ہوئیں، اسی قدر انھوں نے برتھ کنٹرول کے طریقے استعمال کرنے شروع کیے۔ اسی طرح عورتوں کی تعلیم کا براہ راست تعلق بچوں کو بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگوانے سے بھی ہے۔ پڑھی لکھی عورتیں ان ٹیکوں کی اہمیت زیادہ سمجھتی ہیں جس کی وجہ سے بچوں کو بیماریوں سے بچانے کے ٹیکے لگانے کی مہم زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ یو پی ہی کی مثال ہے کہ ۱۹۹۵ء میں وہاں ناخواندہ عورتوں کے فقط ۱۷ فی صد بچوں کو مذکورہ ٹیکے لگائے گئے تھے جب کہ سیکنڈری اسکول کی تعلیم یافتہ عورتوں کے بچوں کو یہ ٹیکے لگانے کا تناسب ۵۰ فی صد تھا۔

اقتصادی فائدے

ناخواندگی کی زیادہ شرحیں اقتصادی ترقی میں بھی حائل ہیں۔ سب کی پرائمری تعلیم کے بغیر ہم اقتصادی اصلاحات کا پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ بات کسے نہیں معلوم کہ زیادہ شرح خواندگی والی ریاستیں کم شرح خواندگی والی ریاستوں سے اقتصادی ترقی کے معاملے میں آگے نکل گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ہریانہ، پنجاب اور مہاراشٹر صرف تعلیم کے معاملے ہی میں آگے نہیں ہیں، وہاں شرح ترقی بھی سب سے زیادہ ہے۔ مغربی بنگال اور آسام اس معاملے میں سب سے پیچھے ہیں۔

آج کی دنیا میں کوئی بھی ملک، جو عورتوں کے تئیں لاپروائی برتتا ہے اور ان کی تعلیم و ترقی پر مناسب توجہ نہیں دیتا، خوش حال بننے کی امید نہیں کرسکتا۔ گزشتہ برسوں میں دیکھا گیا ہے کہ اب ملک میں عورتوں کی فلاح و بہبود پر ہی نہیں، ان کی ترقی اور انھیں اختیارات دینے پر بھی توجہ دی جانے لگی ہے — ہندوستانی منصوبہ بندی کی تاریخ میں پہلی بار نویں پنج سالہ منصوبے (۲۰۰۲-۱۹۹۷ء) کے اہم مقاصد میں عورتوں کو اختیارات دینے کا مقصد بھی شامل کیا گیا ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ پرائمری تعلیم انھیں اختیارات دینے کی جانب پہلا قدم ہے۔ ●

ہندوستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ:

کپڑا

• کپڑے کی صنعت، جس میں دو اہم زرعی پیداوار یعنی روئی اور پٹ سن بطور خام مال استعمال کی جاتی ہیں، ملک میں سب سے پہلے قائم کی گئی صنعتوں میں سے ایک ہے۔

• ملک کو سب سے زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ کپڑے کی برآمدات سے حاصل ہوتا ہے اور مجموعی برآمدات میں کپڑے کی برآمدات کا حصہ تقریباً ایک تہائی ہے۔ سال ۹۷-۱۹۹۶ء میں کپڑے کی برآمدات سے تقریباً ۴۲-ارب روپے کی آمدنی ہوئی ہے۔

• ملک کی مجموعی صنعتی پیداوار میں کپڑے کی پیداوار کا حصہ تقریباً ۱/۵ ہے۔

• ہینڈلوم کا شعبہ، جو زراعت کے بعد اقتصادی سرگرمیوں کا سب سے بڑا شعبہ ہے، ملک کی معیشت میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس سے ۳۰ لاکھ سے زیادہ بنکر گھرانوں اور تقریباً ایک کروڑ ۲۴ لاکھ بنکروں کو بالواسطہ اور بلاواسطہ روزگار مہیا ہوتا ہے۔

• گزشتہ چار دہائیوں میں ہینڈلوم کپڑے کی پیداوار میں دس گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شروع میں ہینڈلوم کپڑے کی پیداوار ۵۰۰ ملین مربع میٹر تھی، جو بڑھتے بڑھتے ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۷۰۲۰ ملین مربع میٹر ہو گئی ہے۔

• ملک میں کپڑے کی مجموعی پیداوار کا تقریباً ۲۲ فی صد حصہ ہینڈلوم کے شعبے میں تیار کیا جاتا ہے۔ ہینڈلوم کے شعبے میں تیاری کے لیے اشیاء کے ریزرویشن سے متعلق قانون، ۱۹۸۵ء کے تحت ۱۱ اشیاء ایسی ہیں جو صرف ہینڈلوم کے شعبے ہی میں تیار کی جاتی ہیں۔

• روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کے لحاظ سے دست کاریوں کا شعبہ ایک اہم شعبہ ہے۔ یہ ۶۵ ملین سے زیادہ افراد کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں دست کاریوں کی برآمدات کی مالیت، جن میں ہاتھ سے بنے ہوئے قالین اور غالیچے بھی شامل تھے، ۴۹،۸ ملین روپے رہی ہے۔

• پاور لوم (بجلی کرگھا) کا شعبہ بھی ملک کی کپڑے کی ضرورتیں پوری کرنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ جون ۱۹۹۶ء میں لامرکزی سیکٹر میں تقریباً ۱۴ لاکھ بجلی کرگھے کام کر رہے تھے۔

• گزشتہ چار دہائیوں میں ہندوستان کی ٹیکسٹائل ملوں میں تکلوں کی تعداد ۱۹۵۱ء میں ۱۱ ملین سے بڑھ کر ۱۹۸۹ء میں ۳۱،۸۲ ملین ہو گئی تھی۔

• ۱۵۸۲ کاٹن / فائبر ٹیکسٹائل ملوں میں سے ۱۸۸ ملین پبلک سیکٹر میں، ۱۴۶ کامپوزٹ سیکٹر میں اور ۱۲۴۷ پرائیویٹ سیکٹر میں ہیں۔

• کاتے ہوئے سوت کی پیداوار ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۴۵۴-ایم کلو گرام تھی، جو ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۲۳۹۹-ایم کلو گرام تک پہنچ گئی۔

• پاور لوم سیکٹر کی ترقی و فروغ اور پاور لوم سیکٹر کے کپڑے کی برآمدات کے فروغ کے لیے ایک علاحدہ پاور لوم ڈیولپمنٹ اینڈ ایکسپورٹ پروموشن کونسل قائم کی گئی ہے۔

• سب سے زیادہ ریشم تیار کرنے کے سلسلے میں ہندوستان دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں شہتوتی، ایری، ٹسر اور موگا یعنی چاروں قسم کا ریشم تیار ہوتا ہے۔ خام ریشم کی مجموعی پیداوار میں شہتوتی ریشم کی پیداوار ۹۲،۶ فی صد، ایری ریشم کی پیداوار ۴،۵ فی صد، ٹسر ریشم کی پیداوار ۲،۴ فی صد اور موگا ریشم کی پیداوار ۰،۶ فی صد ہے۔ یہ زراعت پر مبنی ایک اہم صنعت ہے جو بڑی تعداد میں لوگوں کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ دیہی اور نیم شہری علاقوں میں ریشم سازی کی صنعت میں قریباً ۶۰ لاکھ افراد کام کر رہے ہیں۔

• روئی بُننے کے کام آنے والا ایک اہم ریشہ ہے اور اس کا شمار ہندوستان کی اہم فصلوں میں ہوتا ہے۔ سوت کاتنے

باقی صفحہ ۲۶ پر

اکبر رضی زادہ

فانوس

(فارسی کہانی)

شام کا شور وغل چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ خزاں آچکی تھی۔ پت جھڑ کا موسم کس قدر بے لطف، کتنا غم انگیز۔

دادا جان نے کھانستے ہوئے کہا:

سب دیکھ رہا ہوں حمید میاں، تمہارے ابّو اور امی نے جاتے وقت کیا کہا تھا۔ بھول گئے کیا؟ اپنے بائیں پاؤں کو داہنے پاؤں کے نیچے سے بمشکل نکالتے ہوئے کہنے لگے:

یہ پڑھنا لکھنا کسے فائدہ پہنچائے گا۔ تمہیں یا تمہارے ماں باپ کو۔ یا پھر مجھے؟ پھر تازہ ہوا سینے میں بھر کر بولے:

کاش کہ میری آنکھوں میں دم ہوتا اور یہ مجھے مطالعہ کرنے کی اجازت دے پاتیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب ہی انسان کی بہترین دوست ہوتی ہے۔ صرف کتاب ہیں اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹیلی ویژن کی آواز دھیمی کی اور دادا جان سے مخاطب ہوا:

دادا جان، آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں، قسم لے لیں۔ میں نے حساب کے سبق پر نظر ثانی بھی کر لی ہے۔

دادا جان کی آنکھوں میں لطف و مہربانی کی چمک دیکھ کر میں دنگ رہ گیا:

وہاں اب پریشانی اور کدورت کا نام ونشان تک باقی نہیں تھا۔ چشم زدن میں جیسے سب کچھ بدل گیا ہو۔ اب وہ محبت اور گرم جوشی سے اتنی سرشار تھیں کہ مجھے شرم سی محسوس ہونے لگی۔ کہنے لگے:

تمہارے دوسرے سبق کا کیا حال ہے؟ فارسی؟ املا؟

کل تو ہم لوگوں کے صرف حساب، مضمون نویسی اور کھیل کود کا پیریڈ ہے۔

سچ بولو اپنے دادا کی جان۔

دادا جان کی قسم، سچ بول رہا ہوں۔

بہت اچھا۔ اب جب کہ اپنے سبق اور اسکول کے کاموں سے فراغت پا چکے ہو تو ذرا ایک کام کرو۔ حافظ کا دیوان لے آؤ اور اس سے ایک فال نکالو۔

میرے سبق سے متعلق؟

بہت ہی پیاری ہنسی سے ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ اتنے زور سے ہنسے کہ اوپر کا بچا ہوا ان کا اکلوتا دندان نیش دکھائی دینے لگا۔ بولے:

ارے نہیں بابا، تمہاری پڑھائی کے متعلق نہیں ہے۔

اپنے پھیلے ہوئے پاؤں کو موڑا۔ پالتی مار کر بیٹھ گئے اور کھانستے ہوئے بولے:

میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔

ان کی مات و مبہوت نگاہیں بالکل کسی فانوس میں جلتی ہوئی لو کی مانند کھڑکی کا باہر کہیں دور ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔ نرمی سے بولے:

حافظ کی باتوں میں کوئی شک نہیں۔ اس کے دیوان سے نکالا گیا فال بغیر شک و تردید صحیح ثابت ہوتا ہے۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اور کتنی صبح طلوع آفتاب کا نظارہ دیکھ پاؤں گا۔ میری آنکھیں بھی تو اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور یہ موٹے شیشے کا چشمہ بھی اسی قدر کار آمد ہے کہ اس کی مدد سے چہرے کو پہچان سکوں۔ کچھ سمجھے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

وہ اپنی فانوس میں مقید لے نور آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے۔

دادا جان میں بھلا ۔۔۔۔۔

یہ کیا کہہ رہے ہو میاں؟ اگلے سال تم گائڈ اسکول میں داخلہ لو گے اور ابھی میرے ہی لیے بہانہ بنا رہے ہو؟

درست فرما رہے ہیں دادا جان۔ مگر بخدا حافظ کے بعض اشعار بہت ہی مشکل ہوتے ہیں۔ دراصل ۔۔۔۔۔

اپنے سفید بالوں کے ایک گچھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عینک کے پیچھے سے مجھے گھورتے ہوئے بولے:

دراصل کیا میاں؟ ۔۔۔۔۔

کچھ نہیں دادا جان۔ میں کہہ رہا تھا کہ کل اسکول میں ہم لوگوں کا مضمون نویسی کا پیریڈ ہے اور میری ہزار کوششوں کے باوجود کچھ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔

ارے بے وقوف! تو بھی اپنے والد کی طرح شیطان ہے۔ کام کا بہانہ بنا کر ٹال گئے۔ کہیں شعر نہ پڑھنا پڑ جائے۔ مضمون لکھنے کا بہانہ

۴-۲۰ مہاندی ہاسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی - ۶۷

بنا گئے۔ ہے نا؟ سچ بتاؤں! تم نے اپنے والد کا بچپن مجھے یاد دلا دیا۔ خیر رہنے دو۔ تم اپنا مضمون لکھو۔

والد صاحب کے بارے میں آپ کیا کہہ رہے تھے، دادا جان؟ بولیے نا۔

میں بھی ان کے بارے میں جانتا ہوں مگر آپ سے نہیں بتایا۔

ایک بار پھر بڑے پیار سے ہنستے ہوئے میری جانب دیکھا اور اپنے اوپر بچے ہوئے تنہا دندان نیش کا مشاہدہ کرایا۔

اپنے والد کی تعریف سننا چاہتے ہو؟

اچھا! اب کیا پڑھائی نہیں کرنا ہے خیر! جو دل میں آئے کرو میاں۔

خدا! سچ کہہ رہا ہوں دادا جان۔ کل ہم لوگوں کی انشا نویسی کی کلاس ہے۔ امّی، ابّا بھی دیر سے گھر لوٹیں گے۔ ایسے میں ان کے پاس بھی وقت نہیں ہوگا کہ مجھے انشا لکھوائیں۔ . . . . . . یہ ہماری استانی بھی عجیب ہے۔ اتنا سخت موضوع انشا کے لیے انتخاب کرتی ہیں کہ بس مت پوچھیے۔ مثلاً "دوسروں کی شدید جسمانی اور روحانی اذیت کو محسوس کرنا مگر چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دینا" وغیرہ۔

دوبارہ اپنے پاؤں کو پھیلایا اور کمزور ہڈیوں کے ڈھانچے کو دیوار سے ٹیک لگا دیا!

اب تو جوانی کی صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں!

اپنی پیشانی کی جھرّیوں میں شکن ڈال کر کھنکارتے ہوئے بولے:

آخر تمہارے انشا کا موضوع کیا ہے؟

"یکہ و تنہا خشک پتّا" میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ بہت مشکل موضوع ہوتا ہے۔

ایک لمبی گہری سانس کھینچی اور کھوں کھوں کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دور کہیں خلا میں اپنی آنکھیں گاڑ دیں۔ بولے:

اتفاقاً موضوع بڑا دلچسپ ہے۔

لفظ دلچسپ سنتے ہی اسپرنگ کی طرح میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ٹیلی ویژن کا سوئچ بند کیا اور انشا نویسی کی کاپی لے کر بیٹھ گیا:

چلیے آپ کی نظر میں دلچسپ ہے تو پھر آپ بولتے جائیں اور میں لکھتا جاؤں۔ اپنی کنپٹی پر دادا جان نے ہاتھ پھیرا اور بولے لکھو:

ہمارے گھر میں ایک درخت ہے۔ اس پت جھڑ کے موسم میں اس پر صرف ایک ہی خشک پتّا باقی بچا ہے جو بے چارہ ہلکی ہوا کے چلنے سے بھی پھڑ پھڑا اٹھتا ہے۔ . . . .

قلم کو کاغذ پر سے ہٹائے بغیر میں نے پوچھا:

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں دادا جان؟ ہمارے گھر میں تو سرے سے کوئی درخت ہی نہیں جس کا پتّا خزاں کی ہلکی ہوا سے پھڑ پھڑا اٹھتا ہو!

بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں کے فانوسی حلقوں کا رخ میری طرف کیا جیسے روحانی درد و کرب کا ادراک ان پر منکشف ہو گیا ہو مگر اپنے چہرے سے عیاں نہیں ہونے دینا چاہ رہے ہوں۔ آنکھوں پر سے عینک اتاری، خشک تھوک پھینک کر گلا صاف کیا اور ایک سرد آہ کھینچ کر بولے:

لکھو حمید جان۔ لکھو میرے بچے۔ لکھو۔

جب تم تھوڑے اور بڑے ہو جاؤ گے تو سب تمہاری سمجھ میں آ جائے گا کہ کون سی چیز کہاں واقع ہے!

ان کی بات مان لینے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر وہ بولتے گئے اور میں لکھتا گیا۔ چناں چہ سلسلۂ کلام جاری رہا۔

جب بھی خزاں کی سرد ہوا ہمارے گھر پر سے گزرتی تو درخت کے اس تنہا خشک پتے کو اپنے ساتھیوں کی زبوں حالی کی یاد دلا جاتی اور وہ کانپ کر رہ جاتا۔ سوچتا کہ دیر سویر وہ بھی اپنی جگہ سے گرنے ہی والا ہے اور پھر راہ گیروں کے پاؤں کے نیچے سے خشک پتّے کی خش خش کرتی آہ وزاری کی آوازیں اسے سنائی دینے لگتیں پھر سوچتا کہ یہ تو بالکل سچ ہے کہ خزاں کا موسم ایسا ہی عجیب اور جان سوز ہوا کرتا ہے!

میں نے قلم کو بڑے زور سے کاپی پر پٹخ دیا:

یہ آپ کیا بولتے جا رہے ہیں دادا جان؟ . . . مجھے اس طرح کا مضمون بالکل اچھا نہیں لگتا!

آنسو کے قطرے جو ان کے گالوں پر ڈھلک آئے تھے جلدی جلدی پونچھا اور بولے:

لکھو پیارے لکھو۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ آخر ایک روز سارے خشک پتے اپنی شاخوں سے جدا ہو جائیں گے اور زمین پر آ رہیں گے۔ . . . . .

لمبی سانس کھینچ کر اپنی ٹانگوں پر جھک گئے اور فرمایا:

. . . . . یا پھر ہوا اسے اپنے ساتھ اڑا لے جاتی۔ اوپر۔ اوپر اور اوپر! اور پھر آسمان کی بلندی پر بادلوں کے پیچھے چھپ جائیں گے۔ دھیرے دھیرے ان کی یادیں بھی انسانی ذہن سے محو ہو جائیں گی مانو روزِ اول سے اس کا کوئی وجود ہی نہیں رہا ہو!

اس سے زیادہ اور دادا جان کی باتیں سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ ناراضگی اور غصے سے مضمون نویسی کی کاپی کو بند کیا اور کہا:

دادا جان، درحقیقت، میں نے آپ سے جھوٹ کہا تھا۔ میرے انشا کا موضوع "موسم بہار کی زیبائی" ہے جو کہ بہت ہی آسان موضوع ہے اور اسے لکھنے کے لیے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے! اب میں آپ کے لیے حافظ کا دیوان لانے جا رہا ہوں۔ یقیناً مشکل ہونے کے باوجود حافظ کا شعر پڑھنا آپ کی باتیں سننے سے زیادہ آسان ہے۔

دادا جان نے دوبارہ اپنی موٹے شیشے کی عینک اتاری، سوکھے بند ہونٹ کو لعاب دہن سے تر کیا۔ پیشانی پر چمک رہے شبنم کے موتی جیسے پسینے کے قطرے کو صاف کیا اور بے خود ہو کر مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اپنے سینے سے زور سے بھینچ کر زار و قطار رونے لگے۔ بڑا ہی دلخراش رونا تھا وہ۔ روح اور جسم و جان کو لرزا دینے والا رونا۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ پتا نہیں حافظ کے شعر کا انھوں نے کیا فال نکالا تھا۔ جسے باوجود اپنی اکھڑی ہوئی سانس کے گنگناتے جا رہے تھے:

"صد حیف کہ ما پیر جہاندیدہ بنودیم
روزی کہ رسیدیم بہ ایام جوانی"

باقی صفحہ ۲۶ پر

غزلیں

کرشن موہن

گریزاں رہا جگ میں ہر سو
میں اپنی ہی خوشبو سے خوشخو
زمانے کا ہوں معترِ لیکن تو
زمانہ ہے کیوں میرا اشتر و
سزاوارِ قیدِ بقا ہے
تگ و پو کا آہنگِ دلجو
کشاکش میں، دشتِ طلب میں
بھٹکتا پھرے دل کا آہو
جھلک آس کی، یاس میں بھی
کہ جیسے اندھیرے میں جگنو
کہیں مل نہ پائی جہاں میں
مرے درد کی کوئی دارو
بشر ہوں کہ صاحبِ نظر ہوں
مسلماں ہوں میں، نہ ہندو
مگر محفلِ سادگاں میں
بنا بیٹھا ہوں میں ارسطو
سمجھتا ہوں خود کو مہذب
کہ آتی ہے تھوڑی سی اُردو
مشامِ بُتاں میں بسی ہے
مرے شوخ شعروں کی خوشبو
مرا نام ہے کرشن موہن
مرا کام چاہت کا جادو

ناہید اختر

آپ نے مجھ کو سمجھا کیا ہے
میں کیا کوئی گری پڑی ہوں

جو ہے دل میں وہ ہے زباں پر
آئینہ کی طرح کھڑی ہوں

خیر انا کے صنم کدوں کی
قندیر میں بھی اڑی ہوئی ہوں

سبز رتوں کا مژدہ آئے
کب سے رستہ دیکھ رہی ہوں

مجھ کو پتا ہے اپنی حقیقت
کون ہوں میں اور کہاں کھڑی ہوں

بارشِ سنگ کے اس موسم میں
شیشے کا دل لے کے چلی ہوں

نظیر باقری

گزر رہے تھے جو لمحے انھیں گزرنے دیا
مگر زبان کو شکوہ کبھی نہ کرنے دیا

بچا تو لیتا زمانے کو میں تباہی سے
کسی نے کب مری آواز کو اُبھرنے دیا

نہ مرے پاس رہا وہ نہ مجھ سے دور رہا
اس ایک بات نے جینے دیا نہ مرنے دیا

بھٹکتے پھرتے اندھیروں میں قتل کرکے مجھے
کہ قاتلوں کو اُجالا سبھی میرے سر نے دیا

سمیٹے بیٹھا رہا چور چور ہستی کو
زمیں ہلی بھی تو خود کو نہیں بکھرنے دیا

نظیر ماں کی دعا کی طرح جو سر پہ رہا
غموں کی دھوپ میں سایہ اسی شجر نے دیا

---

۱۵۸ - پشپا نجلی۔ دہلی ۱۱۰۰۹۲

معرفت مہدی اختر۔ بالمقابل تاتارپور پوسٹ بھاگلپور

اکروتیا سادات، پوسٹ آسمولی مرادآباد

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : این۔ این۔ شرما

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

معاون : رفیعہ زیدی

تزئین وکتابت : افتخار احمد خان

سرورق : سندیتا

جلد : ۱۷ شمارہ : ۷

اکتوبر ۱۹۹۷ء (آشون۔ کارتک شک ۱۹۱۹)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

سرکولیشن اینڈ ایڈورٹیزمنٹ منیجر: کے۔ ایس۔ جگناتھ راؤ

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتا:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

"یوجنا" منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین بطرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہے۔

ترتیب

جنگلات کا مشترکہ انتظام ۔ ایک جائزہ

جنگلات کے مشترکہ انتظام کے نظریے اور حقیقی طریقے کا جائزہ لیتے ہوئے، مصنف کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے پاس فیصلے کرنے کے اختیارات ہیں، انھیں کو اولین اہمیت دی جانی چاہیے، نہ کہ محکمۂ جنگلات کو۔ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جب کبھی بھی کوئی موقع سامنے آیا ہے، دیہی گروپوں نے اپنا لوہا منوا دیا ہے۔ آگے چل کر، محکمۂ جنگلات کو ایک مشیر اور سہولت بہم پہنچانے والے کا کردار ادا کرنا ہوگا۔

ماضی کے رواج کے قطعی برعکس، ملک کی ۱۶ ریاستوں میں ۱۵۰۰۰ کمیونٹی گروپ جنگلات کے محکموں کے ساتھ مشترکہ طور سے ۱۵ لاکھ ہیکٹیئر رقبے پر مشتمل جنگلات کا انتظام کر رہے ہیں۔ یہ بات جنگلات کے مشترکہ انتظام (جے۔ ایف۔ ایم) کے پروگرام کے تحت ممکن ہوئی ہے، جسے عوام پر مشتمل جنگلات کے انتظام کی جانب پہلے قدم کے طور پر کافی سراہا گیا ہے۔

تاہم جنگلات کے مشترکہ انتظام کے سات سال بعد ان ریاستوں سے ملنے والے ثبوت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کو محض ایک اور پروگرام میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ مبالغہ آمیز طور سے شرکت، پائیدار ترقی جیسے نظریات پر مبنی، اس میں خود اپنے وسائل کا انتظام کرنے کے سلسلے میں عوام کو شاید ہی اختیارات دیے گئے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی نظریے میں ہی بنیادی طور سے کچھ غلطی ہے یا یہ غلط طریقے سے عمل درآمد کا معاملہ ہے؟ کیا صورت حال میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے؟

جنگلات کے مشترکہ انتظام کے حامی لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک طویل عمل ہے اور ان رویوں اور رجحانات میں تبدیلی لانے میں وقت لگے گا، جو گزشتہ ڈیڑھ صدی میں قائم ہوئے ہیں۔ مخالف لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک محض فریب نظر ہے۔ عطیہ دینے والوں کی بین الاقوامی ایجنسی کے دباؤ کے تحت شروع کیے گئے اس پروگرام کا مقصد جنگلات کی بحالی کے لیے عوام کی تحریکوں کو صحیح سمت میں چلانا ہے۔ اس مضمون میں جنگلات کے مشترکہ انتظام کے نظریے اور حقیقی طریقے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ثانوی مواد کے علاوہ، یہ موقع پر کیے گئے اُن مشاہدوں پر مبنی ہے جو کرناٹک اور اڑیسہ میں نومبر ۱۹۹۶ء [illegible] مئی ۱۹۹۷ء کے درمیان کیے گئے ہیں۔

ابتدا

جنگلات کا مشترکہ انتظام جنگلات کے بارے میں قومی پالیسی، ۱۹۸۸ء کا براہِ راست نتیجہ ہے، جس میں بقا کے لیے جنگلاتی وسائل پر گاؤوں کے غریب لوگوں کے انحصار کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس پالیسی میں جنگلاتی زمینوں کی بہتری اور تحفظ کے سلسلے میں عوام کی شرکت کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ گزشتہ ۱۵۰ برسوں سے ملک کے جغرافیائی علاقے کا ۲۳ فی صد حصہ (۳۲۹ ملین ہیکٹیئر) جس کی زمرہ بندی جنگلاتی زمینوں کے طور پر کی گئی ہے، منصوبہ بند اور سائنسی جنگل بانی کے تحت سرکاری کنٹرول میں رہا ہے اور ملک کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عمارتی لکڑی کی پیداوار پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ جنگلاتی زمینوں پر صنعتی اقسام کی پودکاریوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد بھی یہ پالیسی جاری رہی (سکسینہ ۱۹۹۵: ۱۷)

اس کی وجہ سے جنگلات ختم ہوتے چلے گئے نیز دیہی غریبی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوا۔ لوگوں کے مقامی گروپوں کو ان وسائل سے، جن پر صدیوں سے انحصار کرتے چلے آرہے تھے، الگ کر دیے جانے کے سبب، سماجی بے چینی اور حقوق کے بارے میں جھگڑوں میں اضافہ ہوا۔ جنگلات

کی پامالی کا سلسلہ جاری رہا نیز جنگلات پر مبنی صنعتوں میں اضافے اور بڑھتے ہوئے حیاتیاتی دباؤ کی وجہ سے صورت حال اور خراب ہو گئی تھی۔ زرعی زمین کی کمی (۲۳ء۴۲/۲ ملین ہیکٹیئر جنگلاتی زمین ۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان زراعت کے لیے سرکاری طور سے منتقل کی گئی تھی) ناجائز قبضے، ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے زمین کی منتقلی اور ریاستی جنگلات سے خام مال بہت ہی زیادہ کم قیمت پر حاصل کرنے والی صنعتوں کی وجہ سے جنگلات کی پامالی کا عمل تیزی سے چلتا رہا اور گاؤوں کے غریب لوگوں کے مفادات کی قربانی ہوتی رہی۔ (اگروال اور سہگل، ۱ : ۱۹۹۶ء)

حکومت نے ۱۹۷۶ء میں مرکز اور ریاست دونوں کے دائرۂ اختیار کے تحت مشترکہ فہرست میں جنگلات کے خاتمے کے مسئلے کو شامل کر کے اس کی روک تھام کرنے کی کوشش کی۔ مرکزی حکومت نے جنگلات اور جنگلی جانوروں سے متعلق قوانین منظور کرنے کے اختیارات حاصل کر لیے۔ ۱۹۸۰ء میں جنگلات کے تحفظ کا قانون منظور کرنا ایک اہم قدم تھا، جس کے تحت جنگلاتی زمین کو غیر جنگلاتی استعمال کے لیے منتقل کرنے کے سلسلے میں مرکزی حکومت سے منظوری لینا لازمی ہو گیا۔ اگرچہ غیر جنگلاتی استعمال کے لیے جنگلاتی زمینوں کی منتقلی کی کسی قدر روک تھام ہوئی تھی، تاہم ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان ۴۷۰۰ء۳ ہیکٹیئر سالانہ کی شرح سے جنگلات کے خاتمے کا سلسلہ جاری رہا (اگروال اور سہگل، ۱ : ۱۹۹۶ء)۔

جنگلات پر دباؤ کو کم کرنے کے لیے غیر جنگلاتی زمین پر جنگل بانی کا ایک سماجی پروگرام شروع کیا گیا تھا تاکہ عوام کی مستقل ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے، لیکن اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ سماجی جنگل بانی سے جنگلات سے متعلق لوگوں اور جنگلاتی پیداوار کا استعمال کرنے والے لوگوں کے درمیان چلی آ رہی مسلسل لڑائی کی روک تھام نہیں کی جا سکی۔ جنگلات سے متعلق بہت سے لوگوں نے جنگلات کے محکموں کے طریقہ کار پر اعتراضات کرنے شروع کر دیے۔ وہ یہ حقیقت سمجھنے لگے کہ جنگل بانی کے کسی بھی پروگرام کی کامیابی کے لیے عوام کی شمولیت لازمی ہے۔ (اگروال اور سہگل، ۲ : ۱۹۹۶ء)۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایسی اطلاعات بھی ملنے لگیں کہ بہت سے دیہی گروپوں نے اپنے گاؤوں سے متصل جنگلات کے تحفظ کا کام خود شروع کر دیا ہے۔ اڑیسہ، جنوبی بہار، مدھیہ پردیش اور گجرات میں جنگلات کے تحفظ کے ایسے ہزاروں غیر رسمی گروپ موجود ہیں۔ مغربی بنگال میں جنگلات سے متعلق کچھ دور اندیش افسران نے جنگلات کے انتظام کے کام میں لوگوں کو شامل کرنا شروع کر دیا۔ جنگلات کے انتظام کے لحاظ سے نتائج حیرت انگیز تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہی ۱۹۸۸ء میں جنگلات سے متعلق قومی پالیسی تشکیل دی گئی تھی۔ اس میں ماحولیاتی امور اور مقامی ضروریات کو ترجیح دینے نیز جنگلات کے انتظام کے کام میں عوام کو شامل کرنے پر زور دینا شامل تھا۔ اس پالیسی کے مطابق جنگلات کو صنعتوں کے لیے تجارتی طور سے استعمال نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان سے مٹی اور ماحولیات کا تحفظ کیا جائے گا نیز مقامی لوگوں کی گزر بسر کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔ پالیسی میں مالیہ کمانے کے مقابلے میں ماحولیاتی استحکام کو زیادہ سے زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ (پیرا ۲/۲)۔ اس میں ایک کلچر کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور ملے جلے جنگلات کو ترجیح دی گئی ہے۔ تجارت اور سرمایہ کاری کی بجائے اب معیشت حیوانات اور لوگوں کی کم سے کم ضروریات پوری کرنے، ایندھن کی لکڑی اور چارہ فراہم کرنے نیز قبائلی جنگلاتی رابطوں کو مستحکم بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ (سکسینہ، ۱۳ : ۱۹۹۵ء)۔ نئی پالیسی کے پیرا ۴/۳ میں کہا گیا ہے۔ قبائلیوں نیز جنگلات میں اور ان کے نزدیک رہنے والے دیگر غریب لوگوں کی زندگی جنگلات کے ارد گرد گھومتی ہے یعنی ان کی زندگی کا انحصار جنگلات پر ہے۔ ان کے حقوق کا اور ان کو جو رعایتیں ملی ہوئی ہیں، ان کا مکمل طور سے تحفظ کیا جانا چاہیے۔ ایندھن کی لکڑی، چارے، چھوٹی جنگلاتی پیداوار اور عمارتی لکڑی کی ان کی گھریلو ضروریات کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے۔

لیکن ضرورت پر مبنی، غریبی پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے جنگلات کے انتظام کے سلسلے میں زور دار الفاظ کے باوجود، ان مقاصد پر عمل درآمد کے لیے ٹھوس نوعیت کے بہت ہی کم اقدامات کیے گئے ہیں۔

عمل درآمد

بالآخر ۱۹۸۸ء کی پالیسی کا مقصد جون ۱۹۹۰ء میں ماحولیات اور جنگلات کی وزارت (ایم۔او۔ای۔ایف) حکومت ہند کے ایک سرکلر کے ذریعے عمل درآمد کراتا تھا، جس سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کا نظریہ وجود میں آیا۔ یہ سرکلر بڑی حد تک مغربی بنگال میں مشترکہ انتظام کے کامیاب تجربے پر مبنی ہے۔ اس میں سفارش کی گئی ہے کہ جنگلات کی بحالی کے لیے خاص طور سے قائم کیے گئے دیہی اداروں کو استفادہ کرنے کا حق اور نقشے میں شامل کردہ جنگلاتی علاقوں میں مالیہ کا ایک حصہ دیا جانا چاہیے۔ (ایم۔او۔ای۔الیف، ۱۹۹۰ء، پیرا ۴۔ اور ۵) مستفید ہونے والوں کے حقوق ذمہ داریاں مفاہمت کے ایک میمورنڈم (ایم۔او۔یو) کے طور پر طے کی جاتی ہیں نیز ان پر شرکاء اور ریاستی حکومت دونوں کو اتفاق کرنا ہے (ایم۔او۔ای۔الیف، ۱۹۹۰، پیرا ۱، ۷۔ اور ۱۴) مزید برآں ۱۹۹۰ء کے سرکلر میں کمیونٹی کے انتظام میں غیر سرکاری تنظیموں کی مہارت کے پیش نظر، پامال جنگلاتی زمینوں کے تحفظ اور ان کو کارآمد بنانے کے کام میں عوام کی بامقصد شرکت حاصل کرنے کی غرض سے غیر سرکاری تنظیموں کی شمولیت کی خاص طور سے سفارش کی گئی ہے (پیرا ۳)۔ لیکن سرکلر میں یہ بات واضح نہیں کی گئی ہے

کہ دیہی اداروں کی ترقی و فروغ کی ذمہ داری طے نہیں کی ہے۔ نہ ہی اس میں اس طرح کے اداروں کو کوئی حق دیا گیا ہے، جس سے کہ وہ جنگلات کے انتظام میں شامل ہو سکیں۔

ایک قومی پالیسی کے طور پر اس کی سفارشات لچکدار ہیں نیز اس کے لیے ایک متوازی ریاستی پالیسی بنانے اور سرکاری احکامات کے ذریعے اس پر عمل درآمد کی ضرورت ہے۔

جنگلات کے مشترکہ انتظام کا پروگرام قرار داد میں جاری کر کے ملک کی ۱۷ ریاستوں نے اپنایا ہے۔ صرف کیرالا اور شمال مشرقی علاقے کی ریاستوں نے ابھی یہ پروگرام شروع نہیں کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کیرالا سمجھے جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق قرارداد تیار کر رہا ہے۔ شمال مشرقی علاقے میں جنگلات کے مالک زیادہ تر مقامی برادریاں ہیں اور ملک کے بقیہ حصے میں، جنگلات کے مشترکہ انتظام کے پروگرام پر، جیسا کہ سمجھا گیا ہے، اس کی موجودہ شکل میں عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال تری پورہ نے جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق خود اپنی قرار داد جاری کر دی ہے نیز میگھالیہ اور اروناچل پردیش سے پیش رفت کی رپورٹ بھی مل چکی ہے۔

چوں کہ جنگلات کی اقسام اور سماجی و اقتصادی پیمانے ہر ریاست میں کافی مختلف ہیں، اس لیے جنگلات کے انتظام سے متعلق گروپ کی تشکیل، اس کی قسم (انجمن، امداد باہمی، الف ڈی رجسٹرڈ) لکڑی کے فوائد وغیرہ کے لحاظ سے جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق احکامات سبھی مختلف ہیں۔ تاہم ریاستوں میں جنگلات کے مشترکہ انتظام کا زور ایک جیسا ہی ہے۔ تمام احکامات کے ابتدائی پیراگراف میں، پامال جنگلات کی بحالی اور بہتری کے سلسلے میں کمیونٹی کی شرکت پر زور دیا گیا ہے۔ اڑیسہ کے حکم (۱۹۹۳ء) میں ایک قدم آگے بڑھ کر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ محکمہ جنگلات اور دیہی برادریوں کے درمیان موثر ساجھے داری حاصل کرنے کے لیے جنگلات کے انتظام کو ایک نئی جہت دی جانی ہے نیز یہ کہ دونوں کے لیے مساوی ساجھے داری کا خیال رکھا جانا ہے۔

نظریاتی تبدیلی

جنگلات کے مشترکہ انتظام کو محکمہ جنگلات کے باہر بھی بہت زیادہ حمایت حاصل ہوئی ہے کیوں کہ یہ سیاسی طور سے صحیح ہے اور لوگوں کو جنگلات کے انتظام میں اہم مقام دلاتا ہے۔ اس سے جنگلات کی بحالی کے طریقوں میں بنیادی تبدیلی آئی ہے اور نظریاتی طور سے یہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے:

سے	میں
مرکزی انتظام	لامرکزی انتظام
مالیے پر مبنی	وسائل پر مبنی
پیداواری مقاصد	استحکام
ایک مصنوع	مختلف مصنوعات
بڑے منصوبے	چھوٹے پیمانے پر منصوبہ بندی
نشانے پر مبنی	عمل پر مبنی
یک طرفہ فیصلہ سازی	اشتراکی فیصلہ سازی
تادیبی قواعد	خود احترازی قواعد
عوام کو کنٹرول کرنا	عوام کو سہولت بہم پہنچانا
محکمہ	عوامی ادارے
مفروضہ ہم نسلیت	گوناگونی کو تسلیم کرنا
پہلے سے مقررہ مقصد حاصل کرنا	ضرورت پر مبنی مختلف مقاصد پورے کرنا
علاقائی انتظام	مخصوص جگہ کا انتظام
لکڑی کی پیداوار	حیاتیاتی گوناگونی کے ساتھ ساتھ مختلف پیداوار
واحد تکنیکی پیکیج	پسند و انتخاب کی لمبی فہرست
مقررہ طریقۂ کار	تجربے کرنا اور لچکداری
پہلی پسند کے طور پر پودکاری	کم لاگتی انتظام اور دوبارہ پیداوار
واحد اقسام	مختلف اقسام اور مختلف سطحی پودکاری

ماخذ: راجو، ۱۹۹۶ء

خراب طریقہ

جیسا کہ ملک بھر سے موصول ہونے والے ثبوتوں سے پتا چلتا ہے، اس طریقے میں بہت کچھ تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا کامیابی کی کہانیوں کے باوجود ہے: مثلاً مغربی بنگال کے ضلع مدنا پور میں ارا باڑی، جس نے بلاشبہ یہ دکھا دیا ہے کہ مقامی برادریاں اپنے گاؤوں کے نزدیک واقع جنگلاتی علاقوں کا تحفظ کر سکتی ہیں نیز یہ کہ محکمہ جنگلات بھی، اگر وہ چاہتا ہے تو عوام کے ساتھ کام کر سکتا ہے۔ جنگلات کے مشترکہ انتظام کا بنیادی اصول، جیسا کہ محکمہ جنگلات نے وضاحت کی ہے، یہ ہے کہ

- تحفظ کے کام میں مقامی لوگوں کو شامل کر کے پامال جنگلات کے بڑے علاقوں کو بحال کیا جا سکتا ہے۔
- اگر مقامی لوگوں کو ترغیب اور اختیار دیا جائے تو وہ جنگلات کا تحفظ کریں گے اور انھیں بحال کریں گے۔

لیکن اس طریقے سے پتا چلتا ہے کہ

- بیشتر علاقوں میں جنگلات کے مشترکہ انتظام کو پامال جنگلات کی بحالی نیز محکمہ جاتی مقاصد پورے کرنے کے لیے پودکاری کی برقراری کو بہتر بنانے کی ایک حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔
- جب کہ جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق احکامات میں، ان کو چھوڑ کر جو قومی ملکیت میں لے لیے گئے ہیں جنگلات کی غیر عمارتی لکڑی کی پیداوار (این۔ ٹی۔ ایف۔ پی) تک آزادانہ رسائی کی اجازت ہے، انتظامی مقاصد محکمہ جاتی طور سے مقرر کیے جاتے ہیں اور یہ مقاصد زیادہ تر عمارتی لکڑی پر مبنی ہوتے ہیں۔
- جیسا کہ جنگلات کے مشترکہ انتظام کے

پروگرام میں زور دیا گیا ہے، عوام مفصل کی کٹائی کے فوائد میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے ہیں، کیوں کہ وہ جنگلات سے مسلسل بے شمار فوائد حاصل کر رہے ہیں۔ اس میں جنگلات کی غیر عمارتی لکڑی کی پیداوار نیز ایندھن کی لکڑی اور چارہ شامل ہے۔

درحقیقت پیچیدہ قسم کے نشانے پر مبنی سرکاری پروگرام کی تمام تر الجھنوں سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کے پروگرام پر عمل درآمد کا کام شروع ہوتا ہے۔ اس میں ریاستوں میں مختلف ناموں سے مثلاً ون سرکشا سمیتیاں (اڑلیسہ) یا دیہی جنگلاتی کمیٹیاں، دیہی گروپوں کی تشکیل تک کا کام بھی شامل ہے۔ بہت اہم شخصیتوں یا دو طرفہ عطیہ دینے والوں کی جائزہ ٹیموں کے دورہ کرنے سے پہلے سینئر افسران مثلاً محافظ جنگلات دیہی کمیٹیاں بنانے کے سلسلے میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یا چھوٹے منصوبوں کی مثال لے لیجیے جو کہ جنگلات کے مشترکہ انتظام کا ایک لازمی جزو ہیں۔ جنگلات کے مشترکہ انتظام کے سلسلے میں ریاستی حکومت کے تمام احکامات میں دیہی اداروں کی شرکت سے چھوٹے منصوبے تیار کرنے کا کام شامل ہے۔ چھوٹے منصوبوں کے سلسلے میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان سے لوگوں کی ضروریات کا اظہار ہوگا اور جنگل بانی کے طریقوں میں اسی کے مطابق تبدیلی آئے گی عملاً جنگلات سے متعلق ریاستی محکمے تیاری کے عمل پر حاوی ہو جاتے ہیں اور قطعی دستاویز سے عوام کے فوائد یا وسائل کے استعمال کے خاکے کی بجائے، کی جانے والی سرمایہ کاری کا زیادہ اظہار ہوتا ہے۔ جنگلات کے محکمے عام طور سے بجٹ، اجرت اور کام کی شرحوں، جو مزدوروں کے لیے واجب الادا ہیں، کے سلسلے میں معلومات مہیا کرنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ یہ محکمے جنگل بانی کے اپنے طریقے پر عمل پیرا ہیں،

حالاں کہ کاغذ پر چھوٹا منصوبہ سرمایہ کاری کی بنیاد بن جاتا ہے۔ درحقیقت چھوٹے پیمانے پر منصوبہ بندی کا عمل جوڑ توڑ کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے، جیسا کہ ملک بھر میں تجربے سے پتا چلتا ہے۔ اڑیسہ کے ضلع میور بھنج کے کشلنگ گاؤں میں یا پھول بنی ضلع کے تالاڈنڈاکلا گاؤں میں، گاؤں کے لوگوں نے چھوٹے منصوبے کے بارے میں سنا تک بھی نہیں ہے، حالاں کہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ منصوبہ گاؤں کے لوگوں کے ساتھ مشترکہ طور سے تیار کیا گیا ہے۔ کرناٹک میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ گاؤں کے لوگ لگائے جانے والے درختوں کے سلسلے میں اپنے انتخاب کا اظہار کریں گے اور یہ بات چھوٹے منصوبے میں درج کی گئی ہے۔ منصوبے تیار کیے جانے اور پودکاری کا کام مکمل ہو جانے کے کافی عرصے بعد، یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ ان درختوں کا انتخاب گاؤں کے لوگوں نے کیا ہے، درختوں کی ایک من مانی فہرست چھوٹے منصوبے میں شامل کر دی گئی تھی۔ تقریباً تمام ریاستوں میں چھوٹے منصوبے انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ اگر گاؤوں کے لوگوں کی رسائی دستاویز تک ہو بھی جائے تو یہ ایک ایسی زبان ہے، جسے عام طور سے گاؤوں کے لوگ پڑھ نہیں سکتے۔ نہ ہی جوڑ توڑ کا معاملہ صرف چھوٹے منصوبے تک محدود ہے۔ جنگلات کے مشترکہ انتظام کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز دیہی ادارے کے ساتھ مفاہمت کے میمورنڈم پر دستخط کرنا ہے۔ کرناٹک میں اترا کنڈا ضلع کے کانگوڈ گاؤں میں، جو کہ ریاست کا پہلا گاؤں ہے، جہاں مفاہمت کے میمورنڈم پر دستخط کیے گئے تھے، دیہی ادارے کے صدر سے مفاہمت کے کورے میمورنڈم پر دستخط کرائے گئے تھے کیوں کہ ایک وزیر افتتاح کے لیے آ رہے تھے اور گاؤوں کے لوگوں کو تفصیلات بتانے کا وقت نہیں تھا۔ گجرات میں محکمہ جنگلات سرمایہ کاری کے منصوبوں

پر عمل درآمد کرتے ہوئے دیہی ادارے کو مزدوروں کا ایک ادارہ سمجھتا ہے اور انجام دیے گئے کام کے لیے انھیں اجرتیں دیتا ہے۔ یہ چیز جنگلات کے مشترکہ انتظام کے مقصد کے منافی ہے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنگلات کا محکمہ مجموعی طور سے کمیونٹی کے ساتھ تال میل کرے گا، یعنی مجموعی طور سے دیہی ادارے کے ساتھ تال میل، نہ کہ فرداً فرداً۔ (راجو، ۱۱: ۱۹۹۷)

بعض اوقات کھلے عام عداوت بھی پائی جاتی ہے، جیسا کہ کرناٹک کے اترا کنڈا ضلع کے بیلاں کیری اور باشی گاؤوں میں، جہاں بہت چھوٹے کسان ناجائز قبضوں کی وجہ سے اپنی تمام زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور ان زمینوں پر جنگلات کے مشترکہ انتظام کے تحت ببول یا کیکر کے درختوں کے لیے پودکاری کی گئی ہے۔ نشانے کے حصول کی دوڑ میں لوگ محض گنتی کی حد تک ہی رہ گئے ہیں اور جنگلات کے حقیقی انتظام کے سلسلے میں مشکل سے ہی ان کی کوئی اہمیت ہے۔

مالیے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا

جنگلات کے محکمے کی توجہ عمارتی لکڑی کی پیداوار کر کے مالیے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے پر ہی چلی آ رہی ہے۔ اس کا اظہار ان زمینوں پر بھی ایک ہی قسم کی پودکاری پر زور دینے کی صورت میں ہوتا ہے، جس پر قدرتی طور سے از سر نو پیداوار کی جا سکتی ہے۔ قدرتی طور سے از سر نو پیداوار ملک کے بہت سے علاقوں میں ممکن ہے اور اس سے مختلف اقسام والے جنگلات کو فروغ حاصل ہوتا ہے، جن سے لوگوں کی گوناگوں ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ قدرتی طور سے از سر نو پیداوار کے سلسلے میں واحد مسئلہ یہ ہے کہ اس میں جنگلات کے بڑھنے میں وقت لگتا ہے اور پودکاری کا محکمہ جاتی نشانہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چوں کہ ساگون یا کیکر کی

پودکاری سے مقامی لوگوں کی گزربسر کی ضروریات پوری نہیں ہوتی ہیں، اس لیے وہ اس طرح کے پروگراموں میں شرکت نہیں کرتے ہیں۔

مزید برآں جنگلات کا مشترکہ انتظام پامال علاقوں کے لیے محدود ہے، خاص طور سے ان علاقوں کے لیے جہاں جنگلاتی علاقہ ۲۵ فی صد سے بھی کم ہے۔ یہ چیز ۱۹۸۸ء کی قومی جنگلاتی پالیسی کے انتہائی برعکس ہے۔ اترا کنڈا ضلع میں، مثال کے طور پر، یہ چیز عوام کی شرکت کو ۸۲۶۲ مربع کلومیٹر کے صرف ایک فی صد حصے کے لیے محدود کرتی ہے۔ ضلع کے اس علاقے کی جنگلات کے طور پر زمرہ بندی کی گئی ہے۔ پامال علاقوں کا استعمال لوگ اکثر چراگاہوں کے طور پر کرتے ہیں اور ان علاقوں میں ایک قسم کی پودکاری کرنے کا مطلب ہے لوگوں کا قطعی نقصان۔

جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق احکامات میں فصل کی قطعی کٹائی میں ساجھے داری پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن لوگوں کی زیادہ دلچسپی استفادہ کرنے کے حق میں ہے نہ کہ قطعی مفادات میں۔ مثلاً ایک غریب کنبے کے لیے ۱۵۔۲۰ سال بعد لکڑی میں حصے کے مقابلے میں غیر لکڑی والی جنگلاتی پیداوار کہیں زیادہ مفید ہے۔ اڑیسہ میں اپنے جنگلات کا تحفظ کرنے والے تقریباً تمام گاؤں دعوے سے کہتے ہیں کہ وہ یہ کام درخت گرانے اور قطعی فصل کاٹنے کے لیے نہیں کر رہے ہیں۔ اس کی بجائے غیر لکڑی والی جنگلاتی پیداوار، پتوں کی کھاد اور مٹی کا تحفظ زیادہ اہم ہے لیکن کرناٹک میں، سرکاری حکم میں (جی او) اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ لوگ سرکاری ڈپوؤں سے غیر لکڑی والی جنگلاتی پیداوار خریدتے ہیں تاکہ وہ بچولیوں کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔ چناں چہ لوگوں کو اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی، جس چیز کا وہ تحفظ کرتے ہیں۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں، جن سے جنگلات کے مشترکہ انتظام کے بنیادی فلسفے کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ درحقیقت ان بیشتر علاقوں میں جنگلات کے مشترکہ انتظام کے سلسلے میں گاؤں تلاش کرنے کا کام مشکل ہے، جہاں لوگ اقدام اور ادارے کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں، نہ کہ ایک سرکاری پروگرام۔

لیکن عمل میں محکمہ جنگلات کا رویہ وہی ہے جو کہ تھا۔ اس کی مثال اڑیسہ کے معاملے سے دی جا سکتی ہے، جہاں لوگ بغیر کسی بیرونی مدد کے برسوں سے جنگلات کا تحفظ کر رہے ہیں اور ان کو از سر نو اُگا رہے ہیں۔ حکومت اڑیسہ پیسے کے لیے سویڈش ڈیولپمنٹ ایجنسی (ایس آئی ڈی اے) کے ساتھ بات چیت کر رہی ہے۔ اس کی کامیابی کو ثابت کرنے کے لیے، اس نے اکثر جھوٹے وعدوں سے بہت سی اندرونی کوششوں سے کام لیا ہے۔ ضلع پھول بنی کے ایک گاؤں کریامل میں، گاؤں کے لوگوں کی رضامندی ٹی شرٹیں مفت تقسیم کر کے نیز گاؤں کے لیے ایک رنگین ٹیلی ویژن دے کر حاصل کی تھی۔ ایک اہم سرکاری حکم ۳۰ ستمبر ۱۹۹۶ء کو جاری کیا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ جن جنگلات کا تحفظ کمیونٹی کر رہی ہے، ان کو گاؤں کے جنگلات قرار دیا جائے گا۔ آج پی سی سی ایف سے لے کر ڈی ایف او تک ہر ایک یہ کہہ کر اس کو نہ اپنانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا سرکاری حکم (جی او) کیوں جاری کیا جائے، جس پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکتا؟

قانونی تائید

جنگلات کے مشترکہ انتظام سے متعلق کسی بھی قرارداد یا حکم کو قانونی تائید یا حمایت حاصل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بار بار مانگیں کی گئی ہیں، لیکن ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ لازمی طور سے حکومت اور محکمہ جنگلات ترقیاتی پروجیکٹوں میں کلیدی عنصر کے طور پر انسانی وسائل کی شمولیت کے لحاظ سے شرکت کا جائزہ لیتا ہے تاکہ اس کی کامیابی کو یقینی بنایا جائے۔ جنگلات کا محکمہ جنگلات کے محض کم اخراجاتی تحفظ میں دلچسپی رکھتا ہے اور جنگلات کا مشترکہ انتظام اس مقصد کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔ شرکت کو ایک ایسے عمل کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، جس کے ذریعے عام لوگ اپنے وسائل کی بنیاد پر کنٹرول حاصل کر سکیں اور اپنا معیار زندگی بہتر بنا سکیں۔ جنگلات کے مشترکہ انتظام کو اختیارات دینے کے ایک طریقے کے طور پر نہیں دیکھا جاتا۔

جنگلات کے مشترکہ انتظام کے طریقے نشاندہی کی اس اعلا سطح سے، جو گاؤں کے لوگوں کے پاس ہے اور اختیارات کے اس احساس سے جو وہ محسوس کرتے ہیں، قطعی مختلف ہیں، جہاں کہیں انھوں نے جنگلات کے مشترکہ انتظام سے آزادرہ کر، اپنے آپ جنگلات کے تحفظ کے اقدام کیے ہیں۔ لوگوں کے ذریعے جنگلات کے تحفظ کے ایسے اقدامات کے سلسلے میں اڑیسہ اور بہار سے اب زیادہ سے زیادہ ثبوت مل رہے ہیں، جہاں ہزاروں دیہی گروپ جنگلات کے تخمینہ شدہ ......۴ ہیکٹیئر رقبے پر از سر نو جنگلات اُگا رہے ہیں۔ یہ چیز کچھ حد تک گجرات، راجستھان، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش میں بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ (اگروال اور سہگل، ۱۹۹۶) جنگلات کے مشترکہ انتظام کے سلسلے میں بنیادی اصول، یعنی کمیونٹیاں اپنے جنگلات کا انتظام و انصرام کر سکتی ہیں، کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اصول ان تجربات سے وضع کیا گیا ہے۔

ان دیہی گروپوں نے جنگلات کی پامالی اور نتیجتاً ایندھن، چارے اور چھوٹی جنگلاتی پیداوار کے بحران کے پیش نظر اپنے اپنے گاؤوں سے ملحقہ جنگلاتی علاقوں کا تحفظ کرنا اور ان کو از سر نو اگانا شروع کر دیا ہے۔ یہ گروپ زیادہ تر ان علاقوں میں قائم ہوئے ہیں، جہاں لوگوں کا بہت زیادہ اقتصادی

اور ثقافتی انحصار اب بھی جنگلات پر ہے نیز جہاں کمیونٹی کے وسائل کے انتظام کی روایات اب بھی برقرار ہیں۔ اُن لوگوں نے کسی قسم کی بھی بیرونی مدد، خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری کے، کے بغیر جنگلات کے تحفظ کا کام شروع کیا ہے اور انھوں نے جنگلات کے انتظام کے سلسلے میں اپنی زبردست صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان گروپوں نے تمام متعلقہ گھرانوں میں اخراجات اور فوائد میں حصے داری کے سلسلے میں وسیع ادارہ جاتی طریقہ ہائے کار وضع کیے ہیں۔ رسائی پر کنٹرول اور منفعت فوائد حاصل کرنے والے لوگوں پر جرمانے عائد کرنے کے طریقوں کے بارے میں فیصلہ دیہی میٹنگوں اور مشاورتوں میں کیا جاتا ہے۔

اگرچہ مختلف گاؤوں میں مختلف طریقہ ہائے کار پائے جاتے ہیں، تاہم ان کمیونٹی اداروں کے وضع کردہ اہم قواعد وضوابط یہ ہیں:

● ایندھن کی لکڑی جمع کرنے کا حق۔ گاؤں کے لوگوں کو خشک شاخیں، گری ہوئی ٹہنیاں اکٹھا کرنے کی اجازت ہے لیکن وہ درخت نہیں کاٹ سکتے۔ اس سلسلے میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جمع کرنے کا کام ہفتے میں ایک بار یا سال میں ایک یا دو بار، لیکن صرف ان مخصوص دنوں میں، جب کمیٹی کے اراکین کی نگرانی میں پورے گروپ کو جنگل میں جانے کی اجازت ہوتی ہے۔

● پھل، جڑیں، پتیاں، گوند، سبزیاں، تکہن جیسی چیزیں اکٹھا کرنے کا حق۔

● لوگ زراعتی ساز وسامان نیز مکان کی تعمیر اور مرمت کے لیے درکار لکڑی حاصل کرنے کے سلسلے میں انتظامی کمیٹی کو درخواست دیتے ہیں۔ کمیٹی ضرورت کے صحیح ہونے کی تصدیق کرتی ہے اور ضرورت کے مطابق کچھ درخت تفویض کر دیتی ہے۔ بعض اوقات ایک علامتی فیس لی جاتی ہے اور وہ رقم دیہی ترقیاتی فنڈ میں جمع کرادی جاتی ہے۔ اکثر لکڑی کے سلسلے میں درخواستوں کی تعداد سے نپٹنے کے لیے اصول و ضوابط موجود ہیں اور ان اقسام کا تعین کر دیا جاتا ہے، جن کا اس طرح سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

● تجارتی پیمانے پر درخت کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

● جنگلات کے تحفظ کے کام میں لازمی شرکت، زیادہ تر اس جگہ باری باری نگرانی کے ذریعے، جہاں مخصوص کردہ گھرانوں کے ایک یا دو رکن نگراں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اڑیسہ میں اس کو ٹھینگا پالی اور گجرات میں اس کو وارا کہتے ہیں۔ بعض اوقات گارڈ مقرر کرنے کے لیے گاؤں کے لوگ اناج اکٹھا کرتے ہیں۔

● گاؤں کے خطاکاروں اور بیرونی رضاکاروں کو سزا دینے کے لیے جرمانے۔

یہ سب دیہی ادارے کھلے پن، قواعد و ضوابط، بیداری، پہل اور ترقی، مدت اور ضروریات کی تکمیل کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں (راجو، ۱۰۵:۱۹۹۶) حکومتوں اور غیر سرکاری تنظیموں دونوں کے ذریعے انھیں تسلیم کیے جانے کی ضرورت ہے نیز آزاد عوامی اداروں کے طور پر ان کا احترام کیا جانا چاہیے۔

اگر جنگلات کے محکمے اور حکومت واقعتاً لوگوں کو ہندوستان کے جنگلات کی بحالی کے کام میں شامل کرنا چاہتی ہے، تو اسے عملی حقائق نیز لوگوں کے ذریعے جنگلات کے انتظام کے تجربے کی روشنی میں، جنگلات کے مشترکہ انتظام کے بنیادی ڈھانچے کو بدلنا ہوگا۔ نئے ڈھانچے کے تحت سب سے پہلے جنگلات سے متعلق دیہی کمیٹی کو ایک آزاد ادارے کے طور پر تسلیم کیا جائے گا نہ کہ محکمے کے ایک ضمنی ادارے کے طور پر، جو کہ صرف تحفظ کے لیے قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگلات کے محکمہ کو جنگلات کے مشترکہ انتظام کے سلسلے میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہوگی جیسا کہ آج اسے حاصل ہے، بلکہ لوگوں کو فیصلے کرنے کے اختیارات کے ساتھ، اولین اہمیت دی جائے گی۔ جنگل بانی کا زور تجارتی لکڑی اور تجارتی جنگل بانی کے بجائے غیر تجارتی لکڑی والے جنگلاتی پیداوار اور عوام کی روز مرہ ضروریات پوری کرنے پر دینا ہوگا۔ بالآخر جنگلات کے محکمے کو زراعت یا مویشی پالن کے محکموں کی طرح ایک مشیر اور سہولیات بہم پہنچانے والے کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اپنے جنگلات کو محفوظ رکھنے کا یہی ایک واحد طریقہ ہے اور فرداً فرداً ان کے معاملات سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ محکمہ یہ کام کرسکتا ہے۔ ●

بقیہ: وقت کی صلیب

خالہ زاد بہن سے ہوتی۔ پروین کے ابا کا لاکھوں کا کاروبار تھا اور وہ ظفر کو مالا مال کر دیتے۔ گھر کی ساری کمی دور ہو جاتی ــــ اور آج گھر میں کسی طرح کی کسی کمی کی ذمہ دار ذکیہ اور صرف ذکیہ تھی۔

اب تک ذکیہ کئی نوکرانیاں رکھ چکی تھی۔ ایک آئی تو ذکیہ کے سنگار اور میک اپ کے سامان کا صفایا کرنے لگی اور ہر وقت اس کی نظر ظفر کی نقل و حرکت پر ہوتی۔ دوسری آئی تو وہ منّا کو لے کر باہر نکل جاتی اور محلے کے اوباش لڑکوں سے عشق لڑاتی، جس کے نتیجے میں منّا ایک دن ایک بھکارن کے پیچھے لگ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد بھکارن نے منّا کو گود میں اٹھا لیا۔

وہ تو خیریت ہوئی کہ محلے کے ایک شریف آدمی نے منّا کو پہچان لیا ورنہ زندگی بھر قلق رہ جاتا۔ اس عقل کی دشمن نوکرانی کا وہ لوگ کیا بگاڑ لیتے، وہ یا تو غائب ہو جاتی یا نکالی جانے پر کوئی دوسرا گھر جھانکتی۔

اب ذکیہ منّا کے لیے کیا کرے؟ نوکری چھوڑ دے تو اخراجات کیسے پورے ہوں؟

اس نے گھڑی دیکھی۔ اب دس بج کر ۱۵ منٹ ہو چکے تھے۔ ایک بار منّے کو منانے کی کوشش کی تو وہ فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ذکیہ نے اسے گود میں اٹھا لیا، چمکارا اور ٹافی لانے کا وعدہ کرتے ہوئے دادی کے پاس دے دیا۔

منّا کی دادی نے نفرت بھری نگاہوں سے ذکیہ کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ منّا سسکتا، سہما ذکیہ کو دیکھ رہا تھا ــ اور ذکیہ ممتا کی لاش کو روندتی ہوئی آگے بڑھ گئی ـــ بس وقت پر نہیں ملی تو کالج دیر سے پہنچے گی۔

منّا کا چہرہ دھیرے دھیرے پرنسپل کی پیشانی پر ابھری شکنوں میں کھو گیا۔ منّا کی سسکیاں سڑک کی ٹریفک میں گم ہوتی چلی گئیں۔ ●

ڈاکٹر اقبال محی الدین

خوشحالی کے نشان ہیں ہمارے بندھ

مانسون بارش کے غیر یقینی ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں کھیتی سے متعلق ترقیاتی پروگرام میں آب پاشی کے پروجیکٹس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بڑے بڑے دریاؤں پر بندھ بنا کر پانی جمع کیا جاتا ہے اور اونچائی سے اس کو گرا کر بجلی پیدا کرنے والی مشینوں کو چلایا جاتا ہے جس سے بجلی پیدا کی جاتی ہے اور پانی آب پاشی کے کام آتا ہے۔ ہندوستان میں بہت سے آب پاشی کے پروجیکٹس ہر ریاست میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں جن میں بہت سے تو ایسے ہیں جو آب پاشی کے ساتھ بجلی بھی پیدا کر رہے ہیں۔ جو ملک کے مختلف دریاؤں پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان کے عمل میں آجانے سے ہندوستان میں زراعت پر بہت عمدہ اثرات ہوئے ہیں۔ اس طرح دریاؤں پر تعمیر کیے گئے بندھ ہماری خوشحالی کے نشان ہیں۔ اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالنی ضروری ہے تاکہ پورے ملک کی ایک صاف تصویر ابھر کر آسکے۔

آزادی کے بعد ہمارا ملک معاشیاتی ترقی کے کام میں ہر ممکن کوشش کرتا رہا تاکہ عوام کو خوشحالی بخشی جا سکے۔ ان ترقیاتی کاموں میں ایک بہت اہم کام پانی کے ذخائر کا خاطر خواہ انتظام کرنا تھا۔ دو مسائل آپس میں جڑے ہوئے تھے جن میں سیلاب اور قحط ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ ان مسائل کا حل تجربہ اور ٹیکنالوجی کی مدد سے کیا گیا۔ دریاؤں پر Multi Purpose river valley Project کی تعمیر کی گئی جس سے یہ مسئلہ کافی حد تک سلجھا۔ آزاد ہندوستان نے وادیٔ دامودر پروجیکٹ میں سب سے پہلے اس سلسلہ میں قدم اٹھایا اور کامیابی حاصل کی۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیان ایک ہزار ایک سو ستائیس چھوٹے سے لے کر بڑے تک آبپاشی کے پروجیکٹس لیے گئے جن میں ۷۰۵ پروجیکٹس ہی مکمل ہو سکے۔ ۱۷۔ اور ایسے پروجیکٹس ہیں جو تقریباً مکمل ہونے والے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹی آب پاشی کی اسکیمیں بھی مکمل ہو چکی ہیں اور بہت سی تکمیل کی راہ پر گامزن ہیں۔

۱۹۵۱ء سے پہلے سارے ملک میں سینچائی کا حدود اربعہ ۲۶ء۲ کروڑ ہیکٹر تھا جس میں ۹۷ لاکھ ہیکٹر بڑے اور درمیانی آبپاشی کے پروجیکٹس کے ذریعہ سینچا جاتا تھا اور ۲۹ء۱ کروڑ ہیکٹر چھوٹے پروجیکٹس اور سینچائی کی اسکیموں کے ذریعہ سینچا جاتا تھا لیکن ۱۹۹۲ء تک سینچائی کا حدود اربعہ بڑھ کر ۸ء۵ کروڑ ہیکٹر ہو گیا جن کو بڑے بڑے آب پاشی کے پروجیکٹس کے ذریعہ سینچا گیا۔ اس طرح سینچائی کا رقبہ ۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۹۲ء تک ڈھائی گنے سے بھی زیادہ ہو گیا اور یہ ممکن ہو سکا آب پاشی کے پروجیکٹس کے عمل میں آنے سے۔

ہندوستان میں بہت سے بندھ مختلف دریاؤں پر بنائے گئے ہیں جن سے بجلی پیدا کی جا رہی ہے اور سینچائی کے لیے پانی بھی حاصل کیا جا رہا ہے۔ ایسے بندھوں کو Multi-purpose River Project کہا جاتا ہے۔ کچھ بندھ تو بڑے دریاؤں پر بنائے جاتے ہیں اور کچھ ان کے معاون دریاؤں پر بنائے جاتے ہیں۔ انسانوں کے بنائے ہوئے ایسے بندھوں کے نزدیک بڑے بڑے تالاب بنائے جاتے ہیں جن میں برسات کا پانی اور دریا کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ سیلاب کے پانی کو روکتے ہیں اور مٹی کے کٹاؤ کو بھی روکتے ہیں۔ خشک موسم میں ان کا پانی کھیتوں کی سینچائی کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان بندھوں کی اونچائی سے پانی کو Turbines کے پنکھوں پر گرا کر ان کو رواں کیا جاتا ہے جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔

ان بندھوں کے Catchment Areas پر جنگلات لگائے جاتے ہیں تاکہ ہریالی کے ساتھ ساتھ سیلابی پانی سے وہاں کی مٹی کٹ کر نہ بہہ سکے۔ اس طرح وہاں کی Wild Land اور ایکو سسٹم کو وہ قائم رکھتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں یہ Ecological Balance قائم رکھتے ہیں۔ یہ جنگلات بندھوں، تالابوں، نہروں اور سینچائی کی نالیوں کو کٹنے سے روکتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی زندگی کو یہ بندھ خوشحالی بخشتے ہیں۔

ہندوستان میں مشہور آب پاشی کے پروجیکٹس ہیں۔ (۱) دامودر ویلی پروجیکٹ، بھاکرا ننگل پروجیکٹ، اندرا گاندھی (راجستھان کینال) پروجیکٹ، کوسی پروجیکٹ، ہیرا کنڈ بندھ، تنگ بھدرا پروجیکٹ، ناگرجونا ساگر

ڈی ۔ ۹۱ ۔ ایم ۔ ایم ۔ ٹی ۔ سی ۔ کالونی، سری اروند مارگ ۔ نئی دہلی

پروجیکٹ، چمبل پروجیکٹ، ریہاند پروجیکٹ، کونیا پروجیکٹ ہنڑاواتی پروجیکٹ، سلال ہائی ڈل پاور پروجیکٹ، پوچم پد پروجیکٹ، گنڈک پروجیکٹ وغیرہ۔

۱۔ دامودر ویلی پروجیکٹ ہمارے پانی کے ذخائر کے انتظامیہ دائرے کی بہترین مثال ہے۔ دامودر حالاں کہ ایک چھوٹا دریا ہے مگر یہ "غم کے دریا" سے موسوم ہے کیوں کہ اس میں بے حد سیلاب آتا ہے اور آس پاس کے علاقوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ جنوبی بہار کے چھوٹا ناگپور کے علاقہ سے نکلتا ہے اور مغربی بنگال میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اس کی وادی "کالے سونے" یعنی کوئلہ سے مالامال ہے۔ لوہا بھی اس کے قرب وجوار میں پایا جاتا ہے۔ اس کے کئی چھوٹے چھوٹے بندھ ہیں جو اس دریا کے معاون دریاؤں پر بنائے گئے ہیں۔ ان پر کئی ہائیڈل پاور اسٹیشن ہیں۔ ایک جہاز رانی کی نہر بھی اس دریا سے نکالی گئی ہے۔ ہائیڈل پاور اسٹیشن کو ایک مشترکہ Grid سے جوڑ دیا گیا ہے جو آس پاس کے صنعت کے لیے کافی بجلی پیدا کرتا ہے خاص طور سے جنوب مشرقی بہار کے لیے یہاں سے بجلی سپلائی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی بنگال کے پاس کے علاقوں کو بھی بجلی یہاں سے ہی فراہم کی جاتی ہے۔ یہ پروجیکٹ آدھی ملین ہیکٹیر زمین کی آب پاشی کرتا ہے جس میں جنوب مشرقی بہار اور مغربی بنگال کے علاقے شامل ہیں۔

۲۔ بھاکرہ۔ ننگل پروجیکٹ بھی پانی کے ذخائر کے سائنسی انتظامیہ کی بہترین مثال ہے۔ بھاکرہ بندھ ستلج دریا کے ایسے نازک مقام پر بنایا گیا ہے جہاں اسے دو پہاڑیوں کے درمیان کی دیواریں مل گئی ہیں۔ اس لیے یہ بندھ زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ یہ دنیا کا سب سے اونچا gravity والا بندھ ہے۔ اس کی اونچائی دریائی بہتہ سے ۲۲۶ میٹر ہے۔ یہ بندھ Seismic Zone میں واقع ہے اور پہاڑیاں جو قدرتی دیوار کا کام کرتی ہیں وہ ۹۸۰۰۰۰ ہیکٹیر میٹرس پانی جمع رکھتی ہیں۔ آدمیوں کی تعمیر شدہ جھیل جسے گوبند ساگر کہتے ہیں وہ ریاست ہماچل پردیش میں واقع ہے۔ یہاں سے ۱۱۰۰ کلومیٹر تک نہریں نکالی گئی ہیں اور s ۳۴۰۰ کلومیٹر کے لمبائی تک ہیں۔ یہ ۴ر۱ ملین ہیکٹیر زمین کی آب پاشی کرتا ہے۔ ننگل پاور پلانٹ جو ستلج دریا پر واقع ہے ۱۲۰۴ میگاواٹ بجلی ہر سال پیدا کرتا ہے۔ یہ پروجیکٹ ہماچل پردیش، پنجاب، ہریانہ، راجستھان اور دہلی کو بجلی فراہم کرتا ہے۔

۳۔ اندرا گاندھی (راجستھان کینال) پروجیکٹ ایک بہت اہم اسکیم کے تحت بنایا گیا تا کہ نئے نئے علاقوں میں آب پاشی کی آسانی ہو اور وہاں زراعت کی فراغت ہو جائے۔ بیاس اور راوی دریاؤں کے پانی کو ستلج دریا کی طرف موڑ دیا گیا۔ پونگ بندھ بیاس دریا پر بنایا گیا جس میں ۹۰۰۰ ہیکٹیر میٹر پانی رہتا ہے۔ اسی کی وجہ سے دریا کے بیاس کا پانی ستلج میں مل جاتا ہے تاکہ اندرا گاندھی کینال یا راجستھان نہر جو دنیا کی سب سے لمبی نہر ہے وہ راجستھان کے گنگانگر، بیکانیر اور جیسلمیر اضلاع کو سیراب کر سکے۔ اندرا کینال ۶۴۸ کلومیٹر لمبی ہے۔ دریا کے ستلج، بیاس اور راوی کے پانی کو اس نہر کے ذریعہ شمال مغربی بیابا سے حصے کو سیراب کیا جاتا ہے تاکہ کھیتی میں فروغ ہو اور ہماری خوشحالی میں دن بہ دن اضافہ ہو۔

۴۔ کوسی پروجیکٹ بہار کا ایک اہم پروجیکٹ ہے جو نیپال کی مدد سے عمل میں آیا۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ کوسی دریا کے سیلاب کو کنٹرول کیا جائے۔ دریائے کوسی شمالی بہار کا "غم کا دریا" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ پروجیکٹ بہار میں ۸،۷۳،۰۰۰ ہیکٹیر زمین کی آب پاشی کرتا ہے۔ اس کی خاص نہر ہنومان نگر بیراج سے نکلتی ہے۔ اس پروجیکٹ کے علاوہ ہندوستان اور نیپال کا متحدہ گنڈک پروجیکٹ ہے۔

۵۔ ہیراکڈ بندھ ریاست اڑیسہ میں واقع ہے جو دنیا کا سب سے لمبا بندھ ہے۔ اس ۴ر۸ کلومیٹر لمبے بندھ میں ۸۱۰۰ ملین کیوبک میٹر پانی سینچائی کے لیے موجود رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مہاندی ڈیلٹا کے سیلاب کو بھی یہ بندھ کنٹرول کرتا ہے۔ کل ملا کر یہ ایک ملین کے تین چوتھائی ہیکٹیر زمین کی آب پاشی کرتا ہے اور اس کی پاور ۲۷۰ میگاواٹ ہے۔

۶۔ تنگ بھدرا پروجیکٹ کرناٹک اور آندھرا پردیش ریاستوں کی خدمت کرتا ہے۔ ۲ر۵۵ کلومیٹر لمبا اور ۵۰ میٹر اونچا بندھ ۴۰۰۰۰ ہیکٹیر زمین کی ان دونوں ریاستوں میں آبیاری کرتا ہے۔

۷۔ ناگرجنا ساگر پروجیکٹ آندھرا پردیش ریاست میں دریائے کرشنا پر بنایا گیا ہے۔ یہ ۸۶۷۰۰۰ ہیکٹیر زمین کو سیراب کرتا ہے۔ اس بندھ کا نام بدھ دانشور ناگرجنا کے نام پر رکھا گیا۔

۸۔ چمبل پروجیکٹ ریاست مدھیہ پردیش کے کچھ حصوں کو اور راجستھان ریاست کو سیراب کرنے کے لیے بنایا گیا۔ اس کا خاص مقصد چمبل دریا کے بیسن کی مٹی کے کٹاؤ کو روکنا تھا۔ اس پروجیکٹ میں گاندھی ساگر بندھ مدھیہ پردیش میں، کوٹا بیراج اور جواہر ساگر بندھ راجستھان میں شامل ہیں۔ یہ کل ملا کر آدھا ملین ہیکٹیر زمین کی آب پاشی کرتا ہے اور زراعت میں فروغ دے کر خوشحالی لاتا ہے۔

ان پروجیکٹس کے علاوہ ہندوستان میں بہت سے s مختلف دریاؤں پر بنائے گئے ہیں جن سے بجلی بھی پیدا کی جا رہی ہے اور سینچائی کے لیے پانی بھی حاصل کیا جا رہا ہے۔ پوچم پد پروجیکٹ آندھرا پردیش میں دریائے گوداوری پر ہے، گنڈک بہار اور اتر پردیش کا مشترکہ آب پاشی کا پروجیکٹ ہے۔ نیپال بھی اس آب پاشی کے پروجیکٹ سے فیضیاب ہو رہا ہے۔ سون ہائی لیول کنال بھی بہار کا آب پاشی کا پروجیکٹ ہے۔ گجرات میں کاکرا پارا پروجیکٹ دریائے تاپی پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ گجرات کے دوسرے آبپاشی کے پروجیکٹس میں — اُکائی، ماہی، سابرمتی، پانم اور کرجن۔

کرناٹک کے آب پاشی کے Projects ہیں بھدرا، اپر کرشنا، گھٹا پربھا اور مالا پربھا۔ مدھیہ پردیش میں توا آب پاشی کے پروجیکٹس دریائے نرمدا کی معاون دریا توا پر واقع ہے۔

چمبل پروجیکٹ مدھیہ پردیش اور راجستھان کے اشتراک میں ہے۔ اس کے علاوہ مہاندی کے Reservoir اور بھیس دیو بانگو پروجیکٹ بھی تعمیر کیے گئے ہیں جو مدھیہ پردیش کی سرزمین کو سیراب کرتے ہیں۔

مہاراشٹر کے آب پاشی کے پروجیکٹس ہیں۔ بھیما، جیک وادی، گنگادی، کرشنا پروجیکٹ اور اپرمن گنگا جن سے ریاست مہاراشٹر کو بجلی کے ساتھ ساتھ آب پاشی کے لیے پانی بھی ملتا ہے۔

اڑیسہ کے آب پاشی کے پروجیکٹس ہیں ہیراکُنڈ اور مہاندی ڈیلٹا اسکیم۔

تمل ناڈو اور کیرالا کا مشترکہ آب پاشی کا پروجیکٹ ہے۔ پارم بی کولم علی یار۔ اس کے علاوہ پیری یار پروجیکٹ سے بھی تمل ناڈو ریاست کو آب پاشی کی بہت سہولت ہو گئی ہے۔

اتر پردیش کے آب پاشی کے پروجیکٹس ہیں۔ ساردا پروجیکٹ جو دریائے گھاگھرا پر Left Bank واقع ہے۔ رام گنگا۔ Ghaghara Canal ستہری ضلع (اتر پردیش) میں ستہری بندھ دریائے سبھاگیرتھی پر بنایا گیا۔ مدھیہ گنگا نہر ضلع بجنور میں بنائی گئی جس سے آب پاشی کی جاتی ہے۔

مغربی بنگال میں فراکہ بندھ بنایا گیا تاکہ اس ریاست کو بجلی اور پانی دونوں مل سکیں۔ اس کے علاوہ اس بندھ سے کلکتہ بندرگاہ کی حفاظت بھی ہوتی رہے اور دریائے ہگلی میں جہاز رانی بھی ہوتی رہے۔ ان کے علاوہ مغربی بنگال کے آبپاشی کے پروجیکٹس ہیں۔ میور کاشی، کنگ بتی اور دامودر ویلی پروجیکٹ جو مغربی بنگال اور بہار ریاستوں کا مشترکہ پروجیکٹ ہے۔

اب کچھ آبی بجلی کے اہم پروجیکٹس کی بات بھی ہو جائے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آبی بجلی کی فراہمی کے سلسلے میں کام شروع ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں پہلا آبی بجلی گھر دریائے کاویری پر سیوا سامُدرم کے مقام پر ریاست کرناٹک میں قائم کیا گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ٹاٹا ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم مہاراشٹر کے مغربی گھاٹ پر بنایا گیا تاکہ ممبئی شہر کو بجلی پوری طرح سے فراہم کی جا سکے۔

تمل ناڈو میں پیکارا پہلا پاور اسٹیشن قائم ہوا۔ شمال میں منڈی پاور ہاؤس ہمالیہ کے علاقہ میں بنایا گیا۔ اس کے بعد اپر گنگا کینال ہائیڈرو الیکٹرک گرڈ سسٹم قائم کیا گیا۔

آزادیٔ ہند کے بعد آبی بجلی کے پروجیکٹس ملک کے مختلف حصوں میں تیزی سے عمل میں آنے لگے مثلاً بھاکرہ۔ ننگل، دامودر ویلی، ہیرا کُڈ، چمبل وغیرہ۔ ان کے علاوہ دوسرے اہم آبی بجلی کے پروجیکٹس بھی قائم ہوئے جن میں سے ریہاند پروجیکٹ ہے۔ یہ انسان کی بنائی ہوئی سب سے بڑی ہندوستانی جھیل ہے جو مدھیہ پردیش اور اتر پردیش کی سرحد پر ہے۔ اس سے ۳۰۰ میگاواٹ بجلی ہر سال پیدا کی جاتی ہے۔

کوئنا پروجیکٹ مہاراشٹر میں دریائے کرشنا کے مشرقی معاون دریا پر واقع ہے۔ کوئنا دریا پر ایک بندھ بنایا گیا ہے تاکہ وہ گھاٹ کے مغربی ڈھلان کی طرف ایک Tunnel کے ذریعہ پانی لے جا سکے۔ اس میں بجلی بنانے کی وسعت ۸۸۰ میگاواٹ ہے۔ یہ ممبئی۔ پونا کے صنعتی علاقوں کو بجلی فراہم کرتا ہے۔

کرناٹک میں شراوتی پروجیکٹ جوگ آبشار پر بنایا گیا ہے جو کہ ہندوستان میں سب سے اونچا ہے۔ اس کی بجلی پیدا کرنے کی وسعت ۸۹۱ میگاواٹ ہے۔ یہ بنگلور کے صنعتی علاقوں کو بجلی فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ گوآ اور تمل ناڈو کو بھی بجلی فراہم کرتا ہے۔

کالی ندی پروجیکٹ کرناٹک کو بجلی سپلائی کرتا ہے اور اس کی وسعت ۲۷۰ MW ہے۔ کُندہ پروجیکٹ تمل ناڈو کا اہم آبی بجلی کا پروجیکٹ ہے جس کی وسعت ۵۳۵ MW ہے۔

سابر گری پروجیکٹ کیرالا میں واقع ہے جس کی وسعت ۳۰۰ MW ہے جب کہ ایدوکی پروجیکٹ کی وسعت ۳۹۰ MW ہے۔

اڑیسہ کا بالی میلا پروجیکٹ ۳۶۰ MW Capacity کا ہے۔ گجرات میں اُکائی کے پروجیکٹ کی وسعت ۳۰۰ میگاواٹ ہے۔

جموں اور کشمیر کا سلال ہائیڈل پاور پروجیکٹ مکمل ہو چکا ہے جس کی وسعت ۱۰۰۰ میگاواٹ ہے۔

ان پاور پروجیکٹس کے علاوہ ہندوستان نے بھوٹان میں چوکھا کے مقام پر ایک بہت بڑا پاور پروجیکٹ بنایا ہے۔ اس پروجیکٹ کی بجلی ہندوستان میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ زیادہ تر شمال مشرقی ریاستوں میں اور مغربی بنگال میں یہاں کی بجلی استعمال کی جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دریاؤں پر بنائے گئے باندھوں سے ہمیں بجلی اور پانی آب پاشی کے لیے خوب ملتے ہیں جن سے زراعتی اور صنعتی ترقیات ملک میں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کے رہن سہن کا معیار بڑھتا جا رہا ہے۔ تعلیم کا دور دورہ ہر طرف ہو رہا ہے۔ لوگ تکنیکی اور سائنسی علم حاصل کر کے صنعت و حرفت و زراعت کو فروغ دے رہے ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ "خوشحالی کے نشان ہیں ہمارے بندھ" جن سے ملک دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جا رہا ہے اور سائنسی علم سے ہماری زندگی روشن ہوتی جا رہی ہے۔ ●

بقیہ: اسلوب اور صحافت

رہتے ہیں جب کہ صحافی کا میدانِ عمل ساری دنیا ہے یہ اپنی بات سیدھے سادے انداز میں کم سے کم جگہ میں اور بغیر کسی توڑ مروڑ کے اپنے قاری کے لیے پیش کرتے ہیں اسی لیے اخبار نویس بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والے اسلوب کا سہارا لیتے ہیں۔ صحافی اپنی تحریر میں سادگی، سلاست اور راست بیانی پر زیادہ سے زیادہ زور دیتے ہیں۔

صحافت میں جمالیاتی حس دبی رہتی ہے جب کہ ادب میں جمالیاتی جبلتیں موج زن رہتی ہیں۔ صحافی ذریعۂ اظہار کا زیادہ ماہر ہوتا ہے جب کہ ادیب مخصوص قسم کی ادبی چاشنی سے قاری کو محظوظ کرتا ہے، صحافی نغمگی سے زیادہ صاف گوئی کو اہم سمجھتا ہے جب کہ ادیب ادائے مطلب کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا کو بھی اہمیت دیتا ہے، صحافت میں مقصدیت، حق گوئی، بے باکی، روانی، سہل نگاری اور اقتصادی نویسی کے اجزا جلوہ فگن رہتے ہیں جب کہ ادبی تحریر میں ایمائیت، رمزیت، حسن و جمال اور لطافت و نزاکت وغیرہ کے اجزا نمایاں رہتے ہیں۔ ●

سجاتا وشوا ناتھن

معاشی اختیارات کے لیے عورتوں کی شیرازہ بندی

ہندوستانی ترقیاتی منصوبہ بندی نے چمن کے گوشے گوشے میں بہار آنے کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنایا ہے تاکہ بہار کے لطف و عنایات سے، گل سرسبد سے لے کر خس و خاشاک تک سبھی فیضیاب ہو سکیں۔ گزشتہ سالوں میں یہ بات واضح طور پر محسوس کی گئی ہے کہ عورتیں متعدد سماجی، معاشی، ثقافتی، سیاسی اڑچنوں کے سبب ترقی کے ثمرات سے بہرہ ور ہونے اور ترقی کے عمل میں اپنا قیمتی تعاون دینے میں کافی پیچھے رہ گئی ہیں۔ یہ ایک تشویشناک امر ہے کیوں کہ عورتیں ہماری نصف آبادی پر مشتمل ہیں۔

منصوبہ بندی کے دور اول میں عورتوں کے تعلق سے ایک فلاحی زاویۂ نگاہ اپنایا گیا جو چند پروگراموں میں گرانٹس، معافی، رعایت اور وظیفہ کی شکل میں سامنے آیا۔ لیکن ان مراعات سے شرکت کے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ ۱۹۷۰ء دہے کے نصف آخر میں توجہ محض فلاح و بہبود سے ہٹ کر ترقی پر مرکوز ہو گئی اور سماجی نیز معاشی ترقی کی عمومی رو میں عورتوں کی شمولیت پر اصرار میں اضافہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ متعدد سماجی اور معاشی پروگرام مثلاً لڑکیوں کے لیے غیر رسمی تعلیم، مرکب دیہی ترقیاتی پروگرام بنائے گئے جو یا تو عورتوں کے لیے مکمل طور پر مختص تھے یا ان کے لیے ان میں ایک خاص تناسب رکھا گیا تھا۔ ان پروگراموں کے فوائد کو باقی اور جاری رکھنا ایک چیلنج تھا۔ مطالعوں سے پتا چلا ہے کہ بہتر زندگی، تعلیم، خوراک اور حفظان صحت کے میدان میں عورتوں کو حاصل عملی فوائد زیادہ دیرپا نہیں ہوتے اور اگر انھیں اپنی زندگی سے متعلق فیصلے کرنے کا مناسب اختیار نہیں تفویض کیا گیا تو فائدوں کی بجائے نقصانات کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۰ء کے دہے میں حکمت عملی کا رخ عورتوں کو بااختیار کرنے اور انھیں "گویائی عطا کرنے" کی جانب ہو گیا۔

چناں چہ تفویض اختیارات کے اسی تناظر میں اور موجودہ سماجی نیز معاشی ساخت میں ایک عورت کی بے بسی اور بے اختیاری کے پیش نظر اجتماعی حکمت عملی کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ عورتوں کے چھوٹے چھوٹے غیر رسمی فعال گروپ نہ صرف انھیں چہرہ بخشیں گے بلکہ ان کے لیے انتہائی چھوٹے پیمانے کے قوت بخش خزینے ثابت ہوں گے۔ مزید برآں اجتماعیت' تبادلۂ خیالات، ہنر اور تفاعلی صلاحیتوں کے ذریعہ سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں مفید و معاون ہوں گے جس سے عورتیں رفتہ رفتہ اپنی ضروریات سمجھنے لگیں گی اور جس کے نتیجے میں مزید اساسی منصوبہ بندی اور شرکت کے پروگراموں میں مدد ملے گی۔ اس عمل میں چند سماجی بندشوں سے بھی نجات ملے گی۔ حالیہ برسوں میں کئی گروپس نے معاشی خوشحالی کے لیے ذات، پات اور مذہب کی دیواروں کو توڑ کر آپس میں مل جل کر کام کرنا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے۔

غربت سب سے زیادہ عورتوں کو متاثر کرتی ہے کیوں کہ انھیں کے نازک شانوں پر گھر گرہستی کا بوجھ ہوتا ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ خاندان کے دیگر افراد کو جو بھی دال دلیا میسر ہوتا ہے کھلانے کے بعد ان کے کھانے کے لیے کچھ نہیں بچتا اور نتیجتاً انھیں فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ عورتیں معاشی اور سماجی امتیازات کی شکار ہوتی ہیں اور انھیں قرض کی سہولیات بھی آسانی سے نہیں مہیا ہوتیں۔ ہمارے ملک کی کروڑوں عورتیں غربت کی زندگی گزار رہی ہیں اور ان کی معاشی خوشحالی کے بغیر انھیں سماجی طور پر بااختیار بنانے کی بات کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔ عالمی بینک کے مطالعوں سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ عورتوں کی آمدنی کا اثر پوری فیملی پر پڑتا ہے کیوں کہ اس کا اثر براہ راست بچوں کی صحت اور خوراک پر پڑتا ہے۔ اسی لیے اقتصادی خوشحالی کے لیے عورتوں کی شیرازہ بندی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

۸۳-۱۹۸۲ء میں دیہی علاقوں میں عورتوں اور بچوں کے لیے ترقیاتی پروگرام

THE PROGRAMME FOR DEVELOPMENT OF WOMEN AND CHILDREN IN RURAL AREAS (DWCRA)

کے آغاز نے عورتوں کو چھوٹے چھوٹے گروپ میں منظم کرنے کے ایک نئے دور کی داغ بیل ڈال دی تاکہ مستقل بنیادوں پر ان کی آمدنی

میں اضافہ ہو سکے اور دوسروں کے شانہ بشانہ ان کی رسائی بھی صحت، بچوں کی نگہداشت اور تعلیم بالغان جیسی سہولیات تک ہو سکے۔ اس پروگرام کے تحت دس سے پندرہ عورتوں پر مشتمل گروپ بنائے جاتے ہیں جو اجتماعی طور پر کسی سرگرمی میں حصہ لیتے ہیں۔ ہر گروپ کو پندرہ ہزار روپیوں (جسے اب بڑھا کر ۲۵ ہزار کر دیا گیا ہے) کا ایک فنڈ ملتا ہے تاکہ ان کی انتظامی ضروریات بھی پوری ہو سکیں۔ اس ضمن میں پروگراموں کے معقول نفاذ کی نگرانی کے لیے ایک اضافی گرام سیوکا اور اسسٹنٹ پروجیکٹ آفیسر کی حیثیت سے کسی لیڈی آفیسر کی تقرری کی مانگ بھی کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ پروگرام کو تقویت دینے اور عوامی بیداری کے پیش نظر کمیونٹی بیسڈ کنورجنٹ سروسز (CBCS) اور انفارمیشن، ایجوکیشن اینڈ کمیونیکیشن (IEC) جیسے پروگرام بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ ۱۹۹۶ء کی شروعات تک ۲/۲ ملین عورتوں پر مشتمل ۱/۳ لاکھ سے زیادہ گروپ بن چکے تھے۔ فی الوقت ملک کے کم و بیش تمام اضلاع (ان معدودے چند کو چھوڑ کر جنھیں شہری سہولیات حاصل ہیں) اس پروگرام سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

عورتوں کی اقتصادی خود کفالت اور اپنی مدد آپ کے مدنظر حکومت نے عورتوں کے قرض، بچت اور کفایت شعاری گروپ بھی بنائے ہیں۔ غریب اور حاجت مند عورتوں اور عورتوں کے گروپوں کو چھوٹے کاروبار کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعہ قرض دینے کے لیے ۱۹۹۳ء میں ایک راشٹریہ مہیلا کوش (RMK) قائم کیا گیا۔ فی الوقت (جولائی ۱۹۹۶ء تک) اس اسکیم کا نفاذ ۴۰۰ غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعہ پندرہ ریاستوں، آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش، گجرات، کرناٹک، کیرالا، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، منی پور، اڑیسہ، راجستھان، تامل ناڈو، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں ہو چکا ہے۔

۱۹۹۵ء سے نافذ العمل اندرا مہیلا یوجنا (IMY) کا مقصد مقامی، بلاک اور ضلعی سطح پر صحت، تعلیم، پانی، صفائی ستھرائی، مکان وغیرہ سے متعلق عورتوں کے سود مند پروگراموں میں باہمی تال میل قائم کرنا نیز اجتماعی سرگرمیوں کے ذریعہ عورتوں کی بیداری اور آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے گاؤں کی سطح پر اندرا مہیلا کیندر اور بلاک کی سطح پر اندرا مہیلا بلاک کیندر قائم کیے گئے ہیں۔ اس پروگرام کی سرپرستی مرکز کرے گا۔ غیر سرکاری تنظیموں کو بھی اس میں شریک کیا جائے گا۔ پروگرام کو سات سالوں کے عرصے کے لیے منظوری مل گئی ہے جو ۹۶-۱۹۹۵ء سے شروع ہوگا۔ آغاز میں اس پروگرام کا نفاذ دو سو بلاکوں میں ہونا تھا اور بعد میں ہر سال ایک ہزار بلاکوں کا اضافہ ہونا تھا۔ مرکزی حکومت ہر اندرا مہیلا کیندر کو ایک بار ۵۰۰۰ روپیوں کی گرانٹ دے گی۔ بلاک کی سطح پر مزید فنڈ دیے جائیں گے جن کا استعمال ان افراد کو اعزازیہ طور پر دئے جانے میں ہوگا جنھوں نے بیداری مہم، گروپوں کو متحرک کرنے، گروپ کے ارکان اور کارکنان کی تربیت اور مارکیٹنگ نکاسوں کے ذریعے گروپوں کی بقا میں تعاون دینے میں اہم رول ادا کیے ہوں گے۔

بیداری فراواں

عورتوں کی اجتماعیت نے ان کی بیداری میں اضافہ کیا ہے جس کے سبب بچولیوں کے استحصال کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بہت سے کاروبار مثلاً بُنائی، کھانے کی چیزوں کے پروسیسنگ وغیرہ میں عورتوں کو روالونگ فنڈز اور سہل قرضوں کے ذریعہ مالی تعاون دینے کے نتیجے میں عورتیں براہ راست خام مال کی خرید اور مارکیٹنگ کے ذریعہ بچولیوں کے اس استحصال سے نجات پالیں گی جو روزانہ کی مزدوری کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوا ہے۔

DWCRA گروپوں پر احمد آباد کی سیلف امپلائڈ ویمنز ایسوسی ایشن (SEWA) کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ دست کاری اور گوند جمع کرنے کے کاروبار سے منسلک عورتوں کے گروپوں نے عورتوں کی اقتصادی صورت حال کو مستحکم بنانے، بازار میں اپنی اشیا کی قیمتیں مقرر کرانے، خود کفالت اور ان تمام عناصر کے سبب اپنی سماجی حیثیت میں اضافہ کرنے میں اہم و نمایاں رول ادا کیا ہے۔ عورتوں کو اب احترام کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے اور مرد درون خانہ زیادہ تعاون دینے لگے ہیں یہاں تک کہ وہ ایندھن اور چارے کے جمع کرنے میں بھی عورتوں کا ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عورتوں میں زیادہ خود اعتمادی آئی ہے۔ ایسے میں کہ جب خاندانی نظام درہم برہم ہونے کو ہے، اپنی مدد آپ کرنے والے ان گروپوں نے سماجی تحفظ کو ایک نئی دِشا دی ہے۔ زمینی سطح کے دوسرے تجربات اور مطالعوں سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی محدود اُڑان کے باوجود ان گروپوں کی حکمت عملی نے عورتوں کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ براہ راست عوامی رابطہ قائم کر سکیں نیز بینک وغیرہ کی سہولیات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

حکومت نے غیر رسمی گروپوں کی تشکیل کی انتہائی پُرخلوص کوششیں کی ہیں لیکن اس کے لیے ایک طویل عرصہ اور ساتھ ہی ساتھ مقامی علاقے کی زبردست سماجی بیداری کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں انتہائی کامیاب گروپ والے علاقے وہی ہوتے ہیں جہاں محنتی اور باہمت گرام سیوکائیں اور پروجیکٹ آفیسرز ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے محنتی اور بیش قیمت افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی لیے حکومت کی جانب سے کی جا رہی کوششوں میں مقامی اور غیر سرکاری تنظیموں کو زیادہ سے زیادہ تعاون دینا چاہیے۔ جہاں

جہاں غیر سرکاری تنظیموں نے علاقے کے لوگوں اور ان کے مسائل میں دلچسپی دکھائی ہے وہاں کے گروپوں کی سرگرمیاں کامیابی سے ہم کنار ہوئی ہیں۔

مذکورہ بالا گفتگو سے ایک نیا مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ پرخلوص غیر سرکاری اور رضاکار تنظیموں کی کمی کی وجہ سے اب زیادہ سے زیادہ پرخلوص لوگوں کو سامنے آنا چاہیے۔

نقطۂ آغاز

عورتوں کے گروپوں کی تشکیل کا عمل مندرجہ ذیل طور پر روبہ عمل ہوگا:

سب سے پہلے مقامی سطح پر ایک "ہنر ایکسچینج" قائم کرنا چاہیے جس میں مختلف ہنر مثلاً دست کاری، ٹیلرنگ، کھلونا سازی وغیرہ رکھنے والی عورتوں کے نام ملازمت کے لیے درج ہوں گے۔ چوں کہ رجسٹریشن ایک خود اختیاری فعل ہے اس لیے کام کی تحریک از خود ہوگی۔ کئی باہنر خواتین مزدور کا تعلق غریبوں کے طبقہ سے ہوگا، خواہ وہ خط غربت سے نیچے نہ بھی واقع ہوں اور یہ امر واقع بھی ہے جیسا کہ ماہرین صنفیات کا کہنا ہے کہ جب ہم خط غربت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد پورے خاندان کا خط غربت سے نیچے یا اوپر واقع ہونا ہوتا ہے۔ یہ بات مجموعی طور اور منطقی بنیادوں پر صادق آتی ہے لیکن درون خانہ آمدنی کی تقسیم اور خوشہ چینی کے معاملہ میں یہ بات پوری نہیں اترتی کیوں کہ عموماً عورت تک شوہر کی پوری آمدنی تو نہیں پہنچتی لیکن اس کے باوجود اسے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد کے کھانے پینے کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ چناں چہ اس صورت حال میں ہوسکتا ہے کہ خاندان مجموعی طور پر خط غربت سے اوپر ہو لیکن اس کے بہت سے افراد خط غربت سے نیچے زندگی کم ہو رہے ہیں۔ محض خط غربت سے نیچے واقع خاندانوں کی غیر ہنر مند عورتوں کا انتخاب ہی ہماری جدوجہد کی کامیابی کا ضامن نہیں ہے بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسے میں کئی بار کوششیں ضائع ہوئی ہیں۔

"ہنر ایکسچینج" سے مقامی غیر سرکاری تنظیموں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ایک قسم کے ہنر والی عورتوں کے گروپ بنا سکیں گے۔ ایسے گروپ کی کارکردگی بہتر اور نسبتاً جلد ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے ان میں سے بے حد کامیاب گروپ مقامی رضاکار تنظیموں کا روپ دھار لیں اور اپنے قرب وجوار میں گروپ سازی کے کام میں لگ جائیں۔

اس پورے عمل میں حکومت کو ایک نگراں اور سرپرست کا رول ادا کرنا ہوگا۔ یہ ایک ایسا رول ہے جو اس کے علاوہ کوئی اور ادا نہیں کرسکتا۔ اس جہت میں حکومت کو سب سے پہلے مقامی سطح پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے پھر صحت، تعلیم وغیرہ محکموں سے منتخب افراد پر مشتمل ضلعی سطح کی ٹیمیں بنائی جاسکتی ہیں۔ واضح ہو کہ یہ افراد اعلا منصوبہ بندی کرنے والے نہ ہوں بلکہ وسطی اور نچلی سطح پر کام کرنے والے ہوں۔ یہ ٹیمیں متعدد بلاکوں میں مقامی تنظیموں یا گروپ لیڈروں کی مدد سے مسائل کے حل کرنے میں ممد و معاون ہوں گی۔ اندرا مہیلا یوجنا اسی جانب ایک مثبت قدم ہے۔

مذکورہ "اسسٹم کو موجودہ سسٹم کے ساتھ آزمایا جاسکتا ہے جو ساری ذمہ داریاں مثلاً گروپ بنانے کے امکانات کی تلاش اور پھر عورتوں کی اس جانب ترغیب، ان کے لیے کسی کام کا انتخاب، چند معاملوں میں تربیت کا نظم وغیرہ سرکاری گرام سیویکا پر ڈال دیتا ہے چاہے گروپ کو خاطر خواہ کامیابی ملے یا نہ ملے۔

اگر اقتصادی قوت حاصل ہو جائے تو عورتوں کے مجموعی اختیارات پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے۔ درون خاندان رشتے اور خانگی کاموں کی تقسیم کے انداز بدلیں گے جس کے نتیجے میں عورتوں کو سماجی برتری کے حصول کے ساتھ ساتھ خانگی معاملات میں ان کا دخل بھی بڑھے گا۔ قیادت اور اجتماعی کلچر میں فعال شرکت ان کی سیاسی زیرکی میں اضافہ کی باعث ہوگی اور بالآخر وہ سیاسی طور پر طاقتور اور بااختیار ہوں گی اور اسی سیاسی طاقت کے سبب عورتوں کے لیے مزید منصوبوں کی راہیں ہموار ہوں گی اور ان کی مجموعی طاقت کو استحکام حاصل ہوگا ●

بقیہ: چائے پیجیے

۱۸۔ کار، جہاز، بس اور سمندری سفر پر چائے کے سبب دل متلاتا نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسکیلنز کینسر کے مریض کے علاج کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر چائے روز پی جائے تو کینسر سے بچا جاسکتا ہے۔ اس امر کی جانب دانشوروں کو خصوصی دھیان دینا چاہیے اور ڈاکٹر اسکیلنز کے ساتھ تعاون کر کے تحقیق کرنی چاہیے تاکہ جلد از جلد کینسر جیسی مہلک مرض کا علاج کم خرچ پر ممکن ہو سکے۔

کسی بھی چیز کا حد سے تجاوز کرنا اچھا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا استعمال احتیاط سے اور جسم کی ضرورت کے مطابق ہی کرنا چاہیے۔

ابتدا میں تو اس کی خمیری روٹیاں بناکر تی تھیں اور لوگ اسے غذا کی شکل میں پابندی سے نوش کیا کرتے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے مہمانوں کی تواضع بھی اس سے کیا کرتے تھے، رشتہ داروں کے یہاں تحفہ کے طور پر ان روٹیوں کا لین دین رائج تھا مگر اس وقت یہ صرف مشروب کی شکل میں ہی رائج ہے۔ ایسی حالت میں یہ نہایت ضروری ہے کہ اسے ایسے برتن میں رکھ کر استعمال کیا جائے جو ضرر نہ پہنچائیں۔ اسے کانچ یا مٹی کے برتن میں رکھ کر نوش فرمانا چاہیے۔ عام طور پر لوگ دھات کے بنے برتن جیسے اسٹیل کپ وغیرہ میں رکھ کر اس کا استعمال کرتے ہیں جو مناسب نہیں ہے۔ چائے کے اجزا دھات سے کیمیائی عمل کر کے منفی اثرات پیدا کرسکتے ہیں لہٰذا چینی، مٹی یا شیشے کے فنجان میں رکھ کر چائے کا استعمال کرنا چاہیے۔

●

پروفیسر نسیم احمد زیدی

عمدہ تعلیمی استعداد کے عوامل

(ایک مطالعہ)

آزادی کے بعد سے نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی ملک اپنی قومی یا علاقائی زبانوں کے ذریعہ عمدہ تعلیمی استعداد (EXCELLENCE) پیدا کرنے کے لیے کوئی موزوں نظام قائم نہیں کرسکا اور آج بھی اس کا ذریعہ انگریزی زبان ہی ہے۔ ایسے طلبار جو پیشہ ورانہ اعلا قسم کے کورسیز جیسے ڈاکٹری اور انجینئرنگ وغیرہ میں داخلہ حاصل کر پاتے ہیں ان کی اکثریت یا تو کانونیٹ اسکول سے فارغ ہوتی ہے یا پھر اونچے معیار کے انگریزی ذریعہ تعلیم والے اسکولوں سے۔ عمدہ تعلیم کے لیے ایک مخصوص اسکول اور خاندانی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلیمی لیاقت وہیں سے آتی ہے جہاں یہ ماحول دستیاب ہوتا ہے۔ اس ماحول کے لیے حسب ذیل عناصر ضروری ہیں:

(الف) کانونٹ اسکول جن کو عیسائی مشنریز (Missionaries) چلاتی ہیں یا عمدہ قسم کے اسکول جن میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہوتا ہے۔

(ب) ملازم طبقہ جس کی معیاری آمدنی فی خاندان ماہانہ ۵ ہزار روپیہ سے ۱ہزار روپیہ ہو۔

(ج) والدین کی مناسب تعلیم۔

(د) علاحدہ خاندان (Single family) جن میں بچوں کی تعداد دو یا تین سے زائد نہ ہو۔

یہ نتائج ایک ریسرچ پروجیکٹ سے اخذ کیے گئے۔ اس پروجیکٹ میں علی گڑھ شہر کے ۸۔اسکول چُنے گئے جن میں مسلم طلبار کی تعداد ایک تہائی یا اس سے زیادہ تھی۔ ۱۹۹۵ء میں ہائی اسکول کے نتیجہ کو بنیاد بنا کر ہر اسکول سے ان طلبار کی فہرست حاصل کی گئی جنھوں نے اول سے لے کر ۳۰-۲۵ مقام (Positions) حاصل کیں۔ اس طرح ۱۵۰۷ کل طلبار جو ہائی اسکول کے امتحان میں شریک ہوئے ان میں سے ۲۱۶ طلبار جو اچھی لیاقت والے سمجھے گئے ان سے اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے سینئر سیکنڈری اسکول کے (۱۰۱) ۵۴ طلبار کی فہرست تیار کی گئی جنھوں نے سائنس کے مضامین لے کر اونچے مقام حاصل کیے اور وہ طلبار جو آرٹس (Arts) کے مضمون سے کر ۵۴ مقام حاصل کر پائے۔ اس کے علاوہ ایک پبلک اسکول کے CXII کے ۲۵ طلبا کی فہرست تیار کی گئی جو اعلا مقام حاصل کر پائے۔ SSSC (CXII) میں ان اداروں سے امتحان میں شرکت کرنے والوں کی کل تعداد ۲۳۵۲ تھی۔ (CX)SSC کی سطح پر سوال نامہ میں ۴۰ سوالات تھے جب کہ CXII کے سوال نامہ میں ۵۳ سوالات تھے جن سے ان کے اسکول اور خاندان کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی۔

سبھی طلبار کو جن میں مسلم اور غیر مسلم شامل تھے تین نکاتی پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔

(الف) بہت عمدہ (Excellent) اس گروپ میں ان طلبار کو شامل کیا جنھوں نے ۱۹۹۵ء کے C XII یا C X امتحان میں ۷۵ فی صد یا زائد نمبر حاصل کیے۔

(ب) اوسط (Average) وہ طلبار جو اس امتحان میں ۶۰ فی صد سے زیادہ اور ۷۵ فی صد سے کم نمبر حاصل کر پائے۔

(ج) کمزور (Poor) اس درجہ میں ان طلبار کو رکھا گیا جو ۶۰ فی صد سے کم نمبر حاصل کر پائے۔

(الف)۔ اسکول کی قسم اور ماحول

سرکاری امداد یافتہ اسکول جو قومی یا علاقائی زبانوں میں تعلیم دے رہے ہیں وہ محض خواندگی کی شرح بڑھانے میں کامیاب ہو پائے ہیں لیکن تعلیم کے میدان میں "بہت عمدہ" (Excellence) کے معیار کو حاصل کرنے میں انھیں شدید ناکامی ہی حاصل ہوئی ہے۔ جواب بھی کانونٹ کے ذریعہ چلائے جانے والے یا اچھے انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں سے حاصل ہو رہا ہے۔ کانونٹ یا مانٹیسری قسم کا نظام تعلیم طلبار کے اندر بچپن سے ہی سخت محنت، وقت کی پابندی اور ڈسپلن کی عادت پیدا کرتا ہے

شعبہ معاشیات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اور بچے اپنے اندر اتنا اعتماد پیدا کر لیتے ہیں جو ایک ممتاز اسکول میں پڑھنے اور بہتر اسکول یونیفارم اور رسل و رسائل کی سہولتوں وغیرہ سے لیس ہونے کا ایک لازمی نفسیاتی نتیجہ ہے۔ خود اعتمادی، سخت محنت اور اچھی اسکولی تربیت تعلیم کے میدان میں امتیاز حاصل کرنے کے لیے جزو لازم ہیں اور اچھے انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکول کے طلبا کے اندر ان اوصاف کے پیدا کرنے کے بہترین ذرائع ہیں۔ ایک اسکول کی عمدگی کو اس کے انتظامی ماحول، پرنسپل کی رہبرانہ خصلت اساتذہ کے اخلاقی معیار وغیرہ سے تولا جا سکتا ہے۔ یہ عناصر اسکول کی عمدہ کارکردگی کے ضامن ہوتے ہیں۔ زیادہ تر کانونٹ اسکول انہی شرائط پر کھرے اترتے ہیں اور نتیجتاً وہ عمدگی کے معیار کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

ایک خیال جو وقتاً فوقتاً سامنے آتا رہا ہے کہ بچوں کو ان کو مادری زبان میں ہی تعلیم دی جانی چاہیے، اس مطالعہ کے ذریعہ غلط ثابت ہوا۔ اصولی طور پر ممکن ہے یہ درست ہو لیکن مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کا معقول نظام قائم کرنا اس کا ناگزیر حصہ ہے۔ تعلیم کی اونچی سطحوں پر اکثر معیاری کتابیں مغربی ممالک میں لکھی جاتی ہیں اور قومی اور علاقائی زبانوں میں ان کے تراجم موضوع کی صحیح روح کو اپنے اندر نہیں سمیٹ پاتے۔ کتابوں کے علاوہ معیاری ذرائع ابلاغ مثلاً اخبارات، رسائل وغیرہ صرف انگریزی زبان میں ہی فراہم ہیں۔ اس تناظر میں قومی یا علاقائی زبانوں میں تعلیمی امتیازات حاصل کرنا نہایت مشکل امر ہے۔ اس کے علاوہ پیشہ ورانہ کورسیز مثلاً معالجات (Medicine) انجینئرنگ اور نظم تجارت (Business Administration) وغیرہ میں اعلا تعلیم عموماً انگریزی ذریعہ سے فراہم کی جاتی ہے اور انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں تعلیم یافتہ طلبار کو اپنی تعلیم کے کسی نہ کسی مرحلے میں اپنی مخصوص زبان سے انگریزی زبان کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایسے طلبار کی اکثریت اس نئی صورت حال سے دوچار ہونے میں خود کو ناکام محسوس کرتی ہے۔

یہ نتیجہ کہ عمدہ تعلیمی استعداد مخصوص انگریزی کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے متذکرہ مطالعے سے ایک بڑی حد تک ثابت ہوتا ہے۔ ۱۹۹۵ء کے سیکنڈری اسکول کے امتحانات میں شامل ۸۔ اسکولوں کے ۵۰۷ طلبار میں سے جن لوگوں کا ذریعہ تعلیم انگریزی۔ اردو اور ہندی تھا ان کی تعداد بالترتیب ۱۰۰۷، ۳۰۷ اور ۱۹۳ تھی۔ عمدگی کی شرح یعنی ایسے طلبار کی تعداد جن کو بہت عمدہ (Excellent) کے خانے میں رکھا گیا تھا کسی مخصوص ذریعہ کا انتخاب کرنے والے طلبار کی کل تعداد کے فی صد کے طور پر انگریزی ذریعہ انتخاب کا فی صد ۶ ر۸ تھا جب کہ بقیہ دونوں زبانوں کا فی صد محض ۶ر۲ تھا۔ یعنی اردو ہندی ذریعہ تعلیم کے گروپ میں سو طلبار میں سے صرف ۶ر۲ طلبار نے عمدگی کے درجہ کو حاصل کیا جب کہ انگریزی ذریعہ تعلیم سے سو میں سے ۶ ر ۸ طلبا اس اعزاز کو حاصل کر پائے۔

(ب)۔ خاندانوں کا ماحول

اسکول کے ماحول کے مقابلے میں گھر کا ماحول تعلیمی امتیاز پیدا کرنے میں کہیں زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں حسب ذیل عناصر غور طلب ہیں۔

۱۔ پیشہ ورانہ اور تعلیمی پس منظر

بالائی متوسط آمدنی (upper middle income) والے ملازم طبقہ سے متعلق خاندان تعلیمی لیاقت پیدا کرنے میں زیادہ موافق ماحول فراہم کرتے ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں SSC کا امتحان پاس کر کے اپنی پہلی ہی کوشش میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس یا انجینئرنگ میں داخلہ پانے والے ۳۳ طلبار میں سے ۲۷ طلبار ملازمت پیشہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی دو وجوہات ممکن ہیں:

(الف) اچھی ملازمت کے لیے اعلا تعلیم کی ضرورت ہے۔ اکثر وہ والدین جنھوں نے پیشہ ورانہ کورس میں ڈگری حاصل کی ہے۔ اچھی نوکری پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ خاندان میں تعلیمی فضا پیدا کرنے کے لیے والد کے پاس اعلا تعلیم کی ڈگری یا پیشہ ورانہ تعلیم کی ڈگری ہونی چاہیے اور ماں کے پاس تربیت یافتہ ٹیچر کی ڈگری ہو تاکہ وہ اعلا تعلیمی سطحوں پر بچے کو تعلیمی امتیاز حاصل کرانے میں ایک مثالی ماں کی طرح تربیت دے سکے۔ یہ خیالات اس سروے کے نتائج سے پوری طرح ثابت ہیں۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور انجینئرنگ کورسیز میں داخلے کے لیے منتخب ہونے والے ۳۳ طلبار میں سے ۳۰ کے والد اعلا تعلیم یافتہ یا کسی پیشہ ورانہ ڈگری کے حامل تھے جب کہ تقریباً نصف معاملوں میں ان کی مائیں گھریلو خواتین ہونے کے باوجود تربیت یافتہ ٹیچر کی ڈگری سے لیس تھیں۔ سیکنڈری اسکول کی سطح پر بہت عمدہ کے خانے میں رکھے گئے طلبار میں سے ۷۱ فی صد کے والد پی۔ ایچ ڈی یا پیشہ ورانہ ڈگریوں کے حامل تھے اور تربیت یافتہ ٹیچر اور گریجویشن تک تعلیم یافتہ ماؤں کا فی صد بالترتیب ۴۳ اور ۲۷ تھا۔

(ب) خود روزگار اور تجارتی طبقوں سے عمدہ لیاقت پیدا نہ ہو سکی کیوں کہ طلبار کو یہ معلوم ہے کہ مستقبل میں ان کو خاندانی تجارت میں ہی لگنا ہے۔ جب کہ نوکری پیشہ طبقہ کے لیے اس قسم کا مستقبل سامنے نہیں ہوتا۔ طالب علم کو خود اپنا مستقبل بنانا ہوتا ہے۔ جو جی جان توڑ کر محنت کرتا ہے وہ اچھا مستقبل بنانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

۲۔ آمدنی کا ڈھانچہ

اچھی قسم کی تعلیم مشکل ہے جب تک کہ خاندان کی آمدنی مناسب طور پر زیادہ نہ ہو۔ بہت عمدہ (Excellent) کے درجہ سے تعلق رکھنے والے طلبا کا ۸۳ فی صد ایسے گھروں سے متعلق تھا جن کی ماہانہ آمدنی ۵ ہزار روپیہ سے زیادہ تھی۔ طلبا کا سب سے بڑا حصہ (۵۰٫۷ فی صد) ان کے خاندانوں سے متعلق تھا جن کی ماہانہ آمدنی ۵ ہزار روپیہ سے ۱۰ ہزار روپیہ تھی۔ جب کہ کمزور (Poor) طلبا کے خانے میں (جنھوں نے آخری امتحانوں میں ۶۰ فی صد سے کم نمبر حاصل کیے) طلبا کا تقریباً وہی فی صد ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتا تھا جن کی آمدنی ۵ ہزار روپیہ ماہانہ سے کم تھی۔

۳۔ خاندان کی ساخت

خاندان کی فی کس آمدنی، کل آمدنی کے مقابلے میں خوش حال گھرانے کی بہتر نشاندہی کرتی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاندان کی ساخت (یعنی بڑا یا چھوٹا خاندان) تعلیمی استعداد کی عمدگی کے تعین میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ موجودہ مطالعے میں عمدہ تعلیمی استعداد پیدا کرنے والے مثالی گھرانوں کی ساخت وہ ہے جو ۵-۴ افراد پر مشتمل ہو۔ جیسا کہ اس درجہ کے ۶۶ فی صد گھرانوں کی ساخت سے ثابت ہے۔ عمدہ سے متوسط (Average) اور کمزور (Poor) درجوں کی طرف بڑھیں تب عموماً خاندان کی ساخت بڑی ہوتی جائے گی۔ بڑے خاندانوں کے معاملے میں (۵ افراد سے زیادہ پر مشتمل خاندان) خاندانوں کا فی صد بہت عمدہ کے خانے میں ۲۴ سے بڑھ کر کمزور کے خانے میں ۵۸ تک نظر آتا ہے۔

۴۔ ذرائع ابلاغ

مذکورہ سروے کے مطابق یہ المیہ سامنے آیا کہ قومی یا مقامی زبانوں پر مبنی پریس معیاری معلوماتی ادب فراہم کرنے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ جب کہ انگریزی پریس سے اخبارات و رسائل کے ذریعہ عمدہ تعلیمی استعداد کے لیے ضروری معیاری مواد دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ بہت عمدہ (Excellent) کے خانے میں رکھے گئے طلبا کے ۸۰ فی صد گھرانے یا تو صرف انگریزی اخبارات پر انحصار کرتے ہیں اور صرف ۲۰ فی صد گھرانوں میں ہندی یا اردو کے اخبار آتے ہیں۔ انگریزی رسائل جو سائنس یا دوسرے معلوماتی قسم کے مواد فراہم کرتے ہیں لگ بھگ ۹۲٫۵ فی صد خاندانوں میں منگائے جاتے ہیں اور یہ رسائل و جرائد ہندی یا اردو زبان کے رسائل سے کہیں زیادہ معروف پائے گئے ہیں۔ کمزور طبقہ (Poor) کے طلبا میں سے تقریباً نصف کے گھروں میں ہندی یا اردو کے اخبارات و رسائل ہی منگائے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اس طرح تعلیمی لیاقت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر میں انگریزی کے اخبار اور رسائل وغیرہ منگائے جائیں۔ ان سے طلبا کا تعلیمی معیار اونچا ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن کی اہمیت

متفرق خاندانوں میں رائج تفریح کے ذرائع عمدہ تعلیمی استعداد پر منفی اثرات نہیں ڈالتے۔ جن طلبا کا اس نمونے میں پہلی کوشش میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس یا انجینئرنگ میں داخلہ ہوا ان میں سے اکثر کے گھروں پر رنگین ٹی۔ وی۔ وی۔ سی۔ آر اور کیبل کنکشن تھے۔ سیکنڈری اسکول کے درجہ میں "عمدہ" کے خانے سے متعلق سو خاندانوں میں ۶۶ گھروں میں رنگین ٹیلی ویژن تھے، ۲۸ کے پاس سادے ٹیلی ویژن سیٹ تھے۔ ۳۶ گھروں میں وی۔ سی۔ آر۔ اور ۱۵ خاندانوں میں کیبل کنکشن تھے۔ تفریح کے ان تمام وسائل کے باوجود ان گھرانوں میں تعلیمی عمدگی کی شرح کافی اونچی تھی۔

۵۔ دوسرے عوامل

اسکول اور گھر کے ماحول سے قطع نظر والدین کے ذریعہ تعلیمی سرگرمیوں کا صحیح انتظام و منصوبہ بندی اور خود طلبا کے ذاتی اوصاف مثلاً اعلا پیمانے کی مقابلہ جاتی لگن، کچھ بھی حاصل کرنے کا جنون اور سخت محنت اور مستعدی کی عادت تعلیمی میدان میں عمدگی کے درجہ کو حاصل کرنے میں خاص طور پر معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے سوال نامہ میں ایک سوال ان طلبا سے پوچھا گیا جنھوں نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس اور انجینئرنگ ڈگری کورسز کے لیے داخلے کے امتحان میں پہلی کوشش میں ہی کامیابی حاصل کی تھی۔ ۴۲ فی صد طلبا کا جواب تھا کہ ایسا محض ان کی سخت محنت کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ والدین کی منصوبہ بندی یا اپنے بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں کی نگہداشت ان کی کامیابی میں دوسرے اہم عوامل تھے۔

ملک میں ملازمت یا روزگار کی پیچیدہ صورت حال طلبا کی اکثریت کو "عمدگی" کا درجہ حاصل کرنے سے نہ روک سکی۔ سینئر سیکنڈری اسکول کی سطح پر ۵۳ فی صد طلبا نے بتایا کہ روزگار بازار میں روزگار کی پیچیدہ صورت حال کی وجہ سے ان کی تعلیمی سرگرمیاں کم نہیں ہوئیں جب کہ ۳۷ فی صد طلبا روزگار کی صورت حال سے متفکر تھے۔ باقی طلبا نے اس موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا۔

اس مطالعے کے آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم آٹھویں درجے تک کانونٹ کے ذریعہ چلائے جا رہے یا اچھے پبلک اسکول میں تعلیم اور ایک عمدہ گھریلو ماحول جس میں والدین پڑھے لکھے اور کم از کم متوسط درجے کے سروس میں ہوں جس میں ماہانہ آمدنی ۵ ہزار سے ۱۰ ہزار روپیہ تک ہو۔ علاحدہ خاندان ہو جس میں بچوں کی تعداد ۳-۲ سے زائد نہ ہو وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو تعلیمی لیاقت۔ استعداد و صلاحیت پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

خورشید عالم

سبسڈی اور حکومت

گزشتہ دنوں حکومت ہند نے سبسڈی جیسے اہم اور نازک موضوع پر ملک بھر میں بحث شروع کرنے کی غرض سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ ۲۰ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ نئی دہلی میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فائننس اینڈ پالیسی کے ذریعہ کرائے گئے ایک ریسرچ سروے پر مبنی ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے "گورنمنٹ سبسڈی ان انڈیا" کے نام سے ریسرچ پر مبنی رپورٹ ۱۹۹۷ء میں وزارت خزانہ کے حوالے کی ہے۔ تقریباً ۱۵۰ صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ سبسڈی کیا ہے؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں اور ہندوستان میں اس کی موجودہ شکل کیا ہے وغیرہ۔ اس کے علاوہ واضح طور پر دکھائی دینے کے علاوہ چھپی ہوئی سبسڈی کا حساب کتاب بھی اس رپورٹ میں پیش کیا گیا ہے ہی نہیں بلکہ دنیا کے بڑے ممالک میں دی جانے والی سبسڈی کے اعداد وشمار کا بھی ذکر ہے۔ رپورٹ میں ریسرچ اسکالرز نے ۱۹۹۱ء میں منڈے اور راؤ، مسٹر تیواری کی قیادت میں ۱۹۹۶ء میں سبسڈی پر غور و فکر کے لیے بنی کمیٹی کی سفارشات پر بھی نظر ثانی کی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ نے ہندوستان میں دی جانے والی کل سبسڈی کو موٹے طور پر تین گروپ میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے گروپ میں حکومت کے ذریعہ سماجی، اقتصادی، سکریٹریٹ خرچ، ناگہانی آفات کے دوران دی جانے والی سرکاری امداد شامل ہے۔ واضح رہے کہ انسٹی ٹیوٹ نے اس گروپ میں اخراجات کے طور پر دی جانے والی رقم کو سبسڈی کی فہرست میں درج نہیں کیا ہے۔ اس کے مطابق اس گروپ کو پبلک گڈس/خدمات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرا گروپ میرٹ گڈس/خدمات اور تیسرا گروپ نان میرٹ گڈس/خدمات کا ہے۔

میرٹ گڈس/خدمات میں ان سبھی قسم کی سرکاری امداد کو شامل کیا گیا ہے جس کا پورے سماج سے قریبی تعلق ہے جیسے ابتدائی تعلیم، حفظان صحت، فضلہ وصفائی، ذرائع ابلاغ، پچھڑے طبقوں اور ذاتوں کی ترقی، سماجی بہبود اور خوراک جیسی اشیاء کے علاوہ زمین اور پانی کا تحفظ، ماحولیات، جنگلات، زرعی تحقیق اور تعلیم، باڑھ کنٹرول اور پانی کی نکاسی، سڑک، پل اور جدید ترین سائنسی تحقیقات پر دی جانے والی سرکاری امداد کو اس گروپ میں رکھا گیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ نے اس گروپ کو پبلک گڈس/خدمات کے قریب ہی رکھنا پسند کیا، اس کی ریسرچ کے مطابق اس گروپ کی خدمات پر سبسڈی دی جا سکتی ہے لیکن اس میں بھی کچھ خدمات کو سبسڈی سے مستثنیٰ کرنا پڑ سکتا ہے ان کے مطابق اس گروپ کو دی جانے والی سبسڈی پر کھل کر بحث ہونی چاہیے۔

اس کے علاوہ مذکورہ دونوں گروپ کی تمام خدمات کو انسٹی ٹیوٹ نے نان میرٹ گڈس/خدمات کی فہرست میں رکھا ہے۔ اس گروپ میں اعلا تعلیم، کھیل، آرٹ، سنسکرت، علاج و خاندانی بہبود، پانی کی فراہمی، شہری ترقی، مکان، کھیتی، سینچائی، بجلی، انڈسٹری، ٹریفک، عوامی سہولیات اور سہکاریتا کو رکھا گیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق اس گروپ کو دی جانے والی سبسڈی کو ختم کر دینا چاہیے کیوں کہ ان کے مطابق اس گروپ کی خدمات ایسی ہیں جن کا فائدہ سماج کو کم اور فرد واحد کو زیادہ ملتا ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فائننس اینڈ پالیسی کے اسی ریسرچ پیپر کی بنیاد پر وزارت خزانہ نے اپنا "مباحثی کتابچہ" تیار کیا ہے۔

واضح رہے کہ سبسڈی کے مسئلہ کو تقریباً سبھی وزراء خزانہ نے اٹھاتے ہوئے بجٹ میں اس مد میں خرچ ہونے والی رقم میں کٹوتی کرنے پر زور دیا ہے۔ اس ضمن میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ تین مدیں ایسی ہیں جن سے حکومت کا گھاٹا بدستور بڑھتا جا رہا ہے۔ (۱) حکومت کے ذریعہ سود کی ادائیگی (۲) وی آئی پی کی حفاظت پر خرچ اور (۳) سبسڈی۔ بین اقوامی زر مبادلہ فنڈ اور عالمی بینک کے ماہرین نے بھی اپنی رپورٹ میں بجٹ گھاٹے کو کم کر کے ایک متعینہ حد تک لانے کی سفارش پر زور دیا ہے اس کے لیے وہ سبسڈی کی رقم کو کافی کم کرنے یا اسے بالکل ہی ختم کر دینے کی ضرورت پر زور

۲۳۳۸/۴، ذاکر نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

دیتے ہیں۔

سال ۱۹۹۶-۹۷ء کے اقتصادی جائزہ کے مطابق مرکزی حکومت کے ذریعہ دی جانے والی سبسڈی کی رقم میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ رقم ۱۸ ارب ۱۵ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۹۰-۹۱ء میں ایک کھرب ۲۱ ارب ۵۸ کروڑ روپے اور ۱۹۹۶-۹۷ء میں ایک کھرب ۴۳ ارب ۲۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود گھریلو پیداوار میں سبسڈی کا تناسب ۱۴ فی صد کے آس پاس ہی رہا۔

سبسڈی کا بنیادی مقصد ہے کہ اپنے خریداروں کے لیے اس کی قیمت کم کی جائے مثلاً حکومت کھادی کپڑوں پر ۲۵ فی صد سبسڈی دیتی ہے تو سو روپے کا کپڑا ۷۵ روپے میں خریدار کو ملتا ہے لیکن کپڑا بنانے والے کو سو روپے ہی ملیں گے کیوں کہ حکومت اپنی طرف سے ۲۵ روپے دے کر اس کے نقصان کی بھرپائی کرے گی۔ اسی طرح سے اسکول، کالجوں، کارخانوں کی کینٹین میں جگہ کا کرایہ اور بجلی پانی کا کرایہ ادارہ خود برداشت کرتا ہے جس سے کینٹین بازار کے مقابلے کم قیمت پر کھانے پینے کی اشیاء اپنے خریداروں کو مہیا کراتا ہے۔ کھادی گرام ادیوگ کے سلسلے میں سبسڈی دینے کا مقصد مخصوص طبقے کی فلاح و بہبود، دست کاروں اور دیگر روایتی نقاشوں کی حوصلہ افزائی کرنا، تعلیم، صحت، رہائش، اناج وغیرہ پر سبسڈی دینے کا مقصد انھیں لاگت سے کم قیمت پر مہیا کرا کر کمزور طبقے کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔ اسی طرح بینک قرضے پر کمزور طبقے سے کم سود کی شرح لینا بھی ہے۔

سبسڈی پر حال میں جاری وہائٹ پیپر کے مطابق حکومت کی کل آمدنی کا ۱۴ فی صد سے کچھ زیادہ سبسڈی کی شکل میں نکل جاتا ہے یہی نہیں بلکہ حکومت اپنے تمام ٹیکس سے آمدنی ۱۰ر۵ فی صد ہی وصول کر پاتی ہے یعنی آمدنی کی شکل میں تو وہ ۱۰ر۵۵ فی صد وصول کرتی ہے لیکن سبسڈی یا اخراجات کی شکل میں وہ ۱۴ فی صد یا اس سے کچھ زائد خرچ کرتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اہم ہے کہ جس طبقے کو سبسڈی دی جا رہی ہے وہ اس سے مستفید بھی ہو رہا ہے یا کوئی اور اس کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مثال کے طور پر کھاد پر ۵ سے ۶ ہزار کروڑ روپے کی سبسڈی دی جاتی ہے یہ سبسڈی صارفین کے نام پر ہی دی جاتی ہے لیکن عام طور پر اس کا فائدہ غلے کے بیوپاریوں، بڑے کسانوں کو ہی ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ بقایا رقم کو نہیں وصولنا بھی ایک قسم کی سبسڈی ہوتی ہے لیکن اس کا فائدہ سرمایہ دار طبقہ کو ہی ملتا ہے۔ اس طرح کی مد میں خرچ کی گئی سبسڈی کی رقم حکومت کے کسی کھاتے میں درج نہیں ہوتی۔

سال ۱۹۹۴-۹۵ء میں این۔ آئی۔ پی۔ ایف۔ پی کے اندازے کے مطابق تعلیم پر مرکزی حکومت نے امداد کے طور پر تقریباً ۲۴۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جو ۴۳۰۴۷ر۸۱ کروڑ روپے کی مرکزی امداد کا ۵ر۶ فی صد حصہ ہے۔ اسی طرح ریاستی حکومتیں بھی تعلیم کی مد میں روپیہ خرچ کرتی ہیں جو کہ تقریباً ایک چوتھائی حصہ ہوتا ہے جب کہ پرائمری، سکنڈری اور یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم پر دی گئی کل امداد کا تقریباً ۵۰ فی صد حصہ ابتدائی تعلیم پر ہی صرف ہوتا ہے۔

اسی طرح پٹرولیم کی مد میں امداد کے طور پر کل ۱۸۴۴۰ کروڑ روپے کی رقم کا اندازہ ہے جو گزشتہ سال دی گئی رقم کے مقابلے تقریباً سو فی صد کا اضافہ ہے۔ مقدار اور ریٹ دونوں کے درمیان میں ایچ ایس ڈی (ڈیزل) کے لیے اقتصادی امداد بھی غیر معمولی ہے۔ یہ سال ۱۹۹۴-۹۵ء میں ۴۳۰۰ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۱۹۹۶-۹۷ء میں ۸۳۴۰ کروڑ روپے ہو گئی۔ ان دو سالوں کے دوران ڈیزل میں ۱۰ر۱۳ روپے سے لے کر ۱۲ر۹۷ روپے فی لیٹر کا اضافہ ہو گیا۔ ڈیزل کی اسی کم قیمت کی وجہ سے ۱۹۹۱-۹۲ء اور ۱۹۹۵-۹۶ء کے درمیان ڈیزل کا استعمال بھی تقریباً ۴۲ فی صد بڑھ گیا ہے۔ ان وجوہات نے ایچ۔ ایس۔ ڈی کے لیے اقتصادی امداد میں اضافے پر مجبور کیا۔ کل پٹرولیم پر اقتصادی امداد میں ڈیزل پر دی گئی سبسڈی کا تناسب ۱۹۹۴-۹۵ء اور ۱۹۹۶-۹۷ء کے درمیان ۵۵ر۶ سے بڑھ کر ۲۲ر۵۴ فی صد ہو گیا۔

مٹی کا تیل ایک ایسی پٹرولیم مصنوع ہے جن پر سب سے زیادہ امداد دی جاتی ہے اس کی آدھی گھریلو ضرورتوں کو درآمد کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے جو کہ سال ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۵۶ فی صد تھی۔ مٹی کے تیل کا بہت بڑا حصہ عوامی تقسیم کے نظام کے تحت کیا جاتا ہے۔ سال ۱۹۹۴-۹۵ء میں مٹی کے تیل پر اقتصادی امداد ۴۰۷۳ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر سال ۱۹۹۶-۹۷ء میں ۶۳۵۰ کروڑ روپے ہو گئی۔ مٹی کے تیل کی عوامی تقسیم کی کھپت شہری علاقوں میں ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہری خاندانوں میں کھانا پکانے کے لیے مٹی کے تیل کا استعمال ۲۳ر۶۲ فی صد تھا اور گاؤں میں ۱ر۳۴ فی صد فی خانہ ان تھا۔

وہائٹ پیپر کے مطابق سبسڈی میں کٹوتی کر کے بجٹ گھاٹے کی شرح میں ۴ فی صد کی کمی کرنا ہے اس کے لیے نان میرٹ گڈس/خدمات والے گروپ پر مرکز و ریاستوں کے ذریعہ دی جا رہی موجودہ سبسڈی در کو ۹۰ فی صد سے گھٹا کر ۵۰ فی صد تک لانا ہے یعنی ۴۰ فی صد کی کٹوتی کرنا ہے۔

اس کے برعکس بعض ماہرین اقتصادیات سبسڈی کو جاری رکھنے کی وکالت کرتے ہوئے اس کے طریقۂ کار کو بدلنے پر زور دیتے ہیں ان کے مطابق کھلے بازار میں سود کی شرح سالانہ ۲۸ فی صد کے آس پاس ہوتی ہے اور سرکاری قرض دینے والے ادارے آئی۔ ڈی۔ بی۔ آئی وغیرہ ۵۰ سے ۶۰ ہزار روپے سالانہ قرض دیتے ہیں جس پر سود کی شرح ۱۶ سے ۱۹ فی صد تک ہوتی ہے اس طرح سبسڈی کی ایک بڑی تعداد محض ایک چھوٹے سے طبقے کو ہی حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کے طریقۂ کار کو بدلنے کی ضرورت

ہے تاکہ غریب طبقہ بھی اس سے استفادہ کرسکے۔

اس طرح کھاد، تعلیم، بجلی، پانی، سڑکیں اور کھانے کی اشیاء وغیرہ ہیں ان میں مجموعی سبسڈی سے تو بلاشبہ امیر طبقہ کو فائدہ ہوتا ہے لیکن اس کی وجہ سے کچھ غریبوں کا بھی بھلا ہو جاتا ہے جیسے تعلیم میں غریب بچے بھی اس سبسڈی سے مستفید ہوتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی سے اگر سبسڈی ہٹالی جائے تو ہم اس میدان میں دیگر ملکوں کے مقابلے پچھڑ جائیں گے۔ کیوں کہ امریکہ، جاپان جیسے ترقی یافتہ ممالک بھی اس میدان میں اپنے یہاں سبسڈی دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ کھاد پر بھی سبسڈی بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اگر اس فیلڈ میں سبسڈی نہیں دی گئی تو غریب بھوکوں مرنے لگیں گے۔

حکومت اگر بجلی، پانی، کھاد پر سبسڈی دیتی ہے تو اناج کی قیمتوں پر کنٹرول بھی رکھتی ہے اگر حکومت سبسڈی ہٹائے گی تو اناج کے داموں میں اضافہ ہوگا۔ کچھ کسان تو یقیناً یہ مانگ کر رہے ہیں کہ حکومت سبسڈی نہ دے لیکن ہمیں بین اقوامی بازار میں اپنا مال بیچنے کی اجازت دے۔ جب کہ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ کھیتی باڑی پر ٹیکس نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سبسڈی ہے۔ اسی سبسڈی کے ذریعہ ہی اناج کے داموں پر کنٹرول رکھا جا سکتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک سبسڈی کی ایک اپنی سماجی حیثیت ہے اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ترقی یافتہ ملکوں نے ترقی پسند ریاستوں کا قیام کیا وقت کے ساتھ ساتھ ان ریاستوں کے اپنے اخراجات بڑھتے گئے۔ سویڈن، فرانس، امریکہ، کناڈا، انگلینڈ اور آسٹریلیا و دیگر ممالک اس فہرست میں آتے ہیں جہاں بوڑھوں کو پنشن، تعلیم، صحت وغیرہ حکومت کے ذریعہ برداشت کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی والے علاقے کو ریاست کی طرف سے اور زیادہ تعاون ملتا ہے۔ خود اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ میں بھیڑ پالنے والوں کو ریاست کی طرف سے اچھی خاصی سبسڈی ملتی ہے۔

آزادی کے بعد خود ہمارے ملک کو ترقی پسند ریاست کی فہرست میں رکھا گیا تھا یہ الگ بات ہے کہ اس پر پوری طرح عمل نہیں ہو سکا۔ ہمارے یہاں تعلیم، اسکول کے بچوں کو دن کا کھانا دینے یعنی 'ڈے میل' کا بھی انتظام کیا گیا۔ ماہرین اقتصادیات سبسڈی کو ختم کرنے کی بحث شروع کرنے سے پہلے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ واضح کیا جائے کہ ہندوستان ترقی پسند ریاست کی فہرست میں ہے یا نہیں، کیوں کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی پوری آبادی کا ۴۰ فی صد آج بھی دو وقت کی روٹی کا محتاج ہے جب کہ اس طرح کی حکومت کی یہ پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے باشندوں کو پہلی فرصت میں یہ بنیادی چیزیں مہیا کرائے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے ملک کا زیادہ تر انحصار کھیتی باڑی پر ہے۔ بہت کوششوں اور محنت کے بعد ہم اس میدان میں خود کفیل ہو سکے ہیں لیکن اگر آج اناج کا کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا تو دنیا کا کوئی بھی ملک ہماری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اس لیے زراعت کے شعبہ میں سبسڈی کو ختم کرنے سے پہلے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بھکمری کی نوبت کو ٹالا جا سکے۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ حکومت غریبوں کے نام پر ایسے پروڈکٹس پر سبسڈی دیتی ہے جو ان کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں لہٰذا اس کے صحیح استعمال اور طریقۂ کار کا کوئی نقشہ وضع کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی فضول خرچیوں پر بھی کھل کر بحث ہو جس کی وجہ سے ہمارا بجٹ گھاٹا مسلسل بڑھتا جا رہا ہے اس لیے ان امور پر غور کیے بغیر سبسڈی کو ختم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

سبسڈی کی قسمیں

ہندوستان میں سبسڈی کی درج ذیل قسمیں ہیں

نقد سبسڈی : یہ کھاد، برآمدات وغیرہ کی مدوں کے لیے دی جاتی ہے۔

سود یا قرض سبسڈی: اس میں بازار قیمت سے کم شرح پر قرض دیا جاتا ہے اس کے تحت حفظان صحت خرچوں پر ٹیکس سے مستثنیٰ، زمین کو گروی رکھ کر لیے گئے قرض پر دیے جانے والے سود کی ادائیگی میں سے کٹوتی اور بقایا وصولی کی جگہ پر دیا جاتا ہے۔

جنس سبسڈی : یہ جنس پر دی جاتی ہے۔ جیسے سرکاری اسپتالوں میں مفت علاج یا ایک متعینہ آبادی کو کوئی جنس (اشیاء) کے دیے جانے کا نظم وغیرہ۔

ایکوٹی سبسڈی : یہ کم نفع دینے والی سرکاری صنعتوں میں ایکوٹی کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

خرید سبسڈی : اس کے تحت حکومت سیدھے کسانوں سے بازار سے زیادہ قیمت پر غلہ خریدتی ہے۔

کنٹرول سبسڈی : اس کے ذریعہ نجی اور عوامی شعبوں کی پیداوار کی قیمتیں (یا تعداد) طے کی جاتی ہے۔

بقیہ: بڑھتے قدم

والے انجنوں کا استعمال رفتہ رفتہ ترک کرنے اور ان کی جگہ زیادہ تیز رفتار، زیادہ موثر، زیادہ کفایتی اور زیادہ بوجھ کھینچنے والے ڈیزل اور برقی ریل انجن استعمال کرنے کے سلسلے میں ایک بڑا منصوبہ شروع کیا ہے۔ ہندوستانی ریلوے میں بھاپ سے چلنے والے انجنوں کی تعداد ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۸۲۰۹ سے گھٹ کر ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء کو ۳۰۹۷ ہو گئی ہے۔

● ریلوے اسٹیشنوں کی تعداد ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵۹۷۶ سے بڑھ کر ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو ۷۰۶۸ ہو گئی ہے۔ ●

ہندوستان میں دی جانے والی سبسڈی

(۱۹۹۴-۹۵ء)

(کروڑوں میں)

	کل خرچ	کل وصولیابی	سبسڈی	اگلی ودر فی صد
۱۔ مرکز				
میرٹ گڈس/خدمات	۷۰۹۳،۷۰	۱۷۰،۷۱	۶۹۲۲،۹۹	۲،۴۱
نان میرٹ گڈس/خدمات	۴۱۱۱۲،۷۱	۴۹۸۷،۸۷	۳۶۱۲۴،۸۳	۱۲،۱۳
۲۔ ریاستیں				
میرٹ گڈس خدمات	۲۸۵۶۶،۶۱	۲۹۶،۶۱	۲۸۲۷۰،۰۱	۱،۰۴
نان میرٹ گڈس/خدمات	۷۲۷۷۲،۶۱	۶۷۵۲،۲۰	۶۶۰۲۰،۴۱	۹،۲۸
۳۔ پورا ہندوستان				
میرٹ گڈس/خدمات	۳۵۶۶۰،۳۱	۴۶۷،۳۲	۳۵۱۹۳،۰۰	۱،۳۱
نان میرٹ گڈس/خدمات	۱۱۳۸۸۵،۳۲	۱۱۷۴۰،۰۷	۱۰۲۱۴۵،۲۴	۱۰،۳۱

گھریلو پیداوار کا فی صد (پورا ہندوستان)

میرٹ گڈس/خدمات پر سبسڈی ۳،۶۹

نان میرٹ سبسڈی ۱۰،۷۱

کل سبسڈی ۱۴،۴۰

بحوالہ: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک فائننس اینڈ پالیسی

کچھ اہم پٹرولیم مصنوعات پر دی گئی سبسڈی

(کروڑوں میں)

پٹرولیم مصنوعات	۱۹۹۴-۹۵	۱۹۹۵-۹۶	۱۹۹۶-۹۷
مٹی کا تیل (گھریلو)	۳۷۴۰	۴۱۹۰	۶۳۵۰
رسوئی گیس	۱۴۱۰	۱۶۳۰	۱۹۵۰
ڈیزل	۴۳۰	۲۱۸۰	۸۳۴۰
نیپتھا	۵۲۰	۶۴۰	۹۸۰
بیج	۳۳۰	۵۶۰	۵۹۰
بٹامین پیکڈ	۱۱۰	۱۲۰	۱۹۰
ویکس	۲۰	۴۰	۴۰
کل	۶۵۶۰	۹۳۶۰	۱۸۴۴۰

بحوالہ: وزارت تیل اور قدرتی گیس

مختلف ملکوں میں دی جانے والی سبسڈی

(گھریلو پیداوار کا فی صد)

ممالک	۱۹۸۸	۱۹۹۰	۱۹۹۲	۱۹۹۴
امریکہ	۱۱،۴۹	۱۱،۸۷	۱۳،۴۳	۱۳،۴۲
کناڈا	۱۲،۳۷	۱۳،۵۴	—	—
آسٹریلیا	۱۷،۲۴	۱۵،۷۵	۱۸،۶۵	۱۹،۳۸
جاپان	۸،۵۶	۸،۴۶	—	—
انگلینڈ	۱۸،۱۴	۱۹،۸۴	۲۴،۲۱	—
بھارت	۷،۲۷	۷،۴۳	۷،۱۲	—
انڈونیشیا	۲،۴۲	۳،۹۱	۲،۴۴	—
کوریا	۶،۰۹	۷،۴۵	۸،۴۱	۹،۰۶
ملیشیا	۱۳،۰۵	۱۲،۷۶	۱۳،۰۷	۱۲،۱۵
پاکستان	۸،۰۷	۹،۸۲	۱۱،۴۱	۱۱،۸۳
فلپائن	۷،۵۵	۸،۵۸	۷،۹۹	—
سنگاپور	۱۰،۵۱	۱۰،۳۳	۹،۶۴	—
سری لنکا	۹،۳۱	۹،۳۷	۹،۳۳	۹،۴۵
تھائی لینڈ	۹،۵۰	۸،۷۶	۹،۴۱	—
ارجنٹینا	۳،۵۱	۳،۲۱	—	—
برازیل	۵،۴۴	۵،۸۰	۳،۸۹	—
چلی	۶،۵۸	۵،۶۷	۵،۷۴	۵،۸۷

بحوالہ: گورنمنٹ فائننس اسٹیٹکس (۱۹۹۵) آئی ایم ایف

مرکزی بجٹ میں متعینہ سبسڈی کی رقم

رقم کروڑوں میں

سال	کھاد سبسڈی	بیج سبسڈی	برآمدات اور بازار کی ترقی کے لیے	ریلوے پر دی جانے والی سبسڈی	سود پر دی جانے والی سبسڈی	دیگر	کل
۱۹۷۱-۷۲ء	۴۷	۰	۵۴	۰	۵	۳۴	۱۴۰
۱۹۷۲-۷۳ء	۱۱۷	۰	۶۲	۰	۱۲	۱۴	۲۰۵
۱۹۷۳-۷۴ء	۲۵۱	۰	۶۶	۰	۲۰	۲۴	۳۶۱
۱۹۷۴-۷۵ء	۲۹۵	۰	۸۰	۰	۳۰	۱۴	۴۱۹
۱۹۷۵-۷۶ء	۲۵۰	۰	۱۴۹	۰	۴۷	۲۴	۴۷۰
۱۹۷۶-۷۷ء	۵۰۶	۶۰	۲۴۱	۰	۶۶	۷۴	۹۴۷
۱۹۷۷-۷۸ء	۴۸۰	۲۶۶	۳۲۴	۰	۸۸	۱۲۹	۱۲۸۷
۱۹۷۸-۷۹ء	۵۷۰	۳۴۲	۳۷۵	۰	۵۹	۱۲۹	۱۴۷۵
۱۹۷۹-۸۰ء	۶۰۰	۶۰۳	۳۶۱	۵۶	۹۲	۱۰۹	۱۸۲۱
۱۹۸۰-۸۱ء	۶۵۰	۵۰۵	۳۹۹	۶۹	۲۵۳	۱۵۲	۲۰۲۸
۱۹۸۱-۸۲ء	۷۰۰	۳۸۱	۴۷۷	۷۸	۱۰۲	۲۰۳	۱۹۴۱
۱۹۸۲-۸۳ء	۷۱۱	۶۰۳	۴۷۷	۹۷	۲۱۷	۱۵۷	۲۲۶۲
۱۹۸۳-۸۴ء	۸۳۵	۱۰۴۲	۴۶۳	۹۳	۱۱۸	۱۹۸	۲۷۴۹
۱۹۸۴-۸۵ء	۱۱۰۱	۱۹۲۸	۵۱۸	۱۰۰	۱۳۵	۲۵۶	۴۰۳۸
۱۹۸۵-۸۶ء	۱۶۵۰	۱۹۲۴	۶۰۳	۱۲۸	۲۷۱	۲۲۰	۴۷۹۶
۱۹۸۶-۸۷ء	۲۰۰۰	۱۸۹۸	۷۸۵	۱۴۴	۲۲۹	۳۹۵	۵۴۵۱
۱۹۸۷-۸۸ء	۲۰۰۰	۲۱۶۴	۹۶۲	۱۷۴	۳۹۳	۲۸۷	۵۹۸۰
۱۹۸۸-۸۹ء	۲۰۰۰	۳۲۰۱	۱۳۸۶	۲۰۷	۴۰۶	۲۳۲	۷۷۳۲
۱۹۸۹-۹۰ء	۲۴۷۶	۴۵۴۲	۲۰۱۴	۲۳۳	۸۸۱	۳۲۸	۱۰۴۷۴
۱۹۹۰-۹۱ء	۲۴۵۰	۴۳۸۹	۲۷۴۲	۲۸۳	۳۷۹	۱۹۱۵	۱۲۱۵۸
۱۹۹۱-۹۲ء	۲۸۵۰	۵۱۸۵	۱۷۵۸	۳۱۲	۳۱۶	۱۸۳۲	۱۲۲۵۳
۱۹۹۲-۹۳ء	۲۸۰۰	۵۷۹۶	۸۱۸	۳۵۳	۱۱۳	۲۱۱۵	۱۱۹۹۵
۱۹۹۳-۹۴ء	۵۵۳۷	۴۵۶۲	۶۶۵	۴۱۲	۱۱۳	۱۳۹۳	۱۲۶۸۲
۱۹۹۴-۹۵ء	۵۱۰۰	۵۷۶۹	۶۵۸	۴۲۰	۷۶	۹۰۹	۱۲۹۳۲
۱۹۹۵-۹۶ء	۵۳۷۷	۶۷۳۵	۱۶	۴۱۸	۳۴	۷۲۵	۱۳۳۰۵
۱۹۹۶-۹۷ء	۶۰۶۶	۷۷۶۷	۴۰۰	۴۶۶	۱۲۵۷	۷۳۸	۱۴۶۹۴

بحوالہ: انڈین اکنامک ڈاٹا اینڈ بجٹ ڈاکومینٹس، وزارت خزانہ

پروفیسر شکیل الرحمن

جان لیوا مرض: ایڈس

ایڈس (AIDS) جان لیوا مرض ہے، جنوری ۱۹۸۸ء میں اس مرض کو روکنے اور اس سے بچنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لیے لندن میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، ہندوستان بھی اس کانفرنس میں شریک تھا۔ ایک اعلان نامہ جاری ہوا کہ جس پر دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان نے بھی دستخط کیے تھے، اس میں سب سے اہم بات یہ کہی گئی تھی کہ جب تک اس مہلک مرض کی کوئی دوا ایجاد نہیں ہو جاتی ہر ملک کو یہ چاہیے کہ وہ اپنے عوام کو اس جان لیوا مرض کے تعلق سے معلومات فراہم کرے مثلاً یہ مرض کیوں ہوتا ہے، کس قسم کی احتیاط کی ضرورت ہے، مرد اپنی ہوش مندی کا ثبوت کس طرح دیں اور گھر کی عورتیں کس طرح چوکنا رہیں۔ حکومت ہند کے "نیشنل ایڈس کنٹرول پروگرام" نے تسلیم کیا کہ لوگوں کو حقیقت سے آگاہ رکھنا اور ان کی ذہنی تربیت میں حصہ لینا ضروری ہے۔ حکومت ہند کی کوشش یہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ایڈس کے متعلق عوام زیادہ سے زیادہ آگاہ ہو جائیں۔ "ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن" (WHO) نے اس سلسلے میں مدد کی ہے، ایک ضروری اور عمدہ گائڈ لائن تیار کی ہے، اس سے بڑی مدد مل رہی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایڈس کے لیے اب تک کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی ہے اور یہ بیماری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ شمال مشرق میں یہ مرض اپنے ملک کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا ہے، ملک کے دوسرے علاقے بھی اس کی زد میں ہیں، جب تک ہم لوگوں کے درمیان اس سچائی کو لے کر نہیں جائیں گے کہ اس مرض سے محفوظ رہنے کے لیے صرف چند تدبیریں کام آسکتی ہیں اس وقت تک ہم کامیابی حاصل نہ کرسکیں گے۔ دراصل ہمیں اس مرض سے بچنا ہے اس سے بچ کر زندگی بسر کرنا ہے۔

عمدہ جنسی زندگی بہت بڑی نعمت ہے لہٰذا جنس یا سیکس کے تعلق سے مفید اور بہتر معلومات کی ضرورت ہے۔ ہمیں زندگی بسر کرنے کے اپنے انداز پر غور کرنا ہوگا، جنسی زندگی میں احتیاط ضروری ہے۔ "ایڈس" کے تعلق سے مکمل طور پر باخبر رکھنے کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتیں ایسے افراد کو ٹریننگ دے رہی ہیں جو مختلف علاقوں میں معلومات فراہم کریں، لوگ آگاہ رہیں کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ عوامی سطح پر بھی اس بات کی کوشش ضروری ہے کہ تعلیمی اداروں اور مختلف محکموں میں اس مہلک مرض کے متعلق معلومات فراہم کیے جائیں، جس طرح ہم ملیریا، کالا زار، پولیو وغیرہ کے متعلق لوگوں کو معلومات فراہم کرتے ہیں، اسی طرح "ایڈس" کے متعلق بھی ہمیں معلومات فراہم کرنا چاہیے۔

مرکزی حکومت میں وزیر صحت اور خاندانی بہبود کے وزیر کی حیثیت سے جب میں نے ذاتی دلچسپی لی اور مختلف علاقوں میں ماہرین کے وفد روانہ کیے اور رپورٹس منگوائیں تو اس بات سے سخت صدمہ پہنچا کہ یہ مرض تیزی سے پھیل رہا ہے اور بعض علاقوں میں عوام کا رویہ تبدیل نہیں ہو رہا ہے۔ وہ اپنے جینے کا اسٹائل تبدیل نہیں کر رہے ہیں، اس وقت ملک کے جو حالات ہیں ان کے پیش نظر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہیلتھ ورکرز کام کریں۔ اس بیماری کو کیسے روک سکتے ہیں اور اس سلسلے میں ہم پر کس قسم کی ذمہ داری ہے اس کی تعلیم گھر گھر دی جائے۔ ملک میں "سوشل ورک" کرنے والی انگنت انجمنیں اور ادارے اور ایجنسیاں ہیں، انھیں بھی سوچنا چاہیے کہ یہ صرف حکومت کا کام نہیں ہے، دوا موجود ہوتی تو حکومت تقسیم کرتی، یہاں معاملہ گھر گھر جا کر جانکاری دینے کا ہے۔ ہم اپنے گھر میں بتائیں، اپنے محلے میں بتائیں، اپنے گاؤں اور علاقے میں بتائیں کہ یہ بیماری کیوں اور کیسے ہوتی ہے اور اس سے محفوظ رہنے کی تدبیریں کیا ہو سکتی ہیں۔ جو لوگ خون کا عطیہ دیتے ہیں ان کے خون کی جانچ کا انتظام تو کیا گیا ہے لیکن اپنے اس بڑے سماج میں

مدھوبن، اے-۲۶۷، ساؤتھ سٹی، گوڑگاؤں، ہریانہ-۱۲۲۰۰۱

ہم خود اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کریں اور اپنے خون کی جانچ کراتے رہیں اور پھر اس کا عطیہ دیں تو یہ یقیناً اچھی بات ہوگی۔ یہ مرض ایسے خون سے بھی ہوتا ہے کہ جس میں اس کے جراثیم ہوتے ہیں اور خون دینے سے قبل جن کی جانچ نہیں ہوتی، جب ہم خون دیتے ہیں تو اپنے خون کو پہچاننے میں مضائقہ کیا ہے۔ بڑی حد تک یہ مرض طوائفوں کے ذریعے پھیلتا ہے لہٰذا خود ان کی زندگی بھی خطرے میں ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ انھیں اس مرض کے تعلق سے باخبر رکھا جائے اور ہیلتھ ورکرز اور سوشل ورکرز ان کی ذہنی تربیت میں حصہ لیں۔

اسی طرح انجکشن اور سرنج نے بھی اس مرض کو پھیلایا ہے، ایک ہی سرنج سے انجکشن دینے کی وجہ سے اس مرض کے پھیلنے کا موقع ملا ہے۔ ڈرگس کے استعمال میں انجکشن اور سرنج کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اپنے ملک کے دو علاقوں کی جو رپورٹ میرے پاس آئیں ان میں نوجوانوں میں اس مرض کے پھیلنے کے امکانات زیادہ دکھائی دیے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سرنج کا استعمال ہے۔ نوجوان چھپ چھپا کر انجکشن کے ذریعہ "ڈرگس" لیتے ہیں اور ایک ہی سرنج کا استعمال کرتے ہیں۔ اس بات پر بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنا ملک مختلف سماجی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی اقتصادی حالات میں رہنے والوں کا ملک ہے لہٰذا ہر علاقے کے تعلیم کے طریقوں پر غور کرنا ہوگا تاکہ ہر بات آسانی سے لوگوں کے دل و دماغ تک پہنچ جائے اور وہ اس مرض کی قیامت خیز کیفیت سے آگاہ ہو جائیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ صرف اپنے ملک میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں مرد اور عورت کے تعلقات میں مردوں کی من مانی چلی آئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں بھی ایڈس کی شکار ہوتی رہتی ہیں۔ پیٹ میں جو بچہ ہوتا ہے اسے بھی یہ مرض چھو لیتا ہے۔ بلاشبہ عورتوں کو بہت محتاط اور چوکنا رہنا ہے۔ عورت گھر کی مالکنہ ہوتی ہے، جو بیمار ہو دیکھ بھال تو اسی کے ذمے ہے، اگر اسے عام اور خاص بیماریوں کا درست علم نہ ہو اور اسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ کس بیماری سے کس طرح محفوظ رہا جا سکتا ہے اور بیمار کی تیمارداری کس طرح ہونی چاہیے تو بیمار کے ساتھ اسے بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان جھگڑوں سے عورت کو بچانے کے لیے اور اس لیے بھی کہ وہ ایک اچھی تیماردار ثابت ہو اسے بہت سی باتوں کی واقفیت ضروری ہے۔

انسان کی بہت سی بیماریوں اور دوسری تکلیفوں کی تہہ میں اس کے اپنے رہن سہن کا ڈھنگ موجود ہوتا ہے، تندرست اور خوشحال رہنا یا بیمار اور پریشان رہنا بہت کچھ اس کے اپنے قابو میں ہے۔ رہن سہن یا چال چلن میں ذرا سی چوک ہو جائے تو ڈاکٹروں اور اسپتالوں کا محتاج بننا پڑے گا۔ ہم کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے ہیں، کھانے پینے کی چیزوں کو کہاں رکھتے ہیں، کیسے ہاتھوں سے یا کیسے برتنوں میں کھاتے ہیں، آس پاس کی صفائی کیسی ہے ان پر تندرستی منحصر کرتی ہے۔ ہم لوگوں کے رہن سہن کا ڈھنگ بہت کچھ ہماری پرورش اور ہماری مناسب جانکاری پر منحصر ہے۔ اگر دھیان نہ دیا جائے تو یہی بیماری ہماری موت کا سبب بن جاتی ہے۔ بہت سی بیماریوں کا علاج سائنس نے ڈھونڈ لیا ہے، کچھ بیماریوں کے بچاؤ کے ٹیکے بھی ایجاد کر لیے گئے ہیں، انھیں وقت پر لینے سے بچوں کو خسرہ، ڈپتھیریا، کالی کھانسی، ٹیٹنس، لقوہ اور تپ دق جیسی جان لیوا بیماریوں سے زندگی بھر کے لیے بچاؤ ہو جاتا ہے۔ آج ایک ایسی بیماری اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے ملک میں خاموشی سے گھس آئی ہے جس سے بچاؤ کا نہ تو ابھی تک کوئی ٹیکہ ایجاد ہوا ہے اور نہ ہی اس سے چھٹکارا پانے کا کوئی طریقہ تلاش کیا گیا ہے۔ اس بیماری سے موت جلد نہیں ہوتی۔ ایک بار آئے تو پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ جسم کے اندر سما چکی ہے۔ وہ لوگ کہ جو اپنے جیون ساتھی کے ساتھ وفادار نہیں ہوتے وہ ایڈس کے مرض میں جلد گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ۵۰ فی صد ایسے لوگ ہیں جو اس سبب سے اس مرض میں مبتلا ہیں باقی وہ لوگ ہیں جنھیں نشیلی دواؤں کی لت پڑ گئی ہے اور جو ایک ہی سرنج کے ذریعہ باری باری اپنے جسم میں ان دواؤں کو پیوست کرتے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو تو کبھی اپنے خون کا عطیہ دینا نہیں چاہیے۔

کاش ہم جلد چوکنا ہو جائیں اور اس مہلک مرض سے خود بھی بچے رہیں اور دوسروں کو بھی بچاتے رہیں ●

بقیہ کورا: پروفیسر ترملا راؤ

دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ کے رول کے بارے میں تقریر کی تو انھیں ہاؤس سرجن کی حیثیت سے برخاست کر دیا گیا۔ بعد میں وہ اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گئے اور وہاں سے واپسی پر گاندھی میڈیکل کالج، آندھرا پردیش میں بچوں کے امراض کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

واقعات سے پُر زندگی

ڈاکٹر راؤ ایک بلند پایہ مصنف ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں (جن میں "میری نسل کی کہانی" (تیلگو زبان میں) اور "ایک منکسر المزاج گاندھی وادی کی خود نوشت سوانح حیات" شامل ہیں۔

عمر کے بڑھنے سے ان کی صلاحیتیں ذرا بھی کم نہیں ہوئی ہیں۔ وہ اب بھی لکھتے ہیں۔ ایک مشہور تیلگو روزنامہ میں وہ معمر لوگوں کے لیے ایک کالم باقاعدگی سے لکھتے ہیں۔ اس کالم میں وہ بزرگ اور عمر رسیدہ لوگوں کو اچھی صحت کے گر بتاتے ہیں اور انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ آج کے دور میں جب بزرگوں کی اتنی عزت اور دیکھ بھال نہیں کی جاتی جتنی کہ کسی زمانے میں کی جاتی تھی، انھیں کیسا طرز زندگی اختیار کرنا چاہیے۔

پروفیسر راؤ کو پنڈت نہرو، بی۔ گوپالا ریڈی اور سی۔ راج گوپالاچاری جیسے عظیم مجاہدین آزادی سے اپنے روابط آج بھی بخوبی یاد ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انھوں نے کانگریس کمیٹی (آئی) کے فریڈم فائٹرز سیل کے کنوینر کی حیثیت سے مجاہدین آزادی کی فلاح و بہبود کا کام جاری رکھا۔ کسی زمانے میں جیل میں ان کے ساتھی رہے، صدر جمہوریہ ہند شری آر۔ وینکٹ رمن نے ۱۹ مارچ ۱۹۸۸ء کو انھیں "پدم بھوشن" کے خطاب سے نوازا۔ آج بھی یہ "منکسر المزاج گاندھی وادی" اپنا بیشتر وقت کتابوں کے مطالعہ اور تحریک آزادی کے واقعات لکھنے میں گزارتا ہے، جس میں اس نے سرگرم رول ادا کیا تھا ●

اننتھن ۔ ایک ریلوے ملازم مہاتما گاندھی کی راہ پر

موجودہ نسل کے لیے جدوجہد آزادی ملک کی تاریخ کا محض ایک شاندار باب ہے۔ غیر تشددانہ جدوجہد نے ملک کو آزاد کرانے کے سلسلے میں نوآبادیاتی طاقت کے خلاف ایک محکوم قوم میں اخلاقی طاقت پیدا کی۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اپنی آزادی کے پچاسویں سال میں ہمارے درمیان چند ایسی شخصیتیں موجود ہیں، جنھوں نے "آزاد ہندوستان" کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا۔ یہی مناسب ہے کہ ہم ماضی کو یاد کریں اور ان ہستیوں کے تجربے سے کچھ سیکھیں۔

"آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی۔

ایک روز صبح ریلوے ورکشاپ، پیرامبور، چنئی میں ایک ورکر گاندھی ٹوپی پہن کر کام پر آیا۔ ایک یوروپین افسر اسے ایک طرف لے گیا اور اس سے گاندھی ٹوپی اتار دینے کو کہا۔ ورکر نے انکار کر دیا تو اسے فوراً معطل کر دیا گیا۔ اگلے روز صبح انگریز افسروں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے دیکھا کہ تمام ورکر جن کی تعداد سیکڑوں میں تھی گاندھی ٹوپی پہن کر کام پر آئے ہیں۔ آج یہ ایک معمولی واقعہ نظر آسکتا ہے لیکن آزادی کی جدوجہد کے دنوں میں یہ ریلوے ملازمین کے اتحاد اور ان کے جذبہ حب الوطنی کی دلیل تھا۔"

یہ یادیں ہیں ۹۲ ویں سالہ ٹریڈ یونین لیڈر اور جنوبی ریلوے ایمپلائیز سنگھ کے صدر شری ٹی۔ وی۔ اننتھن کی، جن کا ذکر انھوں نے جوزف چندرا کمار سے کیا ہے۔

ان دنوں ہندوستانی ریلوے کا انتظام انگلینڈ میں رجسٹرڈ چھوٹی بزنس کمپنیاں چلا رہی تھیں۔ یہ کمپنیاں ہندوستانی مزدوروں کا حد سے زیادہ استحصال کرتی تھیں اور کسی کو استحصال کے خلاف آواز اٹھانے یا اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مزدوروں کو منظم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ریلوے ملازمین سفید فام منیجروں کی بدسلوکی کا بدترین شکار تھے۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے اور موقع کے انتظار میں تھے۔

۱۹۰۵ء میں جب لوکمانیہ تلک نے "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آزادی کی تحریک شروع کی تو بدیشی حکمرانوں نے انھیں جلاوطن کر کے برما بھیج دیا۔ یہ خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس کے خلاف سب سے پہلے پیرامبور کے ریلوے ورکروں نے احتجاج کیا اور کئی روز تک دھرنا دیا۔ ریلوے ملازمین کی ناراضگی اور بے اطمینانی کی یہ پہلی علامت تھی۔ اس کے بعد دسمبر ۱۹۱۳ء میں پیرامبور ورکشاپ کے ورکر شدید بارش کی وجہ سے وقت پر ڈیوٹی پر حاضر نہ ہو سکے۔ منتظمین نے بطور جرمانہ آدھے گھنٹے کی اجرت کاٹ لی۔ ملازمین اس کے خلاف اپنی عرضداشت پیش کرنے کے لیے ورکس منیجر کے کمرے کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ انھیں ایک بے قابو ہجوم سمجھ کر مقامی سپرنٹنڈنٹ نے ان پر کئی راؤنڈ گولیاں چلائیں جس سے دو ورکر ہلاک ہو گئے۔

ایک یونین کا جنم

مشہور تھیوسوفسٹ جی۔ ایس۔ ارونڈیل اور ڈاکٹر اینی بیسنٹ، بزنس مین بی۔ پی۔ واڈیا کو، جو ہوم رول تحریک کے روح رواں تھے۔ جب پیرامبور ورکشاپ کے ہنگامے اور ریلوے ورکروں کی بے اطمینانی کا پتا چلا تو انھوں نے ان کے لیے ایک تنظیم بنانی چاہی۔ جب برطانوی حکومت نے یہ سنا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے سوچا اگر ورکر متحد ہو گئے تو جلد ہی وہ جدوجہد آزادی کی دوسری صف بن جائیں گے۔ لہٰذا حکومت نے اس تنظیم کے بنائے جانے کی بھرپور مخالفت کی اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوے ملازمین کو متحد کرنے اور ان کی یونین بنانے کی کوششیں رائیگاں گئیں۔

آخر کار، ۷ فروری ۱۹۱۹ء کو مدراس اینڈ سدرن مراٹھا ریلوے ایمپلائیز یونین وجود میں آئی۔ ڈاکٹر جی۔ ایس۔ ارونڈیل اس کے صدر بنے۔ پرانے ٹریڈ یونین لیڈر اور تامل کے نامور مصنف سترووی کلیانا سندرا نار نائب صدر چنے گئے۔ مجاہد آزادی وی۔ او۔ چدامبرانار کو بھی یونین کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ریلوے منتظمین کو ورکروں کے اتحاد کو دیکھ کر ایک بڑا دھکا لگا۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی اتحاد کی اپیل اور حب الوطنی کا جو جذبہ انھوں نے ورکروں میں جگایا تھا اس سے ریلوے ورکروں میں نمایاں تبدیلی آئی۔

تاریخی واقعہ

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے ۱۳ستمبر ۱۹۲۷ء کو پیرامبور میں یونین کے صدر دفتر کی عمارت کا، جو اب "یونٹی ہاؤس" کہلاتی ہے، سنگ بنیاد رکھا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ ہم سب کے لیے یہ ایک فخریہ لمحہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے بذات خود ہماری تنظیم کو "آشیرواد" دیا۔ سنگ بنیاد رکھنے کے لیے پہلی اینٹ کستوربا گاندھی نے انھیں دی۔ مہاتما گاندھی کے ایک قریبی دوست مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز بھی اس موقع پر موجود تھے۔"

"جنوری ۱۹۳۲ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے تحریک عدم تعاون شروع کی۔ گاندھی جی اور سردار پٹیل جلد ہی گرفتار کر لیے گئے۔ جب ریلوے منتظمین نے ورکروں کو اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک دن کی ہڑتال کرنے کی اجازت نہیں دی، تو ورکروں نے ورکشاپ کے اندر ہی ستیہ گرہ کیا۔ منتظمین نے انتقامی کارروائی کے طور پر ملازمین کی تخفیف کا حکم دیا۔"

"ورکر سخت برہمی کے ساتھ عام جلسے کر رہے تھے اور جلوس نکال رہے تھے۔ بالآخر انھوں نے شری وی۔ وی۔ گری کی رہنمائی میں، جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند بنے، ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ہڑتال شروع کر دی۔ یہ ہڑتال ۷۷ دن یعنی جنوری ۱۹۳۳ء تک جاری رہی۔ ان مشکل دنوں میں عام لوگوں نے ہڑتالی مزدوروں کی امداد کی اور انھیں دوکانداروں سے اشیائے خورد نی، چاول اور مصالحہ جات مفت دلوائے۔"

بھارت چھوڑو تحریک

۱۹۴۱ء میں انگریزوں کے خلاف ایک ملک گیر لہر چلی۔ ریاست کشمیر کی حکومت نے ریاست میں پنڈت جواہر لال نہرو کے داخلہ پر پابندی لگا دی تھی۔ نہرو جی پابندی کی پروا نہ کرتے ہوئے ریاست میں داخل ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے فوراً بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو اپنے ممبئی اجلاس میں تاریخی "بھارت چھوڑو" ریزولیوشن پاس کیا۔ پیرامبور ریلوے ورکرس یونین کے صدر شری وی۔ وی گری بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اس پر ورکروں نے ہڑتال شروع کر دی۔ یہی وہ وقت تھا جب ورکشاپوں کو پوری طرح دفاعی ساز و سامان تیار کرنے پر لگا دیا گیا۔ ہڑتال سے پروڈکشن پر بہت خراب اثر پڑا۔ دفاعی پیداوار میں کمی نیز ورکروں کے ڈسپلن اور اتحاد کو دیکھ کر منتظمین کو جھکنا ہی پڑا اور وہ بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ دفعہ ۴۴ ابھی ہٹا لی گئی، جو پہلے نافذ کر دی گئی تھی۔

ایک اور موقع پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایما پر یونین کے رضاکاروں نے پیرامبور میں تاڑی کی دوکان کے سامنے ستیہ گرہ کیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران حکومت نے پیرامبور ورکشاپ میں ایک ریلوے ملیٹری یونٹ قائم کیا۔ بہت سے ورکر اس یونٹ میں شامل تو ہو گئے مگر انھوں نے جذبہ حب الوطنی کے تحت یونین جیک کے تحت وفاداری کا حلف لینے سے انکار کر دیا۔

فروری ۱۹۴۴ء میں جب کستوربا گاندھی کا انتقال ہوا تو ریلوے ورکر تعزیت کے لیے ورکشاپ سے باہر نکل آئے جب منتظمین نے اس کی پاداش میں آدھے دن کی اجرت کاٹ لی تو ورکروں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ اسے مہاتما گاندھی کے غم میں شریک ہونے کے لیے اپنا ایک نذرانہ عقیدت سمجھا۔ گاندھی جی سے لے کر پنڈت نہرو، بابو راجیندر پرساد، وٹھل بھائی پٹیل، سردار پٹیل، سروجنی نائیڈو، جے پرکاش نارائن اور ونوبا جی تک تمام عظیم رہنما آزادی کی جدوجہد کے دوران جنوبی ریلوے ایمپلائیز سنگھ میں آ چکے تھے اور ریلوے ورکروں سے خطاب کر چکے تھے۔

آزادی اور نئی ذمہ داریاں

جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو ایم۔ ایس۔ ایم۔ ریلوے ایمپلائیز یونین نے تحریک آزادی کے شرکار کی حیثیت سے ایک ہفتے تک بڑے جوش و خروش کے ساتھ خوشیاں منائیں۔ آزادی اپنے ساتھ ورکروں کے لیے نئی ذمہ داریاں بھی لائی۔

اننتھن کہتے ہیں "جب اپنے ملک کی حکومت خود ہمارے ہاتھوں میں آئی تو اس وقت بہت سے سیاسی، سماجی اور اقتصادی چیلنج ہمیں درپیش تھے۔ انھیں محنت کشوں کے دل و دماغ سے دلکش نعروں اور مغرب سے ادھار لیے ہوئے مغربی خیالات کا سحر دور کرنا تھا اور انھیں قومی جھنڈے کے گرد جمع کرنا تھا۔

"یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ گاندھی جی کے سچائی اور عدم تشدد کے آدرشوں نے یونین لیڈروں کی محنت کشوں کو آزاد ہندوستان میں ترقی کے لیے کام کرنے کی راہ دکھلانے میں مدد کی۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد ایم۔ ایس۔ ایم ریلوے ایمپلائیز یونین نے، جو اب جنوبی ریلوے ایمپلائیز سنگھ بن گئی تھی، اپنے دستور عمل میں ہڑتال کی دفعہ خارج کر دی۔ ہمیں مہاتما گاندھی کی یہ نصیحت یاد تھی کہ تنازعات کو دوستانہ طریقے سے حل کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرنی چاہیے جیسے گھریلو معاملات طے کیے جاتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو ثالثی فیصلے کا سہارا لیا جانا چاہیے۔ آزادی کے بعد خود ہمارے اپنے لوگ حکومت چلا رہے ہیں۔ اس لیے ہم ہمیشہ اپنے معاملات پر ان سے بات کر سکتے ہیں اور کسی قابل قبول حل پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہم بات چیت میں یقین رکھتے ہیں۔" یہ خیالات ہیں شری اننتھن کے، جن کی بات جنوبی ریلوے ایمپلائیز سنگھ کے ۸۰۰۰۰ مزدوروں کے لیے قانون کا درجہ رکھتی ہے۔

●

ڈاکٹر اوشا مہتہ کی یادیں

ڈاکٹر اوشا مہتہ گاندھی جی کی ایک پرانی معتقد ہیں۔ وہ بچپن ہی میں تحریک آزادی میں کود پڑی تھیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی قومی کاز کے لیے وقف کر دی۔ وہ ایک ممتاز معلمہ ہیں۔ انھوں نے ۳۰ برس تک ولسن کالج ممبئی اور ممبئی یونیورسٹی میں طلبا کو پڑھایا۔ ۱۹۵۵ء سے جب گاندھی سمارک ندھی کا قیام عمل میں آیا اس کی ایک ٹرسٹی رہیں اور گزشتہ ۵ سالوں سے اس کی صدر ہیں۔ وہ گاندھی امن فاؤنڈیشن، گجرات ودیا پیٹھ اور ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی برائے خواتین سے بھی وابستہ ہیں۔ اس انٹرویو میں انھوں نے اپنی ابتدائی جدوجہد کے دنوں کی مشکلات اور حتی الامکان قوم کی خدمت کرتے رہنے کے عزم پر روشنی ڈالی ہے۔

جدوجہد کے ابتدائی ایام

تحریک آزادی کے ان پرجوش دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اوشا مہتہ نے کہا کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف پہلا نعرہ "سائمن واپس جاؤ" لگایا تھا۔ "یہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے میں آٹھ سال کی تھی۔ ہم چھوٹی چھوٹی لڑکیوں نے ایک "منجر سینا" بنائی تھی۔ ہم اپنے بڑے بزرگوں کی تقلید کرتے تھے۔ جو ملک میں سائمن کمیشن کے آنے کے خلاف تھے اگرچہ ہم اس وقت نہیں سمجھتے تھے کہ یہ سب کیا ہے پھر بھی نعرے لگانے میں ہم سب سے آگے تھے۔"

"چاروں طرف اتنا جوش و خروش تھا کہ کوئی بھی اس سے اچھوتا نہ بچا ان کے سب چاچا اور چاچیاں جدوجہد آزادی میں سرگرم حصہ لے رہی تھیں اور گھر کا ماحول حب الوطنی سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے انھیں تحریک کا ایک حصہ بننے میں بہت مدد ملی۔ ان دنوں میں ان کی خاص سرگرمیاں پربھات پھیری نکالنا، مورچوں اور دھرنوں میں حصہ لینا اور چرخہ کاتنا تھیں۔

گاندھی جی سے پہلی بار ان کی ملاقات انہی دنوں میں ہوئی۔ وہ گاندھی جی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے زندگی بھر کھادی پہننے اور خدمت قوم و وطن کے لیے شادی نہ کرنے کی قسم کھائی اور وہ آج بھی اس قسم پر قائم ہیں۔ اس وقت وہ نو سال کی رہی ہوں گی اس چھوٹی عمر میں ان کے اندر اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کا شوق تھا اور تحریک آزادی کا ایک حصہ بننے پر بہت مسرت تھیں۔

لیکن آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کے لیے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بتاتی ہیں کہ "شروع میں میرے والد میرے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ کیوں کہ وہ برٹش راج کے تحت ایک جج تھے۔ لیکن جب وہ ۱۹۳۰ء میں ریٹائر ہو گئے اور ہم سب ممبئی چلے آئے تو میرے سامنے کوئی رکاوٹ نہ تھی چناں چہ میں تحریک میں بھرپور حصہ لینے لگی۔ بچے ہونے کے ناطے اس وقت ہمارا کام بلیٹن تقسیم کرنا، چوپاٹی کے سمندری پانی سے نمک بنانا اور چھوٹے چھوٹے پیکٹ بنا کر اسے بیچنا تھا۔ ہم کبھی کبھی اپنے رشتہ داروں سے ملنے جیل بھی جایا کرتے تھے جہاں وہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کر رہے تھے۔ انھیں جو کھانا ملتا تھا وہ انسانوں کے کھانے لائق نہ ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس میں کنکر اور مٹی ہوتی تھی۔ ان سب کو شام کے چھ بجے اندر بند کر دیا جاتا تھا اور وہ تقریباً بارہ گھنٹے تالوں میں بند رہتے تھے۔"

خفیہ کانگریس ریڈیو

ڈاکٹر اوشا مہتہ نے ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک میں بڑی دلیری اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا۔ ان کی اہل قیادت میں ممبئی میں ۱۹۴۲ء کی تاریخی تحریک کے شروع ہونے کے ۱۵ دنوں کے اندر ایک خفیہ ریڈیو

اسٹیشن تحریک کی خبریں لوگوں تک پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا۔ اگست ۱۹۴۲ء ہی سے ان کی شاندار آواز جو ریڈیو کے لیے بہت موزوں تھی ہوا کے دوش پر سنی جانے لگی۔ وٹھل بھائی زاویری، چندرکانت زاویری، بابو بھائی ٹھکر اور شکاگو ریڈیو کے مالک نانک موٹوانی ان کے معاون تھے۔ ریڈیو اسٹیشن چلانے کے لیے ساز و سامان، ٹرانسمیٹر اور ٹیکنیشین نانک موٹوانی ہی نے فراہم کیے تھے۔ کئی سرکردہ رہنماؤں مثلاً ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، اچیوت پٹوردھن اور پرشوتم داس ٹیکم داس نے بھی کانگریس ریڈیو کے لیے کام کیا۔

یہ خفیہ کانگریس ریڈیو خفیہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ شمال مغربی صوبے سے بہار اور ہمالیہ کی تلہٹی سے لے کر کنیا کماری تک کی ملک گیر تحریک آزادی کی خبریں نشر کیا کرتا تھا۔ یہ خبریں ہر صبح اور شام ممبئی کے کسی مقام سے نشر کی جاتی تھیں۔ پولیس سے بچنے کے لیے کانگریس ریڈیو کو کئی بار اپنی جگہ بدلنی پڑی تقریباً تین ماہ تک انقلاب کی خبریں اور مہاتما گاندھی اور دیگر قومی رہنماؤں کی ریکارڈ کی ہوئی آوازیں ہندوستان بھر میں سنائی گئیں۔ خفیہ ریڈیو کا یہ تجربہ اپنی قسم کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا سننے والوں کے دلوں پر اور مخالفین کے دلوں پر بھی گہرا اثر ہوا۔ اس دلیرانہ کارنامہ کے لیے برٹش سرکار نے ڈاکٹر اوشا مہتہ اور ان کے رفقائے کار کو جیل کے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔

ڈاکٹر اوشا مہتہ کو ایک کوٹھری میں تنہا رکھا گیا اور بار بار سی آئی ڈی کی پوچھ تاچھ کے لیے لے جایا گیا۔ یہ ذہنی اذیت تقریباً چھ ماہ تک جاری رہی۔ جیل کے حکام نے انھیں بہت سبز باغ دکھائے اور تعلیم کے لیے سمندر پار بھیجنے کا لالچ بھی دیا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ اس جیل میں قید تنہائی بھگتنے والی وہ واحد خاتون تھیں۔ طرح طرح کی پریشانیاں جھیلنے کے باوجود انھوں نے اپنی زبان بند رکھی اور کوئی راز منکشف نہ کیا۔

تحقیقات چھ ماہ تک چلی اور اس کے بعد ان پر مقدمہ چلانے کے لیے ایک خصوصی عدالت قائم کی گئی۔ ڈیڑھ ماہ تک وہ اور ان کے ساتھی ہائی کورٹ جاتے رہے اور پیشی کے بعد ان سب کو جیل بھیجا۔ لیکن ڈاکٹر اوشا مہتہ نے تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے جو ہو وہ اپنی زبان نہیں کھولیں گی۔ جج نے ان سے کئی سوال کیے لیکن وہ یہی کہتی رہیں کہ کیا آپ کے سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے؟ پھر انھوں نے جج سے صاف کہہ دیا کہ وہ ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیں گی۔ جج نے ان کی تعریف کی کہ انھوں نے خود کو بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بولا۔ میں اپنے دیش کے لیے ہر قربانی کرنے کو تیار تھی۔ مجھے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک چار سال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب مرارجی بھائی کی عبوری حکومت بنی تو مجھے مارچ ۱۹۴۶ء میں رہا کیا گیا۔ انھوں نے پہلا حکم میری رہائی کا ہی جاری کیا۔ یروداجیل میں صرف میں ہی واحد خاتون قیدی تھی۔ دوسری سب خواتین کو پہلے رہا کیا جا چکا تھا۔

آزادی کے بعد کا دور

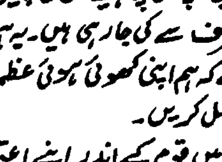
جب ڈاکٹر اوشا مہتہ سے پوچھا گیا کہ ہندوستان کے آزاد ہونے پر انھیں کیا محسوس ہوا تو وہ جذباتی ہو گئیں۔ انھوں نے کہا "مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی تقسیم وطن پر دکھ بھی ہوا۔ ہندوستان آزاد تو ہو گیا تھا لیکن وہ بٹ گیا تھا۔ بہر حال ہم نے ترقی کی ہے سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں اور صنعتوں کے شعبے میں ہم نے پیش رفت کی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم نے جمہوریت کا جھنڈا بلند رکھا ہے۔

"بہت سے شعبے ہیں جن میں ہم اب بھی پیچھے ہیں۔ شرم کی بات ہے کہ بھارت ۲۰۰۰ء میں بھی ایک ناخواندہ ملک رہے گا۔ آج بھی ہماری ۴۰ فی صد آبادی خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ امیر اور غریب کے درمیان خلیج اتنی وسیع ہے کہ اسے پاٹنا ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ وہ آزادی نہیں ہے جس کے لیے ہم نے اپنا سب قربان کر دیا۔ پھر بھی ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے قوم، اس کی قدروں اور اس کی دانائی کے اور بصیرت پر بھروسہ رکھیں۔ ہمیں ملک کی بہترین خدمت انجام دینے کے لیے اپنے آپ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔"

نوجوانوں کے لیے پیغام

ڈاکٹر اوشا مہتہ کا کہنا ہے کہ صورت حال سنگین ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے بیشتر لیڈروں میں دیانت داری اخلاقی اور ذہنی دونوں ہی کا مکمل فقدان ہے جس سے پورے ملک کو نقصان پہنچا ہے۔ اخلاقیہ دیوالیہ پن ہماری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اہل قیادت کی کمی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ یہ چیلنج قبول کریں اور آگے آئیں۔ انھیں دیانت داری کے راستے پر چلنا اور ہماری روایات اور اخلاقی قدروں کو زندہ رکھنا چاہیے۔ انھیں مادہ پرستوں کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیے جن کی پیش کش مغرب کی طرف سے کی جا رہی ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کریں۔

آخر میں قوم کے اندر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ عوام میں بیداری آئی ہے اب انھیں جھوٹے وعدوں کے سبز باغ دکھا کر کے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اچھا ہے کہ ہمارے عوام جاگ گئے ہیں۔ مجھے اپنے لوگوں میں اعتماد ہے اور امید ہے کہ ہماری جد و جہد رائیگاں نہیں جائے گی اور ہندوستان ایک بار پھر اتنا اونچا اٹھے گا جس پر ہم فخر کر سکیں گے۔



یاسمین صدیقی

قوم

قوم کا لفظ انگریز مفکرین ایک آزاد قومی مملکت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جرمن کے لوگ اس لفظ کے مترادف VOLK یعنی عوام کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور انگریزی میں VOLK کے مقابلہ میں PEOPLE کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں NATION ایک سیاسی مفہوم رکھتا ہے جب کہ جرمنی میں یہی لفظ NATION عوام کے لیے استعمال میں آتا ہے۔ زبان کی ان خرابیوں نے مفہوم کو بہت حد تک متاثر کیا ہے لیکن علم سیاست میں قوم اور قومیت کے معنی کو ممیز کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں قوم کا لفظ ایک ایسی علاقائی آبادی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو آزادانہ طور پر منظم ہوئی ہو اور اس میں یگانگت اور وحدت پائی جاتی ہو یعنی اس کا مفہوم سیاسی ہوگیا ہے۔ جب ہم جرمن قوم یا کسی اور قوم کا نام لیتے ہیں تو یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جو باضابطہ طور پر وحدت میں متحد ہوگئے ہیں اور اپنی ایک آزادانہ تنظیم رکھتے ہیں۔

ہنیر کے قول کے مطابق قوم کا لفظ لاطینی زبان NATIO سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیدائش اور نسل کے ہیں یعنی قوم وہی لوگ کہلانے کے مستحق ہیں جو مشترکہ موروث رکھتے ہیں اور ایک ہی نسل کے باشندے ہوں اور ان کی زبان بھی مشترکہ ہو لیکن قوم کا مطلب اب باقی نہیں رہا ہے بلکہ موجودہ دور میں اس کا استعمال ایسے علاقے کے لیے ہوتا ہے جس میں مشترکہ زندگی، مشترکہ رسم و رواج اور مشترکہ جذبات کے عناصر پائے جاتے ہیں اس لیے کہ ایک ریاست کے اندر کئی نسل کے لوگ رہتے ہیں اور وہ تمام مل کر قوم بناتے ہیں بلکہ نہ ان میں خونی اشتراک ہوتا ہے اور نہ ہی مذہبی اور لسانی یگانگت ہوتی ہے۔

زیادہ تر زور اب مشترکہ زندگی اور جذبات پر ہے اس لیے انگلینڈ بھی ایک قوم ہے اور سوئٹزرلینڈ بھی ایک قوم۔ جہاں تینوں نسلوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ایک قوم کا تخیل نفسیاتی، ثقافتی اور روحانی ہو کر رہ گیا۔ اس لفظ کے مادہ سے اس کے مطلب کا تعین مشکل ہی نہیں ہے بلکہ ناممکن العمل ہو کر رہ گیا ہے۔

برجس کے قول کے مطابق قوم ایک ایسی آبادی ہے جس میں مشترکہ زبان اور ادب مشترکہ طور طریقے یا تاریخ مشترکہ رسم و رواج اور حق اور ناحق کے پہچاننے کا مشترکہ شعور ہوتا ہے۔

لیکن برجس کا خیال متعدد وجہوں سے ناقابل قبول ہوچکا ہے اس لیے کہ قوم میں نہ تو اب زبان و ادب کا اشتراک باقی رہا ہے نہ مشترکہ طور طریقے اور رسم و رواج باقی ہیں نہ دوسرے عناصر بلکہ عملی طور پر متعدد ریاستوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ باوجود متعدد اختلافات کے ایک جغرافیائی وحدت رکھنے والے لوگ اپنے کو قوم تصور کرتے ہیں۔ اسی لیے پروفیسر زمرن کا یہ قول زیادہ مناسب ہوگا کہ اگر لوگ یہ احساس کرنے لگیں کہ وہ ایک قوم ہیں تو وہ دراصل قوم بن جاتے ہیں۔

رینان کے خیال میں مشترکہ زبان اور نسل قوم بننے کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان میں مشترک تاریخ و ورثہ ہو خواہ فتح مندی یا شان و شوکت کا ہو یا تکلیف اور قربانیوں کا ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ ان میں آپس میں مل جل کر مشترکہ زندگی گزارنے کا جذبہ بھی موجود ہو۔

ایم۔ ہاسر کہتا ہے ایک قوم ثقافتی ہم آہنگ معاشرتی گروہ ہے جو بیک وقت اپنی وحدت اور مشترکہ زندگی کے لیے باشعور ہوتا ہے۔ یہ ایک ہی علاقے کے ایسے باشندوں کا اتحاد ہے جن کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی حکومت کے ماتحت ہوں لیکن ان میں مشترکہ مفاد کا جذبہ اتنا پرانا ہو جس سے یہ یقین ہو جائے کہ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

لارڈ برائس کہتا ہے کہ ایک ایسی قومیت جس نے اپنے کو سیاسی طور پر منظم کر لیا ہے اور خواہ وہ آزاد ہو یا آزادی حاصل کرنے کی خواہش مند ہو۔ ایک قوم کہلانے کی مستحق ہے۔

مختصراً یہ کہ مغربی مفکرین کے نزدیک موجودہ زمانہ میں قوم کا مطلب ایک ایسی آبادی سے ہوتا ہے جو مکمل طور پر آزاد ہو اور ایک جغرافیائی وحدت میں اتحاد اور یگانگت کے جذبہ سے متحد ہو۔ لیکن بالکلیہ قوم کا یہ مطلب سمجھنا عقلمندی نہیں ہے۔ ایسی آبادی جو مشترکہ جذبات و خیالات کے تحت متحد نہ ہو اور اس میں محبت اور بھائی چارگی

باقی صفحہ ۳۱ پر

نیم چوک، اردو بازار۔ دربھنگہ (بہار) ۸۴۶۰۰۴

ناصر

حمی معوی

(ٹائیفائڈ)

حمی معوی جسے انگریزی میں TYPHOID اور اردو میں "میعادی بخار" کہتے ہیں، ایک شدید قسم کا متعدی بخار ہے جو ایک خاص قسم کے جرثومہ کے سبب پیدا ہوتا ہے جس کو SALMONELLA TYPHI کہتے ہیں۔ اس مرض میں آنتیں ان کے غدود اور تلی خاص طور سے متاثر ہوتی ہے۔ مریض کو بخار، سردرد اور شکم میں درد کی شکایت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں یہ مرض بہت عام ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ کی آبادی میں ۹۰ افراد اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں جن میں سے ۹ افراد موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ مرض زمانہ قدیم میں نہیں ہوتا تھا لیکن آج کل یہ کثیر النوع ہے۔ اس مرض کی تحقیق سب سے پہلے ۱۸۵۰ء میں ولیم جینز نے کی۔ اس کے بعد یعنی ۱۸۶۹ء میں اس کا نام حمی معوی (ENTERIC FEVEER) رکھا گیا۔

اس مرض کا حملہ جولائی سے ستمبر تک زیادہ ہوتا ہے اور موسم برسات اس مرض کے لیے بہت سازگار موسم ہوتا ہے۔ یہ بوڑھوں کی بہ نسبت بچوں اور نوجوانوں میں زیادہ واقع ہوتا ہے۔

اس مرض کے پھیلنے کا سب سے بڑا ذریعہ مریض کے فضلات ہیں۔ یہ مرض قصبوں اور دیہاتوں میں زیادہ پایا جاتا ہے کیوں کہ وہاں پر تالابوں یا کنوؤں کے پانی میں مریض کے فضلات کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے علاقوں میں حفظان صحت کا خیال نہیں رکھا جاتا جس کی وجہ سے کھانے پینے کی اشیا یا مریض کے دیگر مستعملہ سامان سے یہ مرض ایک سے دوسرے شخص میں منتقل ہو جاتا ہے۔

امراضیات

اس مرض کے جراثیم جسم میں داخل ہونے کے بعد آنتوں میں ورم اور سوزش پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے مخاطی خلیات پر حملہ آور ہو کر وہیں اپنی تعداد میں تیزی سے اضافہ کرنے لگتے ہیں۔ ان جراثیم کی سمیت کی وجہ سے چھوٹی آنتوں اور ان کی لمفاوی ساختوں میں زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ زخم پھٹ جاتے ہیں اور ان سے جریان خون ہونے لگتا ہے۔ اگر یہ زخم اور گہرائی میں پہنچ جائیں تو ان سے آنتوں میں سوراخ ہو جاتا ہے۔

اسباب

(۱) جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس مرض کا سبب جراثیم ہیں۔ جب ان جراثیم کی کثیر تعداد صحت مند شخص کے جسم میں پہنچتی ہے تو اسے یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ اگر مریض کے جسم کی قوت مدافعت کمزور ہے تو ان جراثیم کا حملہ بہت آسانی سے ہو جاتا ہے۔

(۲) معدے میں "ہائیڈرو کلورک ایسڈ" کی ایک مناسب مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ ایسڈ غذا کو ہضم کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سے افعال انجام دیتا ہے۔ اس کا ایک فعل یہ بھی ہے کہ یہ اس مرض کے جراثیم کو حملہ کرنے نہیں دیتا اور اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اس میں کمی واقع ہو جائے یا یہ ختم ہو جائے تو ایسی حالت میں جراثیم کو پنپنے کا موقع مل جاتا ہے۔

(۳) آنتوں کے مخصوص ماحول میں شمی تیزاب پایا جاتا ہے جو ان جراثیم کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ضد حیات (ANTI-BIOTISس) ادویہ کے استعمال سے بعض اوقات اس تیزاب میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس سے اس مرض کے جراثیم کے لیے فضا سازگار ہو جاتی ہے۔

علامات

اس مرض کی علامات کو مندرجہ ذیل حصوں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ جراثیم کے جسم پر حملہ کرنے کے بعد تین دن سے سات ہفتے کے درمیان یہ علامات پیدا ہوتی ہیں۔

پہلا ہفتہ

(الف) پہلے ہفتہ میں اس مرض کا تعدیہ چھوٹی آنتوں اور قولون تک ہی محدود رہتا ہے۔ چناں چہ ابتدا میں مریض کو تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ پورے جسم خاص طور سے پیشانی میں درد ہوتا ہے۔ بھوک زائل ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں بے چینی ہوتی ہے۔ دستوں کی خفیف شکایت ہوتی ہے اور کبھی قبض بھی ہو جاتا ہے۔

(ب) زبان درمیان میں خشک لیکن

فیکلٹی آف میڈیسن، جامعہ ہمدرد، ہمدرد نگر، نئی دہلی ۶۲

کناروں اور سامنے کی طرف سرخی مائل ہوتی ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے۔ ابتدا میں یا تو دست آتے ہیں یا قبض رہتا ہے لیکن پہلے ہفتہ کے آخر میں عموماً دستوں کی شکایت ہو جاتی ہے جو پانی جیسے، ہرے اور بدبودار ہوتے ہیں بعض اوقات دستوں کے ساتھ خون بھی آنے لگتا ہے۔

(ج) بخار تیز ہو جاتا ہے اور لرزہ سا آتا ہے۔ صبح کی بہ نسبت شام کو ایک تا تین ڈگری زیادہ ہو جاتا ہے۔

(د) نوجوان مریضوں میں بخار اکثر اچانک بڑھ جاتا ہے۔ سانس میں تنگی ہو جاتی ہے اور کھانسی کی شکایت پائی جاتی ہے۔ نبض کی رفتار درجہ حرارت کے مقابلہ کم ہوتی ہے۔

دوسرا ہفتہ

(الف) مریض کو سستی و کسل مندی محسوس ہوتی ہے اور وہ بے حس سا اوندھے منہ پڑا رہتا ہے۔

(ب) تلی چھونے سے نرم محسوس ہوتی ہے اور دبانے سے دکھتی ہے۔ چوں کہ مرض کا حملہ آنتوں پر ہوتا ہے اس لیے شکم میں بے چینی پائی جاتی ہے اور وہ پھول جاتا ہے۔ قے و متلی کی شکایت ہوتی ہے۔ تلی اور جگر دونوں بڑھ جاتے ہیں قبض کی شکایت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

(ج) بخار بہت تیز ہو جاتا ہے جس کے ساتھ سر درد بھی پایا جاتا ہے۔ یہ بخار صبح کے وقت کم ہو جاتا ہے۔

(د) آٹھویں یا دسویں روز جسم پر سرخ دھبے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یہ جسم کے کسی حصہ پر بھی ہو سکتے ہیں لیکن عموماً ناف کے آس پاس، سینہ اور پیٹھ میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ان کو دبایا جائے تو ان کی سرخی غائب ہو جاتی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ دو تین روز میں ان کا زور کم ہو جاتا ہے۔ اگر مرض کا حملہ شدید ہے تو جسم پر خارش بھی ہوتی ہے۔

تیسرا ہفتہ

اگر مرض کا حملہ شدید نہیں ہوا ہے تو بخار میں کمی آ جاتی ہے اور خون کی سمیت بھی کم ہو جاتی ہے لیکن اگر حملہ شدید ہے تو خون کی سمیت بڑھ جاتی ہے۔ آنتوں سے جریان خون ہونے لگتا ہے یا وہ پھٹ جاتی ہیں۔ بہت شدید حالتوں میں پیچیدگیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جسم کے صالح رطوبات میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ مریض پر ہذیان اور غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔

چوتھا ہفتہ

اگر پیچیدگیاں شروع نہیں ہوئی ہیں تو چوتھے ہفتہ میں بخار کم ہو جاتا ہے۔ معمول کے مطابق بھوک لگنے لگتی ہے۔ زبان صاف ہو جاتی ہے۔ وزن بھی بڑھنے لگتا ہے لیکن مریض کو نقاہت و ضعف محسوس ہوتا ہے۔

اس مرض کا اشتباہ بعض اوقات دوسرے امراض سے ہوتا ہے لیکن اس مرض کی مخصوص تشخیصی علامات سے یہ مرض ممتاز ہو جاتا ہے جیسے سرخ دھبوں کا ظاہر ہونا، تلی کا بڑھ جانا، خون کا معملی امتحان کرنے پر دانوں میں کمی واقع ہونا، خون اور پیشاب و پاخانہ کی کاشت کرنے پر ان میں جراثیم کا پایا جانا وغیرہ۔ وڈال ٹیسٹ سے بھی اس مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے۔

پیچیدگیاں

اس مرض کی پیچیدگیوں کے نتیجہ میں گردے، جگر، پھیپھڑے، قلب اور اعصاب وغیرہ متاثر ہو جاتے ہیں لیکن اس کی سب سے عام اور خطرناک پیچیدگیاں آنتوں سے جریان خون کا لاحق ہونا اور ان میں سوراخ کا ہو جانا وغیرہ ہیں۔ عموماً ۲۵ فی صد اموات کا سبب یہی پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔

علاج اور حفظ ما تقدم

چوں کہ حمی معوی ایک متعدی مرض ہے اس لیے اس کے تلوث سے بچنے کے لیے مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنا ضروری ہے :

۱۔ اگر کسی شخص میں اس مرض کی مخصوص علامات پیدا ہونے لگیں تو دوسرے صحت مند شخص کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے بیمار کو علاحدہ جگہ منتقل کر دیں۔

۲۔ مریض کے فضلات کو بند برتن میں ڈال کر ضائع کر دیں اور اس پر مانع جراثیم دوا جیسے کریسول ۵ فی صد ڈال دیں۔

۳۔ مریض کے تیمار دار اور آس پاس رہنے والوں کو اپنی صفائی ستھرائی اور حفظان صحت کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

۴۔ مریض کے پاس سے واپس آنے کے بعد اپنا ہاتھ دھوئیں اور متعدی اشیا کو چھونے کے بعد بھی ہاتھوں کو اچھی طرح دھوئیں۔ بہتر یہ ہے کہ ربڑ کے دستانے استعمال کریں۔

۵۔ مریض کے بستر کی چادر اور تکیے وغیرہ پر مانع عفونت دوا کا چھڑکاؤ کریں۔

۶۔ کھانے والی اشیا کو کھلا نہ چھوڑیں اور انھیں مکھیوں سے بچائیں۔

۷۔ اپنے پڑوس میں کھلی جگہ پر کسی کو بھی رفع حاجت کی اجازت نہ دیں۔

۸۔ مریض کو پانی، دودھ اور غذائی اشیا کو چھونے کی اجازت نہ دیں۔

۹۔ اناج کو کھلا نہ چھوڑیں اور اسے کچا نہ کھائیں۔ دیگر غذائی اشیا کو بھی ڈھک کر رکھیں۔

۱۰۔ کسی دوسری جگہ سے حاصل شدہ پانی قطعاً استعمال نہ کریں۔

معمولات مطب

اس مرض کے لیے طب یونانی کا مندرجہ ذیل نسخہ عام طور پر استعمال کرایا جاتا ہے:۔

عناب ۵ دانہ، مویز منقیٰ ۹ دانہ، انجیر ۲ دانہ، خاکسی ۵ ماشہ پانی یا کسی مناسب عرق ۱۲ تولہ میں جوش دے کر چھالیں پھر مصری ۲ تولہ یا کوئی مناسب شربت ۲ تولہ ملا کر صبح و شام پلائیں۔ تقویت کے لیے خمیرہ مروارید (۳ سے ۵ ماشہ) دیا جاتا ہے۔ اگر قبض کی شکایت ہوتی ہے تو خمیرہ بنفشہ ۲ تولہ بڑھا دیتے ہیں، اگر کھانسی ہوتی ہے تو اسی نسخہ میں اصل السوس ۵ ماشہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اگر بخار بہت تیز ہوتا ہے تو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں استعمال کرائی جاتی ہیں یا برف کو چورا کر کے اور کپڑے میں رکھ کر مریض کے سر پر رکھواتے ہیں۔

حکیم عبدالجلیل صاحب نے اپنی کتاب "بچوں کا علاج" میں مندرجہ ذیل نسخوں کو بھی بہت مفید بتایا ہے۔

- مونیر منقیٰ ۹ دانہ، انجیر زرد ۹ دانہ، زعفران ۳ گرام سب کو پیس کر چنے کے برابر گولیاں بنالیں۔ ایک ایک گولی خاکسی کے جوشاندے کے ساتھ کھلادیں۔

۲۔ موتی خورد ۱۱ عدد، جاوتری ایک گرام، مونیر منقیٰ ایک دانہ، ورق طلا ارنصف عدد، سب کو کھرل میں پیس کر مونگ کے برابر گولیاں بنالیں۔ ایک ایک گولی صبح وشام کھلائیں۔

۳۔ کشتہ سنکھ تلسی کے پتوں کے شیرے کے ساتھ یا شیرہ مونیر منقیٰ کے ساتھ یا خمیرہ مروارید میں ملا کر کھلانا بھی بہت مفید ہے۔

مذکورہ بالا نسخوں کی مقدار خوراک بچوں کے لیے ہے۔ اگر بڑوں کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو ان کی خوراک میں اضافہ کرلیں اور مذکورہ نسخوں کے استعمال سے قبل کسی مستند حکیم سے مشورہ کریں۔ ●

بقیہ: تبصرہ

تقریباً تمام اساتذہ نے میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

اردو ادب میں تنقید کی ابتدا اور اس روایت کو آگے بڑھانے کا کام سب سے پہلے ہمارے تذکرہ نویسوں نے کیا۔ میر تقی میر نے بھی "نکات الشعرا" کے نام سے اپنے ہم عصر شعرا کا تذکرہ لکھا۔ خوشحال زیدی نے "مثنویاتِ میر"، "ہجویاتِ میر" اور میر کی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" کے علاوہ "نکات الشعرا" پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

کتاب کے آخر میں میر کے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے بارے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آرزو دراصل میر کے استاد بھی ہیں اور یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

کتاب مجلد اور خوب صورت انداز میں شائع کی گئی ہے۔ آفسیٹ کی طباعت اور عمدہ کاغذ نے بھی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔ البتہ پروف ریڈنگ میں رہ جانے والی غلطیوں کا احساس جگہ جگہ ہوتا ہے۔ ●

بقیہ: قوم

کے جذبات فروغ نہ پائیں وہ حقیقی معنی میں قوم نہیں ہوسکتی۔ صرف جغرافیائی وحدت ان جذبات کو جنم دینے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ان میں روحانی اور اخلاقی اتحاد کا ہونا بھی لازمی ہے خواہ خونی اتحاد ہو یا نہ ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روحانی اتحاد کیسے پیدا ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس آبادی میں اخلاقی، ثقافتی، مذہبی اور روایاتی قدریں ضرور موجود ہوں ورنہ مکمل اتحاد نہ ممکن ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان ایک متحد اور مربوط قوم کی اس تعریف پر پورا اترتا ہے۔ صدیوں سے ہم مشترکہ قدار کے حامل رہے ہیں اور آج بھی اتحاد و یکجہتی کے ورثہ دار بن کر ملک کو خوشحالی کی راہ پر آگے بڑھانے کے اہم کام میں منہمک ہیں۔ ●

بقیہ کور ۲: سافٹ ویئر ٹکنالوجی پارک

مہیا کر رہا ہے۔ ایس ٹی پی نوئیڈا کے ڈائرکٹر مسٹر پی ایس نرورا کے مطابق وہ بہت جلد سوچ کر ڈ ویڈیو کانفرنس کی سہولت فراہم کرنے والے ہیں۔

یہ سروسز نوئیڈا، دہلی، گوڑگاؤں اور ملحقہ شہروں میں دستیاب ہیں۔ جن جگہوں پر ایس ٹی پی آئی کا بنیادی ڈھانچہ موجود نہیں ہے، وہاں ودیش سنچار نگم لمیٹڈ نے سافٹ ویئر کی صنعت کی مدد کرنے کے لیے اپنی سروسز بڑھادی ہیں۔

ایس ٹی پی آئی سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، وہ انھیں پورا کر رہی ہے۔ سال ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۷۰۰ ملین امریکی ڈالر کی مالیت کے سافٹ ویئر کی برآمدات کی مالیت بڑھ کر ۱۵ر۱ بلین ڈالر ہوگئی اور اس کا تقریباً ۵۷ فی صد حصہ امریکہ کو برآمد کیا گیا۔ یوروپی ممالک کو صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہی برآمد کیا گیا۔ ایشیائی ممالک حال ہی میں ہندوستان سے سافٹ ویئر درآمد کرنے والے ملکوں کی فہرست میں شامل ہوئے ہیں۔ موجودہ صدی کے اختتام تک اس شعبے کو ۱۰ بلین امریکی ڈالروں کی آمدنی ہونے کی توقع ہے۔

لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ سافٹ ویئر ٹکنالوجی پارک اپنی خدمات، سروسز اور سادہ طریق کار کی بدولت سافٹ ویئر کی برآمدات بڑھانے کا ایک اہم ذریعہ بن گئے ہیں۔ ●

ایس۔اے۔حیات

چائے پیجیے

اس دور میں چائے بہت عام مشروب ہے۔ ہر فرد خواہ امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا، صحت مند ہو یا بیمار اور تعلیم یافتہ ہو یا جاہل چائے کا استعمال کثرت سے کرتا ہے۔ شہر ہو یا دیہات ہر گلی کوچے اور سڑکوں کے کنارے چائے خانہ پر چائے پینے والوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ کافی مقبول ہے۔ آج تو ہمارے معاشرہ کا یہ اہم جزو بن گیا ہے۔ آج ہر کس و ناکس کے یہاں مہمانوں کی تواضع چائے سے ضرور ہوتی ہے۔ یہ دیگر مشروبات کے مقابلہ میں کافی ارزاں پڑتا ہے۔ بھارت میں آسام اور دیگر مشرقی سرحدی صوبوں میں اس کے عمدہ باغات پائے جاتے ہیں جہاں اعلا معیار کی چائے تیار کی جاتی ہے۔

چائے کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات ہیں مگر تمام دانشوران اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا روس میں کارگاسوک نامی مقام سے ہوئی۔ وہاں کے باشندوں کی غذا نباتات تھی اور ان میں زیادہ تر لوگوں کا پیشہ بڑھئی گیری اور کاشت کاری تھا۔ سماج میں ان لوگوں کی بڑی وقعت تھی۔ کارگاسوک کے لوگ اپنی روزمرہ کی خوراک میں اس خمیری خامرے (زد) کا استعمال بڑے شوق سے کرتے تھے۔ عالموں کی رائے ہے کہ چائے کے استعمال سے وہاں کے لوگ تندرست ہوا کرتے تھے۔ ان کی عمریں دراز ہوا کرتی تھیں۔ وہاں کے لوگوں کی اوسط عمر ایک سو سال تھی۔ خون کا دباؤ (BLOOD PRESSURE) اور کینسر (CANCER) کا ایک بھی مریض وہاں نہیں پایا گیا۔ چناں چہ ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک جاپانی خاتون جب کارگاسوک پہنچی تو وہاں کے لوگوں کی صحت دیکھ کر وہ محوِ حیرت ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ وہاں ۸۰ سالہ خاتون کے چہرہ پر بھی جھریاں نہیں تھیں حتیٰ کہ وہاں ۱۳۰ سالہ مرد نے ۸۸ سالہ زن سے شادی رچائی۔ چائے مفید اجزا کا مرکب ہے۔ اس میں موجود پروٹین جسم پر فوری اثر کرتا ہے۔ یہ قدرت کی ایک نعمت ہے۔ بعض دانشوروں کی رائے ہے کہ چائے کا اول مرکز ۲۱۱ قبل مسیح (211BC) چین کی ایک ریاست میں پایا جاتا ہے وہاں یہ "اُمرتا کی دوا" کے نام سے موسوم تھی اور وہاں کے لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ چائے کے استعمال سے آدمی کی زندگی بڑھتی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ چائے روس کی سرحدوں سے پار کر کوریا، جاپان، چین، بھارت اور دیگر ممالک میں پہنچ کر تہلکہ مچانے لگی۔ ہر جگہ اسے کافی پسند کیا گیا۔ اب تو تقریباً تمام ممالک میں لوگ اس کی کارفرمائیوں سے اچھی طرح آشنا ہیں۔

جاپان کے ڈاکٹر پان پن نے اپنی دریافت سے یہ انکشاف کیا ہے کہ چائے میں وہ تین اہم اجزا موجود ہیں جو جسم کے لیے بہت مفید ہیں اور عمر درازی کے اسباب ہیں لہٰذا اس پر کافی تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ نئی کھوج سے دنیا کے عوام زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ ڈاکٹر پان پن نے اپنی دریافت کے پیشِ نظر بہت سی چونکانے والی اور متحیر کر دینے والی باتیں بتائی ہیں جن میں خاص خاص درج ذیل ہیں:۔

۱۔ چائے کے استعمال سے عمر دراز ہوتی ہے۔
۲۔ چیچک میں چائے مفید ہے۔
۳۔ خواتین کو چائے کے استعمال سے جھریاں نہیں پڑتی ہیں۔
۴۔ اس کے استعمال سے کینسر نہیں ہوتا۔
۵۔ عورتوں کا حیض بند نہیں ہوتا ہے۔
۶۔ آنکھوں کی بینائی ٹھیک رہتی ہے۔
۷۔ چائے کے استعمال سے پیروں میں قوت آتی ہے۔
۸۔ چائے کا استعمال گٹھیا میں افاقہ کرتا ہے۔
۹۔ جوڑوں کے درد میں اس کا استعمال مفید ہے۔
۱۰۔ خون کا دباؤ چائے کے استعمال سے ٹھیک رہتا ہے۔
۱۱۔ موتیا بند کے مریضوں کو چائے پلانے سے روشنی میں اضافہ ہوتا ہے۔
۱۲۔ امراضِ قلب کو چائے روکتی ہے۔
۱۳۔ قوت ہاضمہ میں چائے اضافہ کرتی ہے۔
۱۴۔ بے خوابی کو چائے دور بھگاتی ہے۔
۱۵۔ امراضِ جگر اور پیٹ کی بیماری کو چائے ٹھیک کرتی ہے۔
۱۶۔ یہ سستی کو دور بھگاتی ہے۔
۱۷۔ بالوں کا سفید ہونا یہ روک دیتی ہے۔

باقی صفحہ ۱۳۰ پر

اعزازی سکریٹری۔ اسٹڈی سینٹر، گیا (بہار)

اسلوب اور صحافت

اسلوب ایک انگریزی لفظ STYLE کا اردو ترجمہ ہے جس کا مطلب طرز بیان، انداز بیان اور لب و لہجہ کے ہیں جو باتیں طرز بیان سے متعلق ہوں انھیں اسلوب کہا جاتا ہے۔ انگریزی محاورہ ہے کہ STYLE IS THE MAN یعنی کہ آدمی اپنے انداز سے پہچانا جاتا ہے اس طرح سے اسلوب بیان کو اظہار شخصیت کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔ فارسی کی ایک مثل ہے "از کوزہ ہماں تراود کہ درون اوست" یعنی کوزے سے وہی کچھ ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔

اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے جارج بفن نے کہا ہے کہ "اسلوب خود انسان کی شخصیت ہے" یہ تعریف اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے کیوں کہ یہ خود تعریف کی محتاج ہے اسی طرح سے اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے پوپ نے کہا ہے کہ "اسلوب خیال کا لباس ہے" بعض لوگ اسے زبان کے تکنیکی پہلو سے متعلق کر کے اس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں حالاں کہ اسلوب کا جتنا تعلق ہیئت سے اتنی ہی مواد سے بھی ہے۔ اسلوب کی ایک مختصر اور جامع تعریف کچھ اس طرح سے بھی کی جا سکتی ہے کہ زبان اور خیال کا ذاتی طریق اظہار ہی اسلوب کہلاتا ہے۔

ہر شخص اپنی بات اپنے طریقے سے کہتا ہے جس طرح دنیا میں دو آدمی بالکل ایک شکل کے نہیں ہوتے اسی طرح اسلوب بھی ہر ایک کا یکساں نہیں ہوتا بلکہ سب کے الگ الگ ہوتے ہیں کیوں کہ ہر شخص میں انفرادیت ہوتی ہے اور یہ انفرادیت اس کی ذہنی تخلیقات میں بھی اپنے طور پر ظاہر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہی نقطۂ نظر کے ماننے والے اپنی اپنی بات اپنے اپنے انداز سے کہتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ادب میں بعض چیزیں مشترک ہیں لیکن اس کے باوجود مصنف کی کچھ خصوصیات اپنی ہوتی ہیں جو ایک ہی ملک، ایک ہی خطہ اور ایک ہی زبان کے ہوتے ہوئے بھی مختلف ہوتی ہیں اس کی کئی وجہیں بنتی ہیں، ایک یہ کہ ایک ہی خیال مختلف لوگوں کے ذہن میں مختلف طریقے سے آتا ہے۔ دوسری وجہ، یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلوب پر علاقہ اور ماحول کا اثر پڑتا ہے اور تیسری وجہ یہ کہ الفاظ کا انتخاب ترکیبوں کا التزام اور جملوں کی ساخت ہر فنکار کی اپنی ہوتی ہے ان ہی سے اسلوب بنتے ہیں اور انہی سے اسلوب میں انفرادیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں ایک عنصر اور بہت اہم ہے اور وہ ہے ادب کا مواد اور ادب کے قاری۔ یہ حقیقت ہے کہ جیسا مواد ہوگا ویسے ہی اسلوب بنے گا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعر اور ادیب اپنے قارئین کو ذہن میں رکھتے ہوئے ادب کی تخلیق کرتے ہیں تو گویا کہ اسلوب کی تشکیل میں مواد کے ساتھ قاری بھی معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

صحافت ایک مسلسل ہنر ہے جس میں آئے دن نت نئے خیالات، واقعات، حوادث، افکار اور تجربات سے سابقہ کرنا پڑتا ہے اس کی ہر بات میں ایک نیا پن ہوتا ہے اور ہر معاملہ میں کوئی خاص نوعیت ضرور جلوہ نما رہتی ہے۔ کئی مصنفوں نے صحافت کی تعریف مختلف انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہیں۔ میا تھیو آرنالڈ نامی مشہور انگریزی ادیب صحافت کی تعریف یوں کی ہے۔

JOURNALISM IS LITERATURE IN A HURRY یعنی صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے۔ صحافی اس تعریف سے اتفاق نہیں کرتے کیوں کہ یہ تعریف اپنے آپ میں بہت ناقص ہے۔ صحافت کی جامع تعریف فن صحافت کی ایک عمدہ کتاب جس کا نام "ایکسپورنگ جرنلزم" ہے اس میں کچھ اس طرح سے ہے

JOURNALISM IS THE SYSTEMATIC AND RELIABLE DESSEMINATION OF PUBLIC INFORMATION, PUBLIC OPINION AND PUBLIC ENTERTAINMENT BY MODERN MASS MEDIA OF COMMUNICATION.

"یعنی صحافت جدید وسائل ابلاغ کے ذریعہ، عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے"

غور سے دیکھا جائے تو ادب ایک علاحدہ

روم نمبر ۱۳۶، ستلج ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

شے ہے اور صحافت ایک بالکل جدا میدانِ عمل، دونوں کے درمیان ایک واضح خط کھینچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ادبی تحریروں میں ایک ادیب اپنے ہی نظریات، خیالات اور احساسات کا عکس پیش کرتا ہے جب کہ ایک صحافی اپنی ہم عصر دنیا کی ترجمانی کرتا ہے، اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہے، تازہ رائے عامہ کی نباضی کرتا ہے وہ مختلف زاویۂ نگاہ کی نمائندگی کرتا ہے، متعدد اندازِ فکر کا جائزہ پیش کرتا ہے، جدا جدا جذبات کا نچوڑ قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔

ادب کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں جب کہ صحافت کو ہمیشہ وقت کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا پڑتا ہے ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کی تاخیر سے کام بگڑ سکتا ہے ایک ایک لمحہ کی اپنی خاص اہمیت اور وقعت ہوا کرتی ہے۔ صحافت درحقیقت وقت کے ساتھ ایک جنگ ہے جو ہر اخبار کے دفتر میں ہر دن اور ہر گھڑی لڑی جاتی ہے صحافت ایک نہایت ذمہ دارانہ پیشہ ہے جس میں دماغی صلاحیتوں کی ضرورت ہے اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے اس میں اخلاقی اور جسمانی جرأت کی بھی ضرورت پڑتی ہے اسے ایک آرام طلب اور راحت افزا کام تصور کرنا غلط فہمی ہے۔ یہ ایک محنت طلب فن ہے جو پوری سنجیدگی سے برتی جاتی ہے۔

یہ فن صرف کتابوں کے صفحات سے نہیں سیکھا جا سکتا ہے اس فن میں مہارت کسی کلاس روم کی چار دیواری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کی جا سکتی ہے یہ فن تجربہ کی بھٹی میں جل کر نکھرتا ہے کتابیں راہ تو دکھا دیں گی لیکن راہ پر چلنا اور منزل پر پہنچنے کی کوشش کرنا راہی کا فرض ہے۔ صحافت ایک وسیع میدانِ عمل ہے۔ کچھ صحافی اس مقدس پیشہ کو ایک مکمل روزگار کی طرح اپناتے ہیں اور ورکنگ جرنلسٹ (WORKING JOURNALIST) کہلاتے ہیں۔ کچھ اس مصروفیت کو جزو وقتی طور پر اپناتے ہیں اور کچھ اسے شوقیہ طور پر اپنا کر اسے ذاتی شہرت کا ایک وسیلہ بناتے ہیں یا فرصت کے اوقات میں تھوڑا بہت کما لینے کا آسان ذریعہ بنا لیتے ہیں انھیں آزاد صحافی یا فری لانس جرنلسٹ (FREE LANCE JOURNALIST) کہا جاتا ہے۔

اسلوب اور صحافت کے بنیادی مباحث کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ صحافتی اسلوب کی کیا خوبی ہے، کیا انفرادیت ہے اور یہ کہ صحافت کے اسلوب کیسے ہونے چاہئیں۔ جب ہم صحافت میں اسلوب کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب مشترکہ اسلوب نہیں بلکہ انفرادی اسلوب ہے جس میں ہماری تہذیب اور روایت کے ساتھ اپنا ایک صحافتی انداز ہوتا ہے اور یہی انداز "صحافتی اسلوب" کہلاتا ہے۔ صحافتی اسلوب ایک انفرادی اسلوب کا احاطہ کرتا ہے اسی لیے اسلوب کی تشکیل میں جہاں اور بہت سے عناصر کارفرما ہیں وہیں کئی چیزیں بڑا اہم فریضہ ادا کرتی ہیں۔

صحافتی اسلوب کے ان بنیادی اصول وضوابط کے علاوہ صحافیوں پر کچھ اور فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جس کی پاسداری ازحد ضروری ہے وہ یہ کہ صحافی وہی الفاظ اور اصطلاحات زیادہ سے زیادہ استعمال کرے جو متعلقہ زبان کے عام قارئین بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ آسان لفظ کو رقیق لفظ پر ترجیح دی جائے، عام فہم لفظ کو منتخب کرکے خالص ادبی یا تکنیکی لفظ سے پرہیز کیا جائے، مبہم الفاظ سے احتراز بہت ضروری ہے ویسے تو ہر زبان قابلِ فہم ہے لیکن صحافتی زبان کو ہر لحاظ سے قابلِ فہم ہونا ہی چاہیے۔ ایسے ثقیل الفاظ یا سکڑے ہوئے الفاظ نہ استعمال کیے جائیں جس سے عام قاری کو دشواری محسوس ہو، ہمیشہ مروّج اصطلاحات ہی کو جگہ دی جائے، الفاظ تیز یا روکھے نہ ہوں، جملے مختصر ہوں اور جملوں کی ساخت میں چستی ہو۔ انگریزی الفاظ یا غیر معروف نام لکھتے وقت زیر، زبر اور پیش کے استعمال سے الفاظ کو وضاحت کرنا چاہیے صحافتی اسلوب کا بیک وقت قوی اور موثر ہونا بھی ازحد ضروری ہے۔

ادبی اور صحافتی زبان میں بڑا فرق ہے ادبی زبان فکر انگیز، خوب صورت امتیازی اور جاذبِ نظر ہوتی ہے جب کہ صحافتی زبان پرلطف، معلوماتی، جامع، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ صحافی چھوٹے چھوٹے پیراگراف پسند کرتے ہیں۔ عموماً کسی بھی پیراگراف میں چار یا چھ سطریں دی جاتی ہیں طویل پیراگراف خصوصی مقالات میں بھی حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اخبار کی بھی سطریں حتی الامکان مختصر لکھی جاتی ہیں۔ تخلیقی ادب لکھنے والے ایک ایک جملہ میں ۵۰ سے لے کر ایک سو الفاظ تک استعمال کرتے ہیں جب کہ صحافت میں بہت ہی کم الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جملوں کی طوالت میں زیادہ وقت لگتا ہے جس سے لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کو کوفت ہوتی ہے۔

اسلوب تو ہر ادب اور ہر اصناف کے اپنے ہوتے ہی ہیں لیکن صحافتی اسلوب سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ صحافت اپنے اسلوب کے ذریعہ کبھی دماغی قوتوں کو چھیڑتی ہے تو کبھی احساس کے آبگینوں کو جان بوجھ کر ٹھیس لگاتی ہے۔ لکھنے والا کبھی اطلاعات فراہم کرتا ہے تو کبھی قارئین کے اندازِ فکر پر حاوی ہونے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ پڑھنے والوں کی تفریح کے لیے یا ہنسنے ہنسانے کے لیے بھی صحافیوں کی کمی نہیں، لیکن بسا اوقات صحافی اپنے اسلوب کی مدد سے عوام کو کسی خاص تحریک کی حمایت پر اکساتا ہے اور کبھی اس کے برعکس کسی تحریک کی مخالفت پر آمادہ کرتا ہے۔ صحافتی اسلوب میں وہ طاقت ہے کہ جس کو چاہے بامِ عروج تک پہنچا دے اور جس کو چاہے مٹی میں ملا دے

صحافی افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کی طرح تخیلات کی دنیا میں پرواز نہیں کرتے وہ حقائق سے قریب رہتے ہیں وہ چشم دید حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ زمان اور مکان سے قربت کے قائل ہیں نظریات اور خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں مگر ایسے نظریات کا جدید اور تازہ ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ماضی سے زیادہ حال اور مستقبل کے مورخ ہوتے ہیں۔ سائنس داں اپنی تحقیقات کے لیے LABORATORY میں مصروف

باقی صفحہ پر

م۔ق۔خان

وقت کی صلیب

مُنّا ابھی صاف صاف نہیں بول پاتا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ توتلی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ، جیسے ممّی، پپّا، دادا، ہی تو ادا ہوتے ہیں۔

لیکن اس کی صاف شفاف آنکھوں میں، اس کے گول مٹول چہرے پر ساری باتیں اپنا عکس چھوڑ جاتی ہیں، ان پر وہ ساری کیفیت سارے جذبات کندہ ہوتے ہیں جنہیں وہ ابھی اپنی زبان سے اظہار نہیں کر سکتا، جنہیں وہ الفاظ و صوت کا پیکر نہیں عطا کر سکتا۔

ابھی ابھی وہ کمرے سے نکل کر چوکھٹ کے باہر کوریڈور کے بیچ فرش پر لیٹ گیا ہے۔ وہ رہ رہ کر کنکھیوں سے ماں کو دیکھ لیتا ہے اس کی آنکھوں میں ممتا کی باہوں میں جھولنے کی پیاس ہے — غصہ بھی ہے اور خوف بھی!

ذکیہ قدِ آدم آئینے کے پاس بیٹھی تھی۔ مُنّا پہلے سے ہی ذرا بھنّایا ہوا تھا کیوں کہ اس کی آنکھیں اپنے پپّا کو ڈھونڈ کر تھک چکی تھیں۔ دادی امّی جو قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ ان کے پاس سے بھی جھڑکی ہی سن کر آیا تھا۔ ان تمام باتوں کے بعد وہ اپنی ممّی کے پاس آیا تھا اور آتے آتے وہ ماں کے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالنے لگا تھا...

لیکن... ماں...؟

ماں مجبور تھی۔ یہ تو آنے والے مہمان کا حصہ ہو چکا تھا۔ ذکیہ نے منّا کے ہاتھ میں ایک کنگھی پکڑا دی اور اپنا میک اپ درست کرنے لگی۔

ایک زوردار چھناکے کی آواز نے ذکیہ کو چونکا دیا۔ منّے نے پونڈس کے کریم کی شیشی فرش پر گرا دی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے پر کریم کا گھرا لیپ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا اور ساری کریم اور شیشے کے ٹکڑے بکھرے تھے۔

وقت کو آگے بڑھنے کی جلدی تھی اور ذکیہ وقت کے اڑان بھرتے پنچھی کو مٹھی میں مقید کرنا چاہتی تھی۔ ذرا سی دیر ہو جاتی تو پرنسپل کی پیشانی پر بل آجاتے۔ آنکھیں سمٹ جاتیں، وقت کی قیمت اور پابندی پر اُسے لکچر سننا پڑتا تھا۔ دس بج چکے تھے۔ دس بج کر ۵۰ منٹ کے بعد فوراً اس کا کلاس تھا۔ بس اسٹاپ پر اُسے بس کے لیے کتنی دیر تک انتظار کرنا ہوگا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

سوچا تھا ایک اسکوٹر خرید لے گی لیکن چیزوں پر آئے دن کی بڑھتی قیمت سے اس کے سارے سپنے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ اس کے ڈیڈی اپنے ہونے والے داماد کو اسکوٹر دینے کا ارادہ رکھتے تھے — کاش یہی ہوتا!

لیکن اس میں تو خود اسی کا قصور تھا۔ ذکیہ نے ظفر سے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کی تھی اور ماں باپ نے جہیز کے بہت سارے سامان میں کٹوتی کر دی تھی — ظفر نے شادی کے پہلے کوئی شرط تو رکھی نہیں تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر والدین نے بہت سی چیزیں اس کی دوسری جوان ہوتی بہن نفیسہ کے لیے رکھ لی تھیں۔ ذکیہ کو محبت کا سودا مہنگا پڑا لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ محبت تو ایثار و قربانی چاہتی ہی تھی — یہی کیا کم تھا کہ دونوں کے والدین اس شادی کے لیے کسی طرح راضی ہو گئے تھے۔

ذکیہ نے منّا کو ڈانٹا تھا "ایڈیٹ، تم نے یہ کیا کر لیا ہے؟" وہ بلک کر ذکیہ کے کپڑوں سے لٹک گیا — اس کے چہرے اور ہاتھ میں لگی کریم سے ذکیہ کے کپڑے بھی گندے اور داغدار ہو گئے۔ ذکیہ کی برداشت کا دامن تار تار ہو گیا اور اس نے منّا کے گال پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ منّا گال سہلاتا، سسکیاں لیتا، وہاں سے ہٹ کر دہلیز کے پار، احتجاج میں فرش پر لیٹ گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں بے پناہ غصہ اور احتجاج تھا — جن کے اظہار کے لیے اس کے پاس زبان تھی نہ الفاظ — صرف اس کا گول مٹول چہرہ تھا یا صاف شفاف آنکھیں — یا سسکیاں — وہ روتا تو تھا ہی نہیں — وہ شاید رونا بھول چکا تھا — یا عین ممکن ہے روتے روتے اس کی آنکھوں کے آنسو اور گلے کی آواز خشک اور بند ہو چکی تھی۔ منّا کا یہ دیرینہ تجربہ تھا کہ رونے کا

حکیم عنایت کالونی، گیا۔ ۸۲۲۰۰۱

کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوتا۔

منّا کے پاس زبانِ گویا ہوتی، اپنے جذبات کے اظہار کی صلاحیت ہوتی تو وہ ضرور کہتا —"ابھی تو میں بہت چھوٹا ہوں دوسرے کی کیا جلدی تھی؟ کیا ضرورت تھی؟"

لیکن وہ معصوم کیا جانتا ہے کہ ساری باتیں ضرورت کا انتظار نہیں کرتیں — کچھ آپ ہی آپ ہو جاتی ہیں، انہیں محض اتفاق کہا جانا چاہیے — اس میں کسی کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔

ذکیہ بھی کیا کر سکتی تھی؟ اب وہ کنواری نہیں تھی، نن، راہبہ یا بھکشونی بھی نہیں تھی — ظفر کو بھی کیا کہتی؟ ظفر کا بھی اس میں کیا قصور تھا؟ سارا قصور تو خود اسی کا تھا۔ لیکن اس کا بھی کیا قصور تھا؟ اپنی مشغولیت میں وہ CONTRACEPTIVF وقت پر کھانا بھول گئی تھی۔ کبھی کبھی دوا کا ناغہ ہو جانا لازمی تھا کہ ذہن میں انتشار ہو تو یادداشت پر گرفت ڈھیلی پڑ ہی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ تھا کہ ابھی منّا مشکل سے دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ منّا کا دوسرا برتھ ڈے دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ دوسری زندگی پروان چڑھنے لگی — اپنے وجود کا ٹھوس ثبوت دے رہی تھی — دوسرے مہمان کی آمد آمد کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

ذکیہ نے کئی بار ارادہ کیا اس بن بلائے مہمان سے چھٹکارا حاصل کر لے اور اس کے لیے اسقاط حمل ہی ایک واحد راستہ تھا، لیکن اس کے لیے بھی کئی مراحل اور مسائل پیشِ نظر تھے۔ فرصت چاہیے، پیسے چاہییں تھے، اپنے گھر والوں کے ماحول اور خیالات کا سوال بھی تھا، ساتھ ہی ایک زندگی — اپنے خون سے بنی ایک زندگی کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کا سوال تھا — وہ ایک متوسط طبقہ کی فرد تھی جہاں ساری چیزیں یوں دیکھی جاتی ہیں۔

دونوں کماتے ضرور تھے لیکن پھوٹی کوڑی نہیں بچا پاتے تھے۔ منّا کے دادا ابّا کو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینا اور شطرنج کھیلنا ہی تو رہ گیا تھا۔ صبح سے آدھی رات تک پچاس پیالی چائے کا خرچ تھا۔ دوسری جانب منّا کی دادی اماں کو ہر دو مہینے کے بعد بیمار پڑنا جیسے روٹین تھا۔ انھیں پرہیز کرنے کی ہدایت کرنے کی کسے ہمت تھی اور ان کی بیماری کا مطلب ڈاکٹر کی فیس، دواؤں کی قیمت، سہیل اور ظفر کی دو شادی شدہ بہنوں کی آمد، ان کے بچوں کی دھما چوکڑی۔ عیادت میں آنے والوں کی خاطر و مدارات —!

ظفر کی چھوٹی بہن نازیہ — اُسے تو بس کالج جانا اور اس کے بعد آرٹس اسکول کا چکر لگانا تھا۔ باقی وقت میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ بند ہو کر گپ شپ کرنا تھا — ذکیہ سوچتی گھنٹوں کمرے میں بند یہ لڑکیاں کیا کرتی ہیں؟ کیا راز و نیاز ہے کہ جس کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں — کبھی بھولے سے بھی جو منّا کو گود اٹھا لیا ہوتا — کیسے گود اٹھا لیتی —؟ منّا کے گندے ہاتھ پاؤں سے اس کے کپڑوں میں داغ لگ جاتے۔ منّا بھی باہیں پھیلا کر اس کی جانب بڑھتا تو وہ چیخ کر یوں پیچھے ہٹ جاتی جیسے منّا ایک معصوم بچہ نہیں غلاظت کی ایک گٹھری ہو!

ظفر کا چھوٹا بھائی شاہد — اس سے منّا کسی قدر مانوس تھا اور منّا کے لیے اس کے دل میں بھی بڑی شفقت تھی۔ لیکن وہ گھر میں ٹکتا ہی کب تھا۔ غریب ٹکے بھی کیسے؟ ایک تو گھر کا سودا سلف لانے میں اس کا کافی وقت صرف ہو جاتا، دوسرے جب وہ گھر پر ہوتا تو ابّا حضور اُسے دوڑاتا ہوا پہیہ بنانے پر تُلے رہتے "جاؤ مرزا کو بلا لاؤ" "انھیں شطرنج کھیلنے کے لیے ساتھی چاہیے، اس کے بعد "یہ دوا لے آؤ، اس دوا کو واپس کر دو، وہ کتاب نواب صاحب سے مانگ لاؤ اور یہ خط خانصاحب کو دے آؤ" اتنی ہی باتیں ہوتیں تو بھی شاید وہ گھر سے یوں نہ بدکتا۔

ہر دو تین دنوں کے بعد اس کے کپڑوں اور اس کے بال پر سخت تنقید ہوتی۔ وہاں بیٹھے لوگوں کے سامنے آج کے نوجوانوں کا مضحکہ اڑایا جاتا — اور تو اور — کہیں ان کی نظر شاہد پر اس وقت پڑ جاتی جب منّا اس کی گود میں ہوتا تو ابّا حضور فرماتے "عزیزم! بچے سے آپ کو کیوں اس قدر انسیت ہے کہ گود میں اٹھائے پھر رہے ہیں؟ اس طرح بچے کمزور ہو جاتے ہیں — ان میں اپنے پیروں سے چلنے کی طاقت پروان نہیں چڑھ پاتی۔ ایسے بچوں میں آگے چل کر خود اعتمادی نہیں پنپ پاتی۔

اب اس عمر میں ابّا حضور کو کون سمجھاتا کہ خود اعتمادی پیدا کرنے کی یہ عمر نہیں ہوتی۔ ابّا حضور کو کوئی بہانہ ملنا چاہیے، ذکیہ انھیں یہ موقع دینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہنگامہ برپا کریں۔ وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لیتی تھی۔

گھر میں رہ گئے ظفر، تو ان کے سر میں اپنے پروموشن کا ایسا سودا سمایا ہوا تھا کہ ہر وقت اپنے باس کی خوشامد اور چاپلوسی میں سرگرداں رہتے۔ صبح و شام اپنے باس کے گھر کا پھیرا لگانا ان کا پہلا کام تھا۔ ویسے گھر پر وہ جتنی دیر رہتے ان کی دلچسپی منّا سے ضرور ہوتی۔ ایسے میں ٹولے پڑوس سے کوئی معمر عورت آ جاتیں تو ظفر کی امی انھیں پاس بٹھا کر چھالیہ کترتی جاتیں اور سناتی رہتیں "دلہن زمانہ کیسا بدل گیا ہے! ظفر میاں ہیں کہ دن رات بیوی بچے سے چپکے بیٹھے ہیں۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ ظفر کے ابّا فجر کی نماز کی اذان سن کر باہر نکلتے تو پھر شاید عشاء کی نماز کے بعد ہی زنانخانے میں قدم رکھتے اور وہ بھی تب کہ گھر میں کوئی مہمان نہ ہوتا اور سارے لوگ سو چکے ہوتے۔ گود میں بچہ —! مجال تھی کہ ان کا کوئی بڑا موجود ہو اور وہ اپنے کسی بچے کو گود اٹھا لیں — گود لینا تو در کنار، بچے کو انگلی بھی نہیں پکڑا سکتے تھے — اور اب باپ نہ ہوئے بچے کے لیے دائی کھلائی ہوئے۔۔۔!"

ذکیہ ان باتوں کو سن کر اندر اندر کڑھتی لیکن وہ کیا کہتی؟ اس پر تو ایک سنگین الزام تھا کہ اس نے ظفر کو دامِ محبت میں پھانس لیا ورنہ ظفر کی شادی تو پروین سے، ظفر کی

باقی صفحے پر

تبصرے

نام کتاب : امراض العین
مصنف : حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی
سالِ اشاعت : ۱۹۹۶ء
صفحات : ۳۶۰
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : فکر و فن پبلیشرز اینڈ بک سیلر۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

مبصر : شبّر امام

محترم حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی کی تصنیف "امراض العین" ۳۶۰ صفحات اور ۱۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے امراض چشم کا علاج، ان امراض کا ذکر جو آنکھ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان علاماتِ مرض کی نشان دہی جو آنکھ میں ظاہر ہوتی ہیں اور فعل بصارت پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے ہر ایک باب میں آنکھ کے اقسام مرض کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

علم العین کا واضح نظریہ ابوالطب بقراط سے ملتا ہے۔ بقراط و جالینوس نے بہت سے امراضِ چشم کا ذکر کیا ہے۔ مشہور زمانہ ماہر امراض چشم حنین بن اسحاق العبادی اور کنیت ابو زید نے متعدد مقالے لکھے، کئی کتابیں تصنیف کیں اور ساتھ ساتھ بہترین مترجم بھی تھا۔ وہ فصیح و بلیغ مقرر اور اعلا درجہ کا شاعر بھی تھا۔

ابتدائی دور میں طب مذہبی ہستیوں سے وابستہ رہی اور ان ہی لوگوں کی میراث تھی۔ علم طب مذہبی پابندی اور خاندانی وراثت کے باعث فروغ نہ پا سکا اور بقراط نے قید و بند سے اس فن کو آزاد کیا۔ حکیم خورشید احمد صاحب کے کاوشوں اور نگارشات سے اساتذہ کرام، طلبا و طالبات اور عوام و خواص کے لیے کتاب مفید ثابت ہوگی۔ مصنف کی تصنیف نصابی ضرورت کے ساتھ معلوماتی پیش رفت ہے۔

"امراض العین" میں ادویہ کے ساتھ سرجری کو بھی بڑا دخل ہے۔ موجودہ دور میں سرجری کے علم کو مستقل فن کی حیثیت دے کر بہت ترقی دی گئی ہے۔ مصنف کی کتاب Asua، (سرجن) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں امراض العین کے اسباب، علامات اور علاج کے ساتھ ہی ساتھ نسخہ بھی تجویز کیا گیا ہے۔ یہ طب یونانی میں ایک جدید تحقیقاتی اضافہ ہے جس میں قدیم و جدید کی خوبیاں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امراض العین نصابی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ شب و روز کی عملی زندگی میں کام آنے والی معلوماتی کتاب ہے۔

مصنف نے طلبا، اساتذہ اور عام عاملین فن کے ذوق مطالعہ کے لیے گراں قدر عطیہ سپرد کیا ہے۔

حکیم شفقت اعظمی صاحب کی تصنیف معالجاتی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ یہ مفید اور گراں قدر کتاب "سینٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن" کے نصاب میں داخل کیے جانے کے قابل ہے۔

کتاب کا سرِ ورق دیدہ زیب اور کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ قیمت بھی معقول ہے۔ مصنف کے ذوق اور فنی صلاحیت کو دیکھ کر دل سے داد نکلتی ہے۔ مجھے یقین ہے "امراض العین" عام و خاص میں مقبول ہوگی اور لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں گے۔

●

نام کتاب : میر تقی میر شخصیت اور فن
مصنف : ڈاکٹر خوشحال زیدی
قیمت : ۱۲۵ روپے
ناشر : "بزمِ خضرِ راہ" ۸۰۔ انتظار لاج، غفار منزل ایکسٹینشن جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵

مبصر : عادل اسیر دہلوی

زیرِ نظر کتاب "میر تقی میر شخصیت اور فن" ڈاکٹر خوشحال زیدی کی نئی تصنیف ہے جس میں میر تقی میر کی شخصیت کے تعلق سے مختلف تذکرہ نویسوں کے تاثرات کے علاوہ "میر کا غم"، "میر کا تصورِ عشق"، "میر کا فن"، "میر کی زبان"، "میر کی شاعری میں ہندی عناصر" جیسے عنوانات کے تحت میر کی شاعری اور شخصیت کا اجمالی طور پر ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

میر کی شاعری اردو ادب کا عظیم ترین سرمایہ ہے۔ میر کے ہم عصر شعرا کے علاوہ اردو کے

باقی صفحہ ۳۱ پر

غـــــــــزلیں

بیدل سرحدی

پہلے خودی کی تہہ میں اُتریں پھر خود کو خوددار بنائیں
خاموشی کو مقصد بخشیں تب اس کو گفتار بنائیں

جیون کو آدرش بنائیں ترک کریں فرسودہ رسمیں
آنے والی نسل کو جس پر فخر ہو وہ کردار بنائیں

اجلا اجلا چہرہ چہرہ نکھرا نکھرا دامن دامن
عرفاں کی ہم جوت جلا کر تن من کو ضوبار بنائیں

مل جل کے ہم رہنا سیکھیں دور کریں بیگانے پن کو
پیار علیمی اور عمل کو جیون کا آدھار بنائیں

کانٹوں کو بھی عطا کریں ہم پھولوں کا انداز تبسم
بغض و حسد کی دھرتی کو ہم چاہت کا گلزار بنائیں

کبھی نہ اپنا ہاتھ پساریں کبھی نہ لیں احسان کسی کا
خودداری پر حرف نہ آئے خود کو یوں خوددار بنائیں

کون ہے اپنا کون پرایا مکر و ریا کی اس دنیا میں
کس کو اب غم خوار کہیں ہم کس کو اپنا یار بنائیں

خلق خدا کی خدمت کرنا جن کا نصب العین ہو بیدل
ایسے خدمت گار نہیں ہم ایسے خدمت گار بنائیں

نگہبان شعبۂ اشاعت، سنت نرنکاری منڈل، دہلی۔۹

اختر شاہ جہاں پوری

خیالِ منزلِ دشوار رکھتا ہے
کہ وہ بھی اک نہ اک آزار رکھتا ہے

لرز جاتا ہے میرا پیکرِ خاکی
وہ جب سر پر مرے دستار رکھتا ہے

مری جب دائرہ بننے کی خواہش ہو
مجھے منت کشِ پرکار رکھتا ہے

وہ چمکا تا تو ہے سورج مرے سر پر
مگر سایہ پسِ دیوار رکھتا ہے

نہیں کچھ فاصلہ رکھتا وہ ملنے میں
مگر حائل انا دیوار رکھتا ہے

ضرورت کیا نقیبِ صبح کی مجھ کو
مرا ہمزاد جب بیدار رکھتا ہے

ہماری ہی طرح وہ بھی تو اختر
لبِ گویا پئے اظہار رکھتا ہے

رنگین چوپال۔ شاہجہاں پور۔ ۲۴۲۰۰۱ (یوپی)

طاہر اسلم صابر

میری دنیا تھی اندھیری روشنی کے بعد بھی
دوریاں قائم تھیں ربطِ باہمی کے بعد بھی

بعد از ترکِ تعلق بھی تعلق کی امید
روشنی کی آس مجھ کو تیرگی کے بعد بھی

کوئی اک دو گھونٹ پی کر بے خود و سرشار مست
کوئی تشنہ عمر بھر کی مے کشی کے بعد بھی

برخلافِ جادۂ میخانہ اٹھتے کیوں قدم
میں بہت کچھ ہوش میں تھا بے خودی کے بعد بھی

سادہ سادہ سا نظر آتا ہے صابر کیا کہوں
زندگی کا ہر ورق خانہ پُری کے بعد بھی

●

۲۲۳۶، ڈ کوتانا اسٹریٹ، ترکمان گیٹ۔ دہلی۔۶

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

دیہی علاقے اور روزگار

● ہمارے آئین میں مملکتی پالیسی کے ہدایتی اصولوں کے مطابق ملک بھر میں نچلی سطح پر جمہوری اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا۔

● آئین کی دفعہ ۴۰ میں کہا گیا ہے: "مملکت دیہی پنچایتوں کے قیام کے لیے ضروری اقدامات کرے گی نیز انھیں ایسے ضروری اختیارات فراہم کرے گی، جن سے وہ سیلف گورنمنٹ کے طور پر کام کر سکیں۔

● جمہوریت کے اصولوں کے مطابق، جمہوری لامرکزیت کو ملک میں منصوبہ بندی کے عمل کی کلید کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا چنانچہ پنچایتی راج کے اداروں کو آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کا قانون مجریہ ۱۹۹۲ء وضع کر کے تمام سطحوں پر مستحکم بنایا گیا تھا۔

● پائیداری، تسلسل نیز درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبیلوں اور خواتین کے لیے ریزرویشن کے سلسلے میں مناسب اہتمام کر کے پنچایتی راج کے اداروں کو آئینی حیثیت دی گئی ہے۔

● آبادی کے تناسب سے دیہی پنچایتوں اور ضلع پنچایتوں کی سطح پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کے لیے دیہی پنچایتوں اور ضلع پریشدوں کے لیے باقاعدہ تخصیص کرنے کے سلسلے میں مناسب انتظامات کیے گئے ہیں۔

● مقامی ٹیکس لگانے، وصول کرنے اور ان میں مناسبت پیدا کرنے کے اختیارات کے ساتھ ان منتخبہ اداروں کو ۵ سال کی واضح مدت فراہم کی گئی ہے۔ پنچایتوں کو معاشی ترقی اور سماجی انصاف سے متعلق ۲۹ موضوعات کے سلسلے میں منصوبے اور اسکیمیں تیار کرنے کی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔

● پنچایتوں کو اب کسی بھی دیگر جمہوری ادارے کی طرح باقاعدہ تسلیم کیا گیا ہے۔

● نویں پنج سالہ منصوبے کے مسودے میں گاؤں کے غریب لوگوں کی بہبود کے لیے اسکیم کا ایک واضح خاکہ فراہم کیا گیا ہے، جسے پنچایتی راج کے اداروں کے ذریعے منصوبے کی مدت کے دوران شروع کیے جانے کی توقع ہے۔

● ان اداروں کے منتخبہ نمائندوں کی ایک بڑی تعداد کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ فیصلہ سازی اور منصوبہ بندی کے عمل میں شامل ہوں۔ ●

صحت اور خاندانی بہبود

● گزشتہ ۵۰ سال میں شرح پیدائش ۴۱٫۷ فی ہزار سے گھٹ کر ۲۸٫۷ فی ہزار ہو گئی ہے۔

● شرح اموات ۲۲٫۸ فی ہزار سے گھٹ کر ۹٫۳ فی ہزار ہو گئی ہے۔

● شیر خوار بچوں کی شرح اموات ۱۴۶ فی ہزار سے گھٹ کر ۷۴ فی ہزار ہو گئی ہے۔

● چیچک اور گنی وورم کی بیماریاں ختم کی جا چکی ہیں۔ پولیو مائی لیٹیس کا خاتمہ عنقریب متوقع ہے۔ اب حکومت کوڑھ کو بیماری کے خاتمہ پر زور دے رہی ہے۔

● ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی آبادی ۳۴٫۲ کروڑ تھی، ملیریا کے اندراج شدہ کیسوں کی تعداد ۷٫۵ کروڑ تھی اور اس بیماری کے سبب مرنے والوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ اب جب کہ ہندوستان کی آبادی ۹۷ کروڑ تک پہنچ گئی ہے، ملیریا کے کیسوں کی تعداد صرف ۲۰ لاکھ رہ گئی ہے۔ اسی طرح ملیریا سے مرنے والوں کی تعداد میں بھی نمایاں کمی آئی ہے۔

● علاج کے روایتی دیسی طریقوں کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ آیوروید اور سدھ ریسرچ کونسل نے ۱۶ پیٹنٹس پروسیسنگ یا تیاری کے لیے حاصل کیے ہیں۔ ●

ٹیلی مواصلات

● ۱۹۵۱ء — کلکتہ میں ٹیلی گراف لائن ٹریفک کے لیے کھولی گئی۔

● ۱۹۸۲ء — ممبئی میں ایک ٹیلی فون ایکسچینج کھولا گیا۔

● ۱۹۱۴ء — شملہ میں ۷۰۰ لائنوں کی صلاحیت والا پہلا آٹومیٹک ٹیلی فون ایکسچینج چالو کیا گیا۔

● ۱۹۴۳ء — ریڈیو فوٹو سروس شروع کی گئی۔

● ۱۹۴۸ء — انفارمیشن ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ (آئی ٹی آئی) قائم کیا گیا۔
● ۱۹۵۳ء — امرتسر اور کلکتہ میں ۱۲ چینل والا کیریئر سسٹم شروع کیا گیا۔
● ۱۹۶۵ء — دہلی میں ٹیلی کام ریسرچ سینٹر کا قیام عمل میں آیا۔
● ۱۹۶۰ء — کانپور اور لکھنؤ کے درمیان پہلے سبسکرائبر ٹرنک ڈائلنگ روٹ نے کام شروع کیا۔
● ۱۹۶۷ء — چینئی میں پہلا کراس بار ٹرنک سب ایکسچینج چالو کیا گیا۔
● ۱۹۷۱ء — آروی میں ہندوستان کے پہلے سٹیلائٹ اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔
● ۱۹۷۴ء — منگلور اور ادیپی کے درمیان الٹرا ہائی فری کوئینسی (یو ایچ ایف) رابطہ قائم کیا گیا۔
● ۱۹۷۶ء — ممبئی اور لندن کے درمیان سبسکرائبر ڈائلنگ شروع ہوئی۔
● ۱۹۷۸ء — ٹیلی کمیونی کیشنز کے شعبے میں مشاورتی خدمات کی فراہمی کے لیے ٹیلی کمیونی کیشنز کنسلٹنٹس انڈیا لمیٹڈ کا قیام عمل میں آیا۔
● ۱۹۷۹ء — پونے میں مقامی جنکشنوں کے لیے پہلا فائبر آپٹک سسٹم شروع کیا گیا۔
● ۱۹۸۰ء — سکندر آباد میں گھریلو مواصلات کے لیے پہلا سٹیلائٹ اسٹیشن قائم کیا گیا۔
● ۱۹۸۲ء — ممبئی میں اولین اسٹورڈ پروگرام کنٹرولڈ (ایس پی سی) الیکٹرک ڈیجیٹل ٹیلیکس ایکسچینج نے کام کرنا شروع کیا۔
● ۱۹۸۳ء — ممبئی میں اولین ایس پی سی اینالاگ الیکٹرک ایکسچینج چالو کیا گیا۔
● ۱۹۸۴ء — ٹیلی میٹکس کے فروغ کے مرکز (سی ڈی او ٹی) کا قیام عمل میں آیا۔
● ۱۹۸۵ء — دہلی میں اولین موبائل ٹیلی فون سروس شروع ہوئی۔
● ۱۹۸۶ء — مہانگر ٹیلی فون نگم لمیٹڈ (ایم ٹی این ایل) اور ودیش سنچار نگم کا قیام عمل میں آیا۔
● ۱۹۸۷ء — احمد آباد اور راجکوٹ کے درمیان پہلا ڈیجیٹل کو ایکسیل ۱۴۰ ایم بی پی ایس شروع ہوا۔
● ۱۹۹۱ء — ودیش سنچار نگم لمیٹڈ (وی ایس این ایل) سے پہلی کمرشیل الیکٹرانک میل سروس نیٹ ورک کا آغاز ہوا۔
● ۱۹۹۲ء — ویلیو ایڈیڈ سروس پرائیوٹ سیکٹر کے لیے کھولی گئی۔
● ۱۹۹۴ء — قومی ٹیلی کام پالیسی کا اعلان کیا گیا۔
● ۱۹۹۵ء — بنیادی ٹیلی کام سروسز پرائیوٹ سیکٹر کے لیے کھولی گئیں۔ ●

الیکٹرانک ذرائع ابلاغ

ریڈیو

● چینئی پریسیڈینسی ریڈیو کلب کی زبردست کوششوں کے نتیجے میں نشریاتی سروس کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا۔
● انڈیا اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ریڈیو میں تبدیل کردی گئی۔
● آزادی کے وقت ہندوستان میں نو نشریاتی اسٹیشن تھے۔ ان میں سے تین اسٹیشن تقسیم کے بعد اب پاکستان میں ہیں۔
● ۱۹۵۰ء میں آل انڈیا ریڈیو کو نیا نام آکاش وانی دیا گیا۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو کا نظام صرف ۲۸ اسٹیشنوں پر مشتمل تھا۔
● ملک میں آل انڈیا ریڈیو کے ۱۸۷ اسٹیشن کام کر رہے ہیں۔ ان میں ۱۷۹ مکمل اسٹیشن، ۴ ریلے سینٹر، ایک معاون سینٹر اور تین وودھ بھارتی کمرشیل سینٹر شامل ہیں۔
● آل انڈیا ریڈیو کے ۲۹۷ ٹرانسمیٹر ہیں۔ ان میں ۱۴۹ میڈیم ویو، ۵۲ شارٹ ویو اور ۹۶ ایف ایم ٹرانسمیٹر شامل ہیں۔
● آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروس ۱۶ غیرملکی اور سات ہندوستانی زبانوں میں ۵۷ گھنٹے کے پروگرام نشر کرتی ہے۔ یہ سروس شارٹ ویو ٹرانسمیٹروں کے ذریعے امریکی براعظم کو چھوڑ کر تمام ممالک کا احاطہ کرتی ہے۔ ایکسٹرنل سروس کے ترجیحی علاقے قریبی پڑوسی ممالک، جنوب مشرقی اور وسط مشرقی ممالک، افریقی ممالک، یوروپ اور آسٹریلیا ہیں۔

دوردرشن

● ملک کے پہلے ٹیلی ویژن سینٹر کا آغاز تجرباتی سروس کے طور پر دہلی میں ستمبر ۱۹۵۹ء میں آغاز ہوا تھا، جس میں ۵۰۰ واٹ کا ایک ٹرانسمیٹر تھا، جس کا دائرہ کار ۲۴ کلومیٹر تھا۔
● تعلیم اور اطلاعات کے مقصد کے حصول کے لیے دوردرشن نے ایک ہفتے میں تین دن کے محدود ٹرانسمیشن کے ساتھ اپنی ٹیلی کاسٹ کا سلسلہ شروع کیا۔ رفتہ رفتہ یہ ٹیلی کاسٹ کے اپنے وقت میں کئی گنا اضافے کے ساتھ اطلاعاتی اور تفریحی ذریعہ بن گیا۔
● دوردرشن ۴۱ پروگرام پروڈکشن سینٹروں اور ۸۲۴ ٹرانسمیٹنگ اسٹیشنوں کے نظام کے ساتھ ۱۹ چینلوں پر پروگرام ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔
● دنیا کے سب سے بڑے ارضی نظاموں میں سے ایک نظام ہے۔ ہفتہ بھر میں ۱۲۵۰ گھنٹے کے اپنے پروگراموں کے ساتھ، یہ دنیا بھر کے تقریباً ۲۸۰ ملین لوگوں تک پہنچتا ہے۔
● یہ اپنے صدر دفتر اور علاقائی نیوز یونٹوں سے روزانہ ۲۸ زبانوں میں ۷۵ بلیٹن ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔

ریلوے

● ریلوے میں مجموعی سرمایہ کاری ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۸۵۵/۲ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء کو ۳۹۸۱۶/۰ کروڑ روپے ہو گئی۔
● "کیپٹل ایٹ چارج" کے لحاظ سے ریلوے اثاثوں کی مالیت ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۸۲۷ کروڑ سے بڑھ کر ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۸۹/۱۲/۷۷۲ کروڑ روپے ہو گئی۔
● ریلوے برق کاری میں ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۳۱ گنا اضافہ ہوا ہے، یعنی یہ ۳۸۸ روٹ کلومیٹر سے بڑھ کر ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو ۱۲۳۰۶ روٹ کلومیٹر ہو گئی۔
● ریلوے روٹ کلومیٹر ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۵۳۵۹۶ روٹ کلومیٹر سے بڑھ کر ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو ۶۲۹۱۵ روٹ کلومیٹر ہو گئے۔
● ہندوستانی ریلوے نے بھاپ سے چلنے
باقی صفحہ ... پر

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : این. این شرما

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

معاون : رفیعہ زیدی

معاون کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : سجاتا

جلد : ۱۷ : شمارہ : ۸

نومبر ۱۹۹۷ (کارتک۔اگرہائن شک ۱۹۱۹)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زر سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زر سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی. این. گاندھی

سرکولیشن اینڈ ایڈورٹیزمنٹ منیجر : کے. ایس جگناتھ راؤ

مضامین سے متعلق خط کتابت کا پتا:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

ترتیب

دلیپ بسواس

پانی کی آلودگی کی روک تھام

مصنف محسوس کرتا ہے کہ پانی کے انتظام وانصرام درجہ بدرجہ طریقے پر کیا گیا ہے۔ مقدار اور کوالٹی کے اعتبار سے پانی کے ذرائع کے انصرام کے لیے ایک مربوط ادارہ جاتی میکانزم کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کو پانی کے ذرائع قابلِ رشک حد تک حاصل ہیں۔ ملک میں دریاؤں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور اس میں جنوب۔ مغربی مانسون جو سالانہ بارش کا ۷۵ فی صد ہے، کے سبب بہت زیادہ بارش ہوتی ہے۔ بڑی بڑی دریاؤں کی گودیاں، درمیانی اور چھوٹی دریاؤں کی گودیوں سے مل کر ملک کی تمام نکاسی کا ۹۱ فی صد ہیں۔ قدرت کے ان بے بہا رعطیات کے باوجود یہاں پینے کے پانی کی قلت قومی فکر کا ایک مسئلہ ہے۔

پینے کا پانی اس قدر دقت سے دستیاب ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی فراوانی کو معجزہ قرار دیں گے۔ پانی کی مقدار میں کمی اور اس کی کوالٹی میں گراوٹ کا براہِ راست تعلق صارفین کے مختلف زمروں کی کم نہ ہونے والی مقابلہ جاتی مانگ اور گندے پانی کی نکاسی، جو مختلف ذرائع سے آتا ہے، جن میں انسانی آبادیاں، صنعتیں اور کاشت کاری کے عوامل شامل ہیں، سے ہے۔

بہت سے دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی شہر کاری کا زبردست عمل جاری ہے۔ اس شہر کاری کا فی صد اس صدی کے پہلے ۴۰ سالوں میں بارہ تھا۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ بڑھ کر ۲۵٫۷۲ ہو گیا ہے۔ شہر کاری کے علاوہ، ۱۹۹۱ء کی مردم شماری نے صنعتی شہروں کے اچانک اضافہ کو ایک نمایاں خصوصیت بتایا ہے۔ آبادی کا یہ تیزی سے انتقال اور شہر کاری کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیوں کی وجہ سے پانی ایک نایاب وسیلہ بنتا جا رہا ہے۔

پانی کی مقدار میں کمی اور کثافت کے نشانات دریاؤں کے مختلف قسم کے بے ضابطہ استعمال کے سبب صاف ظاہر ہیں۔ اس لیے یہ اہم ہے کہ پانی کے استعمال کی کوالٹی اور مقدار کے درمیان مناسب توازن برقرار رکھا جا سکے۔

پانی کا انتظام وانصرام

مرکزی اور ریاستی سطحوں پر پینے کے پانی، سطحی پانی، زمینی پانی کی سپلائی اور گندے پانی کی نکاسی کے لیے بہت سی ایجنسیاں ہیں۔ مرکزی ایجنسیوں میں جو پانی کے انصرام کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں، درج ذیل بھی شامل ہیں۔

۱۔ وزارتِ آبی وسائل

—— مرکزی آبی کمیشن

—— مرکزی زمینی آبی بورڈ

—— مرکزی بورڈ برائے آبپاشی اور پاور

۲۔ وزارتِ شہری ترقیات

—— مرکزی صحت عامہ اور ماحولیاتی انجینئرنگ تنظیم

۳۔ وزارتِ دیہی ترقیات

۴۔ وزارتِ زراعت

—— زرعی تحقیق کی ہندوستانی کونسل

۵۔ وزارتِ ماحولیات و جنگلات

—— مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ۔

—— گنگا پروجیکٹ ڈائریکٹوریٹ/ قومی دریائی تحفظ ڈائریکٹوریٹ۔

—— ماحولیاتی اثرات کے جائزے کا شعبہ

سی۔ پی۔ سی۔ بی کا رول

مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ نے پانی کی کوالٹی کے انتظام کے لیے ایک ابتدائی ضرورت کے طور پر بڑے بڑے دریاؤں اور ان کے ضمنی دریاؤں کی نشاندہی ان کے نشاندہ بہترین استعمال کے بنیاد پر کی ہے اور پانی کی کوالٹی کے لیے اصول مقرر کیے ہیں۔ ان میں پانی کی کوالٹی کے چنیدہ ابتدائی معیارات استعمال کیے ہیں (گوشوارہ۔۱) اس کے ساتھ ساتھ گزشتہ سالوں میں سینٹرل بورڈ درج ذیل

سرگرمیوں میں شامل رہا۔

- عالمی ادارۂ صحت کے پروگرام کے تحت ہندوستانی آبی وسائل کی مانیٹرنگ اور عالمی ماحولیات مانیٹرنگ سسٹم کے توسط سے خاص کر تازہ سطحی پانی (جیسے دریا، جھیل) کی کوالٹی کو مانیٹر کرنے کے لیے ۴۸۰۔ اسٹیشنوں کے ایک نیٹ ورک کا قیام۔
- ملک کے ۲۱ پرابلم علاقوں میں زمینی پانی کی کوالٹی کے ۳۴۱ اسٹیشنوں کے نیٹ ورک کا قیام۔ زمینی پانی کی کوالٹی کو مانیٹر کرنے کے لیے۔
- دریاؤں کو گودی علاقوں کی نقشہ بندی اور ساحلی پانی کی کوالٹی ۱۷۳۔ علاقوں میں مانیٹرنگ۔
- دریاؤں کی موجودہ حالت، آلودگی کا معیار (گوشوارہ ج) اور عملی منصوبہ کے لیے گودی کے حساب سے جائزہ . . . (گوشوارہ ب)
- آلودہ ساحلی علاقوں اور ایکشن پلانوں کے تحت پروگراموں کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے آبی کوالٹی کی مانیٹرنگ کے لیے گنگا پروجیکٹ ڈائریکٹوریٹ کو امداد۔
- مختلف قسم کی صنعتوں میں آلودگی کی صلاحیتوں کے گہرائی سے مطالعے اور ریاستی آلودگی کنٹرول بورڈوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی آلودگی کنٹرول کمیٹیوں کے ذریعے عملی جامہ پہنانے کے لیے کم از کم قومی معیارات کا بنانا۔
- وزارتِ ماحولیات و جنگلات کی تکنیکی مدد۔ پروجیکٹس کے اثرات کا جائزہ لینے خاص طور سے پانی کی کوالٹی کے نظریے سے۔

چنوتیاں

- صفائی کی ناقص حالت۔
- سطحی پانی میں شہری غلاظت کا بے روک ٹوک بہاؤ
- مقامی اداروں میں فنڈ اور بنیادی سہولیات کا فقدان۔
- پانی کی مطلق صلاحیت کے استعمال کے لیے دریا کے کم سے کم بہاؤ کی عدم دستیابی۔
- ناقص استعمالِ زمین۔
- صنعتی فضلات کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے اینڈ آف دی پائپ تکنالوجی کے استعمال اور استقرار کے مسائل۔
- چھوٹی صنعتی اکائیوں کے چلانے کے لیے دقیانوسی تکنالوجی اور پیمانے۔
- خطاکار اکائیوں کے خلاف عدالتی کارروائی میں دیر۔

حکمت عملی

- تکنیکی اور اقتصادی آسانی کو مناسب مقام دیتے ہوئے منبع پر آلودگی کنٹرول۔
- پانی کے وصولیابی اداروں کی اکتسابات کا زیادہ سے زیادہ استعمال تاکہ آلودگی کے کنٹرول پر صرفہ کو کم سے کم کیا جا سکے۔
- اخراج شدہ پانی کا دوبارہ استعمال۔ زرعی/صنعتی مقاصد کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال۔
- صنعتوں کے مناسب جگہوں پر قیام کے ذریعے آلودگی کنٹرول کی ضروریات کو کم سے کم کرنا۔
- سطحی اور زمینی پانی کی تجرید اور فاضل پانی کے اخراج کو منظم کرنا تاکہ پانی کو بچایا جا سکے۔
- دریا کے بہاؤ میں باقاعدگی لانا۔

ادارہ جاتی میکانزم

ابھی تک پانی کے انصرام کا اس کے مختلف ٹکڑوں میں ایک درجاتی انداز سے اہتمام کیا گیا ہے۔ پانی کے ذرائع، کوالٹی اور مقدار کے لحاظ سے انصرام کے لیے ایک ادارہ جاتی میکانزم ہونا ضروری ہے۔ یہ خاص کر اس لیے بھی ضروری ہے کہ آبی وسائل علاقائی حدود پار کرتے ہیں اور ایک ریاستی کام کے طور پر پانی کا انتظام نہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کیا جانا چاہیے۔

گوشوارہ نمبر ۱

مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ کے ذریعے بنایا گیا پانی کی بنیادی کوالٹی کا قاعدہ

	خصوصیات	(الف)	(ب)	(ج)	(د)	(ہ)
۱۔	تحلیل شدہ آکسیجن (ڈی او) ملی گرام/ا۔ کم سے کم	۶	۵	۴	۴	-
۲۔	بائیوکیمیکل آکسیجن ڈیمانڈ (بی۔او۔ڈی) ملی گرام/ا۔ زیادہ سے زیادہ	۲	۳	۳	-	-
۳۔	کل کالیفارم آرگینزم ۰۰ ایم۔پی۔این/۱۰۰ ملی لیٹر، زیادہ سے زیادہ	۵۰	۵۰۰	۵۰۰۰	-	-
۴۔	پی۔ ایچ۔ ویلیو	۶/۵-۸/۵	۶/۵-۸/۵	۶/۹	۶/۵-۸/۶	۶/۵-۸/۶
۵۔	فری امونیا (جیسے این) ملی گرام/ا، زیادہ سے زیادہ	-	-	-	۱/۲	-
۶۔	بجلی کی کنڈکٹیوٹی مائیکرو موہز/سینٹی میٹر، زیادہ سے زیادہ	-	-	-	-	۲۲۵۰

۶۔	سوڈیم کی چکنے کا تناسب زیادہ سے زیادہ	-	-	-	-	۲۶
۷۔	بورون۔ ملی گرام / ا، زیادہ سے زیادہ	-	-	-	-	۲

• کلاس (الف) پینے کے پانی کا ذریعہ بغیر روایتی طریقے سے صاف کیا گیا میکی جراثیم سے پاک۔ (ب) کھلے میدان میں نہانے کی تنظیم۔ (ج) پینے کا پانی روایتی صفائی کے بعد جراثیم سے پاک کیا گیا۔ (د) جنگلی جانوروں، مچھلیوں کی ترویج (ہ) آبپاشی، صنعتی کولنگ، فاضل پانی کے اخراج کا کنٹرول۔

•• اگر کالی فورم مقررشدہ مقدار سے زیادہ پایا جائے تو کالی فورم کے قاعدے کے مطابق اگر ۲۰ فی صد سے زیادہ نمونے مقررشدہ حد سے زیادہ دکھاتے ہیں۔ اور پانچ فی صد سے زیادہ نمونے مقررشدہ حد سے چار گنا زیادہ دکھاتے ہیں۔ درج الف میں پانی میں گھریلو اور صنعتی فاضل پانی کا اخراج نہیں ہونا چاہیے (ب) اور (ج) کے معاملہ میں اخراج کا اس طرح انتظام / صفائی کی جائے کہ چشمہ کے معیار کو برقرار رکھا جاسکے:

ذریعہ: اے۔ ڈی۔ ایس۔ او۔ آر۔ بی۔ ایس / ۳ / ۷۹۔ ۱۹۷۸ء

اہل قلم حضرات نوٹ فرمالیں کہ **یوجنا** (اردو) میں مضمون / غزل / نظم وغیرہ کی فوٹو اسٹیٹ نقلیں کسی حالت میں قبول نہیں کی جاتیں لہٰذا اصل مسودہ ہی ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

گوشوارہ نمبر ۲

ہند کے بڑے دریاؤں کی تفصیلات

نمبر شمار	دریا کا نام	ہند میں دریا کی لمبائی (کلو میٹر)	ہند میں گودی کا علاقہ (اسکوائر کلو میٹر)	اوسط سالانہ اخراج (ایم۔سی۔ایم)	نکلنے کی جگہ	پہنچنے کی جگہ
۱۔	گنگا	۲۵۲۵	۸۶۱۴۰۴	۴۹۳۴۰۰	گنگوتری گلیشیر، اترکاشی (یوپی)	بنگال کی کھاڑی
۲۔	اندلس	۱۲۷۰	۳۲۱۲۹۰	۴۱۹۵۵	مانسرور جھیل کے نزدیک، تبت	عرب ساگر
۳۔	گوداوری	۱۴۶۵	۳۱۲۸۱۲	۱۰۵۰۰۰	ناسک، مہاراشٹر	بنگال کی کھاڑی
۴۔	کرشنا	۱۴۰۰	۲۵۸۹۴۸	۶۷۶۷۵	مہابالیشور، مہاراشٹر	〃
۵۔	برہم پتر	۷۲۰	۱۸۷۱۱۰	۵۱۰۴۵۰	کیلاش رینج، چین	〃
۶۔	مہاندی	۸۵۷	۱۴۱۶۰۰	۶۶۶۴۰	رائے پور، ایم۔پی	〃
۷۔	نرمدا	۱۳۱۲	۹۸۷۹۶	۴۰۷۰۵	امرکنٹک، ایم۔پی	عرب ساگر
۸۔	کاویری	۸۰۰	۸۷۹۰۰	۲۰۹۵۰	کورگ، کرناٹک	بنگال کی کھاڑی
۹۔	تاپی	۷۲۴	۶۵۱۴۵	۱۷۹۸۲	بتول، ایم۔پی	کھمباٹ کی کھاڑی
۱۰۔	پینار	۵۹۷	۵۵۲۱۳	۳۲۳۸	چیناکسوا پہاڑی	بنگال کی کھاڑی
۱۱۔	براہمنی	۸۰۰	۳۹۰۳۲	۱۸۳۱۰	رانچی، بہار	〃
۱۲۔	ماہی	۵۳۳	۳۴۸۴۲	۸۵۰۰	رتلام، ایم۔پی	کامبے کی کھاڑی
۱۳۔	سابرمتی	۳۰۰	۲۱۶۷۴	۳۲۰۰	اراولی پہاڑ۔ گجرات	〃

گوشوارہ نمبر ۳

دریا کے آلودہ کنارے

دریا	آلودہ حصہ	مطلوبہ درجہ	موجودہ درجہ
یمنا	دہلی۔ اٹاوہ	سی	ڈی، ای
	دہلی کی شہری حدود، متھرا اور آگرہ	بی	ڈی، ای
چمبل	ڈی/ایس نگدا اور ڈی/ایس کوٹا (۱۵ کلومیٹر)	سی	ڈی، ای
کالی	ڈی/ایس مودی نگر سے گنگا میں ملنے تک	سی	ڈی، ای
ہنڈن	سہارنپور سے یمنا سے ملنے تک	ڈی	ای
کھان	اجین شہر کی حدود	بی	ای
	اجین کا ڈی/ایس	سی	ای
دامودر	دھنباد کے ڈی/ایس سے ہلدیا تک	سی	ڈی، ای
گومتی	لکھنؤ سے گنگا کے سنگم تک	سی	ڈی، ای
کاویری	تلاکاوری سے ۵ کلو میٹر مسوری ڈسٹرکٹ بارڈر یا گجی تک	اے	سی
	کے آر ساگر ڈیم سے ہوگینکل تک	سی	ای
	بنگلور سے گرانڈ آئی کٹ تک	سی	ای
	گرانڈ آئی کٹ سے کمباکونم تک	سی	ای
کولونگ	ناگاؤں شہر (آسام) کے ساتھ ساتھ	•	•
بھوگ دوئی	جورہاٹ (آسام) کے برابر برابر	سی	ڈی
برک	سلچر شہر (آسام) کے ساتھ ساتھ	•	•
امپھال	امپھال شہر (منی پور) کے ساتھ ساتھ	سی	ڈی
سوراہ	اگرتلہ شہر (تریپورہ) کے ساتھ ساتھ	•	•
سابرمتی	احمد آباد شہر کے چشمہ سے سابرمتی آشرم تک	بی	ای
	سابرمتی آشرم سے وو تھا تک	ڈی	ای
ستلج	لکھیانا کے ڈی/ایس سے ہریکے تک	سی	ڈی، ای
سوبرناریکھا	ہتھیا ڈیم سے بہراگورا تک	سی	ڈی، ای
گوداوری	ناسک کے ڈی/ایس سے نانڈیڑ تک	سی	ڈی، ای
	ناسک کی شہری حدود اور نانڈیڑ	بی	ڈی، ای
	منچریل اور راما گنڈم سے بھدراچلم تک	سی	ڈی
کرشنا	کرڈ سے سانگلی تک	سی	ڈی، ای
	دھوم ڈیم سے نرسوبادی تک	سی	ڈی
	نرا جھرنا	•	•
	ناگرجنا ساگر تک	سی	ڈی
	اور ایس ڈیم سے رپلا جھرنے تک		
بھدرا	شروع سے بھدرا ڈیم (کرناٹک) کے کمبوسیل کے ڈی۔ایس تک	سی	ای
براہمنی	کمالنگا انگل چشمہ سے بھوجن تک	سی	ڈی
تنگا	سترتھاہلی سے بھدرا سنگم تک	بی	سی
نرمدا	جبل پور شہر کے ساتھ ساتھ	بی	بی

تاپی	نیپانگر ڈی/الیس سے برہان پور شہر تک	اے	بی
بیٹوا	مانڈی دیپ اور ودیشیا کے برابر برابر	سی	ڈی
بیس	منالی کے چشمے سے مانڈی تک	اے	ڈی
	مانڈی چشمہ سے ہماچل پردیش بارڈر تک	اے	سی

بقیہ: دیہی ترقی بنام وقف جائداد

سیل میں جمع کرا کر لاکھوں روپیہ کا پروجیکٹ منظور کرایا جاسکتا ہے۔

غریبی دور کرنے کے لیے ایک اہم پہلو روزگار کی فراہمی بھی ہے۔ چوں کہ دیہی علاقوں میں بے روزگاری کی لعنت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، وقف جائدادیں، قبرستان، غیر استعمال شدہ قبرستان اور مدرسوں کے پاس فالتو زمین کو، اجازت حاصل کرکے جنگلات اور باغات لگانے کے کام میں لایا جاسکتا ہے اس سے غریبوں کے لیے روزگار کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح آمدنی پیدا کرنے کے لیے ان کا سب سے بہتر استعمال کیا جاسکتا ہے اس آمدنی کو لوگوں کی بہبود کی اسکیموں کے لیے دوبارہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وقف جائدادوں کو، بشرطیکہ متعلقہ اتھارٹی کی باضابطہ اجازت اور منشا حاصل ہو، دیہی صنعتیں لگانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صنعتیں گاؤوں میں بھی ہوں گی کبھی کبھی یہ گاؤں اور شہر کی سرحد پر بھی واقع ہوسکتی ہیں اس طرح ان میں دیہی اور شہری دونوں طرح کی خصوصیات پائی جاسکتی ہیں۔ یہ صنعتیں چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرسکتی ہیں۔ ان کا بنیادی کام مقامی طور پر میسر خام مال کا استعمال ہے۔ عام طور پر اس طرح کی پیداوار کی کھپت بھی مقامی ہی ہوتی ہے۔ گاؤوں کی صنعتیں پیداوار کے بہت ہی نچلے پیمانے پر کام کرتی ہیں اور بہت ہی سادہ پیداواری تکنیک استعمال کرتی ہیں۔

عام طور پر گاؤوں کی صنعتیں مندرجہ ذیل اقسام کی ہوتی ہیں۔ دست کاری، کھادی اور دیہی صنعتیں، ہینڈلوم اور دیگر دیہی صنعتیں مثلاً ریشم کے کیڑوں کی افزائش اور جوٹ سے سامان تیار کرنا وغیرہ۔ ان صنعتوں کو مالیہ فراہمی کے لیے ریاستی سطح پر مائنارٹیز فنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشنز موجود ہیں جو بہت ہی ادنیٰ شرح پر قرضوں کی سہولیات فراہم کرتی ہیں۔ ان قرضوں کی آسان قسطوں میں ادائیگی کی جاسکتی ہے۔

جیسے جیسے دیہی اقتصادیات میں ترقی ہوتی جائے دیہی صنعتیں بہتر اور جدید پیداواری تکنیک اپنا سکتی ہیں۔ لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اشیاء کی پیداوار، پیداوار کی تکنیک اور پیداوار کی مقدار سے ان صنعتوں میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ نتیجتاً دیہی زندگی میں بھی ایک انقلاب لایا جاسکتا ہے۔

بقیہ: اردو طباعت اور عصری تقاضے

برقرار رہے گی اور اس فن کے وجود کو بنیادی طور پر کوئی شدید خطرہ ہرگز لاحق نہ ہوگا۔ اگرچہ یہ مشینیں فی الحال گراں محسوس ہو رہی ہیں مگر پھر بھی کتابوں، اخباروں اور رسالوں کی طباعت واشاعت کے دائرے میں ایک عظیم انقلاب لے آئیں گی جس سے اردو زبان کو دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہوجانے کا یقین ہے۔ اردو والوں کو اس عہد آفریں انقلاب کی آہٹوں کا استعمال کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوگی۔

بقیہ: عظیم مدبر سی۔ سبرامنیم کی نظر میں

کو افسوس ہوا جب مہاتما گاندھی نے ۱۵ اگست کی تقریب میں آنے سے انکار کردیا اور اس کے بجائے کلکتہ چلے گئے جہاں فرقہ وارانہ جنون پھوٹ پڑا تھا۔ مہاتما گاندھی کو اس پر بہت رنج ہوا تھا کیوں کہ انھوں نے زندگی بھر جس چیز کی تلقین کی تھی۔ یعنی عدم تشدد کی اسے بہت دھکا لگا تھا۔"

خواب اور نصب العین

ڈاکٹر سی۔ سبرامنیم پرانی یادوں پر سے وقت کی گرد جھاڑتے ہوئے فرماتے ہیں ہم نے اپنے سامنے جو نصب العین رکھے تھے وہ خود مہاتما گاندھی نے ہی طے کیے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں دیہات پر خاص توجہ دی جائے، گاؤوں کو اپنی تمام ضرورتیں خود پوری کرنے کے لائق بنایا جائے۔ غریبی، بیماری اور توہم پرستی کو ختم کیا جائے جو صدیوں سے سیاسی محکومی کی وجہ سے شدت اختیار کرچکی ہے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ہم آزادی صرف اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ جن جگہوں پر انگریز بیٹھے ہیں وہاں ہندوستانی بیٹھیں ہم نے جو چیز ضروری سمجھی تھی وہ صرف ترقی ہی نہیں تھی بلکہ ایسی ترقی تھی جس سے کہ لوگ صحت مند اور بامعنی زندگی بسر کرسکیں۔ یہی ہمارا نصب العین تھا۔

ڈاکٹر سید مسعود حسین جعفری

آلودگی اور توانائی کے مسائل۔ اور ان کا حل

انسانی حیات تین اہم ترین قدرتی مادوں سے مربوط ہے ہوا، پانی اور شمسی حرارت۔ ان کی غیر موجودگی میں کسی بھی جاندار کا جینا مشکل ہے گویا یہ قدرت کی طرف سے بیش بہا ہدایا اور نعمتیں ہیں جن کی ارزانی و فراوانی کا جتنا شکریہ کیا جائے کم ہے۔

انسانی کمند فضائی بلندیوں اور سمندر کی عمیق سطح تک پہنچ چکی ہے۔ انسان اپنی عقل و فہم سے ہمت کے ساتھ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے بلکہ اس کے باوجود خشک زمین کی پیاس کو بارش سے اور ہواؤں کے رخ کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق قائم و دائم نہیں رہ سکا۔

ملک میں اس صدی کا یہ افسوسناک المیہ ہے کہ انسان نے ناعاقبت اندیشی سے جنگلات کا بے تحاشا صفایا کیا اور اس پر طرّہ یہ کہ اس کا احساس زیاں بھی تاخیر سے ہوا۔ دوسری جانب انسانی آبادی میں غیر معمولی اضافہ کے ساتھ مشینی گاڑیوں اور صنعتی کارخانوں کی روز افزوں بہتات نے فضا کو اتنا مکدر کر دیا کہ آلودگی کا مسئلہ سنگین بن گیا۔ اب اس مسئلہ سے نبرد آزمائی ضروری ہے ورنہ مختلف امراض خصوصاً ضیق النفس عام ہو سکتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ کرۂ باد میں ۷۸ فی صد نائٹروجن، ۲۱ فی صد آکسیجن، ۳ فی صد کاربن ڈائی آکسائڈ اور کچھ ہلکی گیسیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف قسم کے ذرات جن میں گرد و غبار کے ساتھ گندھک، کوئلہ اور رطوبت شامل ہے۔ موخرالذکر اجزا کی تعداد کا انحصار زمینی آبادی، صنعتی کارخانوں، مشینوں اور اینٹ کے بھٹوں سے نکلے ہوئے دھوئیں پر ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ، کاربن مونو آکسائڈ اور سلفر ڈائی آکسائڈ، انسانی صحت کے لیے مضر ہیں۔ نباتاتی حیات بھی سلفر ڈائی آکسائڈ جیسی گیس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے، مشاہدات اور تجزیات سے دریافت ہوا ہے کہ اینٹ کے بھٹوں کے نواحی علاقوں میں لگائے گئے پھل دار درختوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ صنعتی شہروں جیسے ممبئی، کلکتہ، چنئی اور کانپور کی شہری آبادی میں کارخانوں کا دھواں انسانی صحت کے لیے خطرناک حد کو پار کر چکا ہے۔ ممبئی کی تقریباً ۱۵ فی صد آبادی صنعتی کارخانوں سے وابستہ ہے۔ اندازہ کے مطابق ملک کے تقریباً نصف کیمیاوی کارخانے ممبئی میں ہیں۔ خاص طور پر چیمبور کا علاقہ مختلف صنعتوں کا مرکز ہے۔ فرٹیلائزر فیکٹری اور تیل صاف کرنے والے کارخانے اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کے صنعتی فضلے اور آلودگی کی وجہ سے بقول شخصے یہ علاقہ اب گیس چیمبر بن گیا ہے۔ یہی کیفیت کلکتہ شہر کی بھی ہے۔ یہاں جوٹ کے کارخانے ۱۸۰۳ء سے کام کر رہے ہیں۔ کثافت اور گندگی سے اب یہ شہر گندے نالوں اور گندی بستیوں کا شہر کہلانے لگا ہے۔ موٹر گاڑیوں اور مختلف مشینی کلوں سے نکلا ہوا دھواں ہر شہر میں فضا کو مکدر کر رہا ہے۔ بقول حالیہ عالمی کانفرنس برائے مسائل آلودگی" (جو لکھنؤ میں منعقد ہوئی) لکھنؤ شہر بھی کچھ کم کثیف نہیں ہے۔ سواری گاڑیوں سے نکلا ہوا دھواں جس میں سلفر ڈائی آکسائڈ اور کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے تشویشناک حد کو پار کر چکا ہے۔ ضلع انتظامیہ نے کانفرنس کے مشاہدات کی روشنی میں آلودگی کنٹرول مہم زوردار طریقہ پر چلائی ہے۔ اس کے خاطر خواہ نتیجے برآمد ہوئے ہیں۔ حالیہ جائزہ کے مطابق سلفر ڈائی آکسائڈ میں ۱۵ سے ۵ء۷ فی صد اور نائٹروجن میں ۵ سے ۱۶ فی صد کی کمی آئی ہے۔ زیادہ پرانی سواری گاڑیاں جو رفتار میں کم اور دھواں زیادہ اگلتی تھیں یا تو منسوخ کی گئی ہیں یا انھیں بیرون شہر چلانے کی اجازت دی گئی ہے۔

شہروں کو اگر گندگی اور کثافت سے دور رکھنا ہے تو شہریوں کو پوری ذمہ داری کے ساتھ مقامی ضلع انتظامیہ کو اپنا تعاون دینا چاہیے۔ شہر کے نواحی علاقوں کے ساتھ اندرون شہر کو پارکوں اور باغوں سے مزین کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں کچھ پرائیویٹ زمروں نے اچھی کارگزاری دکھائی ہے جو قابل تحسین ہے۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ پیڑ اور پودے انسانی صحت کو کتنا فائدہ پہنچاتے ہیں کیمیائی تعامل کے ذریعہ نقصان پہنچانے والی گیس

---

۱۴۸ نیو ماڈل ہاؤس، لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۱

کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنی خوراک کے لیے لیتے ہیں اور آکسیجن نکالتے ہیں جو ہر ذی حیات کے لیے اشد ضروری ہے۔ اگرچہ نظام قدرت کے تحت گیسوں کا یہ دائرۂ عمل فضا میں جاری ہے مگر درختوں کا بے دردی سے صفایا اور آبی ذخائر کی کمی سے توازن بگڑ سکتا ہے۔

ملک میں آبی آلودگی بھی تشویشناک ہے۔ شہروں کی بہ نسبت دیہی بستیاں زیادہ متاثر ہیں۔ دہلی کا حال یہ ہے کہ ایک رپورٹ کے مطابق بجلی گھر سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی راکھ تقریباً ۳ لاکھ ٹن اور جمنا میں گرنے والے فضلے کی مقدار ۲۰ کروڑ لیٹر یومیہ ہے۔ یہ فضلہ پانی کی رَو کے ساتھ دیہی علاقوں سے گزرتا ہے جہاں مویشی اور آبی مخلوق بے حد متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر اور خشکی پر پائی جانے والی پودوں کی نایاب اقسام جو ادویاتی خصوصیات کی حامل ہیں ختم ہو رہی ہیں۔ اسٹاک ہوم کے ماحولیاتی ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق اگر پانی کی بربادی کو روکا نہ گیا تو ۲۰۲۵ء تک دنیا کی دو تہائی آبادی پانی کی ایک ایک بوند کو ترس جائے گی کیوں کہ پانی کی کھپت آبادی میں اضافہ کی شرح سے دوگنی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آئندہ ۳۰ برسوں میں دنیا کی تقریباً ساڑھے پانچ ارب آبادی پانی کی قلت کا شکار ہو جائے گی۔ یعنی دنیا کا ہر تین میں سے دوسرا شخص پانی کی کمی کا شکار ہوگا۔ ۱۹۹۵ء میں دنیا کے تقریباً ۲ فی صد لوگوں کو پینے کا پانی مہیا نہ تھا۔ تقریباً ۹۰ فی صد گندہ پانی صاف کیے بغیر ہی بہا دیا جاتا ہے کیوں کہ شہروں میں صرف دس فی صد گندے یا کثیف پانی کو صاف کرنے کا انتظام ہے۔ یہ رپورٹ جلد ہی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کی جائے گی۔ اگرچہ زمین پر سمندر کے ایک تہائی کے برابر پانی کے ذخائر موجود ہیں لیکن پینے کے قابل کافی تعداد میں پانی کا مہیا کرنا اکثر ترقی پذیر ملکوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک میں زیر زمین پینے کے قابل پانی کا بڑا ذخیرہ ہے اور ۵۰ فی صد آبادی کے لیے پینے کے پانی کا انحصار زمین کے پانی پر ہے لہٰذا پانی کے ذریعہ پھیلنے والی بیماریوں کی روک تھام کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ دیہی علاقے جو صنعتی کارخانوں کے نواح میں آتے ہیں یا جن علاقوں سے دریا گزرتے ہیں ان کی طرف توجہ ضروری ہے تاکہ مشینی فضلہ یا ملبے کے ذریعہ پانی آلودہ نہ ہونے پائے۔

ہمارے ملک میں توانائی کا مسئلہ بھی رفتہ رفتہ تشویشناک بنتا جا رہا ہے۔ ایک طرف کوئلے کی تعداد زیر زمین ذخائر میں کم ہو رہی ہے دوسری طرف پٹرول، ڈیزل اور مٹی کے تیل کا صرفہ بھی بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ایندھن کی لکڑی دیہی علاقوں میں کم ہو گئی ہے اور شہروں میں ایندھن گیس کی سپلائی بھی خاطر خواہ نہیں۔ مٹی کے تیل کے لیے لمبی لمبی قطاریں اس بات کی شاہد ہیں کہ سپلائی وافر نہیں۔ اب رہ جاتی ہے بات بجلی کی توانائی کی۔ اس کی کیفیت بھی خوش کن نہیں۔ ان حالات میں ہمیں توانائی کے متبادل ذرائع تلاش کرنے ہیں۔ دیہی علاقوں کے لیے گوبر گیس اور شہروں کے لیے شمسی توانائی پر پوری توجہ دینی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سورج کا درجۂ حرارت ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سینٹی گریڈ ہے، وہ زمین سے ایک سو گنا زیادہ بڑا اور زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ لہٰذا ان اعداد کی روشنی میں حرارتی توانائی کے حصول کے لیے ہمیں کچھ کرنا ہے تاکہ ملک کے عوام کو خوش حال بنا سکیں۔ ●

بقیہ: ناخواندگی کے خلاف جنگ

راجستھان کے دشوار اضلاع (جہاں عورتوں میں شرح خواندگی دس فی صد سے بھی کم ہے) کے علاوہ جموں و کشمیر اور شمال مشرق کے اضلاع میں (جو نہ صرف دشوار گزار ہیں بلکہ جہاں مواصلات کا بندوبست ناکافی ہے اور جہاں شورش کا مسئلہ بھی ہے) شروع کی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان علاقوں میں پیش رفت میں وقت لگے گا۔

نئے اقدامات

قومی خواندگی مشن درپیش چیلنجوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے لیے کئی نئے اقدامات کر رہا ہے۔ ایک بڑا قدم یہ اٹھایا گیا کہ پروجیکٹوں کی منظوری دینے کا اختیار ریاستی خواندگی مشنوں کے حکام کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ آئین میں ۷۳ ویں اور ۷۴ ویں ترمیم کے بعد پنچایتی راج کے اداروں کو سونپی گئی آئینی ذمہ داری کو مدنظر رکھتے ہوئے، قومی خواندگی مشن پنچایتی راج کے اداروں کو خواندگی مہموں سے وابستہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قریبی نگرانی اور سرگرمیوں میں زیادہ کھلا پن لانے کی غرض سے نگرانی اور جائزے کے نظام پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ قومی خواندگی مشن نے خواندگی کی سرگرمیوں میں کارپوریٹ سیکٹر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔

ہندوستان کو مکمل خواندگی کی منزل کی طرف لے جانے کے لیے خواندگی کی مہمیں بدستور قومی خواندگی مشن کی حکمت عملی کا اہم ترین حصہ رہیں گی۔ لیکن صرف خواندگی ہی ہمارا نصب العین نہیں ہے۔ ہمارا نصب العین ہے دیہی لائبریریاں اور ایسے پروگراموں کے ذریعے، جن کی بدولت نوخواندہ لوگ اپنے وقت اور جگہ کے لحاظ سے اپنی صلاحیت کے مطابق اعلا تعلیم حاصل کر سکیں گے، ایک علم دوست معاشرہ بنانا، نوخواندہ لوگوں کی پیشہ ورانہ ہنرمندی بڑھا کر ان کی پیداواری صلاحیت بہتر بنانا اور ان کی زندگیوں کے معیار میں بہتری لانا۔

ابتدائی تعلیم کا حق ایک بنیادی حق بن جانے سے امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں سبھی لوگ خواندہ بن جائیں گے۔ لیکن ناخواندہ بالغوں کا مسئلہ تو برقرار ہے۔ ہم اپنا نصب العین عوام کی سرگرم شمولیت سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے ۵۰ ویں سال میں ہمیں ناخواندگی کے خلاف اسی طرح لڑنے کا عزم کرنا چاہیے، جس طرح کہ ہم ۵۰ سال پہلے اپنی آزادی کے لیے لڑے تھے۔ ●

آر۔ کے۔ داس گپتا

نیتاجی کا اقتصادی نظریہ

ہندوستان کی اقتصادی تعمیر نو کے سلسلے میں نیتاجی سبھاش چندر بوس نے منصوبہ بندی کمیٹی (پلاننگ کمیٹی) کا جو تصور پیش کیا تھا اس کی روشنی میں ان کے اقتصادی نظریات کے بارے میں غور کرتے ہوئے ہمیں پہلے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ہماری سیاسی تحریک کا بنیادی حوالہ ہمیشہ سے ملک کی اقتصادی صورت حال سے ہی وابستہ رہا ہے۔ سیاسی آزادی کی جدوجہد کا بنیادی محرک یہ تھا کہ سامراجی نظام ملک کی دولت کا جو استحصال کر رہا ہے وہ ختم ہو جائے۔ ہندوستانی تحریک کے رہنماؤں کے ذہن میں اقتصادی پالیسی کا خاکہ بالکل واضح اور صاف تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ملک میں غریبی صرف باہر کے حاکموں کے اقتصادی استحصال کا نتیجہ ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی کا تصور سب سے پہلے سبھاش چندر بوس نے ۱۹۳۸ء میں پیش کیا تھا لیکن اس سے تقریباً سو سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے پہلی بار برطانوی حکومت کی استحصالی اقتصادی پالیسی کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد کے تقریباً سو برس تک ہندوستانی قائدین جس اقتصادی نظریے کے حامی رہے تھے، نیتاجی کا منصوبہ بندی کا نظریہ اس کی ایک ٹھوس تعبیر تھا۔

راجہ رام موہن رائے نے (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۳ء) پہلی بار ان خیالات کا اظہار کیا جنھیں اقتصادیات کی تاریخ میں Drain ... کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ۱۸ اگست ۱۸۳۱ء کو "ہندوستان کا محصولی نظام" کے عنوان سے ایک پیپر پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ "۱۷۶۵ سے ۱۸۲۰ء کے درمیان ہندوستان سے ۱۱ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ کا سرمایہ باہر لے جایا گیا"۔ اس کے بعد ہی بھولاناتھ چندر (۱۸۲۲ تا ۱۹۱۰ء)، دادابھائی نوروجی، مہادیو گووند رانا ڈے (۱۸۴۲ تا ۱۹۰۱ء)، آر سی دتہ (۱۸۴۰ تا ۱۹۰۹ء) اور گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ء تا ۱۹۰۵ء) جیسے ماہرین اقتصادیات نے اس بات کا غائر مطالعہ کیا کہ کس طرح تجارت کے نام پر ناجائز طریقے سے ملک کی معیشت کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ بعد میں آزادی حاصل کرنے تک ہماری سیاسی فکر اور سرگرمی جن اقتصادی بنیادوں پر استوار ہوئی وہ انہی رہنماؤں کے اقتصادی نظریات پر قائم تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے نزدیک ان کے اقتصادی نظریات کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دادابھائی نوروجی تین بار ۱۸۸۶ء، ۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے جب کہ آر سی دتہ ۱۸۹۹ء میں اور سی کے گوکھلے ۱۹۰۵ء میں صدر ہوئے۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں ہمارے اقتصادی خیالات کا محور برطانوی حکمراں طبقے کی طرف سے ہندوستان کا اقتصادی استحصال ہی بنا رہا۔ ملک کی اقتصادی تعمیر نو کے لیے منصوبہ بندی کا خیال تیس کی دہائی کے آخری برسوں میں آیا جب سات صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور مکمل آزادی سامنے نظر آنے لگی تھی۔

ہندوستان کی اقتصادی تعمیر نو کے لیے قومی منصوبہ بندی کا خیال سبھاش چندر بوس کے ذہن میں ہی پہلی بار آیا۔ لیکن یہاں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ان کا ذہن کانگریس کے اقتصادی نظریات کی روایت سے متاثر تھا۔ انھوں نے ایک منصوبہ بندی کمیٹی کے بارے میں سوچا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ ایکٹ کی رو سے ملی ہوئی محدود خود اختیاری کے باوجود اقتصادی اقدامات کے لیے پروگرام طے کرنے کا وقت آچکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ جب سیاسی آزادی ملے گی تو ملکی معیشت کی از سر نو تدوین ضرور ہو گی۔ پھر کیوں نہ کانگریس پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہو جائے۔

شواہد بتاتے ہیں کہ سبھاش ہندوستان کی اقتصادی صورت حال کے بارے میں ۱۹۲۱ء میں ہی کافی غور و فکر کر چکے تھے۔ اس وقت انھیں انڈین سول سروسز سے استعفیٰ دیے اور کانگریس میں شریک ہوئے دس برس ہوئے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اقتصادی تعمیر نو کا کوئی بھی منصوبہ اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب

موجودہ اقتصادی صورت حال کے بارے میں ہمیں پوری واقفیت ہو۔ حالاں کہ وہ نوروجی، رانا ڈے، گوکھلے اور دت کے خیالات سے متفق تھے۔ لیکن ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ان پیش رَووں کے نظریات اس عہد کے درآمدات و برآمدات سے متعلق اعداد و شمار پر مبنی تھے جو اس صدی کی پہلی دہائی میں ختم ہو چکا تھا۔

انھوں نے ۱۹۳۰ء میں بنگال سودیشی لیگ کی بنیا د رکھی جس نے دوسری اور تیسری دہائی کی درآمدات و برآمدات کے اعداد و شمار یکجا کیے۔ ان اعداد و شمار کو کتابچے کی صورت میں ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو سودیشی اور بائکاٹ کے نام سے جاری کیا گیا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کے ذہن میں منصوبہ بندی کمیٹی کا خیال کیسے آیا؟ کچھ بعید نہیں کہ انھیں یہ خیال ان کے سیاسی گرو دیش بندھو چترنجن داس سے حاصل ہوا ہو۔ ۱۹۲۲ء میں گیا میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۳۷ ویں اجلاس کی صدارتی تقریر میں سی آر داس نے کہا تھا: "میرا مشورہ ہے کہ کانگریس بلا تاخیر ایک کمیٹی، ایک مضبوط سرگرم کمیٹی، قائم کرے جو مزدوروں اور کسانوں کو منظم کرنے کا کام کرے۔ ہم نے اس کام کی ابتدا میں یوں ہی بہت دیر کر دی ہے۔" ظاہر ہے کہ سی آر داس کا مقصد یہی تھا کہ یہ کمیٹی زراعت اور صنعت کے مسائل پر توجہ دے۔

دوسری بات یہ کہ سبھاش سوویت منصوبہ سے بھی واقف تھے۔ یہی منصوبہ بعد میں نئی اقتصادی پالیسی کی بنا ثابت ہوا جس کا اعلان لینن نے مارچ ۱۹۲۱ء میں پارٹی کی دسویں کانگریس میں کیا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ سبھاش کا مقصد سوویت پالیسی اور نظام کی تقلید نہیں تھا۔ جیسا کہ ہمیں بعد میں اندازہ ہوگا وہ ان دونوں کے خلاف تھے۔ تاہم وہ اقتصادی منصوبہ بندی کے طفیل روس کی روز افزوں صنعتی ترقی سے متاثر ضرور تھے۔

دی انڈین اسٹرگل میں سبھاش نے کہا، "کمیونسٹ نظریے نے اقتصادی میدان میں کچھ قابلِ تعریف کارنامے انجام دیے ہیں۔ (مثال کے طور پر ملکی منصوبہ بندی کی پالیسی)" یہاں سبھاش نے سوویت منصوبے کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے فقط ایک منصوبے کے خیال کو سراہا۔ صدر کانگریس کی حیثیت سے ۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو نئی دہلی میں وزرائے صنعت کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سبھاش نے کہا "پچھلے ۱۶ برسوں میں سوویت روس آدھا پیٹ کھانے والے کسانوں کی قوم سے ایک شکم سیر و خوش باش صنعتی مزدور طبقے میں بدل گیا ہے۔ سبھاش کی اس بات سے مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ اقتصادی تعمیر نو کے لیے سوویت ماڈل کے حامی تھے۔ انھوں نے مزید کہا "ہمیں سوچنا ہے کہ یہ انقلاب دھیرے دھیرے لایا جائے، جیسا کہ برطانیہ میں ہوا، یا اس طرح طاقت کے بل پر جیسا سوویت روس میں کیا گیا۔ میرے خیال میں اس ملک میں یہ ترقی طاقت کے بل پر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔" لیکن اشتراکیت اور سوویت سیاست کے بارے میں جب ہم سبھاش کے تمام خیالات کو یکجا کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سوویت سوشلزم کے حامی ہرگز نہیں تھے۔ طاقت کے بل بوتے پر ترقی حاصل کرنے سے سبھاش کا مقصد یہ تھا کہ فرسودہ خیالات رکھنے والوں کی تمام مخالفتوں کے باوجود اقتصادی منصوبے کو فوراً عمل میں لایا جائے۔ سبھاش سماجی مساوات کے حامی (سوشلسٹ) تھے لیکن انھوں نے سوویت روس کے سوشلزم کو تسلیم نہیں کیا۔ دی انڈین اسٹرگل میں انھوں نے یہ بات واضح کر دی: "کئی وجہیں ہیں کہ ہندوستان میں اشتراکیت اختیار نہیں کی جاسکتی" اور اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ "اشتراکیت کو کسی بھی طرح کی قومیت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے جب کہ ہندوستان کی موجودہ تحریک ایک قوم پرست تحریک ہے۔" دوسری وجہ یہ ہے کہ "روس اپنے خول میں سمٹ رہا ہے اور اب عالمی انقلاب برپا کرنے میں اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی ہے۔" تیسری وجہ یہ ہے کہ "روس میں اشتراکیت کا مطلب مذہب بیزاری اور لادینیت ہے۔" "ہندوستان میں مذہب کے بارے میں ایسی رائے نہیں ہے۔" چوتھی بات یہ ہے کہ "تاریخ کی مادی جدلیاتی تفہیم جو اشتراکی نظریے کا سب سے اہم عنصر ہے، ہندوستان کے لوگوں کو بلا قیل و قال قبول نہیں ہوگی۔ اسے وہ لوگ بھی نہیں مانیں گے جو اشتراکیت کے اقتصادی افکار کی افادیت کے مدّاح ہیں۔"

سوویت اشتراکیت کے بارے میں ان خیالات کے اظہار کے بعد سبھاش ایک تاریخی بیان رقم کرتے ہیں: "ہندوستان روس کا ایک نیا ایڈیشن نہیں بنے گا۔" سبھاش نے شری رام کرشن اور سوامی وویکانند سے جو کچھ سیکھا تھا، ان کا یہ بیان اسی کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب دی انڈین اسٹرگل میں لکھا "سوامی وویکانند کو جدید قومی تحریک کا روحانی باپ کہا جاسکتا ہے۔"

چناں چہ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ سوشلزم کے حامی سبھاش نے سوویت اقتصادی پالیسی کو تسلیم کیا۔ میرے خیال میں لیونارڈ اے گارڈن نے ایسا سمجھنے کی غلطی کی ہے۔ اپنی ضخیم کتاب برادرز اگینسٹ دی راج: اے بائیوگرافی آف سرت اینڈ سبھاش چندر بوس (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں گارڈن لکھتے ہیں: "منصوبہ بندی کمیشن کا خیال، جو سوویت یونین کے اقتصادی پالیسی کے سانچے میں ڈھل کر نکلا تھا۔۔ سبھاش نے پیش کیا۔" حقیقت یہ ہے کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں کل ہند قومی منصوبہ بندی کمیٹی کی جو پہلی میٹنگ ہوئی تھی اس میں سبھاش نے سوویت منصوبے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ لینن کی نئی اقتصادی پالیسی کے منافی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا "چھوٹی صنعتوں اور بڑی صنعتوں کے درمیان کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے۔"

سبھاش چندر بوس کے سوشلسٹ خیالات

آر. کے. داس گپتا

نیتاجی کا اقتصادی نظریہ

ہندوستان کی اقتصادی تعمیر نو کے سلسلے میں نیتاجی سبھاش چندر بوس نے منصوبہ بندی کمیٹی (پلاننگ کمیٹی) کا جو تصور پیش کیا تھا اس کی روشنی میں ان کے اقتصادی نظریات کے بارے میں غور کرتے ہوئے ہمیں پہلے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ہماری سیاسی تحریک کا بنیادی حوالہ ہمیشہ سے ملک کی اقتصادی صورت حال سے ہی وابستہ رہا ہے۔ سیاسی آزادی کی جدوجہد کا بنیادی محرک یہ تھا کہ سامراجی نظام ملک کی دولت کا جو استحصال کر رہا ہے وہ ختم ہو جائے۔ ہندوستانی تحریک کے رہنماؤں کے ذہن میں اقتصادی پالیسی کا خاکہ بالکل واضح اور صاف تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ملک میں غریبی صرف باہر کے حاکموں کے اقتصادی استحصال کا نتیجہ ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی کا تصور سب سے پہلے سبھاش چندر بوس نے ۱۹۳۸ء میں پیش کیا تھا لیکن اس سے تقریباً سو سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے پہلی بار برطانوی حکومت کی استحصالی اقتصادی پالیسی کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد کے تقریباً سو برس تک ہندوستانی قائدین جس اقتصادی نظریے کے حامی رہے تھے، نیتاجی کا منصوبہ بندی کا نظریہ اس کی ایک ٹھوس تعبیر تھا۔

راجہ رام موہن رائے نے (۱۷۷۲ تا ۱۸۳۳ء) پہلی بار ان خیالات کا اظہار کیا جنھیں اقتصادیات کی تاریخ میں [illegible] کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے ۱۸ اگست ۱۸۳۱ء کو "ہندوستان کا محصولی نظام" کے عنوان سے ایک پیپر پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ "۱۷۶۵ سے ۱۸۲۰ء کے درمیان ہندوستان سے ۱۱ کروڑ ۹۰ لاکھ پونڈ کا سرمایہ باہر لے جایا گیا۔" اس کے بعد ہی بھولاناتھ چندر (۱۸۲۲ تا ۱۹۱۰ء)، دادابھائی نوروجی، مہادیو گووند راناڈے (۱۸۴۲ تا ۱۹۰۱ء)، آر سی دتّہ (۱۸۴۰ تا ۱۹۰۹ء) اور گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ء تا ۱۹۰۵ء) جیسے ماہرین اقتصادیات نے اس بات کا غائر مطالعہ کیا کہ کس طرح تجارت کے نام پر ناجائز طریقے سے ملک کی معیشت کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ بعد میں آزادی حاصل کرنے تک ہماری سیاسی فکر اور سرگرمی جن اقتصادی بنیادوں پر استوار ہوئی وہ انہی رہنماؤں کے اقتصادی نظریات پر قائم تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے نزدیک ان کے اقتصادی نظریات کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دادابھائی نوروجی تین بار ۱۸۸۶ء، ۱۸۹۳ء اور ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے جب کہ آر سی دتّہ ۱۸۹۹ء میں اور جی کے گوکھلے ۱۹۰۵ء میں صدر ہوئے۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں ہمارے اقتصادی خیالات کا محور برطانوی حکمراں طبقے کی طرف سے ہندوستان کا اقتصادی استحصال ہی بنا رہا۔ ملک کی اقتصادی تعمیر نو کے لیے منصوبہ بندی کا خیال تیس کی دہائی کے آخری برسوں میں آیا جب سات صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور مکمل آزادی سامنے نظر آنے لگی تھی۔

ہندوستان کی اقتصادی تعمیر نو کے لیے قومی منصوبہ بندی کا خیال سبھاش چندر بوس کے ذہن میں ہی پہلی بار آیا۔ لیکن یہاں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ان کا ذہن کانگریس کے اقتصادی نظریات کی روایت سے متاثر تھا۔ انھوں نے ایک منصوبہ بندی کمیٹی کے بارے میں سوچا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ ایکٹ کی رو سے ملی ہوئی محدود خود اختیاری کے باوجود اقتصادی اقدامات کے لیے پروگرام طے کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ جب سیاسی آزادی ملے گی تو ملکی معیشت کی از سر نو تدوین ضرور ہوگی۔ پھر کیوں نہ کانگریس پہلے ہی سے اس کے لیے تیار ہو جائے۔

شواہد بتاتے ہیں کہ سبھاش ہندوستان کی اقتصادی صورت حال کے بارے میں ۱۹۳۱ء میں ہی کافی غور و فکر کر چکے تھے۔ اس وقت انھیں انڈین سول سروسز سے استعفیٰ دیے اور کانگریس میں تحریک ہوئے دس برس ہوئے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اقتصادی تعمیر نو کا کوئی بھی منصوبہ اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب

موجودہ اقتصادی صورت حال کے بارے میں ہمیں پوری واقفیت ہو۔ حالاں کہ وہ نوروجی، رانا ڈے، گوکھلے اور دتہ کے خیالات سے متفق تھے۔ لیکن ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ ان پیش رووں کے نظریات اس عہد کے درآمدات و برآمدات سے متعلق اعداد و شمار پر مبنی تھے جو اس صدی کی پہلی دہائی میں ختم ہو چکا تھا۔

انھوں نے ۱۹۳۰ء میں بنگال سودیشی لیگ کی بنیاد رکھی جس نے دوسری اور تیسری دہائی کی درآمدات و برآمدات کے اعداد و شمار یکجا کیے۔ ان اعداد و شمار کو کتابچے کی صورت میں ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو سودیشی اور بائکاٹ کے نام سے جاری کیا گیا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کے ذہن میں منصوبہ بندی کمیٹی کا خیال کیسے آیا؟ کچھ بعید نہیں کہ انھیں یہ خیال ان کے سیاسی گرو دیش بندھو چترنجن داس سے حاصل ہوا ہو۔ ۱۹۲۲ء میں گیا میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۳۷ویں اجلاس کی صدارتی تقریر میں سی آر داس نے کہا تھا "میرا مشورہ ہے کہ کانگریس بلا تاخیر ایک کمیٹی، ایک مضبوط سرگرم کمیٹی، قائم کرے جو مزدوروں اور کسانوں کو منظم کرنے کا کام کرے۔ ہم نے اس کام کی ابتدا میں یوں ہی بہت دیر کر دی ہے" ظاہر ہے کہ سی آر داس کا مقصد یہی تھا کہ یہ کمیٹی زراعت اور صنعت کے مسائل پر توجہ دے۔

دوسری بات یہ کہ سبھاش سوویت منصوبہ سے بھی واقف تھے۔ یہی منصوبہ بعد میں نئی اقتصادی پالیسی کی بنا ثابت ہوا جس کا اعلان لینن نے مارچ ۱۹۲۱ء میں پارٹی کی دسویں کانگریس میں کیا۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ سبھاش کا مقصد سوویت پالیسی اور نظام کی تقلید نہیں تھا۔ جیسا کہ ہمیں بعد میں اندازہ ہوگا وہ ان دونوں کے خلاف تھے۔ تاہم وہ اقتصادی منصوبہ بندی کے طفیل روس کی روز افزوں صنعتی ترقی سے متاثر ضرور تھے۔

دی انڈین اسٹرگل میں سبھاش نے کہا، کمیونسٹ نظریے نے اقتصادی میدان میں کچھ قابلِ تعریف کارنامے انجام دیے ہیں۔ (مثال کے طور پر ملکی منصوبہ بندی کی پالیسی) یہاں سبھاش نے سوویت منصوبے کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے فقط ایک منصوبے کے خیال کو سراہا۔ صدر کانگریس کی حیثیت سے ۲؍اکتوبر ۱۹۳۸ء کو نئی دہلی میں وزرائے صنعت کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سبھاش نے کہا "پچھلے ۱۶ برسوں میں سوویت روس آدھا پیٹ کھانے والے کسانوں کی قوم سے ایک شکم سیر و خوش باش صنعتی مزدور طبقے میں بدل گیا ہے۔ سبھاش کی اس بات سے مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ اقتصادی تعمیر نو کے لیے سوویت ماڈل کے حامی تھے۔ انھوں نے مزید کہا "ہمیں سوچنا ہے کہ یہ انقلاب دھیرے دھیرے لایا جائے، جیسا کہ برطانیہ میں ہوا، یا اس طرح طاقت کے بل پر جیسا سوویت روس میں کیا گیا۔ میرے خیال میں اس ملک میں یہ ترقی طاقت کے بل پر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔" لیکن اشتراکیت اور سوویت سیاست کے بارے میں جب ہم سبھاش کے تمام خیالات کو یکجا کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سوویت سوشلزم کے حامی ہرگز نہیں تھے۔ طاقت کے بل بوتے پر ترقی حاصل کرنے سے سبھاش کا مقصد یہ تھا کہ فرسودہ خیالات رکھنے والوں کی تمام مخالفتوں کے باوجود اقتصادی منصوبے کو فوراً عمل میں لایا جائے۔ سبھاش سماجی مساوات کے حامی (سوشلسٹ) تھے لیکن انھوں نے سوویت روس کے سوشلزم کو تسلیم نہیں کیا۔ دی انڈین اسٹرگل میں انھوں نے یہ بات واضح کر دی: "کئی وجہیں ہیں کہ ہندوستان میں اشتراکیت اختیار نہیں کی جا سکتی" اور اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ "اشتراکیت کو کسی بھی طرح کی قومیت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے جب کہ ہندوستان کی موجودہ تحریک ایک قوم پرست تحریک ہے۔" دوسری وجہ یہ ہے کہ "روس اپنے خول میں سمٹ رہا ہے اور اب عالمی انقلاب برپا کرنے میں اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی ہے۔" تیسری وجہ یہ ہے کہ "روس میں اشتراکیت کا مطلب مذہب بیزاری اور لادینیت ہے۔" "ہندوستان میں مذہب کے بارے میں ایسی رائے نہیں ہے۔" چوتھی بات یہ ہے کہ "تاریخ کی مادی جدلیاتی تفہیم جو اشتراکی نظریے کا سب سے اہم عنصر ہے، ہندوستان کے لوگوں کو بلا قیل و قال قبول نہیں ہوگی۔ اسے وہ لوگ بھی نہیں مانیں گے جو اشتراکیت کے اقتصادی افکار کی افادیت کے مداح ہیں۔"

سوویت اشتراکیت کے بارے میں ان خیالات کے اظہار کے بعد سبھاش ایک تاریخی بیان رقم کرتے ہیں "ہندوستان روس کا ایک نیا ایڈیشن نہیں بنے گا۔" سبھاش نے شری رام کرشن اور سوامی وویکانند سے جو کچھ سیکھا تھا، ان کا یہ بیان اسی کا مظہر ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب دی انڈین اسٹرگل میں لکھا "سوامی وویکانند کو جدید قومی تحریک کا روحانی باپ کہا جا سکتا ہے۔"

چناں چہ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ سوشلزم کے حامی سبھاش نے سوویت اقتصادی پالیسی کو تسلیم کیا۔ میرے خیال میں لیونارڈ اے گارڈن نے ایسا سمجھنے کی غلطی کی ہے۔ اپنی ضخیم کتاب برادرز اگینسٹ دی راج: اے بائیوگرافی آف سرت اینڈ سبھاش چندر بوس (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں گارڈن لکھتے ہیں "منصوبہ بندی کمیشن کا خیال، جو سوویت یونین کے اقتصادی پالیسی کے سانچے میں ڈھل کر نکلا تھا۔۔ سبھاش نے پیش کیا۔" حقیقت یہ ہے کہ ۷؍دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں کل ہند قومی منصوبہ بندی کمیٹی کی جو پہلی میٹنگ ہوئی تھی اس میں سبھاش نے سوویت منصوبے کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ لینن کی نئی اقتصادی پالیسی کے منافی کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا "چھوٹی صنعتوں اور بڑی صنعتوں کے درمیان کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے۔"

سبھاش چندر بوس کے سوشلسٹ خیالات

پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ سوویت نظریے کے حامی نہیں تھے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء کی رنگ پور سیاسی کانفرنس میں اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا "سوشلزم کا تصور کارل مارکس کی کتابوں سے نہیں اخذ کیا گیا ہے۔ اس کی اصل بنیاد ہندوستانی افکار اور ثقافت میں ہے۔ سوامی وویکانند نے جمہوریت کے جس تصور کی تبلیغ کی تھی اس کا مکمل اظہار دلیش بندھو داس کی تحریروں اور سرگرمیوں میں ہوتا ہے۔" اس خطبے میں سبھاش نے کہا: "ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ روسیوں نے جو کارل مارکس کے پیرو ہیں، آنکھ موند کر اس کی تقلید نہیں کی۔ ان کے لیے مارکس کی تھیوری پر عمل کرنا مشکل تھا اس لیے انھوں نے نجی جائداد اور تجارتی کارخانوں کی ملکیت کے بارے میں اس کے خیالات کی روشنی میں ایک نئی اقتصادی پالیسی وضع کی۔"

سبھاش کے نزدیک سوشلزم ایک ہندوستانی نظام ہے جس کی جڑیں یہاں کی روایت میں پیوستہ ہیں۔ ان کے خیال میں یہ روایت سوامی وویکانند کے افکار میں جھلکتی ہے۔ چارو چندر گنگولی کے نام ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک مکتوب میں سبھاش نے لکھا: سوامی وویکانند کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کسانوں، دھوبیوں، موچیوں اور فراشوں کے ذریعے ترقی کرے گا۔" ظاہر ہے کہ یہ کہتے ہوئے سبھاش کے ذہن میں وویکانند کی وہ تقریر رہی ہوگی جو انھوں نے ۲ فروری ۱۹۰۰ء کو کیلی فورنیا کے شیکسپیئر کلب میں کی تھی۔ وویکانند نے کہا تھا: "ہندوستانی لوگ پکے سوشلسٹ ہوتے ہیں۔ نجی ملکیت اس کے بعد کا معاملہ ہے۔"

سبھاش نے سوشلزم کی ہندوستانی شکل کا تصور پیش کیا۔ دراصل وہ کسی مخصوص رائج نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے اور کسی ایسے نظریے پر تو ہرگز نہیں جو باہر سے لایا گیا ہو۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے جولائی ۱۹۳۱ء کو کلکتہ میں منعقدہ اجلاس میں انھوں نے کہا: میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمیں کسی غیر ملکی وابستگی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ایمسٹرڈم یا ماسکو کی بات بلا تامل نہیں قبول کر لینی چاہیے۔ ہندوستان کو اپنے اصول بنانے ہوں گے۔ اپنی ضرورتوں اور اپنے ماحول کے مطابق حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔" ٹریڈ یونین تحریک کے بارے میں انھوں نے کہا "ایک طرف دائیں بازو کی ٹریڈ یونین تحریک ہے جو ہر چیز میں اصلاح چاہتی ہے تو دوسری طرف کمیونسٹ دوست ہیں جو ماسکو کے مقلد ہیں اور اس کے اصولوں پر اصرار کرتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا گروپ ہے جو سوشلزم کا بھی حامی ہے اور اپنے افکار کو بھی عزیز رکھتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا تعلق اسی طبقے سے ہے۔ اپنی اس تاریخی تقریر کے آخر میں انھوں نے کہا: "مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اور ساری دنیا کی آزادی سوشلزم پر منحصر ہے۔۔۔۔ ہندوستان کو اپنی طرز کا سوشلزم اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوشلزم کا جو طریقہ ہندوستان اپنائے اس میں کچھ ایسا نیا پن ہو کہ اس سے ساری دنیا کو فیض پہنچے۔" سبھاش سوویت اشتراکیت کے ماننے والوں کے اتنے خلاف تھے کہ ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء کی ٹریڈ یونین کانگریس میں انھوں نے "ماسکو خطرہ" کا لفظ استعمال کیا۔ اپنے اسی بیان میں سبھاش نے لوگوں کو ان ماسکو نواز کمیونسٹوں سے خبردار کیا جو ہر اس شخص کو ٹریڈ یونین کانگریس سے باہر نکال دینا چاہتے تھے جو ان کا حامی نہیں تھا۔ بعد کے دنوں میں وہ سوویت روس کے تئیں تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کے خیال میں سوویت روس اب اپنے سیاسی افعال میں سچا انقلابی نہیں رہ گیا تھا۔ "روس اب اپنے خول میں سمٹ رہا ہے۔" سبھاش نے دی انڈین اسٹرگل میں لکھا: "اور اب عالمی انقلاب برپا کرنے میں اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی ہے۔ البتہ کمیونسٹوں کی بین الاقوامی تنظیم اب بھی اپنے آپ کو بنائے رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ روس اور سرمایہ دار ممالک کے درمیان حال ہی میں جو معاہدے ہوئے ہیں اور ان معاہدوں میں جو ظاہری اور اندرونی شرطیں پوشیدہ ہیں اور اس نے لیگ آف نیشنز کی رکنیت جس طرح اختیار کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روس نے اپنی انقلابی قوت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

آئیے اب سوشلزم اور منصوبہ بندی کے بارے میں سبھاش کے خیالات کا جائزہ لیں۔ یہاں ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ سوشلزم اور منصوبہ بندی سبھاش کے نزدیک ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ان کے خیال میں سوشلسٹ خطوط پر ملکی معیشت کی نو تشکیل کے لیے ایک قومی منصوبہ بندی ضروری تھی۔ سبھاش نے فروری ۱۹۳۸ء میں ہری پورہ میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۵۱ ویں اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں اس بات کو واضح کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا "صنعتی ترقی کے لیے ایک ایسی جامع اسکیم بنانا ناگزیر ہوگا جس کی ملکیت اور اختیارات سرکار کے پاس ہوں۔" منصوبہ بندی کمیشن کو اس بات کے لیے اچھی طرح سوچ بچار کرنا اور فیصلہ لینا ہوگا کہ جدید کارخانوں کے سخت مقابلے کے باوجود کون کون سی ایسی گھریلو صنعتیں ہیں جن کو فروغ دینا مفید رہے گا اور کون کون سے ایسے زمرے ہیں جن میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہوگی۔ ہم جدید صنعت پسندی کو جتنا بھی ناپسند کریں اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی چاہے جتنی مذمت کریں مگر اب ہم چاہتے ہوئے بھی صنعتی عہد سے پہلے کی دنیا میں نہیں لوٹ سکتے۔ چناں چہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس نئی صنعت پسندی سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیں اور اس کی کمیوں اور خرابیوں سے بچنے کا راستہ ڈھونڈیں، ساتھ ساتھ ہم ان گھریلو صنعتوں کو زندہ کرنے کے امکانات تلاش کریں جو بڑے کارخانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے مشورے کے مطابق، ہمارے

پورے زرعی اور صنعتی نظام کو پیداواریت اور لاگت دونوں سطحوں پر سوشلزم کی راہ پر لانے کے لیے ریاست کو ایک جامع پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔

سبھاش نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے اپنے مکتوب میں پنڈت جواہر لال نہرو سے درخواست کی کہ وہ منصوبہ بندی کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالیں: "مجھے امید ہے کہ آپ منصوبہ بندی کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالیں گے۔ اس کی کامیابی کے لیے آپ کا اس عہدے پر ہونا ضروری ہے۔" پنڈت نہرو نے ان کی دعوت قبول کی اور ۱۷ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں منصوبہ بندی کمیٹی کا افتتاح ہوا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں سبھاش نے کہا "قومی منصوبہ بندی کمیٹی کو پہلے ان بنیادی صنعتوں کی طرف توجہ دینی ہوگی، جو دوسری صنعتوں کو چلانے کے لیے ضروری ہیں مثلاً بجلی کی صنعت، دھاتیں پیدا کرنے والی، بھاری کیمیائی مادے بنانے والی، کل پرزے اور اوزار بنانے والی صنعتیں اور ترسیلی صنعتیں مثلاً ریل، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور ریڈیو وغیرہ۔" اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "گھریلو صنعتوں اور بڑی صنعتوں میں کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے۔" سبھاش نے صنعتوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا۔ چھوٹے، درمیانہ اور بڑی صنعتیں اور ان کے لیے ایک ایسا منصوبہ بنانے کی اہمیت پر زور دیا جس میں تینوں کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔

سوشلزم کے ہندوستانی کردار کو واضح کرنے کے لیے سبھاش نے "سامیہ وادی" لفظ استعمال کیا۔ ایسا کرتے ہوئے غالباً ان کے ذہن میں بنکم چندر چٹرجی کی بنگلہ کتاب "سامیہ" رہی ہو۔ دی انڈین اسٹرگل میں انھوں نے سوشلزم کے اپنے نظریے کو کئی عناصر کے امتزاج سے پیدا شدہ ایک نظریہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ نظریہ جسے سامیہ واد کہا جاتا ہے، ایک ہندوستانی لفظ ہے اور اس کا مطلب "مساوات پر مبنی نظام" ہے۔ یہ ہندوستان کا کام ہے کہ وہ اس نئے نظریے کو کامیاب بنانے کے لیے اقدامات کرے۔

آخر میں ہم اقتصادی منصوبہ بندی کے بارے میں سبھاش کے تصورات کا جائزہ لیں گے۔ مغربی یوروپ اور امریکہ کی اقتصادی ترقی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ ایک معیشت جو پوری طرح سرکار کے زیر اختیار ہو ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ منڈی پر مبنی - - - - - معیشت کے لیے روس اور چین میں حال ہی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ممالک تجارت کو سرکاری تصرف سے باہر رکھنے کے حق میں ہیں۔ جدید اقتصادی افکار اور اعمال کے درج بالا پہلو سبھاش کے افکار سے میل نہیں کھاتے کیوں کہ قومی منصوبہ بندی کے بارے میں سبھاش کا خیال تھا کہ اقتصادی امور میں ریاست سرگرم رول ادا کرے۔ ریاست کے اس رول کی مغرب کے زیادہ تر ماہرین اقتصادیات مخالفت کرتے ہیں۔ دراصل مغربی ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ اقتصادی منصوبہ بندی کا نظریہ ناکام ہوگیا ہے۔ ان کے خیال میں منصوبہ بندی ایک ایسا مردہ اقتصادی نظام ہے جس میں بدلنے اور نئے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزاد معیشت نے مغرب میں غریبی کو ختم کردیا۔ کیا وہاں کے لوگوں کو اقتصادی انصاف اور آزادی حاصل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغرب کے سرمایہ دار ممالک نے بھی اپنی معاشی ترقی کے لیے کوئی نہ کوئی معاشی پالیسی ضرور بنائی ہے۔ یہ اور بات کہ وہ ایک جامع قومی منصوبہ بندی کے حق میں نہیں ہیں۔ آزاد معیشت میں بھی مالی پالیسی اور محصول اور ٹیکس کے قوانین وغیرہ حکومت کے زیر اختیار ہوتے ہیں۔

ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ جے۔ ایم۔ کینز کی ۱۹۳۶ء میں مطبوعہ کتاب جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ انٹرسٹ اینڈ منی کا مرکزی خیال "معیشت کی ضابطہ بندی" ہی ہے۔ اس سے دس سال پہلے اس نے ۱۹۲۶ء میں دی اینڈ آف لیسیز فیئر دیکھی تجارتی مفاد کا خاتمہ لکھی تھی، ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے بعض ناقدوں نے کینز کے افکار کو خطرناک حد تک ریڈیکل قرار دیا تھا کیوں کہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کو ضرب پہنچتی تھی۔ اگر کینز نے معیشت کی ضابطہ بندی کی بات کی ہے تو اس کے پیچھے ایک انسان دوست اقتصادی منصوبہ بندی کا جذبہ کارفرما تھا اور جب ہم سرکاری ملکیت والے صنعتی اور زرعی نظام کے لیے قومی اقتصادی منصوبہ بندی کے سبھاش کے نظریے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ سبھاش کا مقصد ایسی سرکاری ملکیت نہیں تھا جو ایک جانب دار قوت کے قبضے میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سبھاش نے یہ بات بار بار کہی کہ قومی منصوبہ بندی کا ان کا نظریہ وہ نہیں ہے جو سوویت نظام کا ہے۔ اس کے برخلاف ان کا سوشلزم ہندوستانی سامیہ واد تھا اور وہ سوامی وویکانند کے افکار سے متاثر تھے۔ وہ اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ اقتدار معاشرے سے الگ کوئی چیز ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست کسی باضمیر معاشرہ کی بالیدہ شکل ہے اور اس لیے ریاست کبھی فرد کو کچل کر ترقی نہیں کرسکتی۔ سبھاش کا کہنا تھا کہ نئی معیشت ایک ایسے نئے معاشرے کی پیداوار ہوگی جس میں ریاست اس معاشرے کی خواہشوں اور خوابوں کا مرقع ہوگی۔

پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ سوویت نظریے کے حامی نہیں تھے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء کی رنگ پور سیاسی کانفرنس میں اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا "سوشلزم کا تصور کارل مارکس کی کتابوں سے نہیں اخذ کیا گیا ہے۔ اس کی اصل بنیاد ہندوستانی افکار اور ثقافت میں ہے۔ سوامی وویکانند نے جمہوریت کے جس تصور کی تبلیغ کی تھی اس کا مکمل اظہار دیش بندھو داس کی تحریروں اور سرگرمیوں میں ہوتا ہے۔" اس خطبے میں سبھاش نے کہا: "ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ روسیوں نے جو کارل مارکس کے پیرو ہیں، آنکھ موند کر اس کی تقلید نہیں کی۔ ان کے لیے مارکس کی تھیوری پر عمل کرنا مشکل تھا اس لیے انھوں نے نجی جائداد اور تجارتی کارخانوں کی ملکیت کے بارے میں اس کے خیالات کی روشنی میں ایک نئی اقتصادی پالیسی وضع کی۔"

سبھاش کے نزدیک سوشلزم ایک ہندوستانی نظام ہے جس کی جڑیں یہاں کی روایت میں پیوستہ ہیں۔ ان کے خیال میں یہ روایت سوامی وویکانند کے افکار میں جھلکتی ہے۔ چارو چندر گنگولی کے نام ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک مکتوب میں سبھاش نے لکھا: سوامی وویکانند کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کسانوں، دھوبیوں، موچیوں اور فراشوں کے ذریعے ترقی کرے گا۔" ظاہر ہے کہ یہ کہتے ہوئے سبھاش کے ذہن میں وویکانند کی وہ تقریر رہی ہوگی جو انھوں نے ۲ فروری ۱۹۰۰ء کو کیلی فورنیا کے شیکسپیئر کلب میں کی تھی — وویکانند نے کہا تھا: "ہندوستانی لوگ پکے سوشلسٹ ہوتے ہیں۔ نجی ملکیت اس کے بعد کا معاملہ ہے۔"

سبھاش نے سوشلزم کی ہندوستانی شکل کا تصور پیش کیا۔ دراصل وہ کسی مخصوص رائج نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے اور کسی ایسے نظریے پر تو ہرگز نہیں جو باہر سے لایا گیا ہو۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے جولائی ۱۹۳۱ء کو کلکتہ میں منعقدہ اجلاس میں انھوں نے کہا: میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمیں کسی غیر ملکی وابستگی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں امسٹرڈم یا ماسکو کی بات بلا تامل نہیں قبول کرلینی چاہیے۔ ہندوستان کو اپنے اصول بنانے ہوں گے۔ اپنی ضرورتوں اور اپنے ماحول کے مطابق حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔" ٹریڈ یونین تحریک کے بارے میں انھوں نے کہا "ایک طرف دائیں بازو کی ٹریڈ یونین تحریک ہے جو ہر چیز میں اصلاح چاہتی ہے تو دوسری طرف کمیونسٹ دوست ہیں جو ماسکو کے مقلد ہیں اور اس کے اصولوں پر اصرار کرتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا گروپ ہے جو سوشلزم کا بھی حامی ہے اور اپنے افکار کو بھی عزیز رکھتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میرا تعلق اسی طبقے سے ہے۔ اپنی اس تاریخی تقریر کے آخر میں انھوں نے کہا: "مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اور ساری دنیا کی آزادی سوشلزم پر منحصر ہے ۔ ۔ ۔ ہندوستان کو اپنی طرز کا سوشلزم اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوشلزم کا جو طریقہ ہندوستان اپنائے اس میں کچھ ایسا نیا پن ہو کہ اس سے ساری دنیا کو فیض پہنچے۔" سبھاش سوویت اشتراکیت کے ماننے والوں کے اتنے خلاف تھے کہ ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء کی ٹریڈ یونین کانگریس میں انھوں نے "ماسکو خطرہ" کا لفظ استعمال کیا۔ اپنے اسی بیان میں سبھاش نے لوگوں کو ان ماسکو نواز کمیونسٹوں سے خبردار کیا جو ہر اس شخص کو ٹریڈ یونین کانگریس سے باہر نکال دینا چاہتے تھے جو ان کا حامی نہیں تھا، بعد کے دنوں میں وہ سوویت روس کے تئیں تذبذب میں مبتلا ہوگئے تھے۔ ان کے خیال میں سوویت روس اب اپنے سیاسی افعال میں سچا انقلابی نہیں رہ گیا تھا۔ "روس اب اپنے خول میں سمٹ رہا ہے۔" سبھاش نے دی انڈین اسٹرگل میں لکھا: "اور اب عالمی انقلاب برپا کرنے میں اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی ہے۔ البتہ کمیونسٹوں کی بین الاقوامی تنظیم اب بھی اپنے آپ کو بنائے رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ روس اور سرمایہ دار ممالک کے درمیان حال ہی میں جو معاہدے ہوئے ہیں اور ان معاہدوں میں جو ظاہری اور اندرونی شرطیں پوشیدہ ہیں اور اس نے لیگ آف نیشنز کی رکنیت جس طرح اختیار کی ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روس نے اپنی انقلابی قوت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

آئیے اب سوشلزم اور منصوبہ بندی کے بارے میں سبھاش کے خیالات کا جائزہ لیں۔ یہاں ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ سوشلزم اور منصوبہ بندی سبھاش کے نزدیک ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ان کے خیال میں سوشلسٹ خطوط پر ملکی معیشت کی نو تشکیل کے لیے ایک قومی منصوبہ بندی ضروری تھی۔ سبھاش نے فروری ۱۹۳۸ء میں ہری پورہ میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۵۱ویں اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں اس بات کو واضح کر دیا تھا۔ انھوں نے کہا "صنعتی ترقی کے لیے ایک ایسی جامع اسکیم بنانا ناگزیر ہوگا جس کی ملکیت اور اختیارات سرکار کے پاس ہوں۔" منصوبہ بندی کمیشن کو اس بات کے لیے اچھی طرح سوچ بچار کرنا اور فیصلہ لینا ہوگا کہ جدید کارخانوں کے سخت مقابلے کے باوجود کون کون سی ایسی گھریلو صنعتیں ہیں جن کو فروغ دینا مفید رہے گا اور کون کون سے ایسے زمرے ہیں جن میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہوگی۔ ہم جدید صنعت پسندی کو جتنا بھی ناپسند کریں اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی چاہے جتنی مذمت کریں۔ مگر اب ہم چاہتے ہوئے بھی صنعتی عہد سے پہلے کی دنیا میں نہیں لوٹ سکتے۔ چناں چہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس نئی صنعت پسندی سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلیں اور اس کی کمیوں اور خرابیوں سے بچنے کا راستہ ڈھونڈیں، ساتھ ساتھ ہم ان گھریلو صنعتوں کو زندہ کرنے کے امکانات تلاش کریں جو بڑے کارخانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے مشورے کے مطابق ہمارے

پورے زرعی اور صنعتی نظام کو پیداواریت اور لاگت دونوں سطحوں پر سوشلزم کی راہ پر لانے کے لیے ریاست کو ایک جامع پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔

سبھاش نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے اپنے مکتوب میں پنڈت جواہر لال نہرو سے درخواست کی کہ وہ منصوبہ بندی کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالیں: "مجھے امید ہے کہ آپ منصوبہ بندی کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالیں گے۔ اس کی کامیابی کے لیے آپ کا اس عہدے پر ہونا ضروری ہے۔" پنڈت نہرو نے ان کی دعوت قبول کی اور ۱۷ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں منصوبہ بندی کمیٹی کا افتتاح ہوا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں سبھاش نے کہا "قومی منصوبہ بندی کمیٹی کو پہلے ان بنیادی صنعتوں کی طرف توجہ دینی ہوگی جو دوسری صنعتوں کو چلانے کے لیے ضروری ہیں مثلاً بجلی کی صنعت، دھاتیں پیدا کرنے والی، بھاری کیمیائی مادے بنانے والی، کل پرزے اور اوزار بنانے والی صنعتیں اور ترسیلی صنعتیں مثلاً ریل، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور ریڈیو وغیرہ۔" اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ "گھریلو صنعتوں اور بڑی صنعتوں میں کوئی اندرونی تضاد نہیں ہے۔" سبھاش نے صنعتوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا۔ چھوٹے، درمیانہ اور بڑی صنعتیں اور ان کے لیے ایک ایسا منصوبہ بنانے کی اہمیت پر زور دیا جس میں تینوں کو پھلنے پھولنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔

سوشلزم کے ہندوستانی کردار کو واضح کرنے کے لیے سبھاش نے "سامیہ وادی" لفظ استعمال کیا۔ ایسا کرتے ہوئے غالباً ان کے ذہن میں بنکم چندر چٹرجی کی بنگلہ کتاب "سامیہ" رہی ہو۔ دی انڈین اسٹرگل میں انھوں نے سوشلزم کے اپنے نظریے کو کئی عناصر کے امتزاج سے پیدا شدہ ایک نظریہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ نظریہ جسے سامیہ واد کہا جاتا ہے، ایک ہندوستانی لفظ ہے اور اس کا مطلب "مساوات پر مبنی نظام" ہے۔ یہ ہندوستان کا کام ہے کہ وہ اس نئے نظریے کو کامیاب بنانے کے لیے اقدامات کرے۔

آخر میں ہم اقتصادی منصوبہ بندی کے بارے میں سبھاش کے تصورات کا جائزہ لیں گے۔ مغربی یوروپ اور امریکہ کی اقتصادی ترقی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ ایک معیشت جو پوری طرح سرکار کے زیر اختیار ہو ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ منڈی پر مبنی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معیشت کے لیے روس اور چین میں حال ہی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ممالک تجارت کو سرکاری تصرف سے باہر رکھنے کے حق میں ہیں۔ جدید اقتصادی افکار اور اعمال کے درج بالا پہلو سبھاش کے افکار سے میل نہیں کھاتے کیوں کہ قومی منصوبہ بندی کے بارے میں سبھاش کا خیال تھا کہ اقتصادی امور میں ریاست سرگرم رول ادا کرے۔ ریاست کے اس رول کی مغرب کے زیادہ تر ماہرین اقتصادیات مخالفت کرتے ہیں۔ دراصل مغربی ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ اقتصادی منصوبہ بندی کا نظریہ ناکام ہوگیا ہے۔ ان کے خیال میں منصوبہ بندی ایک ایسا مردہ اقتصادی نظام ہے جس میں بدلنے اور نئے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزاد معیشت نے مغرب میں غریبی کو ختم کردیا۔ کیا وہاں کے لوگوں کو اقتصادی انصاف اور آزادی حاصل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغرب کے سرمایہ دار ممالک نے بھی اپنی معاشی ترقی کے لیے کوئی نہ کوئی معاشی پالیسی ضرور بنائی ہے۔ یہ اور بات کہ وہ ایک جامع قومی منصوبہ بندی کے حق میں نہیں ہیں۔ آزاد معیشت میں بھی مالی پالیسی اور محصول اور ٹیکس کے قوانین وغیرہ حکومت کے زیر اختیار ہوتے ہیں۔

ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ جے۔ ایم۔ کینز کی ۱۹۳۶ء میں مطبوعہ کتاب جنرل تھیوری آف ایمپلائمنٹ انٹرسٹ اینڈ منی کا مرکزی خیال "معیشت کی ضابطہ بندی" ہی ہے۔ اس سے دس سال پہلے اس نے ۱۹۲۶ء میں دی اینڈ آف لیسیز فیئر دیکھی تجارتی مفاد کا خاتمہ لکھی تھی، ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے بعض ناقدوں نے کینز کے افکار کو خطرناک حد تک ریڈیکل قرار دیا تھا کیوں کہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کو ضرب پہنچتی تھی۔ اگر کینز نے معیشت کی ضابطہ بندی کی بات کی ہے تو اس کے پیچھے ایک انسان دوست اقتصادی منصوبہ بندی کا جذبہ کارفرما تھا اور جب ہم سرکاری ملکیت والے صنعتی اور زرعی نظام کے لیے قومی اقتصادی منصوبہ بندی کے سبھاش کے نظریے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ سبھاش کا مقصد ایسی سرکاری ملکیت نہیں تھا جو ایک جانب دار قوت کے قبضے میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سبھاش نے یہ بات بار بار کہی کہ قومی منصوبہ بندی کا ان کا نظریہ وہ نہیں ہے جو سوویت نظام کا ہے۔ اس کے برخلاف ان کا سوشلزم ہندوستانی سامیہ واد تھا اور وہ سوامی وویکانند کے افکار سے متاثر تھے۔ وہ اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ اقتدار معاشرے سے الگ کوئی چیز ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست کسی باضمیر معاشرہ کی بالیدہ شکل ہے اور اس لیے ریاست کبھی فرد کو کچل کر ترقی نہیں کرسکتی۔ سبھاش کا کہنا تھا کہ نئی معیشت ایک ایسے نئے معاشرے کی پیداوار ہوگی جس میں ریاست اس معاشرے کی خواہشوں اور خوابوں کا مرقع ہوگی۔

بھارت رتن ارونا آصف علی

آج ہم کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اس آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے متعدد وطن پرستوں کو قربانیاں دینی پڑیں، اور مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ کچھ تو چمک گئے اور کچھ گمنام ہی رہ گئے۔ ارونا آصف علی ہمارے ملک کی ایک ایسی مجاہد آزادی تھیں جنھوں نے مختلف قسم کے مصائب جھیلتے ہوئے ہم کو آزادی کی راہ دکھانے کے لیے حتی الامکان کوشش کی تھی۔ ہماری حکومت نے گزشتہ دنوں قوم اور سماج کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو ملک کے اعلاترین اعزاز بھارت رتن (بعد از مرگ) سے نوازا۔

اعزاز حاصل کر لینے یا کرسی مل جانے سے ہی تو کوئی شخص عظیم نہیں بن جاتا۔ عظیم تو اس کے کارنامے، اس کے پیش کردہ اقدار، ملک اور سماج کے تئیں اس کی خدمات بناتی ہیں۔ ایسے اقدار کے قیام کے لیے ہی تو وہ تا حیات کوشاں رہیں۔ بلاشبہ ارونا اس کے لیے اپنی ذمہ داری نبھاتی رہیں لیکن ان کی خدمات کا اعتراف تاخیر سے کیا گیا ہے۔ آزادی کی اس عظیم مجاہدہ کا ہماری آزادی کے جشن زریں کے موقع پر نوازا جانا فخر کی بات ہے۔ ایک طرح سے گویا قوم کو ہی نوازا گیا ہے۔

۱۶ر جولائی ۱۹۰۹ء میں ایک بنگالی خاندان میں پیدا ہوئی ارونا گانگولی بدیس جاکر تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کو غیر ملک سے کہیں زیادہ اچھا تحریک آزادی میں حصہ لینا لگا۔

ان کا رجحان آزادی کی طرف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آزادی کی تحریک میں معروف کچھ کانگریسی لیڈروں سے رابطہ قائم کیا۔ اسی دوران ان کی ملاقات دہلی کے ایک مشہور کانگریسی رہنما اور بیرسٹر آصف علی سے ہوئی۔ یہ ملاقات گہرے تعلقات میں تبدیل ہوگئی اور ۱۹ سالہ ارونا نے اپنی عمر سے دوگنا سے بھی زیادہ عمر کے آصف سے ماں باپ اور سماج کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ اندھی تقلید، نام نہاد مذہب پرستی، فرقہ واریت اور ذات پات کے خلاف ان کی یہ پہلی بغاوت تھی۔ ایک معزز بنگالی برہمن خاندان میں پیدا ہوئی ۱۹ سالہ لڑکی کا ۴۰ سال سے زیادہ عمر کے مسلم سے شادی کر لینا بلاشبہ ایک بہت بڑی بغاوت ہی کہی جائے گی۔ اس وقت لڑکیاں گھر کی چہار دیواری سے نکلنے کی ہمت نہیں جٹا پاتی تھیں۔

وہ ایک صف اول کی مجاہد آزادی رہیں اور مردوں کے کندھے سے کندھا ملاکر چلتی رہیں۔ اپنے وقت کی ہر تحریک میں حصہ لے کر ثابت کر دیا کہ ہندوستان کی عورتیں مردوں کے مقابلے کسی بھی میدان میں پیچھے نہیں ہیں۔ ۱۹۳۰، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں بالترتیب ایک برس چھ ماہ اور ایک برس کی سزا کاٹی، جس سے ان کی پہچان قومی رہنما کے طور پر ہونے لگی۔ ۲۱ سالہ عورت جس کی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی ہوئی ہو، کے دل پر اس وقت کیا بیتی ہوگی جب وہ سلاخوں کے اندر مصائب جھیل رہی تھیں۔ لیکن وہ ملک کو آزاد دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ ملک کو غلامی کی بیڑیوں سے آزاد کرانے کے لیے پرعزم تھیں۔

'ہندوستان چھوڑو' تحریک کا ہمارے ملک کی تاریخ میں خاص مقام ہے۔ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو ممبئی میں کانگریسی رہنماؤں نے 'انگریزو بھارت چھوڑو' کا نعرہ دیا۔ لیکن زیادہ تر رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ وہاں کے گوالیہ ٹینک (اب اگست کرانتی) میدان میں بہت بڑے جلسہ کے منچ پر ارونا بھارت کا پرچم لیے آئیں اور لہرا کر پولیس کو چکمہ دے کر بھیڑ کو چیرتی ہوئی غائب ہوگئیں۔ انھوں نے حلف لیا تھا کہ وہ چندر شیکھر آزاد کی طرح پولیس کے ہاتھ نہیں آئیں گی۔ وہ جے پرکاش نرائن، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور اچیوت پٹوردھن جیسے سوشلسٹوں کے ساتھ چھپ چھپ کر انگریزوں کے خلاف کام کرتی رہیں۔ سرکار نے ان کے اوپر دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا اور بعد میں یہ رقم بڑھا کر ۲۵ ہزار کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر لوہیا اور جے پرکاش نرائن پکڑے گئے لیکن یہ نہیں پکڑی گئیں۔ کبھی دہلی، کبھی مدراس اور کبھی کلکتہ۔ سب سے زیادہ کلکتہ میں سرگرم رہی تھیں۔ اس دوران ان کو متعدد تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان کی صحت بہت زیادہ گر گئی۔

۹۔ اے سوچیتا اپارٹمنٹس وسندھرا انکلیو۔ دہلی۔ ۹۶

انھوں نے کہا کہ پہلے سرکار ان کی گرفتاری کا پروانہ واپس لے، تبھی خود سپردگی کی بات سوچی جا سکتی ہے۔ گاندھی جی نے بھی ان کو خود سپردگی کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے تو ایک بار غصہ میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتیں تو وہ خود ان کو پکڑوا دیں گے اور انعام کی رقم غریبوں میں تقسیم کر دیں گے۔

ارونا چٹان کی طرح اپنے ارادے پر اٹل رہیں۔ ان کی دہلی کی کوٹھی ضبط کر لی گئی۔ لیکن اس تحریک کی ہیروئن نے ہمت نہیں ہاری۔ ۱۹۴۵ء میں سبھی کانگریسی نیتا رہا کر دیے گئے۔ لیکن ان کی گرفتاری کا وارنٹ ۱۹۴۶ء میں ہی واپس لیا گیا۔ یہ عوامی طور پر اس کے بعد ہی سامنے آئیں۔ جس سامراج کا سورج نہیں ڈوبتا تھا اور ساتوں سمندروں پر جن کی حکومت تھی، اس کی پولیس بھارت ماتا کی اس عظیم بیٹی کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ ایک انتہائی تعجب کی بات ہے۔

ملک کو آزادی ملی اور لیڈر کرسی کی جوڑ توڑ میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے بھی کانگریس کی ممبری لی اور ۱۹۵۸ء میں دہلی کی پہلی میئر منتخب ہوئیں۔ وہ دوبارہ بھی اس عہدہ کے لیے منتخب ہوئیں لیکن انھوں نے دیکھا کہ وہاں بدعنوانی، نوکر شاہی اقربا پروری اور لال فیتہ شاہی کا بول بالا ہے تو نہ صرف میئر کے عہدہ سے استعفا دیا بلکہ سیاست سے ہی کنارہ کش ہو گئیں۔ اس کے بعد نہ تو کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ کوئی انتخاب لڑا۔

انھوں نے سیاست سے الگ ہٹ کر دوسرے شعبوں میں جانے کے بارے میں سوچا۔ سوشلسٹ، سامیہ وادی اور کانگریس سبھی سے ناطہ توڑ کر انھوں نے عورتوں، بچوں، جھونپڑوں، استحصال شدہ لوگوں کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے محسوس کیا کہ کسی بھی منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے مضبوط اور آزاد پریس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے ڈاکٹر بالنگا اور آدتیہ نرائن جیسے سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر روزانہ اخبار "پیٹریاٹ" اور "لنک" میگزین شروع کیا۔ ان کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے بہت کوشش کی تھی۔ یہاں کے انتظامیہ کو لے کر کئی بار تنازعہ کھڑا ہوا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں یہ بھی ان کے اختیار سے نکل گئے۔ قدرت کا کیسا کھیل ہے کہ جس وقت ان کا انتقال ہوا، اس وقت بھی ان میں ہڑتال تھی جو آج بھی جاری ہے۔ لیکن اپنی بانی کی وفات پر دکھ ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے ایک دن کے لیے ہڑتال توڑی تھی اور خصوصی ضمیمہ نکال کر اپنی تعزیت کا اظہار کیا تھا۔

حکومت ہند نے ان کی خدمات کا اعتراف (بعد از مرگ) کر کے صحیح قدم اٹھایا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کی حق دار اپنی زندگی میں ہی تھیں۔ ویسے تو ان کو پہلے ہی سوویت روس کا سب سے بڑا اعزاز "لینن شانتی انعام" "سوویت لینڈ نہرو انعام"، جواہر لال نہرو انعام، قومی اتحاد کے لیے اندرا گاندھی انعام اور پدم بھوشن جیسے ملک اور بیرون ملک کے متعدد اعزازات سے نوازا جا چکا تھا۔ لیکن ملک کے اعلا ترین اعزاز سے نوازا جانا فخر کی بات ہے۔ آج ملک ان کا احسان مند ہے۔ ان کو اعزاز دے کر قوم نے خود کو بھی نوازا ہے۔

جس ملک میں ارونا جیسی خاتون جنم لے، وہ غلام کیسے رہ سکتا ہے۔ اگرچہ ہماری قومی تحریک میں مادام بھیکاجی کاما، میرا بین، اینی بسنٹ، درگا بھابھی اور سروجنی نائیڈو جیسی کئی خواتین نے حصہ لیا۔ لیکن ارونا نے ان میں اعلا مقام حاصل کیا اور ثابت کیا کہ ہندوستانی خواتین کسی بھی میدان میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔

ان کی سب سے بڑی خاصیت یہی رہی کہ انھوں نے اپنی قربانی کا صلہ پانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بدلے میں کچھ حاصل کرنے کی تمنا نہیں کی۔ اگر وہ چاہتیں تو کوئی بڑا عہدہ ضرور لے سکتی تھیں۔ ظلم کے سامنے کبھی جھکیں نہیں، غلط باتوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ نہرو خاندان سے گہرا تعلق ہوتے ہوئے بھی وہ اندرا گاندھی کی عبوری ایمرجنسی کے وقت ان کی نکتہ چینی کرنے میں نہیں چوکی تھیں۔ جب ۱۹۸۷ء میں راجیو گاندھی نے ان کو نائب صدر جمہوریہ کی پیشکش کی تو انھوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا تھا مجھے تو غریبوں میں ہی رہنے دو۔ میں قیدی نہیں بننا چاہتی۔

طیب خاں

دیہی ترقی اور وقف جائداد

ترقی سے مراد ہے زندگی کے مادی معیار میں مجموعی طور پر ایک مثبت تبدیلی۔ بہتری کے لیے یہ یہ مثبت تبدیلی اقتصادی اور سماجی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ عمدہ صحت، مکانات اور فلاح وبہبود کے ذریعے زندگی کے معیار میں بہتری۔ ترقی کے بنیادی اجزار ہیں۔ (۱) غریبی اور عدم مساوات کا خاتمہ (۲) لوگوں کے لیے مادی سہولیات میں اضافہ اور (۳) تعلیم، صحت اور مکانات وغیرہ کے ذریعے سہولیات میں اضافہ۔

گاؤں عام طور پر دیہی آبادی کا جزو اور سب سے چھوٹی انتظامی اکائی ہوتے ہیں۔ ان کی ایک خاصیت ان کا چھوٹا ہونا بھی ہے۔ یہ چند سو کنبوں کی آبادی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دیہاتوں کی طرف لوگوں کی منتقلی بہت زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے وہاں آبادی میں اضافے کی شرح بہت دھیمی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف لوگ دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

گاؤں رہائشی اور زرعی زمینوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کسان یا تو اکٹھا رہتے ہیں یا پھر اپنی اپنی زمینوں پر رہائش اختیار کرتے ہیں۔ مکانات میں زیادہ تر ان کے مالکان ہی رہتے ہیں۔ یہ مکانات کچے ہوتے ہیں۔ خاندان، ذات پات یا مذہبی اعتبار سے یہ لوگ اکٹھا مکان بنا کر رہتے ہیں۔ زمین کا استعمال عام طور پر ابتدا پیداوار کے لیے، پھر تقسیم اور کھپت کے لیے ہوتا ہے۔ سماجی اور اقتصادی لحاظ سے برادریاں مقابلتاً زیادہ یک رنگ ہوتی ہیں۔ تکنیکی اور تنظیمی طرز بہت ہی سیدھا سادھا ہوتا ہے۔ تبدیلیاں بہت دھیمی رفتار سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ لوگوں کا رجحان تنوع اور تبدیلی کی طرف نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں تکنالوجی کا استعمال کم اور کسی حد تک ذرائع کا استعمال مناسب حد تک نہیں کیا جاتا۔ دیہاتوں میں معاشرتی رسم و رواج، عقائد، اقدار اور رجحانات ان تبدیلیوں میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

دیہی علاقوں میں بیشتر اقتصادی سرگرمیاں کنبہ جاتی بنیاد پر منظم ہوتی ہیں۔ مزدوروں اور غیر مزدوروں اور اقتصادی کنبہ جاتی سرگرمیوں کے درمیان فرق ہمیشہ واضح نہیں ہوتا۔ عورتیں اور بچے مختلف قسم کے کھیتی باڑی، مویشی پروری، دست کاری اور صنعت سے متعلق امور انجام دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کاموں میں ان کے ملوث ہونے کے باوجود ان کو مزدوروں کے زمرے میں نہیں رکھا جاتا کیوں کہ وہ ان میں کل وقت کے لیے یا پھر باقاعدگی سے ملوث نہیں ہوتے۔ قومی شماریات کا نظام بھی اس قسم کے کاموں کے تئیں یک طرفہ ہوتا ہے۔ عورتیں گھر کے اندر جو بھی کام کرتی ہیں وہ امور خانہ داری کے زمرے میں آجاتے ہیں اور ان کو اقتصادی سرگرمیوں کی حدود سے باہر گردانا جاتا ہے۔

قومی سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان ۱۹۹۱ء میں خواندگی کی شرح بالترتیب ۸ر۶۳۔ اور ۴ر۳۹ رہی، لیکن دیہی علاقوں میں جہاں ۳ ، ۷ فی صد ہندوستانی بستے ہیں، یہ شرح بہت کم تھی۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک خصوصی عمر کے گروپ کے بچوں کے اندراج کی شرح بہت زیادہ رہی ہے لیکن جو بات بہت اہم ہے وہ یہ ہے کہ اسکولی نظام میں مندرج بچوں کو روکنا اور ایک درجہ سے دوسرے درجے میں ان کی ترقی۔ تعلیمی نظام زیاں میں مبتلا دیکھا گیا ہے۔ بچوں کے اسکول سے اخراج کا مطلب ہے کہ کسی مخصوص نصاب کے مکمل کرنے سے پہلے یا پھر کسی مخصوص سطح تک کامیابی حاصل کرنے سے پہلے ہی اسکول سے نام کٹوا لینا۔

بچوں کے اسکول جانے میں جو عوامل رکاوٹ بنتے ہیں وہ ہیں اقتصادی و سماجی اور تعلیمی۔ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اقتصادی وجوہات میں والدین کی بے حد غریبی شامل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ ملک میں پھیلی ہوئی بچہ مزدوری کی وجہ سے بچے آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے غریب والدین بچوں کو اسکول

۲/۱۷-۱۳، جام نگر ہاؤس، شاہجہاں روڈ، نئی دہلی ۱۱

بھیجنے کے مقابلے میں کام پر بھیجنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سماجی عوامل کا تعلق اس بات سے ہے کہ تعلیم کو پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے علاوہ اس میں یہ ڈر بھی شامل ہے کہ کہیں تعلیم ان کے بچوں کو خاندان سے الگ تھلگ نہ کر دے۔

خصوصاً لڑکیوں کو اسکول نہ بھیجنے میں والدین کی ہچکچاہٹ بہت زیادہ ہوتی ہے تعلیم کے تئیں تحریک پیدا کرنے میں اساتذہ کی بے حسی، درجات میں غیر حاضری، کئی درجات کے لیے صرف ایک ہی اساتذہ اور نصابی کتب کا وقت پر میسر نہ ہونا وغیرہ وغیرہ تعلیمی عوامل میں شامل ہیں۔ نصاب میں خامیاں ایک دوسری وجہ ہے۔ اسکول میں دی جانے والی تعلیم کا معیار بھی مندرجہ ذیل وجوہ کے باعث غیر اطمینان بخش ہے۔ (۱) اسکولی عمارتوں کی زبوں حالی اور سہولیات کی کمی (۲) اساتذہ کی ناکافی تعداد (۳) استاد کی اہلیت اور تعلیم دینے کی تحریک میں پائی جانے والی کمیاں۔

اسکول سے لڑکیوں کے اخراج کے سلسلے میں بھی کچھ مسائل ہیں ان میں (۱) غریبی (۲) امور خانہ داری میں ان کی ضرورت، کھیتی کے کام میں ان کی مدد اور گھر پر چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال (۳) تعلیم کے لیے تحریک پیدا کرتے ہیں۔ اساتذہ کی کم مائیگی اور استانیوں کی کمی (۴) یہ خیال کہ تعلیم کا کوئی خاص استعمال نہیں ہوتا۔ (۵) اسکول کے اندر ناموافق ماحول (۶) چھوٹی عمر میں لڑکیوں کی شادی (۷) سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد لڑکیوں کو گھر سے باہر بھیجنے میں ہچکچاہٹ (۸) اسکولوں اور ہوسٹلوں کی عمارتوں کی کم تعداد۔

عورتوں کی خواندگی کے سلسلے میں ایک اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی حیثیت کم تر مانی جاتی ہے اور ہر سطح پر مردوں کو عورتوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر والدین لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری کی تربیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کی تعلیم کی ضرورت کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ شادی کے سلسلے میں کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے ایک تعلیم یافتہ مرد کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنی تعلیم کی وجہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ کرتا ہے۔ لڑکی سے زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تو کم از کم برابر تعلیم یافتہ لڑکے کی تلاش ایک مشکل کام ہے۔ سرمایہ کاری کے لحاظ سے زیادہ تر والدین لڑکے کی تعلیم پر اخراجات کو بجا تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ لڑکی تو شادی کے بعد پرائی ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں کے سلسلے میں توقع یہ کی جاتی ہے کہ ان کی شادی ابتدائی عمر میں ہی کی جانی چاہیے ورنہ والدین کو سماجی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسکول سے لڑکیوں کے اخراج کی اہم وجہ یہ ابتدائی عمر کی شادی ہی ہے۔

مزید برآں۔ اسکول کے نصاب کے تعلق سے شہروں کے مقابلے دیہاتوں میں تفریق برتی جاتی ہے کیوں کہ دیہی زندگی اور ماحول سے اس کا کچھ نہیں یا تھوڑا بہت تعلق ہوتا ہے۔

دیہات سے شہروں کی طرف لوگوں کی منتقلی برابر جاری رہتی ہے کیوں کہ دیہات میں خاندان کے ہر ممبر کو روزگار میسر نہیں ہوتا۔ غریبی، خراب صحت اور ناخواندگی جیسے مسائل دیہی علاقوں میں چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں غریبی اور بے روزگاری بنیادی مسائل ہیں۔ ان کو حل کیے بغیر صحیح معنوں میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دیہی ترقی نہایت ہی ضروری ہے۔

دیہی علاقوں میں ترقی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت نے کئی اسکیمیں تیار کی ہیں جن کے نفاذ کی ذمہ داری جمہوری طور پر منتخب گرام پنچایتوں کے کاندھوں پر ہے۔ ابھی حال ہی میں حکومت نے غریبوں کے لیے کم از کم ضروریات کی اشیا کو دستیاب کرانے کی ذمہ داری بھی ان پنچایتوں کو سونپی ہے۔ مرکزی حکومت براہ راست رقوم کی فراہمی کرتی ہے۔ پنچایتوں کے پاس دو درجن کام ہوتے ہیں۔ آبادیاتی اور ترقیاتی۔ آبادیاتی کاموں میں صفائی ستھرائی حفظان صحت اور ماحولیاتی تحفظ، پانی کی فراہمی، سڑکوں کی تعمیر اور مرمت، روشنی کا انتظام، قبرستانوں کا رکھ رکھاؤ، پرائمری تعلیم اور صحت وغیرہ۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ دیہی علاقوں میں تعلیم نہیں ہوتی ہے اور اس لیے غیر تعلیم یافتہ پنچایت کے ذریعے دیہی پسماندگی پر حملہ کرنے کی حکمت عملی صحیح نہیں ہے۔ قومی سطح پر خصوصی ادارے یعنی منصوبہ بندی کمیشن کے اعلا سطحی ماہرین کے ذریعے تیار کی گئی ترقیاتی اسکیموں کا پنچایتوں کے ذریعے نفاذ ممکن نہیں ہے۔ پنچایتیں فلاح و بہبود اور ترقیاتی کاموں کا لائحۂ عمل تیار کرنے اور اس سلسلے میں پہل کرنے کی قطعاً نااہل ہیں۔ ترقیاتی منصوبہ بندی میں شرکت اور پالیسی کی تشکیل سازی کے لیے ان کے پاس مناسب معلومات کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ کوئی نابینا کسی لیمپ پوسٹ کو روشن کرنے کی بجائے خود اپنے سہارے کے لیے استعمال کرے۔

ترقیاتی عمل میں دشواریوں اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کی شرکت جن کے پاس ترقیاتی منصوبہ بندی اور پالیسی تشکیل سازی کی صلاحیت ہو، بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں دیہی سطح پر رضاکار تنظیموں کے قیام اور ترقیاتی عمل میں ان کی شرکت کے لیے تحریک پیدا کر کے یہ مقصد بہ خوبی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حالاں کہ دیہی علاقوں میں تعلیم کی کمی ہے لیکن جتنے بھی تعلیم یافتہ لوگ موجود ہیں ان کے درمیان سرکاری سماجی کارکنوں کے ذریعے یہ تحریک پیدا کی جائے کہ وہ دیہی لوگوں کو رضاکار تنظیموں کے قیام کے لیے آمادہ کریں اور خود

ان کی فلاح و بہبود کے لیے سرکاری اسکیموں کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ رضاکار تنظیموں کے قیام کے لیے زمین کی ضرورت ہوگی جہاں سے ترقیاتی اور فلاحی اسکیموں پر عمل درآمد کیا جاسکے۔

دیہی علاقوں میں وقف کی جائدادوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کم از کم مسلم علاقوں میں مسجدیں، مدرسے، مقبرے، قبرستان اور غیر استعمال شدہ قبرستان وغیرہ وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ لوگوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ وہ ایک ادارہ قائم کریں اور اس کو سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ / ریاستی وقف بورڈ کے تحت رجسٹر کرائیں تاکہ اس کو ایک قانونی حیثیت حاصل ہو جائے۔

رضاکار تنظیمیں وہ تنظیمیں ہوتی ہیں جن کا قیام ایسے لوگوں کے ذریعے عمل میں آتا ہے جو اپنی مرضی سے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ملک میں سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ مجریہ ۱۸۶۰ء کے تحت کسی مخصوص مقصد کے لیے قائم کی جانے والے ادارے میں کم از کم سات آدمی ہونا چاہیے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو یقینی بنا کر اس کو ایک عوامی تحریک کی شکل دی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ مل جل کر ایسو سی ایشن کی یادداشت (میمورنڈم) اور اس کے قوائد وضوابط تیار کرتے ہیں جن میں ایسوسی ایشن کے قیام کا مقصد واضح کیا جاتا ہے۔ یہ مقصد اسکولوں انٹرمیجیٹ کالجوں یا اس سے بھی اونچے درجے کے کالجوں کا قیام، کمپیوٹر، شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ، کٹنگ اور ٹیلرنگ، موٹر وائنڈنگ، موٹر میکینک، ریڈیو اور ٹی وی مرمت، اس کی تربیت کے لیے پیشہ ورانہ مراکز کا قیام اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور دیہی صنعتوں کا قیام بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے دیہی لوگوں کو نہ صرف تعلیم ملے گی بلکہ روزگار کی فراہمی میں مدد کرنے والی یہی جو غریبوں کو اپنا روزگار شروع کرنے اور سرکاری و نجی شعبے میں روزگار ڈھونڈنے میں مدد کرے گی۔ ایسوسی ایشن کا میمورنڈم تیار کرنے کے لیے ایک پروفارما اور رہنما اصول ہوتے ہیں جو رجسٹرار سوسائٹیز کے یہاں دستیاب ہوتے ہیں۔ ان رہنما اصولوں کے مطابق شرائط کو پورا کرنا ہوتا ہے اور قوائد وضوابط کی تشکیل کرنا ہوتی ہے۔ ان قوائد وضوابط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ادارہ یا تنظیم کن خطوط پر کام کرے گی۔ اس میں ایسوسی ایشن کے عہدیداروں اور کام کے لیے فیصلہ سازی کے طریقۂ کار کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ رجسٹرار آف سوسائٹیز ہر ضلع صدر دفتر میں ہوتا ہے۔ ایسوسی ایشن آف میمورنڈم اور قوائد وضوابط سے متعلق کاغذات کو مبلغ ۵۰ روپے کی فیس کے ساتھ رجسٹرار آف سوسائٹیز کے پاس جمع کرانا ہوتا ہے۔ وہاں اس کا رجسٹریشن ہو جاتا ہے اور ایسوسی ایشن کے چیف ایگزیکٹیو کے نام ایک سرٹیفکیٹ جاری کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایسوسی ایشن کے عہدیداران کو یہ قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے کہ کام شروع کردیں اور عوام، سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں سے عطیات وصول کرسکیں۔ رقوم کی فراہمی کے ذریعے کوئی بھی پروگرام جس کو ایسوسی ایشن کے میمورنڈم میں ظاہر کیا گیا ہو شروع کیا جاسکتا ہے۔ رضاکار تنظیموں کی امداد کرنے والی تنظیمیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سینٹرل وقف کاؤنسل ۱۴/۱۷۳ اجام نگر ہاؤس، شاہجہاں روڈ۔ نئی دہلی۔

(۲) منسٹری آف ویلفیئر (مائنارٹیز اینڈ بیک ورڈ کلاسز) شاستری بھون نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

(۳) مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، تعلیم آباد سنگم وہار نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۲ اور

(۴) منسٹری آف ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ، شاستری بھون نئی دہلی۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں یا دیہی صنعتوں کے قیام کے لیے کچھ ایسے ادارے بھی ہیں جو بہت معمولی شرح مثلاً ۴ فی صد پر قرض فراہم کرتے ہیں۔ مرکزی سطح پر نیشنل مائنارٹیز فنانس ڈیولپمنٹ کارپوریشن، امبیڈکر بھون رانی جھانسی روڈ نئی دہلی اور ریاستی سطح پر اسی طرح کی کارپوریشنز ریاستی دارالحکومتوں میں کام کررہی ہیں۔

اسی مقصد کے لیے اسی طرح کی ایسوسی ایشنز بنا کر ان کو متعلقہ ریاستی بورڈ میں رجسٹر کرایا جاسکتا ہے۔

سماجی کام کے شعبے میں مناسب تجربہ حاصل کرنے کے بعد یہ ایسوسی ایشنز اپنے آپ کو فارن کنٹری بیوشن ریگولیشن ایکٹ کے تحت بھی رجسٹر کراسکتی ہیں۔ اس کے لیے متعلقہ درخواست فارم بھر کر ڈپٹی سکریٹری ایف۔ سی۔ آر۔ اے منسٹری آف ہوم افیئرس، خان مارکیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳ کو بھیجا جاسکتا ہے۔ یہ فارم اسی دفتر سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس رجسٹریشن کے بعد بین اقوامی ایجنسیوں مثلاً اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ سے عطیات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ایجنسیاں مندرجہ بالا مقصد کے لیے کروڑوں روپیہ فراہم کرتی ہیں۔

اگر سماجی بہبود کے کاموں کے لیے خواہش مند افراد کے پاس کوئی تکنیکی تجربہ نہیں ہے تو وہ گرام نیو جن کیندر، ادھیاتمک نگر ڈاسنا ٹاؤن ضلع غازی آباد یوپی سے رابطہ قائم کریں۔ یہ ایجنسی رضاکار تنظیموں کے عہدیداروں کو تربیت فراہم کرتی ہے۔

وقف جائدادوں کو، بشرطیکہ باضابطہ اجازت لے لی جائے، کوچنگ پوائنٹ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جہاں غریب ضرورت مند اور مستحق امیدواروں کی آئی۔ اے ایس / ریاستی سول سروسز اور دوسری ماتحت سروسز کے لیے امتحانات میں شرکت کے واسطے تیاری کرائی جاسکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے حکومت ہند نے ایک سیل مائنارٹیز اور بیک ورڈ کلاسز ونگ، منسٹری آف ویلفیئر، شاستری بھون نئی دہلی میں قائم کیا ہے۔ یہ سیل پسماندہ اور اقلیتوں سے متعلق تنظیموں کو جو مندرجہ بالا سروسز کے امتحانات کے لیے امیدواروں کو تیار کرنے کی خواہش مند ہو امداد فراہم کرتا ہے۔ اس قسم کا پروجیکٹ متعلقہ درخواست فارم پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ درخواست فارم اس

باقی صلا پر

ظہیر الحسن

مناسب سطح بنائے رکھنے کی ضرورت:

فاسفیٹ اور پوٹاش کھادوں کی قیمتیں

یہ خوشی کی بات ہے کہ ۹۷-۱۹۹۶ء میں اناج کی پیداوار پچھلے سال کی پیداوار ۱۸٫۵ کروڑ ٹن کے مقابلے میں ۱٫۳۷ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۹٫۸۷ کروڑ ٹن ہوگئی۔ یہ پیداوار اس سال کے لیے مقرر کردہ نشانہ ۱۹٫۳۵ کروڑ ٹن سے بھی زیادہ ہے۔ ابھی حال کے مہینوں میں ملک میں اناج کی قلت کی سی جو صورت حال پیدا ہوگئی اس سے نمٹنے کے لیے ہمیں دوسرے ملکوں سے اناج درآمد کرنا پڑ رہا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے میں اور ملک میں اناج کی قیمتوں کو ایک مناسب سطح پر بنائے رکھنے میں اس اضافہ سے کافی مدد ملے گی۔ لیکن کھاد قیمت کی نئی پالیسی کی وجہ سے کیمیاوی کھادوں کے استعمال میں جو جمود یا کمی کا رخ سامنے آرہا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہمیں مطمئن نہیں رہنا چاہیے۔

اگست ۱۹۹۲ء میں فاسفیٹی (پی) اور پوٹاشی (کے) کھادوں کی قیمتوں اور ان کی نقل و حرکت پر سے کنٹرول اٹھا لیے جانے کے بعد سے ان کھادوں کے استعمال میں کمی کا جو رخ شروع ہوا تھا وہ اب بھی جاری ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں فاسفیٹی کھادوں کا استعمال ۳۳٫۲ لاکھ ٹن تھا جو ۹۶-۱۹۹۵ء میں گھٹ کر ۲۹ لاکھ ٹن رہ گیا۔ اسی دوران پوٹاشی کھادوں کا استعمال ۱۳٫۷ لاکھ ٹن کے مقابلے ۱۱٫۶ لاکھ ٹن رہ گیا۔ اپریل-ستمبر ۱۹۹۶ء میں ڈائی امونیم فاسفیٹ (ڈی اے پی) کی بکری ۱۵٫۹ لاکھ ٹن تھی جو ۱۹۹۵ء کی اسی چھ ماہی کی ۱۷٫۹ لاکھ ٹن کے مقابلے کم تھی۔ اسی طرح ان دونوں چھ ماہیوں کے دوران مریٹ آف پوٹاش (ایم۔او۔پی) کی فروخت بالترتیب ۹٫۵ لاکھ ٹن اور ۱٫۷ لاکھ ٹن تھی۔ امسال ربیع کی فصل کے لیے ان کھادوں کی فروخت کا جو منظر سامنے آیا ہے وہ بھی ہمت افزا نہیں ہے۔ اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ جاری سال کے دوران ڈی اے پی اور ایم او پی کا استعمال ۹۶-۱۹۹۵ء کے ۳۳ لاکھ ٹن اور ۱۳٫۵ لاکھ ٹن سے بھی کم رہے گا۔

اسی دوران یوریا کے استعمال میں اضافہ ہوتا رہا ہے جس کی وجہ سے نائٹروجن فاسفیٹی اور پوٹاشی کھادوں کا معیاری تناسب (۴:۲:۱) متاثر ہوا ہے۔ نتیجے میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں لگاتار آٹھویں برس اچھی بارش ہونے کے باوجود اناج کی پیداوار پچھلے سال کے ۱۹٫۱۵ کروڑ ٹن کے مقابلے ۶۵ لاکھ ٹن سے گھٹ کر ۱۸٫۵ کروڑ رہ گئی۔ اس سے پہلے یعنی ۹۳-۱۹۹۲ء سے ۹۵-۱۹۹۴ء تک پوٹاشی اور فاسفیٹی کھادوں کے استعمال میں کمی ہونے کے باوجود اناج کی پیداوار زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ ان برسوں سے پہلے ان کھادوں کے مناسب استعمال کی وجہ سے ان کی تھوڑی بہت مقدار مٹی میں باقی بچ رہی تھی جس کی وجہ سے فصلوں کی غذائی ضرورت کسی حد تک پوری ہوتی رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کھادوں کے استعمال میں ہو رہی کمی سے پیداوار متاثر ہونے لگی۔

پوٹاشی اور فاسفیٹی کھادوں کے استعمال میں جمود یا کمی کا جو رخ دیکھا جا رہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ ان کی قیمتوں پر سے کنٹرول اٹھا لیے جانے کے بعد سے ان کی قیمتوں میں لگاتار اور شدید اضافہ رہا ہے۔ مثلاً کنٹرول اٹھائے جانے سے پہلے ایک ٹن ڈی اے پی قیمت ۴۶۸۰ روپے تھی جو اب بڑھ کر ۹۰۰۰ روپے ہوگئی ہے۔ اسی طرح ایم او پی کی قیمت ۱۷۰۰ روپے سے بڑھ کر ۴۵۰۰ روپے فی ٹن ہوگئی ہے۔

قیمت فروخت مناسب پیداواری خرچ اور تقسیم کے جائز اخراجات پر منحصر ہوتی ہے۔ ان کھادوں کے پیداواری خرچ میں خام مال اور درمیانی خام مالے کی قیمتوں کا حصہ ۸۵-۸۰ فی صد ہوتا ہے۔ ملک میں ان خام مالوں کی قیمتوں کا دو باتوں پر انحصار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ انھیں بیرون ملک سے درآمد کرنا پڑتا ہے لہٰذا انھیں جن ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے وہاں ان اشیاء کی قیمتیں اور انھیں ہندوستان لانے کے اخراجات شامل ہوتے ہیں۔ دوسرے چونکہ اشیاء کی قیمتیں ڈالر میں ادا کرنی ہوتی ہیں اس لیے ان اشیاء

موہنڈھا روڈ، حسین آباد، کامٹی، ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

کو درآمد کرتے وقت زرمبادلہ کی در بھی اسے متاثر کرتی ہے۔ بدقسمتی سے جب سے مذکورہ کھادوں کی قیمتوں پر سے کنٹرول اٹھایا گیا ہے تب سے ہی یہ دونوں باتیں ہمارے لیے ناموافق رہی ہیں۔

کنٹرول اٹھائے جانے کے فوراً پیشتر فاسفورس ایسڈ کی درآمدی قیمت ۳۷۵ ڈالر فی ٹن تھی۔ تب انھیں مراقش اور تیونس سے درآمد کرنے پر ۱۲ فی صد اور دوسرے ممالک سے درآمد کرنے پر ۱۵ فی صد کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی تھی۔ درآمد کا ۷۰ فی صد حصہ مراقش اور تیونس سے آتا تھا اور بقیہ ۳۰ فی صد دوسرے ممالک سے۔ اس طرح بوجھ کے تناسب سے کسٹم ڈیوٹی کا اوسط ۱۳ فی صد ہوتا تھا۔ کسٹم ڈیوٹی کا عنصر شامل کرنے کے بعد فاسفورس ایسڈ کی درآمدی قیمت ۴۲۳٫۷۵ ڈالر فی ٹن تھی اور امونیا کی درآمدی قیمت ۱۱۸ ڈالر فی ٹن کے ساتھ ایک ٹن ڈی اے پی پیداوار میں ان دونوں اشیا کا خرچ ۲۲۹٫۳۶ ڈالر ہوتا تھا۔ اس وقت ۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء سے عمل میں آئے زرمبادلہ کے دوہرے نظام کے تحت کھلے بازار میں رائج ڈالر کے مبادلہ کی در یعنی ۲۹ روپے فی ڈالر پر فاسفورس ایسڈ اور امونیا درآمد کرنا پڑتا تھا۔ اس حساب سے ایک ٹن ڈی اے پی کی پیداوار میں ان دونوں اشیا پر خرچ ۶۶۵۱ روپے ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۰ روپے دیگر پیداواری اخراجات (جن میں پونجی سے متعلق اخراجات بھی شامل ہیں) نقل حمل کا بھاڑہ ۴۰۰ روپے اور تقسیم کے اخراجات اس طرح کل ملا کر ایک ٹن ڈی اے پی کی فارم گیٹ قیمت ۹۲۰۰ روپے ہوتی تھی۔ لیکن چوں کہ سرکار نے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۴۶۸۰ روپے طے کی تھی اس لیے ان دونوں قیمتوں کے درمیانی فرق کو وہ امداد کے طور پر برداشت کرتی تھی۔

کھاد کی قیمت سے متعلق مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی سفارش پر سرکار نے اگست اور ستمبر ۱۹۹۲ء میں کھاد کی قیمتوں اور ان کی پیداوار کے تعلق سے اقدامات کے ایک پیکیج کا اعلان کیا۔ ۲۵ اگست ۱۹۹۲ء سے یوریا کی قیمت میں ۱۰ فی صد کی کمی کی گئی۔ اس کے ساتھ سبھی فاسفیٹی اور پوٹاشی کھادوں کی قیمتوں اور نقل و حرکت پر جاری کنٹرول اٹھا لیا۔ ڈی اے پی اور مرکب کھادوں کے مقامی مینوفیکچررس کو درآمد کی جانے والی ڈی اے پی کی قیمت کا مقابلہ کرنے کے لائق بنانے کی غرض سے فاسفورس ایسڈ پر کسٹم ختم کر دیا گیا اور تمام فاسفیٹی کھادوں کی پیداوار میں لگنے والے خام مال کی درآمد کے لیے زرمبادلہ کی سرکاری در پر ڈالر مہیا کرنے کا اعلان کیا۔ اس وقت ڈالر کی سرکاری مبادلہ در ۲۵٫۸۹ روپے تھی اس طرح اکتوبر اور دسمبر ۱۹۹۲ء کے درمیان فاسفورس ایسڈ اور امونیا کی درآمدی قیمت کم ہو کر بالترتیب ۳۴۰ ڈالر اور ۱۱۲ ڈالر فی ٹن ہو گئی۔

ان سرکاری سہولیات کی وجہ سے ڈی اے پی پیداوار میں فاسفورس ایسڈ اور امونیا کا خرچ کم ہو کر ۱۸۷٫۴۸ ڈالر فی ٹن رہ گیا۔ اس طرح اس کھاد کی مناسب فارم گیٹ قیمت کم ہو کر ۷۵۰۰ روپے فی ٹن ہوئی۔ لیکن سرکار نے جہاں یہ سہولیات دیں وہیں اس کھاد کی قیمت اور اس کے نقل و حرکت پر سے کنٹرول اٹھا لیا اور اب تک دی جانے والی سرکاری سبسڈی کے عوض ۱۰۰۰ روپے فی ٹن کی عارضی رعایت دینے کا اعلان کیا جس کی وجہ سے کسان کے لیے اس کھاد کی قیمت ۶۵۰۰ روپے فی ٹن ہو گئی جو کہ کنٹرول اٹھائے جانے سے پہلے کی قیمت یعنی ۴۶۸۰ روپے فی ٹن کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔

لیکن بدقسمتی سے اس کھاد کے پیداواری خرچ میں کمی کے جو اقدامات کیے گئے تھے ان سے ملنے والا فائدہ بہت تھوڑے عرصہ کے لیے میسر رہا۔ جہاں تک زرمبادلہ کی نچلی اور سرکاری در کی سہولت کا تعلق ہے وہ اس وقت خود بہ خود ختم ہو گئی جب سرکار نے یکم مارچ ۱۹۹۳ء سے زرمبادلہ کی سرکاری اور کھلے بازار کی دروں کو متحد کرتے ہوئے جاری کھاتہ پر مکمل مبادلت کا اعلان کیا۔ مزید یہ کہ اسی دوران عالمی منڈی میں فاسفورس ایسڈ کی قیمتوں میں شدید اضافہ بھی ہوا جس کی وجہ سے فاسفورس ایسڈ پر کسٹم ڈیوٹی ختم کیے جانے سے جو راحت ملی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر گر جانے کی وجہ سے ڈی اے پی پیداوار میں فاسفورس ایسڈ اور امونیا کا حصہ ایک بار پھر زیادہ ہو گیا۔

دسمبر ۱۹۹۶ء اور جنوری ۱۹۹۷ء میں جب کہ ڈالر کے مبادلہ میں روپے کی قدر گھٹ کر ۳۵٫۸۰ روپے ہو گئی تب فاسفورس ایسڈ اور امونیا کا خرچ بڑھ کر ۲۵۴٫۹۲ ڈالر یعنی ۹۱۲۶ روپے ہو گیا۔ یہ خرچ اکتوبر دسمبر ۱۹۹۲ء میں ہونے والے خرچ کے مقابلے ۴۲۶۳ روپے سے زیادہ تھا۔ اس اضافی خرچ میں عالمی منڈی میں فاسفورس ایسڈ اور امونیا کی قیمتوں میں ہوئے اضافے کا حصہ ۱۷۳۷ روپے اور بقیہ ۲۵۲۶ روپے زرمبادلہ کے نئے نظام کی وجہ سے روپے کی قدر میں آئی گراوٹ کی وجہ سے تھا۔

ڈی اے پی پیداوار میں خام مال پر ہونے والے خرچ میں بھاری اضافہ کے ساتھ ساتھ پیداوار کے دوسرے اخراجات میں بھی کافی اضافہ ہوتا رہا ہے جس کی وجہ سے اب اس کی فارم گیٹ قیمت ۱۲۰۰۰ روپے فی ٹن ہوتی ہے۔ اس میں ۳۰۰۰ روپے کی سرکاری رعایت کے بعد بھی کسانوں کو ایک ٹن ڈی اے پی کے لیے ۹۰۰۰ روپے ادا کرنا پڑتا ہے۔ فاسفیٹی اور پوٹاشی کھادوں کی قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال میں جو کمی واقع ہو رہی ہے اس سے کیمیاوی کھادوں کے استعمال کا نمونہ تناسب متاثر ہو رہا ہے۔ اس سے لمبی مدت میں زمین کی زرخیزیت متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔

زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کے لیے فاسفیٹی اور پوٹاشی کھادوں کے استعمال میں اضافہ کیے جانے کی ضرورت ہے جو ان کی قیمتوں کو ایک مناسب سطح پر برقرار بنائے رکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے نہ صرف ان کھادوں کے پیداواری خرچ میں ہو رہے اضافہ پر روک لگانا ہوگی بلکہ ان کھادوں کی قیمتوں میں دی جانے والی رعایت میں وقتی طور پر اضافہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ کھاد قیمت کی نئی پالیسی کی وجہ سے ۹۳-۱۹۹۲ء سے ۹۶-۱۹۹۵ء تک جہاں پیداواری خرچ میں بھاری اضافہ ہوتا رہا وہیں ۱۰۰۰ روپے فی ٹن کی رعایت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا جس سے قیمت فروخت جو ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۶۵۰۰ روپے تھی وہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۸۵۰۰-۷۵۰۰ روپے ہو گئی اور ۹۶-۱۹۹۵ء میں اس میں اور زیادہ اضافہ ہو کر یہ ۱۰۰۰۰-۹۵۰۰ روپے فی ٹن ہو گئی۔ حالات کی سنجیدگی کا جائزہ لیتے ہوئے اور کسانوں کو فاسفیٹی اور پوٹاشی کھادوں کے مناسب استعمال کی ترغیب دینے کی غرض سے سرکار نے ۶ جولائی ۱۹۹۶ء سے ڈی اے پی پر دی جانے والی رعایت ۱۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۳۰۰۰ روپے فی ٹن کر دی۔ لیکن ڈی اے پی کے پیداواری خرچ میں تیزی سے ہو رہے اضافہ کی وجہ سے سرکاری رعایت میں تین گنا اضافہ کے باوجود اس کی قیمت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی اور اب بھی اس کی قیمت ۹۰۰۰ روپے فی ٹن کی اونچی سطح پر بنی ہوئی ہے۔

قیمتیں اونچی رہنے کے علاوہ دستیابی کی دقت بھی ڈی اے پی کے استعمال میں آئی کمی کی خاص وجہ رہی ہے۔ دستیابی کی دقت کے لیے تین خاص وجوہات ہیں۔ اول تو سرکار کی جانب سے قیمتوں کے تعین میں کافی دیر ہوتی ہے اور دی جانے والی رعایت کی ادائیگی چوں کہ ریاستی سرکاروں کے ذمے ہے ان کی جانب سے سبسڈی کے بلوں کے سلسلے میں کافی دیر ہوتی ہے۔ بجٹ میں اس مد کے لیے کافی رقم مختص کیے جانے اور ریاستی سرکاروں کی جانب سے بلوں کی ادائیگی میں تیزی لانے کے وعدوں کے باوجود ۱۰۰۰ کروڑ روپے بقیہ کے ساتھ بلوں کی ادائیگی مینوفیکچررس کے لیے تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔

چوں کہ قیمتوں کے تعین میں کافی دیر ہوتی ہے اس لیے پیداواری اخراجات کا جائزہ لینے کے بعد سرکار جتنی مدت میں فیصلے لیتی ہے اس دوران قیمتوں میں اضافہ کا چکر چلتا رہتا ہے نتیجے میں جب قیمتوں کا اعلان ہوتا ہے تب تک پیداواری اخراجات میں اضافہ ہو چکا ہوتا اس لیے کھاد بنانے والی کمپنیاں اس قیمت کو منفعت بخش نہ مانتے ہوئے دوسری منفعت بخش کھادوں کی پیداوار کی طرف زیادہ دھیان دیتی ہیں اس لیے بھی یہ کھاد ان کی ضرورت کے وقت دستیاب نہیں ہوتی۔

فاسفیٹی اور پوٹاشی کھادوں کے استعمال میں آ رہی کمی کو روکنے کے لیے اور ان کے استعمال کو ملک کے منظور شدہ نمونہ تناسب تک پہنچانے کے لیے ایک سہ رخی لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ اول تو روپے کو نہ صرف مستحکم بلکہ اور زیادہ مضبوط بنانے کی ضرورت ہوگی۔ یہ چوں کہ معیشت کا ایک وسیع تر مسئلہ ہے اس لیے بیرونی ادائیگی کو صحت مند حالت میں لانا ہوگا۔ درآمدات اور برآمدات کے لین دین میں جو مختلف بدعنوانیاں دیکھی جا رہی ہیں انھیں دور کیے جانے پر اس سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً ایک امریکی ماہر معاشیات کی تازہ تحقیق کے مطابق برآمدات کی قیمتیں کم اور درآمدات کی قیمتیں زیادہ رکھنے کی وجہ سے ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء دو سالوں کے دوران ملک سے ۱۱ر۴ ارب ڈالر امریکہ کو منتقل ہو گیا بین اقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کا ایک غیر رسمی اندازہ اس طرح منتقل ہونے والی رقم کا تخمینہ ایک سو ارب ڈالر لگاتا ہے۔ امریکی ماہر کی تحقیق اور آئی ایم ایف کا اندازہ تو صرف امریکہ کے ساتھ ہونے والی تجارت تک محدود ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے (اور نہ ماننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی) تو ان پر روک لگانے کے بعد ملک کی بیرونی ادائیگی کی صورت حال کتنی صحت مند ہو سکتی ہے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نتیجے میں روپے کی قدر بھی کافی مستحکم ہو سکے گی۔ ملک سے روپے کی اس ناجائز اور غیر قانونی منتقلی کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات سے نہ صرف پوٹاشی اور فاسفیٹی کھادوں کی قیمتوں میں خوش آئند کمی واقع ہوگی بلکہ معیشت کے دوسرے شعبوں کو بھی بہت بڑا فائدہ ہوگا۔

دوسری عالمی منڈی سے فاسفورس ایسڈ اور امونیا سستے دام پر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ جن ممالک میں خام مال وافر مقدار میں پایا جاتا ہے جیسے مراقش جارڈن اور تیونس ان ملکوں میں مشترک کارخانے کھولے جائیں تاکہ وہاں سے متوسط پیداوار مناسب دام پر حاصل کی جا سکے۔ جب ان ملکوں میں کثیر ملکی کمپنیاں مشترک کارخانے لگا سکتی ہیں تو پھر تکنالوجی اور انتظامی صلاحیتوں سے لیس ہندوستانی کمپنیاں ان ملکوں میں مشترک کارخانے کیوں نہیں چلا سکتیں۔

ان اقدامات سے نتائج برآمد ہونے تک ان کھادوں کی قیمتیں مناسب سطح پر بنائے رکھنے کے لیے سرکاری امداد کی فوری ضرورت ہوگی۔ لیکن اس کی تکمیل آوری میں ممکنہ خامیوں سے بچنے کے لیے سرکار کو چاہیے کہ ہر فصل سے پہلے ان کھادوں کے مینوفیکچررس سے مشورہ کرنے کے بعد علامتی قیمت کا اعلان کرے اور جیسا کہ اگست ۱۹۹۲ء تک ہوتا آیا تھا اور یوریا کے تعلق سے اب بھی ہو رہا ہے ریاستی سرکاروں کو درمیان میں لائے بغیر مال کی روانگی کی بنیاد پر تیار کیے گئے سبسڈی کے ماہانہ بلوں کی ادائیگی فوراً کی جائے اور سبسڈی کی اسکیم کو ایک ایک سال کے لیے

منظوری دیے جانے کی وجہ سے جو غیر یقینی کے حالات پیدا ہو گئے ہیں انھیں دور کیا جائے۔

گوشوارہ نمبر ۱
کیمیاوی کھادوں کا استعمال

(لاکھ ٹن میں)

سال	نائٹروجن (این)	فاسفورس (پی)	پوٹاش (کے)	میزان (این پی کے)
۱۹۶۰-۶۱ء	۲	منفی	منفی	۲
۱۹۷۰-۷۱ء	۱۵	۵	۲	۲۲
۱۹۸۰-۸۱ء	۳۷	۱۲	۶	۵۵
۱۹۹۰-۹۱ء	۸۰	۳۲	۱۳	۱۲۵
۱۹۹۱-۹۲ء	۸۰	۳۳	۱۴	۱۲۷
۱۹۹۲-۹۳ء	۸۴	۲۹	۹	۱۲۲
۱۹۹۳-۹۴ء	۸۸	۲۷	۹	۱۲۴
۱۹۹۴-۹۵ء	۹۵	۲۹	۱۱	۱۳۵
۱۹۹۵-۹۶ء	۹۸	۲۹	۱۲	۱۳۹
۱۹۹۶-۹۷ء	۱۱۲	۳۷	۱۵	۱۶۴

• اندازہ ماخذ: معاشی جائزہ ۹۷-۱۹۹۶ء

گوشوارہ نمبر ۲
کل ہند این کے پی کے استعمال کا تناسب

سال	نائٹروجن	فاسفیٹ	پوٹاش
۱۹۵۵-۵۶ء	۱۰٫۸	۱٫۳	۱
۱۹۶۰-۶۱ء	۷٫۲	۱٫۸	۱
۱۹۶۵-۶۶ء	۷٫۵	۱٫۷	۱
۱۹۸۰-۸۱ء	۵٫۹	۱٫۹	۱
۱۹۸۵-۸۶ء	۷٫۰	۲٫۵	۱
۱۹۹۱-۹۲ء	۵٫۹	۲٫۴	۱
۱۹۹۲-۹۳ء	۹٫۵	۳٫۲	۱
۱۹۹۳-۹۴ء	۹٫۷	۲٫۹	۱
۱۹۹۴-۹۵ء	۸٫۴	۲٫۶	۱
۱۹۹۵-۹۶ء	۸٫۵	۲٫۵	۱

ماخذ: معاشی جائزہ ۹۷-۱۹۹۶ء

گوشوارہ نمبر ۳
کھاد کی قیمتیں

روپے/ٹن

سال	یوریا	ڈی اے پی	ایم او پی	نسبتی قیمت تناسب	
				ڈی اے پی/یوریا	ایم او پی/یوریا
۱۹۸۹-۹۰	۲۳۵۰	۳۶۰۰	۱۳۰۰	۱٫۵۳	۰٫۵۵
۱۹۹۰-۹۱	۲۳۵۰	۳۶۰۰	۱۳۰۰	۱٫۵۳	۰٫۵۵
۱۹۹۱-۹۲	۳۰۶۰	۴۶۸۰	۱۷۰۰	۱٫۵۳	۰٫۵۶
۱۹۹۲-۹۳ (خ)	۳۰۶۰	۴۶۸۰	۱۷۰۰	۱٫۵۳	۰٫۵۶
۱۹۹۲-۹۳ (ر)	۲۷۶۰	۶۶۵۰	۴۵۰۰	۲٫۴۱	۱٫۶۳
۱۹۹۳-۹۴ (خ)	۲۷۶۰	۶۶۰۰	۳۸۰۰	۲٫۳۹	۱٫۳۸
۱۹۹۴-۹۵ (خ)	۳۳۲۰	۷۵۰۰	۳۸۰۰	۲٫۲۶	۱٫۱۴
۱۹۹۵-۹۶ (خ)	۳۳۲۰	۹۸۰۰	۴۴۵۰	۲٫۹۵	۱٫۳۴
۱۹۹۵-۹۶ (ر)	۳۳۲۰	۱۰۰۰۰	۴۶۰۰	۳٫۰۱	۱٫۳۹

ڈی اے پی اور ایم او پی کی قیمتیں فی ٹن ۱۰۰۰ روپے سبسڈی وضع کرنے کے بعد دی گئی ہے۔ خ۔ خریف ر۔ ربیع

ماخذ: معاشی جائزہ ۹۷-۱۹۹۶ء

محمد طارق

ماحول اور معاشیات میں :

بے کار اشیا چننے والوں کا رول

(ایک مطالعہ)

اکثر غریب عورتیں اور بچے کوڑے کے ڈھیروں میں کچھ تلاش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہم ان کو صرف ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ افراد رحمت خداوندی کی دوسری شکل ہیں کیوں کہ یہ اپنے عمل سے ماحولیاتی اعتدال میں توازن قائم کرتے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف ماحولیاتی نقطہ نظر سے بلکہ معاشی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ وہ تمام اشیاء مثلاً بے کار پلاسٹک کی تھیلیاں، ربر سے بنی اشیاء، ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے، ردی کاغذ اور ہڈیاں وغیرہ جن کو ضائع ہونے میں ایک مدت درکار ہے۔ ان بے کار اشیاء کو کوڑے کے ڈھیروں سے تلاش کرکے دوبارہ قابل استعمال بنانے (RE-CYCLING) کے عمل میں یہ افراد اپنا نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں اعتدال پیدا کرنے میں یہ افراد بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں ساتھ ہی معیشت کی اصلاح میں حصہ دار بنتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں شاہجہاں پور شہر میں رہنے والے ایسے افراد اور ان کے عمل سے ماحولیات اور معاشیات پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

شاہجہاں پور شہر اتر پردیش کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اس شہر کا قیام مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے دور حکومت میں عمل میں آیا تھا جب بادشاہ کے فوجی کمانڈر نواب بہادر خان نے اس شہر کو بادشاہ کے نام سے منسوب کیا۔ کسی بھی شہر کی اقتصادی اور ترقیاتی سرگرمیوں کا اندازہ وہاں کے باشندوں کے کاروبار اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور ان کی مصروفیات پر منحصر ہوتا ہے۔ ذیل میں درج جدول نمبر ۱ میں ۱۹۹۱ء کی سرکاری رائے شماری کی بنیاد پر صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

نمبر شمار	کاروبار / پیشہ	تعداد	فی صد
۱۔	کاشت کار	۸۹۳۰	۸٫۰۲ فی صد
۲۔	زرعی مزدور	۱۰۹۳۰	۹٫۸۲ فی صد
۳۔	کانوں میں	۳۲	۰٫۰۳ فی صد
۴۔	گھریلو صنعت و حرفت	۴۹۸۶	۴٫۴۸ فی صد
۵۔	اشیاء بنانے کی صنعت و حرفت (گھروں کے علاوہ)	۱۲۷۵۵	۱۱٫۴۷ فی صد
۶۔	معمار	۳۸۱۰	۳٫۴۳ فی صد
۷۔	تجارت	۲۲۵۲۷	۲۰٫۲۶ فی صد
۸۔	سواری، باربرداری گودام اور خبر رسانی	۶۵۱۶	۵٫۸۶ فی صد
۹۔	شکار اور مویشی	۱۱۷۲	۱٫۰۵ فی صد
۱۰۔	چیتھڑے اکٹھا کرنے والے بیکار اشیاء کو فروخت کرنے والے	۲۶۴۹	۲٫۶۵ فی صد
۱۱	دیگر نوکریوں میں	۳۶۵۹۶	۳۲٫۹۱ فی صد

اس نقشہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شہر کی آبادی کا بڑا حصہ (تقریباً ۲۰ فی صد) صنعت و تجارت میں مصروف ہے جو آبادی کے ۳۳ فی صد طبقہ کے ملازمت میں مصروف ہونے کی وجہ سے دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ ۱۶ فی صد افراد بڑی صنعتوں سے وابستہ ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔ ۔۔ کوڑا اکٹھا کرنے والے آبادی کا ۲٫۵ فی صد ہیں۔ یہ افراد عموماً بہار، بنگال سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہار اور بنگال سے تعلق رکھنے والی

شعبہ معاشیات، گاندھی فیض عام (پی۔ جی) کالج، شاہجہاں پور

یہ عورتیں جو اس کاروبار میں لگی ہیں تقریباً برابر کی تعداد میں ہیں، لیکن بچوں کی تعداد صوبہ بہار میں بنگال کی دوگنی ہے۔ حالاں کہ ہمارا معاشرہ ان کو اور ان کے اس عمل کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جب کہ یہ افراد معاشرے کے تحفظ اور بقا و ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ جس کا مندرجہ ذیل حقائق کی بنیاد پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ماحولیاتی کردار

جو لوگ ماحولیات کا کچھ علم رکھتے ہیں یا آج کل جب کہ ایک عام انسان بھی اس بات کی اہمیت کا احساس رکھتا ہے کہ ماحولیات کے نظام اعتدال میں صفائی کارکنوں کا کیا کردار ہے۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو مردہ اور بے کار اشیا کو دوبارہ زندگی دے کر قابلِ استعمال بنانے میں اپنا نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ عمل بند کر دیا جائے تو ماحولیاتی نظام کی بقا کا تصور کرنا مشکل ہے۔

قدرت نے ارضیات کی بقا اور ارتقا میں انسانوں کو ماحولیاتی نظام کے لیے دانشمندانہ وجود بخشا ہے لیکن زمین پر انسان قدرت کا وہ عظیم الشان شاہکار ہے جس نے زندگی کو آسان اور آرام دہ بنانے کے لیے ان چیزوں کی ایجاد کی ہے جو قدرت کے نباتاتی، ارضیاتی اور کیمیائی نظام میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح انسان نہ صرف اس نظام میں سہولت بلکہ مختلف نظام قدرت میں رکاوٹ پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

شہروں میں بنیادی طور پر صفائی کا یہ طریقہ رہا ہے کہ استعمال شدہ پانی کے بہاؤ کا رخ قریب ترین دریا کی طرف کر دیا جاتا ہے تاکہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ شہر کی تمام گندگیاں بھی ندی میں چلی جائیں اور شہریوں کی صحت کی حفاظت کی جاسکے۔ لیکن اس طریق کار سے ندیوں کا پانی گندہ ہو جاتا ہے۔ آج کل ایک نیا مسئلہ اور پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ پلاسٹک اور اسی قسم کی بعض دوسری اشیا جن کو بعد استعمال کے نالوں میں پھینک دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے نالوں میں بہنے والے پانی کا بہاؤ رک جاتا ہے اور ساری گندگی مع پانی کے سڑکوں پر بہنے لگتی ہے۔ یہ صورت حال اس وقت اور بھی خراب رخ اختیار کر لیتی ہے جب صفائی ملازمین مہینوں کی ہڑتال پر چلے جاتے ہیں جیسے کہ پچھلے کئی سالوں سے شاہجہاں پور میں ہو رہا ہے اور جو وبائی امراض پھیلنے کی خاص وجہ ہے۔

یہ مسئلہ صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا کیوں کہ پلاسٹک سے بنی اشیا اور اسی قسم کی بعض دوسری اشیا جو قدرتی طریقہ سے ضائع نہیں ہوتیں ان کو اکٹھا کر کے شہر کے باہر جمع کیا جاتا ہے۔ یہ جمع کی گئی اشیا قرب و جوار کے کھیتوں میں نئے پریشانیوں کا باعث بنتی ہیں۔

ان تمام مسائل کا بہترین حل یہ ہے کہ ان اشیا کو اکٹھا کر کے دوبارہ قابلِ استعمال بنایا جائے۔ لیکن ہمارے معاشرہ میں کوڑے کے ڈھیروں سے ان بے کار اشیا کو اکٹھا کرنا اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے اور اس کام میں مصروف افراد کو کمتر درجہ کا انسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کیا ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ لوگ کس قدر قابلِ ستائش ہیں جن کے ذریعہ یہ بے کار اشیا دوبارہ قابلِ استعمال ہو جاتی ہیں۔

معاشی کردار

دوسری جانب یہ افراد معاشی اعتبار سے نہ صرف اپنے لیے ایک ذریعہ معاش پیدا کرتے ہیں بلکہ معاشرہ کا ایک بڑا حصہ بھی اس عمل سے مستفید ہوتا ہے۔ شاہجہاں پور شہر میں ان افراد پر مشتمل چار گندی بستیاں وجود میں آئی ہیں اور ان بستیوں میں رہنے والے افراد بنگلہ دیشی کہے جاتے ہیں۔ اس آبادی کی ۴/۳ آبادی عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے جو کوڑے کے ڈھیروں سے ان بے کار اشیا کو اکٹھا کرنے کا کام کرتے ہیں (دیکھیے گوشوارہ نمبر ۲) ان بچوں اور عورتوں کے ذریعہ اکٹھا کی جانے والی اشیا مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں چنانچہ ان کی آمدنی میں فرق ہوتا ہے (دیکھیے گوشوارہ نمبر ۳)

مزید برآں تقریباً ۱۵ سو افراد ان اکٹھا کی گئی اشیا کی تجارت میں لگے رہتے ہیں جن کو "کباڑی" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کباڑی ان اشیا کو انتہائی کم قیمت پر خرید کر زیادہ داموں پر فروخت کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ افراد اکٹھا کرنے والے لوگوں کی قیمت پر منافع کماتے ہیں۔ مثال کے طور پر معمولی درجہ کی پالیتھین جو یہ کوڑا کباڑ اکٹھا کرنے والے چنتے ہیں تقریباً آٹھ دس روپیہ تک بک جاتی ہے۔ اس طرح چیتھڑے مہیا کرنے والوں کا یہ عمل کباڑ فروشوں کے معاش کا ایک لازمی جزو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ کباڑ فروش ان چیتھڑے اکٹھا کرنے والوں کی قیمت پر بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر کے سماج کے متوسط طبقہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جب کہ یہ چیتھڑے اکٹھا کرنے والے جن کو اس مشکل ترین کام کے عوض زیادہ سے زیادہ ستائش اور فائدہ پہنچنا چاہیے۔ خطِ افلاس سے نیچے ہی رہنے پر مجبور ہیں۔

اس بنیادی اور اہم کام کے عمل میں لانے کی وجہ سے ان لوگوں کو حکومت کی طرف سے معاشی امداد ملنی چاہیے اور ان کی مہیا شدہ اشیا کی قیمت دوسری چیزوں کی طرح بڑھا دینی چاہیے۔ اس طرح کہ انھیں ان کے کام کا زیادہ حصہ مل سکے اور وہ ایک بہتر زندگی گزار سکیں۔

دوسرے یہ کہ بے کار اشیاء کو اکٹھا کرنے کے اس عمل کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ عام لوگوں کو ان افراد کے اس انتہائی اہم کام کے سلسلہ میں باخبر کرنا چاہیے اور ان بے کار اشیاء کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ قدم اٹھانا چاہیے تاکہ یہ اہم کام باقاعدہ اور سائنٹفک طریقے پر ہو سکے۔

گوشوارہ نمبر ۲

نمبر شمار	آبادی کے نام	مکمل آبادی	چیتھڑے اٹھانے والوں کا فی صد
۱۔	تارین ٹکلی	۸۲۵	۷۲/۷۲ فی صد
۲۔	ٹاؤن ہال	۶۹۲	۸۶/۷۰ فی صد
۳۔	مہندر جلال نگر	۷۴۵	۷۳/۸۳ فی صد
۴۔	شہر کے مختلف علاقے	۲۱۰	۷۱/۴۳ فی صد

گوشوارہ نمبر ۳

اشیاء	اشیاء کی قیمتیں روپیہ/کلو	بچے		بالغ (عورتیں)	
		مقدار (کلو)	کمائی (روپیوں میں)	مقدار (کلو میں)	کمائی (روپیوں میں)
پالیتھین	۰/۵۰	۴	۲/۰۰	۵	۲/۵۰
شیشہ	۰/۷۵	۲	۱/۵۰	۵	۳/۷۵
کاغذ	۰/۷۵	۲	۱/۵۰	۶	۴/۵۰
ہڈی	۱/۵۰	۲	۳/۰۰	۳	۴/۵۰
چپل	۵/۰۰	۰/۵	۲/۵۰	۱	۵/۰۰
پلاسٹک کی اشیاء	۱۰/۰۰	۰/۵	۵/۰۰	۱	۱۰/۰۰
گتہ	۲/۰۰	۱	۲/۰۰	۳	۶/۰۰
سفید پالیتھین	۲/۰۰	۲	۴/۰۰	۲	۴/۰۰
شراب کی تھیلیاں	۱۲/۰۰	—	—	۰/۲۵	۳/۰۰
اوسط	۳/۸۳	۱/۷۵	۲/۶۸	۲/۹۲	۴/۸۱

●

بقیہ: دہی: ایک مقوی غذا

لہٰذا یہ دل کے لیے مضر ہے جب کہ دہی کی چکنائی کولیسٹرول میں اضافے کا سبب نہیں بنتی لہٰذا امراض قلب اور بلڈ پریشر میں دہی زیادہ مفید ہے۔ دہی کی چکنائی کے ذرّے دودھ کی بہ نسبت چھوٹے ہوتے ہیں لہٰذا وہ جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔ دہی کا پروٹین بھی جلد ہضم ہونے والا ہوتا ہے۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین/ دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انہیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد/ غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں ۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATIONS) استعمال کئے گئے ہوں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجہ مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لیے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

سید ظفر حسین

جدوجہد آزادی میں غدر پارٹی کا رول

۱۸۵۷ء کی قومی برگشتگی کو ہندوستانی غدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مسلح قومی برگشتگی یعنی جنگ آزادی کے آخری دنوں میں، جب ہندوستان کی آزادی کے متوالے باغیوں نے انگریزوں کو تقریباً کچل کر رکھ دیا تھا، اگر عین وقت پر جاہل اور خود غرض جاگیرداروں کے ذریعہ انگریزوں کی مدد کرنے کی وجہ سے جنگ کا پانسہ نہ پلٹا ہوتا تو ۱۸۵۷ء کے آزادی کے متوالے باغیوں کو شکست کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے نتیجے کے طور پر جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ستارہ غروب ہوا، وہاں برطانوی شہنشاہیت کا سورج طلوع ہوا اور تقریباً سارا ہندوستان اس کے زیر حکمرانی آگیا۔

انگریزوں کی زرعی و اقتصادی استحصال کی پالیسی کے تحت صنعت اور دیہی دست کاریوں میں گراوٹ آنے سے زراعت و کاشت کاری پر گزر اوقات کا بوجھ بڑھ گیا۔ سماج کے نچلے اور درمیانے طبقے معاشی زوال اور بے روزگاری کا شکار ہو گئے۔ پنجاب اور بنگال کے صوبے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں روزگار اور معاشی خوشحالی کی تلاش میں پنجاب کے کسان اور کاشت کار ملک سے باہر جانے لگے تھے۔ اس زمانے میں بنگال اور جنوبی ہندوستان کے بہت سے علاقوں کے لوگ بھی بیرون ملک جانے لگے تھے۔ روزگار کی تلاش میں جب یہ لوگ چین، ملایا، جاپان، انڈونیشیا وغیرہ ہوتے ہوئے کناڈا اور امریکہ گئے تو معلوم ہوا کہ یہاں ورکروں کی اجرتیں ہندوستان کے مقابلے کہیں زیادہ ہیں۔ کناڈا گو برطانوی شہنشاہیت کی ایک نو آبادی تھی مگر یہاں اجرتوں کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے ایشیا کے لوگ، خاص کر چینی و جاپانی اور ہندوستانی باشندے یہاں آکر بہ حیثیت ورکر کام کرنے لگے تھے۔

علاوہ ازیں، متمول خاندانوں کے لوگ بھی اعلا تعلیم کی غرض سے برطانیہ اور یوروپ گئے۔ وہاں کے سیاسی سماجی، تمدنی اور تعلیمی حالات سے روشناس ہوئے نیز ایک آزاد اور خود کفیل سماج سے متعارف ہوئے۔ کناڈا اور امریکہ میں ارزاں مگر جفاکش ایشیائی ورکروں کی دستیابی سے اجرتوں کی شرح میں گراوٹ آئی۔ سفید فام لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع کم ہو گئے۔ وہ خود کو رنگ و نسل کے اعتبار سے بہتر سمجھتے تھے۔ ان میں موجود رنگ و نسل کے احساس برتری اور تعصب نے اس مسئلے کو ہوا دی۔ کناڈا اور امریکہ میں اس رنگ و نسل کے امتیاز اور تعصب کی مخالفت نے تحریک کا درجہ حاصل کر لیا۔ نقل وطن کی راہ میں کھڑی مشکلات کے حل کے لیے برطانوی شہنشاہیت اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کی توجہ مبذول کرائی گئی تو ہندوستان کی برطانوی حکومت کو ایک نئے خطرہ کا احساس ہوا۔

بہر حال جب ہندوستانیوں کو کناڈا اور امریکہ میں رنگ و نسل کے امتیازی سلوک اور ایک محکوم ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ذلت، بے عزتی اور تعصب کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے اس کا مقابلہ اپنے ملک کی بہترین تہذیبی روایات سے کیا تو ان میں خود داری کا احساس اور قومی شعور بیدار ہوا اور اس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے ملک کو سامراجی تسلط سے آزاد کرانے کی کوششیں شروع کر دیں اور ان کوششوں کو ایک فعال تحریک میں بدل دیا۔

۱۹۰۷ء میں برصغیر امریکہ میں معاشی بحران پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں چاروں طرف بے روزگاری پھیل گئی۔ ہندوستانی لوگ ارزاں ورکروں کی حیثیت سے کام پر لگے رہے۔ ان کے خلاف نسلی امتیاز و تعصب نے نسلی فسادات کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستانی باشندے زیادہ تر کیلی فورنیا، اوریگون، واشنگٹن سان فرانسسکو، وینکوور میں قیام پذیر تھے۔

کچھ متمول حضرات اجوالا سنگھ، وساکا سنگھ، سنتوک سنگھ، سوہن سنگھ بھکنہ، کیسر سنگھ، کانشی رام وغیرہ نے مل کر وینکوور میں ایک گردوارہ تعمیر کر لیا تھا۔ مگر رنگ و نسل کے امتیازی سلوک اور ایک محکوم ملک کے باشندے ہونے کے باعث سماجی عزت و وقار سے محروم رہنے کی وجہ سے انھوں نے

ایک سماجی وسیاسی تنظیم قائم کی۔ یوں تو قومی تصور و احساس پر مبنی سرگرمیاں ۱۹۰۶ء سے جاری تھیں۔ ادھر ہندوستان کی برطانوی حکومت نے نئے خطرات کا احساس کرتے ہوئے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر بیرونی ممالک کے لیے نقل وطن کرنے اور کناڈا و امریکہ میں سکونت پذیر ہونے کی راہ میں سخت رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کر دیں اور ہندوستان میں بھی نقل وطن پر سخت پابندیاں عائد کیں۔

ان سختیوں اور مشکلات کے جواب میں ۱۹۰۷ء میں انڈین انڈی پینڈنس لیگ قائم ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں کانشی رام جوشی کی قیادت میں پورٹ لینڈ ان کی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں پورٹ لینڈ میں ہرنام سنگھ کوٹلہ، اودھ سنگھ، پنڈت کانشی رام، سوہن سنگھ بھکنہ نے پیسفک کوسٹ ہندوستان ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کی نگرانی میں ایک اردو ہفتہ وار "ہندوستان" نکالنے کی تجویز پاس ہوئی۔ لالہ ہردیال جو اپنے انقلابی خیالات کے لیے بہت مشہور تھے، اس میں شمولیت کے لیے انھیں دعوت دی گئی۔

ہردیال بھائی پرمانند کے ساتھ ۲ مارچ ۱۹۱۳ء کو امریکہ پہنچے۔ میٹنگ میں ہردیال نے جمہوری وسیاسی نوعیت کی ایک پارٹی قائم کرنے کی تجویز رکھی، جس میں ۱۸۵۷ء کے غدر کی روح پیوست ہو اور بھارت میں انقلاب لانے کے لیے یہاں تیاریاں کی جائیں اور پھر ہندوستان جاکر برطانوی حکمراں طبقہ کو ملک سے باہر نکال کر امریکی طرز کی جمہوریت قائم کی جائے، جس میں تمام ہندوستانیوں کو مساوی درجہ، ذات پات، فرقہ، رنگ و نسل کے امتیاز و تفریق کے بغیر سماجی وسیاسی آزادی حاصل ہو۔ ہردیال ایک اسکالر اور بہترین خطیب تھے۔ انھوں نے پارٹی کی ترجمانی، برطانوی شہنشاہیت سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تیاریوں اور ہندوستانیوں میں انقلاب انگیز خیالات کی تبلیغ کے لیے ایک ہفت روزہ اردو اور پنجابی میں نکالنے کی تجویز پیش کی اور اس کا نام ۱۸۵۷ء کے غدر کی یاد میں "غدر" رکھا۔ پارٹی کا نام غدر پارٹی اور اس کے تحت چلائی جانے والی تحریک کو غدر تحریک کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا صدر دفتر سان فرانسسکو میں قائم کیا گیا، جس کا نام یوگانتر آشرم رکھا۔

یہ ہفت روزہ "غدر" اردو میں یکم نومبر ۱۹۱۳ء سے اشاعت پذیر ہوا۔ بعد میں یہ ہفت روزہ ہندی، پنجابی، گجراتی زبانوں میں بھی شائع ہوا مگر اس کی اشاعت باقاعدہ نہیں رہی۔ بعد ازاں اس ہفت روزہ کا نام ہندوستان غدر، اسی طرح پارٹی کا نام ہندوستان غدر پارٹی اور تحریک کا نام ہندوستان غدر تحریک رکھا گیا۔ اس پارٹی و تحریک کا اصل مقصد مسلح جدوجہد کے ذریعہ برطانوی تسلط اور غلبہ سے ہندوستان کو آزاد کرانا تھا۔ بندرگاہ سان فرانسسکو انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس پارٹی و تحریک کے صدر سوہن سنگھ بھکنہ منتخب ہوئے۔ ہردیال جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ کیسر سنگھ، پنڈت کانشی رام، ہرنام سنگھ، کریم بخش اور منشی رام دیگر عہدیداران تھے۔ یہ جب آپس میں ملتے تھے تو بندے ماترم کہہ کر ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے تھے۔

اردو ہفت روزہ "ہندوستان غدر" ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد و تحریک کے اولین باب میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ اس کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی تبلیغ کی گئی نیز خودغرضی و مطلب پرستی کی جگہ بھائی چارہ اور دوستی کا پیغام دیا گیا۔ برطانوی شہنشاہیت کی ڈپلومیسی برطانوی حکومت کی دوغلی حکمت عملی، منافقانہ پالیسی، رعایا پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم اور ہندوستان کو مستقل طور پر محکوم بنائے رکھنے کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی گئی۔ ہندوستانیوں کو سرکشی و بغاوت کی دعوت دی گئی۔ نقل وطن کی راہ میں پیدا کی گئی مشکلات اور نقل وطن کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی۔ رنگ و نسل کے امتیاز اور تعصب کے تحت کناڈا اور امریکہ سے واپس کیے جانے والے ہندوستانیوں کی سفر کی سخت صعوبتوں، مالی مشکلات، دیگر ممالک میں ادھر ادھر بھٹکنے، دیوالیہ ہونے کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ الغرض یہ کہ امریکہ اور کناڈا میں مقیم ہندوستانیوں میں سیاسی وسماجی شعور بیدار کیا گیا۔

ہندوستان غدر پارٹی نے انقلاب کے اپنے پروگرام کے تحت ساری دنیا میں اپنے رابطے قائم کیے۔ ملایا، برما، سیام، انڈونیشیا، ہانگ کانگ، فلپائن، چین، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، ارجنٹینا وغیرہ میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اس بات پر زور دیا گیا کہ سیاسی تنظیمیں قائم کی جائیں، انقلاب انگیز سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اتحاد اور ہم آہنگی قائم ہوئی ہے اسے برقرار رکھا جائے۔

غدر پارٹی تحریک کی جانب سے باغیانہ خیالات کی حامل نظموں اور غزلوں پر مشتمل ایک کتابچہ شائع و تقسیم کیا گیا۔ غدر پارٹی و تحریک کی انقلابی سرگرمیوں سے کناڈا اور امریکہ میں انارکی وسماجی انتشار پھیلنے کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ امریکہ کے ایمیگریشن ڈپارٹمنٹ آف لیبر نے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے دباؤ ڈالنے پر اس طرف توجہ دی اور اس طرح ۱۹۱۴ء میں غدر پارٹی کے عہدیداران اور ورکروں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے ہوئے اور پھر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ہردیال ضمانت پر رہا ہوتے ہی اپنی جان کو خطرہ محسوس کرکے امریکہ سے فرار ہوگئے اور سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔

اب پارٹی اور تحریک چلانے کی ذمہ داری سنتوکھ سنگھ، ہرنام سنگھ، کانشی رام، کرتار سنگھ، نرنجن داس، رام چندر وغیرہ کے کاندھوں پر آگئی تھی۔ اس پارٹی نے ایک نیا نعرہ اختیار کیا آزادی یا موت۔ کرتار سنگھ نے جرمنی جاکر ہوائی جہاز اڑانا سیکھا، ماسٹر اودھم سنگھ نے ہانگ کانگ جاکر توپ خانے کی تربیت حاصل کی۔ ہرنام سنگھ نے بم تیار کرنے کی تربیت لی۔ اس پارٹی و تحریک کا آدرش اور پروگرام حصول آزادی کے لیے مسلح

جدوجہد، ہندوستان میں قومی جمہوری حکومت کی تشکیل، ہندو مسلم اتحاد، ذات پات، فرقہ، رنگ و نسل کے امتیاز و تفریق کے بغیر سماج کی تعمیر و تشکیل نو نیز سیکولر اور غیر مذہبی اقدار کی حمایت پر مبنی تھا۔

اس پارٹی و تحریک کا پیغام تھا کہ ملک پر قربان ہونے اور شہید ہونے کا وقت آگیا ہے۔ رائے بہادر اور خان بہادر ملک و قوم کے غدار ہیں۔ ہندوستانی شیرو اٹھو اور ایک مسلح جدوجہد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس طرح ہفت روزہ ہندوستان غدر، غدر پارٹی، غدر تحریک نے ایک بین اقوامی کردار نوعیت حاصل کر لی۔

اگست ۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ غدر کے ساتھیوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کی نئی حکمت عملی کے تحت جرمنی کی حمایت کی گئی۔ ہندوستان میں فرنگیوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ جنگ میں جرمنی کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اسلحہ جمع کرنے کے لیے مالی امداد کا مطالبہ کیا گیا۔

جنگ عظیم کے شروع کے دو سالوں میں آٹھ ہزار غیر مقیم ہندوستانی وطن واپس آئے تھے۔ یہ سبھی کسی نہ کسی شکل میں غدر پارٹی و تحریک سے وابستہ یا اس کے رکن تھے۔ غدر پارٹی و تحریک کے رہنما اور رکن باری باری ہندوستان آنے لگے۔ کرتار سنگھ، مو ہونے سنگھ سبکنہ، خفیہ طور پر ہندوستان آئے اور گرفتار ہوئے۔ نند سنگھ، جسونت سنگھ، اہم رہنما جوالا سنگھ، امر سنگھ وغیرہ سبھی ہندوستان آئے اور گرفتار ہوئے۔ جوالا سنگھ برلن کمیٹی کی رہنمائی میں ایک پورے قافلے کی قیادت کرتے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔

امریکہ اور کناڈا میں انقلابی سوچتے تھے کہ ۳۰ کروڑ ہندوستانی ہمارے ساتھ ہیں۔ مگر وہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کی قیادت یہاں مفاد پرست جاگیرداروں، شہزادوں، سرمایہ داروں، قاضیوں، ملاؤں اور پنڈتوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ سیاسی سوجھ بوجھ سے بے بہرہ تھے۔ انقلابی ہندوستان سے باہر اور الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے یہاں کے سیاسی حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ وہ غیر منظم تھے۔ کوئی رازداری بھی نہیں برتی گئی تھی۔ اس لیے سفر کے دوران ان کے منصوبے اور پروگرام افشاں ہو گئے۔ روپیہ پیسہ بھی ان کے پاس نہیں تھا کیونکہ وہ سب سان فرانسسکو میں غدر پارٹی کے فنڈ میں جمع تھا۔ راستے میں اسلحہ بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ چند درجن پستولوں اور چند سو کارتوسوں سے انقلاب برپا نہیں ہو سکتا تھا۔ جو روپیہ ساتھ لائے تھے گرفتاری پر ضبط کر لیا گیا تھا۔

ہردیال سوئٹزرلینڈ سے برلن چلے گئے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران جرمن یونین آف فرینڈس آف انڈیا قائم ہوئی۔ اس کے اور غدر پارٹی کے اشتراک و تعاون سے انقلابی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ۱۹۱۵ء میں انڈیا انڈی پینڈنس کمیٹی کے نام سے اس کمیٹی کی تشکیل نو عمل میں آئی، جو بعد میں برلن کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ انقلابیوں کو اسلحہ خریدنے کے لیے جرمنی نے مالی امداد فراہم کی۔ ہردیال اس کمیٹی کے ایک اہم رکن تھے جو ۱۹۳۵ء تک حیات رہے اور اس تحریک کو چلاتے رہے۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں وہ امریکہ میں سیاسی تقریریں اور دورے کرتے رہے۔ اسی دوران ایک مقام پر ان کا انتقال ہو گیا۔

اپریل ۱۹۱۴ء میں ہردیال کے امریکہ سے فرار ہونے کے بعد اور بہت سے انقلابی عہدیداروں اور رہنماؤں کے ہندوستان روانہ ہونے پر رام چندر نے آہستہ آہستہ پارٹی اور تحریک میں ایک اہم مرکزی حیثیت حاصل کر لی تھی اور غدر تحریک کی قیادت اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ ایک پروگرام کے تحت انقلابیوں کے جتھے جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ رام چندر اور بھگوان سنگھ نے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان پہنچنے پر انھیں ہتھیار مل جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اگرچہ گپتا نے اسلحہ خریدنے اور افراد جمع کرکے ہندوستان بھیجنے کی کافی کوششیں کیں، مگر وہ ناکام رہے۔

غدر پارٹی میں شدید اختلاف پیدا ہونے کے باعث رام چندر نے اپنے تین ساتھیوں کو پارٹی سے باہر نکال دیا۔ برلن کمیٹی نے ڈاکٹر چندر کے چکرورتی کو سان فرانسسکو روانہ کیا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں چکرورتی گرفتار ہوئے اور ہندوستان سازش کے کاغذات امریکی حکومت کے ہاتھ لگ گئے۔ ادھر ۱۹۱۷ء میں امریکہ برطانوی حکومت کی حمایت میں جنگ میں شامل ہو گیا۔ رام چندر اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انارکی (انتشار) پھیلانے اور برطانیہ کے خلاف مسلح جنگ کی سازش کرنے کے الزامات عائد کرکے مقدمہ چلایا گیا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں مقدمہ شروع ہوا۔ رام چندر پر الزام لگایا گیا کہ اس نے رشوت لی ہے۔ ایسوسی ایشن کا روپیہ دوسرے کاموں میں لگایا ہے۔ مقدمہ کے آخری دن اس کے ایک ساتھی رام سنگھ نے بھری عدالت میں رام چندر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ۲۹ افراد کو سزا ہوئی۔ جودھ سنگھ اذیت رسانی کے باعث پاگل ہو گیا۔ اس طرح ہندوستان سے باہر قائم کی جانے والی غدر پارٹی اور اس کا ہفت روزہ ترجمان "غدر" ہندوستان کی جدوجہد اور تحریک آزادی کا ایک ایسا اہم ابتدائی باب بن کر رہ گیا، جو تاریخ ہند میں زندہ و پائندہ رہے گا۔

سماجی سرگرمیوں میں پڑجاتا ہے۔ جب بچہ
نو ونما کی اس منزل پر پہنچتا ہے جہاں اس
، تلاش و جستجو کا رجحان پیدا ہوتا ہے تو ضرورت
ہ زیادہ محتاط ماں اس کو ان مواقع سے محروم
تی ہے جن کے ذریعے وہ اپنی نئی صلاحیتوں
بروئے کار لاسکتا ہے۔ ہر نئے مرحلے پر بچے کے
رویے کا انحصار ایک حد تک اس امر پر ہوتا
ہ کہ اس کے قریبی رشتے دار اس نئے تجربے
کیا مطلب لیتے ہیں، کس حد تک اسے قبول
رتے ہیں اور کس درجہ اس کی قدر و منزلت
رتے ہیں۔

بچے کی شخصیت کے فروغ میں رکاوٹ
نے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ والدین
ں کی ذاتی خصوصیات کا بالکل غلط اندازہ لگاتے
ں۔ ہر خاندان چاہتا ہے کہ اس کا گھرانہ سب
ہ زیادہ مثالی گھرانہ بن جائے۔ اس قسم کی
ش سے خاندان میں نا اتفاقی، باہمی رنجش
مسلسل علالت کے واقعات رونما ہوتے
ہتے ہیں۔ والدین خیال کرتے ہیں کہ دوسرے
ندان کے بچوں کے مقابلے میں ان کا بچہ
شائستہ واقع ہوا ہے۔ یہ خوف بھی دامن گیر
تا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کا بچہ کمتر
ہ۔ اس خدشہ کی وجہ سے بچے کو غیر ضروری ڈسپلن
شکنجے میں کسا جاتا ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ
ہ کہ کسی گھرانے میں اگر بچوں کی جسمانی یا ذہنی
دونما میں نمایاں فرق ہو یا کوئی اور تغیر ہو یا
تے تو اس اختلاف کو یا تو سرے سے نظر انداز
ردیا جاتا ہے یا اسے غلط معنی پہنا دیے جاتے
ں۔ ایک عام بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی ماں
پ کے دو بچوں کے رویوں میں اختلاف ہو
اس پر انتہائی حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔
بات کو بھلا دیا جاتا ہے کہ پہلے بچے کی
پیدائش کے وقت خاندان کی جو خصوصیات
ہیں، دوسرے بچے کی پیدائش کے وقت ان
کافی فرق پیدا ہو چکا ہوتا ہے۔
ایک ہی خاندان میں اولاد کے ساتھ جو
متیازی سلوک برتا جاتا ہے اس کے نتائج
ک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ والدین کے
البات لڑکوں سے کچھ اور لڑکیوں سے کچھ اور

ہوتے ہیں۔ اولاد بھی ان مطالبات کو یکساں سنجیدگی کے ساتھ قبول نہیں کرتی۔ بعض بچے ان پر زیادہ دھیان دیتے ہیں اور بعض کم۔ والدین کے مطالبات کا یہ فرق اور بچوں کے طرز عمل کے اختلافات، ہر بچے کی مجموعی شخصیت کی تعمیر میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تعمیر شخصیت میں دوسری اہم چیز وہ جذباتی اظہار ہے جو والدین کے تعلق سے فروغ پاتا ہے اور صنف مخالف کے دوسرے افراد تک منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں بچوں کی شخصیت کی نشو ونما میں برابر کی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس عدم مطابقت کے ماحول میں بچوں کے درمیان حریفانہ رجحان پرورش پاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ ماں کی فکرمندی، باپ کی غفلت شعاری، والدین کی باہمی نا اتفاقیاں اور بے اصولی ڈسپلن، یہ ہیں وہ اسباب جو بچے کی شخصیت پر برا اثر ڈالتے ہیں۔

بچے کے احساس سلامتی پر ماں باپ کے باہمی تعلقات کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ والدین کی شخصیتوں میں قابل لحاظ ہم آہنگی، ذوق و شوق اور دلچسپیوں میں اشتراک، ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک، باہمی التفات و محبت اور اولاد برائے اولاد کی دلی تمنا ایسی مثالی شرائط ہیں جو بچے کی صحت مند نشو ونما کے لیے ضروری ہیں۔ اگر خاندان کے ماحول میں یہ شرائط نہ پائی جائیں تو ظاہر ہے کہ والدین کے باہمی جھگڑے اور ان کے طرز عمل کے اختلافات بچوں کے لیے مسائل کھڑے کر دیں گے۔ جدید جمہوری سماج میں یہ حقیقت برابر تسلیم کی جارہی ہے کہ بچے کی شخصیت کو فروغ دینے کے بہترین حالات ان خاندانی رشتوں میں پائے جاتے ہیں جہاں بچوں کی جسمانی نا پختگی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے والدین اور ان کے بچے مساوات کے اصول کی بنیاد پر مل جل کر کام کرتے ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ کسی کام کو کرتے وقت بچے کو نتیجے کی فکر نہیں رہتی۔ اس کا مقصد تو محض کھیل اور تفریح ہوتا ہے۔ ۵ سال کی عمر تک تو یہ ہو سکتا ہے کہ بچے کا مقصد محض کھیل اور تفریح ہو لیکن ۵ سال کی عمر کے بعد بچے کا ہر کام با مقصد ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر کام کے نتیجے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تربیت کے کام میں ماں باپ کے مقابلے میں استادوں کو خاص طور سے یہ سہولت رہتی ہے کہ وہ بچے کو اس کے ہم جولیوں کے ساتھ رکھ کر سیکھنے سکھانے کا کام آسانی سے کر سکتے ہیں اور بچے کو اسکول کے اندر مختلف کاموں کے دوران دیکھ سکتے ہیں۔ استاد بچے کے مختلف قسم کے رویوں کو دیکھ کر اس کی شخصیت اور مقاصد کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور وہ استاد جو تربیت کے کام میں بچے کی والدین کا تعاون حاصل کر لیتے ہیں خوب کامیاب رہتے ہیں۔ ●

قلم کار، و ایجنٹ حضرات

کو مطلع کیا جاتا ہے کہ **یوجنا** (اردو) کا دفتر آر کے۔ پورم سے منتقل ہو کر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱ آگیا ہے۔ لہٰذا اب مضامین/تخلیقات خطوط وغیرہ پٹیالہ ہاؤس کے پتے پر ہی ارسال کریں۔

(ادارہ)

عظیم مدبر سی۔ سبرامنیم کی نظر میں:

آزادی کے پچاس برس

ڈاکٹر سی۔ سبرامنیم آئین ساز اسمبلی کے ان ۷ ممبروں میں سے ایک ہیں، جو حیات ہیں۔ وہ ایک نہایت تجربہ کار شخص ہیں۔ وہ تمل ناڈو میں وزیر اور اس کے بعد مرکزی کابینہ کے وزیر رہے اور وزارت مالیات سمیت کئی وزارتیں سنبھالیں بعد میں وہ مہاراشٹر کے گورنر بھی رہے۔ وزیر خوراک وزراعت کی حیثیت سے ملک میں سبز انقلاب لانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ گزشتہ سال دسمبر میں پودوں کے سائنس دانوں کی عالمی کانگریس کے صدر ڈاکٹر نارمن سی۔ بورلاگ سے کورومنڈل فرٹیلائزرس کا بورلاگ ایوارڈ حاصل کیا۔ ۸۷ سالہ ڈاکٹر سبرامنیم خود کو دماغی اور جسمانی طور پر چست رکھتے ہیں، عام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور لوگوں کو سیاست، پبلک ایڈمنسٹریشن اور سائنس اور ٹکنالوجی خصوصاً خوراک کی پیداوار کے بارے میں اپنے خیالات و تجربات سے متعارف کراتے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے دلی احساسات فکرمندیوں اور امیدوں میں ہمیں شریک کیا ہے۔

"آج کے ہندوستان کا مقابلہ ایک متلاطم اور طوفانی سمندر سے کیا جاسکتا ہے جب آپ سمندر کو طوفان کی گرفت میں دیکھتے ہیں تو ہر چیز غیر متوازن اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن آپ جب گہرائی میں جاتے ہیں، تھوڑی سی گہرائی میں تو شاہانہ اور تخلیقی سمندر کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ دو ہندوستان ہیں۔ ایک تو سیاست اور اس سے تعلق رکھنے والی سرگرمیوں کے سبب متلاطم ہندوستان ہے اور دوسرا وہ، جو رضاکارانہ خدمات کے میدان میں، روحانیت کے میدان میں ہے جہاں ہماری جڑیں اب بھی گہری ہیں۔ جب تک ہماری یہ جڑیں ختم نہیں ہوتیں ہمارا مستقبل پر امید ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ طوفانی صورت حال کوئی قدرتی صورت حال نہیں ہے اور معمول پر واپس آنا ہی ہے۔"

۵۰ سال پہلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سبرامنیم کہتے ہیں "یہ صرف ہندوستان کے آزادی حاصل کرنے یا اپنی منزل مقصود پر پہنچنے ہی کا سوال نہیں تھا۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک انوکھا واقعہ تھا کہ کیسے ایک طاقتور سامراجی ملک کو پر امن جدوجہد کے ذریعے ایک محکوم ملک کو آزادی دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ حملہ آور ہمیشہ پر تشدد مقابلوں اور بغاوتوں کے ذریعے ہی کھدیڑے گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی آزادی کی جدوجہد کو ہندوستان سے تحریک ملی۔ ۱۵ اگست حقیقتاً تاریخ انسانی کا ایک اہم دن ہے۔"

مقدر سے ملاقات

۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کو ہم سب آئین ساز اسمبلی میں جسے اب سینٹرل ہال کہا جاتا ہے، جمع تھے۔ گیارہ بجے جب سب لیڈر ایک ایک کرکے ہال میں داخل ہوئے تو یہ ایک سنسنی خیز لمحہ تھا۔ آچاریہ کرپلانی سب سے پہلے آئے اور پھر سردار پٹیل جن کے ہمراہ سروجنی نائڈو تھیں۔ سب سے آخر میں پنڈت جواہرلال نہرو آئے۔ ان کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ ہم سب نے ہندوستان کی ترقی کے لیے کام کرنے کا حلف لیا جواب کافی مشہور ہو چکا ہے۔ ان کے الفاظ میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے ہیں۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ کی یہ ایک بہترین تقریر تھی۔ یہ فخر وانبساط کا لمحہ تھا۔"

تقسیم کا زخم

"لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ دردناک پہلو۔ تقسیم وطن کا درد اوران فسادات کا درد جو تقسیم کے بعد ملک میں ہوئے۔ یوم آزادی سے پہلی شام کو اور اس کے بعد لوگ وسیع پیمانے پر ہلاک کیے گئے۔ پاکستان سے لاکھوں ہندو ہندوستان آرہے تھے اور لاکھوں مسلمان ہندوستان سے پاکستان جارہے تھے۔ آئین ساز اسمبلی

باقی صفحہ پر

مناظر حسین

دہی: ایک مقوی غذا

دہی محتاج تعارف نہیں۔ یہ دنیا کے اکثر خطوں میں بہ کثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ لسی، دہی بڑے، چاٹ، رائتہ اور کڑھی بھلا کسے پسند نہیں۔ دہی غذا کو خوش ذائقہ اور مقوی بناتا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں صدیوں سے اس کا استعمال غذا، حسن افزا مصنوعات اور دوا کی شکل میں ہوتا آرہا ہے۔ دہی کو متھ کر مکھن نکالنے کے بعد چھاچھ یا مٹھا بھی بیحد مفید ہے۔

سائنس دانوں نے اب یہ ثابت کردیا ہے کہ دہی دودھ سے بھی زیادہ مفید ہے جنھیں دودھ ہضم نہیں ہوتا انھیں بھی دہی آسانی سے ہضم اور جزو بدن ہوجاتا ہے۔ دہی کا ۸۰ فی صد حصہ جسم کے کام آتا ہے جب کہ دودھ کا ۲۰ فی صد حصہ ہی جسم کے کام آپاتا ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق دودھ میں کیسین نام کا پروٹین ہوتا ہے اور دہی میں لیکٹک ایسڈ بیکٹیریا ہوتا ہے جو کیسین پروٹین کو جما دیتا ہے۔ دہی کے دودھ سے زیادہ مفید ہونے کی یہی وجہ ہے کہ دودھ میں جو خاص قسم کی عفونت کو روکنے والے جراثیم ہوتے ہیں ترشی پیدا ہونے سے ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ جراثیم بدبو پیدا کرنے والے جراثیم کو ہلاک کردیتے ہیں۔ دہی میں کیلشیم کی مقدار دودھ سے ۱۸ گنا زیادہ ہوجاتی ہے۔ دہی کو سونے چاندی کے برتنوں میں کھایا جائے تو ان دھاتوں کے قدرے مقدار دہی میں آجاتی ہے جو حیات میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

یورپ کے ایک معروف محقق اور ڈاکٹر پروفیسر میکنی کاف نے بلغاریہ کے دورے کے دوران بلغاروی لوگوں کی جسمانی قوت اور درازی عمر کا سبب دریافت کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں کے باشندے دہی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ وہاں سیکڑوں کی عمریں سو سال سے زیادہ ہیں۔ دہی کے ساتھ ساتھ وہ پھل اور سبزیوں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔

آیورویدمیں دہی کو بھوک بڑھانے والا، ہاضم، مصفی خون، زہر کو دور کرنے والا، دل اور دماغ کو فرحت اور قوت بخشنے والا، پیٹ کے امراض کو دور کرنے والا اور بواسیر میں مفید بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دست، بدہضمی، جریان اور سفید داغ میں بھی بے حد مفید ہے۔ دہی کو مناسب مقدار میں ہمیشہ استعمال کرنے والا کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ دہی میں ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں جن کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ پیٹ میں جاتے ہی امراض پیدا کرنے والے جراثیم سے جنگ کرکے ان کو مغلوب کرلیتے ہیں۔ معدے میں جاکر یہ جراثیم غذا کے نشاستی اور شکری اجزا کو ترشی میں تبدیل کرکے معدے اور آنتوں کو مضر جراثیم سے محفوظ رکھتے ہیں۔

دہی جسمانی کمزوری اور خون کی کمی میں نہایت مفید ہے۔ بچوں کے دست، ضعف اعصاب، خون کی کمی اور آنتوں کے امراض میں دہی غذا کی غذا اور دوا کی دوا ہے۔ دہی دل اور دماغ اور آنتوں کو قوت بخشتا ہے، بادی کو دور کرتا ہے۔ دہی میں شکر ملاکر پینا زکام کے لیے مفید ہے۔ گائے کا دہی قوت بخش ہونے کے علاوہ نہایت زود ہضم ہے۔ تپ دق، پرانی کھانسی، دمہ اور بواسیر میں مفید ہے۔ پیچش اور سنگرہنی کی شکایت کو ختم کرتا ہے۔

گرمی کے موسم میں دہی اور اس سے تیار کیا ہوا چھاچھ اور لسی پینے سے پیٹ کی گرمی دور ہوتی ہے اور تشنگی بھی رفع ہوجاتی ہے۔ دہی میں کشمش، چھوہارہ، ناریل، بادام، چرونجی اور پستہ ملاکر کھانے سے وزن میں اضافہ ہوتا ہے۔ دہی میں پانی، میٹھے پھلوں کا رس، مصری وغیرہ ملاکر لسی بناکر پینے سے موسم گرما میں دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے، گرمی کو دور کرتا ہے اور لو سے بچاتا ہے۔

دہی جمانے میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ خالص دودھ سے، صاف برتن میں جمایا گیا ہو۔ دودھ والا جانور تندرست ہو اور جس برتن میں دودھ دوہا گیا ہو وہ بھی پاک و صاف ہو تو دہی کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ زیادہ ترش دہی استعمال کرنا مناسب نہیں، کیوں کہ کھٹا دہی خون میں جوش پیدا کرتا ہے اور اس کے استعمال سے کھانسی اور زکام کی شکایت ہوجاتی ہے۔

دودھ کی چکنائی کولیسٹرول کو بڑھاتی ہے

باقی صفحہ ۲۳ پر

مڈل اسکول لکھی پور، روایا چاکند، ضلع گیا ۸۰۴۴۰۴

عظیم مدبر سی۔ سبرامنیم کی نظر میں:

آزادی کے پچاس برس

ڈاکٹر سی۔ سبرامنیم آئین ساز اسمبلی کے ان ۱۷ ممبروں میں سے ایک ہیں، جو حیات ہیں۔ وہ ایک نہایت تجربہ کار شخص ہیں۔ وہ تمل ناڈو میں وزیر اور اس کے بعد مرکزی کابینہ کے وزیر رہے اور وزارت مالیات سمیت کئی وزارتیں سنبھالیں بعد میں وہ مہاراشٹر کے گورنر بھی رہے۔ وزیر خوراک و زراعت کی حیثیت سے ملک میں سبز انقلاب لانے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ گزشتہ سال دسمبر میں پودوں کے سائنس دانوں کی عالمی کانگریس کے صدر ڈاکٹر نارمن سی۔ بورلاگ سے کورومنڈل فرٹیلائزرس کا بورلاگ ایوارڈ حاصل کیا۔ ۸۷ سالہ ڈاکٹر سبرامنیم خود کو دماغی اور جسمانی طور پر چست رکھتے ہیں، عام جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور لوگوں کو سیاست، پبلک ایڈمنسٹریشن اور سائنس اور ٹکنالوجی خصوصاً خوراک کی پیداوار کے بارے میں اپنے خیالات و تجربات سے متعارف کراتے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے دلی احساسات، فکرمندیوں اور امیدوں میں ہمیں شریک کیا ہے۔

• آج کے ہندوستان کا مقابلہ ایک متلاطم اور طوفانی سمندر سے کیا جاسکتا ہے جب آپ سمندر کو طوفان کی گرفت میں دیکھتے ہیں تو ہر چیز غیر متوازن اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن آپ جب گہرائی میں جاتے ہیں، تھوڑی سی گہرائی میں تو شاہانہ اور تخلیقی سمندر کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ دو ہندوستان ہیں۔ ایک تو سیاست اور اس سے تعلق رکھنے والی سرگرمیوں کے سبب متلاطم ہندوستان ہے اور دوسرا وہ، جو رضاکارانہ خدمات کے میدان میں، روحانیت کے میدان میں ہے جہاں ہماری جڑیں اب بھی گہری ہیں۔ جب تک ہماری یہ جڑیں ختم نہیں ہوتیں ہمارا مستقبل پر امید ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ طوفانی صورت حال کوئی قدرتی صورت حال نہیں ہے اور معمول پر واپس آنا ہی ہے۔"

۵۰ سال پہلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سبرامنیم کہتے ہیں "یہ صرف ہندوستان کے آزادی حاصل کرنے یا اپنی منزل مقصود پر پہنچنے ہی کا سوال نہیں تھا۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک انوکھا واقعہ تھا کہ کیسے ایک طاقتور سامراجی ملک کو پر امن جدوجہد کے ذریعے ایک محکوم ملک کو آزادی دینے پر مجبور کیا گیا۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ حملہ آور ہمیشہ پر تشدد مقابلوں اور بغاوتوں کے ذریعے ہی کھدیڑے گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی آزادی کی جدوجہد کو ہندوستان سے تحریک ملی۔ ۱۵ اگست حقیقتاً تاریخ انسانی کا ایک اہم دن ہے۔"

مقدر سے ملاقات

۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کو ہم سب آئین ساز اسمبلی میں جسے اب سینٹرل ہال کہا جاتا ہے، جمع تھے۔ گیارہ بجے جب سب لیڈر ایک ایک کرکے ہال میں داخل ہوئے تو یہ ایک سنسنی خیز لمحہ تھا۔ آچاریہ کرپلانی سب سے پہلے آئے اور پھر سردار پٹیل جن کے ہمراہ سروجنی نائڈو تھیں۔ سب سے آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو آئے۔ ان کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ ہم سب نے ہندوستان کی ترقی کے لیے کام کرنے کا حلف لیا جو اب کافی مشہور ہو چکا ہے۔ ان کے الفاظ میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہے ہیں۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ کی یہ ایک بہترین تقریر تھی۔ یہ فخر و انبساط کا لمحہ تھا۔"

تقسیم کا زخم

لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ دردناک پہلو۔ تقسیم وطن کا درد اور ان فسادات کا درد جو تقسیم کے بعد ملک میں ہوئے۔ یوم آزادی سے پہلی شام کو اور اس کے بعد لوگ وسیع پیمانے پر ہلاک کیے گئے۔ پاکستان سے لاکھوں ہندو ہندوستان آرہے تھے اور لاکھوں مسلمان ہندوستان سے پاکستان جارہے تھے۔ آئین ساز اسمبلی

باقی صفحہ ۵۶ پر

مناظر حسین

دہی: ایک مقوی غذا

دہی محتاج تعارف نہیں۔ یہ دنیا کے اکثر خطوں میں بہ کثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ لسی، دہی بڑے، چاٹ، رائتہ اور کڑھی بھلا کسے پسند نہیں۔ دہی غذا کو خوش ذائقہ اور مقوی بناتا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں صدیوں سے اس کا استعمال غذا، حسن افزا مصنوعات اور دوا کی شکل میں ہوتا آرہا ہے۔ دہی کو متھ کر مکھن نکالنے کے بعد چھاچھ یا مٹھا بھی بے حد مفید ہے۔

سائنس دانوں نے اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ دہی دودھ سے بھی زیادہ مفید ہے۔ جنھیں دودھ ہضم نہیں ہوتا انھیں بھی دہی آسانی سے ہضم اور جزو بدن ہو جاتا ہے۔ دہی کا ۸۰ فی صد حصہ جسم کے کام آتا ہے جب کہ دودھ کا ۲۰ فی صد حصہ ہی جسم کے کام آپاتا ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق دودھ میں کیسین نام کا پروٹین ہوتا ہے اور دہی میں لیکٹک ایسڈ بیکٹیریا ہوتا ہے جو کیسین پروٹین کو جما دیتا ہے۔ دہی کے دودھ سے زیادہ مفید ہونے کی یہی وجہ ہے کہ دودھ میں جو خاص قسم کی عفونت کو روکنے والے جراثیم ہوتے ہیں ترشی پیدا ہونے سے ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ جراثیم بدبو پیدا کرنے والے جراثیم کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ دہی میں کیلشیم کی مقدار دودھ سے ۱۸ گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ دہی کو سونے چاندی کے برتنوں میں کھایا جائے تو ان دھاتوں کے قدر سے مقدار دہی میں آجاتی ہے جو حیات میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

یورپ کے ایک معروف محقق اور ڈاکٹر پروفیسر میکنی کاف نے بلغاریہ کے دورے کے دوران بلغاروی لوگوں کی جسمانی قوت اور درازی عمر کا سبب دریافت کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ یہاں کے باشندے دہی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ وہاں سیکڑوں کی عمریں سو سال سے زیادہ ہیں۔ دہی کے ساتھ ساتھ وہ پھل اور سبزیوں کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔

آیوروید میں دہی کو بھوک بڑھانے والا، ہاضم، مصفی خون، زہر کو دور کرنے والا، دل اور دماغ کو فرحت اور قوت بخشنے والا، پیٹ کے امراض کو دور کرنے والا اور بواسیر میں مفید بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دست، بدہضمی، جریان اور سفید داغ میں بھی بے حد مفید ہے۔ دہی کو مناسب مقدار میں ہمیشہ استعمال کرنے والا کبھی بیمار نہیں ہوتا۔ دہی میں ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں جن کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ پیٹ میں جاتے ہی امراض پیدا کرنے والے جراثیم سے جنگ کر کے ان کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ معدے میں جا کر یہ جراثیم غذا کے نشاستی اور شکری اجزا کو ترشی میں تبدیل کر کے معدے اور آنتوں کو مضر جراثیم سے محفوظ رکھتے ہیں۔

دہی جسمانی کمزوری اور خون کی کمی میں نہایت مفید ہے۔ بچوں کے دست، ضعف اعصاب، خون کی کمی اور آنتوں کے امراض میں دہی غذا کی غذا اور دوا کی دوا ہے۔ دہی دل اور دماغ اور آنتوں کو قوت بخشتا ہے، بادی کو دور کرتا ہے۔ دہی میں شکر ملا کر پینا زکام کے لیے مفید ہے۔ گائے کا دہی قوت بخش ہونے کے علاوہ نہایت زود ہضم ہے۔ تپ دق، پرانی کھانسی، دمہ اور بواسیر میں مفید ہے۔ پیچش اور سنگرہنی کی شکایت کو ختم کرتا ہے۔

گرمی کے موسم میں دہی اور اس سے تیار کیا ہوا چھاچھ اور لسی پینے سے پیٹ کی گرمی دور ہوتی ہے اور تشنگی بھی رفع ہو جاتی ہے۔ دہی میں کشمش، چھوہارہ، ناریل، بادام، چرونجی اور پستہ ملا کر کھانے سے وزن میں اضافہ ہوتا ہے۔ دہی میں پانی، میٹھے پھلوں کا رس، مصری وغیرہ ملا کر لسی بنا کر پینے سے موسم گرما میں دل و دماغ کو فرحت بخشتا ہے، گرمی کو دور کرتا ہے اور لو سے بچاتا ہے۔

دہی جمانے میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ خالص دودھ سے، صاف برتن میں جمایا گیا ہو۔ دودھ والا جانور تندرست ہو اور جس برتن میں دودھ دوہا گیا ہو وہ بھی پاک و صاف ہو تو دہی کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ زیادہ ترش دہی استعمال کرنا مناسب نہیں، کیونکہ کھٹا دہی خون میں جوش پیدا کرتا ہے اور اس کے استعمال سے کھانسی اور زکام کی شکایت ہو جاتی ہے۔

دودھ کی چکنائی کولیسٹرول کو بڑھاتی ہے

باقی صفحہ ۲۳ پر

مڈل اسکول لکشمی پور، وایا چاکند، ضلع گیا، بہار ۸۰۴۴۰۴

اردو طباعت اور عصری تقاضے

غالباً ۱۸۰۰ء میں پہلی بار اردو
کتاب سیرام پور بنگال میں ٹائپ کے
ریعے چھپ کر شائع ہوئی تھی اور یہ انجیل
دس کا ترجمہ تھا جسے انگریزوں نے ہندوستانیوں
ے لیے شائع کیا تھا۔ اس کے بعد سے اردو
اعت و اشاعت کی صنعت دھیرے دھیرے
ی راہوں اور نئی منزلوں سے روشناس ہوتی
ی۔ ابتدا میں وقتی ضروریات کے لحاظ سے
کتابیں اور لغات شائع ہوئیں وہ زیادہ
ٹائپ میں تھیں، مگر ساتھ ساتھ لیتھو
یس بھی برابر رواج پاتا رہا۔

اردو زبان و ادب کی بنیادی ضرورت
ے دوش بدوش فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی
اعتی سرگرمیوں سے بھی اس صنعت کو مزید
قویت پہنچی اس وقت تک ملک کے
تلف حصوں میں اردو کتابوں اور رسالوں
طباعت کا منظر اپنے خط و خال بھی نمایاں
رچکا تھا۔ پھر یہ سلسلہ "جام جہاں نما" سے
وتا ہوا، اودھ پنچ، زمیندار، مخزن،
لگداز جیسے جریدوں تک بھی اور اجتماعی
لچسپیوں کے زیر اثر جوش و خروش، ولولوں
ور امنگوں کے زیر سایہ پروان چڑھتا رہا۔
س طرح کلکتہ، لکھنؤ، دہلی، حیدرآباد اور
ہور وغیرہ میں اردو طباعت و اشاعت
ے چھوٹے بڑے کئی مراکز قائم ہوتے رہے۔
اص طور پر مطبع نول کشور جیسے اداروں نے
تقریباً ہر سائز کی کتابیں شائع کر کے اس صنعت اور کاروبار کو ایک وقار بخشا اور ساتھ ہی خدمت لوح و قلم کی ایک روشن روایت شروع کی۔ اس وقت تک تقریباً سارے برصغیر کے لیے لیتھو کتابت اور لیتھو پریس ہی اردو اور اردو والوں کے لیے پسندیدہ اور مناسب طباعتی وسیلہ تھا۔ ہاتھ کمپوزنگ اور ٹائپ کا طریقہ اگرچہ بالکل ہی مسترد نہیں ہوا تھا مگر اسے عام مقبولیت بھی حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ اس طریقہ طباعت کے فنی نقائص یا پریسوں کو کاریگروں کی عدم دستیابی نہیں بلکہ خط نستعلیق کی خوب صورتی، جمالیاتی ندرت اور عوامی پسندیدگی اس معاملے میں فیصلہ کن قوت کا درجہ رکھتی تھی۔ مزید دیوبند، ندوۃ العلماء، دہلی کالج، انجمن ترقی اردو اور مکتبہ جامعہ جیسے اداروں کے قیام اور ان کی حیات افروز کارکردگی نے اردو رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کو نئی توانائی بخشی۔ ان میں بھی نستعلیق اور لیتھو پرنٹنگ ہی کو سبقت حاصل ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اگرچہ "الہلال" جیسے اخبار کے لیے خط نسخ اور ٹائپ کو پسند کیا تھا مگر عام اردو والوں نے خط نستعلیق ہی کو ترجیح دی اور بالآخر حتمی طور پر باوجود بعض دانشورانہ کوششوں کے خط نستعلیق ہی اردو کے لیے مختص ہو گیا اور لیتھو پریس اس کے لیے ہر اعتبار سے موزوں قرار پایا۔ خاص کر کم تعداد اشاعت کے پیش نظر۔ مگر زندگی خواہ فرد کی ہو یا جماعت کی، زبانوں کی ہو یا علوم و فنون کی، وہ جامد یا ساکت نہیں رہتی، وہ فطری طور پر ترقی اور تبدل پذیر ہوتی ہے۔ زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فکری اور فنی ارتقاء بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح نئے تغیرات، نئے تجربات، نئی ترقیات اور نئی ایجادات کا سلسلہ جاری و ساری رہتا ہے۔ مغربی صنعتی انقلاب کے بعد تو پورے کرۂ ارض میں ہر شعبۂ زندگی میں خاص کر مشینی و آلاتی وسائل اور ذرائع، ان کی اطلاقی سوجھ بوجھ میں تبدیلیوں اور ترقیوں کا تواتر سا بندھ گیا تھا۔ طباعت کے ضمن میں بھی ہاتھ کمپوزنگ سسٹم جو کہ اردو کا مقدر بنتا جا رہا تھا نئے تقاضوں اور نئے چیلنجوں سے دو چار ہوا۔ پھر فوٹو آفسیٹ پرنٹنگ ٹکنالوجی وجود میں آئی۔ ابتدا میں گرچہ یہ ایک مہنگا سودا ثابت ہوئی مگر کوئی بھی زبان عصری تقاضوں کو پورا کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ طباعت واشاعت کے جدید تقاضے اور عصری معیارات اردو کے سامنے نئے مسائل اور نئے سوالات لے کر ابھر رہے ہیں تو اردو بھی ان سے روگرداں ہو کر اپنے وجود اور اپنے زمانے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی۔ اس لیے اب ہر اہم ایجنسی، انجمن اور ہر بڑا اشاعتی ادارہ، فوٹو آفسیٹ کی طرف رجوع کر چکا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے تو اپنے رسالے اور اپنی کتابیں فوٹو آفسیٹ سسٹم سے ہی شائع کرتے ہیں۔ لیتھو پریس ہر چند کہ

ردو ٹائپ شٹ بہار قانون ساز اسمبلی پٹنہ ۱۸۰۰ء

کم خرچ و بالانشیں کے مصداق ہے مگر تیز رفتار زندگی کے تناظر میں اب یہ ایک طرح کی پسماندگی کی علامت بنتا جا رہا ہے۔ ہاں اس موقع پر دو اور طریق ہائے طباعت کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض اخبارات، رسائل ونڈانگ سسٹم سے چھپتے ہیں اس میں کتابت بٹر پیپر پر کرائی جاتی ہے اور فلم نگیٹو کو استعمال کیے بغیر سیدھا پلیٹ بنا کر طباعت ہوتی ہے۔ اس لیے لاگت کم آتی ہے۔ مگر اس سسٹم کی کچھ معذوریاں اور کوتاہیاں ہیں۔ شاید اسی لیے کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے یہ طریقہ زیادہ کامیاب یا پسندیدہ ثابت نہ ہو سکا۔ دوسرا طریقہ جس کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ اسکرین پرنٹنگ کا ہے۔ مگر یہ زیادہ تر مذہبی قسم کی کتابوں کے سرورق، کارڈس، سہرے وغیرہ کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ شاید اس دائرے میں توسیع کی زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے۔

ہندوستان میں ان دنوں اردو اخبارات، رسائل طباعت و اشاعت کے اعتبار سے چھٹے نمبر پر ہیں اور علمی و ادبی اور باوقار جرائد کی تعداد تو مجموعی اعتبار سے گھٹتی ہی جا رہی ہے۔ اس کو یقیناً کوئی اطمینان بخش صورت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ امید کی جھلملاتی کرن کی صورت ملک میں اردو کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں کچھ اضافہ ضرور ہو رہا ہے۔ دوسری طرف اردو اخبارات کے لیے حیات نو کا پیغام لانے والے اردو ٹیلی پرنٹر اور ٹیلی پرنٹنگ سروس کے جلد شروع ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ چند برس پہلے تک ملک میں عام طور پر چھ سو یا سات سو معیاری کتابیں ہر سال شائع ہوتی تھیں اب ان کی تعداد بڑھ کر ایک ہزار اور ڈیڑھ ہزار کے بیچ تک پہنچ گئی ہے۔ بہرحال اردو اخبارات، رسائل اور کتابوں کی اشاعت، نکاسی اور فروخت کے مسائل پر بھی سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ بہت دیر ہونے سے پہلے اس کی طرف خصوصی موثر اور مثبت اقدامات کیے جا سکیں۔ ورنہ اردو والوں کی نہ دردمندی کا کوئی ثبوت ملے گا اور نہ ہی دانشمندی کا۔

فوٹو آفسیٹ اگرچہ ہر طرح سے ایک ترقی یافتہ اور مکمل نظام ہے جس میں روٹری سسٹم کے ذریعے ہر قسم کی طباعت، رنگین اور باتصویر پوری جاذبیت اور جامعیت کے ساتھ کی جا سکتی ہے مگر ذہن انسانی کی اختراع پردازی کو نہ تو سلب کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے اور ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے ورنہ زندگی کا ارتقاء ہی رک جائے گا۔ بہرحال اقتضائے حالات کے مطابق کتابت اور طباعت کے مزید نئے طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جو یقیناً مستحسن کوششیں ہیں۔ آج کا دور محض ایٹمی دور ہی نہیں بلکہ کمپیوٹرائزڈ دور ہے، ہم تیزی سے اکیسویں صدی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں کمپیوٹر کو رواج دیا جا رہا ہے۔ نئی نسلیں ان سے بہرہ ور ہی نہیں ہو رہی ہیں بلکہ ان کی عادی ہوتی جا رہی ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں بھی کمپیوٹر بہت جلد عام ہو جائیں گے۔ اب طباعت کے میدان میں بھی کمپیوٹر کی مدد سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام یکساں معیار کے ساتھ کیا جانا ممکن ہو گیا ہے۔ لندن کی ایک فرم مونو ٹائپ نے کچھ عرصہ پہلے خط نستعلیق کا اردو کمپیوٹر بنا لیا تھا۔ مگر یہ پکچر سسٹم پر مبنی ہے۔ جس میں الفاظ کو ممکن حد تک ارکان تہجی میں توڑ کر ان کی پکچر بنا کر کمپیوٹر کے حافظے میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ جیسے لڑکی ٹائپ کرنا ہو تو پہلے "لڑ" کی پکچر استعمال کیا جائے گا پھر "کی" کی پکچر جوڑ کر لڑکی ٹائپ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ساری عبارت ٹائپ ہو کر مرتب ہو جائے گی۔ لیکن اس سسٹم میں کمپیوٹر کی کارکردگی اس کے حافظے میں محفوظ پکچرس کی حد تک محدود ہو جاتی ہے۔ لندن ہی کی ایک اور فرم لائنو ٹائپ نے ایک قدم آگے بڑھ کر زیادہ بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ نستعلیق کمپیوٹر بنا لیا ہے جو حروف تہجی اور ان کی مستعملہ صورتوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح اس کمپیوٹر کے ذریعے جس میں ہر طرح کی کشادگی اور گنجائش فراہم کی گئی ہے کوئی بھی لفظ، ترکیب یا عبارت وغیرہ حسب ضرورت اور حسب منشا ٹائپ کی جا سکتی ہے۔ اس میں دس پوائنٹ سے لے کر ۷۲ پوائنٹ تک عبارت، عنوانات یا کسی بھی قسم کے دیگر مستعملات کے بڑھانے یا گھٹانے کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ دو چار ٹرمینل کو ایک ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مواد ٹائپ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نسخ بھی ٹائپ ہو سکتا ہے اور نستعلیق بھی۔ حوالوں، سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کو حسب ضرورت اور حسب منشا کسی بھی سائز میں کسی بھی طرز نگارش میں نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً یہ ایک حیرت انگیز ایجاد ہے اور اردو والوں کے لیے خط نستعلیق کے ساتھ جدید ٹکنالوجی کا ایک تاریخ ساز کارنامہ بھی۔ تصحیح بھی انھیں مشینوں پر کر لی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد فوٹو آفسیٹ کے سسٹم سے چھپائی کا کام پورا کر لیا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ اخباروں، رسالوں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے بھی یکساں طور پر مفید اور کارگر ہے۔ خصوصی اہمیت کی بات یہ ہے کہ ان کی مدد سے مہینوں اور برسوں کی کتابت کا کام چند دنوں اور ہفتوں میں بہتر اور خوبصورت نتائج کے ساتھ مکمل کر لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی کر لیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں اس طرح کی مشینیں ترقی اردو بیورو نئی دہلی میں لگائی گئی ہیں اور اب یہ سلسلہ اردو دنیا کے مختلف گوشوں تک بھی پھیل رہا ہے۔ یہاں فن کتابت اور خطاطی کے مستقبل کے بارے میں ایک سوالیہ نشان سنجیدگی کے ساتھ سامنے آتا ہے، مگر میری ذاتی رائے ہے کہ ان مشینوں کے رواج پا جانے کے بعد بھی جو بڑی حد تک محدود پیمانے پر ہی ہوگا فن کتابت اور خطاطی کی اہمیت اور ضرورت

باقی صفحہ ۶ پر

انور نزہت

یہ قربتیں یہ فاصلے

آج صبح بچوں کو اسکول چھوڑ کر جیسے ہی واپسی کے لیے مڑی اس نے دیکھا کالے گھنے بادل منڈلا رہے ہیں وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی آگے بڑھ رہی تھی کہ بادل اتنے زور سے گرجا کر وہ کانپ گئی۔ خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ بارش بہت تیز ہونے لگی تھی اور آج اتفاقاً سے چھتری وہ گھر ہی بھول آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری سڑکیں پانی سے جل تھل ہو گئی تھیں اور وہ بری طرح بھیگ گئی تھی۔

پانی سے بھیگی ہوئی ہوائیں اس کے وجود کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن آج وہ اپنی ہی اندرونی کشمکش میں ڈوبی ہوئی تھی جسے کوئی پانی کوئی ہوا گیلا نہیں کر سکتی تھی وہ اندر سے بالکل سوکھی ہوئی تھی۔ بلکہ اس کے سارے وجود میں شعلے بھڑک رہے تھے۔۔

اپنے شوہر عابد کے مرنے کے بعد وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔ اختر عابد کا دوست تھا یوں تو عابد کے اور بھی کئی دوست تھے۔ لیکن اختر نے اس کو بہت سہارا دیا کیوں کہ اختر انجم کا ہم مزاق تھا اور وہ اس کے دل بہلانے اس کی دلجوئی میں پیش پیش رہتا۔ انجم کو ادبی محفلوں سے بہت لگاؤ تھا اور اختر ایک اچھا شاعر تھا، خوب صورت تھا، آواز بہت اچھی تھی، بترنم سے پڑھتا تھا۔ اختر اسے ادبی جلسوں، مشاعروں، سیمناروں میں لے جاتا۔ اس کی قربت انجم کے لیے معاون ثابت ہوئی۔ انجم اس سے ہر بات بے جھجک کہہ دیتی کیوں کہ اختر بھی دو بچوں کا باپ تھا۔ گھر میں ایک پیاری سی بیوی تھی اور اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ انجم کو کوئی چھوٹی سی شاپنگ بھی کرنا ہوتی وہ اختر کا انتظار کرتی۔ جہاں جانا ہوتا اختر کے ساتھ جاتی۔ بچوں کو اسکول بھی اسی کے مشورے سے داخل کیا۔ لیکن اختر نے اس سے یہ کیا کہہ دیا وہ اختر کو عام مردوں سے منفرد سمجھی تھی۔

اس کے سارے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اس نے پوری رات جنگلے پر کھڑے ہو کر کاٹ دی تھی اور ایک ہی سوال اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا تھا۔ کل شام چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے اختر نے اس سے کہا تھا۔ "ایک بات تم سے پوچھوں انجم؟"

"ہاں پوچھو۔" "کبھی تمہارا اپنے لیے جینے کا جی چاہا؟۔۔۔۔ نہیں۔ اس نے فوراً ہی کہا۔ پھر اختر نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔

"جھوٹ کیوں بولتی ہو۔۔۔۔؟ اس کے انداز میں بے اعتمادی تھی ـــــ مجھے یقین ہے ـــــ آخر کیوں ـــــ"

"میں کیوں کر مان لوں کہ تم اتنی بڑی حقیقت بلکہ۔۔۔ ضرورت سے منکر ہو ـــــ"

اس کی بے یقینی برقرار تھی ـــــ "کیسی ضرورت" انسانی ضرورتوں کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں اور پھر۔۔۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انجم جیسی ذہین عورت کے لیے اتنے ہی الفاظ کافی تھے ـــــ اس نے ذرا ترشی سے کہا ـــــ "بھٹکنے کیوں لگے آپ تو بہت اچھی بھلی باتیں کیا کرتے تھے"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور تم بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لو" اس نے بڑے بھروسے سے کہا۔

"یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں بھی آپ کے خیال سے اتفاق کروں" "تم تو میری ہم خیال ہو"

"یہ ٹھیک ہے ہم دونوں کے خیالات بہت ملتے ہیں"۔۔۔ اختر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"آج تمہیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی ـــــ انسان کی اپنی ذات بھی ہوتی ہے"

اختر آج اس سے یہی بات کہنے آیا تھا۔ وہ انجم کی دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا۔ انجم نے کہا ـــــ "اختر صاحب میں نہیں مانتی بعض اوقات فرد سے وابستہ دوسری ذاتیں اتنی اہم ہو جاتی ہیں جن کے سامنے اپنی ذات مسخ ہو جاتی ہے۔

اختر نے کہا "تم اس وقت ماں بن کر بول رہی ہو ورنہ حقیقت کو یوں نہ جھٹلاتیں"

انجم نے کہا "ہر شخص کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ میں آپ کی بات کو جھٹلا بالکل نہیں رہی ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں وہ بھی سچ ہے"

اختر نے کہا ـــــ "تو پھر تم میری بات پر متفق ہو" اس نے اپنا فیصلہ ہنس کر سنا دیا۔

انجم نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا ـــــ "واہ یہ خوب آپ کی کوئی دھونس ہے میں اپنی

ایکھ - ۱، مرلوی روڈ ہیئلہ ہاؤس۔ نئی دہلی - ۲۵

مرضی کی مالک ہوں۔ میں وہ کرتی ہوں جس کی میرا دل گواہی دیتا ہے ورنہ میں نے کبھی اپنی ذات کے سامنے کبھی کسی چیز کے لیے نہیں جھکی چاہے میرا کتنا ہی بڑا نقصان —— یا نفع ہو۔"

اختر نے بھی گمبھیر ہو کر کہا "بات کو گھماؤ مت میری بات کا جواب دو۔"

آپ کی فضول باتوں کے لیے میرے پاس کوئی جواب نہیں — "یہ فضول باتیں ہیں۔" وہ طیش میں آکر سیدھا کھڑا ہو گیا اور غصہ سے چائے کا کپ جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا وہ میز پر رکھا اور دروازہ زور سے بند کر کے چلا گیا۔

انجم اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس قدر ٹھنڈے اور نرم مزاج کا اختر آج آگ بگولہ کیسے بن گیا — کیا؟ کسی نے اسے میرے خلاف کچھ کہا ہے —— اگر کوئی کچھ کہتا تو وہ اس طرح کی باتیں کیوں کرتا۔ وہ تو اپنی ذات سے متعلق باتیں کر رہا تھا۔

حالاں کہ انجم اسے روکنا چاہتی تھی لیکن وہ بہت غصہ میں تھا انجم کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یکایک اختر کو کیا ہو گیا۔ اختر اس کی سوچ کو ایک نئی نہج پر ڈال کر چلا گیا تھا بلکہ اس کا ناراضگی سے اٹھ کر چلے جانا ہی انجم کے لیے دعوت فکر سے کم نہ تھا۔۔۔

آج اسے اپنے شوہر کی یاد بری طرح ستا رہی تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی کھڑکی سے بوچھار اس کے پلنگ تک آرہی تھی۔ بوندیں اس کے جسم کو بھگو رہی تھیں۔ بوچھار سے اس کے سارے کپڑے گیلے ہو گئے تھے اور وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اس کے پورے جسم میں محرومی کے شعلے بھڑک رہے تھے جس کی تپش اس کے پورے وجود کو جلا رہی تھی۔ اندر سے وہ بالکل سوکھی تھی کسی نے سچ ہی کہا ہے — دوستوں پر بھروسہ نہیں کیا جانا چاہیے۔

عورت کی دوست صرف اس کی ہم جنس ہی ہو سکتی ہے۔۔۔ مرد نہیں۔۔۔

عابد کی موت کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔۔۔ اور اس نے اتنے عرصہ میں زندگی کو جیسے چھو کر محسوس کر لیا تھا اور اس عرصہ میں اس نے دنیا کے لوگوں سے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا جتنا دوسرے افراد شاید پوری زندگی میں بھی نہ سیکھ پائیں۔۔۔

کوئی لڑکی جوانی میں بیوہ ہو جائے اور خوب صورت بھی ہو تو اسے کن خاردار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتی ہے جو خود ایسی ہی صورت حال سے گزری ہو۔ کوئی دوسرا فرد اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ عابد کی موت کے وقت اس کی عمر ہی کیا تھی۔ — ۲۵۔۲۶ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ عمر کا سب سے خوب صورت دور وہی ہوتا ہے۔ اس دور میں اسے کیا کیا نہ دیکھنا پڑا تھا۔ کچھ لوگوں کی نگاہوں میں تو مجسم گناہ ہوتا۔ وہ خود کو کتنا بھی ڈھانپ کر باہر نکلتی لیکن گندے اور مکروہ چہرے اس کا تعاقب کرتے رہتے۔

اختر عابد کا دوست تھا اکثر اس کے گھر آتا رہتا تھا وہ اسے اور لوگوں سے منفرد لگا اور انجم نے اختر کو اپنا دوست مان لیا اور اختر نے بھی اخلاقی قدروں کو کبھی پار نہ کیا۔ دونوں کی دوستی بڑے سیدھے ڈھنگ سے چلتی رہی بلکہ اور اس میں شدت آگئی۔

انجم جہاں جاتی اختر کے ساتھ ہی جاتی کیوں کہ اختر اس کا ہم مزاق تھا۔ دونوں کے خیالات ملتے تھے۔ اختر انجم کو خوش کرنے اور اس کا دل بہلانے کے لیے باہر بھی لے جاتا۔ مشاعروں، ادبی جلسوں، ادبی کانفرنسوں۔ وہ اختر کی ذات سے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ اگر ایک دن اختر اس کے گھر نہ آتا تو وہ دن اس کا بڑی بے چینی سے گزرتا۔ یہ اس کی قربت کی انتہا تھی۔

لیکن آج اختر نے اس کے بھرم کو چکنا چور کر دیا تھا۔ پتا نہیں اختر کو کیا ہو گیا۔ آج وہ اختر۔ اختر نہیں رہا تھا۔ وہ بھی ایک مرد ہے۔ کوئی بھی مرد عورت کو ایک ہی روپ میں دیکھتا ہے۔ اس کے ذہن کے ایک چھوٹے سے گوشے میں بھی ایک خفیف سا احساس بھی نہ آیا کہ اختر اس سے اس طرح کا رشتہ چاہتا ہے۔۔۔

اختر کی آواز بہت اچھی تھی اور ترنم بھی بہت اچھا تھا۔ اکثر لڑکیاں اس کے پیچھے گھومتیں اور وہ آکر اسے ہنس ہنس کر بتاتا انجم بھی اس کی باتوں سے محظوظ ہوتی۔۔۔ اسے ذرا بھی برا نہ لگتا۔

وہ پوری رات الجھتی رہی۔ صبح ناشتہ کے بعد اس نے اختر کو فون کیا۔۔۔ اختر جب سے ناراض ہو کر گیا تھا نہ وہ آیا اور نہ ہی فون کیا۔ اس کے نہ آنے سے اسے اور زیادہ تشویش ہوئی۔ اس نے فون کیا دوسری طرف سے اختر کی آواز "ہلو" کہا "آپ آئے کیوں نہیں۔ آپ تو ایسے خفا ہو کر گئے ہیں جیسے ہم سے کوئی ناتا ہی نہ تھا۔۔

اختر نے رکھائی سے کہا "تم سناؤ تمہارے خیالات میں تبدیلی آئی؟ یا ابھی وہی لے کر حصار میں بیٹھی ہو۔"

انجم نے کہا "پہلے میری بات کا جواب دیجیے آپ آئے کیوں نہیں۔"

"تم میری بات کا جواب دو۔ میرا تمہارے گھر روز آنا مناسب نہیں ہے۔ ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں وہ اس کو کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی جوان مرد کسی جوان عورت سے ملے اور وہ بھی بیوہ ہو کیسے برداشت کرے گا۔ میں تو تمہاری عزت کی خاطر یہ قدم اٹھا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ نے یہ نہ سوچا آپ کی ایک بیوی بھی ہے آپ کے دو بچے بھی ہیں۔"

"تمہیں ان سب باتوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہوگا میں تو تمہیں معاشرے میں عزت دینا چاہتا ہوں۔ سوچ لو اگر تمہیں منظور ہو تو میں آج شام کو آ کر لے جاؤں گا ورنہ۔ ۔۔۔"

انجم سوچ میں پڑ گئی وہ اختر کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اختر اس کی کمزوری بن گیا تھا۔

اس نے مصالحانہ انداز میں کہا۔" اختر تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔"

" اور انکار کی صورت میں تم مجھے اور..... میری دوستی دونوں کو کھو بیٹھو گی۔ اختر نے درمیان سے ہی اس کی بات کاٹ دی۔"

" اچھا تم گھر تو آؤ پھر سامنے بیٹھ کر ہی باتیں کر لیں گے۔"

"اگر گھر آ کر بھی ایسی ہی باتیں ہونی ہیں تو بے کار ہے۔ جب تک میری بات کا جواب اثبات میں نہیں مل جاتا میرا آنا ناممکن سمجھو" لہجہ فیصلہ کن تھا۔

" پھر آپ نہیں آئیں گے۔ اتنی پرانی دوستی آپ ختم کر رہے ہیں۔"۔

" دوستی میں ختم نہیں کر رہا ہوں تم کر رہی ہو۔ تم میری بات پر متفق ہو جاؤ گی تو سب درست ہو جائے گا۔" لیکن میں ایک عورت ہوں دوسری عورت پر سوکن بن کر ظلم نہیں کر سکتی۔؟ کیا تمہیں اپنی بیوی کا بھی خیال نہیں جو تمہارے بچوں کی ماں بھی ہے۔

" یہ تم مجھ پر چھوڑ دو میں سب ٹھیک کر لوں گا۔۔ اور پھر انسان کی سب سے اہم ضرورت اس کی اپنی ذات کی ہوتی ہے میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

فون کھٹ سے بند ہو گیا وہ ریسیور تھامے منہ کھولے کھڑی رہ گئی۔

اس روز وہ تمام دن خواہ مخواہ کے بکھیڑوں میں لگی رہی اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا مگر اختر کی یاد ایک لمحہ کو اس کے ذہن سے محو نہ ہوئی بلکہ ہتھوڑے کی مانند ضربیں لگا کر بے چین کرتی رہی حتیٰ کہ رات آ گئی بستر پر لیٹ کر تو سوچیں کنکھجوروں کی طرح دماغ میں رینگنے لگی ہیں۔۔۔

آج اسے کسی فیصلہ پر پہنچنا تھا اس نے اپنے ذہن کے پردے پر اس روز کی گفتگو اور پھر اختر کی پوری شخصیت اس کے نظریے، دلائل اور ہر جملے کے ساتھ اس کے تاثرات بھی یاد آ رہے تھے۔ مثلاً جب اس نے یہ کہا۔

" انسان کی سب سے اہم ضرورت ذات کی ضرورت ہے۔ اس وقت وہ جس نظروں سے انجم کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک مرد کی آنکھیں تھیں۔ جو مافی الضمیر بھی بیان کر رہی تھیں۔ جو لب نہ کہہ سکتے تھے۔ جو انسانی وجود کا سب سے اہم اور سچا حصہ ہوتے ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور پھر فون پر تو اس نے کچھ باقی بھی نہ رکھا تھا۔

وہ رات بھی اس کی ایسے ہی کٹ گئی۔

عابد کے مرنے کے بعد کوئی ایک رات بھی اس کی ایسی نہ کٹی جو اسے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی ہو۔ وہ ہمیشہ نیند کی گولیوں کا سہارا لیتی پھر بھی کبھی کبھی اسے پوری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی اور نیند اس سے روٹھی رہتی۔ رات کو بستر پر اسے اپنے شوہر کا بھرپور پیار بری طرح تڑپاتا وہ خود کو سنبھالنے کے لیے اسے کتنی کرب اور اذیت سے گزرنا پڑتا۔ ان تمام سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ اختر کی سوچ اپنی جگہ درست ہے مگر اسے اپنے شوہر عابد کے سامنے اختر کی شخصیت ماند نظر آنے لگی۔ عابد کتنا بلند تھا۔ وہ اسے کتنا ٹوٹ کر پیار کرتا تھا اس وقت اس کی چاہت اس کا پیار اسے بری طرح تڑپانے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ایک دن عابد نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔

" انجم جان۔ موت کوئی گالی نہیں ہے۔ اگر میں مر جاؤں اور تمہیں کوئی بہتر انسان ملے تو تم فوراً اس سے شادی کر لینا۔ میرے لیے اپنی معصوم جوانی برباد نہ کرنا آخر انسان کی اپنی ذات بھی ہوتی ہے اور حقیقت سے منکر نہیں ہوا جاتا۔

وہ پوری رات سوچتی رہی۔ اختر اور عابد میں موازنہ کرتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جسے وہ سونا سمجھتی رہی وہ تو پیتل بھی نہیں۔ اپنی ہی ذات کا پجاری ہے۔

تمام رات جاگنے سے طبیعت کسلمند تھی پھر بھی اٹھی اسکول کے لیے بچوں کو تیار کیا اور اسکول کی بس میں جا کر بٹھایا۔ بس چلی گئی لیکن آج وہ دیر تک بچوں کی بس کو کھڑی دیکھتی رہی پھر اس نے گیٹ بند کیا اور بھاری بھاری قدموں سے کمرے میں آئی کیوں کہ آج اسے اختر کو جواب دینا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے ریسیور اٹھا کر اختر کا نمبر گھمایا۔

" ہلو۔" " اختر بول رہا ہوں۔" " ہاں اور تمہارے جواب کا بے چینی سے منتظر بھی ہوں۔" اختر اس کی آواز سن کر خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔

" اختر تم ایک مرد ہو لہٰذا اتنے حساس ہو کر تم کبھی نہیں سوچ سکتے۔۔۔ تم نے یہ سوچا کہ میری کوکھ سے دو پھول بھی ہیں ان کا مستقبل کیا ہوگا۔۔ اور تمہارے دو بچے اور اس بیوی کے دل پر کیا گزرے گی۔ تم سے زیادہ کچھ کہنا بے کار ہے۔۔ تم صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتے ہو۔۔ بہرحال یہ بات مجھ سے کسی بھلے انداز میں کہی جاتی میری جانب سے انکار ہی ہوتا۔

میں یہ کیوں کر بھول جاؤں کہ میرا وجود تن تنہا نہیں ہے۔ میں ایک ایسا درخت ہوں جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اگر اسے اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو اس کی شاخیں اور پتے مرجھا جائیں گے وہ سرسبز نہیں ہو سکتے؟ اختر آخر تم بھی ایک مرد ہی ہو۔

یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

تعبیر کے دن آئے ہیں

(آزادی کا جشنِ زریں)

خورشید افسر بسوانی

س کی آنکھ میں جو خواب سجوئے تھے کبھی
ن کی سچائی کے، تعبیر کے دن آئے ہیں
ہم ابھی تک تو سمیٹا کیے بکھرے لمحے
ب نئے دور کی تعمیر کے دن آئے ہیں

ام پر فرقہ پرستی کے بہے گا نہ لہو
ب مرے دیش کا انصاف نہیں سستا ہوگا
ور ہو جائے گی ذہنوں کی کثافت ساری
س نئے دور کا ماحول بھی ستھرا ہوگا

جس طرح بکھری ہوئی زلف سنور جاتی ہے
ب تو یوں وقت کی پیشانی کا بل نکلے گا
رحلہ کوئی ہو آسانی سے طے ہوتا ہے
سئلہ کوئی بھی ہو جلد ہی حل نکلے گا

کنالوجی ہو، کہ سائنس کوئی میداں ہو
ہر قدم رکھنا ہے اب پہلے قدم سے آگے
تیز تر ہوگئی رفتارِ ترقی اپنی
ب نہ نکلے گا کوئی دیش بھی ہم سے آگے

بسواں ۔ سیتاپور ۔ یوپی

رئیس الدین رئیس

خوابوں میں تعبیریں گھولا کرتے ہیں
شب کی گرہیں دن میں کھولا کرتے ہیں

رکھ کر غزلوں میں کچھ پیچیدہ الفاظ
ہم جدّت کی بولی بولا کرتے ہیں

بچپن ہم کو گودی میں بھر لیتا ہے
جب تتلا کر بچے بولا کرتے ہیں

قسمت کس بازار میں لائی ہے ہم کو
رتی رتی خود کو تولا کرتے ہیں

وہم و یقیں کے پیچیدہ گلیاروں میں
قدم رئیس کے اکثر ڈولا کرتے ہیں

۱۷۲۵/۱۰/۱۔ دہلی گیٹ علی گڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۱

غزلیں

شہناز چاندنی

ستارے چاند سورج کیا کریں گے
بس ان کے حسن کو دیکھا کریں گے

غمِ فرقت نہ جن کو راس آیا
وہی آنسو مجھے رسوا کریں گے

فقیری میں ہی لطفِ زندگی ہے
شہنشاہی تیرا ہم کیا کریں گے

تری یادوں کے گلشن میں کبھی ہم
گلابوں کی طرح مہکا کریں گے

جو مجھ پر آج کھل کر ہنس رہے ہیں
وہ کل میرے لیے رویا کریں گے

لہو میں جن کے شامل ہیں جفائیں
وفا ہم سے بھلا وہ کیا کریں گے

جنوں میں چاندنی لفظوں کے پتھر
امیرِ شہر پر پھینکا کریں گے

معرفت عکیل قریشی ۔ ڈھولی کھال، سہارنپور

بڑھتے قدم۔۔۔

(ترقیاتی خبرنامہ)

کیا آپ جانتے ہیں؟

مٹی کے تیل کی قیمتوں میں دو بار تخفیف کی گئی۔ ۱۹۹۱ء میں ۲ر۴۰ روپے فی لیٹر سے گھٹا کر اس کی قیمت ۲ر۲۰ روپے فی لیٹر کی گئی اور ۱۹۹۴ء میں ۲ روپے فی لیٹر کی گئی۔ تب سے قیمتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

- ایشیا کے ترقی پذیر ملکوں میں مٹی کا تیل سب سے زیادہ سستا ہندوستان میں ہے۔ مٹی کے تیل پر دی جانے والی سبسڈی سال رواں میں ۶۳۰۰ کروڑ ہونے کی توقع ہے جب کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں یہ ۳۷۴۴ کروڑ روپے تھی۔
- رسوئی گیس ابھی تک بین اقوامی قیمت کے مقابلہ میں نصف قیمت پر فروخت ہو رہی ہے۔ اس مد میں سال رواں میں دی جانے والی سبسڈی ۲۰۳۰ کروڑ روپے کی ہوگی جب کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں یہ ۱۴۱۰ کروڑ روپے کی تھی۔
- ڈیزل پر ۹۵-۱۹۹۴ء میں سبسڈی ۳۰۴ کروڑ روپے تھی جو ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۴۳۸۰ کروڑ روپے ہو گئی تھی۔ ۹۸-۱۹۹۷ء میں اس کے ۳۵۴۰ کروڑ ہو جانے کا امکان ہے۔
- ڈیزل کی عالمی قیمت کم ہو جانے سے ڈیزل کی درآمدی قیمت سے صارفین کو فائدہ پہنچے گا۔
- درآمدی قیمت میں یکسانیت لانے سے صنعتوں میں کام میں آنے والی اشیا مثلاً ایل۔ ایس۔ ایچ۔ ایس اور فرنیس آئیل کی قیمتیں کم ہوئی ہیں۔ اس سے انجینئرنگ، ٹیکسٹائل اور فاؤنڈری صنعتوں کو بالخصوص چھوٹے اور درمیانہ سیکٹروں میں فائدہ پہنچے گا۔
- تھوک قیمتوں کے عدد اشاریہ (ڈبلیو پی آئی) پر پٹرولیم کی قیمت کے اضافہ کا اثر صرف ۰ر۴۷ فی صد ہوگا۔
- پٹرول کی قیمتوں میں معمولی اضافہ کر کے اور تیل کے شعبہ میں جامع اصلاحی پیکیج نافذ کر کے سپلائی میں خلل پیدا ہونے کے خطرہ کا سدباب کر لیا گیا ہے۔

ریلوے مسافروں کے دعوؤں کو جلد نمٹانے کے اقدامات

ریلوے نے مسافروں کے دعوؤں کو جلد از جلد نمٹانے کے لیے دو سطحی اقدامات کیے ہیں۔ انتظامی شعبہ میں وزارت ریلوے نے تمام زونل ریلویز کے جنرل منیجروں کو ہدایت کی ہے کہ مسافر ٹرین کے حادثہ یا واقعہ کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو زخمی ہونے والے اور مرنے والے مسافروں کے بارے میں تفصیلات حاصل کی جائیں۔ کلیم کی درخواستوں کے فارم دعویٰ کرنے والوں کو فراہم کیے جائیں اور ریلوے کے دعوؤں کے ٹریبونل کے متعلقہ بنچ کو ریکارڈ فراہم کیا جائے جب دعوے داخل کیے جا چکیں اور ان کی سماعت شروع ہو جائے تو زونل ریلویز کو چاہیے کہ جلد از جلد فیصلہ کرنے کے لیے ٹریبونل کو ہر ممکن تعاون دیں۔ اس سلسلہ میں زونل ریلویز کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ریلوے کے دعوؤں کے ٹریبونل سے نوٹس ملنے کے ۳۰ دن کے اندر اندر تحریری بیانات داخل کریں۔ اس کے ساتھ ہی زونل ریلویز کے چیف کلیم افسروں کو سرمایہ کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر دو لاکھ روپے تک کی ڈگری کی رقم کی منظوری دینے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ زونل ریلویز سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلیم کی ڈگری کی رقم کے چیک ۱۵ دن کے اندر جاری کر دیئے جائیں۔

خواندگی۔۔۔ حقائق ایک نظر میں

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں خواندگی کی شرح ۵۲ر۲۱ فی صد ہے۔ خواتین میں خواندگی ۳۹ر۲۹ فی صد اور مردوں میں خواندگی ۶۴ر۱۳ فی صد ہے۔ یہ شرح خواندگی پڑوسی ممالک بھوٹان (۴۲ر۲ فی صد) بنگلہ دیش (۳۸ر۱ فی صد)، پاکستان (۳۷ر۸ فی صد) افغانستان (۳۱ر۵ فی صد) اور نیپال (۲۷ر۵ فی صد) کے مقابلے میں کافی بہتر ہے۔

- نو ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں نے ۷۰ فی صد سے زیادہ کی اعلا شرح خواندگی حاصل کی ہے۔ ان میں کیرالا (۸۹ر۸۱ فی صد،

میزورم (۸۲٫۲۷ فی صد)، لکشدیپ (۸۱٫۷۸ فی صد)، گوا (۷۵٫۵۱ فی صد)، دہلی (۷۵٫۲۹ فی صد)، پانڈیچری (۷۴٫۷۴ فی صد)، انڈمان و نکوبار جزائر (۷۳٫۰۲ فی صد) اور دمن و دیو (۷۱٫۲۰ فی صد) شامل ہیں۔

- ۱۳ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں نے قومی اوسط سے زیادہ شرح خواندگی حاصل کی ہے۔ دیہی علاقوں میں ۲۲۶٫۱۴ ملین سے (۴۴٫۶۹ فی صد) خواندہ افراد ہیں، جن میں ۱۵۱٫۲۱ ملین مرد (۵۷٫۸۷ فی صد) اور ۷۴٫۹۳ فی صد ملین (۳۰٫۶۲ فی صد) عورتیں شامل ہیں۔
- شہری علاقوں میں ۱۳۳٫۱۴ ملین خواندہ افراد (۷۳٫۰۸ فی صد) ہیں، جن میں ۸۱٫۳۲ ملین مرد (۸۱٫۰۹ فی صد) اور ۵۱٫۸۲ ملین خواتین (۶۴٫۰۵ فی صد) شامل ہیں۔
- قومی خواندگی مشن کا مقصد ۱۹۹۹ء تک ۱۵ سال سے ۳۵ سال تک کی عمر کے ۱۰۰ ملین ناخواندہ افراد کو کام کاج کے لائق خواندہ بنانا ہے نیز ۲۰۰۵ء تک مکمل خواندگی کا نشانہ حاصل کرنا ہے۔
- خواندگی کی مہموں پر عمل درآمد کرنے کے لیے سماج کے ہر طبقہ سے ۱۰ ملین سے زیادہ رضاکاروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔
- خواندگی کے مرحلہ کے تحت ۴۲۹ اضلاع کا احاطہ کیا جاتا ہے جب کہ خواندگی کے بعد کے مرحلہ کے تحت ۱۹۳ اضلاع کا احاطہ کیا جاتا ہے۔
- اب تک منظور شدہ خواندگی پروجیکٹ پڑھنا لکھنا سیکھنے والے ۱۲٫۷ ملین افراد کا احاطہ کرتے ہیں۔
- ۱۹۹۱ء میں کیرالہ کو پہلی مکمل طور سے خواندہ ریاست قرار دیا گیا تھا اور ارناکلم کو ۴ فروری ۱۹۹۰ء کو پہلا مکمل طور سے خواندہ ضلع قرار دیا گیا تھا۔ ●

زیر زمین آبی وسائل کے فروغ کے لیے قانون

مرکزی حکومت نے تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام تمام علاقوں کو ایک ماڈل بل کا مسودہ ارسال کیا ہے تاکہ زیر زمین آبی وسائل کے فروغ کی ضابطہ بندی اور کنٹرول کے لیے انھیں مناسب قانون وضع کرنے میں مدد مل سکے۔ اب تک صرف گجرات، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش نے اس مقصد کے لیے قانون وضع کیا ہے۔ چوں کہ پانی ریاستی موضوع ہے، اس لیے ماڈل بل کے خطوط پر مناسب قانون ریاستی حکومتوں کو ہی وضع کرنا ہوگا۔ ●

اے ڈی بی کے خصوصی فنڈ میں ہندوستانی عطیہ میں اضافہ

حکومت ہند نے ایشیائی ترقیاتی بینک (اے ڈی بی) کے تکنیکی امداد کے خصوصی فنڈ میں عطیات دینے کی "جزوی طور پر پابندی" کی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کے بعد ۹۸-۱۹۹۷ء میں اسے ۴۵ لاکھ روپے کا مکمل طور پر غیر پابند عطیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے، یعنی اب ہندوستان کے ذریعہ دیے جانے والے عطیات کے استعمال پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ "جزوی طور پر پابندی" کی شرط کے نفاذ کی وجہ سے ہندوستان یا کسی دوسرے ترقی پذیر ممبر ملک سے رضاکارانہ طور پر موصول ہونے والے عطیات کے استعمال پر پابندی لگی ہوئی تھی۔

بینک کے ڈائریکٹروں کے بورڈ نے ہندوستان کی جانب سے بینک کے خصوصی فنڈ میں مزید عطیہ دینے کی پیش کش منظور کرلی ہے۔ بینک نے ہندوستان کی جانب سے "غیر پابند" عطیہ دینے کے فیصلے کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ ہندوستان، ایشیائی ترقیاتی بینک کے تکنیکی امداد کے خصوصی فنڈ (ٹی اے ایس ایف) میں ۱۹۷۰ء سے عطیات دے رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ۲ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا تھا اور ۱۹۸۹ء سے سالانہ ۲۲٫۵۰ لاکھ روپے کا عطیہ دیا جارہا تھا۔ "تکنیکی امداد" ایشیائی ترقیاتی بینک کی ایک اہم سرگرمی ہے جس کے ذریعہ ترقی پذیر ممبر ملکوں کو ترقیاتی پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی، ان پر عمل درآمد اور انھیں جاری کرنے کے کام میں مدد دی جاتی ہے۔ بینک کی جانب سے مختلف علاقائی مطالعات اور سرگرمیوں میں بھی تکنیکی مدد فراہم کی جاتی ہے۔ بینک کے ذریعہ گرانٹ، قرض اور یا دونوں طریقوں سے تکنیکی امداد دینے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سرمایہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تکنیکی امداد کے خصوصی فنڈ میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ملکوں کی جانب سے دیے جانے والے رضاکارانہ عطیات ہیں۔ ہندوستان کو بینک کے ذریعہ ۱۹۸۸ء میں ۶٫۰ ملین ڈالر کی امداد ملی تھی جو ۳۰ جون ۱۹۹۷ء کو ۱۴٫۴ ملین ڈالر کی خطیر رقم تک جا پہنچی تھی۔ ●

۱۱ لاکھ کنوؤں کی تعمیر

اب تک تمام ملک میں ملین ویل اسکیم (ایم ڈبلیو ایس) کے تحت ۱۱ لاکھ کنوؤں کی تعمیر ہو چکی ہے۔

ملین ویل اسکیم کا شمار جواہر روزگار یوجنا اسکیم کی ایک ذیلی اسکیم کے طور پر ہوتا تھا مگر یکم جنوری ۱۹۹۶ء سے یہ اسکیم آزاد اسکیم ہو گئی ہے۔ ملین ویل اسکیم کے تحت چھوٹی سینچائی اسکیمیں ہیں جیسے کنوؤں کی کھدائی، سینچائی تالاب، درج فہرست ذاتوں/ درج فہرست قبائل سے تعلق رکھنے والے چھوٹے کسانوں کی زمینوں کی ترقیات۔ اس اسکیم کے لیے اس سال مئی کے آخر تک ۱۹۸٫۱۴ کروڑ روپے مرکز نے جاری کیے ہیں۔ اس اسکیم کا دستیاب مجموعی فنڈ (جس میں غیر خرچ شدہ میزان بھی شامل ہے) ۴۲۱٫۱۶ کروڑ روپے ہے۔ ریاستیں اور مرکزی انتظام کے علاقے جنھوں نے قومی اوسط سے زائد فی صد استعمال کیا ہے ان میں اروناچل پردیش، آسام، بہار، گجرات، ہماچل پردیش، مہاراشٹر، اڑیسہ، سکم اور لکشدیپ کے نام شامل ہیں۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں ملین ویل اسکیم کا ایک علاحدہ وجود ہونے کے بعد سے مئی ۱۹۹۷ء تک اس اسکیم کے تحت ۹۱۸۸ کنویں تعمیر ہو چکے ہیں اور ۹۱،۵۷۷ کنویں ابھی زیر تیاری ہیں۔ ●

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : این۔ این۔ شرما

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

معاون : رقیہ زیدی

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : سجاتا

جلد : ۱۷ : شمارہ : ۹

دسمبر ۱۹۹۶ء (اگرہاین۔ پوش شک ۱۹۱۹)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) ڈی۔ این۔ گاندھی

سرکولیشن اینڈ ایڈورٹیزمنٹ منیجر : کے۔ ایس۔ جگنا تھ راؤ

مضامین سے متعلق

خط وکتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن

پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

پروفیسر این۔ سی۔ پراشر

نیتاجی سبھاش اور قومی منصوبہ بندی

جدوجہد آزادی کی تمام عظیم شخصیتوں میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی پہچان سب سے الگ تھی۔ حالاں کہ مذہب سے ان کا گہرا لگاؤ تھا مگر وہ قدیم ثقافتی ورثہ پر ضرورت سے زیادہ زور نہ دے سکے خود ان کا قول ہے کہ:۔

"ہندوستان کے عظیم ثقافتی سرمایہ کو میں بہت واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں لیکن اسے ہندوستان کی بے چارگی، عام غریبی، ناخواندگی اور پستی کو دور کرنے کا وسیلہ نہ بنایا جانا چاہیے۔ کچھ عرصہ کے لیے مذہب اور فلسفہ کو ایک دوسرے سے الگ رہنے دیا جائے یہاں تک کہ ہم چلتے پھرتے ڈھانچوں کو انسانی شکل میں ڈھال لیں۔ آج کے دور میں فلسفہ اور مذہب بھوکوں کی خوراک، ننگوں کے لیے کپڑے اور بے گھروں کے لیے گھر ہونے چاہئیں۔ پہلے شاندار زندگی اس کے بعد فلسفہ آتا ہے۔"

ایک محب وطن کے اس قدر بیباکانہ اور حوصلہ بخش الفاظ واضح طور پر منزل مقصود کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صرف آزادی کا حصول اور وہ بھی سیاسی آزادی کا حصول کافی نہ تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ:۔

"آزادی سے میرا مطلب ہوتا ہے ہمہ جہت آزادی یعنی فرد کی آزادی اور سماج کی آزادی، امیر کی آزادی اور غریب کی آزادی، مردوں کی آزادی اور عورتوں کی آزادی، تمام افراد اور تمام طبقات کی آزادی۔ یہ آزادی صرف سیاسی غلامی سے نجات ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ دولت کی مساوی تقسیم، ذات پات کی تفریق اور سماجی نابرابری کا خاتمہ، فرقہ پرستی اور مذہبی عدم رواداری کے خاتمہ سے بھی عبارت ہے۔"

یہ دو اقتباسات آزاد ہند کے لیے سبھاش چندر بوس کے پورے مسلک کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس میں ہم کو وہ نگینے نظر آتے ہیں جو پوری آب و تاب سے چمکتے ہیں اور اپنی کرنیں ہر سمت ڈال کر ذہن کے تاریک اور دھندلے گوشوں کو روشن کرتے ہیں۔ اس میں ہم کو ہندوستان کی مستقبل کی نسل کے لیے یہ واضح پیغام ملتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کو اپنے ملک کے لیے استعمال کریں۔

اپنے طالب علمی کے زمانہ ہی سے جب آئی۔ سی۔ ایس کے وقاری امتحان میں چوتھی پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود وہ آئی۔ سی۔ ایس میں شامل ہونے سے گریزاں تھے ان میں اپنے ملک کے مستقبل کے لیے کام کرنے اور منصوبہ سازی کرنے کا جوش بھرا ہوا تھا۔ دیش بندھو چترنجن داس کے نام ۱۹۲۱ء میں ان کے دو خطوط قومی منصوبہ بندی کے ابتدائی خیال سے لبریز تھے پروفیسر مدھو ڈنڈوتے نے اپنی کتاب "سبھاش چندر بوس — ہندوستانی منصوبہ بندی کے محرک" (SUBHAS CHANDRA BOSE PIONEER OF INDIAN PLANNING) میں لکھا ہے کہ انھوں نے منصوبہ بندی کے تصور کو مندرجہ ذیل چار دستاویزوں میں واضح اور شفاف انداز میں پیش کیا تھا۔

——— ہری پورہ، گجرات میں ۱۹۳۸ء میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۵۱ ویں اجلاس میں ان کا خطبۂ صدارت۔

——— ۱۹۴۲ء میں ایک جرمن میگزین میں شائع ہوا ان کا مضمون بعنوان "ہندوستان اور اس کے مسائل" (INDIA AND HER PROBLEMS)

——— ۱۹۴۴ء میں ٹوکیو یونیورسٹی کے طلبہ کو دیا گیا ان کا خطبہ بعنوان "ہندوستان کے بنیادی مسائل — — — —" (THE FUNDAMENTAL PROBLEMS OF INDIAN)

——— بمبئی میں ۱۷ دسمبر ۱۹۳۸ء کو قومی منصوبہ بندی کمیٹی کے افتتاحی اجلاس میں ان کا خطبہ۔

——— مشہور سائنس داں ڈاکٹر میگھناتھ ساہو کو دیا گیا ان کا انٹرویو۔

جب دوسرے قائدین صرف سیاسی آزادی پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے تب نیتاجی نے آزاد ہندوستان میں منصوبہ بندی کے ذریعہ اقتصادی ترقی کا تصور

پیش کیا تھا۔ نیتاجی کے ذریعہ جن کو صنعت کاری کے لیے مشترکہ نظریہ فراہم کرنے کا اختیار دیا گیا تھا ان سات صوبوں کے وزرائے اعظم (PREMIERS) کی کانفرنس کا انعقاد ان کی ٹھوس کوشش کا مظہر ہے۔ جب انھوں نے منصوبہ بندی کے لیے پہلی قومی کمیٹی مقرر کی اور بطور صدر پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ایم۔ وشوسیوریہ، پرشوتم داس ٹنڈن، ٹھاکر داس، کے۔ ٹی۔ شاہ، ڈاکٹر دی۔ ایس۔ دوبے اور شری وی۔ جی گری کی طرح کی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ اس کے پہلے جلسہ کا افتتاح کیا تو یہ بات واضح تھی کہ وہ سماجی اور اقتصادی تعمیر نو کا ایک خاکہ قوم کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جس پر آزادی کی صبح طلوع ہونے کے بعد عمل کیا جائے۔

آزاد خیال

نیتاجی کی یہ خوبی تھی کہ وہ کسی عقیدہ یا نظریہ کی اندھی تقلید نہیں کرتے تھے۔ حالاں کہ وہ سائنسی بنیادوں پر جدید قوم کی تعمیر کے تصور کو پسند کرتے تھے مگر وہ ٹریڈ یونینوں کے حقوق، مزدوروں اور کسانوں کی بہبود اور ثقافتی، لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق سے بھی اسی قدر آگاہ تھے۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ کسی بھی شعبہ میں چند ہاتھوں میں اقتدار کی مرکزیت، اقتدار کے بے جا استعمال کا سبب بنتی ہے۔ انھوں نے مخصوص دفعات کے ذریعہ مناسب آئینی تحفظات کی وکالت کی اور تمام اندرونی اور بیرونی استحصالی اقدامات کے سدباب کی بات کہی یعنی انھوں نے ایک طرف تو تجارت وصنعت پر زبردست زور دیا اور دوسری طرف پنچایتی راج اداروں کے ذریعہ اقتدار کی لامرکزیت پر زور دیا۔ انھوں نے دیہی عوام اور ان کے اداروں کے ساتھ ہی اور نوجوانوں، عورتوں اور کمزور تر طبقات کو بھی اختیارات سے لیس کرنے کی وکالت کی۔ طالب علموں اور نوجوانوں کے مسائل سے آگاہ ہونے کی وجہ سے نیتاجی نے ان کی توانائی کو قوم کی فلاح کے لیے استعمال میں لانے پر غور کیا۔ انھوں نے نیچے سے منصوبہ بندی کی ضرورت کا اظہار کیا نہ کہ اوپر سے۔ اسی طرح انھوں نے تعلیم پر بھی بہت زیادہ زور دیا۔ وہ ہمیشہ طالب علموں اور نوجوانوں کو خطاب کرنے کے خواہاں رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ لوگ جدوجہد آزادی کی صف اول میں رہیں۔ وہ اقتصادی اور سماجی تعمیر نو کے خواہاں تھے۔ ان کا قول تھا کہ طلبہ قوم کا بے حد مثالی حصہ ہیں۔ وہ تعلیم کے ٹھوس نظام کو مستقبل کی کلید قرار دیتے تھے۔ جو مئی ۱۹۲۸ء کو پونے میں مہاراشٹر صوبائی کانگریس کی کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا تھا کہ:۔

"تعصب ثقافتی رفاقت کے راستہ کا سب سے بڑا کانٹا ہے۔ اسے راستہ سے ہٹانے کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں کہ سیکولرزم اور سائنسی نظریہ پر مبنی تعلیم کا نظام برپا کیا جائے۔"

قومی تعمیر نو کے لیے ان کا اہم ترین تصور ملک کے اتحاد سے عبارت تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک دن وہ بھی آئے گا جب آزادی کے موقع پر ہندوستان کا بٹوارہ ہو جائے گا۔ انھوں نے کانگریسی لیڈروں کو تقسیم کی ہولناکیوں سے آگاہ کیا تھا۔ عارضی آزاد ہند حکومت کے صدر اور آزاد ہند فوج (آئی۔ این۔ اے) کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے انھوں نے تمام محبان وطن کو یہ پرجوش پیغام دیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر بٹوارے سے گریز کریں۔ شاید انھوں نے اس خون خرابہ اور فرقہ وارانہ جنون کا اندازہ لگا لیا تھا جس سے قوم کو بٹوارہ کی صورت میں گزرنا تھا۔

لہٰذا متحدہ ہندوستان کے لیے مربوط منصوبہ بندی کا ان کا نظریہ، دور دراز کے شہر سنگاپور سے قوم کے لیے ان کی بہترین پیش کش تھی۔ مغربی پنجاب اور سندھ کا محنت سے تکمیل کو پہنچایا گیا نہروں کا نظام اور مشرقی پاکستان کے جوٹ کی پیداوار کے علاقوں نے اقتصادی اور سماجی تعمیر نو کے عمل کو توانا اور سریع الحرکت بنا دیا ہوتا۔ انھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ مضبوط مرکز اور مساوی طور پر مضبوط ریاستوں کے درمیان توازن ضروری ہے۔ ان کے پاس نہ صرف برطانوی صوبوں کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے بھی جو ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تمام دیسی ریاستوں کا احاطہ کرتا تھا ایک منصوبہ تھا۔ ان کا ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینے کا نظریہ تھا کہ اسے کسی بھی رسم الخط میں جو عام طور پر استعمال کیا جاسکتا ہو، لکھا جائے۔ مگر ان تمام اقدامات کا اہم ترین عنصر بے غرضانہ خدمت اور مادر وطن کی آزادی کے لیے مسلسل جدوجہد کے ساتھ ہی عوام کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے باضابطہ اور ہنسی خوشی سے کام کرنے سے عبارت تھا۔

سیاسی وابستگی

نیتاجی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ قومی قیادت کی مضبوط سیاسی وابستگی کے بغیر محض اقتصادی منصوبہ بندی خیال باطل ہے لہٰذا وہ ان لوگوں سے متفق نہ تھے جن کا کہنا یہ تھا کہ آزادی ملنے کے بعد کانگریس کو توڑ دیا جانا چاہیے۔ اس کے برخلاف ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ جو پارٹی ملک کو آزادی دلائے وہ قومی تعمیر نو اور سماجی و اقتصادی تعمیر نو کی ذمہ داری بھی سنبھالے۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے ان ممتاز سیاسی پارٹیوں کا تجزیہ کیا جنھوں نے طویل جدوجہد کے بعد بہت سے ملکوں میں آزادی دلائی اور اسی لیے انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو "شیڈو کیبنٹ" (عکسی کابینہ) کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ:۔

"اس مرحلہ پر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے کردار کے سلسلے میں کچھ اور بھی کہنا چاہوں گا۔ میرے فیصلہ کے مطابق یہ کمیٹی مجاہدین آزادی کی قومی فوج کو محض نظریاتی

مت مقرر کرنے کا ذریعہ نہیں۔ یہ آزاد ہندوستان کی عکسی کابینہ بھی ہے اور اسے اس انداز میں کام بھی کرنا چاہیے۔ یہ ایجاد بندہ نہیں۔ یہ وہ کردار ہے جو اپنی قومی نجات کے لیے جدوجہد کرنے والے دوسرے ملکوں کے ایسے ہی اداروں کے سپرد کیا گیا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو آزاد ہندوستان کے تناظر میں غور وفکر کرتے ہیں جو اس ملک میں خود اپنی زندگی کے مختصر عرصہ میں قومی حکومت کے قیام کا یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ہم یہ مطالبہ کریں کہ ورکنگ کمیٹی خود کو آزاد ہندوستان کی عکسی کابینہ سمجھے اور عکسی کابینہ کی طرح کام بھی کرے۔ یہی صدر ڈی۔ ویلیرا کی ری پبلکن حکومت نے اس وقت کیا تھا جب وہ برطانوی راج سے لڑ رہی تھی اور برطانوی سرکار کے پاؤں اکھڑ رہے تھے اور مصر کی وفد پارٹی کی مجلس عاملہ نے بھی برسر اقتدار آنے سے پہلے یہی کیا تھا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو چاہیے کہ وہ روزمرہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ہی ان مسائل کا مطالعہ بھی کرتے رہیں جو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد پیدا ہو سکتے ہیں۔

فیڈرل اسکیم کے تحت انگریز سرکار کے تجویز کردہ نئے آئین کو مسترد کرتے ہوئے کانگریس نے کہا تھا کہ حصول آزادی کے بعد خود ہندوستان کے عوام اپنا آئین بنائیں گے۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس نے محسوس کیا تھا کہ انگریز سرکار اپنے بجٹ کے اخراجات کا ۵۰ فی صد حصہ (۱۹۳۷-۳۸ء میں) فوج پر خرچ کرتی ہے۔ اس بڑے خرچ کا مقصد دفاعی افواج کی منہ بھرائی تھی جس کی واحد ذمہ داری برطانوی سلطنت کو تحفظ اور استحکام فراہم کرنا تھا اور جسے ہندوستان کے عوام (۳۵ کروڑ) اور ان کی بہبود کی کوئی فکر نہ تھی۔

نوکر شاہی کا جائزہ

حصول آزادی کے بعد قومی تعمیر نو کے لیے سبھاش کے خیال میں ایک اور بنیادی ضرورت نوکر شاہی کے جائزے کی تھی۔ ان کا نظریہ تھا کہ نوکر شاہی کو قومی تصور پر عمل کرنا چاہیے اور انتظامی ذرائع سے عوام کو فوری راحت اور انصاف فراہم کرنے کا از سر نو عہد کرنا چاہیے تاکہ عوام کو عدالتوں کے دروازوں پر دستک نہ دینی پڑے۔

نیتاجی نے زمینی اور پٹہ داری کے طریقوں میں اصلاح کر کے زرعی پیداوار بڑھانے کی ضرورت جتائی تھی۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے زراعت کی سائنسی اور جدید ترین تکنیک استعمال کرنے پر بھی زور دیا تھا۔ مگر انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ صرف یہی کافی نہ ہوگا۔ ان کا کہنا تھا کہ وقت کا تقاضا یہ ہوگا کہ گھریلو صنعتوں سے لے کر بھاری صنعتوں تک تمام زمروں کی صنعت کاری ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی صنعتی انقلاب کے ان خراب اثرات سے بچنا بھی چاہیے جن سے یوروپی ممالک دوچار تھے۔ اس مقصد کے لیے اہم ترین ضرورت اس بات کی تھی کہ آبادی کو قابو میں رکھا جائے جو تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ غریبی ختم کرنے کا کوئی پروگرام اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب آبادی پر قابو حاصل ہو جائے ورنہ آبادی میں اضافہ ہر ترقی کو چٹ کر جائے گا۔

ہری پورہ (گجرات) میں ۱۹۳۷ء میں نیتاجی سبھاش چندر بوس نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو حوصلہ بخش پیغام دیا تھا اس سے بہتر الفاظ میں قومی حیات نو اور منصوبہ بندی کے میدان میں توانا جذبہ کی عکاسی کرنے کے لیے ہمارے قومی لیڈروں نے کوئی اور بیان نہیں دیا۔ انھوں نے فرمایا تھا، حالاں کہ اس وقت تعمیر نو کا کوئی تفصیلی منصوبہ پیش کرنا قبل از وقت ہو سکتا ہے مگر ہمیں کچھ ایسے اصولوں کو زیر غور لانا چاہیے جن کی روشنی میں مستقبل میں تعمیر نو کا کام ہو سکے۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ غریبی، ناخواندگی اور بیماری کو دور کرنے اور سائنسی پیداوار اور تقسیم سے تعلق رکھنے والے ہمارے خاص قومی مسائل کو سوشلسٹ طرز کے خطوط پر عمل کر کے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ ہماری مستقبل کی قومی حکومت کو سب سے پہلے تعمیر نو کا ایک جامع منصوبہ تیار کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کرنے کا کام کرنا ہوگا۔ اس منصوبے کے دو حصے ہونے چاہئیں ایک فوری پروگرام اور ایک طویل المیعاد پروگرام۔ پہلے حصہ اور اس کے فوری اثرات کا خاکہ تیار کرنے میں تین باتوں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ پہلی یہ کہ ملک کو قربانیاں دینے کے لیے تیار کیا جائے، دوسری یہ کہ ہندوستان کو متحد کیا جائے اور تیسری یہ کہ مقامی اور ثقافتی خود مختاری کی گنجائش پیدا کی جائے۔ دوسرا اور تیسرا مقصد ایک دوسرے کی ضد لگ سکتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بطور عوام ہمارے پاس جو سیاسی ذہانت اور عقلمندی ہے اسے ان دونوں مقاصد میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ ہمیں ملک کو متحد کرنا ہوگا تاکہ ہم کسی بھی غیر ملکی حملہ کے مقابلہ میں ہندوستان کو کھڑا کرنے کے قابل بنا سکیں۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ذریعہ ملک کو متحد رکھتے ہوئے ہمیں تمام اقلیتی فرقوں اور صوبوں کو ثقافتی اور حکومتی امور میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے کر مطمئن کرنا ہوگا۔ غیر ملکی غلامی کا بوجھ اترنے کے بعد عوام کو متحد رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کرنے ہوں گے کیوں کہ غیروں کی حکومت نے ایک حد تک ہمارے حوصلوں کو پست کر دیا ہے اور غیر منظم بنا دیا ہے۔ قومی اتحاد کے فروغ کے لیے ہمیں اپنی عام بول چال کی زبان اور مشترکہ رسم الخط کو فروغ دینا ہوگا۔ مزید یہ کہ طیاروں، ٹیلی فون، ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن کی طرح کے جدید ذرائع کو استعمال کر کے ہمیں ہندوستان کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہوگا اور مشترکہ تعلیمی پالیسی کے ذریعے پوری آبادی میں ہمیں ایک مشترکہ جذبہ بھی پیدا کرنا ہوگا۔"

●

چتنا باسو

نیتا جی اور اقتصادی منصوبہ بندی

سبھاش چندر بوس کی تمام تحریروں اور تقریروں کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایک جامع اور واضح اقتصادی نظریہ تھا بالخصوص اقتصادی منصوبہ بندی کے ذیل میں اس بارے میں ان کا ذہن بہت صاف اور نظر تیز تھی اور انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بلا خوف و خطر کیا۔

ان کی اقتصادی فکر کے بنیادی اصول پہلی بار انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۵ ویں اجلاس منعقدہ ہری پورہ کے صدارتی خطبے میں سامنے آئے۔ اپنے اس تاریخی خطبے میں انھوں نے آزاد ہندوستان میں اقتصادی تعمیر نو کی خاطر لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے خاکہ پیش کیا۔ اپنے افکار پیش کرتے ہوتے انھوں نے اقتصادی امور سے متعلق تمام سرگرمیوں کا احاطہ کیا۔

یہاں بات کو واضح کرنے کے لیے ان کے ہری پورہ خطبے کا ایک طویل اقتباس نقل کرنا مفید ہوگا تا کہ ان کے خیال ٹھیک طرح سے سامنے آسکیں۔ انھوں نے کہا "جہاں تک اقتصادی تعمیر نو کا تعلق ہے ہمارے سامنے سب سے بنیادی مسئلہ غریبی کو ختم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں اپنے اراضی کے نظام میں زبردست تبدیلی لانی ہوگی اور زمینداری ختم کرنی ہوگی۔ زرعی قرضے معاف کرنے ہوں گے اور دیہی عوام کو سستی شرح پر قرض دینا ہوگا۔ کوآپریٹو تحریکوں کو فروغ دینا، مصنوعات بنانے والوں اور صارفین دونوں کے حق میں مفید ہوگا۔ زمینی پیداوار بڑھانے کے لیے زرعی نظام کو سائنسی بنیادوں پر چلانا ہوگا۔"

انھوں نے بجا طور پر دیہی غربت کے بنیادی وجہوں کی نشاندہی کی تھی جو بڑی حد تک آج بھی ہمارا مسئلہ ہے۔

زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ انھوں نے صنعتی ترقی کے لیے اسکیمیں بنانے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ صنعتوں کی تیز رفتار ترقی میں ریاست کا جو رول ہونا چاہیے اس بارے میں ان کے خیالات بالکل واضح ہیں۔ انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا۔ "ریاست کی ملکیت اور اسی کے کنٹرول میں صنعتوں کی ترقی کے لیے ایک جامع اسکیم وضع کرنا ناگزیر ہوگا۔" تاہم آج ریاست کا دخل بہت تیزی سے کم کیا جا رہا ہے اور زیادہ زور پرائیویٹ سیکٹر پر دیا جا رہا ہے۔

سبھاش چندر بوس نے یہ بھی محسوس کیا کہ پرانے کی جگہ اب ایک نیا صنعتی نظام بنانا پڑے گا کیوں کہ پرانا نظام بیرونی ملک بڑے پیمانے پر پیداوار اور ملک میں باہر والوں کی حکمرانی کے نتیجے میں تباہ ہو چکا ہے۔

نیتا جی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ معیشت میں پوری جدید کاری کے حق میں تھے۔ انھوں نے کہا "ہم جدید صنعتی ترقی کو خواہ کتنا ہی ناپسند کریں اور اس کے زیر اثر پنپنے والی خرابیوں کی خواہ جتنی بھی مذمت کریں، ہم اب چاہیں بھی تو پیچھے کی طرف نہیں مڑ سکتے۔" تاہم انھوں نے گھریلو صنعتوں کی اہمیت پر خاطر خواہ زور دیا۔ ان کے خیال میں گھریلو، چھوٹی، درمیانہ اور بڑی صنعتوں کے درمیان باہمی تعلقات سے ٹکراؤ اور تضاد کی صورت نہیں پیدا ہوگی بلکہ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوگا اور سبھی کو پھلنے پھولنے کے بہتر مواقع میسر آئیں گے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ "بہتر ہوگا کہ ہم صنعتی ترقی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لیں اور اس کی خرابیوں کو کم کرنے کے طریقے وضع کریں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان گھریلو صنعتوں کو دوبارہ بحال کرنے کے امکانات دریافت کریں جو بڑے کارخانوں کے سامنے مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہیں۔" ہندوستان جیسے ملک میں گھریلو صنعتوں کے لیے گنجائش رہے گی، خاص طور سے ایسی صنعتوں کے لیے جن کا تعلق زرعی پیداواروں سے ہے مثلاً کپڑوں کی بُنائی۔"

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ جس زمانے میں (۳۹-۱۹۳۸ء) نیتا جی نے یہ خیالات پیش کیے اس زمانے میں گھریلو، درمیانہ اور بڑی صنعتوں کے یکساں پھلنے پھولنے کے بارے میں بہت سے خدشات عام تھے اور اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر مباحثہ چل رہے تھے۔ سبھاش چندر بوس نے ۱۷/دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں کل ہند قومی

منصوبہ بندی کمیٹی کی پہلی میٹنگ کی افتتاحی تقریر میں اس تنازعے کے حوالے سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا "پچھلے کچھ ہفتوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ بعض حلقوں میں اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ہماری صنعتی منصوبہ بندی کی کوششوں سے کھادی اور گھریلو صنعتوں کی تحریک پر اثر پڑے گا، جو ۱۹۲۱ء سے چل رہی ہے۔ ذہن نشین رہے کہ دہلی میں اپنی افتتاحی تقریر میں میں نے واضح کر دیا ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں میں کوئی ٹکراؤ یا تضاد نہیں ہے۔ حقیقت ہے کہ میں نے صنعتوں کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے؛ گھریلو، درمیانہ اور بڑی صنعتیں۔ میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک ایسا منصوبہ بنایا جائے جس میں تینوں کے لیے پھلنے پھولنے کے مواقع ہوں۔ یہی نہیں منصوبہ بندی کمیشن میں ہم نے دیہی صنعتوں کی تنظیم کو نمائندگی دینے کے لیے ایک سیٹ مخصوص کی ہے اور اسی طرح ایک نشست قومی منصوبہ بندی کمیٹی میں بھی مخصوص کی جا سکتی ہے۔ یہ ہمارے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی اگر کوئی یہ کہے یا سمجھے کہ قومی منصوبہ بندی کمیشن کو چلانے والے گھریلو صنعتوں کو بحال کرنے کی تحریک کو توڑنا چاہتے ہیں۔

ہر کوئی جانتا ہے اور جاننا چاہیے کہ یوروپ اور ایشیا کے ترقی یافتہ ملکوں مثلاً جرمنی اور جاپان میں بھی خاصے بڑے پیمانے پر گھریلو صنعتیں ہیں اور وہ ترقی پر ہیں۔ تو پھر ہم اپنے ملک میں اس ذیل میں خدشات میں کیوں مبتلا ہیں؟

صنعتی ترقی کے بارے میں اپنے خیالات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: قومی منصوبہ بندی کمیٹی کو بعض مخصوص مسائل سے نمٹنا ہوگا۔ سب سے پہلے ان صنعتوں کی طرف توجہ دینی ہوگی جن سے دوسری صنعتیں چلتی ہیں۔ مثلاً بجلی کے کارخانے، دھات، بھاری کیمیائی مادے نیز چھوٹی بڑی مشینیں اور ساز و سامان بنانے والی صنعتیں اور ترسیلی صنعتیں مثلاً ریلوے، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور ریڈیو وغیرہ۔"

منصوبہ بند معیشت

سبھاش چندر بوس کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے منصوبہ بند معیشت کا تصور پیش کیا۔ وہ ہندوستان میں اقتصادی منصوبہ بندی کے پیش رو تھے۔ انھوں نے منصوبہ بندی اور اقتصادی ترقی میں ریاست کے دخل کو ناگزیر قرار دیا۔ ہری پورہ کے اپنے خطبے میں اس سلسلے میں انھوں نے کہا: آخر میں ایک اہم بات اور کہنا چاہوں گا۔ منصوبہ بندی کمیشن کے مشوروں کی روشنی میں حکومت کو ایک جامع اسکیم وضع کرنی ہوگی تاکہ ہم اپنے زرعی اور صنعتی نظام کو پیداوار اور لاگت دونوں اعتبار سے دھیرے دھیرے سماج واد کی طرف لا سکیں۔ اس کے لیے مزید سرمایہ حاصل کرنا ہی ہوگا، چاہے وہ اندرونی یا بیرونی قرضے سے ہو یا افراطِ زر کے ذریعے۔

سبھاش چندر بوس نے آزاد ہندوستان کے لیے ایک بہت بڑے پروگرام کا خواب دیکھا تھا۔ آزاد ہندوستان میں منصوبہ کے بارے میں اپنے تصور کا ذکر کرتے ہوئے نومبر ۱۹۴۴ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں نیتا جی نے کہا تھا: "اس کے بعد سب سے اہم مسئلہ غریبی اور بے روزگاری کا ہوگا۔۔۔ آزاد ہندوستان میں تیسرا بڑا مسئلہ ہوگا تعلیم۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم ان تینوں مسائل کو کس طرح حل کریں۔ کیا ہم ان مسائل کو پرائیویٹ ایجنسیوں اور نجی کوششوں پر چھوڑ دیں یا ان کو حل کرنے کی ذمہ داری ریاست کو اٹھانی ہوگی۔"

آبادی کا مسئلہ

آبادی آج ہندوستان کا سب سے شدید مسئلہ ہے۔ نیتا جی نے اب سے ۶۰ سال پہلے ہی اس مسئلے کو محسوس کیا اور اس پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ۱۹۳۸ء کے ہری پورہ صدارتی خطبے میں ہی انھوں نے کہا تھا کہ آبادی پر روک ہماری اقتصادی منصوبہ بندی کا ایک لازمی جزو ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا "آزاد ہندوستان میں جن مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک طویل مدتی پروگرام بنانا ہوگا ان میں سب سے پہلا مسئلہ ہوگا بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا۔ میں اس تھیوریٹیکل بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہندوستان کی آبادی زیادہ ہے یا نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس ملک میں غریبی ہو، بھوک ہو، بیماری ہو وہ ملک ہر دس سال میں اپنی آبادی میں تین کروڑ افراد کے اضافے کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ اگر آبادی اسی تیزی سے بڑھتی رہی جس تیزی سے یہ حالیہ دنوں میں بڑھی ہے تو ہمارے سارے منصوبے دھرے ہو جائیں گے۔ چناں چہ یہ بہتر ہوگا کہ ہم اس وقت تک اپنی آبادی پر روک لگائے رکھیں جب تک ہم سب کو کھانا کپڑا بہم پہنچانے کے قابل نہ ہو جائیں۔"

اقتصادی منصوبہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو ان کی ضروریات کی تمام چیزیں ترجیح وار فراہم کی جائیں۔ اس کے لیے ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے، جس میں تقسیم منصفانہ ڈھنگ سے کی جائے۔ وہ اثاثے جو پیداواری حیثیت رکھتے ہیں انھیں مناسب حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ترقی کے عمل میں عوام کی ہمہ گیر شرکت صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ اس منصفانہ تقسیم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے معاملات صاف اور کھلے رہیں گے اور لوگوں کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس بیدار ہوگا۔ نیتا جی ان امور کے باہمی ربط کی اہمیت سے واقف

تھے۔ ان کے نزدیک اخلاقی ذمہ داری کا احساس ترقیاتی سرگرمیوں کی زنجیر کی ایک بہت اہم کڑی ہے۔ چناں چہ ۱۹۴۴ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں اپنی تقریر میں انھوں نے کہا تھا "ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ سوال اٹھائیں کہ کیا کوئی قوم اعلا اخلاقی سطح تک اٹھ سکتی ہے، کیا کوئی قوم دور اندیش اور بے لوث ہو کر ایک نیا نظام قائم کرنے کی ذمہ داری اُٹھا سکتی ہے۔ مجھے انسانوں کی دنیا پر بہت بھروسہ ہے۔ اگر کوئی ایک فرد بے لوث ہو سکتا ہے، اعلا اخلاقی قدروں کو اپنا سکتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم بھی اپنے آپ کو اخلاقی بلندی تک نہ لے جا سکے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ایسے بھی انقلاب آئے ہیں کہ ایک پوری قوم کے سوچنے کا انداز بدل گیا اور اس نے اعلا اخلاقی بلندیوں کو چھو لیا۔

آزادی کی تحریک میں شامل ہوتے ہی سبھاش چندر بوس نے طلبا اور نوجوانوں کے سامنے اپنی متعدد تقریروں میں سماج واد (سوشلزم) کی وکالت کی۔ اس سلسلے میں ان کا ذہن بہت صاف تھا اور وہ اس پر اصرار کرتے تھے۔

۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے نہایت واضح لفظوں میں سوشلزم کی وکالت کی۔ انھوں نے کہا "مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دنیا کی طرح بھارت کی بھلائی بھی سوشلزم میں ہے۔ ہندوستان کو دوسرے ملکوں سے سیکھنا چاہیے اور ان کے تجربوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ لیکن ہندوستان کو اپنے حالات اور اپنی ضروریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنا طریقہ وضع کرنا چاہیے۔ کسی نظریے کو عمل میں لاتے وقت آپ وہاں کے تاریخی اور جغرافیائی امور سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو ناکامی یقینی ہے ہندوستان کو سوشلزم کا اپنا طریقہ بنانا چاہیے جب ساری دنیا سماج واد لانے کے لیے تجربے کر رہی ہے تو ہمیں کیوں نہیں ایسا کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ہندوستان سوشلزم کی جو صورت اپنائے اس میں کچھ ایسا نیا پن ہو جو ساری دنیا کے لیے مفید ثابت ہو۔"

اپنے سوشلسٹ پروگرام کے بارے میں انھوں نے ہری پورہ کے خطبے میں بتایا تھا۔ انھوں نے کہا "سیاسی آزادی حاصل کر لینے کے بعد ملک کو سماج واد کی طرف لے جانے کے لیے سوشلسٹ پروگرام ضروری ہیں۔"

اپنے مشہور سیاسی مقالے میں جو انھوں نے ماسکو جاتے ہوئے کابل میں قیام کے دوران لکھا تھا، نیتاجی نے صاف لفظوں میں کہا "سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد بائیں بازو کے رجحانات کا مطلب ہوگا سوشلسٹ بنیادوں پر قومی زندگی کی تعمیرِ نو کرنا۔"

ہمیں خوشی ہے کہ نواں پنج سالہ منصوبہ اس وقت شروع ہو رہا ہے جب ملک میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی پیدائش کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ نویں منصوبے پر اس طرح عمل درآمد ہوگا کہ ہندوستانی منصوبہ بندی کے پیش رو کے خوابوں اور مشن کی تکمیل ہوگی۔ ●

بقیہ: جنگلات کی غیر چوبی پیداوار کا بندوبست

ایک مکمل طریقہ کار اپنانا چاہیے۔ عمدہ بیج اور پودوں کے اسٹاک کا انتظام ہونا چاہیے۔ قلم سازی کے تجربات اور غیر ملکی پودوں کی آبیاری کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ نفع بخش تجارت کو فروغ دینے کے لیے مارکیٹ سروے کرنے، مانگ بنائے رکھنے بلکہ مانگ پیدا کرنے پر زور دینا چاہیے۔ پیداوار میں اضافہ کرنے والے جدید اوزاروں کو استعمال کر کے پرکھنا چاہیے۔ چند ماحولیات مخالف سسٹم کو ترک کر دینا چاہیے۔ جنگلاتی بندوبست میں دیہی معاشی خوشحالی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔

جنگلاتی املاک کی مجموعی ملکیت کی پالیسی اپنائی جانی چاہیے جس میں عوام اور ماہرین کو فیصلہ سازی میں دخیل ہونا چاہیے۔ محض پیڑوں کے کاٹنے پر پابندی ہی تحفظ شجر کاری اور بایو ڈائیورسٹی کا حل نہیں ہے۔ ●

بقیہ: اقبال کی حب الوطنی

وہ وطنیت کے جذبے سے سرشار یورپ گئے لیکن وہاں وطنیت کی اور ہی کارفرمائیاں نظر آئیں۔ وہاں لوگوں کو انھوں نے مادہ پرستی۔ دہریت۔ سرمایہ داری اور قومی عناد کی زبردست لعنتوں میں گرفتار پایا۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ مغربی وطنیت کا مطلب صرف اپنے وطن کی آزادی ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی تباہی بھی ہے۔ وطنیت کا مطلب بین اقوامی تنازعات ہے۔ ٹیگور بھی اس قسم کی حب الوطنی کے خلاف تھے اور انھوں نے اپنے چند لکچروں میں ان خیالات کا اظہار صاف طور پر کر دیا تھا۔ اس وقت اقبال نے ایک زبردست پیش گوئی کی کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے دل میں جو جذبہ حب الوطنی کا تھا اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس عظیم مفکر شاعر اور مدبّر نے وفات پائی۔ ایسی شخصیتیں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

●

آزادی کے بعد ہندوستان کی اقتصادی ترقی

کسی ملک کی تاریخ میں ۵۰ سال ا عرصہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود زشتہ ۵ دہوں میں ہمارے ملک نے ایک ڑی چھلانگ لگائی ہے اور ہمارے ملک ی معیشت جو بڑی حد تک دیہی معیشت تی اب ایک صنعتی معیشت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ حالاں کہ یہ معیشت "ایشیا کے ٹیروں" ی معیشت کی سطح ہی سے نہیں بلکہ جنوب شرقی ایشیا کی کچھ ترقی پذیر معیشتوں سے ی پیچھے ہے۔ ہندوستان کو انگریزوں سے رثہ میں ایک کنگال معیشت ملی تھی۔ راعت پر اس معیشت کا اصل دارو مدار تھا۔ ۱۹۴۲-۴۶ء کے دوران قومی آمدنی ں زراعت کا حصہ ۵۷٫۶ فی صد تھا جب کہ طانوی راج کے اواخر میں جدید صنعت حصہ محض ۷٫۵ فی صد تھا۔ چھوٹے پیمانہ منعتوں اور کانوں کا حصہ ۱۲ تا ۱۴ فی صد ا۔ اب جی ڈی پی میں زراعت کا حصہ ٹ کر ۲۸٫۶ فی صد ہو گیا ہے حالاں کہ عتی پیداوار میں چار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ۔ ۱۹۵۰ء میں زرعی پیداوار ۵۰٫۸۲ ملین تھی جو ۱۹۹۶-۹۷ء میں بڑھ کر ۱۹۲ ملین ہو چکی تھی مگر آبادی میں بھی تین گنا فہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آبادی کا تخمینہ ا ملین تھا اور اب ۹۰۰ ملین سے زیادہ ی ہو چکی ہے۔

انگریزوں نے ۲۰۰ سال تک اپنی حکومت کے زمانہ میں زراعت کے فروغ اور صنعتی بنیاد کی فراہمی کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ بلاشبہ انھوں نے بنیادی ڈھانچہ مثلاً ملک بھر میں سڑکیں، باقاعدہ ریلوے سسٹم اور ٹیلی مواصلات فراہم کیا لیکن یہ کام انھوں نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط بنانے کے مقصد سے کیا تھا۔ زراعت کے شعبہ میں بھی انھوں نے صرف ان اشیاء کی کاشت کی ہمت افزائی کی جن کی گھریلو منڈی میں مانگ تھی اور ان اناجوں کی کاشت کی ہمت افزائی نہیں کی جو اس وقت ملک میں موجود غریبی کی تخفیف کر سکتی تھی۔ زرعی پیداوار کی شرح بھی بہت کم تھی اور آج جو پیداوار ہوتی ہے اس کے ایک چوتھائی حصہ کے برابر تھی۔ آزادی سے قبل کی ۳۴۰ ملین آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارتا تھا۔ فی کس قومی آمدنی میں بھی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا، جس سے کہ کسی بھی ملک کی اقتصادی ترقی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

لیکن ۱۹۱۸ء کے بعد جدید صنعت نے بلاشبہ کافی تیزی سے ترقی کی اور آزادی ملنے کے وقت ملک میں خوب ترقی یافتہ سوتی کپڑے، کاغذ، دفتی اور چینی کی صنعتیں موجود تھیں مگر ہندوستان وسیع و عریض صنعتی بنیاد سے محروم تھا۔ ملک کا اپنا بنیادی ضروریات کے لیے بدستور درآمدات پر انحصار تھا چاہے وہ سوئی ہو یا آٹوموبائیل۔ حالاں کہ ملک میں ایک منظم ریلوے سسٹم تھا لیکن وہ بنیادی ڈھانچہ مفقود تھا جس سے آج ہم واقف ہیں۔ سڑکوں کی مجموعی لمبائی، آج کے مقابلہ میں صرف ۲۰ فی صد تھی۔ فولاد، سیمنٹ اور بجلی کی پیداوار بس برائے نام ہی تھی۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں بجلی کی نصب شدہ صلاحیت صرف ۲۳۰۰ میگاواٹ تھی۔ پٹرولیم مصنوعات کی پیداوار محض ۰٫۲ ملین ٹن تھی اور تیار فولاد کی پیداوار ۱٫۰۴ ملین ٹن تھی۔

آزادی کے ۵۰ برس بعد اب محاسبہ کا وقت آگیا ہے۔ حالاں کہ ہم نے زراعت اور صنعت میں کافی ترقی کی ہے مگر بنیادی ڈھانچہ کی فراہمی میں ہم بدستور پیچھے ہیں، جس کی وجہ سے مزید ترقی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی ہو گئی ہے۔ بیرونی محاذ پر بحران کو قابو میں لانے اور سرکاری مالیات کو مضبوط بنیاد فراہم کرنے کے لیے ۱۹۹۱ء میں استحکام پیدا کرنے اور ڈھانچہ میں ردوبدل کی جو پالیسی شروع کی گئی تھی اس کے نتیجہ میں غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرہ میں بلاشبہ اضافہ ہوا ہے لیکن مطلوبہ صنعتی ترقی کے فقدان اور عالمی مانگ گھٹنے کی وجہ سے کچھ عرصہ سے برآمدات میں کمی آرہی ہے جب کہ درآمدات بالخصوص خام تیل کی درآمد میں

اضافہ ہو رہا ہے۔ بہت زیادہ سرکاری اخراجات کی وجہ سے سرکاری مالیات کو بھی صحت مند شکل دینے کی کوششوں میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

اس کے باوجود ۵۰ برسوں کی حصولیابیوں کو کم کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ جدید ہندوستان کی صنعتی معیشت کی بنیادیں جواہر لال نہرو نے رکھی تھیں۔ انھوں نے بطور وزیر اعظم ۱۷ سال تک ملک کی معیشت کی تعمیر میں مدد کی جو بالکل پستی میں پڑی ہوئی تھی۔ ملک کی صنعتی ترقی کو پبلک سیکٹر کی مدد سے تعمیر کیا گیا کیوں کہ پرائیویٹ سیکٹر کے پاس بنیادی پروجیکٹوں جیسے بھاکڑہ ہائیڈرو الیکٹرک پاور پروجیکٹ، بھلائی اسٹیل پلانٹ اس طرح کے دوسرے پروجیکٹوں کی تعمیر کے لیے وسائل نہیں تھے۔ ان پروجیکٹوں کو ایک عظیم دور اندیش نہرو نے جدید ہندوستان کے مندروں سے تعبیر کیا تھا۔ نہرو نے محسوس کر لیا تھا کہ صنعتوں کے بنیادی ڈھانچہ کے بغیر جدید صنعتی معیشت کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ لہٰذا ملی جلی معیشت تیزی کے ساتھ ترقی اور فروغ کے لیے ضروری ہو گئی۔

حالاں کہ ہندوستان نے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کی لیکن منصوبہ بندی یا منصوبہ بند ترقی کا سلسلہ ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا۔ پہلے پانچ سالہ منصوبہ (۱۹۵۱-۵۶ء) میں ۲۰۶۹ کروڑ روپے پبلک سیکٹر کے لیے مختص کیے گئے تھے اور اس میں زراعتی ترقی پر توجہ مرکوز کی گئی تھی ساتھ ہی ۲۷ برس میں فی کس آمدنی کو دوگنا کرنے کے عزم کا بھی اظہار کیا گیا تھا۔ اس منصوبہ میں زراعت پر اس لیے توجہ مرکوز کی گئی تھی تاکہ بعد کی منصوبہ بندی کے مرحلوں میں صنعت کی ترقی کی صلاحیت کو بڑھایا جاسکے۔

دوسرے منصوبہ (۱۹۵۶-۶۱ء) میں پروفیسر پی سی۔ مہالنوبس کی قیادت میں مقرر کی گئی کمیٹی کی تجویز کردہ ایک حکمت عملی طے کی گئی جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا۔ چوں کہ زراعت کی آمدنی میں تخفیف ہوتی رہے گی اس لیے زراعت کے شعبہ میں بے روزگار ہونے والے مزدوروں کو زیادہ مفید طور پر صنعت میں روزگار سے لگایا جاسکے گا۔ اس حکمت عملی کے دو بنیادی نکات میں صنعت کاری اور صنعتی شعبہ میں بھی بھاری مصنوعات کی صنعت پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔

تیسرے منصوبہ (۱۹۶۱-۶۶ء) میں دوسرے منصوبہ کے مقاصد کی پیروی کرتے رہنے کے ساتھ ہی اناج میں خود کفیل ہونے کا مقصد بھی شامل تھا۔ ایک بار پھر زراعت آب پاشی اور بجلی پر زیادہ خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ان کے لیے پبلک سیکٹر کے ۷۵۰۰ کروڑ روپے کی مختص رقم کے ۳۵ فی صد کے مساوی رقم مختص کی گئی۔ اس منصوبہ میں یہ بات دوہرائی گئی تھی کہ بنیادی صنعتوں مثلاً فولاد، ایندھن، بجلی، مشین سازی اور کیمیکلز کی صنعتوں کو اقتصادی فروغ کے بامعنی پروگرام کی بنیاد کا درجہ حاصل ہے۔

حالاں کہ دوسرے اور تیسرے منصوبوں کو مقررہ نشانوں سے کم کامیابی حاصل ہوئی لیکن سریش ڈی تندولکر کے مطابق پہلے تین منصوبوں کے عرصہ کو "متواتر فروغ کے عرصہ" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے ۵ سالہ منصوبوں کے دوران مہالنوبس کی حکمت عملی کو وسعت دینے کے لیے طویل المیعاد ترقی کے عمل میں مناسب کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس کے نتیجہ میں بنیادی ڈھانچہ میں پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاری میں کافی تیزی آگئی (سڑکوں، ریلویز، بڑی اور درمیانہ آب پاشی) اور درمیان کی چیزوں جیسے فولاد، کوئلہ، بجلی اور بھاری بجلی کی مشینوں میں بالواسطہ پیداواری سرمایہ کاری میں بھی اضافہ ہو گیا۔

لیکن گھریلو، دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو روزگار فراہم کرنے کا وسیلہ بنانے اور اشیائے صرف کی فراہمی کی ہمت افزائی کرنے کی کوششوں میں بہت کم کامیابی ملی حالاں کہ یہ بھی حکمت عملی کا حصہ تھیں۔ مجموعی طور پر اس عرصہ میں صنعتی پیداوار میں کافی اچھی یعنی ۸ تا ۱۰ فی صد اضافہ کی مجموعی شرح ریکارڈ کی گئی اور اناج کی پیداوار کی مجموعی اضافہ کی شرح ۳ تا ۳٫۵ فی صد رہی جب کہ فی کس آمدنی میں اضافہ کی شرح ۱٫۷۵ فی صد ریکارڈ کی گئی۔ اضافہ کی یہ تمام شرحیں آزادی سے قبل کے مقابلہ میں کافی تیز رفتار ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کو منصوبہ بندی کی کامیابی قرار دیا گیا۔

۶۹-۱۹۶۶ء کے دوران منصوبہ بندی کے عمل میں رخنہ پیدا ہو گیا اور باقاعدہ منصوبہ بندی کی جگہ کسی حد تک عارضی تین سالانہ منصوبوں (۱۹۶۶-۶۹ء) نے لے لی۔ اس کے بعد زیادہ بڑے نشانوں کے ساتھ منصوبہ بندی پھر شروع کی گئی۔ چوتھے منصوبہ (۱۹۶۹-۷۴ء) میں ترقی کا نشانہ بڑھا کر ۵٫۵ فی صد سالانہ مقرر کر دیا گیا۔ اس منصوبہ کے مقاصد میں قومی آمدنی میں اضافہ، بچت اور سرمایہ کاری کے تناسب میں اضافہ، خود کفالت کا حصول، روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کرنا، آمدنی کی تقسیم میں نابرابری اور اقتصادی طاقت کی مرکزیت کو کم کرنا شامل تھا تاکہ ان تمام اقدامات کے نتیجہ میں سماجی انصاف اور مساوات کا مقصد حاصل ہو سکے۔

پانچویں منصوبہ (۱۹۷۴-۷۹ء) میں پبلک سیکٹر کے لیے مجموعی طور پر ۳۸۸۵۳ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی۔ یہ منصوبہ پانچ سالانہ منصوبوں کا پیوند ثابت ہوا۔ کیوں کہ منصوبہ کو آخری شکل قومی ترقیاتی کونسل کے ذریعہ اس کی منظوری کے تین سال بعد دی گئی تھی اور اس کے آخری دو برسوں میں جنتا حکومت کے ہاتھ میں باگ ڈور تھی جس نے منصوبہ کو حکومت کے وعدوں اور سیاسی یقین دہانیوں کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ اس کے باوجود پانچ سال کے

عرصہ میں قومی آمدنی میں اضافہ کی نشان زدہ شرح اور زراعتی پیداوار دونوں میں اضافہ ہوا۔ مگر صنعتی شعبہ میں آئرن اور کوئلہ، بجلی کی تیاری، تیار فولاد اور مل کے کپڑوں کی پیداوار میں نمایاں طور پر کمی آئی۔

چھٹے ۵ سالہ منصوبہ (۸۵-۱۹۸۰ء) نے جس میں پبلک سیکٹر کے لیے ۹۷،۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی، روکاوٹوں کے باوجود معقول کامیابی حاصل کی۔ ۵٫۲ فی صد فروغ کا نشانہ پار کر لیا گیا خاص طور سے اناج کی پیداوار کے سلسلہ میں کارکردگی متاثر کرنے والی تھی جو ۷۹-۱۹۷۸ء کے ۱۳۲ ملین ٹن سے بڑھ کر ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۵۲٫۴ ملین ٹن ہو گئی تھی۔ مگر صنعتی پیداوار میں کمی آئی جس کے فروغ کا نشانہ ۷ فی صد مقرر کیا گیا تھا اور فروغ صرف ۵٫۵ فی صد ہی ہوا۔

تاہم غریبی دور کرنے کے سلسلہ میں ایک قابل ذکر کامیابی حاصل ہوئی۔ نیشنل سیمپل سروے کے مطابق ۷۸-۱۹۷۷ء میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں کے تناسب کی شرح ۴۸٫۳ فی صد تھی جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں گھٹ کر ۳۶٫۹ فی صد رہ گئی۔ چھٹے منصوبے کے دوران اقتصادی ترقی کی اونچی شرح اور اس کے نتیجہ میں زراعتی پیداوار میں اضافہ کے نتیجہ میں غریبی دور کرنے اور روزگار بڑھانے میں قابل ذکر کامیابی ملی۔ اس کے ساتھ ہی غریبی دور کرنے کے پروگراموں مثلاً مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) قومی دیہی روزگار پروگرام (این آر ای پی) اور دیہات میں روزگار کی گارنٹی کے پروگرام (آر ایل ای جی پی) کے دائرۂ کار کو وسعت دینے سے بھی غریبی کو کم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے نے معیشت کے تمام شعبوں — زراعت، صنعت، سماجی سیکٹروں بالخصوص غریبی دور کرنے کے سلسلہ میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی۔

زراعت کے شعبہ میں ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۸۵-۱۹۸۴ء ترقی کی شرح صرف نام کے لیے ۰٫۵ فی صد تھی۔ ۵۰-۱۹۴۹ء سے ۸۴-۱۹۸۳ء تک — ترقی کی شرح ۱۹۷۰ء کے دہے میں سبز انقلاب کے نتیجہ میں ۲٫۷ فی صد ہو گئی تھی۔ یہ کامیابی تھائی لینڈ، میکسیکو اور ملیشیا کو چھوڑ کر جو یا تو چھوٹے ملک ہیں اور / یا جن کے پاس ایسی زمین کا کافی رقبہ موجود ہے جو زیر کاشت نہیں زراعت کے شعبہ میں ترقی کی شرح کا تین فی صد سے زیادہ ہونا ایک نادر بات ہے ایک عدیم المثال حصولیابی ہے۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں مانسون کی تباہ کن ناکامی سے قبل ہندوستان میں اناج کی پیداوار ۱۹۵۱ء میں ۵۲ ملین ٹن کی پیداوار سے بڑھ کر ۸۹ ملین ٹن ہو گئی تھی۔ ۵۶-۱۹۵۵ء اور ۶۵-۱۹۶۴ء کے درمیانی عرصہ میں تمام اجناس کے زیر کاشت رقبہ میں ۸ فی صد اور پیداوار میں ۳۴٫۸ فی صد اضافہ ہوا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے دہے کے وسط میں اناج میں خود کفالت حاصل کرنے کے لیے زراعت میں تکنالوجی کی تبدیلی کا دور آ گیا تھا۔

اس طرح ۱۹۶۰ء کے دہے کے وسط کے بعد گیہوں اور چاول کے زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کے استعمال کے ساتھ ہی زراعت میں عوامی سرمایہ کاری میں بھی کافی اضافہ ہوا اور نئی تکنالوجی نے کسانوں کے لیے سرمایہ کاری کے منافع کو بڑھا دیا۔ چوں کہ زراعت میں پبلک اور پرائیویٹ سرمایہ کاری کے سلسلہ میں زبردست مقابلہ ہے اس لیے زراعتی اشیاء کی قیمتوں میں سبز انقلاب سے قبل کی مدت کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔

سبز انقلاب کے بعد آبپاشی کی سہولیات کے رقبہ میں زبردست اضافہ ہوا۔ سبز انقلاب سے قبل دس لاکھ ہیکٹیر سالانہ سے بھی کم رقبہ میں آب پاشی کی سہولیات تھیں مگر ۱۹۷۰ء کے دہے میں اس میں اضافہ ہوا اور یہ رقبہ تقریباً ۲۵ لاکھ ہیکٹیر سالانہ تک پہنچ گیا۔ چاول، دال اور تلہن کی طرح کی فصلیں جن کی پیداوار میں اضافہ کی شرح سبز انقلاب کے دنوں میں، سبز انقلاب سے قبل ریکارڈ کی گئی شرح سے بہت نیچے آ گئی تھی، ان کی پیداوار میں اضافہ کی شرح بہت بڑھ گئی۔

صنعت کے شعبے میں ایک وسیع و عریض صنعتی بنیاد ڈالی گئی۔ ساتواں پانچ سالہ منصوبہ شروع کرنے سے پہلے ایک وسیع و عریض بنیادی ڈھانچہ تعمیر کیا گیا۔ بنیادی صنعتوں کا قیام عمل میں آیا، بہت بڑی تعداد میں صنعتی اشیاء خام مال، نیم تیار اور تیار مال — میں خود کفالت حاصل کی گئی۔ صنعتی سرگرمیوں کے لیے مراکز بھی عالم وجود میں آئے اور کارخانہ داروں کی نئی نسل بھی۔ بہت بڑی تعداد میں انجینئروں تکنیشینوں اور مہارت رکھنے والے کارکنوں کو بھی تربیت دی گئی۔

مگر سال بہ سال یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ ۱۹۶۰ء کے بعد تیسرے منصوبے کے آغاز میں صنعتی لائسنسوں کے اجرا کا جو نظام شروع کیا گیا تھا وہ مضر ثابت ہو رہا ہے اور معیشت کے لیے بوجھ بن رہا ہے۔ صنعت کے قیام کے لیے ہی لائسنس لینا ضروری نہ تھا بلکہ صنعتی پیداوار بھی لائسنس کے تابع تھی۔ پیداوار کا انحصار مانگ اور فراہمی پر نہیں تھا بلکہ حکومت کی مرضی پر منحصر تھا۔ ہر صنعتی یونٹ کی پیداواری صلاحیت طے کر دی گئی تھی اور وہ اس صلاحیت سے آگے نہیں جا سکتی تھی — کنٹرولر آف کیپٹل ایشوز کے ذریعہ اسٹاک مارکیٹ کی کارکردگی کو ضابطہ بند کر دیا گیا تھا۔ غیر ملکی زر مبادلہ ریگولیشن ایکٹ (فیرا) ملک کی سرحدوں کے آر پار سرمایہ کی آمد کی نگرانی کرتا تھا اور آج بھی بڑی حد تک نگرانی کر رہا ہے۔ بینکوں کے ذریعہ دیے جانے والے سود کی شرح طے کرنے کا اختیار ریزرو بینک آف انڈیا کو حاصل تھا۔ معاشرہ کے مختلف طبقات کے لیے سود کی شرحیں بھی الگ الگ تھیں۔

ترجیحی سیکٹر" کہے جانے والے شعبہ کو دوسروں کے مقابلہ میں بہت کم شرح سود پر قرض دیا جاتا تھا۔ مالی شعبہ میں اصلاحات کا عمل ابھی تک ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ درآمد اور برآمد کو بھی سخت ضوابط کے حصار میں لے لیا گیا تھا۔ محصول کی شرحیں بہت زیادہ تھیں اور درآمدات پر غیر محصول رکاوٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ یہ محدود اور ممنوعہ فہرستوں کی شکل میں تھیں جن کو دھیرے دھیرے کم کر دیا گیا۔

جہاں تک غریبی دور کرنے کے پروگراموں کے باوجود غریبی کی موجودگی کا تعلق ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی شرح کا اندازہ ۳۶٫۹ فی صد لگایا گیا تھا۔ یہ اندازہ دیہی علاقوں میں ۲۴۰۰ کیلوریز اور شہری علاقوں میں ۲۱۰۰ کیلوریز کے استعمال کی بنیاد پر لگایا گیا تھا۔

ساتویں منصوبہ کے شروع میں یعنی ۸۶-۱۹۸۵ء کے شروع میں پالیسی اور طریقہ عمل میں بہت سی تبدیلیاں لائی گئی تھیں جن کا مقصد پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنا، خرچ گھٹانا اور معیار کو بہتر بنانا تھا۔ صنعتوں پر پیداوار کی صلاحیت کے سلسلہ میں لگائی گئی پابندی رفتہ رفتہ کم کر دی گئی اور "براڈ بینڈنگ" کا طریقہ رائج کیا گیا جس کے تحت پیداوار کرنے والے کو منڈی کی ضرورت کے مطابق پیداوار کرنے کی چھوٹ مل گئی مگر پالیسی میں اہم تبدیلیوں کے لیے ۱۹۹۱ء تک انتظار کرنا پڑا۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبہ کی تین بنیادی ترجیحات خوراک، کام اور پیداواریت تھیں۔ اس منصوبہ میں ۸۵-۱۹۸۴ء کی قیمت پر پبلک سیکٹر کے لیے ۱۸۰۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی اور معیشت کے لیے ۵ فی صد سالانہ فروغ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس منصوبہ میں اناج کی پیداوار بڑھانے، روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے اور پیداواری صلاحیت بڑھانے والے پروگراموں اور پالیسیوں پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اس منصوبہ میں بنیادی ڈھانچہ کو بہتر بنانے پر بھی زور دیا گیا تھا۔ زرعی پیداوار میں ۴ فی صد سالانہ اور صنعتی پیداوار میں ۸٫۷ فی صد سالانہ اضافہ کا نشانہ طے کیا گیا تھا۔ بنیادی ڈھانچہ کے میدان میں کافی بہتری لانے پر بھی توجہ دی گئی تھی۔

اس منصوبہ کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ صنعتی شعبہ میں ترقی کی شرح ساتویں منصوبہ میں مقررہ ۸٫۷ فی صد کے مقابلہ میں ۸٫۵ فی صد رہی۔ کاغذ اور کاغذ کی مصنوعات، کیمیکلز، بنیادی دھات کی مصنوعات، الیکٹریکل مشینری، کیپٹل سامان، درمیانہ درجہ کے سامان اور چند اشیار صرف کی پیداوار میں اونچی شرح سے اضافہ ہوا۔ اس سے ان پالیسی اقدامات کے موثر ہونے کا اندازہ ہوا جن کے ذریعہ صلاحیت کے زیادہ موثر ڈھنگ سے استعمال پر لگی ہوئی پابندیوں کو نرم کر دیا گیا تھا اور نازک شعبوں میں سرمایہ کاری کے لیے زیادہ کشش پیدا کر دی گئی تھی۔ مگر کچھ صنعتوں جیسے ربڑ، جوٹ کے سامان، پلاسٹک، ٹرانسپورٹ آلات، خوراک کی مصنوعات میں اضافہ کی رفتار سست رہی۔ اس منصوبہ کے دوران جی ڈی پی میں ۵٫۸ فی صد کا اضافہ ہوا۔

مگر خلیج کی جنگ کے بعد اور پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں زبردست اضافہ کی وجہ سے ادائیگی کے توازن کی صورت حال قابو سے باہر ہو گئی۔ منصوبہ کے پہلے دو برسوں کے دوران برآمدات میں اضافہ کی شرح بہت خراب یعنی ۴٫۳ رہی۔ اگرچہ ۸۸-۱۹۸۷ء کے بعد برآمدات میں اضافہ کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اس برس یہ اضافہ ۲۵٫۹ فی صد ۸۹-۱۹۸۸ء میں ۲۹٫۱ فی صد اور ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۳۶٫۸ فی صد تھا اور اس طرح چار سال کے عرصہ میں اضافہ کی اوسط شرح ۱۹٫۸ فی صد تک پہنچ گئی تھی مگر درآمدات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ منصوبہ میں درآمدات کی شرح ۸٫۵ فی صد مقرر کی گئی تھی مگر اوسط شرح ۱۵٫۹ فی صد تک پہنچ گئی تھی۔ حالاں کہ زیادہ بڑی درآمدات کا تعلق منصوبہ کے پروجیکٹس سے تھا مگر چھوٹی درآمدات میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ منصوبہ کی میعاد کے اواخر میں ملک کی ادائیگیوں کا توازن اتنا زیادہ خراب ہو گیا کہ جون ۱۹۹۱ء میں صرف ۱۰۰۰ کروڑ روپے کا غیر ملکی محفوظ سرمایہ باقی بچا۔ یہ سرمایہ مشکل سے دو ہفتوں کی درآمدات کے لیے پورا پڑ سکتا تھا۔

ان دشواریوں پر قابو پانے کے لیے ۱۹۹۱ء میں حکومت نے معیشت میں استحکام لانے اور ڈھانچہ میں ردوبدل کرنے کے اقدامات شروع کیے گئے۔ ان اقدامات کا مقصد ادائیگیوں کے توازن کے بحران کو دور کرنا اور حکومت کے وسائل کی صورت حال کو بہتر بنانا تھا۔ معیشت میں وسیع پیمانہ پر اصلاحات کی گئیں جن کا زور اس بات پر تھا کہ معیشت کی ترقی کے لیے مقابلہ جاتی صلاحیت پیدا کی جائے۔ نئی صنعتی پالیسی (این آئی پی) پر ایک بیان پارلیمنٹ میں دیا گیا جس میں اٹھارہ صنعتوں کو چھوڑ کر جن کا تعلق سلامتی اور فوجی امور، سماجی اسباب، مہلک کیمیکلز، ماحول کی آلودگیوں اور اونچے بجٹ کے لوگوں کے ذریعہ استعمال کی جانے والی اشیار سے تھا باقی تمام صنعتوں کے لیے لائسنسنگ کو ختم کر دیا گیا۔ پبلک سیکٹر کے لیے مخصوص صنعتوں کی تعداد گھٹا کر آٹھ کر دی گئی جو کہ سرکار کے خیال میں سلامتی اور فوجی ضروریات کے تحت آتی تھیں۔ دو فہرستوں میں مزید تخفیف کرتے ہوئے مالی شعبہ میں اصلاحات لانے کے لیے بینکوں کو سودی شرح طے کرنے کی آزادی دینے اور "محفوظ قانونی نقدی" اور لکویڈٹی قانونی تناسب کو گھٹا دیا گیا۔ سرمایہ بازار پر کنٹرولر آف کیپٹل ایشوز کے ذریعہ وزارت خزانہ کی گرفت ڈھیلی کر دی گئی جس کے نتیجہ میں سیکورٹی اینڈ ایکسچینج بورڈ آف انڈیا

ا قیام عمل میں آسکا۔

اس ماحول میں آٹھویں منصوبہ پر کام شروع ہوا۔ آٹھویں منصوبہ میں پبلک سیکٹر کے لیے ۴۳۴۱۰۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی اور جی ڈی پی میں ۵٫۶ فی صد اضافہ کا نشانہ طے کیا گیا تھا۔ یہ کم نشانہ وسائل کی کمی کی وجہ سے مقرر کیا گیا تھا حالاں کہ ابتدا میں چھ فی صد نشانہ مقرر کرنے کا خیال تھا۔ آٹھویں منصوبہ میں رواں صدی کے اختتام تک کافی روزگار بلکہ مکمل روزگار کی فراہمی، آبادی میں اضافہ کی رفتار کو کم کرنے، سب کے لیے ابتدائی تعلیم کا انتظام کرنے، پینے کے صاف پانی کی فراہمی اور صحت کی دیکھ بھال کی بنیادی سہولیات کی فراہمی کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس منصوبہ کے تحت زراعت کو ترقی دینے اور کثیر پہلو بنانے، خوراک میں خود کفیل ہونے اور فاضل اناج برآمد کرنے اور بنیادی ڈھانچہ (توانائی، ٹرانسپورٹ، مواصلات اور آب پاشی) کو مضبوط بنانے پر بھی زور دیا گیا تھا۔

آٹھویں منصوبہ کے پہلے چار برسوں کے دوران ہندوستانی معیشت کی کارکردگی بہت زیادہ اطمینان بخش تھی۔ اصلاحات کے نتیجہ میں سرمایہ کو بڑے پیمانہ پر ملک سے باہر لے جانے کا عمل رک گیا اور سرمایہ کی ملک میں آمد کافی بڑھ گئی۔ اس کے نتیجہ میں ادائیگیوں کے توازن میں سدھار آیا اور ہندوستانی معیشت میں بین اقوامی اعتماد بحال ہو گیا۔ ۱۹۹۱-۹۲ء میں معیشت میں ایک فی صد سے کم اضافہ ہوا تھا مگر جلد ہی آٹھویں منصوبے کے پہلے چار برسوں کے دوران اضافہ کی شرح بڑھ کر ۷٫۵ فی صد ہو گئی۔ تازہ ترین اندازہ کے مطابق آٹھویں پانچ سالہ منصوبہ کے دوران اضافہ کی شرح لگ بھگ چھ فی صد ہو گی۔

جی ڈی پی میں اضافہ سے ۱۹۹۵-۹۶ء کے دوران زراعتی شعبہ کی اچھی کارکردگی اور صنعتی شعبہ میں سدھار کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ۱۹۹۵-۹۶ء میں ایک معمولی کمی آنے کے بعد زراعتی پیداوار میں مسلسل ۴ فی صدی اوسط شرح سے اضافہ ہوا۔ صنعتی محاذ پر ۱۹۹۱-۹۲ء کے دوران تمام اہم شعبوں کو کساد بازاری کا سامنا تھا۔ لیکن صنعتی سدھار کا جو عمل ۱۹۹۲-۹۳ء میں شروع کیا گیا تھا وہ ۱۹۹۶-۹۷ء کو چھوڑ کر برابر آگے بڑھتا رہا۔

جہاں تک غریبی دور کرنے کے پروگراموں کا تعلق ہے ۱۹۸۷-۸۸ء سے ۱۹۹۳-۹۴ء تک روزگار میں ۲٫۴۳ فی صد سالانہ کا اضافہ ہوا۔ یہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷-۸۸ء تک کی مدت میں ۱٫۷۷ فی صد کی شرح سے بہت زیادہ ہے۔ ان رجحانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجلی کی صلاحیت میں ۵۳۴٫۶۰ میگاواٹ کا اضافہ ہوا۔ اس میں سے ۱۰۵٫۶۰ میگاواٹ کا اضافہ پرائیویٹ سیکٹر سے تعلق رکھتا ہے۔ سڑکوں، بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کو بھی کافی سدھارنے کی ضرورت ہے، بنیادی ڈھانچہ کے سیکٹر میں کمی کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ حکومت پرائیویٹ سیکٹر کے لیے اس میں کشش پیدا کرنے میں ناکام رہی۔ ایک طرف تو کمزور بنیادی ڈھانچہ کی وجہ سے صنعت کے مزید فروغ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے اور دوسری طرف پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر دونوں دونوں میں صنعتوں کی بیماری عام ہے۔ پبلک سیکٹر کی تشکیل نو میں حکومت اس طرح کامیاب نہیں ہو سکی ہے کہ اس میں لگے ہوئے سرمایہ کی مناسبت سے آمدنی ہوتی۔ پبلک سیکٹر میں بچت کی کمی کی وجہ سے بنیادی ڈھانچہ اور سماجی شعبوں میں سرمایہ کاری کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے جب کہ نجی سیکٹر کے پاس کافی وسائل نہیں ہیں کہ وہ بنیادی ڈھانچہ میں سرمایہ کاری کر سکیں یا وہ اس طرح کی سرمایہ کاری کو مفید نہیں سمجھتے۔ بنیادی ڈھانچہ میں غیر ملکی سرمایہ کاری حسب ضرورت نہیں ہو رہی ہے۔ یہ منظر نامہ یقینی طور پر بدلے گا مگر اس کے لیے حکومت کے ذریعہ بنیادی ڈھانچہ اور صنعتی سیکٹروں میں نئے اقدامات کرنے ہوں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان نے آزادی کے بعد سے اب تک شاندار ترقی کی ہے لیکن اسے ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کے عمل میں روزگار میں اضافہ کے امکانات بڑھ گئے ہیں اور منصوبہ بندی کمیشن کو توقع ہے کہ یہ رجحان نویں پنج سالہ منصوبہ کے دوران بھی جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ آٹھویں منصوبہ کے پہلے چار برسوں کے دوران ۴۰۰۰ ملین سے زیادہ روزگار کے دن جواہر روزگار یوجنا اور ایمپلائمنٹ انشورنس اسکیم کے تحت پیدا کیے گئے۔

آٹھویں منصوبہ کے درمیانہ مدت کے جائزہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی شعبہ اور بعض فزیکل بنیادی ڈھانچوں کے سیکٹر کی مالی کارکردگی میں کمی آئی اور تعلیم، خاندانی بہبود، عورتوں اور بچوں کی ترقی، ہاؤسنگ، واٹر سپلائی، شہری ترقی اور روزگار کے شعبوں میں سرگرمیوں کا انحصار بجٹ میں مقررہ رقم کی فراہمی پر رہا اور چوں کہ بجٹ میں ان شعبوں کے لیے کافی رقم مختص نہیں کی جاسکی تھی اس لیے ان شعبوں کی کارکردگی گھٹی۔

بنیادی ڈھانچہ کے سیکٹر مثلاً بجلی کے شعبہ کی کارکردگی میں سنگین کمی آئی جس کا اثر صنعتی ترقی پر پڑ رہا ہے۔ آٹھویں منصوبہ کے پہلے چار برسوں کے دوران ۱۴۷۹۹ میگاواٹ صلاحیت کا اضافہ ہوا حالاں کہ آٹھویں منصوبہ کے لیے ۳۰۵۵۸ میگاواٹ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اپریل-نومبر ۱۹۹۶-۹۷ء کے دوران سطح تک لے جانے اور غریبی، طلب اور پستی سے آزاد کرانے کے لیے زبردست کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سب کے لیے وسائل چاہئیں۔ ۱۹۹۶-۹۷ء کے اقتصادی سروے میں کہا گیا ہے کہ "مرکز کے مالیے خسارہ کو جلد از جلد جی ڈی پی سے چار فی صد

باقی صفحہ ۳۰ پر

پروفیسر ایل۔آر۔ داس گپتا

۱۲۵ویں سالگرہ پر خراج عقیدت:

سری آروبندو کی یاد

یہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء کو سری آروبندو کا ۱۲۵واں جنم دن، ہندوستان کی آزادی کی ۵۰ ویں سالگرہ کا دن بھی تھا۔ مادر وطن کے لیے خود ان کی عظیم قربانیوں اور ایک غلام اور پست کردہ قوم میں بے مثال ہمت و استقلال پیدا کرنے کی ان کی کاوشوں ہی کے نتیجہ میں بالآخر ہندوستان کی آزادی کا راستہ ہموار ہوا۔

ان کی تعلیم لندن میں ہوئی تھی مگر برطانوی تعلیم نے ان کی ہندوستانی روح کو زائل نہیں کیا تھا۔ انھوں نے آئی۔سی۔ایس میں شامل ہونے کے اپنے حق کو رضاکارانہ طور پر چھوڑ دیا تھا اور مادر وطن کے ایک قابل فخر سپوت کی طرح ہندوستان واپس آکر انھوں نے غیر ملکی غلامی سے مادر وطن کو آزاد کرانے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔

سری آروبندو کے سیاسی نظریات اور سرگرمیوں کے تین پہلو تھے۔ پہلا، مسلح انقلاب کے لیے خفیہ انقلابی سرگرمیوں سے عبارت ہے، دوسرا، پوری قوم کو سوتنترتا سیانی بنانے کے لیے عوامی پروپیگنڈہ سے اور تیسرا، ایک عوامی اور متحدہ مخالفت، عدم تعاون اور جامد مزاحمت سے عبارت ہے۔ ان تینوں کا مقصد مادر وطن کو آزاد کرانا ہی تھا۔

پہلے چند برسوں کے دوران جب وہ بڑودہ اسٹیٹ سروس میں تھے سری آروبندو نے ملک کے حالات کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے ابتدائی تیاری کے کام یعنی فوجی ایکشن کے ضمنی مقصد سے بڑودہ کی فوج کے ایک سپاہی جتن بنرجی کو نوجوانوں کی صف میں شامل ہونے کے لیے بنگال بھیجا۔ پھر ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کا واقعہ ہوا اور سری آروبندو نے سودیشی تحریک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مستقبل کے پر تشدد انقلاب کی عام تبلیغ کی۔ انھوں نے ایک اخبار "یوگانتر" نکالا جس میں چھاپہ مار جنگ کی جانب مائل کرنے والے مضامین چھاپے جاتے تھے۔ انھوں نے کانگریس کی اس وقت کی درخواست اور عرضداشت پیش کرنے اور احتجاج کرنے کی پالیسی کی مذمت کی اور اپنی مدد آپ کرنے اور بے خوفی سے کام لینے کا پیغام دیا۔

سری آروبندو نے تلک سے رابطہ قائم کیا اور سودیشی کے نظریات کی ہمت افزائی کی۔ وہ ہندوستان کی تجارت اور صنعتوں کی ترقی کو انقلابی سرگرمیوں کا لازمی حصہ مانتے تھے۔ اخبار بندے ماترم کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حکومت نے ان پر مقدمہ چلایا۔ نیشنلسٹ پارٹی (قوم پرست جماعت) کے ایک ممتاز قائد کی حیثیت سے ان کا ارادہ انقلابی مقاصد کے لیے کانگریس پر قبضہ کر لینے اور منظم اداروں کی تخلیق، عدم تعاون میں شدت پیدا کرنے، جامد مزاحمت کرنے اور بالآخر پورے ملک میں کھلی بغاوت شروع کرنے کا تھا۔ بڑودہ کی ملازمت سے لمبی چھٹی لینے کے بعد سری آروبندو نے باریسال (بنگال) اور کلکتہ کے کانگریس کے اجلاس میں شرکت اور بپن پال کے ساتھ مشرقی بنگال کا دورہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور بنگال نیشنل کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ سری آروبندو نے مزید آگے قدم بڑھایا۔ وہ پہلے شخص تھے جس نے ہندوستان کو مکمل اور مطلق آزادی کا کھل کر اعلان کیا۔ آروبندو اور تلک دونوں ہی برطانوی مال کے موثر بائیکاٹ کے حق میں تھے۔

سری آروبندو نے قومی تعلیم کو بھی زبردست اہمیت دی۔ پورے بنگال میں قومی اسکول کھولے گئے، عوامی عدالتوں نے بھی کام شروع کر دیا۔ بندے ماترم کے نعرے نے ملک میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔

اب سری آروبندو ایک تسلیم شدہ لیڈر بن گئے تھے اور معتدل مزاج

لیڈروں کی قرارداد کو نامنظور کرانے کے قابل ہو چکے تھے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کر کے کلکتہ کی علی پور جیل میں بند کر دیا۔ سی۔ آر داس قوم پرستوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور کلکتہ کے مشہور قانون داں تھے۔ انھوں نے کسی فیس کے بغیر مہینوں عدالت میں آکر سری آروبندو کا دفاع کیا یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں ان کو رہا کر دیا گیا۔ انھوں نے جیل میں ایک سال گیتا اور اپنشدوں کا مطالعہ کرتے ہوئے گہرے مراقبہ اور یوگا کی مشق میں گزارا۔ روحانی توانائی اور طاقت حاصل کر کے اور الہامی رہنمائی کے ذریعہ زندگی کے بارے میں ان کے نظریات میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی اور ان کی زندگی کا مقصد دنیا بھر میں پھیلی ہوئی پوری نسل انسانی کے مستقبل کی فکر میں غلطاں رہنا بن گیا۔ پہلی بار انھوں نے اتر پارہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے اس روحانی تجربہ پر روشنی ڈالی جو انھیں جیل میں ہوا تھا۔

اچانک الہامی حکم ملنے پر سری آروبندو ۴ اپریل ۱۹۱۰ء کو پانڈیچری پہنچ گئے اور انھوں نے عام سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا بند کر دیا۔ بعد میں انھوں نے اپنے اخبار THE ARYA (آریہ) میں اپنے اس واضح تصور کے بارے میں لکھا کہ برطانیہ آزادی دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ سری آروبندو نے ہندوستان میں اور دنیا بھر میں رونما ہونے والے تمام واقعات پر گہری نظر رکھی اور جب ضروری سمجھا تب صرف روحانی طاقت ہی سے مداخلت کی۔ انھوں نے ہٹلر اور نازیوں کے پیچھے کالی "اسوری" طاقتیں دیکھیں اور کرپس کی پیشکش کی کھل کر حمایت کرتے ہوئے کانگریسیوں پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس پیشکش کو آزادی کی جانب ایک قدم کے طور پر تسلیم کر لیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ۷۵ ویں جنم دن کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیے گئے سری آروبندو کے پیغام کا متعلقہ حصہ مندرجہ ذیل ہے:

"۱۵ اگست آزاد ہندوستان کا جنم دن ہے۔ ایشیا اور پوری دنیا کے لیے اس کی ایک اہمیت ہے کیوں کہ یہ دن نسل انسانی کے مستقبل کو طے کرنے میں ایک نئی طاقت کی حصہ داری کے آغاز کی دلالت کرتا ہے۔ ہندوستان صرف اپنے مفادات کی حفاظت ہی کے لیے نہیں بلکہ ایشور اور دنیا کے مددگار اور پوری نسل انسانی کے لیڈر کے طور پر جینے کے لیے اٹھ رہا ہے۔ ملک کا بٹوارہ ختم ہونا چاہیے۔ تقسیم کو ختم ہونا چاہیے اور وہ ختم ہوگی۔ اگر ہندوستان بٹا ہوا رہا تو اپنی حفاظت کے یقین سے محروم رہے گا۔ اس لیے سب کا فائدہ اسی میں ہے کہ یونین (متحدہ ملک) بنے۔ قدرت کے تقاضے اور ایشور کی مرضی کے خلاف یہ ملک ہمیشہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ نسل انسانی کے اتحاد کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس میں کوئی آفت مخل ہو جائے یا اسے ملیامیٹ کر دے لیکن آخری نتیجہ یقینی ہے۔ ہندوستان کا روحانی تحفہ مغرب میں داخل ہو رہا ہے۔ مرضی الٰہی موجود ہے اور مشکلات پر قابو حاصل کر لیا جائے گا۔"

آروبندو آشرم

سری آروبندو آشرم کی ماں (MOTHER) الفاسا کا جنم ۲۱ فروری ۱۸۷۸ء کو پیرس میں ہوا تھا۔ وہ اپنے گورو کی تلاش میں دنیا کا دورہ کر رہی تھیں۔ پانڈیچری پہنچنے پر انھیں سری آروبندو کی شکل میں اپنا گورو مل گیا اور وہ ۱۹۲۰ء میں پانڈیچری میں مستقل طور پر بس گئیں۔ اس مضمون نگار کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے مدر کے کئی بار درشن کیے ہیں اور گیارہ سال تک قریب سے اس زمانہ میں آشرم کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے جب وہ پانڈیچری میں مرکزی حکومت کے ایک پوسٹ گریجویٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ جے آئی پی ایم ای آر میں کام کرتا تھا۔

جب ۱۹۲۶ء میں سری آروبندو نے گوشہ تنہائی اختیار کر لیا تو ان کے پیروکاروں کی روحانی رہنمائی کی ذمہ داری مدر پر آن پڑی۔ آشرم سری آروبندو یا مدر کے منصوبہ سے زیادہ "سادھکوں" کی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ آشرم میں ۲۰۰۰ افراد کی ایک روحانی برادری تھی اور بہت بڑی تعداد میں آشرم سے وابستہ لوگ پانڈیچری میں رہتے تھے جو آشرم کے ممبر نہ تھے۔ آشرم میں رہنے والے چار سو عمارتوں میں مقیم تھے اور خاص حصہ میں سری آروبندو اور مدر کی "سمادھی" تھی۔ اپنے آشرم کے سلسلہ میں سری آروبندو کا کہنا ہے کہ "یہ ترک دنیا کے لیے وجود میں نہیں لایا گیا تھا بلکہ زندگی کے ارتقاء کے مرکز اور میدان کے طور پر اسے قائم کیا گیا تھا جو بالآخر ایک اعلا تر روحانی شعور کے ذریعہ لے جائی جائے گی اور روح کی ایک عظیم تر زندگی کا حصہ بن جائے گی۔"

آشرم کی زندگی تمام مذاہب کی مشترکہ منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک ضابطہ کی پابند ہے۔ یہ سری آروبندو اور مدر کی رہنمائی میں ایک اندرونی عمل سے عبارت ہے۔ مراقبہ ذہن میں اتنی یکسوئی پیدا کر دیتا ہے کہ دل میں موجود جلوۂ الٰہی سے اس کا ربط قائم ہو جاتا ہے۔ آشرم میں سب کے لیے اجتماعی مراقبہ کا عمل بھی باقاعدگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ آشرم میں رہنے والے ارکان سنیاسی نہیں ہیں۔ بھگتی ضروری ہے جس کے معنی باطن کی کھڑکیوں کے وا ہونے کے ہیں نہ کہ بیرون کو ترک کرنے کے۔ آشرم میں رہنے والا ہر شخص روحانی ریاضت کے طور پر کوئی کام کرتا ہے۔ سری آروبندو آشرم کو جاری رکھنے میں کافی کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام ممبروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مدر کا قول ہے کہ "ایشور کے لیے کام کرنا جسم کی عبادت ہے۔ اہمیت اس کی نہیں

ہے جو آپ کرتے ہیں بلکہ کام کرنے کے طریقے کی ہے۔ ایشور کو ہمیشہ یاد رکھو اور تمہارا کام ایشور کے وجود کا مظہر ہو گا۔"

آشرم اپنے ممبروں کو مقامات، فرنیچر، بجلی، صفائی، کپڑے، صحت کی دیکھ بھال کی سہولیات وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ مشترکہ رسوئی میں۔۔۔ لوگوں کے لیے کھانا تیار کیا جاتا ہے۔ آشرم کے مختلف فارموں اور باغیچوں میں چاول، سبزیوں، پھلوں اور پھولوں کی کاشت ہوتی ہے اور لکڑی کے کام، لوہے کے کام، ہاتھ کے بنے کاغذ اور گھریلو صنعتوں وغیرہ کے کارخانے بھی آشرم میں موجود ہیں۔ آشرم کا انتظام متولیوں کا ایک بورڈ کرتا ہے اور اسے اپنے حامیوں اور پرستاروں سے مدد ملتی ہے۔

ہم یہاں سری آروبندو کی تعلیمی پالیسی کے صرف خدوخال پر غور کریں گے۔ وہ اس قومی تعلیم کو ہندوستانی روح کے مطابق اور اس کی ضرورت و کلچر کے عین مطابق بنانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس تعلیم کا صرف ماضی ہی سے رشتہ نہ ہو بلکہ ملک کی مستقبل کی ضروریات سے بھی تعلق ہو۔ اس تعلیم کا مرکزی تصور انسانی ذہن اور روح کی تعمیر ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کوئی شخص حاصل شدہ علم سے کیا کرتا ہے اور کس طرح استفادہ کرتا ہے۔ ہندوستان اور ایشیا کو یوروپ سے نئے علوم حاصل کرنے چاہئیں اور ان سے مستقبل کی تہذیب کی تخلیق کرنی چاہیے۔

حقیقی تعلیم

سری آروبندو کے مطابق حقیقی اور زندہ تعلیم سے تین چیزوں کا اظہار ضروری ہے۔ یہ ہیں، فرد، قوم اور عالمی انسانیت۔ یہ تعلیم فرد کے اندر جو کچھ ہے اسے باہر نکالتی ہے اور اسے اپنے عوام اور نسل انسانی کے ذہن اور روح میں داخل ہونے میں مدد دیتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں فرد واحد کو باشعور وجود سے تعبیر کیا جاتا ہے عالمی وجود

ذات اور روح کے بارے میں سری آروبندو کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستانی قوم ایک عظیم فرقہ وارانہ روح ایک "سوَ بھاؤ" اور "سوَ دھرم" ہے۔ قومی روح اور "دھرم" کو حقیقی تعلیم ہی کے ذریعہ مقوی اور توانا بنایا جاسکتا ہے اور اسی کے ذریعہ۔۔۔ زندگی، ذہن اور روح کے اختیارات میں اضافہ کیا جاسکتا ہے تاکہ بیداری اور روحانیت کو فروغ دیا جاسکے۔

قومی تعلیم کے سلسلہ میں سری آروبندو کے اس نظریہ کے ذریعہ ہم سری آروبندو سینٹر آف ایجوکیشن، پانڈیچری کا سرسری جائزہ لے سکتے ہیں جس کا افتتاح مدر نے جنوری ۱۹۵۲ء میں، ۵، دسمبر ۱۹۵۰ء کو سری آروبندو کی روح کے جسم خاکی چھوڑنے کے بعد کیا تھا۔ یہاں نرسری سے اونچی سطح تک کی کلاسوں کا بشمول ہیومینٹیز، لسانیات، فائن آرٹس، سائنس، انجینئرنگ، ٹکنالوجی اور پیشہ ورانہ تربیت کی کلاسوں کا انتظام کیا گیا ہے اور جو سہولیات فراہم کی گئی ہیں ان میں لائبریری، لیبارٹری، ورکشاپ، تھیٹر اور اسٹڈیوز شامل ہیں۔

جسمانی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ طلبہ اور آشرم کے ممبر روزانہ ہونے والی ایتھلیٹکس، پیراکی، جمناسٹک، کھیلوں، جنگ جوئی کے کھیلوں اور آسنوں میں پوری طرح آراستہ کھیل کے میدانوں، پیراکی کے تالابوں، جمنازیم، ٹینس کورٹس، جوڈو ہال اور پلے گراؤنڈ میں حصہ لیتے ہیں۔

اپنے مضامین کا خود ہی انتخاب کرنے کے لیے طلبہ کی ہمت افزائی کی جاتی ہے تاکہ وہ خود اپنی شخصیت سازی کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔ ٹیچر کی حیثیت تعلیم دینے والے سے زیادہ ایک مشورہ دینے والے یا گائیڈ کی ہے۔ تعلیم کا مرکز کوئی ڈگری یا ڈپلومہ نہیں دیتا۔ یہ طلبہ میں علم کے شعور کی مسرت اور ترقی، آزادی اور بیرونی مقاصد سے آزاد رہنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سری آروبندو کا پیغام ان کی تعلیمات پر مبنی ہے جو ہندوستان کی قدیم عظمتوں سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کا پیغام یہ ہے کہ "آفاق کے مظاہر کے پیچھے وجود اور شعور کی حقیقت ہے۔" اس شعور کا پہلا پرتو زندگی اور دوسرا پرتو دماغ ہے۔ تخلیق کا دوسرا قدم سپر مائنڈ (عظیم ترین دماغ) کو عالم وجود میں لانے کی طرف اٹھنا چاہیے کیوں کہ اس صورت میں ذات باری کے جلوے جو ہر چیز میں موجود ہیں اپنی تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ سری آروبندو کا کہنا ہے کہ اس کے لیے یوگا کو استعمال کر کے انسانی وجود کے تمام اجزاء کو کھول کر عظیم ترین ذہنی طاقت کے اصولوں سے کام لیتے ہوئے تغیر لایا جاسکتا ہے۔ بیرونی تیاگ ضروری نہیں ہے لیکن خواہش پر قابو پانا، جسم سے وابستگی اور اس پر کنٹرول اور جسم کی ضروریات، لالچ اور جبلتوں کو قبضہ میں کرنا ضروری ہے۔ یوگا اندرون کے فروغ کا ذریعہ ہے جس کے ذریعہ خود کو پہچانا جاسکتا ہے اور اپنے اندر ایک ایسا اعلیٰ شعور پیدا کیا جاسکتا ہے جو انسانی فطرت کو بدل کر "ایشوریہ" بنا دے گی۔ سری آروبندو کے کام اور پیغام دانشمندانہ ہیں اور ان کا تعلق نسل انسانی کے پورے مستقبل سے ہے۔ سری آروبندو کی قربانی، سادھنا، غیر معمولی ذہانت اور وسعت نظر نے صرف ہندوستان ہی میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور غیر ملکی غلامی سے آزاد ہونے میں مدد نہیں دی بلکہ ان طریقوں اور راستوں سے تعارف بھی کرایا جن پر چل کر الوہیت، انسان کے روپ میں زمین پر آسکتی ہے۔

آلودگی سے پاک ایک نئی دریافت:

بحری رَو توانائی

اس سے پہلے کہ میں رَو توانائی" (QCEANIC WAVE ENERG سے متعلق گفتگو
روں مجھے کہہ لینے دیجیے کہ فطرت کا اپنا ایک
ول ہے۔ صحرا و بیاباں، کوہ و دمن، ندی
ے، چشمہ زار و آبشار، ارض وسماں، شمس
قر اور سیارے وغیرہ سبھی کا اہتمام فطرت
ے اسی ضابطے کے مطابق ہو رہا ہے۔ سردی
رمی اور بارش اسی فطرت کے اصول پر مبنی
ر ضابطے کے تحت روبہ عمل ہے۔ ایک طے
دہ لائحہ عمل پر کسی کلی کا نکلنا پھر اس کا
کلنا، کسی درخت کا بارور ہونا اور پھر اس
پکنا، پہاڑوں پر برف کا جمنا اور پھر اس کا
ھلنا، دھوپ چھاؤں، بادل وغیرہ فطرت
ے اصول کا ہی نتیجہ ہے۔ قدرتی ضابطوں کا
ازن جب تک قائم رہتا ہے تب تک سب
ھ اعتدال میں ہوتا ہے ٹھیک ٹھاک
لتا ہے۔ ذرا فطرت کے نظام میں بے اعتدالی
ر بے ضابطگی آئی اور ماحولیات میں غیر
توازن آثار رونما ہونے لگے جس کے نتیجے
ں جنگل، پہاڑ، ندی، زمین اور سیارے
بھی میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ بارش
ی کمی یا زیادتی، سیلاب، زلزلہ وغیرہ غیر
توازن ماحولیات کی ہی علامت ہے۔ مغرب
ی جدیدیت نے انسانی نفسیات پر بھرپور
ر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا نظریہ تجارتی
ہو گیا۔ لوگوں نے بغیر مشقت، آسانی سے اور

نہایت بے دردی کے ساتھ جنگلوں کی کٹائی شروع کر دی، پہاڑوں کو توڑنے پھوڑنے لگے اور زمین کو تلف کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے، فطرت مشتعل ہوئی اور کرۂ ارض پر سیلاب، خشک سالی، زلزلہ وغیرہ جیسے قدرتی آفات کا قہر و غضب شروع ہوا لہٰذا تمام زندگیاں اس کا شکار ہونے لگیں۔ ملک کے صنعتی شہروں میں پانی، ہوا اور صوتی آلودگی کی بہتات کی بنا پر لوگ نہایت مہلک اور نئی نئی بیماریوں کی زد میں آتے جا رہے ہیں۔ شہروں میں بڑھتی ہوئی گاڑیوں کا ازدحام اور گھنی آبادی کی وجہ سے ماحولیات تو اثر انداز ہے ہی صوتی آلودگی بھی بڑھ رہی ہے۔ شور و غوغا اور دھواں کے درمیان کام کرنے والے مزدور ہائی بلڈ پریشر اور بہراپن سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔

ملک کو اگر ماحولیاتی دشواری سے بچانا ہے تو ایک طرف جنگلوں کی تباہی کو روک کر نئے جنگلوں کو وسعت دینی ہوگی اور صنعتی فضلے یا کچرے کو ندیوں میں ڈھکیلنے کے بجائے اسے نیست و نابود کرنے کے وسیلے یا اس سے کارآمد شے میں تبدیل کرنا ہوگا، اسے کھاد وغیرہ میں منتقل کرنے کے اسباب ڈھونڈھنے ہوں گے۔ ہوائی آلودگی سے متعلق بھی زہریلی کیمیا کو ہوا میں چھوڑنے سے پہلے اسے بے اثر کرنے کی تکنیک کو وسعت دینی ہوگی۔ ساتھ ہی ضوابط تحفظ ماحولیات کی خلاف ورزی کرنے والی صنعتوں کے خلاف سخت کارروائی کرنی ہوگی۔ (اب اس سلسلے میں عدلیہ نہایت چوکسی کے ساتھ بیدار ہے) اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاں ایک جانب توانائی کے نئے نئے ذرائع بالخصوص پھر سے استعمال کیے جا سکنے والے ذرائع کی تلاش دنیا میں زور و شور سے چل رہی ہے وہاں ہمارے یہاں توانائی کے ایک ایسے ہی معاملے میں قابل ذکر ترقی ہوئی ہے جس کا ابھی تک کوئی خاص استعمال نہیں ہو پایا تھا۔ یہ ہے بحری رو (QCEANIC WAVE)۔ اس سے بجلی پیدا کرنے کا پلانٹ عنقریب کام کرنے لگے گا۔ مدراس کی تنظیم علم الصنائع ہند (INSTITUTE OF INDIAN TECHNOLOGY) کے ایک بحری انجینئرنگ پارٹی کے ذریعہ تیار کردہ پلانٹ کیرل میں ترلیوندرم کے نزدیک وجھنجم میں سمندر کے اندر قائم کیا جا رہا ہے۔ اس میں ۱۵۰ کلوواٹ تک بجلی تیار کی جا سکتی ہے اور اس تحقیق کے مطابق ملک میں اس کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کی جانب ترقی ہو سکے گی۔

سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق دنیا کے تمام سمندروں میں لہروں سے تقریباً ۳۰ لاکھ میگاواٹ بجلی نکالی جا سکتی ہے اگرچہ یہ مقدار ۲۰۰۰ء تک کی توانائی سے متعلق ضروریات کا ایک ادنیٰ جزو ہے۔ لیکن سمندری لہروں کی اس ضمن میں بہت ہی اہمیت ہے کہ یہ بار بار استعمال ہونے والا

روشعبہ بہار قانون ساز اسمبلی۔ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۱۵

وسیلہ ہے اور اس سے کسی طرح کی آلودگی کا خدشہ نہیں رہتا جو نہایت ہی اہم اور سود مند ہے۔ ہندوستان میں ۱۷۰۰ کلو میٹر لمبے سمندر میں لہروں سے ۴۰۰۰۰ میگاواٹ بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔

یوں تو سمندری لہروں سے بجلی نکالے جانے کی کوشش انیسویں صدی کے اوائل میں ہی شروع ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اس حلقہ میں کوئی تجارتی پروجیکٹ مکمل نہیں ہو پائی ہے۔ سمندری لہریں ایک طرح کی شمسی توانائی ہے جو ہوا کی سمندری سطح سے ٹکرانے کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔ رو توانائی (WAVE ENERGY) کی بناوٹ ہی اس طرح کی ہے جس کے لیے ایسے ہی چھوٹے چھوٹے پلانٹوں کی ضرورت ہے۔ جس طرح کا پلانٹ مدراس کے INSTITUTE OF INDIAN TECHNOLOGY کو وسعت دی گئی ہے۔ WAVE ENERGY کا استعمال کرنے کی سب سے بہتر جگہ بحر عرب اور خلیج بنگال ہے۔ جہاں مانسون کے دوران متواتر چلنے والی تیز ہوائیں رو توانائی پلانٹوں کے لیے ایندھن مہیا کراتی ہیں۔

جہاں تک پلانٹ کی تعمیر اور اس کے قیام کا سوال ہے یقیناً اس میں دو سال کی مدت صرف ہوئی۔ جلد ہی اس پلانٹ کو اصل مقام پر لے جایا جائے گا اور وِجھنجم بندرگاہ کے قریب سمندر میں موجودہ مانع رو (WAVE OBSTRUC TION) کے سامنے ۱۰ میٹر گہرے پانی میں اسے قائم کیا جائے گا۔ اس پروجیکٹ سے متعلق انجینئر تحقیق و تفتیش اور فروغ سے متعلق مطالعہ کے بعد پلانٹ کے نمونے کو وِجھنجم کے لیے منتخب کیا گیا کیوں کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل کے برعکس مغربی ساحل پر لہریں زیادہ فعال انگیز اور تیز رو ہیں۔ آئی۔ آئی۔ ٹی مدراس کے علاوہ کیرل کے محکمہ بندرگاہ انجینئرنگ ترویندرم، مرکز مطالعہ سائنس اراضی اور تین پرائیویٹ کمپنیوں نے اس پروجیکٹ میں تعاون دیا ہے۔ محکمہ بحری فروغ نے اس پروجیکٹ کے لیے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا تعاون دیا ہے۔

یہ پلانٹ ایک بھاتی (BELLOWS) کی طرح کام کرتا ہے اس پلانٹ کے اندر لہروں کی رفتار کی وجہ سے پانی کی سطح اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے جس سے اس کے اوپری در کے توسط سے ہوا اندر آتی ہے اور باہر نکلتی ہے۔ ہوا کے اس آمدورفت سے ایک خاص ٹربائن جو بجلی جنریٹر سے جڑی ہوتی ہے، ایک ہی سمت میں گھومنے لگتی ہے جس سے بجلی کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ وِجھنجم مرکز میں ۲۳ میٹر، ۱۷ میٹر، ۱۴ میٹر ساخت کا کرکریٹ رو توانائی صندوق لگا ہوا ہے۔ اس پلانٹ کے توسط سے ماہ اپریل سے نومبر تک ۷۵ کلو واٹ بجلی اور ماہ دسمبر سے مارچ تک (جب جنوب و مغرب مانسون بے اثر ہوتا ہے) ۲۵ کلو واٹ بجلی تیار ہوگی۔ مانسون کے دوران یعنی ماہ جون تا ستمبر اس اصول سے ۱۲۰ کلو واٹ بجلی ملنے کی امید ہے۔ پلانٹ تیار کرنے والی جماعت کے رہنما (آئی۔ آئی۔ ٹی۔ مدراس) پروفیسر رویندرن کے مطابق دو لاثمان آبی ستون کے ذریعہ ٹربائن میں ۲۰ میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ہوا چھوڑی جائے گی اگرچہ ہوا کی رفتار دو طرفہ ہوگی لیکن ٹربائن ایک ہی سمت گھومے گا۔

مرکز مطالعہ سائنس اراضی کے محکمہ بحری سائنس کے صدر ڈاکٹر باوا کے مطابق لہروں سے توانائی حاصل کرنا براہ راست ہوا سے توانائی حاصل کرنے کے برعکس زیادہ منافع بخش ہے۔ کیوں کہ ہوا اور سمندری سطح کے ٹکراؤ کی وجہ سے توانائی لہروں میں مرکوز ہو جاتی ہے۔ بادی توانائی (AIR ENERGY) تو کسی خاص جگہ کے بادی اصول پر ہی منحصر کرتی ہے لیکن رو توانائی (WAVF FNERGY) کو سمندر میں پھیلے مختلف حلقے کو اثر انداز کرتے ہیں۔

بحری رو توانائی (QCEANIC WAVF ENFRGY) کو تجارتی سطح کا پلانٹ بنانے سے قبل ہندوستان کے سمندر کے ساحلی علاقے میں توانائی کی صلاحیت کا اندازہ لگانے کے لیے وسیع مطالعہ اور تخمینہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے لہروں پر تیرتے رہنے والے پلانٹ QCEANIC VESSELS شماریاتی سمندری لہروں سے گزشتہ و آئندہ اندازے کے مطابق سال بھر لہروں کی رفتار وغیرہ کی نگرانی کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں آئی۔ آئی۔ ٹی، مدراس اور قومی بحری سائنسی تنظیم، بمبئی نے کچھ کام شروع کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی ساحل پر لہروں کی اونچائی اور لہروں کی مدت بالترتیب ۱٫۱ سے ۴٫۰ میٹر اور ۵٫۵ سے ۸٫۴ سیکنڈ رہتی ہے۔ اسی طرح مغربی ساحل پر یہ آنکڑے بالترتیب ۱٫۰ سے ۲٫۶ میٹر اور ۵ سے ۷ سیکنڈ کے ہیں۔ مغربی ساحل پر WAVE ENERGY کی صلاحیت جنوب و مغرب مانسون کے دوران ۵ سے ۴۷ کلو واٹ (میٹر) اور غیر مانسون دنوں میں ۵ سے ۹ کلو واٹ (میٹر) رہتی ہے۔ مشرقی ساحل پر یہ قبل کے حالت میں ۱۳ سے ۴۳ کلو واٹ (میٹر) اور دیگر حالت میں ۷ سے ۱۷ کلو واٹ (میٹر) ہوتی ہے۔

برطانیہ، امریکہ، ناروے، جاپان، سوئیڈن، جرمنی، فرانس، فنلینڈ اور آئرلینڈ میں بھی رو توانائی سے متعلق تحقیق کی جا رہی ہے۔ لیکن ابھی تک جاپان کو ہی رو توانائی کے پلانٹ کے استعمال کرنے میں کامیابی ملی ہے جسے ہم ایک بڑے پیمانے کی یونٹ کہہ سکتے ہیں۔ کائی مائی پلانٹ کے نام سے پہچانے جانے والے اس پلانٹ کی مقررہ صلاحیت ایک میگاواٹ کی ہے۔ جاپان میں سمندر میں نصب کیے گئے اس پلانٹ سے بجلی کی پیداوار کے ساتھ ساتھ پانی سے یورینیم بھی نکالا جاتا ہے۔ اس آلہ کی تعمیر پر صرف ۷ لاکھ امریکن ڈالر کا صرفہ آیا ہے لیکن اس کو روبہ عمل ہونے سے قبل بحری جائزہ و تحقیق پر تقریباً ۴۰ لاکھ ڈالر صرف ہوئے تھے۔

بحری رو توانائی پلانٹوں (QCFANIC WAVE ENERGY PLANTS) کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے لیے ایندھن

باقی صفحہ ۲۳ پر

حکومت کا جرأت مندانہ اقدام،

پرسار بھارتی، عوام کی آواز، عوام کو واپس

صحافت کو جمہوریت میں چوتھے ستون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ کسی بھی صحت مند جمہوری نظام کو قائم رکھنے کے لیے صحافتی آزادی نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ملک کا دنیا کے جمہوری ممالک میں ممتاز مقام نہ صرف اس لیے ہے کہ یہ سب بڑا جمہوری ملک ہے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ یہاں صحافت کو آزادانہ فضا میں پنپنے کا بھرپور موقع مل رہا ہے۔

صحافت پہلے صرف اخبارات تک محدود تھی اور پریس کا مطلب تھا صرف اور صرف اخباری کالم نگاری یا نامہ نگاری مگر بعد میں ریڈیو کی صحافت وجود میں آئی اور سرعت کے ساتھ خبریں پہنچانے کی صفت کے سبب ساری دنیا میں آن واحد میں چھاگئی۔ پھر مختلف ممالک کی عالمی نشریات بھی شروع ہوگئیں اور ریڈیو کو سرکاری پروپیگنڈہ کی مشینری کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران تو جرمن اور اتحادی افواج کی خونریز لڑائی کے ساتھ ریڈیو سے زبانی لڑائی بھی اپنے عروج پر تھی جس میں ایک دوسرے پر الزامات اور جوابی الزامات، فتوحات و شکستوں کے دعووں کا ایک سیل امڈ پڑا تھا۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد جب دنیا نے انسانی مسائل کی طرف توجہ دینی شروع کی تو ریڈیو نے نہ صرف تفریح و دلچسپی کے نئے دروازے کھولے بلکہ اطلاعات، افکارات اور خبر نگاری کے ایک نئے فن سے بھی دنیا کو درست طور پر آشنا کیا۔

ہمارے ملک میں ریڈیو کا قیام ویسے تو ۱۹۳۶ء میں انگریزوں کے زمانے میں ہی ہوا تو مگر اس وقت آل انڈیا ریڈیو انگریزوں کے "ماؤتھ پیس" کے علاوہ کوئی رول ادا ہی نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ انگریزوں کے زیر انتظام ہی چل رہا تھا۔

آل انڈیا ریڈیو کا اصل چہرہ آزادیٔ ہند کے بعد نکھر کر سامنے آیا جب کہ وہ ناوابستہ ممالک کے صف اول کے رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی پالیسی کے سبب ناوابستگی کے ساتھ اپنے خبرنامہ اور دوسرے پروگرام نشر کرنے لگا۔ اس کے دروازے ہندوستان کے عام آدمی کے لیے بھی کھل گئے اور ملک کی پارلیمنٹ کی طرح آکاش وانی پر بھی سب ہی سیاسی پارٹیوں کو اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی آزادی مل گئی۔

۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء میں ہندوستان نے تجرباتی نشریات کے ساتھ ٹیلی ویژن کی دنیا میں قدم رکھا پھر ۷۰ کی دہائی میں سری نگر، امرتسر، ممبئی، کلکتہ، لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں ٹیلی ویژن سینٹر قائم ہوگئے۔ ۱۹۸۲ء میں ۱۵ اگست کو لال قلعہ کی تاریخی فصیل سے آنجہانی اندرا گاندھی کی تقریر کے براہ راست نشریہ سے ہندوستان نے رنگین نشریات کی دنیا میں قدم رکھا اور پھر دوردرشن نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ خاص طور پر ۱۹۸۴ء کے انتخابات میں الیکشن پر جو آزادانہ تبصرے اور براہ راست نتائج نشر ہوئے ان سے تمام ملک کے عوام دم بخود اور مسرور تھے۔

ویسے تو آکاش وانی اور دوردرشن دونوں ہی کی گائڈ لائنز میں غیر جانب داری، سیاسی اعتدال پسندی اور قومی مفادات کو دھیان میں رکھنے کی بات واضح انداز میں موجود ہے لیکن حکومت کے زیر انتظام ہونے کے سبب اکثر و بیشتر ان دونوں اداروں کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگ جاتے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں وشوناتھ پرتاپ سرکار نے ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا کہ آکاش وانی اور دوردرشن کو ایک کارپوریشن میں تبدیل کرکے دونوں اداروں کو خاطر خواہ آزادی دے دی جائے۔ "پرسار بھارتی" قانون کا یہ بل پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے پاس ہونے کے باوجود سرد خانے میں پڑا رہا۔

اس درمیان ملک میں کیبل نیٹ ورکس کا جال پھیلنے لگا۔ ۲ اگست ۱۹۹۰ء میں جب عراق نے کویت پر حملہ کیا اور اس کے کچھ ماہ بعد مغربی ممالک کی فوجوں نے کویت کو آزاد کروانے کی مہم شروع کی تو اس وقت امریکہ کی مشہور خبر رساں ٹیلی ویژن

۵۰۳۔ ٹیگور روڈ ہوسٹل جنشور روڈ، نئی دہلی۔ ۲

ایجنسی کیبل نیوز نیٹ ورکس (سی۔این۔این) نے تعداد پر بمباری کے جو براہ راست بلیٹن نشر کیے اس کو ڈش اینٹینا کی مدد سے بڑے بڑے ہوٹل اور کلب اپنے گاہکوں اور ممبروں کو دہلی، ممبئی، کلکتہ اور چنئی جیسے بڑے شہروں سے دکھاتے رہے۔

اس کے بعد سے تو ہمارے ملک میں ڈش اینٹینا کا جال سا بچھ گیا اور اس کے دو سال بعد ہی ایک پرائیویٹ نشریاتی کمپنی نے ہندوستان میں پروگرام ریکارڈ کر کے سنگاپور سے سیٹلائٹ کے ذریعہ نشر کرنا شروع کر دیا۔

پھر تو جیسے چینلوں کی بھرمار ہو گئی اور اب ہمارے ملک میں ایک اندازہ کے مطابق ملکی و غیر ملکی چینلز کی تعداد پچاس کے ہندسے کو پار کر چکی ہے اور کئی ملکی نٹ ورکس خبرنامہ بھی نشر کر رہے ہیں ایسے عالم میں دوردرشن کو اپنی ساکھ بنائے رکھنے کے لیے سخت جدوجہد کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور آکاش وانی بھی اپنے سامعین کی ایک بڑی تعداد سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۹۷ء کو حکومت ہند نے پارلیمنٹ سے پاس شدہ قانون کو لاگو کرنے کے احکامات جاری کر دیے اور دونوں اداروں کو خاطر خواہ خود مختاری بھی دے دی۔ آزاد ہندوستان کے آزاد شہریوں کو ۔۔۔۔۔۔ حکومت نے "پرسار بھارتی" کی شکل میں جو تحفہ دیا ہے اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگانا ابھی تھوڑا سا مشکل ہے کیوں کہ دونوں اداروں کی نشریات یا ان کے کام کاج میں کوئی خاص فرق فی الحال نظر نہیں آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حکومت چاہتی تھی کہ پہلے سانچے میں سے مجسم باہر آ جائے اس کے خدوخال کو تو بعد میں بھی نکھارا جا سکتا ہے۔

ہمیں توقع کرنا چاہیے کہ آنے والے وقت میں آکاش وانی اور دوردرشن نہ صرف عوام کو بہتر اور صحت مند تفریحی پروگرام دیں گے بلکہ بے لاگ اور غیر جانب دارانہ انداز میں اپنے خبرنامہ نشر کر کے اپنی ویسی ہی ساکھ قائم کریں گے جیسی کہ چناؤ کمیشن یا سپریم کورٹ کے بارے میں عوام کے دلوں میں قائم ہے۔

نہ صرف موجودہ وزیر اطلاعات و نشریات اپنے اس جرأت مندانہ اقدام کے لیے قابل مبارک باد ہیں بلکہ خود وزیر اعظم شری اندر کمار گجرال (جن کی ذاتی دلچسپی بھی اس قانون کے لاگو ہونے میں عجلت کا باعث بنی) بھی قابل مبارک باد اور ستائش ہیں کہ انھوں نے عوام کی آواز کو عوام کے حوالے کرنے کا ایک بہت بڑا جمہوری عمل خوابوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی منزل میں پہنچا دیا۔ ●

بقیہ: لڑکیوں کی تعلیم اور صحت

رہنے کے لیے دوپہر کا کھانا (۱۵ لاکھ اسکولوں میں) مفت وردی (۲۵ لاکھ اسکولوں میں) اور مفت نصابی کتابوں (۳۱۵ لاکھ اسکولوں میں) کا بندوبست کیا گیا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر لڑکیوں کو اپنے ساتھ اپنے چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کو اسکول میں لانے کی اجازت دی جائے اور ان دونوں کو مفت کھانا فراہم کیا جائے تو ان کی حاضری کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر ان کی صحت کا انتظام بھی ہو تو لڑکیوں کی تعلیم میں نہایت کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

اختتام

بھارت ایک ترقی پذیر ملک ہے اس لیے اس کے ذرائع بھی محدود ہیں ہماری نسوانی خواندگی میں اضافہ دس فی صد فی دہائی ہے۔ مقصد کی حصولیابی ۲۰۰۰ء تک حاصل کر سکتے ہیں۔

لڑکیوں کے سلسلے میں خاندان، سماج و حکومت کو ایک ساتھ کوشش کرنی ہوگی لڑکیوں کے تئیں لاپروائی برتنے و ایسے رویے کو ختم کر کے اس کو سماج و خاندان کا ایک اہم اکائی ماننا ہوگا۔ جو کہ حقیقت میں وہ ہے بھی۔ ایک لڑکے کو پڑھانے سے صرف ایک لڑکا پڑھ پاتا ہے جب کہ ایک لڑکی کو تعلیم دینے سے نہ صرف ایک خاندان تعلیم یافتہ ہوتا ہے بلکہ ملک بھی تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ لڑکی خوشحال خاندان کی بنیاد تصور کی جاتی ہے۔ عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا مردوں و عورتوں دونوں کے لیے مستقبل کی ضمانت ہے۔ تعلیم یافتہ عورتوں کے بچے اوروں کے مقابلے تعداد میں کم، صحت میں بہتر اور تعلیم میں آگے ہوتے ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کرنے کے لیے اسکولوں کے اوقات، لڑکیوں کی سہولت کے مطابق رکھے جائیں۔ علاوہ ازیں ان کی مالی امداد و صحت پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔ ●

بقیہ: بڑھتے قدم

کے شروع میں ہندوستان کے بحری جہازوں کی صلاحیت ۱۸۶ء ملین جی آر ٹی تھی اور مجموعی غیر ملکی تجارت تقریباً ۴۸ر۲۴ ملین ٹن ہو گئی تھی۔ ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں کے ذریعہ ڈھویا گیا مال صرف ۲۱ر۲ ملین ٹن یعنی مجموعی تجارت کا صرف ۹ فی صد تھا۔ اس طرح غیر ملکی جہاز راں کمپنیوں کے حصہ میں سمندر کے راستے ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کا کافی بڑا حصہ چلا گیا تھا گزشتہ چند دہوں میں ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں کا حصہ ۳۰ تا ۳۵ فی صد کے درمیان گھٹتا اور بڑھتا رہا ہے حالاں کہ غیر ملکی تجارت میں برابر اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر ڈی۔ کے پانڈے، الپنا کاک اور کسم پانڈے

جنگلات کی غیر چوبی پیداوار کا بندوبست

غیر چوب عمارتی جنگلاتی پیداواریں (NTFP) (NON-TIMBER FOREST PRODUCTS) اور غیر چوبی جنگلاتی پیداواریں (NON-WOOD FOREST PRPDUCTION) (NWFP) ایسی اصطلاحات ہیں جن کا آج کل کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل ایسی پیداواروں کو جنگلات کی فروعی پیداوار کہا جاتا تھا۔ آج NTFP کی اصطلاح وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے جس سے مراد ایندھن، چارہ، بالیوماس، بانس، بید، گھاس، ریشے، تیل تینن اور خضاب، گوند، دال، طبی جڑی بوٹیاں، چھالیں، پھول پتیاں، پھل، بھلے کوکر منتے، بیج، دودھ پلانے والے جانور، چڑیاں، حشرات الارض، مچھلیاں اور کیڑے مکوڑے وغیرہ وغیرہ ہیں۔ فروعی پیداوار کی اصطلاح سے ہی یہ بات ظاہر ہے کہ ان پیداواروں کو اس قدر اقتصادی اہمیت کا حامل نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ان پر سنجیدگی سے توجہ دی جاتی۔ لیکن حالیہ اعداد و شمار نے اس مفروضے کی یکسر نفی کر دی ہے۔ محکمۂ جنگلات کی آمدنی کا ۲/۵ حصہ اور جنگلاتی پیداواروں کے ایکسپورٹ سے حاصل شدہ آمدنی کا ۳/۴ حصہ NTFPs سے حاصل ہوا ہے۔ NTFPs کی ۷۰ فی صد پیداوار پانچ ریاستوں مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، بہار، اڑیسہ اور آندھرا پردیش سے حاصل ہوئی ہے۔ (عالمی بینک ۱۹۹۱ء)

ہندوستان کی ۶۰ فی صد قبائلی آبادی انھیں ریاستوں میں ہے۔

یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ NTFP کو جمع کرنے کے ذریعے روزگار کے مواقع میں ۱۸/۰ ملین سے ۳/۲ ملین افراد/سال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ جنگلات سے متعلق کاروبار میں عورتوں کو ملازمت کے کم و بیش ۸۵/۱/۵۷ عورت دن میں سے ۹۰ فی صد NTFP کو خام مال کی طرح استعمال میں لانے والے چھوٹے پیمانے کے کاروباروں سے وابستہ ہیں۔ واضح ہو کہ NTFPs سے متعلق یہ اعداد و شمار ان جنگلات سے لیے گئے ہیں جو پہلے ہی سے خستہ حالت میں ہیں۔ JFM. کے ذریعہ جنگلات کے حفاظتی اقدامات کی اصلاح کے بعد چند چیزوں مثلاً بیڑی پتے وغیرہ کے علاوہ دوسری بہت سی چیزوں کی پیداوار میں قابلِ ذکر اضافہ ہوگا اور اس سے مجموعی آمدنی عمارتی لکڑیوں کی آمدنی سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس کے نتیجے میں روزگار کے مواقع اور ایکسپورٹ سے حاصل شدہ آمدنی دونوں ہی میں اضافہ ہوگا۔ اس کے باوجود قومی اور ریاستی سطح پر NTFP پر معقول توجہ نہیں دی گئی ہے۔ NTFPs کی پائیدار حصولی، پروسیسنگ اور مارکٹنگ سے معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ درحقیقت روزگار اور آمدنی دونوں کے لحاظ سے NTFP لکڑی کے مقابلے میں زیادہ فائدہ بخش ہے۔

ہندوستان طرح طرح کے مال و اسباب سے زرخیز ایسا ملک ہے جو افریقی۔ ایشیائی اور بلاد شرقی کی حیاتیاتی اور جغرافیائی حدود کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ اپنے وسیع و عریض ماحولیاتی علاقے اور مختلف النوع حیاتیاتی خلقت کے سبب اس کا شمار دنیا کے ۱۲ کثیر النوع ممالک میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں NTFPs دینے والے ۳۰۰۰ پیڑ پودے ہیں لیکن ان میں سے صرف ۱۲۶ سے مارکٹنگ کے فوائد حاصل ہیں۔ ای۔ او۔ ولسن کے مطابق پوری دنیا میں جانداروں اور پودوں کی ۱۰ کروڑ سے زیادہ قسمیں موجود ہیں۔ اروِن کے مطابق منطقۂ حارہ کے جنگلوں میں ہی ۳ کروڑ قسمیں موجود ہیں۔ اندازہ ہے کہ زمین پر موجود جانداروں اور پیڑ پودوں کی ۱۷ لاکھ نامعلوم قسمیں کل اقسام کی محض ۵ فی صد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۳/۶ بلین سال قبل زندگی وجود میں آئی تھی۔ اسی وقت سے ارتقائے حیات کے مرحلوں میں معدومیِ نوع و قسم بھی ہم رکاب رہی ہے۔ اس معدومی میں انسان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مزید برآں MFP قدر کی حامل قسمیں معدومی کی زیادہ شکار ہوئی ہیں۔

NWFPs کے امکانات اتنے وسیع اور ثمر آور ہیں کہ اگر ان کا بندوبست صحیح طور پر کیا جائے تو ان سے ہونے والی بازیافت نہ صرف پیڑوں کی کٹائی پر پابندی سے ہونے والے مالی نقصانات کی بھرپائی

کر دے گی بلکہ دیہی عوام کی غریبی کے ازالہ میں ایک اہم رول ادا کرے گی۔ سرکاری جنگلوں سے حاصل شدہ NWFPs کی فروخت سے ملنے والی سرکاری رایلٹی سال ۸۶-۱۹۸۵ میں سو کروڑ سے زائد تھی جو بعد کے سالوں میں اور بڑھ گئی۔ جنگلات کی پیداوار کے ایکسپورٹ کی مجموعی یافت کا ۷۰ فی صد NWFPs کے ایکسپورٹ سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح جنگلات کے سیکٹر سے پیدا شدہ ۲۳۰ ملین آدمی/سال کے مجموعی روزگار میں ۱۶۱ ملین آدمی/سال کا روزگار NWFP کے جمع کرنے، پروسیسنگ اور فروخت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت ۲۵۱ ملین ٹن NWFPs کی پیداوار میں سے صرف ۱۰۳۲ ملین ٹن ہی جمع کیا جا رہا ہے۔ اگر تمام NWFPs کا مناسب بندوبست کر دیا جائے تو اس سیکٹر میں موجودہ روزگار کے مواقع ۱۶۱ ملین آدمی/سال سے بڑھ کر ۴ ملین آدمی/سال ہو جائیں گے۔ اس سے نہ صرف جنگلات کے قرب و جوار میں بسنے والے غریب افراد کی معاشی صورت حال بہتر ہوگی بلکہ ریاست کی آمدنی اور ایکسپورٹ میں بھی اضافہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ترقی و خوشحالی کے لیے NWFPs کے بندوبست پر توجہ لازمی بن گئی ہے۔

ماحولیاتی اور ایکالوجی تحفظ کے لیے قاعدے، ضابطے اور پابندیاں بنیادی ضرورتیں ہیں۔ لیکن سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ افراد اور ان کی روزافزوں آبادی کی سماجی اور معاشی مجبوریاں جنگلوں کے ماحولیاتی نظام کے بے قاعدہ و بے ضابطہ استعمال پر منتج ہوتی ہیں۔ ان دونوں کے لیے وہ وسائل بھی درکار ہیں جو نباتات و جمادات کے تنوع کو برقرار رکھیں۔ ان کے برعکس تجارتی اور صنعتی اقتصادیات کی توجہ صرف چند سودمند اور نفع بخش اقسام کی زیادہ سے زیادہ اور مخصوص سائز کی پیداوار پر ہوتی ہے۔

جنگلاتی بندوبست میں ان صورتوں کا خیال متوازن انداز میں رکھنا ہوگا۔ کم از کم پیڑوں کے اقسام کے سلسلہ میں ایسا تعصب تجارتی اور صنعتی تناظر میں ضرور موجود ہے۔ لیکن NTFPs کا تجارتی اور صنعتی نقطۂ نگاہ سے مناسب بندوبست نہیں کیا گیا۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جنگلوں کے لیے عمومی طور پر اور NTFPs کے لیے خصوصی طور پر مناسب بندوبست کیا جائے۔ NTFPs کو جنگلوں کے ماحولیاتی نظام کو نقصان پہنچائے بغیر جمع کیا جا سکتا ہے۔ قبائل، جنگلات اور ایکالوجی تینوں کو مینجمنٹ کے زاویہ نگاہ میں ایک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس تبدیلی کو NTFP کو صفِ اول میں لانا ہوگا۔ اس جانب پہلا قدم جنگلات کے ماحولیاتی نظام اور ارد گرد کے باشندگان سے تعلقات استوار کرنا ہے۔ مداخلت کے گوناگوں طریقوں کو ممکنہ حد تک ختم کرنا ہوگا۔ NTFPs کی بابت کیا، کہاں اور کتنے کا اندازہ لگانا ہوگا۔ NTFPs کی قومی، علاقائی اور مقامی فہرست تیار کرنی ہوگی اور پھر درج فہرست پیداواروں کی ماحولیاتی، سماجی نیز معاشی، ذخیرہ اندوزی، اسٹوریج، پروسیسنگ، اصلاح اور مارکیٹنگ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ NTFPs کے لیے علاحدہ لائحہ عمل تیار ہونا چاہیے اور ان کے اسٹاک میپ بنائے جانے چاہئیں۔ فضائی تصویروں اور سٹیلائٹ شبیہوں میں پیڑوں کی چھتناوروں کے نیچے کی سطح کی وضاحت کی جانی چاہیے۔ ملک کا NTFP اٹلس تیار کیا جانا چاہیے۔

مختلف النوع اقسام کے عمودی اور افقی دونوں ہی مینجمنٹ کا نظم کرنا چاہیے۔ NTFPs کو حاصل کرنے کے لیے چھتناور کو برتنے اور استعمال کرنے کا نظم ہونا چاہیے۔ چارے کو بھی NTFP کی حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے۔ کسی خاص NTFP کے زرخیز علاقوں کی نشاندہی ہونی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ نقشے بھی تیار کروائے جانے چاہئیں۔ مقامی اور اندرونی صرف ریکارڈ کیے جانے چاہئیں۔ مختلف فروخت مراکز پر رائج قیمتوں کا مناسب سروے ہونا چاہیے۔

تجارتی معلومات کے مختلف مراحل سے گاؤں والوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ دیسی معلومات یکجا کر کے ان کا استعمال کرنا چاہیے۔ حیات نو، کاشت اور پیداوار کا سسٹم بنانا چاہیے۔ بنیادی ذخیرہ اندوزی کی مدد کی جانی چاہیے تاکہ انھیں مناسب قیمتیں مل سکیں۔ جنگلات کے قریب ہی NTFP پر مبنی انڈسٹریز قائم کرنی چاہئیں۔ فصل اور بازار کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھتے ہوئے مستقل پیداواروں کے ذریعہ پیدا شدہ فرق کے ازالے کی کوشش کرنا چاہیے۔

جنگلوں کے اندر اور باہر تجارتی پیمانے پر شجرکاری کو فروغ دینا چاہیے۔ NTFP دینے والی جڑی بوٹیوں کی کاشت کاری کے جدید طریقے موزوں و مناسب ہوں گے۔ NTFP باغات کے لیے NTFP شجرکاری طریقہ ہی موزوں ترین ہوتا ہے کیوں کہ نجی اور کارپوریٹ سیکٹروں میں ماحولیاتی تحفظ کو تجارتی کاشت کاری سے مربوط ہونا چاہیے۔ ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ پروگراموں میں NTFP پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ طویل اور قلیل مدتی پروگرام بنائے جانے چاہیے۔ مناسب قومی، ریاستی اور اساسی تنظیموں کا مطالعہ قلیل مدتی پروگراموں کی حیثیت سے کرنا چاہیے۔ وسائل کی فہرست تیار کی جانی چاہیے۔ ذخیرہ اندوزی، اسٹوریج، درجہ بندی، پروسیسنگ، اصلاحی تدبیروں اور ناپ تول کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرنی چاہیے۔ انفارمیشن کے ذرائع ڈھونڈھے جانے چاہئیں۔ کارپوریٹ سیکٹروں کو محدود و مخصوص شجرکاریوں کو فروغ دینا چاہیے۔

NTFPs کی دیرپا یافت کی خاطر جنگلوں کے بندوبست کے پیشِ نظر جنگل سازی کو فروغ دینا چاہیے۔ R&D پروگراموں میں NTFP کو شامل کر دینا چاہیے۔ جڑی بوٹیوں، بیلوں اور پیڑ پودوں کی دیگر قسموں کی شجرکاری کے بارے میں معلومات میں اضافہ کرنا چاہیے۔ NTFP کی کاشت کے لیے

باقی صفحہ پر

عرفان مرزا

سکم: اقتصادی ترقی کی راہ پر

صدیوں سے بدھ ازم کی خانقاہوں کا مسکن سکم بھی اب اسی بدلتی ہوئی دنیا میں جاگ رہا ہے جہاں سماجی و اقتصادی بحران کی تیز و تند ہوائیں سمندروں کو پار کر کے جزیروں تک اور پہاڑوں کو سر کر کے خاموش وادیوں تک پہنچ رہی ہیں اور جن کی اندرونی پہنچ سے بھی اب گھریلو زندگی کا کوئی بھی گوشہ بچنے والا نہیں ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے بین اقوامی زائچے کے اس گمبھیر منظر نامے میں سکم عوام و حکام بھی اسی کشمکش سے دو چار ہیں جو ماضی کی سادہ روایات اور حال کے پیچیدہ تقاضوں کے درمیان ایک مستقل توازن تلاش کرتی ہے۔

سرد ماحول اور خاموش وادیوں میں بسا ہوا ہندوستان کا یہ سب سے کمسن صوبہ علاوہ کشمیر کے ملک کے تمام پہاڑی مقامات میں سب سے زیادہ قدرتی مناظر کی دولت سے مالا مال ہے۔ رنگوں سے گلنار وادیاں اور برفانی گلیشیر جا بجا بکھرے پڑے ہیں جن میں ان گنت گرم پانی کے سوتے اور سرد پانی کے چشمے دلفریب مناظر سے آنکھوں کو خیرہ کیے رہتے ہیں۔ اس پس منظر میں کنچن جنگا کی برف پوش چوٹیاں رہ رہ کر ابھرتی ہیں اور اقبالؔ کی طرف سے ہمالہ کو پیش کیے گئے خراج عقیدت کی یاد دلاتی ہیں:

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

اس دلکش منظر سے بھٹکتے ہوئے تیشا اور انگیت دریا نکلتے ہیں جو یہاں کسی بھی آنے والے کا سب سے پہلے خیر مقدم کرتے ہیں کیوں کہ تقریباً ہر سڑک جو یہاں تک پہنچی ہے ان کے یا ان کے ساتھی چشموں کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے چٹانوں پر مختلف مفکروں اور فلسفیوں کے اقوال انگریزی کے جلی حرفوں میں درج ہیں جو آنے والوں کو صحیح راہِ عمل کی تلقین کرتے ہیں لیکن جو چیز آپ کے سکم میں داخل ہونے کا اعلان کرتی ہے وہ مقامی پولیس کی نیلی خوش پوشاکی اور جا بجا ہندوستانی فوج کی موجودگی ہے۔

لیکن اب شاید سکم کی ان بیش بہا قدرتی نعمتوں کی عالمی بازار میں بولیاں لگنے کا وقت آگیا ہے۔ تیشا اور انگیت دریاؤں کی آبی توانائی سے تقریباً ۸۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے گلوبل ٹینڈر (GLOBAL TENDER) جاری کیے جا چکے ہیں۔ صوبہ کے ایک ہی چائے کے باغ تیمائی اسٹیٹ کا رقبہ اب سو ہیکٹا ایکڑ (HECTA ACRE) سے بڑھایا جائے گا۔ غیر ملکی سرمایہ داروں کو مختلف طرح کی ترغیب دے کر سکم میں سرمایہ لگانے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ سیاحوں کے نئے اژدہام کو بلانے کے لیے مختلف طرح کی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ جن میں ریل کی نئی لائن اور ۔ ۔ ۔ ۔ ROPEWAYS کی تشکیل سرفہرست ہے ۔ پہاڑوں پر کاشت کاری کا رقبہ بڑھایا جا رہا ہے اور ان پر مختلف طرح کے پھولوں اور پھلوں کے باغات اور مسالوں کی کمیاب قسمیں لگائی جائیں گی۔ کم آمدنی اور نوکری پیشہ لوگوں کے لیے مختلف رہائشی بستیاں بنائی جا رہی ہیں جن سے لوگوں کو کافی آرام مل رہا ہے۔ دور دراز علاقوں میں بجلی اور پانی کی سہولتیں پہنچ چکی ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایک شاندار نو منزلہ اسپتال کا افتتاح کیا گیا ہے جہاں جدید ترین علاج کے لیے بہترین سہولتیں بہت جلد دستیاب ہونے لگیں گی۔ اپنے خوب صورت پس منظر کی وجہ سے یہ اسپتال بہت جلد ملک کے صفِ اول کے اسپتالوں میں شمار ہونے لگے گا۔ ایک میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج بھی کھولنے کے منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔

فی الحال سکم میں جو چند کارخانے ہیں ان میں شراب کی دو فیکٹریاں، ایک گھڑی سازی کا کارخانہ اور ایک سکم جوئیلز (SIKKIM JEWELS) سرفہرست ہیں (سکم جوئیلز میں گھڑی اور بجلی کے میٹروں میں استعمال ہونے والے بہت زیادہ باریک مصنوعی قیمتی پتھر بنائے جاتے ہیں) ان تمام صنعتوں میں ۷۰ فی صد سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہیں۔ عورتوں کا مرتبہ سکم کے معاشرے میں بہت بلند تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے خلاف جرائم نہیں کے برابر ہیں، زندگی کے ہر شعبے میں ان کا بڑا عمل دخل ہے اور قالین، اونی کپڑے اور دوسری دستکاریاں تقریباً

۱۱- ملا سدّین اسٹریٹ، کلکتہ - ۷۰۰۰۱۶

انھیں کی مکمل عمل پیرائی سے چل رہی ہیں۔ ان ساری صنعتوں میں مرکزی حکومت کی ایک بڑی امداد شامل ہے اور صوبائی اخراجات جو تقریباً ۲۲۰ کروڑ روپے ہیں، ان کا ۹۰ فی صد حصہ مرکزی حکومت کی امداد کی شکل میں آتا ہے۔

سکم میں اب جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں ان میں یہاں کی پرانی روایتوں کے احترام اور یہاں کے نازک قدرتی ماحول کی برقراری کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مثلاً مختلف پہاڑی کھیلوں جیسے MOUNTAINEERING اور RIVER RAFTING وغیرہ کی فیس اتنی زیادہ رکھی گئی ہے کہ زیادہ باہر کے لوگ اس میں شامل نہ ہو سکیں۔ ٹیشا پر جو ڈیم بنائے جائیں گے ان میں اس کا خیال رکھا جائے گا کہ نایاب پھولوں اور جڑی بوٹیوں کے علاقے زیر آب نہ ہوں اور اسی طرح مختلف اقدام اٹھائے جا رہے ہیں کہ سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کی رفتار اتنی ہو کہ مقامی آبادی آہستہ آہستہ اپنی بدلتی ہوئی زندگی کی عادی ہو سکے۔ اس ذیل میں سوئٹزرلینڈ کی اکثر مثال دی جاتی ہے کہ جہاں قدرتی ماحول کو مجروح کیے بغیر سائنسی ترقی ہوئی ہے۔ اس ماڈل کو مد نظر رکھتے ہوئے صوبائی حکومت اقتصادی ترقی کے لیے کوشاں ہے اور مرکزی حکومت بھی اس میں شانہ بشانہ شریک ہوتی نظر آتی ہے۔

سکم اب ہندوستان کے ان گنے چنے جغرافیائی خطوں میں سے ہے جہاں اقتصادی ترقی کا دور اپنے پورے اثر کے ساتھ نہیں پہنچا ہے۔ اس ذیل میں مرکزی اور صوبائی حکومت کی نیک نیتی اور نیک خیالی پر کسی کو شک نہیں ہے۔ لیکن سکم کی ترقی سے منسلک کئی اہم نکات ہیں جنھیں دور اندیشی نظر انداز نہیں کرنے دیتی۔ سائنسی تکنیک سے منسلک سماجی و اقتصادی تبدیلیوں کا سلسلہ جب ایک بار چل پڑتا ہے تو ایک حد کے بعد یہ خود کار ہو کر انسانی قابو سے باہر اور انسانی قدروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر کیا بے لگام ہونے پر یہ جارحانہ اقتصادی طاقتیں سکم میں بھی وہ ہی قیامت ڈھائیں گی جو بالعموم ترقی پذیر ممالک کے بیشتر حصوں میں اور بالخصوص ہندوستان کے چپے چپے میں برپا کر رہی ہیں؟ کیا ایک بار پھر ہماری آنکھوں کے سامنے وہی منظر دہرایا جائے گا جس میں سائنسی تکنیک اثر انداز ہو کر ایک خوابیدہ معاشرے کو جھنجھوڑ کر تبدیل کرنا شروع کر دیتی ہے؟ قیاس اور تصور کی دوربین سے تو ہمیں یہی دکھائی دیتا ہے کہ محافظوں کی طرح کھڑے ہوئے یہ قطار در قطار پہاڑ مادی ترقی کے "اس بھوکے اژدہے" کو نہیں روک سکیں گے، جو جہاں بھی جاتا ہے سارے جنگلات، حیوانات و نباتات صاف کرنا شروع کر دیتا ہے اور سارے چشمے اور دریا پی کر سکھاتا جاتا ہے یا پھر انھیں غلیظ اور آلودہ کر کے کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔ اس لیے ترقی اور ماحولیات میں توازن برقرار رکھنا ضروری ہے۔

اپنے سفر سکم کے دوران راقم کے ساتھ کچھ انہونی سی باتیں ہوئیں جنھوں نے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ناقابل فراموش ہے۔ ایک اسکول کی لڑکی کا سڑک کے کنارے چٹانوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کو چلو میں جمع کر کے پینا اور پھر پلٹ کر سیاحوں کے اچنبے پر کھلکھلا کے ہنسنا اور بھاگ جانا۔ کیا گرتے ہوئے پانی کی صفائی اور لڑکی کی معصومیت کی گواہی، نئی تبدیلیوں کی آمد اور پھر ان کا سرپٹ اور بے تکان رقص برداشت کر سکے گی؟ یا پھر پہاڑوں سے گھری ہوئی چھنگو جھیل تک جانے کا بلندی کا راستہ مسدود کرنے والی تازہ برف کی سفید چادروں پر ان گنت گاڑیوں اور بسوں کے ڈیزل کے سیاہ دھبے اور ہوا میں کالے دھوئیں کی بدنما لکیریں شاید آنے والے کل کی نشاندہی کر رہی ہیں؟ ●

بقیہ: بحری رو توانائی

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سمندر میں دور دور تک قائم بحری رو توانائی مرکز سے ملنے والی توانائی کی ممکنہ انتہائی پیداوار کے لیے نئے طرز اور طریقے کو فروغ دینا ہوگا۔ برطانوی انجینیروں کے مشورے پر زیادہ تر ماہرین پلانٹ کی جگہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امکان پر بھی غور کر رہے ہیں جس سے ٹینکروں اور پائپوں کے ذریعہ ساحل تک لایا جا سکتا ہے۔

بحری رو توانائی پلانٹ کی لاگت ایک لاکھ روپے سے دو لاکھ روپے فی کلو واٹ صلاحیت ہوگی۔ جب کہ روایتی یا عام بجلی گھر کی تعمیر پر تقریباً فی کلو واٹ چھ ہزار پانچ سو فی روپے سے ۱۳ ہزار روپے کا صرفہ ہوتا ہے اس حساب سے بحری رو توانائی کی پیداواری صلاحیت حرارتی بجلی اور پن بجلی پلانٹوں کے مقابلے میں تین گنا ہے۔ آئی۔آئی۔ٹی نے ان ہی جگہوں پر ایسے پلانٹ لگانے کی سفارش کی ہے جہاں حکومت ہند چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں (اسٹیشن) بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ایک قطار میں بنائے گئے PLANT DOCKS دیوار کا کام بھی کریں گے اور ساتھ ہی بجلی بھی تیار کریں گے۔ چوں کہ کل لاگت DOCKS کی دیوار اور بجلی پلانٹ کے درمیان بٹ جائے گی۔ اس لیے بجلی پیداوار کی لاگت فی یونٹ ایک روپیہ سے کم آئے گی۔ یقیناً اس میں مزید تحقیق اور محنت و مشقت کی ضرورت ہے تاکہ فی یونٹ لاگت کم سے کم آئے۔

مرکز مطالعہ سائنس اراضی کے ڈاکٹر باوا کے مطابق بحری رو توانائی کا اصل منافع یہ ہے کہ یہ بار بار استعمال ہو سکتی ہے۔ آلودگی سے پاک ہوگی اور صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ جزیروں میں تو اس سے زیادہ کار آمد توانائی کے دوسرے ذرائع ہو ہی نہیں سکتے کیوں کہ یہ قریب ہی میں میسر ہیں۔ بہت سی جگہوں پر ایسے اسٹیشن بنائے جانے کی طرف ترقی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ آئی۔آئی۔ٹی کے ذریعہ وسعت دیے گئے اس پلانٹ کا مستقبل بہت ہی تابناک ہے۔ اس سے امید افزا توقع کی جا سکتی ہے۔

خواجہ عبدالخالق

جنگ آزادی اور کالا پانی

انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کی جنگ آزادی کا جزائر انڈمان میں "کالے پانی" کی سزا سے شروع ہی سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ ہماری پہلی جنگ آزادی کے فوراً بعد ہی، جو ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی تھی، یعنی ۱۸۵۸ء میں انگریزی حکومت نے انڈمان جزیروں میں جو خلیج بنگال میں دریائے ہگلی کے دہانے سے ۵۹۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں، پورٹ بلیئر نامی جگہ پر ایک تعزیری نو آبادی قائم کی تھی۔ اس کے قیام کا بڑا مقصد یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین کو ان کے وطن سے بہت دور ایک نیم آباد علاقہ میں رکھا جائے جہاں سے ان کا اپنے ہم وطنوں سے کوئی رابطہ قائم نہ رہ سکے اور جہاں کی گرم و مرطوب آب و ہوا اور اجنبی ماحول میں انسانیت سوز سزاؤں سے ان کے جذبۂ حب الوطنی کو کچلا جائے۔ اسی وقت سے انڈمان بھیجے جانے کی سزا کو عرف عام میں "کالے پانی کی سزا" کا نام دے دیا گیا۔

انڈمان میں ملک بدر کیے گئے ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ کیے گئے سلوک نے برطانوی سامراج کے مقاصد کی ہمیشہ نشاندہی کی۔ ہماری جنگ آزادی کس طرح انڈمان میں "کالے پانی" کی سزا سے جڑی ہوئی ہے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ یہ معلوم ہو کہ وہاں بھیجے گئے ہمارے مجاہدین آزادی نے وہاں کیا صعوبتیں جھیلیں اور ان کا کیسے مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں بالآخر برطانوی حکومت کو ملک کی آزادی سے صرف دس سال پہلے ۱۹۳۷ء میں تمام سیاسی قیدیوں کو وہاں سے ملک واپس بھیجنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

ہمارے ان جاں بازوں کو برسوں تک اپنے بھائی بندوں سے کوئی رابطہ قائم نہیں رکھنے دیا گیا۔ ان میں اپنے وطن واپس آنے کی کوئی امید نہیں چھوڑی گئی۔ انھیں وہ حقوق بھی نہیں دیے جاتے جو معمولی مجرموں کو دیے جاتے ہیں۔ پھر انھیں مختلف طریقوں سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ بعض اوقات انھیں کوڑے لگائے جاتے لیکن انھوں نے برطانوی ظلم و ستم کے آگے کبھی اپنا سر نہیں جھکایا اور ان میں سے بہتوں نے بخوشی جام شہادت پیا۔

ہندوستان سے انڈمان قیدیوں کا پہلا جتھا جو ۷۷۳ قیدیوں پر مشتمل تھا ۱۰ مارچ ۱۸۵۸ء کو پہنچا۔ وہاں کے ناسازگار حالات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلے ہی دو مہینوں میں ۲۲۸ قیدی اس تعزیری نو آبادی سے فرار ہو گئے تھے جن میں سے ۸۸ پھر گرفتار ہوئے اور ان میں سے ۸۷ کو وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے ایک ہی دن میں قتل کر دیا گیا۔ مفرور قیدیوں کی اکثریت انڈمان کے قدیم باشندوں کے ہاتھوں ماری گئی یا پھر فاقہ اور بیماریوں کا شکار ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے جن مجاہدین کو انڈمان بھیجا گیا تھا ان میں سے بہت سے انتہائی اعلا کردار اور قابلیت کے لوگ تھے۔ چناں چہ غالب نے اپنے دوست علامہ فضل حق خیرآبادی کا ذکر کیا ہے جن کا انڈمان میں جلا وطنی میں انتقال ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے معرکہ کے ایک اور مشہور لیڈر مولانا لیاقت علی خاں کا بھی انڈمان میں انتقال ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہدین آزادی کی پہلی کھیپ کے بعد جو سیاسی قیدی انڈمان بھیجے گئے وہ "وہابی" تھے۔ ہندوستان میں وہابی تحریک کے بانی سید احمد کے ۱۸۳۱ء میں مارے جانے کے بعد کچھ عرصہ تک وہابی تحریک جس کا مقصد ہندوستان سے انگریزی حکومت کو ختم کرنا تھا دبی رہی لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک شروع ہوتے ہی وہ اس میں شامل ہو گئے تھے پھر ۱۸۶۳ء میں وہابی مجاہدین انگریزوں کے خلاف افغان جنگ میں شریک ہوئے۔ بہر حال وہابی لیڈر مولانا محمد جعفر تھانیسوری پکڑے گئے اور دوسرے وہابی مجاہدین کے ساتھ انھیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ مولانا جعفر کو وہاں ۲۰ سال کی قید کی سزا پر بھیجا گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے "کالا پانی" کے نام سے اردو میں اپنی سرگزشت بھی شائع کی تھی۔

مولانا جعفر کے انڈمان میں زمانۂ قید کے دوران ہی ہندوستان کے وائسرائے لارڈ میو کو ایک آفریدی پٹھان قیدی شیر خان نے وہاں ۸؍فروری ۱۸۷۲ء کو قتل کیا تھا۔ وہابی قیدیوں پر اس قتل کی سازش کرنے کا شبہ کیا گیا تھا لیکن یہ شبہ ثابت نہیں ہو سکا اور وہ بری الذمہ قرار دیے گئے۔ شیر خان نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے کہا تھا "خدا نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا میرا شریک کوئی آدمی نہیں، خدا ہے" پھر سولی پر چڑھتے ہوئے اس نے دوسرے قیدیوں سے کہا تھا "بھائیو! میں نے تمہارے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے جان دی۔ شیر خان کے بارے میں خیال یہی ہے کہ اس کا وہابی تحریک سے تعلق تھا وائسرائے سے بہتر اس تحریک کا ہدف کون ہو سکتا تھا۔

وہابیوں کے بعد ۱۸۹۱ء میں منی پور کے باغی انڈمان بھیجے گئے جنھوں نے انگریزوں کا سخت مقابلہ کر کے تین انگریز جنرلوں کو ہلاک کیا تھا۔ ان کے لیڈر سیناپتی تکیندر جیت اور ان کے کئی جنرلوں کو پھانسی کی سزا دی گئی جب کہ ان کے دوسرے ساتھیوں کو انڈمان بھیجا گیا۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے کے بعد سے سیاسی قیدی بڑی تعداد میں انڈمان بھیجے گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ملک کے مختلف صوبوں خاص طور پر بنگال میں انگریزی حکومت کے خلاف سخت انقلابی شورش برپا ہو چکی تھی اور بہت سی خفیہ تنظیمیں بن گئی تھیں جن کا مقصد ملک کو کسی بھی صورت سے غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانا تھا۔ پہلے تو حکومت نے ان تحریکوں کے کارکنوں کو ہندوستانی جیلوں میں رکھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ یہ سیاسی کارکن دوسرے قیدیوں کو بھی انگریزوں کے خلاف بھڑکا رہے ہیں تو حکومت نے انھیں انڈمان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ علی پور سازش کیس، ناسک سازش کیس، ڈھاکہ سازش کیس اور رڈ لہوزی اسکوائر بم کیس میں ماخوذ لوگوں کو انڈمان بھیج دیا گیا۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ انڈمان کے بدنام زمانہ "سیلولر جیل" کی تعمیر ۱۸۹۶ء میں شروع ہو کر ۱۹۱۰ء میں مکمل ہوگئی تھی۔ ۱۸۹۷ء کے شروع ہی میں اس جیل کی چار سو کال کوٹھریاں تیار ہوگئی تھیں اور جیل کی تکمیل کے وقت اس میں ۶۶۳ کال کوٹھریاں تھیں۔ سنگین مجرموں کو چھ ماہ تک سیلولر جیل میں رکھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور جیل "ساجھی جیل" بھی تعمیر کی گئی تھی جو ۱۹۱۶ء میں بن کر تیار ہوئی جس میں سیلولر جیل میں رہنے کے بعد سنگین مجرم نیز دوسرے قیدی، مقامی قیدی اور نابالغ قیدی رکھے جاتے۔

تمام سیاسی قیدیوں کو سیلولر جیل ہی میں رکھا جاتا اور انھیں آپس میں نیز دوسرے قیدیوں سے ملنے جلنے نہ دیا جاتا۔ سیاسی قیدی جو پڑھے لکھے لوگ تھے اور ہاتھ کا کام کرنے کے عادی نہیں تھے روزانہ کام کے مقررہ کوٹہ کو پورا نہ کر پاتے تھے جس کی پاداش میں انھیں کال کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا اور بیماروں کی خوراک دی جاتی جس سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ پھر جیل کے عملہ کا ان کے ساتھ بڑا ابرا برتاؤ ہوتا تھا جس سے تنگ آکر بنگال کے ایک نوجوان سیاسی قیدی اندو بھوشن رائے نے مئی ۱۹۱۲ء میں خودکشی کر لی تھی۔ ایک اور سیاسی قیدی الاسکردت ۱۰ جون ۱۹۱۲ء کو پاگل ہوگیا تھا جب کہ وہ جیل کی مشقت سے انکار کرنے کی بنا پر ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھا، دن تک کھڑے رہنے کی سزا بھگت رہا تھا۔

وی۔ ڈی۔ ساورکر نے جو خود انڈمان کی جیل میں رہ چکے تھے سیاسی قیدیوں کے ساتھ برے برتاؤ کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دن میں انھیں ذرا بھی آرام نہیں کرنے دیا جاتا تھا سیلولر جیل میں پانی کی سخت قلت تھی، کسی قیدی کو دن میں دو پیالہ سے زیادہ پینے کا پانی نہیں ملتا اور نہانے کے لیے پانی بالکل ہی نہیں دیا جاتا۔ انھیں صرف بارش کے پانی میں نہانے کی اجازت تھی۔ اپنا روزانہ کا کام پورا نہ کر پانے پر انھیں بعض اوقات سختی سے مارا پیٹا جاتا۔ بیمار قیدیوں کو ڈاکٹری صلاح کے باوجود اسپتال میں نہ بھیجا جاتا بلکہ کام کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ سیاسی قیدیوں کو ان کی ضرورت کے مطابق پاخانہ پیشاب کرنے تک کی اجازت نہیں تھی بلکہ اس کے لیے دن بھر میں صرف تین وقت مقرر تھے۔ انھیں دیا گیا کھانا نہ صرف ادنیٰ درجہ کا ہوتا بلکہ اس میں کیڑے مکوڑے بھی ہوتے۔ انھیں پڑھنے کے لیے کوئی کتاب یا اخبار نہیں دیا جاتا۔ انھیں وہ سہولتیں بھی نہ دی جاتیں جو معمولی مجرموں کو دی جاتی ہیں مثلاً انھیں کلرکی کا کام نہ دیا جاتا جس کے وہ اہل تھے۔ بلاشبہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ معمولی مجرموں سے بھی زیادہ برا برتاؤ کیا جاتا۔

چناں چہ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اگر انھیں انڈمان میں رکھا جائے تو دوسرے قیدیوں کو دی گئیں تمام مراعات انھیں بھی دی جائیں اور جب ان کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوا تو "سوراجیہ" کے ایڈیٹر لادھا رام نے ۷ ستمبر ۱۹۱۲ء کو بھوک ہڑتال شروع کر دی، اس کے بعد منی گوپال مکھرجی نے بھوک ہڑتال کی جو ۲۷ دن تک جاری رہی۔ ان بھوک ہڑتالیوں کو زبردستی کھانا کھلایا جانے لگا۔ ان کی ہمدردی میں سیاسی قیدیوں نے عام ہڑتال کر کے کام کرنا بند کر دیا جس کی پاداش میں انھیں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے جکڑا گیا، ٹاٹ کے کپڑے پہنائے گئے، بیماروں کی خوراک دی گئی اور سیلولر جیل کی کوٹھریوں میں الگ الگ رکھا گیا۔ لیکن وہ جھکے نہیں۔ تب حکومت نے بات چیت شروع کی اور نتیجتاً انھیں چوکیداری اور ہلکی محنت کے دوسرے کام دیے گئے۔ اپریل ۱۹۱۴ء میں ۱۶ سیاسی قیدیوں کو پھر

ہڑتال کرنی پڑی جس کے بعد اچھی کارگزاری دکھانے والے سیاسی قیدیوں کی قید بامشقت کو قید سادہ میں بدلا گیا نیز خط وکتابت اور کپڑوں کے سلسلہ میں انھیں وہی سہولتیں دی گئیں جو عام قیدیوں کو حاصل تھیں لیکن بہ حالت مجبوری ان کے تئیں جیل کے عملہ کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جو ایک واقعہ سے ظاہر ہے۔ ایک دن دو انقلابی۔ بھائی پرمانند اور آشوتوش لہری۔ سیلولر جیل کے ایک یوروپین جیلر کی گالی گلوچ برداشت نہیں کر پائے اور انھوں نے اسے اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کی پاداش میں دونوں انقلابیوں کو ۳۰-۳۰ کوڑے مارے گئے اور انھیں "قید تنہا" کی سزا دی گئی۔

اس سے پہلے ۱۹۱۵ء میں غدر پارٹی کے ممبروں کو تاج برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں انڈمان بھیج دیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں لاہور سازش کیس کے قیدی بھی وہاں پہنچے۔ اس سازش کا منصوبہ جسے مشہور انقلابی راس بہاری بوس اور ایک مسلمان دلیش بھگت پنگلے نے بنایا تھا کہ شمالی ہندوستان کی فوجی چھاؤنیوں کے سپاہی ایک مقررہ تاریخ کو بغاوت کریں لیکن سازش کا بھانڈا پہلے ہی پھوٹ گیا انقلابی گرفتار ہوئے ان پر مقدمے چلے اور انھیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ اس کیس کے ایک قیدی رام رکھا کو جب سیلولر جیل میں جنیو پہننے کی اجازت نہیں دی گئی تو اس نے ایک لمبی بھوک ہڑتال کے بعد اپنی جان کی قربانی پیش کردی۔

انڈمان میں سیاسی قیدیوں کی تعداد برابر بڑھنے نیز ہڑتالوں اور بھوک ہڑتالوں کا سلسلہ جاری رہنے سے وہاں کے حالات بے قابو ہوتے جا رہے تھے بالآخر حکومت کو انڈمان کی تعزیری نوآبادی ختم کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا جس کے بعد ۱۹۲۱ء میں تمام سیاسی قیدیوں کو ہندوستان واپس بھیج دیا گیا لیکن صرف گیارہ سال بعد ۱۹۳۲ء میں حکومت نے انھیں پھر انڈمان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت کے اپنے فیصلہ کو پلٹنے کی وجوہات یہ تھیں کہ بیس کی دہے میں ملک بھر میں انقلابی تحریکیں بہت زوروں پر رہیں اور ہندوستانی جیلوں میں تشدد پسند سیاسی قیدیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی نیز یہ کہ ملک میں ان کے لیے ہمدردی بہت بڑھ گئی تھی اور وہ دوسرے قیدیوں کو اپنے خیالات سے متاثر کر رہے تھے۔

چناں چہ ۱۹۳۲ء کے آخر اور ۱۹۳۳ء کے شروع میں سیاسی قیدی پھر انڈمان پہنچا دیئے گئے جہاں انھوں نے اپنے پیش رؤں کا احتجاجی اور مزاحمتی رویہ قائم رکھا کیوں کہ ان کے مسئلے وہی تھے۔ ۱۲مئی ۱۹۳۳ء کو ۲۹ قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کی اور دوسرے قیدیوں نے عام ہڑتال کرکے کام کرنا بند کر دیا۔ شہید بھگت سنگھ کے ساتھی مہاویر سنگھ کو زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش میں اس کی موت ہوئی اور اس کی لاش کو بھاری پتھر باندھ کر سمندر میں ڈبو دیا گیا۔ اس واقعہ سے سیاسی قیدیوں میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا۔ بھوک ہڑتالیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ تین اور قیدیوں نے جام شہادت پیا۔ سارے ہندوستان میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ حکومت کو جھکنا پڑا اور سیاسی قیدیوں کے بیشتر مطالبے حکومت نے منظور کیے۔ بھوک ہڑتال ۴۶ دن کے بعد ۲۶ جون ۱۹۳۳ء کو ختم ہوئی تھی۔

اس کے بعد تین سال تک حالات قدرے بہتر رہے لیکن ۱۹۳۷ء تک صورت حال پھر پہلی جیسی ہو گئی۔ ۱۹۳۳ء میں دی گئی تقریباً ساری سہولتیں واپس لے لی گئیں۔ جیل کے قواعد کی معمولی سی خلاف ورزی پر سیاسی قیدیوں کو کوڑے تک لگائے جانے لگے۔

ادھر ہندوستان میں کانگریس اور دوسری پارٹیوں کا سخت مطالبہ تھا کہ سیاسی قیدیوں کو ہندوستان واپس بھیجا جائے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک اس بارے میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ۲۷۱ سوالات پوچھے گئے۔ ادھر ۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء کو انڈمان میں ۱۸۳ سیاسی قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ان کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ کر ۲۳۰ ہو گئی۔ باقی قیدیوں نے عام ہڑتال کرکے کام کرنا بند کر دیا۔ انڈمان میں سیاسی قیدیوں کی بھوک ہڑتال سے ایک بار پھر سارے ملک میں غم وغصہ کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ ہندوستان کے مختلف جیلوں میں بھی سیکڑوں سیاسی قیدیوں نے بھی ہمدردی میں ہڑتال شروع کر دی۔

بھوک ہڑتال کے چار ہفتہ جاری رہنے کے بعد مرکزی اسمبلی نے ایک ریزولوشن میں حکومت سے سیاسی قیدیوں کو انڈمان سے ہندوستان واپس بھیجنے کو اور ہڑتالیوں سے بھوک ہڑتال ختم کرنے کو کہا۔ پھر ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء کو مہاتما گاندھی نے بھوک ہڑتالیوں سے اپنی بھوک ہڑتال ختم کرکے نیز یہ یقین دلانے کو کہا کہ وہ تشدد کا راستہ ترک کرکے اہنسا کا طریقہ اختیار کریں گے۔ اسی رات سیلولر جیل میں ہڑتالیوں نے ایک عام جلسہ میں گاندھی جی کا مشورہ مان کر اپنی ہڑتال ختم کر دی اور انھیں مطلع کر دیا کہ انھوں نے تشدد کو سیاسی حربہ کے طور پر ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی حکومت نے سیاسی قیدیوں کی سیلولر جیل سے ہندوستان واپسی کے فیصلہ کا اعلان کر دیا اور ان کا پہلا جتھا ۲۲ ستمبر ۱۹۳۷ء کو انڈمان سے روانہ ہو گیا۔ ہندوستانی جیلوں سے بھی بیشتر تشدد پسند سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کو انڈمان بھیجے جانے کی نوبت نہیں آئی اور انڈمان کی تعزیری نوآبادی بھی جو ۱۸۵۸ء میں قائم کی گئی تھی ۱۹۴۵ء میں ختم کر دی گئی۔

انڈمان میں "کالے پانی" کی سزا کاٹنے والے ہندوستان کے مجاہدین آزادی کی برطانوی سامراج کے ظلم وستم کے خلاف جد وجہد ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے اور وہاں کے سیلولر جیل کی عمارت ایک قومی یادگار ہے جہاں ہر ہندوستانی جنگ آزادی کے سورماؤں کو خراج عقیدت پیش کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہے۔ ●

ڈاکٹر گیتا چوبے

لڑکیوں کی تعلیم اور صحت

عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ عورت اپنے اور اپنے خاندان کو غیر تعلیم یافتہ عورت کے مقابلے زیادہ صحت مند رکھ سکتی ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ عورت کے تعلیم یافتہ ہونے کی شرائط مردوں کے تعلیم یافتہ ہونے کی شرائط کے مقابلہ زیادہ مشکل ہیں۔ یہ بات تو ہمیشہ ہی بھلا دی جاتی ہے کہ عورتوں کو تعلیم میں دلچسپی جب ہی پیدا ہوگی جب کہ وہ خود صحت مند ہوں اور کام دھندے و خانگی کام کاج کرنے کے بعد بھی تعلیم کے لیے وقت نکال سکتی ہوں۔ جو لوگ تعلیم کو سب سے زیادہ اہم مانتے ہوئے صحت کو تعلیم کے بعد مقام دیتے ہیں، ان سے میں اختلاف کرتی ہوں خاص کر بچیوں کی تعلیم کو عام کرنے کے ضمن میں۔ لڑکیوں کی صحت کی طرف خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تعلیم کی کوئی بھی سطح ہو، چاہے وہ پرائمری ہو یا کہ ابتدائی۔ اس کو عام کرنے کے لیے تین باتوں پر زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے (کوٹھاری کمیشن نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے)۔

۱۔ بندوبست (۲) رجسٹریشن و (۳) پڑھائی کے دوران روکنا۔

میرے خیال میں ایک بات اور بھی اہم ہے اور وہ ہے ترغیب دینا۔ مذکورہ بالا کو باثر بنانے کے لیے ان میں رغبت پیدا کرنا بے حد ضروری ہے۔

ان تمام عوامل میں صحت کو اپنی ایک الگ ہی اہمیت حاصل ہے۔ لڑکیوں کی صحت سے مراد ہے لڑکی کی اپنی ذاتی صحت اور لڑکی کے خاندان کی صحت کیوں کہ خاندان کے دیگر افراد کی تیمارداری کی ذمہ داری بھی زیادہ تر لڑکیوں کو نبھانی پڑتی ہے۔ لڑکیوں کی صحت سے ہمیشہ ہی بے توجہی رہی ہے۔ جنھیں پیٹ بھر کھانا نہ ملے ان کی صحت مند غذائیت پر بحث کرنا فضول ہے۔ کئی تجربات سے اس بات کا پتا چلا ہے کہ لڑکوں کے مقابلے لڑکیاں زیادہ بیمار رہتی ہیں۔

اس صدی کے آخر تک سب کے لیے تعلیم، صحت، سماجی انصاف و برابری کی بات کی جارہی ہے لیکن جب تک صحت، غذائیت اور تعلیمی منصوبوں میں لڑکیوں کو افضلیت اور خصوصیت نہیں بخشی جاتی تب تک یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان خصوصیات سے محروم ہونے والوں کی تعداد کا فی صد لڑکیوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

پیش نظر مقالہ کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں اس حقیقت سے بحث کی گئی ہے کہ مختلف قسم کی ترغیبات کے باوجود صحت کی خرابی لڑکیوں کو ان کے تعلیمی حقوق سے محروم کیے ہوئے ہے۔ دوسرا حصہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ اسکولوں کی سہولیت سے مستفیض نہیں ہونے دیتی۔ تیسرے حصہ میں لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق رجسٹریشن و صحت سے متعلق موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ آخری حصہ میں بحث طلب موضوع یہ ہے کہ رجسٹریشن کی امید افزا حالت ہونے کے باوجود لڑکیاں صحت کی خرابی کے سبب ابتدائی تعلیم مکمل نہیں کرپاتیں۔

ترغیب دینا

دستیاب گوشوارہ کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ دو دہائیوں میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے خواندہ ہونے کا فی صد (گوشوارہ ۱۔۱)۔ اعداد و شمار کے مطابق زیادہ ہی رہا ہے۔ سابقہ نو دہائیوں میں عورت کی خواندگی میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ صدی کی ابتدا میں جہاں ۶۔۰ فی صد عورتیں پڑھی لکھی تھیں وہاں صدی کے آخر تک ۵۰ فی صد عورتیں خواندہ ہوسکتی ہیں۔ موجودہ دور میں تقریباً ۶۰ فی صد عورتیں ناخواندہ ہیں۔

خواندہ عورتوں میں دو تہائی شہروں میں رہنے والی عورتیں ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں میں ترغیب دینے کی زیادہ ضرورت ہے۔ شہروں میں لڑکیاں اور ان کے سرپرست صاحبان تعلیم کے تئیں زیادہ باشعور ہیں۔ لیکن گاؤں اور پچھڑے علاقوں میں بسنے والے لوگ ابھی بھی لڑکیوں کی تعلیم دلانے سے متعلق اپنا ذہن نہیں بنا پا رہے ہیں۔

عام طور پر لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے اہمیت دی جاتی ہے لیکن تعلیم کے میدان میں "لڑکی پرایا دھن" ہے کی مثال اس طرح صادق آتی ہے کہ لڑکی پر وقت اور سرمایہ خرچ کرنا بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیوں کی پڑھائی اس لیے بھی رک جاتی ہے کیوں کہ انھیں لڑکوں کے مقابلہ گھریلو کام، چھوٹے بچوں کو پالنا یا کھیتوں / بازاروں میں زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ایسے حالات میں ان کے لیے مقناطیسی ترغیب کارگر ہو سکتی ہے۔

ان کے اثرات وقت کی کمی اور خرابی صحت کی وجہ سے خاطر خواہ نہیں ہو پا رہے ہیں۔ لڑکیوں کو کچھ گھریلو کام، ایندھن اکٹھا کرنا اور پانی بھرنا جیسے کام انھیں پورے دن مصروف رکھتے ہیں اور تھکا دینے کے لیے یہ کام کافی ہیں۔ اس سلسلے میں ریاستی سرکاروں کو کچھ اقدامات کرنے چاہئیں۔

بندوبست

جن مقامات پر اسکول نہیں ہیں وہاں

گوشوارہ نمبر ۱
شرحِ خواندگی

سال	عورت		مرد		خواندگی کا معیار
	درجہ	اضافہ	درجہ	اضافہ	
۱۹۵۱ء	۸٫۸۶	-	۲۷٫۱۶	-	پانچ سال
۱۹۶۱ء	۱۵٫۳۴	۶٫۴۸	۴۰٫۴۰	۱۳٫۲۴	یا
۱۹۷۱ء	۲۱٫۹۷	۶٫۶۳	۴۹٫۹۵	۹٫۵۵	اس سے
۱۹۸۱ء	۲۸٫۴۶	۶٫۴۹	۵۲٫۴۵	۲٫۵۰	زائد
۱۹۸۱ء	۲۹٫۸۵	-	۵۶٫۵۰	-	۷ سال یا اس
۱۹۹۱ء	۳۹٫۱۹	۹٫۳۴	۶۴٫۲۰	۷٫۷۰	سے زائد

ترغیب دینے والے ایسے پروگراموں کو اہمیت دی جانی چاہیے جو لڑکیوں کو گھریلو کام کاج کے مقابلہ اسکول جانے کو راغب کر سکیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے

۱۔ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے والے پروگرام۔
۲۔ گھریلو کاموں کو جلد نمٹانے سے متعلق پروگرام۔
۳۔ صحت سے متعلق پروگرام۔

تعلیم کی اہمیت سے متعلق تشہیر لگاتار ذرائع ابلاغ سے کی جا رہی ہے۔ یہ تشہیر لڑکوں کی تعلیم میں تو سود مند ثابت ہو رہی ہے لیکن لڑکیوں کے معاملات میں ان کے گھر سے اسکول آنے جانے میں کافی وقت خراب ہوتا ہے جس سے لڑکیوں میں عدم دلچسپی تو پیدا ہوتی ہی ہے ساتھ ہی یہ آمد و رفت کا سلسلہ ان کی صحت پر بھی برا اثر ڈالتا ہے۔ اگر غذا کی کمی و خراب غذائیت یا زیادہ کام کی وجہ سے یہ لوگ بیمار رہیں تو وہ ایک کلومیٹر کے پیدل سفر کرنے میں بھی مجبوری کا احساس کرتی ہیں جس کے سبب وہ اسکول سے غیر حاضر رہنا شروع کر دیتی ہیں۔

لڑکیوں کی صحت کی خرابی ہو یا کہ ان کے خاندان کے کسی فرد کی، اس کمی کے باعث یہ لوگ اسکول و اساتذہ کی سہولیات سے بھی پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتیں۔ موسم کی خرابی میں تو اسکول کی دوری اور پریشانی کن ثابت ہوتی ہے۔ پانچویں تعلیمی سروے کے مطابق ۳۰۰ سے زائد آبادی پر مشتمل مقامات پر ایک کلومیٹر کے فاصلے تک کوئی اسکول نہیں ہیں۔ ان میں ۱۴ مقامات کی آبادی تو ۵۰۰ سے زائد ہے۔ ۴۱۰ مقامات کی آبادی ۲۰۰۰ سے ۵۰۰۰ کے درمیان اور تقریباً ۲۵۰۰ مقامات کی آبادی ۱۰۰۰-۲۰۰۰ کے درمیان ہے۔ ایسے حالات لڑکیوں کی تعلیم پر برا اثر ڈالتے ہیں۔

اس طرح کے اسکولوں میں صاف ستھرا ماحول و صاف پانی کا بندوبست نہ ہونے سے اور خراب موسم سے بچاؤ نہ کر پانے کی وجہ سے بچوں کی صحت اطمینان بخش نہیں رہ سکتی۔ سرپرست صاحبان ایسے اسکولوں میں سال بھر اپنے بچوں کو بھیجنے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کر سکتے۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ ۲۲۵۰ پرائمری اسکول ایسے بھی ہیں جہاں پر کوئی بھی استاد نہیں ہے۔ ۲۹ فی صد پرائمری اسکولوں میں صرف ایک ہی ٹیچر ہے۔ جس کے چھٹی چلے جانے پر اسکول میں پڑھائی ہی نہیں ہو پاتی۔ ایسے حالات اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے مناسب ماحول نہیں بنا پاتے اور کتابیں، وردیاں و دوپہر کا ناشتہ جیسی سہولیات بھی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ اگر لڑکے بغیر پڑھائی کے ہی گھر واپس آ جاتے ہیں تو کوئی بات نہیں لیکن لڑکیوں کا اسکول سے بغیر پڑھے لکھے واپس آنا انھیں اور ان کے والدین کے لیے پریشان کن بات ہوتی ہے اور تعلیم کے تئیں ان کے دلوں میں عدم دلچسپی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶ء) کے تحت نافذ کیے گئے آپریشن بلیک بورڈ کے مناسب طور پر مکمل در آمد سے کچھ اچھے نتائج کی امید ظاہر ہوتی ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کو مناسب طور پر فروغ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے اسکول کے قریب ہی آنگن واڑیوں

کا بھی بندوبست ہو تا کہ لڑکیاں اپنے ساتھ گھر کے چھوٹے بچوں کو بھی لے جا سکیں اس وقت آنگن واڑی اور اسکول دو الگ الگ سمت میں کام کر رہے ہیں جو کہ لڑکیوں کے لیے بے اثر ثابت ہو رہے ہیں۔ گاؤں میں صوبائی سرکار کی طرف سے صحت مراکز کا انتظام ہونا چاہیے جن میں مفت ڈاکٹری جانچ اور دوائیوں کی تقسیم بھی شامل ہو۔ اس سہولت سے لڑکیاں اپنا اور اپنے خاندان والوں کا فوری طور پر علاج کروا سکتی ہیں۔ تمام لوگوں کے صحت مند رہنے پر باقاعدہ طور سے اسکول آجا سکتی ہیں۔ تب ہی اسکولوں و اساتذہ کا بندوبست کامیاب ہو سکے گا۔ تعلیم و صحت کی سہولیات کا ایک ساتھ بندوبست ہونے پر لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ حاصل ہونا ممکن ہے۔"

رجسٹریشن

لڑکیوں کی تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے لڑکیوں کا اسکول میں رجسٹریشن صد فی صد ہونا چاہیے۔ پرائمری درجات میں لڑکیوں کے رجسٹریشن کی شرح جہاں صرف ۸۷ فی صد ہے وہیں لڑکے لڑکیوں کی مشترکہ شرح ۱۰۵ ہے۔ یہ شرحیں ایک سے پانچ تک کی جماعت کے رجسٹرڈ طلبا کو چھ سے گیارہ سال کی عمر کے بچوں کی تعداد سے تقسیم کرکے حاصل کی جاتی ہے۔ سو سے زیادہ کی شرح یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان جماعتوں میں ۶ سال سے کم اور گیارہ سال سے زیادہ کی عمر کے بھی رجسٹرڈ ہیں۔ جب عمر کے مطابق رجسٹریشن شرح نکالتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ صرف ۳۰ فی صد کم یعنی ۱۰۵ کے بجائے ۷۶ ہے۔ لڑکیوں کی شرح نسبتاً کم گھٹتی ہے۔ (۸۷ سے ۶۵)۔ اتر پردیش، راجستھان و بہار کی حالت بڑی خراب ہے۔ یہاں داخلے کی شرح ۵۰ فی صد کے آس پاس ہے۔

داخلے کی اس خراب حالت کے لیے غریبی ایک وجہ سمجھی جاتی ہے لیکن ذرائع کا نہ ہونا بھی ایک سبب ہو سکتا ہے لیکن ان میں کسی مخصوص وجہ کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ تجویز یہ کیا گیا ہے کہ وردیوں، کتابوں اور دوپہر کے کھانے کے انتظامات سے داخلے کی شرح میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

پڑھائی کے دوران روکنا

والدین داخلہ تو بہ آسانی کرا لیتے ہیں لیکن اصل مسئلہ بچے کو اسکول میں پانچویں جماعت تک پہنچنے پر روک لینا ہے۔ پانچویں جماعت تک بچے کے نہ پڑھنے کی وجہ ہے سہولیات کا مہیا نہ ہونا۔

مختلف اسکولوں میں لڑکیوں کو وظیفہ، کتابیں، ڈریس و دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے۔ لیکن پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ان کی تعداد آدھی رہ جاتی ہے۔ اس کے لیے کوئی ایک ذمہ دار نہیں ہے۔ حقیقت میں جو بچیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں، وہ روزی بھی کما رہی ہیں جو کہ ان کے خاندان کے لیے ضروری بھی ہے۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کے روزی کمانے کی امید زیادہ کی جانے لگتی ہے اور نفسیاتی طور پر بھی روزی کما کر خاندان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھنے لگتی ہیں۔

لڑکیوں کو زیادہ تر آلودہ ماحول میں تقریباً ۱۲-۱۶ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ چوڑی بنانے کے کارخانے میں بہت زیادہ حرارت ہے تو قالین بنانے کے کارخانے میں کیمیکل کا استعمال، قالین کی صنعت میں تو بچوں کو ترجیحی بنیاد پر کام دیا جاتا ہے کیوں کہ ان کی چھوٹی و پتلی انگلیاں قالین بننے کے لیے بہترین ثابت ہوتی ہیں۔ شِوکاشی کی ماچس فیکٹریوں میں ۹۰ فی صد لڑکیاں کام کرتی ہیں جن کی عمر ۱۴ سال سے کم ہے اور یہ قانونی اعتبار سے خلاف قانون کام ہے۔ اس طرح صحت کے لیے نقصان دہ ماحول کے لیے لڑکیوں کا انتخاب ہو ہی جاتا ہے کیوں کہ لڑکے اس ماحول میں کام کرنا پسند نہیں کرتے اور عورت ذات میں مادہ برداشت اور روزگار نہ پانے کی مجبوری انھیں ایسے استحصال کو برداشت کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔

لڑکیوں کے صحت و تعلیم دونوں زاویہ سے یہ ضروری ہے کہ تعلیم کو روزگار سے جوڑا جائے۔ اس تجویز کو آج سے ۴۴ سال قبل درگابائی دیش مکھ کی صدارت میں ہونے والے نسوانی تعلیمی قومی کمیشن نے حکومت کے سامنے رکھی تھی کہ لڑکیوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے کہ وہ کوئی ہنر سیکھ کر اپنی روٹی روزی کما سکیں۔

میرا خیال ہے کہ لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے وقت ہنر اور پیسہ دونوں کمائیں۔ لڑکیوں سے ایسے کام کرائیں جائیں جن سے وہ روزی کما سکیں اور اس کی رقم ہر ہفتہ ان کو ملتی رہے تاکہ والدین/سرپرست صاحبان تعلیم کو روزی کمانے کے سلسلے میں اڑچن نہ سمجھیں۔

اس کے بندوبست و انتظام کے لیے اسکول کو ہر آزادی ملنی چاہیے کہ وہ مقامی طور پر سستے صنعتی ذرائع کا استعمال کرکے مناسب فائدہ کما سکیں اور لڑکیوں کے درمیان تقسیم کریں "ارننگ وہائل لرننگ" کا صحیح تصور جب ہی پیدا ہو سکے گا۔

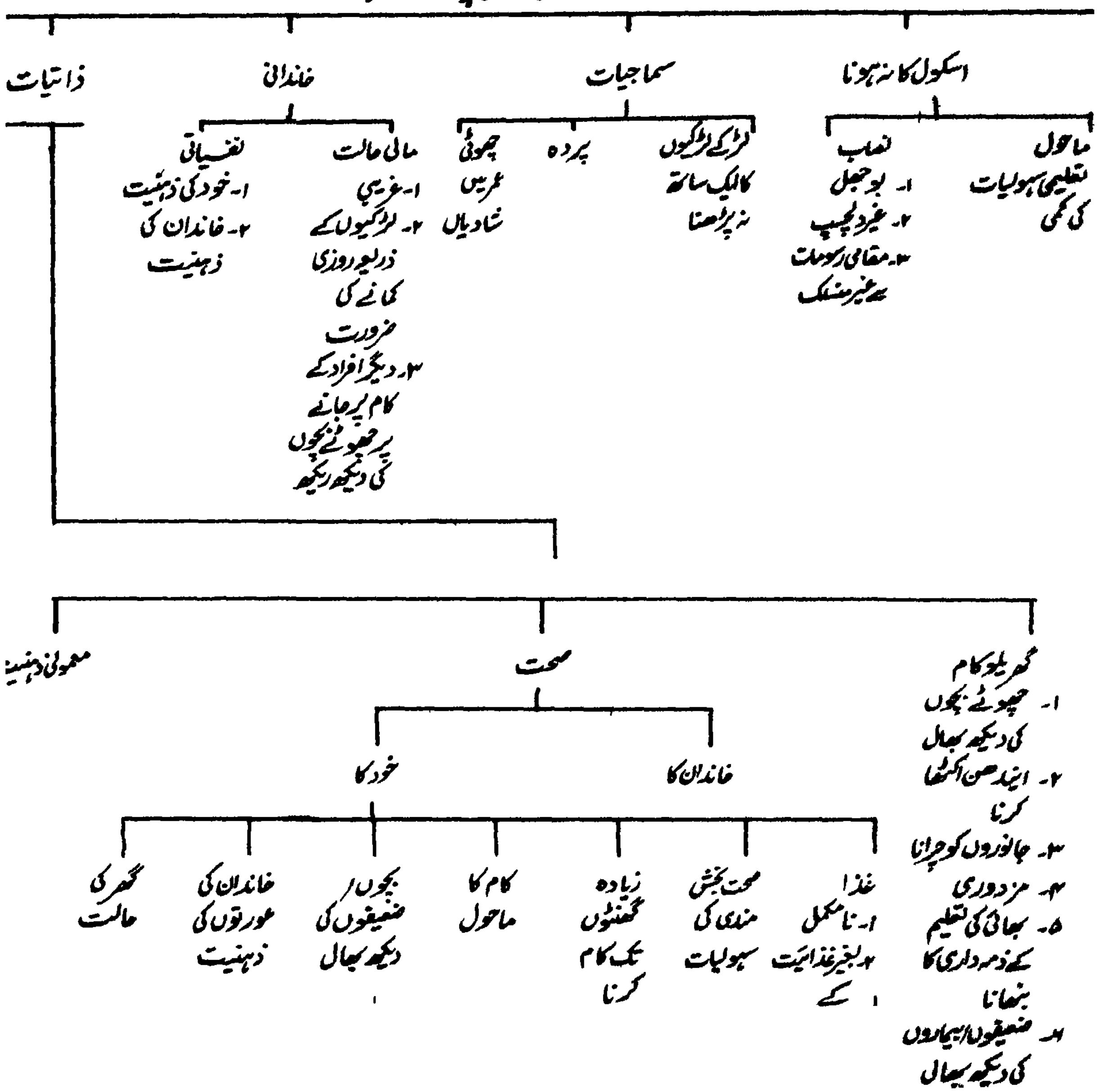
اسکول چھوڑنے کی وجوہ

داخلہ ہو جانے کے بعد لڑکیوں کے اسکول چھوڑنے کی کئی وجوہ ہیں۔ صحت مند نہ ہونا بھی ان میں سے ایک سبب ہے۔ گوشوارہ نمبر ۲ میں وجوہات پیش کی گئی ہیں۔

(گوشوارہ نمبر ۲۔ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

گوشوارہ نمبر۲

لڑکیوں کے ذریعہ اسکول چھوڑنے کی وجوہ



گوشوارہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکیوں کا پرائمری سطح تک تعلیم حاصل نہ کر پانے میں انتظامیہ، اسکول و سماج سبھی ذمہ دار ہیں۔ اسکول کا غیر دلچسپ ماحول، حالات کے مطابق نصاب تیار نہ ہونا، سماجی رسومات کی بندش وغیرہ چیزیں، بچوں میں "اسکول کے مقابل گھر اچھا" کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف کام کی زیادتی، غذا کی کمی و تمام گھر والوں کی معمولی سوچ لڑکیوں کو اسکول جانے سے روکتے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ داخلہ لینے کے بعد تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھنے اور لڑکیوں کے اسکول چھوڑنے کی عادت کو ختم کرنا ہوگا۔ کچھ اسکولوں میں بچوں کے حاضر

باقی صفحہ ۱۹ پر

ایس۔ جی۔ راوت

دست کاروں کے ساتھ شراکت داری:

دست کاری برآمدات سے حاصل شدہ فوائد

دست کاری مصنوعات کی عالمی منڈی میں ہندوستان اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ گزشتہ پنج سالہ منصوبوں کے دوران دست کاری مصنوعات کی برآمدات کا گوشوارہ مندرجہ ذیل گوشوارہ میں دیکھا جاسکتا ہے:

گوشوارہ نمبر ۱
متعدد پنجسالہ منصوبوں کے دوران دست کاری مصنوعات کی برآمدات اور روزگار کے مواقع

منصوبے اور میقات	برآمدات (منصوبے کا اختتامی سالے) (روپے/کروڑ)	روزگار (تخمیناً) (افراد/لاکھ)
تیسرا منصوبہ ۱۹۶۱-۶۶	۱۲٫۳۷	۱۱٫۳۵
چوتھا منصوبہ ۱۹۶۹-۷۴ء	۷۲٫۵۸	۱۴٫۹۰
پانچواں منصوبہ ۱۹۷۴-۷۹	۱۹۹٫۸۷	۱۸٫۹۰
چھٹواں منصوبہ ۱۹۸۰-۸۵	۵۳۵٫۴۶	۲۷٫۴۰
ساتواں منصوبہ ۱۹۸۵-۹۰	۱۰۰۸٫۶۴	۴۲٫۱۵
آٹھواں منصوبہ ۱۹۹۲-۸۷	۵۶۶۰٫۰۰ (مجوزہ)	۷۰٫۸۲

قابل غور بات یہ ہے کہ برآمدات میں اضافے کے ساتھ ساتھ دست کاری کے میدان میں روزگار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ درحقیقت دست کاری مصنوعات کی برآمدات کے حاصل شدہ اعداد و شمار کی بنیاد پر ہی مصنوعات کی پیداوار اور سیکٹر میں روزگار کے مواقع پر معتبر اعداد و شمار کا تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ چوں کہ دست کاری کی صنعت ایک غیر منظم سیکٹر ہے اسی لیے مرکزی/ریاستی حکومتوں کے ذریعے نہ تو وقفے وقفے سے سروے کرائے جاتے ہیں اور نہ ہی باقاعدہ اعداد و شمار جمع کیے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر پیداوار اور روزگار کے تخمینی اعداد و شمار کی تصدیق کی جاسکے۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران دست کاری مصنوعات کی برآمدات اور متوقع روزگار کا اندازہ درج ذیل گوشوارہ ۲ سے کیا جاسکتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲
آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے دوران دست کاری مصنوعات کی برآمدات اور روزگار کے مواقع

سالے	برآمدات (روپیہ/کروڑ)	متوقع روزگار (لاکھ افراد)
۱۹۹۲-۹۳	۲۵۱۸٫۹۷	۵۲٫۱۸
۱۹۹۳-۹۴	۳۳۶۰٫۲۰	۵۶٫۲۲
۱۹۹۴-۹۵	۴۴۵۸٫۳۰	۶۲٫۷۴
۱۹۹۵-۹۶	۴۹۸۰٫۱۵	۶۵٫۵۸
۱۹۹۶-۹۷ (متوقع)	۵۶۶۰٫۰۰	۷۰٫۸۴

ہندوستانی دست کاری مصنوعات کی برآمدات میں پانچ مصنوعات کا زیادہ حصہ ہے یعنی ہاتھ سے بنی ہوئی قالینیں، دھات کی آرائشی اور نمائشی چیزیں، بانس اور بید سے بنی چیزیں، ہاتھ کی چھپائی والے کپڑے اور لکڑی کی چیزیں۔

۱۹۸۵-۸۶ء سے ۱۹۹۵-۹۶ء تک ان مصنوعات کی برآمدات کا گوشوار درج ذیل ہے:

(گوشوارہ نمبر ۲۔ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

بقیہ کور ۲: خوراک سے متعلق تکنالوجیاں

ہندوستان میں ان پھلوں کی پیداوار سب سے زیادہ مہاراشٹر میں ہوتی ہے۔ کسٹرڈ ایپل (شریفہ) رام پھل، انار اور بیر وغیرہ غیر مروجہ پھلوں میں شمار ہوتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں غیر مروجہ پھلوں کی کاشت میں سال بہ سال اضافہ ہوا ہے کیوں کہ ان پھلوں کی کاشت کے لیے زیادہ سے زیادہ زمین استعمال کی جانے لگی ہے لیکن تکنالوجی کی ناکافی دستیابی کی وجہ سے ان پھلوں کی صنعتی پروسیسنگ کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے یا ضرورت سے کم استعمال کیا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر۳

دست کاری مصنوعات کی برآمدات (مصنوعات کے اعتبار سے)

سال	قالین	دیگر	ٹوٹل
۱۹۸۵-۸۶ء	۲۲۰	۲۸۳	۵۰۳
۱۹۸۶-۸۷ء	۲۸۴	۲۸۶	۵۷۰
۱۹۸۷-۸۸ء	۳۷۵	۴۱۵	۷۹۰
۱۹۸۸-۸۹ء	۴۵۱	۵۵۱	۱۰۰۲
۱۹۸۹-۹۰ء	۴۲۰	۵۸۸	۱۰۰۸
۱۹۹۰-۹۱ء	۵۶۵	۸۶۹	۱۴۳۴
۱۹۹۱-۹۲ء	۸۴۸	۹۶۱	۱۸۰۹
۱۹۹۲-۹۳ء	۱۰۴۳	۱۴۷۶	۲۵۱۹
۱۹۹۳-۹۴ء	۱۳۹۰	۱۹۷۰	۳۳۶۰
۱۹۹۴-۹۵ء	۱۸۲۲	۲۶۳۶	۴۴۵۸
۱۹۹۵-۹۶ء	۱۹۶۰	۳۰۲۰	۴۹۸۰

ہندوستانی دست کاری مصنوعات مغربی یورپی ملکوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران مختلف ملکوں کو برآمد کی جانے والی مصنوعات کا گوشوارہ درج ذیل ہے:

گوشوارہ نمبر۴

مختلف ملکوں کو دستکاری مصنوعات کی برآمدات (فی صد تناسب) کا گوشوارہ

ممالک	۱۹۹۲-۹۳	۱۹۹۳-۹۴	۱۹۹۴-۹۵	اوسط
آسٹریلیا	۱٫۸۱	۱٫۷۸	۱٫۷۹	۱٫۷۹
کینیڈا	۳٫۳۲	۳٫۲۶	۳٫۴۳	۳٫۳۴
فرانس	۳٫۷۵	۳٫۵۶	۳٫۴۷	۳٫۵۹
جرمنی	۲۳٫۱۶	۲۴٫۰۴	۲۳٫۱۹	۲۳٫۴۶
اٹلی	۲٫۸۰	۳٫۲۰	۳٫۸۰	۳٫۲۷
جاپان	۳٫۲۳	۳٫۳۹	۳٫۶۰	۳٫۴۱
نیدرلینڈس	۲٫۵۶	۲٫۷۱	۲٫۹۸	۲٫۷۵
سعودی عربیہ	۲٫۲۷	۲٫۳۳	۲٫۴۵	۲٫۳۵
سوئٹزرلینڈ	۲٫۷۱	۲٫۵۵	۲٫۵۸	۲٫۶۱
امریکہ	۳۲٫۵۸	۳۲٫۱۸	۳۰٫۴۸	۳۱٫۷۵
انگلینڈ	۸٫۶۴	۷٫۷۳	۷٫۴۹	۷٫۹۴

دیگر	۱۳٫۱۷	۱۳٫۲۶	۱۴٫۷۶	۱۳٫۷۴
ٹوٹل	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

مصنوعات کے لحاظ سے غیر ملکی خریداروں کا گوشوارہ نمبر ۵ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

گوشوارہ نمبر۵

مصنوعات کے لحاظ سے غیر ملکی خریداروں کا گوشوارہ

مصنوعات	ممالک
قالینیں اور دیگر جاجمیں	امریکہ، جرمنی، انگلینڈ، فرانس اور کینیڈا
لکڑی کی مصنوعات	امریکہ، انگلینڈ، جرمنی اور اٹلی
دھات کی آرائشی و نمائشی مصنوعات	امریکہ، انگلینڈ، جرمنی، فرانس اور سعودی عربیہ
ہاتھ کی چھپائی والے کپڑے اور اسکارف	امریکہ، انگلینڈ، جرمنی اور کینیڈا
کڑھائی اور کروشیا کاری کی مصنوعات	امریکہ، انگلینڈ، سعودی عربیہ اور کینیڈا
شالیں اور نمائشی چیزیں	سعودی عربیہ، امریکہ، انگلینڈ اور جاپان
زری اور زری مصنوعات	انگلینڈ، امریکہ، جاپان اور سعودی عربیہ
مصنوعی جیولری	امریکہ، انگلینڈ، سعودی عربیہ اور جرمنی

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی دست کاری مصنوعات کو سب سے زیادہ درآمد کرنے والے ممالک جرمنی، امریکہ اور انگلینڈ ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نئے صنعتی ممالک اور ترقی پذیر ممالک مثلاً تائی وان، جنوبی کوریا، ہانگ کانگ، ملیشیا انڈونیشیا وغیرہ مندرجہ بالا گوشواروں میں شامل نہیں ہیں۔ چناں چہ دست کاری مصنوعات کی برآمدات میں اضافے کے پیش نظر ہمیں اپنی توجہ ان ملکوں پر مرکوز کرتے ہوئے اپنی مارکیٹنگ اور برآمداتی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

فروغ برآمدات

ڈیولپمنٹ کمشنر (ہینڈی کرافٹس) کے محکمہ نے تعلیم یافتہ

دست کاروں کے لیے بزنس انٹرپرائزز اور ایکسپورٹ مینجمنٹ میں تربیتی پروگراموں کی ایک اسکیم وضع کی ہے۔ متعلقہ برآمدات افزا دست کاریوں میں تربیتی پروگراموں کا نظم پیشہ ور اداروں کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔

اہم اور برآمدات افزا دست کاریوں کے میدان میں صنعت کاروں / دست کاروں / برآمد کنندگان کو پیکجنگ اور اس سے متعلق اشیاء کے بارے میں جدید ترین تکنیکوں سے آگاہ کرنے کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پیکجنگ، ممبئی کے اشتراک سے تربیتی پروگراموں کا نظم کیا جا رہا ہے۔ فروغ برآمدات کی اس اسکیم کے تحت مذاکرے، مطالعے اور ورکشاپ کرائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں قالین صنعت پر دہلی میں ڈی۔ سی (ہینڈی کرافٹس) نے ایک بین الاقوامی مذاکرے کا اہتمام کیا جس میں جرمنی، امریکہ، انگلینڈ، جاپان وغیرہ کے قالین درآمد کرنے والی متعدد انجمنوں نے شرکت کی۔

فائدے

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ دست کاری مصنوعات کی بیشتر برآمدات نجی سیکٹروں کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ دست کاروں، کوآپریٹوز اور ریاستی ہینڈی کرافٹس ڈیولپمنٹ کارپوریشنز کے ذریعہ براہ راست برآمد نہیں کے برابر ہے۔ نجی برآمد کنندگان دست کاری مصنوعات کے میدان میں طلب پیدا کرتے ہیں جس کے نتیجے میں پیداواری سرگرمیاں تیز ہوتی ہیں لیکن کم پونجی اور محدود ذرائع و وسائل رکھنے والے دست کار غیر منظم نیز مالی طور پر کمزور ہونے کے سبب سے نجی سیکٹر کے ایکسپورٹروں کے استحصال کا شکار بن جاتے ہیں۔ یہ ایکسپورٹرز ان سے دست کاروں کو خام مال کی قیمت اور اتنی قلیل اجرت دیتے ہیں کہ بس ان کا وجود باقی رہے اور ان کی پیداواری سرگرمیاں جاری رہیں۔

ماضی میں بیشتر ایکسپورٹرز دولت، جائداد، نام اور ساکھ کما کر امیر سے امیر ترین ہوگئے جب کہ دست کاروں کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر ۹۶-۱۹۹۵ء میں ڈی سی (ہینڈی کرافٹس) نے غریب اور منظم دست کاروں کے بہبود کے لیے فلاحی اسکیمیں (مثلاً کارخانہ / رہائش، اجتماعی انشورنس اور صحت سے متعلق سہولیتیں وغیرہ) وضع کیں۔ جموں کشمیر، گجرات، اڑیسہ اور مغربی بنگال کے علاوہ تمام ریاستوں نے ہینڈی کرافٹس کے لیے علاحدہ ڈائرکٹوریٹ قائم کر دیا ہے تاہم چند ریاستوں نے ابھی تک یہ قدم نہیں اٹھایا ہے حالاں کہ ان ریاستوں سے اچھی خاصی برآمدات ہو رہی ہے۔

دست کاری مصنوعات کی برآمدات سے ہونے والے فائدوں کو بنیادی سطح کے دست کاروں تک پہنچانے اور اس میں اضافہ کرنے کے لیے درج ذیل مشورے سود مند ہوں گے۔

(۱) پبلک سیکٹر انڈرٹیکنگس، ریاستی ہینڈی کرافٹس ڈیولپمنٹ کارپوریشنز وغیرہ کو اس قابل بنایا جانا چاہیے کہ وہ دست کاری مصنوعات کی برآمدات بڑے پیمانے پر انجام دے سکیں۔

یہ قدم کم لاگت کی ان مصنوعات کی پیداوار میں اضافے کا موجب ہوگا جو خریدار کی ضرورت اور مذاق کے مطابق برآمد کی جاتی ہیں اور جنھیں روزمرہ کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ عام طور پر بڑے تھوک امپورٹرز اور چین اسٹورز ان مصنوعات کو بڑے پیمانے پر درآمد کرتے ہیں۔ ان مصنوعات کو مختلف شکلوں، رنگوں اور ڈیزائنوں میں میکانکی پروسس اور صفائی کے ساتھ زیادہ تعداد میں تیار کرنا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے ہندوستان کو بڑے پیمانے پر مشین صنعتی اور معیاری بننا ہوگا نیز دست کاروں کو خام مال مہیا کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ یہ تنظیمیں کم تعداد میں مطلوب لیکن قیمتی مصنوعات کی برآمدات کو بھی فروغ دے سکتی ہیں جو ثقافتی ڈیزائنوں وغیرہ پر مبنی ہوتی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے اعلا طبقے کے آرٹ کے شیدائی ایسی مصنوعات طلب کرتے ہیں۔

(۲) ان منتخب دست کاری مصنوعات کی پیداوار اور برآمد کے لیے ہینڈی کرافٹس سیکٹر میں کوآپریٹو کے فروغ کی کوششیں ہونی چاہئیں جو نہ صرف استعمال (درآمدی ملک / سوسائٹی / صارفین کی ضرورتوں کے مطابق) اور جمالیاتی جاذبیت کے اعتبار سے اہم ہوں بلکہ نسلی اور روایتی آرٹ اور کلچر کی نمائندہ بھی ہوں۔

چوں کہ دست کاری سیکٹر میں کوآپریٹوز کا نظام کامیاب نہیں ہو سکا اس لیے ایسی جگہوں پر جہاں دست کاریوں کی بہتات ہو، دست کاروں کے خود معاون گروپوں یا تنظیموں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے گروپوں / تنظیموں کے لیے مخصوص اسکیموں کو وضع کرنے کی ضرورت ہے جو ادارہ تعاون، مالی معاونت، مارکیٹنگ کی سہولیات، خام مال، تربیت، تکنالوجی پیش رفت اور ڈیزائن فراہم کر سکیں۔

(۳) مارکیٹنگ کی فراست انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اعداد و شمار کی قلت نیز نامناسب وسائل کے باوجود اس پر توجہ مرکوز کی جانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے امریکہ، جرمنی اور یوروپی کونسل ممالک میں کونسل برائے فروغ ہینڈی کرافٹس برآمدات کی شاخیں قائم کی جانی چاہئیں۔

(۴) ایکسپورٹ آرڈر حاصل کرنے کے لیے خود معاون گروپوں / تنظیموں کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ اس سے بنیادی سطح کے دست کاروں کو براہ راست فائدہ پہنچے گا اور انھیں بہتر اجرت اور بہتر زندگی نصیب ہوگی۔ اس طرح پرائیویٹ ایکسپورٹرز کی غیر معمولی یافت کا دھارا دست کاروں کی جانب مڑے گا اور ان کے کا استحصال نسبتاً کم ہوگا۔

پروفیسر حاجی شمس الدین

اقبال کی حُبّ الوطنی

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کشمیری تھے لیکن ان کے آباو اجداد پنجاب چلے آئے اور سیالکوٹ میں رہنے لگے۔ علامہ اقبال کی پیدائش سے پہلے ان کے والد شیخ نور محمد نے خواب دیکھا تھا کہ ایک سفید کبوتر آسمان میں پرواز کر رہا ہے پھر اتر کر ان کی گود میں بیٹھ جاتا ہے۔ ان کے والد کے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی گئی تھی کہ ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوگا جو دنیا میں ان کا نام روشن کرے گا۔ الغرض ۱۸۷۵ء میں ان کے ہاں ایک بچہ ہوا۔ والدین نے بڑے چاؤ سے بچہ کا نام اقبال رکھا جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ ابتدائی تربیت و تعلیم والدہ ماجدہ کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کی ذہانت کا اندازہ آپ اس واقعہ سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے آپ دیر سے اسکول پہنچے۔ ماسٹر صاحب نے دیر سے آنے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے بے ساختہ جواب دیا "اقبال دیر ہی میں آتا ہے" ماسٹر صاحب ان کے اس جواب کو سن کر داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

اقبال بیرونی ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان آئے اور لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہوگئے مگر ۱۸ ماہ بعد یہ نوکری چھوڑ دی تو ان کے خادم نے پوچھا کہ شیخ صاحب آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی تو کہنے لگے" علی بخش انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکلیں ہیں۔ سب سے بری بات یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنھیں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں مگر انگریز کا نوکر رہ کر میں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ اب میں بالکل آزاد ہوں۔ جو چاہوں کہوں اور جو چاہوں کروں۔"

اقبال کی شاعری میں ترنم بھی ہے۔ شوکت الفاظ بھی رکھتی ہے۔ اس کی بندشیں بھی چست ہیں۔ خیالات کی بلندی اور گہرائی بھی اس کے دامن سے وابستہ ہے۔ اس میں داغ کی زبان بھی ہے۔ غالب کا فلسفہ بھی ہے۔ شبلی و حالی کے قومیات بھی ہیں۔ سب کچھ ہے جو ہونا چاہیے مگر اس سب کچھ کے اندر جو ایک پیامِ عمل ہے۔ جو فلسفہ حرکت و حیات ہے۔ جو دعوت ہے وہی اس کی جان ہے۔

ملک کی بہبودی، ہندو مسلمان کی بہتری کا نسخہ صرف باہمی محبت میں ہے۔ دلی الفت۔ دلی اتحاد۔ باہمی اعتماد۔ ایک دوسرے پر اعتبار۔ اصل اصول ہیں۔ اس سلسلہ میں اقبال نے کہا ہے ؎

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیش میں بنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

دل کے دلیس میں محبت کا مندر بنانے کی۔ اخوت کا معبد قائم کرنے کی۔ جہاں پجاری محبت کی دیوی کے شیدائی ہوں۔ اخوت کے نشہ میں سرشار ہوں، کی ضرورت ہے کیوں کہ ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نیا شوالہ چمنستانِ ہند میں بنانے کی تجویز دردِ دل سے پیدا ہوئی تھی اور ایک بے دھڑک بھی زبان سے نکلی تھی۔

ترانہ ۱۹۰۴ء کے آخر میں لکھا گیا تھا۔ سادہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں اقبال نے کہا اور ہندوستان میں گھر گھر اور بچہ بچہ کی زبان پر رواں ہوگیا۔ دیکھیے کہ حب وطن نے کیا ہی روح افزا اور دل بڑھانے والا انداز اختیار کیا تھا ؎

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

ترانہ شروع سے لے کر آخر تک وطنیت کی لے سے ہندوستانی دلوں کو ابھارنے میں بلا تمیز مذہب و ملت نواپیرا

۷/۱۵۰۔ بیج ناتھ پورہ، رائے پور ۴۹۲۰۰۱۔ ایم پی

ہے۔ اپنی دلوں میں ملکی اور ملی رنگ نے
ـبال کے قلم سے ایک نظم لکھوائی جو اپنی
زمیں لاثانی ہے ؎

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

علامہ اقبال بہت بڑے وطن پرست
ـھے۔ آپ نے اپنی شاعری کے پہلے دور میں
ـی نظمیں لکھیں جن سے وطن سے والہانہ محبت
اظہار ہوتا ہے۔ وہ آزادی وطن کے خاص
ـر پر خواہش مند تھے۔ وہ میدانِ عمل میں کود
ـے اور اپنے آتشیں افکار سے ملک و
ـم کو جھنجھوڑ دیا۔ اسی دور میں انھوں نے ترانۂ
ـدی لکھ کر وطن سے اپنی بے پناہ محبت کا
ـہار کیا۔ کہتے ہیں ؎

ـرے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
ـہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ـدی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اس ترانہ میں ہندوستان کی ندیوں،
ـیاؤں اور پہاڑوں کی تعریف کی ہے۔
ـ کے علاوہ اسی دور میں 'صدائے درد' کے
ـان سے ایک نظم کہی جس میں ہندوستان
ـ مختلف فرقوں کے باہمی تنازعات پر
ـوس کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں ؎

ـ میں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قرب، فراق آمیز ہے
ـ یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
ـ کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

اس کے بعد تصویر درد کے نام سے ایک
نظم کہی۔ اس وقت اقبال نے تمام سیاسی
کیفیت بیان کر دی۔ آزادی کے خواہش مندوں
کی کمی اور پھر آزادی کا لفظ منہ پر لانا اپنے آپ
کو پابندِ سلاسل کرنا تھا۔ اس وقت انھوں
نے کہا۔ ؎

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

پھر اقبال نے انگریزی حکومت پر
جو "پھوٹ ڈالو حکومت کرو" کا الزام ہے اس
پر بھی اظہار خیالات کیا۔ کہتے ہیں ؎

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گلچیں
تری قسمت میں رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

پھر قوم کو ان الفاظ میں بیدار کرنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

پھر شاعر عزم کرتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو
متحد کر دے گا۔ ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

اقبال کی شاعری راستہ چلنے والوں کو اپنی
طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی نوا سے بجھے
ہوئے دل جوش میں آجاتے ہیں اور قلب میں
گرمی پیدا ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے
جو بھروسا تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمھیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ انساں اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال صرف رزم کے نہیں، بزم کے بھی
مردِ میداں ہیں۔ وہ صرف سپاہی پیدا نہیں
کرنا چاہتے۔ وہ انسان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔
ان کا نصب العین ان اشعار سے واضح
ہو گا۔ ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

اقبال نے ملوکیت اور سرمایہ داری
کے خلاف بھی آواز بلند کی اور مزدوروں کی
تحریک سے ہمدردی ظاہر کی۔ چند اشعار پیش
ہیں۔ جس جوش و خروش۔ جس جذبۂ صادق۔
جس خلوص کے یہ آئینہ دار ہیں اس کا اندازہ
اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال صحیح معنیٰ میں وطن کے پجاری تھے

باقی صفحہ پر

غـــــــــزلیں

راجندر بہادر موج

نہ دیکھا اور نہ پہچانا کسی نے
مجھے اتنا ہی سمجھا آدمی نے

قدم بھٹکے جہاں راہِ وفا میں
وہیں آواز دی مجھ کو کسی نے

بھلایا ابتدا اور انتہا کو
دکھائے خواب ایسے زندگی نے

جہاں پہنچے نہیں اربابِ دانش
وہاں پہنچا دیا میری خودی نے

بہت رنگین تھا نقشہ جہاں کا
کیا پھیکا محبت کی کمی نے

وہیں اے موج ہے آغوشِ ساحل
جہاں پر ڈوب جاتے ہیں سفینے

موج مارگ، فتح گڑھ - یوپی - ۲۰۹۶۰۱

سدھیر کمار پرواز

آپ گر مل جائیں گے تو ہر خوشی مل جائے گی
جس کو چاہا جا سکے وہ زندگی مل جائے گی

باغباں تیرے گلستاں میں ہیں کلیاں بے شمار
کیا ترے گلشن سے ہم کو اک کلی مل جائے گی

شہر میں دیوانہ بن کر پھر رہا ہوں دربدر
اس طرح شاید کبھی تیری گلی مل جائے گی

لوگ کہتے ہیں جہاں سے اٹھ گئی انسانیت
ڈھونڈ کر تو دیکھیے وہ آج بھی مل جائے گی

میکشی سے زندگی کے دورِ غم ہو لگے نہیں
ہم نے مانا دو گھڑی کو بے خودی مل جائے گی

آپ کہتے ہیں نہ فن سے مجھ کو شہرت مل سکی
آپ تو مل جائیے وہ بھی کبھی مل جائے گی

جالوٹ نگر، سہارنپور - ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)

مناظر حسن شاہین

آگ نفرت کی بجھانے کا ہنر جانتے ہیں
دل کو ہم دل سے ملانے کا ہنر جانتے ہیں

دوستو! راہ کے کانٹوں سے ہمیں کیا لینا
ہم تو بس پھول کھلانے کا ہنر جانتے ہیں

آج بھی دل میں چراغوں کو سجا رکھا ہے
روشنی ہم بھی لٹانے کا ہنر جانتے ہیں

دستِ تدبیر بھی ہے جذبۂ تعمیر کے ساتھ
بزمِ گیتی کو سجانے کا ہنر جانتے ہیں

سنگ کو موم بنانا بھی ہمیں آتا ہے
دوب پتھر پہ اگانے کا ہنر جانتے ہیں

ان کو گر آنکھ چرانے کی ادا آتی ہے
ہم بھی ہر دل میں سمانے کا ہنر جانتے ہیں

مڈل اسکول لکشمی پور، وایا چاکند، ضلع گیا (بہار)

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

ریلوے نے اپریل تا اگست ۱۹۹۷ء کے دوران مال کی نقل و حمل کے نشانے تجاوز کیا

اگست ۱۹۹۷ء میں ختم ہونے والی موجودہ مالی سال کے پہلے ۵ مہینوں میں ریلوے نے ۱۷۲٫۴۲ ملین ٹن مال ڈھو کر مالیہ کمایا ہے۔ گزشتہ سال کی اسی مدت میں ریلوے نے ۱۶۱٫۲۹ ٹن مال ڈھویا تھا۔ اس مدت کے لیے ۱۶۹٫۵۵ ملین ٹن مال کا جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا اس سے یہ سال ۲٫۹۰ ملین ٹن اور گزشتہ سال کے مقابلہ میں ۱۱٫۱۹ ٹن زیادہ ہے۔

مجموعی طور پر ڈھوئے گئے مال میں کوئلہ ۸۵٫۱۱ ملین ٹن، فولاد کے کارخانوں کے لیے خام مال ۱۵٫۰۸ ملین ٹن، فولاد کے کارخانوں سے تیار لوہا اور فولاد ۴٫۶۷ ملین ٹن، برآمدات کے لیے خام لوہا ۱۴٫۴۶ ملین ٹن، سیمنٹ ۱۴٫۶۲ ملین ٹن، اناج ۱۱٫۷۳ ملین ٹن، کیمیاوی کھاد ۱۰٫۸۲ ملین ٹن، پیٹرول، تیل اور لبری کینٹ ۱۲٫۴۰ ملین ٹن اور دوسرا سامان ۱۴٫۰۲ ملین ٹن تھا۔ دوسرے سامان میں کنٹینر ٹریفک بھی شامل ہے۔ ●

اپریل تا اگست ۱۹۹۷ء میں مال بھاڑے سے ریلوے کی آمدنی میں ۲۵ فی صد اضافہ

اگست ۱۹۹۷ء میں ختم ہونے والے رواں سال کے پہلے پانچ مہینوں میں ریلوے نے مال بھاڑے کی مد میں ۸۱۰۰٫۸۱ کروڑ روپے کمائے۔ واضح رہے کہ گزشتہ سال اسی مدت کے دوران اس مد میں ریلوے نے ۶۴۵۹٫۸۴ روپے کمائے تھے۔ یعنی گزشتہ سال کے مقابلے میں ۲۵٫۴۹ فی صد اضافہ ہوا۔ اس عرصہ میں مجموعی طور پر ۱۷۲٫۴۲ ملین ٹن مال ڈھویا گیا۔ بھاڑے کی مجموعی آمدنی میں سے ۳۸۵۴٫۵۱ کروڑ روپے کوئلہ ڈھونے ۱۹۸٫۷۲ کروڑ روپے فولاد کے کارخانوں کو خام مال کی فراہمی ۴۸۶٫۳۰ کروڑ روپے لوہے اور فولاد سے ۳۷۸٫۸۱ کروڑ روپے ایکسپورٹ کے لیے آئرن سے، ۴۵۲٫۴۰ کروڑ روپے سیمنٹ سے، ۵۴۵٫۲۵ کروڑ روپے اناج سے، ۳۳۴٫۰۱ کروڑ روپے کیمیاوی کھادوں سے، ۱۰۱٫۷۸ کروڑ روپے پیٹرولیم، تیل اور لبری کینٹ سے اور ۵۷۸٫۳۰ کروڑ روپے دوسرے سامان سے حاصل ہوئے۔ فی ملین ٹن اوسط آمدنی ۴۷٫۰۱ کروڑ روپے اور پیسوں میں ۶۹٫۳۷ پیسے فی نیٹ ٹن کلومیٹر ہوئی۔ ●

فولاد کی برآمدات میں ۴٫۳ فی صد اضافہ

اپریل تا اگست ۱۹۹۷ء کے دوران ۶ لاکھ ٹن نیا فولاد برآمد کی گئی ہے۔ اس طرح ۱۹۹۸ء کے اس عرصہ کے دوران فولاد کی برآمد کے مقابلہ میں ۴٫۳ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اپریل تا اگست ۱۹۹۷ء کے دوران ۲٫۷ لاکھ ٹن سیمنز بھی برآمد کی گئی ہے جب کہ ۱۹۹۶ء میں اسی مدت میں سیمنز کی برآمد ۰٫۷ لاکھ ٹن ہی تھی۔

۹۷-۱۹۹۶ء میں ہندوستان میں ۲۲٫۷۲ ملین ٹن کاربن فولاد کی ریکارڈ پیداوار ہوئی اور توقع ہے کہ سال رواں میں تیار کاربن فولاد کی پیداوار ۲۳٫۲۵ ملین ٹن ہوگی یعنی گزشتہ سال سے ۵ فی صد زیادہ پیداوار ہوگی۔

اپریل تا اگست ۱۹۹۷ء کے دوران تیار فولاد کی کھپت کا تخمینہ ۸٫۶ ملین ٹن لگایا گیا ہے جو کہ سالانہ مانگ کے ۲۴٫۸۶ ملین ٹن تخمینہ کا لگ بھگ ۳۴٫۶ فی صد حصہ ہے اور ۱۹۹۶ء میں اسی مدت کے دوران ہوئی کھپت سے ۱٫۸ فی صد کم ہے۔ ●

سونے کے زیورات کی عالمی تجارت میں ہندوستان کے حصہ میں اضافہ

سونے کے زیورات کی عالمی تجارت میں ہندوستان کا حصہ ۱۹۹۱ء میں ۶۹٫۰ فی صد تھا، جو ۱۹۹۵ء میں بڑھ کر ۱۶٫۰۶ فی صد ہو گیا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں ۵۲٫۷۵ امریکی ڈالر کی سونے کے زیورات کی بین اقوامی تجارت ہوئی تھی۔ ہندوستان کے ذریعہ مجموعی طور پر برآمد کیے جانے والے جواہرات و زیورات میں سونے کے زیورات کا حصہ ۱۲ فی صد تھا اور سونے کے زیورات بالخصوص سونے کے

جڑاؤ زیورات کی عالمی تجارت میں ہندوستان کی حصہ داری میں مزید اضافہ کے امکانات موجود ہیں۔

ہندوستان سے سونے کے زیورات کی برآمد میں قریب قریب دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں ہندوستان نے ۱۱ر۲۶۴ ملین امریکی ڈالر کے سونے کے زیورات برآمد کیے تھے جب کہ ۱۹۹۶-۹۷ء میں اس نے ۸۰ر۵۱۱ ملین امریکی ڈالر کے سونے کے زیورات برآمد کیے۔ ۱۹۹۶-۹۷ء میں جواہرات وزیورات کی مجموعی برآمد ۳۰ر۴۷۴۴ ملین ڈالر (۷ر۴۔ ارب ڈالر) کی تھی اور امریکہ متحدہ عرب امارات، برطانیہ، کویت، جاپان، ہانگ کانگ وغیرہ ہندوستانی زیورات کے خاص خاص بازار تھے۔ اگر پورے سال سونے کی فراہمی بلا روک ٹوک جاری رہتی تو برآمد میں اور اضافہ ہو جاتا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ عالمی بازار میں ہندوستان کا حصہ بڑھا کر تین فی صد تک کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ سونا برابر فراہم کیا جاتا رہے اور دیگر تحدیدات ختم کر دی جائیں۔ ●

۱۹۹۶-۹۷ء میں معدنیات کے نئے ذخائر تلاش کیے گئے

جیولاجیکل سروے آف انڈیا (جی ایس آئی) نے ۱۹۹۶-۹۷ء کے دوران ۴۵ر۶ ملین ٹن کوئلہ، ۱۰ ملین ٹن لگنائٹ، ۷ر۱ ملین ٹن خام سونے، ۶ ملین ٹن خام پلاٹینیم، ۵۲ر۲ ملین ٹن لیڈ زنک اور ۲۹ر۱ ملین ٹن خام میگنیز، ۵۱۵ ملین ٹن لائم اسٹون (چونے کا پتھر) ۱۱۰ ملین ٹن اعلا درجہ کی مٹی، ۷ر۱۸ ملین مکعب میٹر ڈائی منشن اسٹون کے نئے ذخائر تلاش کرکے ان کی دوبارہ زمرہ بندی کی۔ جی ایس آئی نے ۵ ہیرے بھی تلاش کیے جو آندھرا پردیش میں وجراکرور کان کے علاقہ میں دستیاب ہوئے تھے اس نے آندھرا پردیش میں ہیرے کی کان کا ایک اور علاقہ بھی تلاش کیا۔

جیولاجیکل سروے آف انڈیا نے باقاعدہ نقشہ کے مطابق ۳۷۴۴ کلومیٹر رقبہ میں سروے کا کام کیا۔ اس طرح ملک کے ۹۵ر۹۴ کلومیٹر کے رقبہ کا جو ملک کے ای ای زون میں بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں ہے، میرین سروے کرایا گیا اور ۸۸۶۱ کلومیٹر علاقہ کا ملٹی سنسر ایرو جیو فزیکل سروے ہوا۔ ●

یوریا کی اطمینان بخش فراہمی

ملک میں یوریا اور کنٹرول سے مستثنیٰ دوسری خاص خاص کھادوں کی دستیابی اپریل تا جولائی ۱۹۹۷ء کے عرصہ میں اطمینان بخش رہی۔ ریاستوں کو جولائی ۱۹۹۷ء کے لیے مقررہ نشانے سے زیادہ یعنی ۱۰ لاکھ ٹن یوریا فراہم کی گئی حالاں کہ مغربی بندرگاہوں پر بارش کی وجہ سے درآمدی یوریا کو جہازوں سے اتارنے کے کام میں دشواری پیدا ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر ۱۸۱ر۷۷ لاکھ ٹن یوریا کی دستیابی ای سی اے کے ذریعہ مقررہ نشانہ کے ۷۲ فی صد کے مساوی رہی جب کہ سابقہ سال اسی مدت میں یہ فراہمی ۶۸ فی صد تھی۔ جولائی ۱۹۹۷ء میں ۱۷ر۴ لاکھ ٹن یوریا ملک میں درآمد ہوئی تھی اور ۲۱ر۷ر۹۷ تک ملک میں یوریا کی مجموعی درآمد ۱۳ر۵۳ لاکھ ٹن تھی۔ جہاں تک کنٹرول سے مستثنیٰ کیمیاوی کھادوں کا تعلق ہے لگ بھگ ایک لاکھ

۸۱ ہزار ٹن ڈی اے پی اور ایک لاکھ ۱۱ ہزار ٹن ایم او پی کی تجارت کے کھاتے میں ملک میں درآمد کی گئی تھیں اور اپریل تا جولائی ۱۹۹۷ء کے دوران ملک میں ڈی اے پی اور ایم او پی کی مجموعی درآمد بالترتیب ۷ لاکھ ۱۶ ہزار ٹن اور ۸۰ر۱۶ لاکھ ٹن تھی۔ ●

بین الاقوامی تجارت میں ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں کا حصہ ۳۲ فی صد سے زیادہ

سال ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران ہندوستان کی جہاز راں کمپنیوں نے ۵۰ر۷۹ ملین ٹن مال ڈھویا ہے۔ اس طرح بین الاقوامی تجارت میں ان کا حصہ لگ بھگ ۲۸ فی صد سے بڑھ کر، جو گزشتہ دو برسوں میں تھا، ۳۱ر۳۲ فی صد ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی غیر ملکی تجارت میں اضافہ کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے گئے ہیں اور نویں منصوبہ میں ۷ر۳ ملین جی آر ٹی حاصل کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں سمندر کے راستے سے نویں منصوبہ کے دوران ہندوستان کے تجارت میں اضافہ اور غیر ملکی جہاز راں کمپنیوں پر ہندوستان کا انحصار کم ہونے کی توقع ہے۔

آٹھویں منصوبہ کی ابتدا میں سمندر کے راستہ ۱۲۲ر۳۰ ملین ٹن کی مجموعی تجارت ہوئی تھی۔ اس میں سے ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں کا حصہ ۴۲ر۷۶ ملین ٹن (۳۴ر۹۰ فی صد) تھا۔ حالاں کہ شروع میں ہندوستان کے حصہ میں اضافہ کا رجحان نظر آیا تھا مگر ۹۴-۱۹۹۳ء میں یہ کم ہو کر ۴۲ر۰۲ ملین ٹن (۲۸ر۷۰ فی صد) رہ گیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہندوستان کی جہاز راں کمپنیوں کو اپنی مرضی سے اپنے جہازوں کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی اور انھیں ہندوستانی مال کے ڈھونے کا پابند نہیں رکھا گیا تھا۔ آٹھویں منصوبہ کے دوران جہاز رانی کی صنعت کا ایک مقصد سال ڈھونے کی صلاحیت سات ملین جی آر ٹی تک لے جانا اور دوسرا مقصد سمندر کے راستے تجارت میں ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں کا حصہ ۴۰ فی صد تک کرنا تھا۔ حالاں کہ ۷ ملین جی آر ٹی کا مقصد ایک سال پہلے ہی پورا ہو گیا لیکن غیر ملکی تجارت میں ہندوستانی جہاز راں کمپنیوں کا حصہ ۳۵ فی صد ہی تک جا سکا۔ ۱۹۶۰ء کے دہے

باقی صفحہ ۱۹ پر

بقیہ: آزادی کے بعد ہندوستان کی اقتصادی ترقی

کم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سود کی شرح گھٹائی جا سکے اور پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں میں اعلا سطحی سرمایہ کاری کے لیے وہ آزاد وسائل پیدا کیے جا سکیں جن پر نویں منصوبہ کے بنیادی مقاصد کے دستاویز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ریزرو بینک آف انڈیا سے مرکزی حکومت کے قرض لینے کے عمل کی بھی روک تھام کی جائے تاکہ افراط زر اور دباؤ کے عمل کو روکا جا سکے۔ تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی سود کی ادائیگیوں کو قابو میں رکھا جا سکے جس کی وجہ سے دستیاب وسائل کو ترجیحی، سماجی اور ڈھانچہ جاتی ضروریات پر مرکوز کرنے میں دشواری پیدا ہو رہی ہے، طویل المیعاد قرض کی ہنڈیاں جاری کر کے منڈی کے باقاعدہ فروغ کی کوشش بھی کی جانی چاہیے جس کی بنیادی ڈھانچہ میں سرمایہ کاری کے لیے اور بیرونی وسائل سے حکومت کے بہت زیادہ قرض لینے پر روک لگانے کے لیے شدید ضرورت ہے۔ ●

REGD. NO D (DN) 204
R.N 27032/81
VOL 17 NO 9

YOJANA (URDU)
DECEMBER 1997

ISSN 0971 - 8338
LICENSED U (DN) 55 TO POST WITHOUT
PREPAYMENT AT NDPSO NEW DELHI

PRINTED AND PUBLISHED BY SURINDER KAUR, DIRECTOR ON BEHALF OF PUBLICATIONS DIVISION AND PRINTED AT BENGAL OFFSET-WORKS, 335, KHAJOOR ROAD, KAROL BAGH, NEW DELHI 110005 AND PUBLISHED AT PUBLICATIONS DIVISION PATIALA HOUSE NEW DELHI-110001. EDITOR ABID AKHTAR KARHANI.